

فتاویٰ شیخ الاسلام ابنِ تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ



انتخاب وتقدیم
فضیلۃ الشیخ محمد عزیر شمس رحمہ اللہ

ترجمہ
پروفیسر حافظ عبدالجبار حفظہ اللہ

فتاویٰ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ

انتخاب و تقدیم

فضیلۃ الشیخ محمد عُزیر شمس رحمۃ اللہ علیہ

ترجمہ

پروفیسر حافظ عبد الجبّار حفظہ اللہ

جلد پنجم

دار أبي الطيب

للبحث والتحقيق

نام کتاب: ـــــــــ فتاویٰ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ

انتخاب وتقدیم: ـــــــــ فضیلۃ الشیخ محمد عزیر شمس رحمہ اللہ

ترجمہ: ـــــــــ پروفیسر حافظ عبدالجبار حفظہ اللہ

طبع اول: ـــــــــ فروری 2021ء

طبع دوم: ـــــــــ مارچ 2024ء

ناشر

دار ابی الطیب

للبحث والتحقیق

گل روڈ، حمید کالونی گلی نمبر 5 گوجرانوالہ

www.darabitayyab.com darabitayyab1@gmail.com

www.facebook.com/darabitayyab/

+92-55-3823990

فہرست (جلد پنجم)

سفرِ زیارت

جہاد

خرید وفروخت

اوقاف اور وصیت

نکاح

طلاق

ظہار، نسب، عدت، رضاعت

نان و نفقہ

حدود و تعزیرات

متفرق مسائل



سفرِ زیارت

کسی دربار پر نماز پڑھنے، نذر ماننے اور قرآن پڑھنے کے لیے قصداً جانا

سوال ایک قبر (دربار) میں زین العابدین کی اولاد میں سے ایک معزز شخص مدفون ہے۔ لوگ وہاں نمازِ پنج گانہ ادا کرنے کے لیے قصداً جاتے ہیں، اس کی نیاز دیتے ہیں، کچھ برکت کے لیے جاتے ہیں اور کچھ سمجھتے ہیں کہ وہاں دیگر مساجد کی نسبت نماز ادا کرنا افضل ہے، کیا یہ لوگ صحیح ہیں یا غلط ہیں؟ کیا ان کو کوئی ثواب ملے گا یا نہیں ملے گا؟ جو لوگ وہاں صدقہ کرتے ہیں یا قبر (دربار) کے نگران اور وہاں کے مجاور فقرا کو نذرانے اور خیرات دیتے ہیں، ان کو ثواب ملے گا؟ وہاں عشا سے لے کر صبح تک قراء بلا اجرت قرآن پڑھتے رہتے ہیں، کیا ان کو بھی اجر ملتا ہے؟ نیز کیا میت کو قرآن سننے کا ثواب ہوتا ہے؟

کچھ لوگ قبروں کے پاس اجرت لے کر قرآن پڑھتے ہیں، تیجے، ساتویں، چہلم اور برسی کے موقع پر ختم پڑھتے اور لوگوں کو رلانے کے لیے غمناک اشعار گاتے ہیں۔ واعظین بھی یہ کام کرتے ہیں۔ کچھ لوگ گلیوں، بازاروں میں گزرتے قرآن پڑھتے ہیں اور لوگ ان کو خیرات دیتے ہیں۔ ان کاموں کی کیا حیثیت ہے؟

ایک حدیث بیان کی جاتی ہے کہ میت کو اس کے گھر والوں کے رونے سے عذاب ہوتا ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا تھا کہ وہ یہودی عورت تھی، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ایک فرمان ہے:

«إِنَّ اللّٰهَ لَا يُعَذِّبُ بِدَمْعِ الْعَيْنِ وَلَا بِحُزْنِ الْقَلْبِ، وَلٰكِنْ بِهٰذَا »[1]

اللہ تعالیٰ آنکھ سے نکلنے والے آنسو اور دل کے غم پر عذاب نہیں دیتا، لیکن اس پر یعنی زبان پر عذاب دیتا ہے۔ ان احادیث کا کیا مطلب ہے؟ اگر کوئی انسان علمی یا جائز گفتگو کر رہا ہو، یا نماز و ذکر میں مشغول ہو تو کیا کسی دوسرے کے لیے بلند آواز میں قرآن پڑھنا جائز ہے جس سے اس دوسرے کو تشویش یا خلل محسوس ہوتا ہو؟ ان سوالات کے جوابات عنایت فرما کر عند اللہ ماجور ہوں۔

جواب الحمد لله. ائمہ اسلام ۔رضي الله عنهم أجمعين۔ کا اتفاق ہے کہ قبروں پر تعمیر شدہ درگاہوں میں، خواہ

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٢٤٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٩٢٤)

وہاں کسی ولی کی قبر ہو یا صحابی کی یا اہلِ بیت میں سے کسی کی، یا نبی کی، یا کسے دوسرے کی، نیز چاہے یہ یقینی علم ہو کہ قبر اسی کی ہے جس کا نام لیا جاتا ہے، یا علم ہو یہ اس کی قبر نہیں، یا اس کا حال نامعلوم ہو، کسی بھی صورت میں وہاں نماز پڑھنا مساجد میں نماز پڑھنے سے افضل نہیں، بلکہ ان تمام عام جگہوں سے بھی افضل نہیں، جہاں نماز پڑھنا جائز ہوتا ہے۔ وہاں کوئی ایک نماز پڑھنے کے لیے یا نمازِ پنجگانہ ادا کرنے کے لیے قصداً جانا کسی کے لیے بھی شریعت میں مشروع نہیں، بلکہ وہاں نماز پڑھنے کے لیے اور خصوصاً وہاں نماز پڑھ کر برکت کے حصول کی نیت سے ارادتاً جانا نہ اللہ کا حکم ہے نہ رسول کا، نہ کسی صحابی کا نہ کسی امام کا اور نہ اہلِ بیت میں سے کسی کا اور نہ کسی دوسرے ہی کا، انھوں نے اس کام کا کوئی ثواب ذکر کیا ہے نہ اجر اور نہ نیکی ہی۔

بلکہ رسول اللہ ﷺ، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ سے اس کی ممانعت شہرت کی حد تک منقول ہے۔ کئی ایک ائمہ نے یہ صراحت کے ساتھ کہا ہے کہ قبروں پر مساجد بنانے کی نہی نہی تحریمی ہے۔ صحیح بخاری و مسلم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما دونوں سے مروی ہے کہ جب آپ ﷺ کا آخری وقت آیا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

''اللہ یہود و نصاریٰ پر لعنت کرے، انھوں نے اپنے نبیوں کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا۔''[1]

آپ ﷺ نے ان کے کام سے خبردار کرتے ہوئے یہ بات کہی۔

صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ یہود و نصاریٰ کو تباہ کرے انھوں نے اپنے انبیا کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا۔''[2]

صحیح مسلم میں حضرت جندب بن عبداللہ بجلی سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں: میں نے رسول اللہ ﷺ کو آپ ﷺ کی موت کے پانچ دن پہلے، یہ فرماتے ہوئے سنا: ''میں اللہ کے ہاں اس بات سے بَری ہوں کہ میرا تم سے کوئی خلیل ہو۔ اللہ نے جس طرح ابراہیم علیہ السلام کو خلیل بنایا، اسی طرح مجھ کو بھی خلیل بنایا ہے۔ اگر میں اپنی امت میں سے کسی کو اپنا خلیل بناتا تو وہ ابوبکر ہوتے۔ یاد رہے! تم سے پہلے لوگ اپنے انبیا کی قبروں کو سجدہ گاہیں بنا لیتے تھے۔ خبردار! تم قبروں کو مساجد نہ بنانا۔ میں تم کو اس سے منع کرتا ہوں۔''[3]

ابو مرثد غنوی سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''نہ قبروں پر بیٹھو اور نہ ان کی طرف رخ کر کے نماز ہی پڑھو۔'' (رواہ مسلم)[4]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٢٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٣١)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٣٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٣٠)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٣٢)

[4] صحيح مسلم، رقم الحديث (٩٧٢)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبرستان جانے والی عورتوں، ان پر مساجد بنانے والوں اور ان پر دیے جلانے والوں پر لعنت کی ہے۔''[1] یہ حدیث مسند احمد، ابو داود، ابن ماجہ، نسائی اور ترمذی میں بھی مروی ہے۔ امام ترمذی کا قول ہے: یہ حدیث حسن ہے، کچھ نسخوں میں صحیح بھی لکھا ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مرض الموت میں فرمایا: ''اللہ یہود و نصاریٰ پر لعنت کرے! انھوں نے اپنے انبیا کی قبروں کو مساجد بنا لیا۔'' اگر یہ خدشہ نہ ہوتا کہ مبادا آپ کی قبر کو مسجد (سجدہ گاہ) بنا لیا جائے تو اس کو ظاہر کر دیا جاتا۔[2] اس مسئلے کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث، صحابہ کے آثار، ائمہ اور تمام علمائے دین کے اقوال کثرت کے ساتھ ملتے ہیں۔ اس لیے جو یہ عقیدہ رکھتا ہو کہ اس قبر کے پاس نماز پڑھنے کی کوئی ایسی فضیلت ہے جو دوسری جگہ نماز پڑھنے کی نہیں۔ یا یہ سمجھتا ہے کہ وہاں نماز پڑھنے کے قصد سے جانا چاہیے، کیوں کہ اس کا اجر و ثواب ہے، ایسا انسان غلط سوچ اور عقیدے کا مالک اور بالاتفاق گمراہ ہے۔

اسی طرح قبر کے پاس اعتکاف کرنا اور اس کا مجاور بن کر بیٹھ جانا بھی بالاتفاق غیر مشروع ہے، یہ نہ واجب ہے نہ مستحب، بلکہ ممنوع و مذموم بدعت ہے۔ زمین کا وہ ٹکڑا جہاں اعتکاف کرنا اور جہاں مجاور بننا جائز ہے، وہ مساجد ہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَلَا تُبَٰشِرُوهُنَّ وَأَنتُمْ عَٰكِفُونَ فِى ٱلْمَسَٰجِدِ ﴾ [البقرۃ: ۱۸۷]

''اور ان سے مباشرت مت کرو جب کہ تم مسجدوں میں معتکف ہو۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی مسجد میں رمضان کا آخری عشرہ اعتکاف کرتے۔[3] ایک مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیس دن کا اعتکاف کیا،[4] اور ایک دفعہ رمضان کے آخری عشرے میں اعتکاف چھوڑ دیا اور شوال کے مہینے میں اس کی قضا دی۔[5] یہی مسلمانوں کے لیے بھی مشروع اور جائز ہے۔

غیر مسلم کی قبر کی زیارت عبرت کے لیے، دعائے مغفرت کے لیے نہیں:

قبروں کی زیارت کرنا ارشاد شدہ طریقے کے مطابق کی جائے تو جائز ہے۔ اگر مردہ کافر ہو تو موت سے

---

[1] مسند أحمد (۲۲۹/۱) سنن أبي داود، رقم الحديث (۳۲۳٦) سنن الترمذي، رقم الحديث (۳۲۰) سنن النسائي، رقم الحديث (۲۰٤۳) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (۱۵۷۵) السلسلة الضعيفة (۲۲۵)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (۱۲٦۵) صحيح مسلم، رقم الحديث (۵۲۹)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (۱۹۱٦، ۱۹۱۷) صحيح مسلم، رقم الحديث (۱۱۷۱، ۱۱۷۲)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (۱۹۳۹)

[5] صحيح البخاري، رقم الحديث (۱۹٤۰) صحيح مسلم، رقم الحديث (۱۱۷۳)

سامانِ عبرت حاصل کرنے کے لیے اس کی قبر کی زیارت بھی جائز ہے، لیکن اس کے لیے دعا نہیں کی جاتی، کیوں کہ صحیح مسلم میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میں نے اپنے رب سے اپنی ماں کی قبر کی زیارت کرنے کی اجازت مانگی تو مجھے اجازت دے دی گئی۔ میں نے اس کے لیے استغفار کی اجازت چاہی تو یہ اجازت نہ ملی، لہٰذا تم قبروں کی زیارت کیا کرو۔ یہ تم کو آخرت کی یاد دلاتی ہیں۔''[1]

آپ ﷺ نے اپنی والدہ کی قبر کی زیارت کی والد کی قبر کی نہیں، کیوں کہ فتح مکہ کے موقع پر والدہ کی قبر راستے میں آئی تھی، لہٰذا جب آپ مکہ جاتے ہوئے ان کی قبر کے پاس سے گزرے تو اس کی زیارت کی۔ روایات میں ہے کہ آپ ﷺ نے ایک ہزار مسلح لشکر کے ساتھ اپنی والدہ کی قبر کی زیارت کی، خود بھی روئے اور اپنے اردگرد کے لوگوں کو بھی رلایا۔[2] لیکن آپ اپنے والد کی قبر کے پاس سے نہیں گزرے تھے، اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان کے لیے استغفار کی اجازت بھی نہیں دی تھی، کیوں کہ استغفار مومنوں کے لیے ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ وَلَوْ كَانُوْٓا اُولِيْ قُرْبٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ﴾ [التوبة: ١١٣]

''اس نبی اور ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے، کبھی جائز نہیں کہ وہ مشرکوں کے لیے بخشش کی دعا کریں، خواہ وہ قرابت دار ہوں، اس کے بعد کہ ان کے لیے صاف ظاہر ہو گیا کہ یقیناً وہ جہنمی ہیں۔''

پھر فرمایا:

﴿ وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗٓ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ ۭ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ ﴾ [التوبة: ١١٤]

''اور ابراہیم کا اپنے باپ کے لیے بخشش مانگنا نہیں تھا مگر اس وعدہ کی وجہ سے جو اس نے اس سے کیا تھا، پھر جب اس کے لیے واضح ہو گیا کہ بے شک وہ اللہ کا دشمن ہے تو وہ اس سے بے تعلق ہو گیا۔ بے شک ابراہیم یقیناً بہت نرم دل، بڑا بردبار تھا۔''

ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ کے لیے استغفار کیا تھا، اللہ تعالیٰ نے ذکر کیا ہے، ابراہیم علیہ السلام نے کہا:

﴿ رَبَّنَا اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ يَوْمَ يَقُوْمُ الْحِسَابُ ﴾ [إبراهيم: ٤١]

''اے ہمارے رب! مجھے بخش دے اور میرے ماں باپ کو اور ایمان والوں کو، جس دن حساب قائم ہو گا۔''

ایک دوسری آیت میں استغفار کا وعدہ کیا تھا جو اس طرح ہے:

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٩٧٦)

[2] مسند أحمد (٣٥٥/٥) المستدرك للحاكم (٣٧٦/١) السنن الكبرىٰ للبيهقي (٧٦/٤)

﴿ سَلٰمٌ عَلَيْكَ سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ اِنَّهٗ كَانَ بِيْ حَفِيًّا ﴾ [مریم: ٤٧]

''تجھ پر سلام ہو، میں اپنے رب سے تیرے لیے ضرور بخشش کی دعا کروں گا، بے شک وہ ہمیشہ سے مجھ پر بہت مہربان ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے اس بات کے سوا حضرت ابراہیم علیہ السلام کو رسول اللہ ﷺ کے لیے نمونہ بنایا اور قرآن میں فرمایا:

﴿ قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاۗءُ اَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗٓ اِلَّا قَوْلَ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ لَاَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ وَمَآ اَمْلِكُ لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ﴾ [الممتحنة: ٤]

''یقیناً تمھارے لیے ابراہیم اور ان لوگوں میں جو اس کے ساتھ تھے ایک اچھا نمونہ تھا، جب انھوں نے اپنی قوم سے کہا کہ بے شک ہم تم سے اور ان چیزوں سے بری ہیں جنھیں تم اللہ کے سوا پوجتے ہو، ہم تمھیں نہیں مانتے اور ہمارے درمیان اور تمھارے درمیان ہمیشہ کے لیے دشمنی اور بغض ظاہر ہو گیا، یہاں تک کہ تم اس اکیلے اللہ پر ایمان لاؤ، مگر ابراہیم کا اپنے باپ سے کہنا (تمھارے لیے نمونہ نہیں) کہ بے شک میں تیرے لیے بخشش کی دعا ضرور کروں گا اور میں تیرے لیے اللہ سے کسی چیز (کے دلوانے) کا مالک نہیں ہوں۔''

جب اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو مشرکوں کے لیے استغفار کرنے سے منع کیا، چاہے وہ قریبی رشتے دار ہی ہوں تو کچھ لوگوں نے ابراہیم علیہ السلام کے عمل سے دلیل لینا چاہی، اللہ نے اس کا جواب بیان کر دیا اور فرمایا:

﴿ وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ اِيَّاهُ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗٓ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ ﴾ [التوبة: ١١٤]

''اور ابراہیم کا اپنے باپ کے لیے بخشش مانگنا نہیں تھا مگر اس وعدہ کی وجہ سے جو اس نے اس سے کیا تھا، پھر جب اس کے لیے واضح ہو گیا کہ بے شک وہ اللہ کا دشمن ہے تو وہ اس سے بے تعلق ہو گیا۔''

کیوں کہ ان کا باپ کافر ہی مرا تھا۔ کچھ رافضی اور جاہل قسم کے لوگ، یہ کہتے ہیں کہ وہ مسلمان مرا تھا، لیکن ان کی یہ بات کتاب و سنت اور اجماع کے خلاف ہے۔

اسی طرح رسول اللہ ﷺ کے والد اور چچا ابو طالب بھی حالتِ کفر میں فوت ہوئے تھے۔ صحیح مسلم میں ہے کہ ایک آدمی نے پوچھا: اے اللہ کے رسول! میرا باپ کہاں ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: تیرا باپ جہنم میں ہے۔ جب وہ واپس ہوا تو آپ ﷺ نے اس کو بلایا اور کہا: «إن أَبِي وَأَبَاكَ فِي النَّارِ» ''تیرے باپ کے ساتھ میرا باپ بھی جہنم میں ہے۔''[1]

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٠٣)

صحیحین میں ہے کہ جب ابو طالب کی وفات کا وقت ہوا تو رسول اللہ ﷺ اس کے پاس گئے۔ وہاں ابو جہل اور عبداللہ بن امیہ بھی بیٹھے تھے۔ آپ ﷺ نے کہا: «يَا عَمِّ قُلْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهَ، كَلِمَةً أُحَاجُّ لَكَ بِهَا عِنْدَ اللّٰهِ» ''کلمہ لا الہ الا اللہ پڑھ لے، میں اس کے ساتھ تیرے لیے اللہ کے پاس جھگڑا کروں گا۔'' ان دونوں نے کہا: اے ابو طالب! کیا تو عبدالمطلب کی ملت سے پھرنے لگے ہو؟ اس کے منہ سے نکلنے والے آخری الفاظ یہ تھے؟ عبدالمطلب کی ملت پر۔ رسول اللہ ﷺ نے کہا: میں اس وقت تک تیرے لیے بخشش طلب کرتا رہوں گا جب تک مجھے اس سے منع نہ کر دیا جائے۔'' تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرما دی:

﴿مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَنْ يَسْتَغْفِرُوا لِلْمُشْرِكِينَ وَلَوْ كَانُوا أُولِي قُرْبَىٰ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُمْ أَصْحَابُ الْجَحِيمِ﴾ [التوبة: ١١٣]

''اس نبی اور ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے، کبھی جائز نہیں کہ وہ مشرکوں کے لیے بخشش کی دعا کریں، خواہ وہ قرابت دار ہوں، اس کے بعد کہ ان کے لیے صاف ظاہر ہو گیا کہ یقیناً وہ جہنمی ہیں۔''[1]

صحیح میں ہے: حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے آنحضرت ﷺ سے کہا: اللہ کے رسول! آپ کا گمراہ بوڑھا چچا آپ کو گھیرے رکھتا تھا اور آپ ﷺ کے ساتھ حسنِ سلوک کرتا تھا، کیا آپ اس کو کچھ فائدہ پہنچائیں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''میں نے اس کو آگ کی گہرائیوں میں پایا تو اس کے لیے سفارش کی۔ اس بنا پر اس کو جہنم میں قدموں تک آگ میں کر دیا گیا۔ اگر میں نہ ہوتا تو وہ جہنم کے سب سے نچلے گڑھے میں ہوتا۔''[2]

یہ ساری صحیح احادیث ائمہ اسلام کے اس اتفاقی موقف کی تائید کرتی ہیں کہ وہ کافر ہی فوت ہوا تھا، اور ساتھ ہی ساتھ جاہل رافضیوں کے اس دعوے کی تردید بھی کرتی ہیں کہ وہ مومن فوت ہوا تھا۔ یہ لوگ سیرت ابن اسحاق میں مروی اس بات سے دلیل لیتے ہیں کہ وہ موت کے وقت آہستہ آہستہ بڑبڑانے لگا تو حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے کہا: اس نے وہ کلمہ پڑھ دیا ہے جو آپ اس سے کہہ رہے تھے، مگر صحیح بخاری کی حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ عباس رضی اللہ عنہ اس وقت وہاں موجود نہیں تھے اور ان کو اس کے گمراہ ہی مرنے کا علم تھا، اسی لیے تو انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے یہ پوچھا تھا کہ کیا اس کے کفر کے باوجود اس کی نصرت اس کو کچھ فائدہ دے گی؟ تو آپ ﷺ نے بتایا کہ آپ ﷺ کی سفارش کی وجہ سے اس نصرت نے اس کو فائدہ دیا جس کے نتیجے میں اس کے عذاب میں کمی کر دی گئی، مگر عذاب ختم نہ کیا گیا، اگر وہ حالتِ ایمان میں فوت ہوا ہوتا تو عذاب میں نہ ہوتا اور رسول اللہ ﷺ کو اس کے لیے بخشش مانگنے

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٤٩٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٦٧٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٠٩)

سے نہ روکا جاتا، پھر مزید یہ کہ اس کا ذکر حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہوتا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے بیٹے حضرت علی دونوں نے ان کا جنازہ پڑھا ہوتا، بلکہ بظاہر مسلمان اور بباطن کافر منافقوں کے لیے بھی استغفار غیر مفید اور ناجائز ہے۔ جب ان کا پتا چل جائے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ اَسْتَغْفَرْتَ لَهُمْ اَمْ لَمْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ لَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ﴾ [المنافقون: ٦]

''ان پر برابر ہے کہ تو ان کے لیے بخشش کی دعا کرے، یا ان کے لیے بخشش کی دعا نہ کرے، اللہ انھیں ہرگز معاف نہیں کرے گا۔''

نیز فرمایا:

﴿وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ ۭ اِنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَمَاتُوْا وَهُمْ فٰسِقُوْنَ﴾ [التوبة: ٨٤]

''اور ان میں سے جو کوئی مر جائے اس کا کبھی جنازہ نہ پڑھنا اور نہ اس کی قبر پر کھڑے ہونا، بے شک انھوں نے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ کفر کیا اور اس حال میں مرے کہ وہ نافرمان تھے۔''

جہاں تک اہلِ ایمان کی قبروں کی زیارت کا مسئلہ ہے تو یہ جائز، بلکہ مستحب اور سنت ہے۔

قبروں کی زیارت کی دو اقسام ہیں:

قبروں کی زیارت کی اقسام:

① شرعی زیارت۔ ② غیر شرعی زیارت یا زیارتِ بدعیہ۔

شرعی زیارت میں میت کو سلام کہا جاتا ہے اور اس کے لیے دعا کی جاتی ہے۔ مسنون دعا کے الفاظ اس طرح ہیں:

«اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ أَهْلَ دَارِ قَوْمٍ مُؤْمِنِيْنَ، وَإِنَّا إِنْ شَاءَ اللّٰهُ بِكُمْ لَاحِقُوْنَ، وَيَرْحَمُ اللّٰهُ الْمُتَقَدِّمِيْنَ مِنَّا وَمِنْكُمْ وَالْمُسْتَأْخِرِيْنَ، نَسْأَلُ اللّٰهُ لَنَا وَلَكُمُ الْعَفْوَ وَالْعَافِيَةَ، اَللّٰهُمَّ لَا تَحْرِمْنَا أَجْرَهُمْ وَلَا تَفْتِنَّا بَعْدَهُمْ، وَاغْفِرْلَنَا وَلَهُمْ»[1]

''مومن قوم کے گھر والوں کو سلام، ہم بھی اگر اللہ نے چاہا تو تمھارے پیچھے آنے والے ہیں، اللہ ہم سے اور تم سے پہلے اور بعد میں چلے جانے والوں پر رحم کرے، ہم تمھارے لیے اور اپنے لیے اللہ تعالیٰ سے عافیت اور درگزر کے طالب ہیں۔ اے اللہ! ہمیں ان کے اجر سے محروم نہ کرنا اور ان کے بعد فتنے میں نہ ڈالنا اور ہمیں اور ان کو بخش دینا۔''

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحديث (٩٧٥) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٥٤٧) مسلم و ابن ماجہ میں یہ سارے الفاظ نہیں ہیں۔

شرعی زیارت جنازے ہی کی ایک قسم ہے، کیوں کہ دونوں کا مقصود میت کے لیے دعا کرنا ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ مسلمانوں کی دعا کے ذریعے میت پر رحم کرتے ہیں اور دعا کرنے والوں پر بھی، تو جس طرح جنازہ پڑھنے والے کو ثواب ملتا ہے، اسی طرح اس شرعی زیارت کرنے والے کو بھی ثواب ملتا ہے۔ جو انسان ایمان کی حالت میں اور ثواب کی نیت سے جنازہ پڑھتا ہے اس کو ایک قیراط اجر ملتا ہے اور جو تدفین تک شریک رہتا ہے اس کو دو قیراط اجر ملتا ہے۔ [1]

اللہ سبحانہ وتعالیٰ مومنوں کی شفاعت اور میت کے لیے ان کی دعا قبول کرتے ہیں۔ صحیح حدیث میں ذکر ہوا ہے کہ جب ایک سو مومن اس کی شفاعت کریں تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے ان کی شفاعت قبول کرتے ہیں۔ [2] صحیح مسلم کی ایک دوسری حدیث میں چالیس کی شفاعت کا ذکر ہے [3] اور ایک اور حدیث میں تین صفوں کا ذکر ہے۔ [4] اس لیے مسلمان پسند کرتے تھے کہ جنازے کی صفیں تین سے کم نہ ہوں۔

مومنوں کو ایک دوسرے کے لیے دعا کرنے کا حکم ہے، بلکہ فاضل (فضیلت والا) مفضول (کم فضیلت) اور مفضول فاضل کے لیے دعا کرتا ہے۔ صحیح حدیث میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''جب تم اذان سنو تو اس کا جواب دو، پھر مجھ پر درود بھیجو۔ جو مجھ پر ایک مرتبہ درود بھیجتا ہے، اس پر اللہ دس رحمتیں کرتا ہے، پھر میرے لیے ''مقامِ وسیلہ'' کی دعا کرو۔ یہ جنت کا ایک درجہ ہے جو صرف اللہ کے ایک بندے کے لیے ہے اور میں امید رکھتا ہوں کہ وہ بندہ میں ہی ہوں گا، لہٰذا جس نے میرے لیے اللہ سے مقامِ وسیلہ کی دعا کی، وہ قیامت کے دن میری شفاعت کا مستحق بن جائے گا۔'' [5]

آپ ﷺ نے فرمایا: ''جو مومن اپنے کسی مومن بھائی کے لیے اس کی غیر موجودگی میں دعا کرتا ہے، اللہ اس کے ساتھ ایک فرشتے کی ذمے داری لگا دیتا ہے، جب وہ اپنے بھائی کے لیے کوئی دعا کرتا ہے تو فرشتہ کہتا ہے: تیرے لیے بھی اس جیسی ہو۔'' [6]

غیر شرعی زیارت کی صورت یہ ہے کہ کوئی قبر کے ساتھ چمٹے، اس پر ہاتھ پھیرے، اسے چومے، یا وہاں نماز پڑھنے، دعا کرنے اور مردے سے مرادیں مانگنے کے لیے جائے، یا اس طرح کا کوئی بھی کام کرے جو مشرک اور

---

(1) صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (٩٤٥)

(2) صحيح مسلم، رقم الحديث (٩٤٧)

(3) صحيح مسلم، رقم الحديث (٩٤٨)

(4) سنن أبي داود، رقم الحديث (٣١٦٦) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٠٢٨) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٤٩٠) ضعيف الجامع، رقم الحديث (٥٢٢٠)

(5) صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٨٤)

(6) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٣٢)

عیسائی کرتے ہوں، یہی وجہ ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے یہ دعا کی تھی: ''اے اللہ! میری قبر کو صنم نہ بنانا جس کی پوجا شروع ہو جائے۔ ایک قوم پر اللہ کا شدید غضب اترا جس نے اپنے انبیا کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا تھا۔'' (موطا)[1]

کئی ایک علمائے سلف نے اس بات کی نشاندہی کی ہے کہ بتوں کی اصل عبادت یہی تھی، انھوں نے اس آیت:

﴿وَقَالُوْا لَا تَذَرُنَّ اٰلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّلَا سُوَاعًا وَّلَا يَغُوْثَ وَيَعُوْقَ وَنَسْرًا﴾

[نوح: ٢٣]

''اور انھوں نے کہا تم ہرگز اپنے معبودوں کو نہ چھوڑنا اور نہ کبھی وڈ کو چھوڑنا اور نہ سواع کو اور نہ یغوث اور یعوق اور نسر کو۔''

کی تفسیر میں کہا ہے: ''یہ قومِ نوح کے نیک لوگوں کے نام ہیں، وہ جب فوت ہو گئے تو لوگوں نے ان قبروں پر ڈیرے ڈال لیے، اس کے بعد ان کی مورتیاں گھڑ لیں، یہی بت عربوں کے پاس پہنچ گئے، پھر اللہ نے اپنے رسول کو مبعوث کیا جس نے ایک اللہ کی عبادت کی دعوت دی، ان کو صنم پرستی وغیرہ جیسے شرک سے منع کیا اور ان کو واضح کر کے بتایا کہ اصل دین یہی ہے کہ ایک اللہ کی عبادت کی جائے اور کسی بھی چیز کو اس کے ساتھ شریک نہ بنایا جائے۔[2]

صحیح بخاری و مسلم میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے حضرت معاذ بن جبل سے کہا: ''اے معاذ! کیا تو جانتا ہے بندوں پر اللہ کا حق کیا ہے؟ انھوں نے جواب دیا: اللہ اور رسول ہی جانیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: یہ کہ اس کی بندگی کریں اور کسی چیز کو اس کے ساتھ شریک نہ بنائیں۔ کیا تو جانتا ہے جب بندے یہ کریں تو اللہ پر ان کا حق کیا ہے؟ میں نے کہا: خدا رسول ہی جانیں! فرمایا: یہ کہ ان کو عذاب نہ دے۔''[3]

صحیحین میں مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''ساٹھ یا ستر سے کچھ اوپر ایمان کی شاخیں ہیں، بلند ترین شاخ لا الہ الا اللہ کہنا اور پست ترین شاخ راستے سے تکلیف دہ چیز ہٹانا ہے، حیا بھی ایمان کی ایک شاخ ہے۔''[4]

ترمذی میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''افضل ذکر لا الہ الا اللہ اور افضل دعا الحمد للہ ہے۔''[5]

موطا میں ہے: ''میں نے اور مجھ سے پہلے نبیوں نے جو افضل بات کہی ہے وہ یہ ہے: لا إله إلا الله وحده لا شريك له، له الملك وله الحمد وهو على كل شيء قدير''[6]

---

[1] الموطأ (١٧٢/١) یہ روایت مرسل ہے۔

[2] تفسير الطبري (٦٢/٢٩)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٧٠١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٠)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٥)

[5] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٣٨٣) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٨٠٠)

[6] الموطأ (٤٢٢/١) یہ روایت مرسل ہے۔

صحیحین میں ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: ''جو ایک دن میں سو مرتبہ "لا إله إلا الله وحده لا شريك له، له الملك وله الحمد، وهو على كل شيئ قدير" پڑھتا ہے یہ اس کے لیے دس غلام آزاد کروانے کے برابر ہے، اس کے لیے سو نیکیاں لکھ دی جاتی ہیں اور اس کی سو غلطیاں مٹا دی جاتی ہیں۔ یہ (کلمات) اس کے لیے سارا دن شام تک شیطان سے ڈھال بن جاتے ہیں، کوئی اس سے افضل عمل پیش نہیں کرتا، مگر وہ جو اسی کی طرح کہے یا اس سے زیادہ کہے اور جو ایک دن میں سو مرتبہ "سبحان الله وبحمده" کہتا ہے اس کی غلطیاں مٹا دی جاتی ہیں، چاہے سمندر کی جھاگ کے برابر ہی ہوں۔''[1]

جہاں تک ایسی نذر ماننے کا سوال ہے تو یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ نذر اصلاً مکروہ اور منع ہے، اس میں مجھے ائمہ کا کوئی اختلاف معلوم نہیں، کیوں کہ رسول اللہ ﷺ نے نذر سے منع کیا اور فرمایا ہے:

«إِنَّهُ لَا يَأْتِي بِخَيْرٍ وَّإِنَّمَا يُسْتَخْرَجُ بِهِ مِنَ الْبَخِيلِ»[2]

''یہ کوئی اچھائی نہیں لاتی، بلکہ اس کے ذریعے بخیل سے (مال) نکلوا لیا جاتا ہے۔''

صحیحین میں یہ حدیث بھی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''نذر ابن آدم کو تقدیر کی طرف لے ہی آتی ہے۔ وہ نذر پر وہ دیتا ہے جو غیر نذر پر نہیں دیتا۔''[3]

آپ ﷺ نے بیان فرمایا کہ نذر نہ بھلائی لے کر آتی ہے نہ تکلیف دور کرتی ہے، لیکن نذر کے ساتھ وہ کام ہو جاتا ہے جو نذر کے بغیر بھی ہو جانا تھا اس لیے نذر بے فائدہ ہی رہتی ہے، مگر اس کے ذریعے بخیل سے کچھ نکلوا لیا جاتا ہے، کیوں کہ وہ نذر ماننے کی وجہ سے کچھ نکالنے پر مجبور ہو جاتا ہے جسے نذر کے بغیر کبھی نہ نکالتا۔

آپ ﷺ نے نذر سے اس وجہ سے منع کیا ہے کہ آدمی نذر مان کر اپنے لیے ایسی چیز لازمی کر لیتا ہے جو اس کے لیے لازمی نہیں ہوتی، پھر کبھی وہ اس کو پورا بھی نہیں کر پاتا، قابلِ ملامت ٹھہرتا ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ لَئِنْ اٰتٰىنَا مِنْ فَضْلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُوْنَنَّ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝٧٥ فَلَمَّآ اٰتٰىهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ بَخِلُوْا بِهٖ وَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝٧٦ فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِيْ قُلُوْبِهِمْ اِلٰى يَوْمِ يَلْقَوْنَهٗ بِمَآ اَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ وَبِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ﴾

[التوبة: ٧٥-٧٧]

''اور ان میں سے بعض وہ ہیں جنھوں نے اللہ سے عہد کیا کہ یقیناً اگر اس نے ہمیں اپنے فضل سے کچھ

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣١١٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٩١)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٢٣٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٤٠)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٣١٦)

عطا فرمایا تو ہم ضرور ہی صدقہ کریں گے اور ضرور ہی نیک لوگوں سے ہو جائیں گے۔ پھر جب اس نے انھیں اپنے فضل سے کچھ عطا فرمایا تو انھوں نے اس میں بخل کیا اور منہ موڑ گئے، اس حال میں کہ وہ بے رخی کرنے والے تھے۔ تو اس کے نتیجے میں اس نے ان کے دلوں میں اس دن تک نفاق رکھ دیا جس میں وہ اس سے ملیں گے۔ اس لیے کہ انھوں نے اللہ سے اس کی خلاف ورزی کی جو اس سے وعدہ کیا تھا اور اس لیے کہ وہ جھوٹ کہتے تھے۔''

اس لیے جب جس کام کے لیے نذر مانی گئی ہو، اگر وہ نیکی کا کام ہو تو اسے پورا کرنا ضروری ہوتا ہے، اگرچہ فی نفسہٖ نذر ممنوع ہے، جس طرح ظہار کرنا منع ہے، مگر جب کوئی کر لے تو اس پر کفارہ لازم ہو جاتا ہے۔ منہی عنہ (ممنوع) میں اگر کسی چیز کو لازمی کر لیا جائے یا حرام کر لیا جائے تو بطور سزا منہی عنہ لازم ہو جاتا ہے، اگر اس کام میں وجوب اور تحریم نہ ہو، بلکہ اباحت ہو تو اسے کرنا جائز نہیں ہوتا، کیوں کہ منہی عنہ معصیت اور نافرمانی ہے اور معصیت شرعی ممانعت کا سبب نہیں بنتی۔ صحیح بخاری میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو اللہ کی فرماں برداری کرنے کی نذر مانتا ہے وہ اس کی فرماں برداری کرے اور جو اللہ کی نافرمانی کرنے کی نذر مانتا ہے وہ اس کی نافرمانی نہ کرے۔''[1]

اس بنا پر اہلِ علم کا اس بات پر اتفاق ہے کہ جس کام کی نذر مانی گئی ہو، اگر وہ کوئی نیکی کا کام ہو جیسے شرعی نماز، شرعی حج، شرعی روزہ، شرعی صدقہ، شرعی طریقے کے مطابق غلام آزاد کرنا وغیرہ تو اسے پورا کیا جائے، اگر وہ کوئی نافرمانی کا کام ہو تو اسے پورا کرنا جائز نہیں ہوتا، لیکن کیا ایسے شخص پر قسم کا کفارہ ادا کرنا ضروری ہوتا ہے؟ اس میں علما کے دو اقوال ہیں:

1. امام ابوحنیفہ، مالک اور شافعی کے قول کے مطابق اس پر کچھ عائد نہیں ہوتا۔
2. امام احمد کے ظاہر مذہب میں اس پر قسم کا کفارہ عائدہ ہوتا ہے، کیوں کہ صحیح مسلم میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''نذر کا کفارہ بھی وہی ہے جو قسم کا کفارہ ہے۔''[2]

سنن میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''معصیت کے کام میں نذر ماننا نہیں اور اس کا کفارہ قسم کا کفارہ ہی ہے۔''[3]

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٦٣١٨)

[2] صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٦٤٥)

[3] سنن أبي داود، رقم الحدیث (٣٢٩٠) سنن الترمذي، رقم الحدیث (١٥٢٤) سنن النسائي، رقم الحدیث (٣٨٣٤) شیخ البانی رحمہ اللہ نے إرواء الغلیل (١/٥١٥) میں اسے صحیح کہا ہے۔

اگر یہی بات ہے تو پھر جو کسی قبر پر دیا جلانے یا قبر کے مجاوروں وغیرہ کے لیے روشنی کے لیے تیل مہیا کرنے کی نذر مانتا ہے، اس کی یہ نذر، نذرِ معصیت ہے، کیوں کہ دین میں قبروں پر دیے جلانے اور وہاں مجاور بن کر بیٹھنے سے منع کیا گیا ہے، اس لیے اس کام میں اعانت کرنا گناہ اور زیادتی کے کام میں تعاون کرنا ہے۔ کسی عالم کو اس بات میں کوئی شک نہیں کہ یہ نہ تو نیکی کا کام ہے نہ اللہ کی فرماں برداری کا۔ جب یہ نہ نیکی ہے نہ فرماں برداری تو ایسی نذر کو بالاتفاق پورا کرنا بھی ضروری نہیں، کیوں کہ صرف نیکی کی نذر پوری کرنا ضروری ہوتا ہے، حرام، مکروہ یا مباح نہیں۔

بلکہ اس بات میں بھی علما کا اختلاف ہے کہ کیا ہر نیکی کی نذر ماننا جائز ہے اور اس کو ادا کرنا ضروری ہو جاتا ہے، یا صرف اس کام کی جس کی اصل اور جنس شریعت میں واجب ہو۔ امام مالک، شافعی اور احمد جیسے اکثر فقہا نے پہلی بات اختیار کی ہے اور امام ابوحنیفہ نے دوسری بات، اس لیے ان کے نزدیک اگر کوئی شخص مسجدِ نبوی یا مسجدِ اقصیٰ جانے کی نذر مانے تو اس نذر کو پورا کرنا ضروری نہیں، کیوں کہ اس کی جنس اور اصل شریعت میں واجب ہی نہیں (یعنی شریعت میں مسجدِ اقصیٰ یا مسجدِ نبوی کی زیارت واجب نہیں) لیکن اگر کوئی حج یا عمرے کے لیے مکہ جانے کی نذر مانے تو وہ اس نذر کو پورا کرے گا، کیوں کہ حج اور عمرے کی جنس شریعت میں واجب ہے۔

جمہور علما کے قول کے مطابق جو انسان مسجدِ نبوی یا مسجدِ اقصیٰ میں نماز پڑھنے یا اعتکاف کرنے کی نذر مانتا ہے وہ اس نذر کو پورا کرے گا، ہاں اگر وہ فاضل، یعنی زیادہ فضیلت والا کام کر لیتا ہے تو مفضول، یعنی اس سے کم فضیلت والے کو کرنے سے بری اور مستغنی ہو جاتا ہے، مثلاً جس انسان نے مسجدِ نبوی یا مسجدِ اقصیٰ میں جانے کی نذر مانی وہ وہاں نہیں جاتا، لیکن مسجدِ حرام میں چلا جاتا ہے تو اس کو ان دوسری دو جگہوں پر جانے کی ضرورت نہیں رہتی، اسی طرح جو مسجدِ نبوی میں چلا جائے اس کو مسجدِ اقصیٰ جانے کی ضرورت نہیں رہتی۔ مسجدِ حرام تمام مساجد سے افضل ہے۔ کوئی دوسری جگہ اس کے قائم مقام نہیں۔ وہاں طواف کیا جاتا ہے، حج کے لیے جایا جاتا ہے اور اس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی جاتی ہے۔ قبروں پر ڈیرے لگانے والوں اور مجاوروں کی اعانت کے لیے ان کو صدقہ وغیرہ دینے کا کوئی ثواب نہیں ہوتا۔ وہ فقیر ہوں یا عوام۔ اسی طرح نماز یا تلاوت وغیرہ جیسے کسی کام کے لیے قبروں پر اکٹھ کرنے کے لیے وہاں کا رخ کرنا بھی درست اور مناسب نہیں، بلکہ اگر وہاں کوئی اکیلا نماز پڑھے تو اس سے بھی بڑا جرم ہے، کیوں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: ''میری قبر پر میلہ نہ لگانا۔''[1] قبر پر اکٹھ کرنا اور وہاں بار بار جانا، میلہ لگانا ہی ہوتا ہے۔ یہ کسی بھی عالم نے نہیں کہا کہ قبر پر قرآن پڑھنے کے لیے اکٹھا ہونا مسجدوں اور گھروں میں قرآن پڑھنے کے لیے اکٹھا ہونے اور اجتماع کرنے سے افضل ہے، بلکہ اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ مساجد اور گھروں میں قرآن کے لیے اجتماع کرنا قبروں پر اجتماع کرنے سے افضل ہے۔

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٠٤٢) صحيح الجامع، رقم الحديث (٧٢٢٦)

صحیح میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کوئی قوم اللہ کے گھر میں قرآن کی تلاوت اور پڑھائی کے لیے اکٹھ نہیں کرتی، مگر ان کو رحمت ڈھانپ لیتی ہے، ان پر سکینت نازل ہوتی ہے، فرشتے ان کو گھیر لیتے ہیں اور اللہ ان کے سامنے ان کا ذکر کرتے ہیں جو اس کے پاس ہوتے ہیں۔''[1] کسی امام نے یہ بات نہیں کہی کہ میت کو قرآن سننے کا اجر ملتا ہے، گو کچھ متاخرین سے یہ بات منقول ہے، مگر ان کا شمار ائمہ دین میں نہیں ہوتا۔ صحیح مسلم میں نبی اکرم ﷺ کا یہ فرمان موجود ہے کہ ''جب ابن آدم فوت ہو جاتا ہے تو تین اعمال: صدقہ جاریہ، فائدہ بخش علم اور دعا کرنے والے نیک بچے کے سوا اس کے اعمال منقطع ہو جاتے ہیں۔''[2]

سننا، جس کا اجر ملتا ہے، اعمال سے تعلق رکھتا ہے۔ بلاشبہہ مردہ سنتا ہے۔ یہ نصوص اور اتفاق اہلِ سنت سے ثابت ہے۔ صحیح میں یہ حدیث موجود ہے کہ ''مردہ ان کے جوتوں کی آہٹ سنتا ہے، یہاں تک کہ وہ اس سے منہ موڑ کر واپس چلے جاتے ہیں۔''[3]

آپ ﷺ نے جب بدر کے پرانے کنویں میں پھینکے گئے کافروں کو مخاطب کیا تو فرمایا:

((مَا أَنْتُمْ بِأَسْمَعَ لِمَا أَقُولُ لَهُمْ))[4] ''میں جو کہہ رہا ہوں تم اس کو ان سے زیادہ نہیں سن رہے۔''

یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ نے قبرستان جانے والے کو مردے کو سلام کہنے کا حکم دیا ہے۔ اگر وہ سلام نہ سنتا تو آپ ﷺ اس کو سلام کہنے کا حکم نہ دیتے۔ ابن عبدالبر کا قول ہے: ''آپ ﷺ کی یہ حدیث ثابت ہے کہ جو آدمی کسی ایسے آدمی کی قبر کے پاس سے گزرتا ہے جس کو وہ دنیا میں جانتا ہے، پھر اس کو سلام کہتا ہے تو اللہ سلام کا جواب دینے کے لیے اس میں اس کی روح لوٹا دیتا ہے۔''[5] لیکن اس ادراک سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کو اس کا اجر وثواب بھی ملتا ہے، گو میت کو بعض باتیں سننے سے آرام و آسایش ملتی ہے جس طرح کسی کے نوحہ کرنے سے اس کو تکلیف ہوتی ہے۔ تاہم اس کو یہ تکلیف کسی کے نوحہ کرنے کی سزا کے طور نہیں ہوتی، کیوں کہ یہ اس کا عمل نہیں، بلکہ یہ ان تکلیفوں کی نوع سے ہے جو بندے کو دوسرے کے عمل کی وجہ سے بھگتنا پڑتی ہیں، مثلاً: گندی بوئیں سونگھنا، بری آوازیں سننا، خوف ناک اشیا دیکھنا وغیرہ۔

اگر میت کو اس سننے کا اجر ملتا تو صحابہ، تابعین اور ائمہ اسلام اس پر عمل کرنے کے زیادہ حق دار تھے۔

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٦٩٩)

[2] صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٦٣١)

[3] صحیح البخاري، رقم الحدیث (١٣٠٨) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٨٧٠)

[4] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٣٧٥٧) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٨٧٥)

[5] الاستذکار لابن عبد البر (٢٣٤/١) السلسلة الضعیفة (٤٤٩٣)

وہ ختمِ قرآن کے لیے قبر کے پاس اکٹھے نہیں ہوتے تھے، جس طرح کچھ متاخرین کرتے ہیں، بلکہ قبر کے پاس قرآن خوانی کے بارے میں علمائے کرام کا اختلاف ہے۔ یہ امام ابو حنیفہ، مالک اور اکثر روایات کے مطابق امام احمد کے ہاں مکروہ ہے۔ امام احمد نے دوسری روایت میں اس کی رخصت دی ہے، کیوں کہ انھیں معلوم ہوا کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے یہ وصیت کی تھی کہ ان کو دفن کرتے وقت سورت بقرہ کی ابتدائی اور آخری آیات پڑھی جائیں۔ یہ رخصت یا مطلقاً ہے یا خاص طور پر دفن کرتے وقت، لیکن اس کو باقاعدہ سنت اختیار کرنا کسی بھی امام کا مذہب نہیں۔

اگر ثواب کی نیت سے قرآن خوانی کرنے کی یہ حیثیت ہے تو اجرت اور کرائے پر قرآن پڑھنا کیا حیثیت رکھتا ہوگا، بلکہ قرآن، فقہ اور حدیث کی تدریس اور اذان، امامت اور کسی دوسرے کے لیے حج کرنے کے لیے کسی کو اجرت پر ملازم رکھنے سے متعلق بھی علما کا اختلاف ہے، امام شافعی کے مذہب میں یہ جائز ہے۔ امام مالک کا مذہب بھی جواز کے قریب ہی ہے اور امام ابو حنیفہ وغیرہ کے مذہب میں یہ ناجائز ہے۔ امام احمد سے بھی مشہور تر روایت یہی ہے اور ان سے ایک تیسرا قول بھی منقول ہے کہ یہ ضرورت مند کے لیے جائز ہے، مالدار کے لیے نہیں، جس طرح یتیم کی سرپرستی کرنے والے کا حکم ہے:

﴿ وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ ۖ وَمَنْ كَانَ فَقِيرًا فَلْيَأْكُلْ بِالْمَعْرُوفِ ۚ ﴾ [النساء: ٦]

''اور جو غنی ہو تو وہ بہت بچے اور جو محتاج ہو تو وہ جانے پہچانے طریقے سے کھا لے۔''

وجہ اختلاف یہ ہے کہ وہ اعمال جو صرف اہلِ قربت (مسلمانوں) کے ساتھ خاص ہوں (یعنی وہ کوئی نیکی اور عبادت کا کام ہو جس کو کر کے بندہ اللہ کا قرب حاصل کر سکتا ہو اور اس عمل کو صرف مسلمان کر سکتا ہو) انھیں حصولِ قربت کے علاوہ کسی اور غرض سے سرانجام دینا جائز ہے یا نہیں؟ جو کہتے ہیں: ایسا کرنا جائز نہیں، ان کے نزدیک ان میں (اجارہ) اجرت لینا بھی جائز نہیں۔ یہ اعمال عوض اور اجرت لینے کی وجہ سے حصولِ قرب کے طور پر سرانجام نہیں دیے جائیں گے، کیوں کہ اعمال کا دار و مدار نیتوں پر ہوتا ہے۔ ہر شخص کے لیے وہی ہوتا ہے جو اس نے نیت کی ہوتی ہے اور اللہ صرف وہ عمل قبول کرتا ہے جس میں خالص اس کی رضا مقصود ہو۔ جن علما نے ان کاموں میں اجارہ جائز کہا ہے، انھوں نے ان اعمال کو قربِ الٰہی کے علاوہ کسی اور مقصد کے طور پر سرانجام دینا بھی جائز کہا ہے۔ ان پر اجارہ درست نہیں، کیوں کہ ان میں اجرت پر رکھنے والے کا فائدہ ہے۔ قرآن خوانی کے لیے اجرت پر بلوانا اس باب سے تعلق نہیں رکھتا۔

علمائے کرام کا اتفاق ہے کہ صدقہ کرنا، غلام آزاد کرنا اور اس طرح کی دیگر مالی عبادات میت کو پہنچتی ہیں، البتہ نماز، روزے اور قرآن خوانی جیسی بدنی عبادات کے ایصال میں اختلاف ہے۔ جس نے صرف اس کو جائز کہا ہے تو عملِ صالح کا ثواب ہونا، جو صرف اللہ کی رضا کے لیے ہو، ضروری ہے۔ اگر عبادت محض معاوضے اور اجرت کے

لیے سرانجام دی جائے، مثلاً کوئی کسی کو اپنی نماز پڑھنے، روزہ رکھنے یا قرآن خوانی کا معاوضہ دے تو وہ عبادت قربِ الٰہی کے حصول کے طور پر سرانجام نہیں دی گئی، اس لیے نہ اس کا ثواب ہے نہ اس کا ایصال کیا جا سکتا ہے۔

لیکن بذاتِ خود قرآن حفظ کرنا اور پڑھنا پڑھانا مقصود و مطلوب اعمال سے تعلق رکھتا ہے اور اس کام میں خرچ کرنا نیکی اور اللہ کی اطاعت کا کام ہے جس طرح جہاد اور روزے وغیرہ میں مسلمانوں کی اعانت کرنا نیکی اور فرماں برداری کا کام ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''جس نے روزے دار کو روزہ کھلوایا، اس کو اس کے برابر اجر ملتا ہے۔''[1] آپ ﷺ کا یہ فرمان بھی ہے: ''جس نے کسی غازی کو تیار کیا اس نے خود لڑائی لڑی اور جس نے اس کے پیچھے اس کے اہل و عیال کے ساتھ بھلائی کی اس نے خود لڑائی لڑی۔''[2] لہٰذا تلاوتِ قرآن اور تبلیغِ قرآن وغیرہ میں مسلمانوں کی مالی اعانت کرنا جائز اور اچھا عمل ہے۔

جب لوگ بدل گئے تو انھوں نے شرعی کام چھوڑ کر بدعت اختیار کر لی۔ اگر بدعت میں کوئی ایسی مصلحت ہو کہ اس بدعت کو چھوڑ دینے کی صورت میں وہ مصلحت بھی ختم ہو جائے اور لوگ مشروع اور جائز کام بھی نہ کریں تو ایسی صورت میں اس مشروع کام کا حکم دینا جو اس مصلحت کا سبب ہو، ضروری ہو جاتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس بدعت سے بھی منع کیا جائے۔ اگر ایسا ممکن نہ ہو تو جو ممکن ہو وہ کیا جائے اور راجح کو مقدم رکھا جائے۔ اگر فعل کی مصلحت اہم ہو تو اس سے نہ روکا جائے، کیوں کہ روکنے میں مفسدت اور خرابی ہو گی اور مصلحت حاصل کر لی جائے۔ اگر فعل کی مفسدت اہم ہو تو اس سے روکا جائے۔

بنابریں تربتوں پر جو دولت وقف کی جاتی ہے اس میں ایک مصلحت تو یہ ہے کہ قرآن کریم کو حفظ کیا جاتا ہے، اس کی تلاوت کی جاتی ہے اور اس میں اس کی بقا کا سامان ہے۔ یہ اموال اس کام کے لیے خاص ہوتے ہیں، کیوں کہ ایسا ممکن ہے کہ کسی علاقے اور ملک میں ایسے اسباب نہ ہونے کی وجہ سے حفظِ قرآن کا سلسلہ مٹ جائے۔ یہ تو مصلحت تھی، اس کام میں کئی مفاسد بھی ہیں، مثلاً: غیر اللہ کے لیے قرآن خوانی کا امکان، قرآن کو روٹی کا ذریعہ بنانا، ناجائز طریقے سے قرآن خوانی کرنا اور اس کے نتیجے میں لوگوں کا شرعی قرآن خوانی سے منہ موڑنا۔ جب ان مفاسد کے بغیر اس مصلحت کو حاصل کرنا ممکن ہو اس وقت اس سے روکنا اور اس کو ختم کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ اگر یہ سمجھا جائے کہ اس کے نتیجے میں کوئی بڑی مفسدت اور خرابی رونما ہو جائے گی تو دو خرابیوں میں سے ادنیٰ خرابی کو، اعلیٰ اور بڑی خرابی کے احتمال کے ساتھ نہ دور کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ بوڑھے زانی، جھوٹے بادشاہ اور متکبر فقیر کے بارے

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٨٠٧) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٧٤٦) صحيح الجامع (٦٤١٥)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٦٨٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٨٩٥)

میں سخت وعید وارد ہوئی ہے۔ صحیح مسلم میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تین لوگ ایسے ہیں جن سے اللہ بات کرے گا نہ ان کی طرف دیکھے گا اور نہ ان کو پاک ہی کرے گا، ان کے لیے دردناک عذاب ہے: ایک بوڑھا زانی، جھوٹا بادشاہ اور متکبر فقیر۔''[1] کیوں کہ ان لوگوں کے حق میں ان گناہوں کا موجب اور سبب بہت کمزور ہے۔

چنانچہ جو مومن رضائے الٰہی کا خواہاں ہو اور چاہتا ہو کہ اللہ اس کو ثواب دے اور اس کے فوت شدہ پر رحم کرے تو وہ اس کی طرف سے صدقہ کرے۔ اس کے لیے وہ ایسے شخص کا انتخاب کرے جو اس مال کو قرآن کریم کی تعلیم جیسے مفادِ عامہ سے وابستہ کام اور افراد پر خرچ کر سکتا ہو، لیکن وہ ان پر میت کو ایصالِ ثواب کرے یا قبر کے پاس قرآن خوانی کرنے یا اس طرح کا کوئی کام کرنے کی شرط نہ لگائے جو عمل کو خالص اللہ کی رضا کے لیے کرنے سے نکال دے یا اس کو غیر شرعی بنا دے۔ صحیحین میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ ''ایک آدمی نے رسول اللہ ﷺ سے کہا: میری ماں کی جان نکل گئی۔ میرا خیال ہے اگر وہ بات کرتی تو صدقہ کرتی۔ اگر میں اس کی طرف سے صدقہ کر دوں تو کیا اس کو ثواب ملے گا؟ فرمایا: ہاں۔''[2]

صحیح بخاری میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ''سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کی غیر موجودگی میں ان کی والدہ وفات پا گئیں اور وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور کہنے لگے: میری غیر موجودگی میں میری والدہ فوت ہوگئی ہے۔ اگر میں اس کی طرف سے صدقہ کروں تو کیا اس کو کوئی فائدہ ہو گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں۔ تو انھوں نے کہا: میں آپ کو گواہ بناتا ہوں کہ میرا مخراف باغ اس کی طرف سے صدقہ ہے۔''[3]

تیجے، ساتویں اور برسی منانے اور مرنے والے پر رونے کا حکم:

تیسرے دن، ساتویں دن، ماہانہ اور سالانہ اجتماع وغیرہ جس کا سوال میں ذکر ہوا ہے، بدعت ہے اور کئی پہلوؤں سے مکروہ ہے۔ ایک یہ ہے: ماتم کے موقع پر غمگین اشعار پڑھنا ایک طرح کی نوحہ خوانی ہے۔ اسی طرح ہر وہ کام جو مصیبت کو دوآتشہ کر دے، اسی ضمن میں شمار ہوگا۔ اس موقع پر جن کو واعظین کہا جاتا ہے وہ درحقیقت نوحہ خواں ہوتے ہیں۔ اگر عورتوں کو کمزور دل ہونے کے باوجود اس سے منع کیا گیا ہے، حالانکہ عورتوں کو ایک حد تک گانے اور بجانے کی اجازت ہے جو مردوں کو نہیں تو مردوں کو کیسے اجازت ہوگی؟ شریعت نے آنکھ سے بہنے والے آنسو اور دل سے پھوٹنے والے دکھ سے منع نہیں کیا، کیوں کہ اس کو روکنا ممکن نہیں ہوتا۔ عورتوں کو سدِ ذرائع کے طور پر جنازے میں

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٧)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٦٠٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٠٤)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٦٠٥)

شریک ہونے اور قبروں کی زیارت جیسے نوحہ پر بھڑکانے والے تمام اسباب سے روکا گیا ہے اور مردوں کو مضبوط دل کے مالک ہونے کی وجہ سے ان کاموں سے نہیں روکا گیا۔ اس سے معلوم ہوا مردوں کے لیے نوحہ گری کی ممانعت عورتوں سے بھی زیادہ ہے، کیوں کہ اس معاملے میں عورتوں کی نسبت ان کا عذر کم ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی چھوٹی مصیبت میں نوحہ کرتا ہے تو وہ کسی بڑی مصیبت میں نوحہ کرنے والے سے زیادہ حق رکھتا ہے۔

صحیح مسلم میں ابو مالک اشعری سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میری امت میں چار جاہلیت کے کام ہیں، جن کو وہ نہیں چھوڑیں گے: ① حسب پر فخر کرنا ② نسبوں میں طعن و تنقید کرنا ③ ستاروں سے بارش طلب کرنا اور ④ نوحہ گری۔''[1]

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اگر نوحہ کرنے والی نے مرنے سے پہلے توبہ نہ کی تو قیامت کے دن اس کو خارش زدہ قمیص اور گندھک کا کرتا پہنایا جائے گا۔''[2]

میت پر صرف اتنا رونے کی اجازت ہے جس میں آنکھ سے آنسو ٹپک پڑے اور دل غمزدہ ہو جائے، اس کے باوجود غم کی وجہ سے رونے کی کوشش کرنا مناسب نہیں، رحمت کے لیے رونے کے عکس۔ ایسی حالت میں زبان سے الفاظ نکالنا اور چہرے پر تھپڑ مارنا منع ہے، لہٰذا اس کام کی اعانت کرنا کیسے جائز ہوسکتا ہے۔

صحیحین میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ بیمار ہو گئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عبدالرحمان بن عوف، سعد بن ابی وقاص اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم کی معیت میں ان کی عیادت کے لیے تشریف لائے۔ جب آپ اکیلے میں ان کے پاس آئے جب کہ وہ بے ہوش تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: کیا یہ فوت ہو گئے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا گیا: نہیں۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم رو پڑے۔ جب لوگوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو روتے دیکھا تو رونا شروع کر دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیا تم سنتے نہیں؟ اللہ آنکھ کے آنسو اور دل کے غم کی وجہ سے عذاب نہیں دیتا، لیکن اس کے ساتھ یعنی زبان کے ساتھ عذاب دیتا ہے یا رحم کرتا ہے۔''[3]

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی زینب فوت ہوئی تو عورتوں نے رونا شروع کر دیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو اپنے کوڑے سے مارنا شروع کر دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا ہاتھ پکڑا اور فرمایا: عمر! رک جاؤ۔ پھر فرمایا: عورتو! تم شیطان کی آواز نکالنے سے باز آ جاؤ۔ پھر فرمایا: جو آنکھ اور دل سے ظاہر ہو وہ اللہ کی

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٩٣٤)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٩٣٤)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٢٤٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٩٢٤)

طرف سے اور رحم دلی کی وجہ سے ہوتا ہے اور جو ہاتھ اور زبان سے صادر ہو وہ شیطان کی طرف سے ہوتا ہے۔''[1]

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبدالرحمان بن عوف رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پکڑا اور اپنے بیٹے ابراہیم کی طرف چل دیے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو جان کنی کے عالم میں پایا تو اٹھا کر اپنی گود میں رکھ لیا اور رو پڑے۔ عبدالرحمان بن عوف رضی اللہ عنہ نے تعجب سے کہا: آپ رو رہے ہیں؟! کیا آپ نے رونے سے منع نہیں کیا ہوا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں، لیکن میں نے دو احمق اور فاجر آوازوں سے روکا ہے: « صَوْتٍ عِنْدَ مُصِيبَةٍ خَمْشِ وُجُوْهٍ وَشَقِّ جُيُوْبٍ وَرَنَّةِ الشَّيْطَانِ » (رواه الترمذي وقال حديث حسن)[2] باقی محدثین نے بایں الفاظ: «وَصَوْتٍ عِنْدَ نَغْمَةٍ لَهْوٍ وَّلَعْبٍ وَمَزَامِيرَ الشَّيْطَانِ»[3] مکمل ذکر کی ہے۔

صحیحین میں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے رخساروں پر مارا، گریبان چاک کیے اور جاہلیت کی باتیں کی، وہ ہم سے نہیں۔''[4]

بازاروں میں قرآن پڑھنا:

بازاروں میں چلتے پھرتے قرآن پڑھنا اور اس کے ساتھ پیسے اکٹھا کرنا دو پہلوؤں سے منع ہے:

1. لوگوں سے مانگنے کے لیے قرآن پڑھنا۔ حدیث میں ہے:

«اِقْرَأُوا الْقُرْآنَ وَاسْأَلُوا بِهِ اللّٰهَ قَبْلَ أَنْ يَّجِيْئَ أَقْوَامٌ، يَقْرَأُوْنَهُ وَيَسْأَلُوْنَ بِهِ النَّاسَ »[5]

''قرآن پڑھو اور اس کے ذریعے اللہ سے مانگو، اس سے پہلے کہ ایسے لوگ آجائیں جو قرآن پڑھیں اور اس کے ساتھ لوگوں سے مانگیں۔''

2. یہ کام قرآن کے ابتذال اور ناقدری کا باعث ہے، کیوں کہ بازاروں میں مصروف لوگ اسے توجہ سے اور کان لگا کر سن نہیں پائیں گے۔

حدیث: ''اہلِ میت کے رونے سے میت کو تکلیف ہونا'' کی تشریح:

یہ حدیث کہ ''اہلِ میت کے رونے سے میت کو عذاب ہوتا ہے جس پر نوحہ کیا جائے اس کو ایسا ہی عذاب ملتا

---

[1] مسند أحمد (٢٣٧/١) مسند الطيالسي (٣٥١/١) السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٣٣٦١)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (١٠٠٥) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢١٥٧)

[3] المستدرك للحاكم (٤٣/٤) مصنف ابن أبي شيبة (٦٢/٣) السنن الكبرىٰ للبيهقي (٦٩/٤) علامہ ہیثمی رحمہ اللہ نے مجمع الزوائد (١٧٣) میں کہا ہے کہ اس کی اسناد میں محمد بن عبدالرحمن بن ابی لیلیٰ سیئ الحفظ ہے اور باقی رجال ثقہ ہیں۔

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٢٣٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٣)

[5] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٩١٧) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٥٧٠)

ہے جیسا اس پر نوحہ کیا جاتا ہے۔'' صحیح ہے۔ [1] اور عبداللہ بن عمر، عمر بن خطاب اور مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہم وغیرہ سے مروی ہے، لیکن یہ ایک مشکل حدیث ہے اور کئی لوگوں کے لیے اس کا معنی سمجھنا دشوار ہوا ہے، اس لیے اس میں کئی اختلافی آراء ہیں:

1. کچھ نے اس کو رد کیا ہے اور یہ اعتراض کیا ہے کہ اس کا راوی اس کو محفوظ نہیں رکھ سکا۔ یہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور ان کے ہم خیال علما کی رائے ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے کتاب ''مختلف الحدیث'' میں یہی رائے اپنائی ہے، پھر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس کو دو الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے جن میں سے ایک اس کے معنی کے مناسب ہے۔

وہ الفاظ یہ ہیں:

«إِنَّ اللّٰهَ يَزِيْدُ الْكَافِرَ بِبُكَاءِ اَهْلِهِ عَلَيْهِ» [2]

''اللہ کافر کے اہلِ خانہ کے اس پر رونے کی وجہ سے اس کے عذاب میں اضافہ کر دیتا ہے۔''

ان کے نزدیک اس حدیث کے کمزور ہونے کی یہ وجہ ہے کہ اللہ نے قرآن میں فرمایا ہے:

﴿ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ﴾ [الأنعام: ١٦٤]

''اور نہ کوئی بوجھ اٹھانے والی کسی دوسری کا بوجھ اٹھائے گی۔''

تاہم جمہور سلف و خلف جانتے ہیں اس جیسی تاویل کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت احادیث کو رد کر دینا مناسب نہیں، چاہے ان کے راوی جابر اور ابوسعید جیسے صغار (چھوٹے) صحابی ہی ہوں۔ لیکن اگر راوی حضرت عمر جیسے جلیل القدر ہوں تو پھر اس کو کیسے رد کیا جا سکتا ہے؟

تفصیل اس طرح ہے کہ آیتِ مذکورہ: ﴿ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ﴾ [الأنعام: ١٦٤] میں یہ ذکر ہوا ہے کہ گناہ گار کا بوجھ کوئی دوسرا نہیں اٹھاتا، یہ معنی صحیح ہے اور حدیث کے مخالف نہیں۔ حدیث میں یہ قطعاً ذکر نہیں کہ میت زندہ کے گناہ کا بوجھ اٹھاتی ہے، بلکہ زندہ نوحہ کرنے والے کو اپنے نوحہ کرنے کی سزا ملے گی جس کو میت اس کی طرف سے نہیں اٹھاتی جس طرح قرآن سے ثابت ہے۔ البتہ میت کا کسی دوسرے کے عمل سے اذیت محسوس کرنا ایک بالکل دوسری بات ہے جس طرح وہ کسی دوسرے کے عمل کی وجہ سے آسودگی محسوس کرتی ہے۔ یہ چیز اس آیت:

﴿ وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسٰنِ اِلَّا مَا سَعٰى ﴾ [النجم: ٣٩]

''اور یہ کہ انسان کے لیے وہی ہے جس کی اس نے کوشش کی۔''

کے مخالف و منافی نہیں۔

---

1. صحيح البخاري، رقم الحديث (١٢٢٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٩٢٧، ٩٣٣)
2. صحيح ابن حبان (٤٠٥/٧)

کچھ لوگ یہ تاویل کرتے ہیں کہ اگر لوگ اس کام کے عادی ہوں اور مرنے والا مرنے سے پہلے ان کو اس سے نہ روکتا ہو تو یہ ایک طرح سے اس کی طرف سے اس کا اقرار سمجھا جائے گا، اس لیے اس کو عذاب ہوتا ہے۔ یہ لوگ میت کے اس عذاب کو اس کے عمل کی سزا سمجھتے ہیں اور سزا کے لیے چونکہ گناہ کا ہونا ضروری ہے، اس لیے انھوں نے میت کے لیے گناہ گھڑ لیا ہے جس کی اس کو سزا ملنی چاہیے، لیکن ایسا نہیں۔ عذاب کبھی تو گناہ کی سزا کے طور پر ہوتا ہے اور کبھی سزا کے طور پر نہیں ہوتا۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«اَلسَّفَرُ قِطعَةٌ مِنَ الْعَذَابِ »[1] ''سفر عذاب کا ایک ٹکڑا ہے۔''

نبی اکرم ﷺ نے یہ نہیں کہا: اس کو سزا دی جاتی ہے، بلکہ آپ ﷺ نے کہا ہے: اس کو عذاب دیا جاتا ہے۔

اس حدیث کی تفسیر صحیح بخاری میں نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کی اس حدیث سے بھی ہوتی ہے کہ ''عبداللہ بن رواحہ بے ہوش ہو گئے تو ان کی بہن نے رونا شروع کر دیا اور ساتھ کہتی: ہائے افسوس! اس پہاڑ پر! افسوس یہ کتنا عظیم تھا! اس طرح وہ اس کے مناقب ذکر کرنے لگی۔ جب ان کو ہوش آیا تو بہن سے کہنے لگے: تو جو کہتی تھی، مجھ سے کہا جاتا تھا: کیا تو ایسا ہی ہے؟ جب وہ فوت ہوئے تو پھر وہ ان پر بالکل نہ روئی۔''[2]

حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''میت کو زندہ کے رونے کی وجہ سے عذاب دیا جاتا ہے۔ جب نوحہ کرنے والی کہتی ہے: ہائے افسوس، اس تقویت پہنچانے والے، مدد کرنے والے اور پہنانے والے پر! میت کو کھینچا جاتا ہے اور اس سے پوچھا جاتا ہے: کیا تو اس کا بازو، اس کا مددگار اور اس کو پہنانے والا ہے۔'' (رواه أحمد)[3]

ترمذی میں حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''جو مرنے والا مرتا ہے اور اس پر رونے والا کھڑا ہو کر کہتا ہے: ہائے افسوس! اس پہاڑ پر وغیرہ وغیرہ تو اس پر دو فرشتوں کی ذمے داری لگا دی جاتی ہے جو اس کو ٹھوکتے ہیں اور کہتے ہیں: کیا تو ایسا ہی ہے؟'' (قال الترمذي حديث حسن غريب)[4]

سنن ابو داود میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک جنازے میں عورتوں سے کہا: ''گناہ گار ہو کر لوٹو، اجر کے ساتھ نہیں، تم زندہ کو فتنے میں ڈالتی ہو اور مردے کو اذیت دیتی ہو۔''

میت کو نوحہ کی وجہ سے جو عذاب ہوتا ہے وہ اس نوعیت کا ہوتا ہے۔ بسا اوقات زندہ انسان بھی کسی چیز کو دیکھ کر یا سن کر یا سونگھ کر عذاب میں مبتلا ہو جاتا ہے اور یہ سارے امور اس سے علاحدہ ہوتے ہیں۔ یہ تعذیب کسی فتنے کی

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٧١٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٩٢٧)
[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٠١٩)
[3] مسند أحمد (٤١٤/٤) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٥٩٤) المستدرك للحاكم (٤٧١/٢) صحيح الترغيب والترهيب (٢٠٩/٣)
[4] سنن الترمذي، رقم الحديث (١٠٠٣) صحيح الجامع (٥٧٨٨)

ہولنا کی، دباؤ، قیامت کی ہولنا کی اور اس طرح کی تکلیفوں کی نوع سے ملتی جلتی ہے۔ اس مسئلے کی تفصیل کسی دوسرے مقام پر گزر چکی ہے۔

یہ سوال کہ ''اللہ آنکھ سے بہنے والے آنسو اور دل کے غم پر مواخذہ نہیں کرتا، بلکہ اس (زبان) کی وجہ سے مواخذہ کرتا یا رحم کرتا ہے۔''[1] بالکل صحیح بات ہے اور اس حدیث کے ہم معنی ہے جو پہلے گزر چکی ہے کہ ''جو ہاتھ اور زبان سے ہو وہ شیطان کی طرف سے ہے اور جو آنکھ اور دل سے ہو تو وہ اللہ کی طرف سے ہے۔''[2] میت کو اس کام کا عذاب ملتا ہے جس سے اس کو منع کیا گیا ہو، اس پر نہیں جو اس کے لیے جائز ہو۔ اس لیے اس کی تفسیر نوحہ کے ساتھ وارد ہوئی ہے، یعنی آواز کھینچ کر رونا۔ آواز پست ہو تو یہ آنسو ہے۔ الفاظ میں اضافہ معنی میں اضافہ کی طرح ہوتا ہے۔ یہ شعر پڑھا جاتا ہے:

بكت عيني وَحُقَّ لها بُكاها　　　وما يغني البُكَاءُ ولا العَوِيل

''میری آنکھ روئی اور اس کو رونے کا حق ہے، لیکن رونا اور چیخنا کسی کام نہ آیا۔''

جو انسان مسجد میں نماز پڑھ رہا ہو، تلاوت کر رہا ہو، حدیث پڑھا رہا ہو، فتویٰ دے رہا ہو اور اس طرح کا کوئی بھی کام کر رہا ہو جس کے لیے مسجد بنائی جاتی ہے تو یہ لوگ اپنی آواز بلند کر کے ایک دوسرے کو اذیت نہ دیں۔ سنن میں حدیث ہے: ''نبی اکرم ﷺ اپنے صحابہ کی طرف نکلے، وہ نماز پڑھ رہے تھے اور بلند آواز سے قرآن پڑھ رہے تھے تو آپ ﷺ نے فرمایا: لوگو! تم میں سے ہر کوئی اپنے رب سے سرگوشی کر رہا ہے، لہٰذا ایک دوسرے کے اوپر بلند آواز سے قرآن نہ پڑھو۔''[3]

آپ ﷺ نے نمازیوں کو بلند آواز سے قرآن پڑھنے سے روک دیا، تاکہ دوسروں کو تشویش نہ ہو، اس کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ لوگ نماز پڑھ چکے ہوں اور ذکر میں مشغول ہوں۔ ایسے میں کوئی بعد میں اکیلا نماز پڑھے یا جس کی رکعت چھوٹ گئی تھی، وہ اپنی رکعت پوری کرے تو بلند آواز سے قرآن پڑھنا شروع کر دے، جس سے دوسرے تشویش محسوس کریں۔

اکثر علما کے نزدیک اکیلے نماز پڑھنے والے کے لیے بلند آواز میں قرآن پڑھنا مستحب نہیں۔ امام احمد سے مشہور روایت یہی ہے۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٢٤٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٩٢٤)

[2] مسند أحمد (٢٣٧/١) السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٣٣٦١)

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٣٣٢) شیخ البانی رحمہ اللہ نے اسے صحیح کہا ہے۔

جہر اور با آوازِ بلند تلاوتِ قرآن اس امام کے لیے جائز ہے جس کو مقتدی سنیں، اس لیے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: ''جب وہ پڑھے تو تم خاموش ہو جاؤ۔''[1] جن علما کے نزدیک اکیلے نمازی کے لیے با آواز بلند پڑھنا مستحب ہے وہ اس کو اتنا بلند پڑھنے سے روکتے ہیں جس سے دوسرا تشویش محسوس کرے، کیوں کہ رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع کیا ہے، بلکہ بالکل تھوڑی آواز بلند کرے یا اسے چھوڑ ہی دے، کیوں کہ بلند آواز سے پڑھنے میں دوسرے کو اذیت دینا ہے جو منع ہے۔

دیکھیے حجرِ اسود کو چھونا اور بوسہ دینا مستحب ہے، لیکن جب وہاں بھیڑ ہو اور ایسا کرنے سے لوگوں کو اذیت دی جائے تو اس سے منع کیا جاتا ہے۔ جس طرح رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس سے منع کیا تھا۔ مسند میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا: اے عمر! تو طاقتور آدمی ہے، حجرِ اسود پر بھیڑ نہ کر کہ تو کمزور کو تکلیف دے۔ اگر خلوت میسر ہو تو اس کو چھو لے، ورنہ اس کی طرف منہ کر اور لا إله إلا الله اور الله أكبر کہہ۔''

عبدالرحمان بن عوف رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب ہم بیت اللہ کے طواف سے فارغ ہو گئے تو رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے کہا: اے ابو محمد! تم نے حجرِ اسود کو چھوتے وقت کیا کہا؟ میں نے کہا: میں نے اس کو چھوا اور چھوڑ دیا، آپ ﷺ نے فرمایا: تم نے ٹھیک کیا۔ (صحیح ابن حبان، معجم طبرانی)[2]

مزید یہ کہ تلبیہ پڑھتے وقت اور اذان دیتے وقت آواز بلند کرنا سنت ہے، لیکن عورت کی آواز بلند کرنے میں خرابی ہے، اس لیے جس کام میں خرابی اور مفسدت ہو اس سے روک دیا جاتا ہے، اس بنا پر عورت کو تلبیہ پڑھتے وقت صرف اتنی آواز بلند کرنے کا حکم ہے جس کو اس کی ساتھی سن سکے۔ شریعت میں اس کی مثالیں کافی ہیں۔ والله أعلم[3]

پیروں کی تعظیم کرنے، ان سے فریاد کرنے اور ان کی قبروں پر جانے کا حکم

سوال کچھ لوگ مشائخ یعنی پیروں کی اس طرح تعظیم کرتے ہیں کہ مشکلات میں ان سے مدد طلب کرتے ہیں، ان کے سامنے گڑگڑاتے ہیں، ان کی قبروں کی زیارت کرتے ہیں، ان کو چومتے ہیں اور ان کی مٹی سے برکت لیتے ہیں، وہاں ساری رات چراغ جلائے رکھتے ہیں اور شبِ حیات کے نام سے میلہ لگاتے ہیں جس میں شرکت

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٦٠٤) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٨٤٦) صحيح الجامع (٢٣٥٨) امام ابو داود کے بیان کے مطابق ''وإذا قرأ فانصتوا'' کی زیادتی محفوظ نہیں ہے، اس کے راوی ابو خالد کا وہم ہے۔

[2] الموطأ (٣٦٦/١) المستدرك للحاكم (٣٤٦/٣، ٣٤٧) المعجم الكبير (١٢٧/١) المعجم الصغير (٣٨٨/١) موارد الظمآن (٢٤٧/١) علامہ ذہبی رحمہ اللہ نے مستدرک کی تلخیص میں اس روایت کے ضعف کی وجہ سے اسے حذف کر دیا ہے۔

[3] جامع المسائل (١١٩/٣-١٤٢)

کے لیے لوگ دور دراز سے آتے ہیں اور وہاں چڑھاوے چڑھاتے اور نماز پڑھتے ہیں۔

کیا یہ کام حرام ہے یا مکروہ ہے؟ نیز کیا مشائخ کو ان کے ان کاموں کی تصویب و تائید کرنی چاہیے یا ان سے روکنا چاہیے؟ وہ اپنے مریدوں کو کیا تعلیم دیں اور کیا نصیحت کریں، کیا وہ دوسرے شہروں میں رہنے والے لوگوں کو اپنی سندِ مشیخت (خلافت) دے سکتے ہیں؟ نیز سانپ اور آگ پکڑنے وغیرہ جیسے کاموں پر ان کی تائید کرنی چاہیے یا نہیں؟ وہاں جو ائمہ مساجد حاضر ہوتے، سماع میں شرکت کرتے اور ان جیسے کاموں میں ان کی ہم نوائی کرتے ہیں، ان کو کیا کرنا چاہیے؟ اور اس طرح کے کاموں میں ولیِ امر (حکمران) کی ذمہ داری کیا ہے؟

فتویٰ عنایت فرما کر عند اللہ ماجور ہوں۔

جواب الحمد لله رب العالمين.

1 جو انسان کسی دوسرے اور غیر موجود انسان سے اس طرح مدد طلب کرتا ہے کہ مشکلات اور پریشانیوں میں اس کو پکارتا ہے، اس کے سامنے اپنی حاجتیں رکھتا ہے، مثلاً کہتا ہے: اے پیر و مرشد! میرا سب کچھ آپ ہی ہیں، یا دشمن کے حملہ آور ہوتے وقت پیر سے مدد طلب کرے یا بیماری یا غریبی دور کرنے کے لیے اور اس طرح کی دیگر حاجات کو پورا کرنے کے لیے اس کو پکارے، ایسا انسان گمراہ، جاہل، مشرک اور بالاتفاق خدا کا نافرمان ہے۔ اہلِ اسلام کا اتفاق ہے کہ میت کو نہ پکارا جاتا ہے نہ اس سے کچھ مانگا ہی جاتا ہے، خواہ وہ کسی نبی کی میت ہو یا پیر کی یا کسی کی بھی۔

لیکن جب وہ زندہ اور موجود ہو اور اس سے کوئی ایسی چیز مانگی جائے جسے دینے اور کرنے پر وہ قادر ہو، مثلاً دعا وغیرہ، تو یہ جائز ہے۔ جس طرح صحابہ کرام رضی اللہ عنہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے دعا کروایا کرواتے تھے۔ اور قیامت کے دن بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے خیر طلب کی جائے گی۔ یہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وسیلہ اور استغاثہ (فریاد طلبی ہے) جس کا شریعت میں ذکر ہوا ہے۔

صحیح بخاری وغیرہ میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: جب لوگ قحط سالی کا شکار ہوئے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے وسیلے سے بارش کی دعا کی اور کہا: اے اللہ! جب ہم قحط سالی میں مبتلا ہوتے تو تیرے سامنے اپنے نبی کو وسیلہ بناتے، تو ہمیں بارش دیتا۔ ہم اپنے نبی کے چچا کو تیرے سامنے وسیلہ بناتے ہیں تو ہمیں بارش دے۔"[1] راوی کہتا ہے: تو بارش ہو جاتی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے توسل، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا اور شفاعت کے

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٩٦٤، ٣٥٠٧)

ذریعے ہوتا تھا۔ جب آپ ﷺ فوت ہو گئے تو انھوں نے آپ ﷺ کے چچا عباس رضی اللہ عنہ کی دعا اور شفاعت کو وسیلہ بنایا، کیوں کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے قریبی تھے، لیکن اس وقت انھوں نے رسول اللہ ﷺ کو وسیلہ بنایا نہ آپ ﷺ سے مدد طلب کی اور نہ وہ دعا کرنے کے لیے آپ ﷺ کی قبر ہی پر گئے، کیوں کہ آپ ﷺ نے اس دروازے تک جانے والا ہر ذریعہ اور راستہ بند کر دیا تھا اور فرما دیا تھا: ''میری قبر پر میلہ نہ لگانا، جہاں تم ہو، وہیں سے مجھ پر درود بھیجو۔ تمھارا درود مجھ تک پہنچ جائے گا۔''[1] آپ ﷺ نے دعائیہ انداز میں کہا: ''اے اللہ! میری قبر کو صنم نہ بنا دینا جس کی پوجا کی جائے۔''[2] فرمایا: ''اللہ یہود و نصاریٰ پر لعنت کرے! انھوں نے اپنے انبیا کی قبروں کو (مساجد) سجدہ گاہیں بنا لیا تھا۔''[3] آپ ﷺ نے یہ بات اس کام سے خبردار کرتے ہوئے کہی اور فرمایا: ''تم سے پہلے لوگ قبروں کو سجدہ گاہیں بنا لیتے تھے۔ خبردار! تم قبروں کو سجدہ گاہیں نہ بنانا، میں تم کو اس سے منع کرتا ہوں۔''[4]

اس لیے علمائے کرام کہتے ہیں: قبروں پر مساجد تعمیر کرنا حرام ہیں، اگر انبیا اور بزرگوں کی قبروں کو مساجد (سجدہ گاہیں) بنانا اور وہاں نماز پڑھنا ممنوع ہے، تاکہ یہ شرک کا ذریعہ نہ بن جائے تو صاحبِ قبر کو پکارنا، اس سے مانگنا، اللہ کے سامنے اس کو وسیلہ بنانا، اس کی قبر پر سجدہ کرنا یا اس کو چھو کر اپنے بدن پر ہاتھ پھیرنا کیونکر جائز ہو سکتا ہے، بلکہ یہ صریح شرک ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَمْلِكُوْنَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ وَمَا لَهُمْ فِيْهِمَا مِنْ شِرْكٍ وَّمَا لَهٗ مِنْهُمْ مِّنْ ظَهِيْرٍ ﴿٢٢﴾ وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا لِمَنْ اَذِنَ لَهٗ ﴾ [السبأ: ٢٢، ٢٣]

''کہہ دے پکارو ان کو جنھیں تم نے اللہ کے سوا گمان کر رکھا ہے، وہ نہ آسمانوں میں ذرہ برابر کے مالک ہیں اور نہ زمین میں اور نہ ان کا ان دونوں میں کوئی حصہ ہے اور نہ ان میں سے کوئی اس کا مددگار ہے۔ اور نہ سفارش اس کے ہاں نفع دیتی ہے مگر جس کے لیے وہ اجازت دے۔''

فرمایا:

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٠٤٢) صحيح الجامع، رقم الحديث (٧٢٢٦)

[2] الموطأ (١٧٢/١)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٢٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٣١)

[4] صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٣٢)

﴿ قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ فَلَا يَمْلِكُوْنَ كَشْفَ الضُّرِّ عَنْكُمْ وَلَا تَحْوِيْلًا ﴿56﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ يَبْتَغُوْنَ اِلٰى رَبِّهِمُ الْوَسِيْلَةَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ وَيَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَيَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ ؕ اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُوْرًا ﴾ [بني إسرائيل: ٥٦، ٥٧]

''کہہ پکارو ان کو جنھیں تم نے اس کے سوا گمان کر رکھا ہے، پس وہ نہ تو تم سے تکلیف دور کرنے کے مالک ہیں اور نہ بدلنے کے۔ وہ لوگ جنھیں یہ پکارتے ہیں، وہ (خود) اپنے رب کی طرف وسیلہ ڈھونڈتے ہیں، جو ان میں سے زیادہ قریب ہیں اور اس کی رحمت کی امید رکھتے ہیں اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں۔ بے شک تیرے رب کا عذاب وہ ہے جس سے ہمیشہ ڈرا جاتا ہے۔''

سلف کی ایک جماعت کا کہنا ہے: کچھ قومیں فرشتوں اور انبیا میں سے عیسیٰ اور عزیر علیہما السلام کو پکارتی تھیں تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''جس طرح تم میرے بندے ہو اسی طرح یہ بھی میرے ہی بندے ہیں، جس طرح تم میری رحمت کی امید رکھتے ہو اسی طرح یہ بھی میری رحمت کی امید رکھتے ہیں، جس طرح تم میرا قرب تلاش کرتے ہو اسی طرح یہ بھی میرا قرب تلاش کرتے ہیں اور جس طرح تم مجھ سے خوف کھاتے ہو اسی طرح یہ بھی مجھ سے خوف کھاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ﴿79﴾ وَلَا يَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا ؕ اَيَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴾

[آل عمران: ٧٩، ٨٠]

''کسی بشر کا کبھی حق نہیں کہ اللہ اسے کتاب اور حکم اور نبوت دے، پھر وہ لوگوں سے کہے کہ اللہ کو چھوڑ کر میرے بندے بن جاؤ اور لیکن رب والے بنو، اس لیے کہ تم کتاب سکھایا کرتے تھے اور اس لیے کہ تم پڑھا کرتے تھے۔ اور نہ یہ (حق ہے) کہ تمھیں حکم دے کہ فرشتوں اور نبیوں کو رب بنا لو، کیا وہ تمھیں کفر کا حکم دے گا، اس کے بعد کہ تم مسلم ہو۔''

اللہ نے بیان کر دیا کہ فرشتوں اور نبیوں کو رب بنانا کفر ہے اور یہ اس وجہ سے تھا کہ وہ ان کو اللہ کے سوا پکارتے تھے، وہ یہ عقیدہ نہیں رکھتے تھے کہ یہ زمین و آسمان کی تخلیق میں خدا کے شریک تھے، بلکہ یہ بات کسی نے نہیں کہی۔ اسی لیے اللہ نے عیسائیوں سے متعلق کہا:

﴿ اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ ۚ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴾ [التوبة: ٣١]

''انھوں نے اپنے عالموں اور اپنے درویشوں کو اللہ کے سوا رب بنا لیا اور مسیح ابن مریم کو بھی، حالانکہ انھیں اس کے سوا حکم نہیں دیا گیا تھا کہ ایک معبود کی عبادت کریں، کوئی معبود نہیں مگر وہی، وہ اس سے پاک ہے جو وہ شریک بناتے ہیں۔''

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بیان کیا ہے کہ عیسائی اپنے علما اور راہبوں کو اللہ کے علاوہ رب بنانے اور عیسیٰ علیہ السلام کو خدا بنانے کی وجہ سے مشرک ہیں، حالانکہ کوئی عیسائی یہ نہیں کہتا کہ علما اور راہب زمین و آسمان کی تخلیق میں خدا کے ساتھ شریک تھے۔ اگر کوئی کسی فوت شدہ نبی کو پکارنے اور اس سے مدد مانگنے کی وجہ سے مشرک ہو جاتا ہے تو جو کسی غیر نبی فوت شدہ کو پکارتا اور اس سے مدد طلب کرتا ہے وہ کیونکر مشرک نہیں ہو گا؟!

بنا بریں قبروں کی زیارت کی دو حیثیتیں ہیں:

1. شرعی زیارت۔
2. بدعی (غیر شرعی) زیارت۔

شرعی زیارت میں میت کے لیے دعا کرنا مقصود ہوتا ہے، جس طرح جنازے کا مقصود میت کے لیے دعا کرنا ہوتا ہے۔ شرعی زیارت کرتے وقت یہ دعا پڑھی جاتی ہے:

«اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ دَارَ قَوْمٍ مُؤْمِنِیْنَ وَإِنَّا إِنْ شَاءَ اللّٰهُ بِکُمْ لَاحِقُوْنَ، یَرْحَمُ اللّٰهُ الْمُتَقَدِّمِیْنَ مِنْکُمْ وَالْمُتَأَخِّرِیْنَ، نَسْأَلُ اللّٰهَ لَنَا وَلَکُمُ الْعَافِیَةَ فِي الدُّنْیَا وَالْآخِرَةَ، اَللّٰهُمَّ لَا تَحْرِمْنَا أَجْرَهُمْ وَلَا تَفْتِنَّا بَعْدَهُمْ، وَاغْفِرْ لَنَا وَلَهُمْ»[1]

یہ میت کا جنازہ پڑھنے کی قبیل سے ہے۔

بدعتی زیارت شرک کی جنس سے ہے جس طرح عیسائیوں کے ہاں ہوتا ہے، اس میں میت کو پکارا جاتا ہے، اس سے مدد طلب کی جاتی ہے، اللہ کو اس کا واسطہ دیا جاتا ہے، قبر کو چوما جاتا ہے اور اس پر ہاتھ پھیر کر اپنے جسم پر لگایا جاتا ہے، اس کو سجدہ کیا جاتا ہے، وہاں چہرے کو اس کی خاک سے آلودہ کیا جاتا ہے اور اس طرح کے کئی ایسے کام کیے جاتے ہیں جو اس سے حاجتیں مانگنے یا اس کو سبب بنانے پر متضمن و مشتمل ہوتے ہیں، ان میں سے کوئی کام بھی مسلمانوں کے دین سے تعلق نہیں رکھتا، نہ رسول اللہ ﷺ نے ان میں سے کسی کام کا حکم دیا ہے، نہ کسی صحابی نے اس کو کیا ہے اور نہ کسی امام نے اسے مستحب اور اچھا جانا ہے، بلکہ انھوں نے ان سے منع کیا ہے، بلکہ سب ائمہ اسلام کا

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۹۷۵) سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (۱۵۴۷) مسلم و ابن ماجہ میں یہ سارے الفاظ نہیں ہیں۔

اتفاق ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی قبر مبارک کو بھی چومنا یا اس پر ہاتھ پھیر کر اپنے جسم پر لگانا یا اس کے پاس سجدہ کرنا جائز نہیں۔ اگر آپ ﷺ کی قبر کے پاس ایسے کسی کام کی اجازت نہیں جو اللہ کے ہاں سارے لوگوں سے افضل، سب سے زیادہ معزز، اس کا سب سے قریبی وسیلہ اور اس کے نزدیک سب سے زیادہ جاہ کے مالک ہیں تو کسی اور کی قبر کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے؟

وہ حدیث جو کچھ لوگ بیان کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: « إِذَا سَأَلْتُمُ اللّٰهَ فَاسْئَلُوْهُ بِجَاهِيْ » ''جب تم اللہ سے مانگو تو میری جاہ اور وسیلے کے واسطے سے مانگو۔'' موضوع روایت ہے، کسی محدث اور صاحبِ علم نے اسے روایت نہیں کیا اور یہ مسلمانوں کی حدیث کی مشہور کتابوں میں بھی نہیں ملتی۔

2 اسی طرح انبیا کی قبروں، بزرگوں کی قبروں اور اہلِ بیت وغیرہ کی قبروں پر چراغ جلانا اور چادریں چڑھانا تمام اہلِ اسلام کے اتفاق کے ساتھ غیر مشروع اور ناجائز ہے۔ امت اور ائمہ میں سے کسی نے یہ کام نہیں کیا اور کسی امام نے اسے پسندیدہ اور مستحب نہیں کہا، بلکہ سنن میں رسول اللہ ﷺ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

«لَعَنَ اللّٰهُ زَوَّارَتِ الْقُبُوْرِ وَالْمُتَّخِذِيْنَ عَلَيْهَا السُّرُجَ وَالْمَسَاجِدَ » (قال الترمذي حديث حسن)[1]

''اللہ قبروں کی زیارت کرنے والی عورتوں، ان پر دیے جلانے والوں اور انھیں مساجد (سجدہ گاہیں) بنانے والوں پر لعنت کرے۔''

جو انسان کسی قبر کو تیل، شمع، قندیل، چادر، پردہ اور اس طرح کی کوئی بھی چیز مہیا کرنے کی نذر مانتا ہے اس کی یہ نذر فرماں برداری اور نیکی کی نذر نہیں اور اس نذر کو پورا کرنا بھی کسی کے ذمے ضروری نہیں۔ مجھے اس مسئلے میں علما کا کوئی اختلاف معلوم نہیں۔ لیکن کیا ایسی نذر ماننے والا پوری نہ کرنے کی صورت میں قسم کا کفارہ دے گا یا نہیں؟ اس میں علما کے دو اقوال ہیں۔

3 اسی طرح کسی بھی قبر کے پاس ختمِ قرآن یا دعا، یا ذکر یا سماع یا کسی بھی اس طرح کے کام کے لیے اکٹھ کرنا بدعت اور ممنوع ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے: ''میری قبر کو عید نہ بناؤ۔'' (ابو داود)[2]

اگر آپ ﷺ کی قبر کو عید بنانے اور وہاں میلہ لگانے سے منع کیا گیا ہے تو آپ ﷺ کے علاوہ دوسروں کی قبر پر اس طرح کا کام کرنا بالاولیٰ ممنوع ہو گا، وہ جگہ جس کو عید کے لیے اختیار کیا جائے، اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٢٠) سنن النسائي، رقم الحديث (٢٠٤٣) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٥٧٥) السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٢٢٥)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٠٤٢) صحيح الجامع، رقم الحديث (٧٢٢٦)

لوگ کسی خاص وقت میں وہاں اکٹھ کرنے کے عادی ہو جاتے ہیں، جس طرح لوگ ہر سال عرفات، مزدلفہ اور منیٰ میں اکٹھے ہوتے ہیں۔ اس طرح جس وقت کو عید بنایا جائے، یہ وہ وقت ہوتا ہے جس میں لوگ اکٹھ کرنے کے عادی ہوتے ہیں، جس طرح عیدِ فطر اور عیدِ بقر کے دنوں میں لوگ اکٹھے ہوتے ہیں۔

وہ مشرکینِ عرب جن کو رسول اللہ ﷺ نے کافر قرار دیا ہے، ان سے جنگیں لڑیں اور ان کا خون اور مال حلال قرار دیا۔ وہ یہ نہیں کہتے تھے کہ ان کے معبود زمین و آسمان اور جہاں کی تخلیق میں خدا تعالیٰ کے شریک کار تھے، بلکہ وہ خدا کے اکیلا خالقِ ارض و سما ہونے کا اقرار کرتے تھے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَلَىِٕنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ﴾ [لقمان: ٢٥]

''اور بلاشبہ اگر تو ان سے پوچھے کہ آسمانوں کو اور زمین کو کس نے پیدا کیا تو ضرور ہی کہیں گے کہ اللہ نے۔''

فرمایا:

﴿ قُلْ لِّمَنِ الْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهَآ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ۚ قُلْ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝ قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ۝ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ۚ قُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ۝ قُلْ مَنْۢ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ۚ قُلْ فَاَنّٰى تُسْحَرُوْنَ ۝ ﴾ [المؤمنون: ٨٤۔٨٩]

''کہہ دے زمین اور اس میں جو کوئی بھی ہے کس کا ہے، اگر تم جانتے ہو۔ وہ ضرور کہیں گے اللہ کا ہے۔ کہہ دے پھر کیا تم نصیحت حاصل نہیں کرتے۔ کہہ ساتوں آسمانوں کا رب اور عرشِ عظیم کا رب کون ہے؟ ضرور کہیں گے اللہ ہی کے لیے ہے۔ کہہ دے پھر کیا تم ڈرتے نہیں؟ کہہ کون ہے وہ کہ صرف اس کے ہاتھ میں ہر چیز کی مکمل بادشاہی ہے اور وہ پناہ دیتا ہے اور اس کے مقابلے میں پناہ نہیں دی جاتی، اگر تم جانتے ہو۔ ضرور کہیں گے اللہ کے لیے ہے۔ کہہ پھر کیا تم کہاں سے جادو کیے جاتے ہو۔''

اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرمایا ہے:

﴿ وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ ﴾ [یوسف: ١٠٦]

''اور ان میں سے اکثر اللہ پر ایمان نہیں رکھتے، مگر اس حال میں کہ وہ شریک بنانے والے ہوتے ہیں۔''

سلف کی ایک جماعت کا کہنا ہے: ان سے پوچھا جائے کہ زمین و آسمان کا خالق کون ہے؟ تو وہ جواب دیتے ہیں: اللہ تعالیٰ۔ حالانکہ وہ اس کی عبادت نہیں کرتے، بلکہ غیر اللہ کو پوجتے ہیں۔ ان کی عبادت یہ تھی کہ وہ ان کو پکارتے تھے اور ان کو اپنے وسیلے، واسطے اور سفارشی قرار دیتے تھے۔ تو جو انسان اس راہ پر چلتا ہے وہ اتنا ہی مشرک

ہے جتنا شرک اس راہ میں ہو۔

اس شرک میں جب انسان پر حجت قائم ہو جائے مگر وہ پھر بھی باز نہ آئے تو اس سے اسی طرح قتال کرنا ضروری ہو جاتا ہے جس طرح اس جیسے مشرکوں سے قتال کیا جاتا ہے۔ اس کا نہ جنازہ پڑھا جائے اور نہ اس کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کیا جائے۔ لیکن اگر وہ جاہل اور لاعلم ہو، اس تک نہ علم پہنچا، نہ وہ اس شرک کی حقیقت سے آشنا ہوا جس کی بنیاد پر رسول اللہ ﷺ نے مشرکوں سے قتال کیا تھا تو اس پر کفر کا حکم نہیں لگایا جائے گا، بالخصوص جب اس طرح کا شرک اسلام سے نسبت رکھنے والوں میں بہت زیادہ ہو چکا ہے۔ جو انسان اس طرح کے کام کو نیکی اور قربت خیال کرتا ہے وہ بالاتفاق گمراہ ہے اور قیامِ حجت کے بعد کافر۔ اس سے منع کرنا اور ہر طریقے سے اس کو روکنا بالعموم مسلمانوں اور بالخصوص والیانِ ریاست کی ذمے داری ہے اور جو باز نہ آئے اس کو شرعی سزا دی جائے۔ واللہ أعلم

4 مشائخ کی ذمے داری:

مشائخ اپنے مریدوں کو اللہ اور رسول کی فرماں برداری کا حکم دیں، کتاب وسنت کی پیروی کریں اور وہی کام کریں جس کا حکم اللہ اور رسول نے دیا ہے اور جن کاموں سے اللہ اور رسول نے منع کیا ہے، ان سے رک جائیں، لیکن اس سب سے مقصود ان کو ایک اللہ کی عبادت اور اس کے رسول کی فرماں برداری کی دعوت دینا ہے۔ شیوخ اس دین کے مبلغ بنیں جو رسول نے پیش کیا اور رسول کو خدا نے دیا اور خلفائے راشدین کی راہ پر چلیں جس طرح رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: ''جو تم میں سے زندہ رہے گا وہ عن قریب بہت سا اختلاف دیکھے گا! تم میری سنت اور خلفائے راشدین مہدیین کی سنت اختیار کرنا، اسے تھام کر رکھنا اور ڈاڑھوں سے پکڑ لینا، نئے نئے امور سے بچنا، یقیناً ہر بدعت گمراہی ہے۔''[1]

اللہ نے بھی اپنے بندوں کو یہ بڑی جامع وصیت کی ہے:

﴿ وَلَقَدْ وَصَّيْنَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَاِيَّاكُمْ اَنِ اتَّقُوا اللّٰهَ ﴾ [النساء: ١٣١]

''اور بلاشبہ یقیناً ہم نے ان لوگوں کو جنھیں تم سے پہلے کتاب دی گئی اور تمھیں بھی تاکیدی حکم دیا ہے کہ اللہ سے ڈرو۔''

جب رسول اکرم ﷺ نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن بھیجا تو یہ تین وصیتیں کیں: ① جہاں بھی رہو اللہ سے ڈرتے رہنا، ② برائی کے پیچھے ہی اچھائی کرنا، یہ اسے مٹا دے گی اور ③ لوگوں کے ساتھ حسنِ اخلاق سے پیش آنا۔''[2]

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٦٠٧) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٦٧٦) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٢، ٤٣) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٧٣٥)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (١٩٨٧) صحيح الجامع، رقم الحديث (٩٧)

5 اجازتیں لکھ کر دینا ایسے ہی ہے جیسے کوئی کسی کے مشیخت اور پیری کے اہل ہونے کی سند جاری کرے اور اس میں لوگوں کو اس کی اطاعت و اتباع کا حکم دیا جائے۔ ایسی سند صرف اس کو جاری کی جائے جس کو جاری کرنے والا نمونے اور پیروی کا اہل جانتا ہو۔ جو اپنے قول و عمل میں عادل نہ ہو، اس کو جاری نہ کرے۔ جو انسان شریعتِ اسلام سے ناواقف اور جاہل ہو یا کوئی مفاد پرست ہو، مال اور خدمت کے عوض اجازت اور سند حاصل کرنے کی کوشش کرے، لیکن اس کا اہل اور مستحق نہ ہو تو اس کو یہ سند نہ لکھ کر دی جائے۔ اگر کوئی کسی کو اس طرح کی اجازت اور سند دے بھی دے تو اس کی کوئی حیثیت نہیں ہوگی، بالخصوص جب اجازت کا مضمون مال مانگنے پر مشتمل ہو۔ یہ بھیک مانگنے والوں کی اجازت ہے، طریقت کی اجازت نہیں۔

جو مستحق افراد کو لوگوں کا مال تقسیم کرنے کی ذمے داری اٹھاتا ہے، اس کے لیے انصاف کے ساتھ مستحق لوگوں کو جاننا اور صرف مستحق افراد کو دینا ضروری ہے جو لوگوں کے اموال اپنے ذاتی کام نکلوانے اور ناجائز مصارف میں صرف کرتے ہیں۔ ایسے لوگ ناجائز طریقے سے لوگوں کا مال کھانے والے اور اللہ کی راہ سے نکلنے والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ﴾ [التوبة: ٣٤]

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! بے شک بہت سے عالم اور درویش یقیناً لوگوں کا مال باطل طریقے سے کھاتے ہیں اور اللہ کے راستے سے روکتے ہیں۔''

جو شیوخ اور پیرانِ اسلام قابلِ اتباع نمونہ بننے کے اہل ہوتے ہیں وہی لوگوں کو طریقتِ الٰہی کی دعوت دیتے ہیں جو حقیقت میں شریعتِ الٰہی اور دینِ خدا ہے جو محمد کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دے کر بھیجا گیا جس طرح کتاب و سنت اور اجماعِ امت سے ثابت ہے۔ ایسے پیر لوگوں کے اموال کو شرعی مصارف میں استعمال کرتے ہیں جو اللہ اور رسول کو پسند ہیں۔ اس طرح یہ لوگ اللہ کے دین کے داعی اور مال کو اس کی راہ میں خرچ کرنے والے بن جاتے ہیں۔

6 جو لوگ اس طرح کے غیر شرعی اشارے لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں جو حقیقت میں جھوٹ کا پلندہ ہوتے ہیں، مثلاً خون دکھانا، چینی یا کوئی مٹھائی یا عرق گلاب ظاہر کرنا، سانپ پکڑنا یا آگ چھونا وغیرہ۔ یہ سارے لوگ باطل پرست، گمراہ اور جھوٹے ہیں، ان کو سخت سے سخت سزا دی جانی چاہیے۔ ایسے لوگ یا شیطانی جال کے حامل ہوتے ہیں یا بہتانی حال کے عامل۔ یہ ان کے عوام ہیں اور وہ ان کے خواص۔ ان سب کو ان تمام بدعتوں اور برائیوں سے توبہ کرنی چاہیے۔ ایسی طریقت پر چلنا چاہیے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش کی ہے۔ ایسے لوگ لوگوں

کے لیے نمونہ بننے کے اہل نہیں اور کسی کو بھی ان کی اقتدا اور پیروی نہیں کرنی چاہیے۔

7 جو نام نہاد علما ان کے باطل اجتماعوں میں کثرت سے شرکت کرتے ہیں یا ان کی مساجد یا دوسری جگہ میں قائم کی جانے والی محافلِ سماع میں حاضر ہوتے، یا ان کے کاموں کی تحسین کرتے ہیں، وہ سخت سزا کے مستحق ہیں جس کی کم از کم سزا ان کو امامت کے منصب سے معزول کرنا ہے، کیوں کہ یہ انسان گمراہ اماموں کا مددگار یا انھی میں سے ایک ہے، اس لیے اہلِ ہدایت وفلاح کا امام بننے کا اہل نہیں، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ ۖ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۚ ﴾ [المائدۃ: ۲]

''اور نیکی اور تقویٰ پر ایک دوسرے کی مدد کرو اور گناہ اور زیادتی پر ایک دوسرے کی مدد نہ کرو۔''

نیز فرمایا:

﴿ وَالْعَصْرِ ۝ إِنَّ الْإِنسَانَ لَفِي خُسْرٍ ۝ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝ ﴾ [العصر: ۱۔۳]

''زمانے کی قسم! کہ بے شک ہر انسان یقیناً گھاٹے میں ہے۔ سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے اور ایک دوسرے کو حق کی وصیت کی اور ایک دوسرے کو صبر کی وصیت کی۔''

مزید فرمایا:

﴿ وَلْتَكُن مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ ۚ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴾ [آل عمران: ۱۰۴]

''اور لازم ہے کہ تم میں ایک ایسی جماعت ہو جو نیکی کی طرف دعوت دیں اور اچھے کام کا حکم دیں اور برائی سے منع کریں اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔ واللہ أعلم.[1]

قدس اور مزارِ خلیل کی زیارت اور خلیلی لنگر کا حکم

سوال قدس اور ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کی قبر کی زیارت، نیز اس موقع پر تقسیم ہونے والے لنگر کو برکت کی نیت سے کھانے اور اسی نیت سے ایک شہر سے دوسرے شہر لے جانے کا کیا حکم ہے؟ اور اس میں کیا سنت اور کیا بدعت ہے؟

جواب الحمد للہ. بیت المقدس میں نماز پڑھنے، وہاں اعتکاف کرنے، تلاوتِ قرآن، ذکر یا دعا کرنے کی نیت سے رختِ سفر باندھنا علمائے اسلام کے اتفاق کے ساتھ جائز اور مستحب ہے۔ صحیح بخاری و مسلم میں حضرت ابو ہریرہ اور ابو سعید رضی اللہ عنہما کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

[1] جامع المسائل (۳/۱۴۵۔۱۵۴)

«لَا تُشَدُّ الرِّحَالُ إِلَّا إِلَى ثَلَاثَةِ مَسَاجِدَ: اَلْمَسْجِدِ الْحَرَامِ، وَالْمَسْجِدِ الْأَقْصَى، وَمَسْجِدِيْ هَذَا »[1]

''مسجدِ حرام، مسجدِ اقصیٰ اور میری مسجد؛ ان تین مساجد کے سوا کسی جگہ کی زیارت کے لیے رختِ سفر نہ باندھا جائے۔''

مسجدِ حرام اور مسجدِ نبوی اس سے افضل ہیں، صحیحین میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«صَلَاةٌ فِيْ مَسْجِدِيْ هَذَا خَيْرٌ مِنْ أَلْفِ صَلَاةٍ فِيْمَا سِوَاهُ إِلَّا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ »[2]

''میری اس مسجد میں نماز، مسجدِ حرام کے سوا، باقی سب مساجد میں ایک لاکھ نماز پڑھنے سے بہتر ہے۔''

جہاں تک صرف خلیل علیہ السلام کی قبر یا ان کے علاوہ کسی نبی یا ولی کی قبر، دربار اور آثار کی زیارت کا مسئلہ ہے تو بشمول ائمہ اربعہ مسلمانوں کے کسی امام نے اسے مستحب نہیں سمجھا، بلکہ اگر کوئی شخص اس طرح کی نذر مان لے تو اس کے لیے اس کو پورا کرنا ضروری نہیں۔ ان تین مساجد کی زیارت کی نذر کے عکس اگر کوئی شخص حج یا عمرے کی نیت سے مسجدِ حرام کی زیارت کی نذر مانتا ہے تو بالاتفاق یہ نذر اس پر لازم ہو جاتی ہے، اگر کوئی باقی دو مساجد کی زیارت کی نذر مانے تو امام مالک، احمد اور شافعی جیسے اکثر فقہا کے ظاہر قول کے مطابق سفر لازم ہو جاتا ہے، کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: ''جو اللہ کی فرمانبرداری کی نذر مانے وہ اس کی فرمانبرداری کرے اور جو اللہ کی نافرمانی کی نذر مانے وہ اس کی نافرمانی نہ کرے۔'' (رواه البخاري)[3] ہر وہ نذر پوری کرنا ضروری ہوتا ہے جو اللہ کی فرمانبرداری پر مشتمل ہو، مثلاً: نماز، روزے، اعتکاف، صدقے یا حج کی نذر ماننا۔

بنابریں ان تین مساجد کے علاوہ کسی دوسری جگہ جانے کی نذر ماننے سے وہ نذر لازم نہیں ہوتی، کیوں کہ وہ فرمانبرداری نہیں۔ اس کی دلیل یہ حدیث ہے: «لَا تُشَدُّ الرِّحَالُ إِلَّا إِلَى ثَلَاثَةِ مَسَاجِدَ»[4] اگر ان تین مساجد کے علاوہ کسی دوسری مسجد کا قصد کرتے ہوئے اس کی زیارت منع ہے تو جو مسجد نہ ہو اس کا قصد کرنا بالاولیٰ منع ہو گا، کیوں کہ مساجد میں عبادت، گھر یا کسی دوسری جگہ عبادت کرنے سے بلاشک افضل ہے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١١٣٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٣٩٧)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١١٣٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٣٩٤)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٣١٨)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (١١٣٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٣٩٧)

«أَحَبُّ الْبِقَاعِ إِلَى اللّٰهِ الْمَسَاجِدُ»[1] ''مساجد اللہ کو زمین کے تمام ٹکڑوں سے زیادہ محبوب ہیں۔''

پھر حدیث ''شدِ رحال'' سفرِ تجارت یا سفرِ علم وغیرہ کے برخلاف زمین کے ہر مقصود گوشے اور کونے کے لیے رختِ سفر باندھنے کے منع ہونے پر مشتمل ہے، کیوں کہ تجارت یا علم وغیرہ جیسی ضرورت کے لیے وہاں جانا ضروری ہوتا ہے جہاں یہ موجود ہو۔ اسی طرح کسی مسلمان بھائی کی زیارت و ملاقات کے لیے بھی وہاں کا سفر کرنا پڑتا ہے جہاں وہ رہتا ہو۔ کچھ متاخر علما کا کہنا ہے کہ درباروں اور درگاہوں کی زیارت کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ انھوں نے یہ دلیل پیش کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر ہفتے سوار ہو کر اور پیدل چل کر قبا جایا کرتے تھے۔ (بخاری و مسلم)[2] لیکن اس حدیث میں ان کے لیے کوئی دلیل نہیں، کیوں کہ قبا درگاہ نہیں، مسجد ہے اور بالاتفاق اس کے لیے قصداً سفر کرنا منع ہے، کیوں کہ یہ مشروع اور جائز سفر نہیں، بلکہ اگر کوئی شخص اپنے گھر اور ڈیرے میں قبا کا قصداً سفر کرے تو یہ جائز نہیں ہوگا۔ لیکن اگر کوئی مسجدِ نبوی کی زیارت کے لیے نکلے، پھر وہاں سے قبا جائے تو یہ اسی طرح مستحب ہے، جس طرح بقیع میں موجود قبروں اور شہدائے احد کی زیارت کرنا۔''

خلیل علیہ السلام کی قبر کے پاس جو روٹی اور دال تقسیم ہوتی ہے، اس کو متقدمین اور متاخرین میں سے کسی نے بھی پسند نہیں کیا، بلکہ یہ کام صحابہ، تابعین اور بعد میں بھی بعثت کے پانچ سو سال تک کسی زمانے میں رو بہ عمل نہیں تھا، تا آنکہ عیسائیوں نے اس خطے پر قبضہ جما لیا۔ اس وقت ان کی قبر پر بنا ہوا گنبد نما بھی کھلا نہیں ہوا تھا، بلکہ بند تھا۔ صحابہ و تابعین اور اسلاف میں سے کوئی بھی خلیل علیہ السلام کی قبر کی زیارت کے لیے نہیں آتا تھا۔ جب عیسائیوں نے ان علاقوں پر قبضہ کر لیا تو انھوں نے ان کے حجرے کو مسمار اور برابر کر کے گرجا بنا لیا۔ جب اس کے بعد مسلمانوں نے قبضہ کیا تو انھوں نے اس کو مسجد بنا دیا جو بدعت اور ممنوع ہے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ یہود و نصاریٰ پر لعنت کرے کہ انھوں نے اپنے انبیا کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا۔''[3] ان کے اس فعل سے خبردار کرتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا۔ صحیح بخاری میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وفات سے پانچ دن قبل فرمایا: ''تم سے پہلے لوگ قبروں پر مسجدیں بنایا کرتے تھے، خبردار! تم قبروں پر مساجد نہ بنانا، میں تم کو اس سے منع کرتا ہوں۔''[4] اس کے بعد کچھ لوگوں نے دال اور روٹی کا لنگر جاری کر دیا اور اس کے لیے ٹرسٹ بنا دیا، مگر یہ ٹرسٹ اور وقف خلیل علیہ السلام نے

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٦٧١) مگر اس میں "أحب البقاع" کے بجائے "أحب البلاد" کے الفاظ ہیں۔

[2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (١١٣٥) صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٣٩٩)

[3] صحیح البخاري، رقم الحدیث (١٣٢٤) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٥٢٩)

[4] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٥٣٢)

قائم کیا نہ بنی اسرائیل میں سے کسی نے اور نہ رسول اللہ ﷺ اور آپ ﷺ کے خلفا ہی نے یہ کام کیا، بلکہ آنحضرت ﷺ سے مروی ہے: ''آپ ﷺ نے یہ بستی دارمیوں کے لیے چھوڑ دی۔'' اور ان کو خلیل علیہ السلام کی قبر کے پاس دال روٹی یا کچھ اور کھانے کھلانے کا حکم نہیں دیا تھا۔ لہٰذا جو یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ اس دال روٹی کو کھانا مستحب ہے اور رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے، وہ بدعتی اور گمراہ ہے، بلکہ جو مطلق دال کی کسی فضیلت کا قائل ہے وہ بھی جاہل ہے۔ یہ جو حدیث بیان کی جاتی ہے: ''دال کھاؤ، یہ دل کو نرم کرتی ہے .....'' بالاتفاق جھوٹی اور خود ساختہ ہے۔ تاہم یہودیوں نے دال کی تمنا کی تھی، اللہ نے ان سے متعلق ذکر کیا ہے:

﴿ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِیْ هُوَ اَدْنٰی بِالَّذِیْ هُوَ خَیْرٌ ﴾ [البقرة: ٦١]

''کیا تم وہ چیز، جو کمتر ہے، اس چیز کے بدلے مانگ رہے ہو جو بہتر ہے۔''

کچھ لوگ دال کے ذریعے جنوں کا قرب حاصل کرتے ہیں، چنانچہ وہ لوگ دال پکا کر بیت الخلاء وغیرہ میں رکھواتے ہیں یا ان کو بھجواتے ہیں اور شیاطین سے حاجات طلب کرتے ہیں۔ تاہم یہ سب کام جبت و طاغوت پر ایمان کی نوع سے ہیں۔

دینِ اسلام کی بنیاد یہی ہے کہ ایک اللہ کی عبادت کی جائے، جس کا کوئی شریک نہیں اور ان واجبات، مستحبات اور مندوبات کے مطابق کی جائے جو محمد ﷺ کی زبانِ مبارک سے شریعت کے روپ میں صادر ہوئے۔ جو شخص ایسی عبادت کے ذریعے اللہ کی عبادت کرتا ہے جو واجب اور مستحب نہیں، وہ گمراہ ہے۔ واللہ أعلم [1]

تین مقدس مقامات کی مجاورت، جہاد کی افضلیت اور رسول اللہ ﷺ کی قبر مبارک کی زیارت کا حکم

سوال کیا مسجدِ نبوی، مکہ مکرمہ یا مسجدِ اقصیٰ کا خادم اور مجاور بننا افضل ہے یا جہاد کے لیے کسی سرحدی علاقے میں چلے جانا؟ نیز درج ذیل احادیث کی وضاحت مطلوب ہے:

1. «مَنْ زَارَ قَبْرِي وَجَبَتْ لَهُ شَفَاعَتِي» [2]

''جس نے میری قبر کی زیارت کی، اس کے لیے میری شفاعت لازم ہوگئی۔''

2. «مَنْ زَارَ الْبَيْتَ وَلَمْ يَزُرْنِي فَقَدْ جَفَانِي» [3]

''جس نے بیت اللہ کی زیارت کی، لیکن میری زیارت نہ کی، اس نے مجھ سے جفا کی۔''

---

[1] مجموع الفتاویٰ (٢٠/٢٧_٢٤)

[2] سنن الدارقطني (٢٧٨/٢) شعب الإيمان (٤٩٠/٣) ضعيف الجامع (٥٦٠٧)

[3] السلسلة الضعيفة (٤٥)

اس سے متعلق یہ سوال ہے کہ کیا رسول اللہ ﷺ کی زیارت مستحب ہے یا نہیں؟
فتویٰ عنایت فرما کر اللہ کے ہاں اجر کے مستحق ہوں۔

جواب الحمد لله رب العالمين.

مرابطت یعنی سرحدی علاقے میں جہاد کے لیے ٹھہرنا تینوں مساجد کی مجاورت سے افضل ہے۔ عام ائمہ اسلام کا صریحاً یہی مذہب ہے، بلکہ مجاورت میں ان کا اختلاف ہے۔ امام ابوحنیفہ نے اسے مکروہ کہا ہے، لیکن مالک واحمد وغیرہما نے مستحب کہا ہے، تاہم ان سب کے نزدیک مرابطت مجاورت سے افضل ہے، اس پر سلف کا اتفاق ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا قول ہے: ''میں ایک رات اللہ کی راہ میں مرابطت کرلوں، یہ میرے لیے لیلۃ القدر میں حجرِ اسود کے پاس تہجد پڑھنے سے زیادہ محبوب ہے۔'' کیوں کہ رباط (سرحد پر قیام کرنا جہاد کے لیے گھوڑے تیار رکھنا) جہاد کی جنس سے تعلق رکھتا ہے اور جہاد کی جنس حج کی جنس پر مقدم ہے۔ صحیحین میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا: کون سا عمل افضل ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانا۔ پوچھا گیا: پھر کون سا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ کی راہ میں جہاد کرنا۔ پوچھا گیا: پھر کون سا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: حجِ مبرور (مقبول)۔''[1] اللہ تعالیٰ نے بھی فرمایا ہے:

﴿ اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَآجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَجٰهَدَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ لَا يَسْتَوٗنَ عِنْدَ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿١٩﴾ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۙ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ﴿٢٠﴾ يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ وَّجَنّٰتٍ لَّهُمْ فِيْهَا نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ ﴿٢١﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۗ اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿٢٢﴾ ﴾ [التوبة: ١٩-٢٢]

''کیا تم نے حاجیوں کو پانی پلانا اور مسجد حرام کو آباد کرنا اس جیسا بنا دیا جو اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان لایا اور اس نے اللہ کے راستے میں جہاد کیا۔ یہ اللہ کے ہاں برابر نہیں ہیں اور اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔ جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے ہجرت کی اور اللہ کے راستے میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ جہاد کیا، اللہ کے ہاں درجے میں زیادہ بڑے ہیں اور وہی لوگ کامیاب ہیں۔ ان کا رب انھیں اپنی طرف سے بڑی رحمت اور عظیم رضا مندی اور ایسے باغوں کی خوشخبری دیتا ہے جن میں ان کے لیے ہمیشہ رہنے والی نعمت ہے۔''

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٨٣)

جہاں تک یہ حدیث ہے: "مَنْ زَارَ قَبْرِيْ وَجَبَتْ لَهُ شَفَاعَتِيْ" [1] اسے دار قطنی نے روایت کیا ہے، اس کی سند ضعیف ہے، اس لیے کئی ایک علما نے اسے موضوعات میں شمار کیا ہے۔

یہ احادیث کی معتبر اقسامِ کتب: صحاح، سنن اور مسانید میں موجود نہیں، دوسری حدیث جس کے الفاظ ہیں: "مَنْ حَجَّ الْبَيْتَ وَلَمْ يَزُرْنِيْ فَقَدْ جَفَانِيْ" [2] اسے بھی حدیث کا علم رکھنے والے کسی عالم نے روایت نہیں کیا، بلکہ یہ خود بنا کر رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کی گئی ہے اور اس کا مفہوم بھی اجماع کے مخالف ہے، کیوں کہ رسول اللہ ﷺ سے جفا کرنا کبیرہ گناہ، بلکہ کفر اور نفاق ہے اور آپ ﷺ سے اپنے اہل وعیال اور مال سے بھی زیادہ محبت رکھنا فرض ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهِ لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتَّى أَكُوْنَ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنْ وَّالِدِهِ وَوَلَدِهِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِيْنَ» [3]

"اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! تم میں سے کوئی ایک بھی ایمان دار نہیں ہو سکتا، تاوقتیکہ میں اس کو اس کے والد، اولاد اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔"

رہی آپ ﷺ کی زیارت تو وہ بالاتفاق واجب نہیں، بلکہ کتاب وسنت میں اس کے متعلق کوئی حکم ہی نہیں۔ کتاب وسنت میں جو حکم موجود ہے وہ آپ ﷺ پر صلاۃ وسلام بھیجنا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ ﷺ پر آپ ﷺ کے اصحاب اور آپ ﷺ کی اولاد پر بے شمار صلاۃ وسلام بھیجے!

زیارت کے متعلق علما کا سب سے زیادہ اعتماد اس حدیث پر ہے جو ابو داود میں ان الفاظ سے مروی ہے:

«مَا مِنْ مُسْلِمٍ يُسَلِّمُ عَلَيَّ إِلَّا رَدَّ اللّٰهُ عَلَيَّ رُوْحِيْ حَتَّى أَرُدَّ عَلَيْهِ السَّلَامَ» [4]

"جو مسلمان بھی مجھے سلام کہتا ہے، اللہ تعالیٰ میری روح مجھ میں لوٹا دیتے ہیں، تاکہ میں اس کے سلام کا جواب دوں۔"

امام مالک وغیرہ نے یہ الفاظ کہنا مکروہ کہا ہے کہ میں نے نبی اکرم ﷺ کی قبر کی زیارت کی۔ صحابہ میں سے عبداللہ بن عمر اور انس رضی اللہ عنہم وغیرہما آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے دونوں ساتھیوں کو سلام کہا کرتے تھے۔ موطا میں ہے کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما جب مسجد میں داخل ہوتے تو کہتے:

---

[1] سنن الدارقطني (٢/٢٧٨) شعب الإيمان (٣/٤٩٠) ضعيف الجامع، رقم الحديث (٥٦٠٧)

[2] السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٤٥)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٤٤)

[4] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٠٤١) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٢٦٦)

"اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ، اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا أَبَا بَكْرٍ، اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا أَبَتِ"[1]

"اے اللہ کے رسول! آپ پر سلام ہو، اے ابوبکر! آپ پر سلام ہو، اے میرے ابا جان! آپ پر سلام ہو۔"

آپ ﷺ کی مسجد کے لیے سفر کرنا بالاتفاق مشروع ہے، صحیحین میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

«لَا تُشَدُّ الرِّحَالُ إِلَّا إِلَى ثَلَاثَةِ مَسَاجِدَ: اَلْمَسْجِدِ الْحَرَامِ، وَالْمَسْجِدِ الْأَقْصَى وَمَسْجِدِيْ هٰذَا»[2]

"تین مساجد کے سوا کسی کے لیے رختِ سفر نہ باندھا جائے: (ایک) مسجدِ حرام، (دوسری) مسجدِ اقصیٰ اور (تیسری) میری یہ مسجد۔"

صحیحین ہی میں یہ حدیث بھی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

"میری اس مسجد میں نماز پڑھنا مسجدِ حرام کے سوا دیگر مسجدوں میں ایک ہزار نمازیں پڑھنے سے بہتر ہے۔"[3]

لہٰذا جو شخص مسجدِ نبوی میں داخل ہو وہ صحابہ کے عمل کے مطابق آپ ﷺ کو بھی سلام کہے اور آپ ﷺ کے دونوں ساتھیوں کو بھی۔

اگر سفر کی غرض صرف آنحضرت ﷺ کی قبر کی زیارت ہو مسجدِ نبوی میں نماز پڑھنا نہ ہو تو اس مسئلے میں اختلاف ہے، ائمہ اور اکثر علما کا موقف ہے کہ یہ جائز نہیں اور اس کا حکم بھی نہیں دیا گیا، کیوں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

«لَا تُشَدُّ الرِّحَالُ إِلَّا إِلٰى ثَلَاثَةِ مَسَاجِدَ: اَلْمَسْجِدِ الْحَرَامِ، وَمَسْجِدِيْ هٰذَا، وَالْمَسْجِدِ الْأَقْصَى»[4]

بنا بریں اگر کسی نے اس سفر کی نذر مانی ہو تو علما نے ذکر نہیں کیا کہ اسے پورا کرنا فرض ہے، برخلاف اس سفر کے جو تینوں مساجد میں نماز پڑھنے کی نیت سے کیا جائے علما ایسی نذر کو جو مسجدِ حرام میں نماز پڑھنے کے لیے مانی گئی ہو، پورا کرنا واجب کہتے ہیں، لیکن دوسری دو مساجد کے متعلق ان کا اختلاف ہے۔ مالک، شافعی اور احمد جیسے جمہور فقہا ان دو مساجد میں نماز پڑنے کی نذر کو پورا کرنا واجب کہتے ہیں، کیوں کہ فاضل کی طرف سفر مفضول کی طرف سفر سے بے نیاز نہیں کرتا۔

---

[1] الموطأ (٤٤٨/٣) مصنف عبد الرزاق (٥٧٦/٣) مصنف ابن أبي شيبة (٢٨/٣) سنن البيهقي الكبرىٰ (٢٤٥/٥) شیخ البانی رحمہ اللہ نے فضل الصلاة على النبي (ص:٨١) میں اسے صحیح کہا ہے۔

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١١٣٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٣٩٧)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (١١٣٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٣٩٤)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (١١٣٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٣٩٧)

ابو حنیفہ صرف مسجدِ حرام میں نماز پڑھنے کی نذر پورا کرنا واجب قرار دیتے ہیں، کیوں کہ ان کے نزدیک اسی عمل کو نذر کے ساتھ واجب کیا جا سکتا ہے جس کی جنس شریعت میں واجب ہو، لیکن جمہور ہر ایسی نذر کو پورا کرنا واجب کہتے ہیں جو نیکی اور اطاعت کے زمرے میں آتی ہو، اس کی دلیل یہ حدیث ہے جو صحیح بخاری میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«مَنْ نَذَرَ أَنْ يُّطِيعَ اللّٰهَ فَلْيُطِعْهُ، وَمَنْ نَذَرَ أَنْ يَّعْصِيَ اللّٰهَ فَلَا يَعْصِهِ »[1]

''جس نے اللہ کی اطاعت کی نذر مانی وہ اس کی اطاعت کرے اور جس نے اللہ کی نافرمانی کی نذر مانی وہ اس کی نافرمانی نہ کرے۔''

بلکہ ابن عقیل اور دیگر علما نے صراحت کے ساتھ کہا ہے کہ جو انبیا وغیرہ کی قبروں کی زیارت کی نیت سے سفر کرتا ہے وہ اس سفر میں نماز قصر نہ کرے، کیوں کہ یہ سفرِ معصیت ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ شخص اس کام کو نیکی سمجھ رہا ہوتا ہے، لیکن وہ نیکی نہیں۔ ایسے عمل کے ذریعے اللہ کا قرب حاصل کرنا جو نیکی نہ ہو، معصیت ہوتا ہے، نیز چونکہ اس سے منع بھی کیا گیا ہے اور نہی تحریم کا تقاضا کرتی ہے۔

بعض متاخرین نے قبروں کی زیارت کی رخصت دی ہے۔ ابو حامد غزالی نے احیاء العلوم میں، ابو الحسن بن عبدوس اور ابو محمد مقدسی نے بھی اس کا ذکر کیا ہے اور طبرانی کی یہ روایت بھی ذکر کی جاتی ہے جو ابن عمر رضی اللہ عنہما سے ان الفاظ کے ساتھ مروی ہے:

«مَنْ جَاءَ نِيْ زَائِراً لَا تنزعُهُ إِلَّا زِيَارَتِيْ كَانَ حَقًّا عَلَيَّ أَنْ أَكُوْنَ لَهُ شَفِيْعاً يَّوْمَ الْقِيَامَةِ »[2]

''جو میری زیارت کے لیے آیا، اس کو صرف میری زیارت نے اکسایا تو مجھ پر فرض ہے کہ میں قیامت کے دن اس کی سفارش کروں۔''

لیکن اس حدیث میں ایک راوی عبداللہ بن عبداللہ بن عمر عمری ہے جس کو ضعیف قرار دیا گیا ہے، اس لیے سلف اور ائمہ میں سے کسی نے بھی اس سے استدلال نہیں کیا اور اس جیسی حدیث سے کسی شرعی حکم کو ثابت کرنا جائز نہیں۔ اس پر علمائے اسلام کا اتفاق ہے۔ واللہ أعلم[3]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٣١٨)

[2] المعجم الكبير (٢٩١/١٢) علامہ ہیثمی رحمہ اللہ نے مجمع الزوائد (٦٦٦/٣) میں کہا ہے کہ اس کی سند میں مسلمہ بن سالم راوی ضعیف ہے۔

[3] مجموع الفتاویٰ (٢٧/ ٢٤_٢٩)

مکہ اور مدینہ میں سے افضل

سوال مکہ افضل ہے کہ مدینہ؟

جواب مکہ افضل ہے۔ عبداللہ بن عدی بن حمراء رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ ''حزورۃ'' نامی جگہ پر کھڑے ہوئے اور فرمانے لگے:

«وَاللّٰهِ إِنَّكَ لَخَيْرُ أَرْضِ اللّٰهِ، وَأَحَبُّ أَرْضِ اللّٰهِ إِلَى اللّٰهِ، وَلَوْ لَا أَنَّ قَوْمِي أَخْرَجُوْنِي مِنْكَ مَا خَرَجْتُ»[1]

''اے مکہ، اللہ کی قسم! تو اللہ کی سب سے بہتر زمین ہے، اور اللہ کو سب سے پیاری زمین ہے۔ اگر میری قوم مجھے تجھ سے نہ نکالتی تو میں نہ نکلتا۔''

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح ہے۔

اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ مکہ سب سے بہتر اللہ کی زمین ہے اور اللہ اور اس کے رسول کو سب سے زیادہ پیاری ہے، یہ حدیث مکہ کی فضیلت میں صریح ہے۔

یہ حدیث جو بیان کی جاتی ہے:

"أَخْرَجْتَنِي مِنْ أَحَبِّ الْبِقَاعِ إِلَيَّ، فَاسْكِنِّي أَحَبَّ الْبِقَاعِ إِلَيْكَ"[2]

''تو نے مجھے اس علاقے سے نکالا ہے جو مجھے سب سے پیارا ہے، تو تو مجھے اس علاقے میں ٹھہرا جو تجھ کو سب سے پیارا ہے۔''

یہ موضوع اور من گھڑت روایت ہے، کسی اہلِ علم نے اسے نقل نہیں کیا۔ واللہ أعلم[3]

کیا تربتِ مدفنِ رسول ﷺ مسجدِ حرام سے افضل ہے؟

سوال کیا وہ تربت اور مٹی جس میں آنحضرت ﷺ دفن ہیں، مسجدِ حرام سے افضل ہے؟ کچھ کہتے ہیں کہ وہ زمین و آسمان سے افضل ہے۔ کچھ کہتے ہیں کہ وہ کعبہ سے افضل ہے؟

جواب وہ تربت جس میں حضور اکرم ﷺ مدفون ہیں، اس کی افضلیت کے متعلق میرے علم کے مطابق قاضی عیاض

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٩٢٥) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣١٠٨) صحيح الجامع (٧٠٨٩)

[2] المستدرك للحاكم (٤/٣) علامہ ذہبی رحمہ اللہ نے اسے موضوع کہا ہے۔

[3] مجموع الفتاویٰ (٣٦/٢٧)

کے سوا کسی نے نہیں کہا کہ وہ مسجدِ حرام، مسجدِ نبوی یا مسجدِ اقصیٰ سے افضل ہے۔ قاضی عیاض نے اس پر اجماع ذکر کیا ہے، لیکن ہمارے علم کے مطابق اس سے پہلے کسی نے یہ بات نہیں کہی اور اس پر کوئی حجت نہیں، بلکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا بدن مساجد سے افضل ہے۔

جس سے کوئی پیدا ہو یا جس میں دفن ہو تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ جس سے وہ پیدا ہوا ہو وہ اس سے افضل ہو۔ کوئی یہ نہیں کہتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے والدِ محترم عبداللہ کا بدن انبیا کے بدنوں سے افضل ہے، کیوں کہ اللہ زندہ سے مردہ اور مردہ سے زندہ نکالتا ہے۔ نوح علیہ السلام نبی کریم تھے، لیکن ان کا غرق ہونے والا بیٹا کافر تھا۔ ابراہیم خلیل الرحمان تھے مگر ان کا باپ آزر کافر تھا۔

مساجد کی افضلیت پر دلالت کرنے والی آیات و احادیث مطلق ہیں۔ ان سے انبیا کی قبریں یا صالحین کی قبریں مستثنیٰ نہیں کی گئیں۔ اگر قاضی عیاض کی ذکر کردہ بات صحیح ہوتی تو ہر نبی کا مدفن، بلکہ ہر صالح اور نیک بزرگ کا مدفن مساجد سے افضل ہوتا جو اللہ کے گھر ہیں۔ اس بنا پر تو مخلوق کے گھر خالق کے گھروں سے افضل ہو جائیں گے، جن میں اس نے اپنا نام لینے اور ذکر بلند کرنے کا حکم دیا ہے۔ یہ قول بدعت اور اصولِ اسلام کے مخالف ہے۔

اللہ تعالیٰ نے کوئی ذات ایسی پیدا نہیں کی جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات سے اس کی نگاہ میں زیادہ قابلِ احترام ہو، لیکن وہ مٹی جہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم دفن ہیں، وہ کعبہ سے افضل نہیں۔ کعبہ اس سے افضل ہے، جیسا کہ ذکر ہوا کہ قاضی عیاض کے سوا کسی نے اس مٹی کو کعبہ سے افضل قرار نہیں دیا، لیکن کسی عالم نے ان سے اتفاق نہیں کیا۔ واللہ أعلم [1]

شام میں اقامت کا حکم

سوال کیا دیگر بلادِ اسلام کی نسبت شام میں اقامت اختیار کرنا افضل ہے؟ نیز کیا اس سلسلے میں کوئی نصِ قرآنی یا حدیث موجود ہے؟ جواب عنایت فرما کر عند اللہ ماجور ہوں۔

جواب ہر وہ جگہ جہاں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اور نیکیوں کے زیادہ اسباب اور امکان موجود ہوں، جہاں انسان زیادہ علم، زیادہ صلاحیت اور زیادہ گرمجوشی سے عبادت کر سکے وہاں اس جگہ کی نسبت قیام کرنا افضل ہے جہاں یہ اسباب نسبتاً کم ہوں اور اطاعت و فرماں برداری میں اس کی وہ حالت نہ ہو، یہ بنیادی قاعدہ ہے۔

اللہ کے ہاں سب سے زیادہ معزز وہ ہے جو سب نے زیادہ پرہیزگار ہو۔

تقوے کی تفسیر اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں فرمائی ہے:

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۲۷/۳۷)

﴿لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ۗ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ۗ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ﴿۱۷۷﴾﴾ [البقرة: ۱۷۷]

''نیکی یہ نہیں کہ تم اپنے منہ مشرق اور مغرب کی طرف پھیرو اور لیکن اصل نیکی اس کی ہے جو اللہ، یومِ آخرت اور فرشتوں اور کتاب اور نبیوں پر ایمان لائے اور مال دے اس کی محبت کے باوجود قرابت والوں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافر اور مانگنے والوں کو اور گردنیں چھڑانے میں۔ اور نماز قائم کرے اور زکات دے اور جو اپنا عہد پورا کرنے والے ہیں جب عہد کریں اور خصوصاً جو تنگ دستی اور تکلیف میں اور لڑائی کے وقت صبر کرنے والے ہیں، یہی لوگ ہیں جنھوں نے سچ کہا اور یہی بچنے والے ہیں۔''

اللہ اور اس کے رسول کے حکم پر عمل کرنا اور ان کی منع کردہ چیزوں کو چھوڑ دینا یہی تقوے کی اصل ہے۔ اگر یہی اصل ہے تو یہ انسان کے حالات کے تنوع کے پیشِ نظر متنوع ہے۔

کبھی انسان کے لیے کفر و فسق اور طرح طرح کی بدعات سے آلودہ سرزمین پر قیام کرنا افضل ہوتا ہے۔ اگر وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ صحیح طور پر ادا کرنے پر قادر ہو اور وہاں ہاتھ اور زبان سے جہاد کر رہا ہو۔ ایسا شخص اگر سرزمینِ ایمان و اطاعت میں چلا آئے تو اس کی نیکیاں کم ہو جائیں گی، کیوں کہ وہاں وہ جہاد نہیں کر سکے گا، اگرچہ وہاں قیام اس کے لیے زیادہ راحت بخش ہو۔ اسی طرح اگر وہ خیر معدوم ہو جائے جو وہ فسق و فجور کی جگہ کر رہا تھا تو پھر وہاں قیام کا جواز وہ نہیں رہے گا جو پہلے تھا۔ اسی طرح اگر کوئی انسان ہجرت سے قاصر ہو اور افضل جگہ نقل مکانی نہ کر سکتا ہو جہاں اس کے لیے دین پر عمل کرنا آسان ہو، اللہ اور اس کے رسول کی فرماں برداری تو دونوں جگہوں پر ایک ہی ہے، لیکن وہاں زیادہ مشقت طلب ہے۔ جب دونوں جگہ اطاعت یکساں ہو تو ایسی صورت میں جہاں زیادہ مشقت ہوگی وہاں زیادہ فضیلت ہوگی۔ اس بنا پر کچھ علما نے مہاجرینِ حبشہ کو افضل قرار دیا ہے جو کافروں کے درمیان رہ کر دین پر عمل کر رہے تھے۔

اگر وہاں رہ کر انسان کے دین کا نقصان زیادہ ہو تو پھر وہاں سے نقل مکانی کر جانا افضل ہوتا ہے۔ اکثر لوگوں کا حال یہی ہے، وہ دفاع نہیں کرتے، بلکہ جمہور کے دین پر ہوتے ہیں۔

ان مقدمات کی بنا پر موجودہ اوقات میں دینِ اسلام اور اس کے حدود و شعائر شام میں نسبتاً بہتر اور غالب

ہیں۔ یہ بات محسوسات اور معقولات دونوں سے ثابت ہے اور یہ علم و ایمان کی دولت سے مالا مال عقلائے اسلام کے ہاں متفق علیہ کی حیثیت رکھتی ہے۔نصوص سے بھی یہی ثابت ہے۔

سنن ابی داود میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« سَتَكُوْنُ هِجْرَةٌ بَعْدَ هِجْرَةٍ، فَخِيَارُ أَهْلِ الْأَرْضِ أَلْزَمُهُمْ مُهَاجِرِ إِبْرَاهِيْمَ »①

''ہجرت کے بعد ہجرت ہو گی، جو اہلِ زمین میں سب سے بہتر ہوں گے وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ہجرت گاہ کا زیادہ التزام کریں گے۔''

سنن میں عبداللہ بن خولہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم کئی لشکر تیار کرو گے، (ایک) شام میں، (دوسرا) یمن میں اور (تیسرا) عراق میں۔'' ابن خولہ نے کہا: اے اللہ کے رسول! میرے لیے منتخب فرما دیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم شام کو منتخب کرنا، وہ اللہ کی بہترین زمین ہے۔ اس کی مخلوق میں سے بہترین لوگ اسے ہی منتخب کریں گے۔ جس نے انکار کیا، وہ یمن کے ساتھ مل جائے اور اس کے ساتھ غداری کرنے سے بچے (ایک روایت میں ہے: پھر تم اپنے تالابوں سے اپنی اور اپنے جانوروں کی پیاس بجھاؤ)، اللہ تعالیٰ نے میرے لیے شام اور اس کے باشندوں کی ضمانت دی ہے۔''②

ابن حوالہ کہا کرتے تھے: جس کی اللہ نے ذمے داری اٹھائی ہے تو وہ ضائع نہیں ہوگا۔شام کی فضیلت میں یہ دو احادیث نصوص کا درجہ رکھتی ہیں۔

صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اہلِ مغرب ہمیشہ غالب رہیں گے، ان کی مخالفت کرنے والا اور ان کو چھوڑنے والا ان کو نقصان نہیں پہنچا سکے گا، تا آنکہ قیامت قائم ہو جائے۔''③ امام احمد کا قول ہے: ''اہلِ مغرب، اہلِ شام ہیں۔''

یہ اس زمانے میں اہلِ مدینہ کی زبان تھی۔ وہ اہلِ نجد و عراق کو اہلِ مشرق کہتے تھے اور اہلِ شام کو اہلِ مغرب، کیوں کہ مشرقی جہت اور مغربی جہت نسبتی چیزیں ہیں۔ ہر جگہ کا اپنا مشرق و مغرب ہوتا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات مدینہ میں فرمائی تھی۔تو اس وقت جو علاقے اس کے مغرب میں تھے وہ مغربی کہلاتے تھے اور جو اس کے مشرق میں تھے، وہ مشرقی کہلاتے تھے۔علمِ جغرافیہ سے بھی یہی ثابت ہے۔

---

① سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٤٨٢) ضعيف الجامع، رقم الحديث (٣٢٥٩)

② سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٤٨٣) صحيح الجامع، رقم الحديث (٣٦٥٩)

③ صحيح مسلم، رقم الحديث (١٩٢٥)

مسند احمد جیسی کئی معتبر کتابوں میں اس اصل پر دلالت کرنے والے کئی آثار رسول اللہ ﷺ سے منقول ہیں، مثلاً آپ ﷺ نے اہلِ شام کی تعریف میں فرمایا: ''ان کے منافق ان کے مومنوں پر غالب نہیں آ سکیں گے۔''[1]

آپ ﷺ کا یہ فرمان: ''میں نے دیکھا گویا اسلام کا ستون میرے سر کے نیچے سے پکڑ لیا گیا۔ میں نے اپنی نگاہ اس کے پیچھے پیچھے لگا دی تو وہ شام جا پہنچی۔''[2] اس معنی میں اور بھی بہت سے آثار ہیں جو ایک دوسرے کی تائید کرتے ہیں۔ کتاب و سنت، سابقہ انبیا کی مرویات، محسوسات و منقولات سے حاصل ہونے والی معلومات اور عارفوں کے کشفوں سے یہ معلوم ہوتا ہے۔ خلق و امر کی ابتدا مکہ سے ہوئی جو تمام بستیوں کی ماں اور خلق کی اصل ہے۔ وہیں سے رسالتِ محمدی کا آغاز ہوا اور اس کی روشنی ساری زمین پر چھا گئی۔ اللہ نے اس کو قبلہ بنا دیا۔ لوگ اس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے ہیں اور وہاں حج کے لیے جاتے ہیں۔ دین و دنیا کی بے شمار مصلحتیں وہاں قائم ہیں۔

پہلے زمانے میں اسلام کا ظہور سرزمینِ حجاز پر بڑی آب و تاب سے ہوا۔ مذکورہ دلائل سے معلوم ہوتا ہے کہ نبوت کا ملک شام ہے اور وہیں اکٹھے ہونا ہے تو بیت المقدس اور اس کے اردگرد کی سرزمین میں خلق و امر لوٹے گا۔ وہاں مخلوق اکٹھی ہو گی اور آخری زمانے میں اسلام شام میں زیادہ ظاہر اور غالب ہو گا۔ جس طرح مکہ بیت المقدس سے افضل ہے تو امت کا پہلا طبقہ آخری طبقے سے افضل ہے۔ آخری زمانے میں دین کا شام لوٹنا خود معراج کے واقعے سے بھی مستنبط ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کو مسجدِ حرام سے مسجدِ اقصیٰ تک سیر کروائی گئی۔ آخری زمانے میں بہترین لوگ ابراہیم کی ہجرت گاہ تک پہنچنے کا زیادہ التزام کریں گے جو شام میں ہے اور یہ محسوس بھی کیا جا رہا ہے۔

قرآن پاک کی پانچ آیات شام کی برکت پر دلالت کرتی ہیں جو حسبِ ذیل ہیں:

1. ﴿ وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ﴾

[الأعراف: ١٣٧]

''اور ہم نے ان لوگوں کو جو کمزور سمجھے جاتے تھے، اس سرزمین کے مشرقوں اور اس کے مغربوں کا وارث بنا دیا، جس میں ہم نے برکت رکھی ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو ارضِ شام کا وارث بنایا تھا:

2. ﴿ سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِيْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ ﴾

[بني إسرائيل: ١]

---

[1] مسند أحمد (٤٩٩/٣) المعجم الكبير (٢٠٩/٤) شیخ البانی رحمہ اللہ اور شعیب ارناؤوط نے اسے ضعیف کہا ہے۔

[2] مسند أحمد (١٩٨/٤) علامہ ہیثمی رحمہ اللہ نے مجمع الزوائد (٣٥/١٠) میں کہا ہے کہ اس کی سند میں عبدالعزیز بن عبید اللہ ضعیف راوی ہے۔

''پاک ہے وہ جو رات کے ایک حصے میں حرمت والی مسجد سے بہت دور کی اس مسجد تک لے گیا جس کے ارد گرد ہم نے بہت برکت دی ہے۔''

3 ﴿وَنَجَّيْنٰهُ وَلُوْطًا اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا﴾ [الأنبياء:٧١]

''اور ہم نے اسے اور لوط کو اس سرزمین کی طرف نجات دی جس میں ہم نے جہانوں کے لیے برکت رکھی۔''

4 ﴿وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ عَاصِفَةً تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖٓ اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا﴾ [الأنبياء:٨١]

''اور سلیمان کے لیے ہوا (مسخر کر دی) جو تیز چلنے والی تھی، اس کے حکم سے اس زمین کی طرف چلتی تھی جس میں ہم نے برکت رکھی۔''

5 ﴿وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ الْقُرَى الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا قُرًى ظَاهِرَةً﴾ [السبأ: ١٨]

''اور ہم نے ان کے درمیان اور ان کی بستیوں کے درمیان جن میں ہم نے برکت رکھی، نظر آنے والی بستیاں بنا دیں۔''

یہ وہ پانچ آیات ہیں اور برکت دینی برکت کو بھی شامل ہے، دنیاوی کو بھی اور دونوں ہی بلاشبہہ معلوم اور محسوس ہیں۔

یہ من حیث الجملہ فضیلت ہے، لیکن انفرادی طور پر بہت سے لوگوں کے لیے غیر شام میں اقامت پذیر ہونا افضل ہو سکتا ہے۔ اگر بہت سے شامی کسی ایسی جگہ نقل مکانی کر جائیں جہاں ان کے لیے دین پر عمل کرنے کے لیے زیادہ مواقع ہوں اور وہ زیادہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کر سکیں تو وہ ان کے لیے افضل ہو گا۔

ابو درداء رضی اللہ عنہ نے سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے کہا: مقدس زمین میں آ جاؤ۔ سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: زمین کسی کو مقدس نہیں بناتی۔ آدمی کا عمل اس کو مقدس بناتا ہے۔ بات حضرت سلمان فارسی ہی کی ہے۔ مکہ، اللہ اس کو اپنی حفاظت میں رکھے، سب سے مقدس اور اشرف بُقعہ ہے۔ وہ اسلام کی غربت کے دنوں دارِ کفر اور دار الحرب تھا اور وہاں ٹھہرے رہنا حرام تھا۔ جب مسلمانوں نے ہجرت کی تو ان کے لیے اس کے بعد وہاں آنا اور اقامت اختیار کرنا حرام کر دیا گیا۔

شام، موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں بنی اسرائیل کو لے کر نکلنے سے پہلے، صابی، مشرک اور سرکش لوگوں کا ملک اور دار الفاسقین تھا، اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے کہا تھا:

﴿سَاُورِيْكُمْ دَارَ الْفٰسِقِيْنَ﴾ [الأعراف: ١٤٥]

''عنقریب میں تمھیں نافرمانوں کا گھر دکھاؤں گا۔''

زمین کا دارِ کفر، دارِ اسلام یا دارِ ایمان، دارِ سلامتی، دارِ حرب، دارِ طاعۃ، دارِ معصیت، دار المومنین یا دار الفاسقین ہونا عارضی صفات ہیں، لازمی نہیں۔ یہ ایک وصف سے دوسرے وصف میں منتقل ہوتی رہتی ہے، جیسے آدمی خود کفر سے

اسلام، ایمان اور علم کی طرف منتقل ہوتا ہے اور اس کے عکس بھی۔

ہر وقت اور ہر جگہ میں دائمی فضیلت تو ایمان اور عملِ صالح ہی کی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالنَّصَارَىٰ وَالصَّابِئِينَ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ ﴾ [البقرة: ٦٢]

''بے شک جو لوگ ایمان لائے اور جو یہودی بنے اور نصاریٰ اور صابی، جو بھی اللہ پر اور یوم آخرت پر ایمان لائے گا اور نیک عمل کرے گا تو ان کے لیے ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے۔''

﴿ وَقَالُوا لَن يَدْخُلَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَن كَانَ هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ ۗ تِلْكَ أَمَانِيُّهُمْ ۗ قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ﴿١١١﴾ بَلَىٰ مَنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهُ أَجْرُهُ عِندَ رَبِّهِ ﴾

[البقرة: ١١١، ١١٢]

''اور انھوں نے کہا جنت میں ہرگز داخل نہیں ہوں گے مگر جو یہودی ہوں گے یا نصاریٰ۔ یہ ان کی آرزوئیں ہی ہیں، کہہ دے لاؤ اپنی دلیل، اگر تم سچے ہو۔ کیوں نہیں، جس نے اپنا چہرہ اللہ کے تابع کر دیا اور وہ نیکی کرنے والا ہو تو اس کے لیے اس کا اجر اس کے رب کے پاس ہے۔''

فرمایا:

﴿ وَمَنْ أَحْسَنُ دِينًا مِّمَّنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ وَاتَّبَعَ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا ۗ وَاتَّخَذَ اللَّهُ إِبْرَاهِيمَ خَلِيلًا ﴿١٢٥﴾ ﴾ [النساء: ١٢٥]

''اور دین کے لحاظ سے اس سے بہتر کون ہے جس نے اپنا چہرہ اللہ کے لیے تابع کر دیا، جب کہ وہ نیکی کرنے والا ہو اور اس نے ابراہیم کی ملت کی پیروی کی، جو ایک (اللہ کی) طرف ہو جانے والا تھا اور اللہ نے ابراہیم کو خاص دوست بنا لیا۔''

اپنا چہرہ اللہ کے سپرد کرنے سے مراد نیت خالص کرنا، صرف اللہ کی رضا کی خاطر عمل کرنا اور اسی پر توکل کرنا ہے، دوسرے لفظوں میں تسلیم و رضا کی خو۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ ﴾ [الفاتحة: ٤]

''ہم صرف تیری عبادت کرتے ہیں اور صرف تجھ سے مدد مانگتے ہیں۔''

﴿ فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ ﴾ [هود: ١٢٣]

''سو اس کی عبادت کر اور اس پر بھروسا کر۔''

﴿ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيبُ ﴾ [هود: ٨٨]

''میں نے اسی پر بھروسا کیا اور میں اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔''

اللہ تعالیٰ نے جب سے اپنے ختمی مرتبت پیغمبر کو مبعوث کر کے اہلِ زمین پر حجت قائم کر دی ہے۔ تب سے اہلِ زمین پر آپ ﷺ پر ایمان لانا، آپ ﷺ کی اطاعت کرنا اور آپ ﷺ کی شریعت و منہاج کی پیروی کرنا لازم کر دیا ہے۔

لوگوں میں سب سے زیادہ علم رکھنے والا اور اپنے علم، حال، قول اور عمل کے ذریعے سب سے زیادہ فرماں برداری کرنے والا ہی سب سے افضل ہوتا ہے۔ ایسے لوگ سب سے زیادہ پرہیز گار ہوتے ہیں۔ جو جگہ اور عمل انسان ے لیے اس مقصد کے لیے زیادہ سازگار اور معاون ہو، وہی اس کے لیے افضل ہوتا ہے، اگرچہ کسی اور کے لیے کوئی اور چیز بہتر ہو۔ لہٰذا ہر انسان وہ کرے جو اس کے لیے اور اس کے حق میں افضل ہو، اگر دو مختلف جگہوں پر رہتے ہوئے دو آدمیوں کو نیکیوں اور مصالح کے یکساں مواقع ملتے ہوں تو وہ دونوں فضیلت میں برابر ہوں گے، ورنہ ان امور میں جو زیادہ آگے ہو گا، وہ افضل ہو گا۔

آج کے زمانے میں مساجدِ ثلاثہ میں علم و ایمان کے اعتبار سے وہ بہار نہیں جو پہلے کبھی ہوتی تھی۔ آج ان امور میں اقصائے مغرب کے باشندے سبقت لے گئے ہیں، اس لیے ہر حال میں زمین کے کسی ٹکڑے کی فضیلت کو اس کے باشندوں کی فضیلت پر محمول نہیں کرنا چاہیے، بلکہ ہر ایک کو اس کا حق دینا چاہیے۔ انسان کی فضیلت کا اصل معیار اس کے ایمان و عمل کی قوت اور خوش گفتاری ہی ہے۔

بعض اوقات کچھ علاقے اور زمین کے حصے کچھ نیک اعمال میں زیادہ معاون ہوتے ہیں، جس طرح مکہ میں طواف کیا جاتا ہے اور وہاں نماز پڑھنے کا اجر بھی کئی گنا زیادہ ملتا ہے۔ تاہم ایسا بھی ہوتا ہے کہ افضل زمین پر کوئی ایسا قوی معارض سامنے آ جائے جو اس کو مفضول بنا دے، مثلاً کوئی شخص مکہ میں چلا جائے، لیکن وہاں جا کر لوگوں سے مانگنے کا پیشہ اختیار کرے، بہت سے نیک اعمال چھوڑ دے۔ اسی طرح اگر کوئی شام میں اقامت اختیار کرتا ہے کہ یہاں اس کی جان اور مال زیادہ محفوظ ہے۔ نیک عمل سے اس کو کوئی غرض نہیں۔ یہ تو نیتوں کا معاملہ ہے اور «إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ»[1] جو جس نیت سے عمل کرتا ہے وہی پھل پاتا ہے۔

اگر کسی چیز کو بالجملہ کسی دوسری چیز پر بالجملہ فضیلت دی گئی ہے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کے تمام افراد ہی دوسری کے تمام افراد سے افضلیت رکھتے ہیں، مثلاً دوسری صدی کی تیسری صدی پر فضیلت، عرب کی اپنے سوا پر فضیلت، قریش کی اپنے دیگر پر فضیلت وغیرہ وغیرہ۔ واللہ أعلم[2]

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (١) صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٩٠٧)

[2] مجموع الفتاویٰ (٢٧/٣٩_٤٧)

جبلِ لبنان کی فضیلت کی حقیقت

سوال کیا جبلِ لبنان کی فضیلت میں کوئی آیت یا حدیث وارد ہوئی ہے؟ کیا دین میں کوئی ایسا حکم ہے کہ لوگ جب اس کو دیکھیں تو اپنا سر اٹھا کر نگاہیں اس کی طرف مرکوز کر لیں؟ اور جو صبح یا شام اس پر نگاہ ڈالے گا تو عظیم برکت حاصل کرے گا؟ کیا اہلِ علم کے ہاں یہ بات معروف اور ثابت ہے کہ وہاں چالیس ابدال ہیں؟ یا وہاں کچھ ایسے لوگ تھے جن کے بال بکریوں کے بالوں جیسے تھے، نیز کیا یہ نیک لوگوں کا حلیہ ہے؟ کیا وہاں زیارت کی نیت سے جانا جائز ہے؟ کیا وہاں کوئی نبی مدفون ہے؟ کیا وہاں رجالِ غیب ہیں؟ اگر ہیں تو کس طرح کے ہیں؟ کیا دین میں اس طرح کا عقیدہ رکھنا جائز ہے؟ کیا ان امور میں مداہنت کرنے والا یا انھیں پسند کرنے والا گناہ گار ہے؟ نیز ان حالات میں امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرنے والا واقعی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے والوں میں شمار ہوگا؟

جواب جبلِ لبنان یا اس طرح کی جگہوں کی فضیلت سے متعلق اللہ اور اس کے رسول سے کوئی نص منقول نہیں، بلکہ یہ اور اس طرح کے سارے پہاڑ اللہ کی تخلیق اور نشانیاں ہیں جو اس نے زمین کو سہارنے اور ٹھہرائے رکھنے کے لیے بنائے ہیں۔ ان میں اللہ کی مخلوق کے لیے بے شمار فوائد ہیں اور یہ اللہ کی بندوں پر نعمتوں میں سے ایک نعمت ہیں۔ آخر کار اللہ ان کو اڑا کر رکھ دے گا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْجِبَالِ فَقُلْ يَنْسِفُهَا رَبِّيْ نَسْفًا ﴿١٠٥﴾ فَيَذَرُهَا قَاعًا صَفْصَفًا ﴿١٠٦﴾ لَّا تَرٰى فِيْهَا عِوَجًا وَّلَاۤ اَمْتًا ﴿١٠٧﴾ ﴾ [طٰہٰ: ۱۰۵۔۱۰۷]

''اور وہ تجھ سے پہاڑوں کے بارے میں پوچھتے ہیں تو کہہ دے میرا رب انھیں اڑا کر بکھیر دے گا۔ پھر انھیں ایک چٹیل میدان بنا کر چھوڑے گا۔ جس میں تو نہ کوئی کجی دیکھے گا اور نہ کوئی ابھری ہوئی جگہ۔''

یہ جو کچھ لوگوں سے اس طرح کی کہانیاں نقل کی جاتی ہیں کہ جبلِ لبنان اور جبلِ لکام میں کچھ اللہ کے بندے اکٹھے ہوتے ہیں اور ان سے طرح طرح کی باتیں اور افعال نقل کیے جاتے ہیں تو اس کی اصلیت یہ ہے کہ یہ سارے پہاڑی مقامات سرحدی علاقے تھے، جہاں مسلمان دشمنوں سے جہاد کرنے کی غرض سے پڑاؤ ڈالتے اور سرحدوں کی حفاظت اور پہرے داری کا کام کرتے تھے، جب مسلمانوں نے سارا شام اور دیگر علاقے فتح کیے تو اس وقت غزہ، عسقلان، عکہ، بیروت، جبلِ لبنان، طرابلس، مصیصہ، سیس، طرسوس، اذنہ، جبلِ لکام، ملطیہ، آمد، جبلِ لیسون اور قزوین سے شاش تک کی طرح کے علاقے سرحدی علاقے تھے۔ اسی طرح سکندریہ اور عراق میں عبادان وغیرہ کا علاقہ

بھی سرحدی علاقہ شمار ہوتا تھا۔ نیک لوگ اللہ کی راہ میں پہرے داری اور جہاد کے لیے سرحدی علاقوں میں آتے جاتے رہتے تھے، کیوں کہ اللہ کی راہ میں جہاد کے لیے سرحدی مقامات پر قیام اور رباط مکہ و مدینہ کی مجاوری کرنے سے افضل ہے اور مجھے اس میں کسی کا اختلاف معلوم نہیں۔

صحیح مسلم میں حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«رِبَاطُ يَوْمٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ خَيْرٌ مِنْ صِيَامِ شَهْرٍ وَقِيَامِهِ، وَمَنْ مَاتَ مُرَابِطًا مَاتَ مُجَاهِداً وَجَرَى عَلَيْهِ عَمَلُه وَأُجْرِيَ عَلَيْهِ رِزْقُهُ مِنَ الْجَنَّةِ وَأَمِنَ الْفَتَّانَ »[1]

''اللہ کی راہ میں ایک دن اور رات کا رباط ماہِ رمضان کے روزوں اور قیام سے بہتر ہے، جو حالتِ رباط میں فوت ہوا وہ مجاہد فوت ہوا، اس کا عمل جاری کر دیا جاتا ہے، جنت سے اس کے رزق کا اجرا کر دیا جاتا ہے اور وہ (قبر میں منکر نکیر) سے امن میں رہتا ہے۔''

سنن میں حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«رِبَاطُ يَوْمٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ خَيْرٌ مِنْ أَلْفِ يَوْمٍ مِمَّا سِوَاهُ مِنَ الْمَنَازِلِ »[2]

''اللہ کی راہ میں ایک دن کا رباط دیگر مقامات پر ایک ہزار دن گزارنے سے بہتر ہے۔''

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا قول ہے:

''لَأَنْ أُرَابِطَ لَيْلَةً فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ أَحَبُّ إِلَيَّ مِنْ أَنْ أَقُوْمَ لَيْلَةَ الْقَدْرِ عِنْدَ الْحَجَرِ الْأَسْوَدِ''

''مجھے اللہ کی راہ میں ایک رات کا رباط حجرِ اسود کی قربت میں لیلۃ القدر گزارنے سے زیادہ محبوب ہے۔''

کیوں کہ رباط جہاد کی جنس اور قبیل سے ہے اور مجاورت تنسک اور تعبد کی جنس سے، جنس جہاد کتاب وسنت اور اجماع کی روشنی میں جنسِ تنسک سے افضل ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَآجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَجٰهَدَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ لَا يَسْتَوٗنَ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿١٩﴾ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۙ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ﴿٢٠﴾ يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ وَّجَنّٰتٍ لَّهُمْ فِيْهَا نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ ﴿٢١﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۚ اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿٢٢﴾ ﴾ [التوبة: ١٩-٢٢]

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٩١٣)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (١٦٦٧) سنن النسائي، رقم الحديث (٣١٦٩) ضعيف الجامع (٣٠٨٤)

''کیا تم نے حاجیوں کو پانی پلانا اور مسجد حرام کو آباد کرنا اس جیسا بنا دیا جو اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان لایا اور اس نے اللہ کے راستے میں جہاد کیا۔ یہ اللہ کے ہاں برابر نہیں ہیں اور اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔ جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے ہجرت کی اور اللہ کے راستے میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ جہاد کیا، اللہ کے ہاں درجے میں زیادہ بڑے ہیں اور وہی لوگ کامیاب ہیں۔ ان کا رب انھیں اپنی طرف سے بڑی رحمت اور عظیم رضا مندی اور ایسے باغوں کی خوشخبری دیتا ہے جن میں ان کے لیے ہمیشہ رہنے والی نعمت ہے۔ جس میں وہ ہمیشہ رہنے والے ہیں ہمیشہ۔ بے شک اللہ ہی ہے جس کے پاس بہت بڑا اجر ہے۔''

جہاد اور رباط کے فضائل بکثرت ہیں۔ اس لیے صالح اہلِ ایمان سرحدی مقامات پر جہاد اور پہرے داری کی نیت سے پڑاؤ ڈالتے اور رباط کیا کرتے تھے، مثلاً: امام اوزاعی، ابو اسحاق مزاری، مخلد بن حسین، ابراہیم بن ادہم، عبداللہ بن مبارک، حذیفہ مرعشی اور یوسف بن اسباط وغیرہم شامی سرحدی علاقوں میں جہاد اور پہرے داری کی نیت سے قیام کیا کرتے تھے، بلکہ کچھ تو شامی سرحدی علاقوں میں رباط کے لیے عراق اور خراسان وغیرہما سے بھی آیا کرتے تھے، کیوں کہ اہلِ شام عیسائی اہلِ کتاب سے لڑا کرتے تھے۔ اور سنن میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ قَتَلَهُ أَهْلُ الْكِتَابِ فَلَهُ أَجْرُ شَهِيْدَيْنِ))[1]

''جس کو اہلِ کتاب نے قتل کیا، اس کو دو شہیدوں کا اجر ملے گا۔''

کیوں کہ یہ لوگ یعنی عیسائی مذہبی جنگ کرتے تھے، باقی ترکی کافر وغیرہ کسی دین و مذہب کی بنیاد پر لڑائی نہیں لڑتے تھے۔ اگر یہ عیسائی غالب آ جاتے تو دین و دنیا سب میں فساد مچا دیتے، مگر ترک غالب آنے کی صورت میں ملک اور بادشاہت میں تو فساد مچاتے مگر دینی فساد اس کے تابع ہوتا۔ وہ اصلاً دین کی بنیاد پر نہیں لڑتے تھے، اس لیے اس وقت کی فقہی اور علمی کتابوں میں ''طرطوس'' کا ذکر بڑے تواتر سے ملتا ہے جو مسلمانوں کی سرحدی چوکی تھی، حتی کہ امام احمد اور سری سقطی جیسے علما اور مشائخ بھی رباط کے لیے وہاں جایا کرتے تھے، خود مامون اس کے قریب فوت ہوا۔

بنابریں متقدمین کی کتابوں میں جو عسقلان، اسکندریہ، عکہ، یا قزوین وغیرہ کی فضیلت اور وہاں نیک لوگوں کی خبروں کا عام ذکر ملتا ہے، وہ ان جگہوں کی خصوصیت کی بنا پر نہیں، بلکہ ان کے سرحدی علاقے ہونے کی وجہ سے ہے، کسی علاقے کا مسلمانوں کا سرحدی علاقہ ہونا یا نہ ہونا اس کی عارضی صفت ہوتی ہے، دائمی نہیں، جیسے کوئی علاقہ دارِ اسلام ہوتا ہے یا دارِ کفر، دارِ حرب ہوتا ہے یا دارِ امن، دارِ علم و ایمان ہوتا ہے یا دارِ جہالت اور نفاق۔ علاقے وہاں کے باشندوں اور ان کی صفات کے لحاظ سے مختلف حالات سے دو چار ہوتے رہتے ہیں، مگر تین مساجد کے برخلاف ان

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٤٨٨) مگر اس کے الفاظ مختلف ہیں اور شیخ البانی رحمہ اللہ نے اسے ضعیف بھی کہا ہے۔

کے خصائص اور صفات دائمی ہیں، عارضی نہیں اور ان کو ان سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ باقی تمام مساجد کی جگہ کسی مصلحت کی بنا پر تبدیل کی جا سکتی ہے، گو یہ ایک نزاعی مسئلہ ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مسجدِ کوفہ کی جگہ تبدیل کی تھی، مسجد کو کسی دوسری جگہ تعمیر کروایا تھا اور پہلی جگہ کھجور فروشوں کی دکانوں میں تبدیل ہو گئی۔ امام احمد وغیرہ کا مذہب بھی یہی ہے۔

فصل: کوہِ لبنان میں خلوت نشینی کی اصلیت:

اگر یہ معروضات واضح ہو گئی ہیں تو یاد رکھیے کہ یہ شام کے ساحلی علاقے چوتھی صدی کے وسط تک اسلام کے سرحدی علاقے تھے۔ مسلمانوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد میں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی قیادت میں قبرص فتح کیا تھا۔ چوتھی صدی کے دوران میں خلافت اضطراب کا شکار ہو گئی اور مصر، مغرب، بلادِ مشرق اور ارضِ شام پر رافضیوں اور منافقوں کی حکومت قائم ہو گئی۔ یہ لوگ شام کے ساحلی اور غیر ساحلی علاقوں پر بھی قابض ہو گئے۔ یہ ایک رسوا قوم تھی جس کے پاس عقل تھی نہ نقل، نہ صحیح دین تھا اور نہ دنیا کی عزت۔ لہٰذا عیسائی شام کے عام بلکہ اکثر ساحلی علاقوں پر قابض ہو گئے۔ انھوں نے رافضیوں اور منافقوں وغیرہ کو مغلوب کر لیا اور بہت سے علاقے ان سے ہتھیا لیے۔

پھر وہ وقت آیا جب نور الدین زنگی اور صلاح الدین ایوبی جیسے اہلِ سنت بادشاہوں کے ہاتھ میں اقتدار آیا اور انھوں نے شام کے عام علاقے عیسائیوں سے واپس لے لیے۔ بچنے والے رافضیوں اور منافقوں نے جبلِ لبنان وغیرہ میں پناہ لے لی۔ وہاں بھی وہ عیسائیوں کے زیرِ تسلط ہی رہے اور ان کے مزارعوں کی حیثیت سے رہنے لگے۔ اس طرح جبلِ لبنان جیسے علاقے عیسائیوں اور رافضیوں کے ہاتھوں میں آتے جاتے رہے۔ ان علاقوں کی کوئی فضیلت نہیں، بلکہ ایسی جگہ عیسائیوں اور رافضیوں کے درمیان رہنا ہی جائز نہیں جہاں وہ مسلمانوں کو اپنے دین کے اظہار سے روکتے ہوں۔

تاہم کچھ زہد و عبادت کے شائق اور خلوت پسند لوگ اس سوچ کے ساتھ اس پہاڑ کی فضیلت کے قائل ہیں کہ انسان وہاں خلوت نشین ہو سکتا ہے اور پھلوں وغیرہ پر گزارہ کر سکتا ہے۔ اس نیت کے ساتھ اس کا ارادہ کرتے ہیں جو ان کی غلطی اور خطا ہے، کیوں کہ عام حالات میں مسلمانوں کے لیے پہاڑوں، جنگلوں اور وادیوں میں سکونت اختیار کرنا مشروع اور جائز نہیں، مگر جب شہروں میں رہنے میں ایسا فتنہ ہو جس کی وجہ سے انسان اپنا دین چھوڑنے پر مجبور ہو جائے اور فرائض کو ادا کرنے اور حرام کاموں کو چھوڑنے سے قاصر ہو تو ایسے حالات میں مسلمان ایسی زمین کو چھوڑ جائے جہاں دین پر چلنے اور اس کو قائم رکھنے سے قاصر ہو اور وہاں چلا جائے جہاں دین کو قائم رکھ سکتا ہو، کیوں کہ مہاجر وہ ہے جو اس کام کو چھوڑ دے جس سے اللہ نے منع کیا ہے۔

ان زاہد اور عابد قسم کے لوگوں میں کچھ ایسے لوگ بھی ہو سکتے ہیں جو اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے ہوں، کچھ

ایسے بھی ہو سکتے ہیں جو درمیانی راہ پر چلنے والے ہوں، کچھ گناہ گار ہوں مگر اللہ نے ان کے گناہ بخش دیے ہوں، مگر جو نیکیوں میں آگے رہنے والے اور اللہ کے مقرب بندے ہوتے ہیں وہ فرائض کے بعد نوافل کے ذریعے اللہ کا قرب تلاش کرتے ہیں، جس طرح صحیح حدیث قدسی میں ذکر ہوا ہے۔

مسلمانوں کے ہاں اس بات میں کوئی اختلاف نہیں کہ شہروں میں رہنے والے عابد اور زاہد پہاڑوں اور وادیوں میں رہنے والے عابدوں اور زاہدوں سے بہت بہتر ہیں، جس طرح شہر کے رہنے والے کو بستی کے رہنے والے اور مہاجر کو دیہاتی پر فضیلت ہوتی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ كُفْرًا وَّنِفَاقًا وَّاَجْدَرُ اَلَّا يَعْلَمُوْا حُدُوْدَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ ﴾ [التوبة: ٩٧]

''بدوی لوگ کفر اور نفاق میں زیادہ سخت ہیں اور زیادہ لائق ہیں کہ وہ حدیں نہ جانیں جو اللہ نے اپنے رسول پر نازل کی ہیں۔''

حدیث میں ہے:

« إِنَّ مِنْ أَكْبَرِ الْكَبَائِرِ أَنْ يَرْتَدَّ الرَّجُلُ أَعْرَابِيًا بَعْدَ الْهِجْرَةِ »[1]

''ہجرت کے بعد اعرابی ہو جانا کبیرہ گناہ ہے۔''

یہ اس سے متعلق ہے جو بستی میں لوگوں کے درمیان رہتا ہو تو جو کسی بستی یا پہاڑ میں اکیلا ہی مقیم ہو، اس کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے؟ یہ شخص جن دنیوی مصلحتوں اور فوائد سے محروم رہتا ہے، اسی طرح کی یا اس کے قریب قریب دینی مصلحتوں سے بھی محروم رہتا ہے، کیوں کہ جماعت پر اللہ کا ہاتھ ہے اور ایک کے ساتھ دوسرا شیطان ہوتا ہے اور جب دو ہو جائیں تو شیطان کچھ دور بھاگ جاتا ہے۔

فصل: کوہِ لبنان میں چالیس ابدال کی اصلیت:

اگر کچھ جاہل لوگ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ وہاں چالیس ابدال رہتے ہیں تو یہ سراسر جہالت اور گمراہی ہے۔ وہاں چالیس ابدال کبھی اکٹھے ہوتے ہیں نہ ان کے لیے یہ مشروع ہے اور نہ اس میں کوئی فائدہ ہے۔ جاہل عوام کا یہ عقیدہ رافضیوں کے امام منتظر اور صاحبِ زماں خلیفہ کے عقیدے جیسا ہے جو ان کے عقیدے کے مطابق نظروں سے اوجھل ہے مگر شہروں میں حاضر ہوتا ہے۔ وہ اس کی بے تحاشا تعظیم کرتے ہیں اور اس سے برکت کی امید لگائے بیٹھے ہیں، حالانکہ وہ وجود ہی نہیں رکھتا اور اس کی کوئی اصلیت ہی نہیں، اس لیے ہر وہ شخص جو اپنے دین کو ایسی مجہول

---

[1] سنن النسائي، رقم الحديث (٥١٠٢) مگر الفاظ مختلف ہیں۔ صحيح الجامع (٥)

ہستیوں کے ساتھ معلق اور وابستہ کرتا ہے اور اس ہدایت اور دینِ حق سے منہ چڑاتا ہے جو اللہ نے اپنے رسول کو دے کر مبعوث کیا، وہ گمراہوں اور شریعتِ اسلام سے نکلے ہوئے لوگوں میں سے ہے، بلکہ آج کل تو وہاں عیسائی، نصیریہ اور رافضہ جیسے گمراہ لوگ رہتے ہیں، جن سے مسلمانوں نے کئی لڑائیاں لڑی ہیں۔ اسی طرح بہت سے جاہل، بہتان طراز اور ناممکنات کے قائلین کہتے پھرتے ہیں کہ وہاں یا کسی دوسری جگہ رجالِ غیب رہتے ہیں، یہ لوگ ان کی تعظیم کر کے حقیقت میں جاہل ترکوں، دیہاتیوں، کسانوں اور عام لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا کر ان کو دین کی حقیقت سے گمراہ کرتے ہیں اور ناجائز طریقے سے ان کا مال کھاتے ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ﴾ [التوبة: ٣٤]

''بے شک بہت سے عالم اور درویش یقیناً لوگوں کا مال باطل طریقے سے کھاتے ہیں اور اللہ کے راستے سے روکتے ہیں۔''

اللہ کا کوئی نبی اور ولی کبھی جسمانی طور پر لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہوتا، لیکن بہت سے اولیا کی دلی کیفیت لوگوں سے اوجھل رہتی ہے۔ وہ باطنی طور پر اللہ کے ولی ہوتے ہیں، علم و ایمان سے مالا مال ہوتے ہیں اور پاکیزہ احوال کے حامل ہوتے ہیں۔ وہ شہروں میں رہتے ہیں، مساجد میں ہوتے ہیں اور لوگوں کے ساتھ ہوتے ہیں، مگر اکثر لوگ ان کے حالات سے آگاہ نہیں ہوتے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

«رُبَّ أَشْعَثَ أَغْبَرَ، ذِي طِمْرَيْنِ، مَدْفُوعٍ بِالْأَبْوَابِ، لَوْ أَقْسَمَ عَلَى اللّٰهِ لَأَبَرَّهُ» [1]

''کوئی ایسا بھی ہوتا ہے، جس کے بال پراگندہ ہوں، وہ غبار سے اٹا ہوا ہو، اس کے پاس پرانی سی دو چادریں ہوں، لوگ دروازے ہی سے دھتکار دیں، مگر اللہ کی قسم کھالے تو اللہ اس کی قسم پوری کر دے۔''

یعنی وہ ایسا شخص ہوسکتا ہے جو اپنی پریشانی کی وجہ سے لوگوں کی نگاہوں میں نہ بیٹھ پاتا ہو مگر اللہ اس کی قسم پوری کر دے۔ تاہم یہ کوئی ضروری صفت نہیں، بلکہ اللہ کی ولایت وہی ہے جو اس فرمان میں ذکر ہوئی ہے:

﴿ اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿٦٢﴾ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ﴿٦٣﴾ ﴾ [يونس: ٦٢۔ ٦٣]

''سن لو! بے شک اللہ کے دوست، ان پر نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ وہ جو ایمان لائے اور بچا کرتے تھے۔''

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٢٢)

اللہ کے ولی وہ مومن ہیں جو تمام مباح اصناف میں بھی تقویٰ اختیار کرتے ہیں۔

اسی طرح جو یہ کہا جاتا ہے کہ وہاں ایسے لوگ رہتے ہیں جن کے بدنوں پر بکری کے بالوں جیسے بال ہیں، ایک محال خبر ہے۔ ہاں کچھ گمراہ قسم کے زاہد ضرور ہو سکتے ہیں جو تارکِ سنت ہوں اور جسم سے کسی طرح کے بال نہ اتارتے ہوں۔ ان کے جسموں پر بال ہی بال ہو سکتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو مونچھیں پست کرنے، بغلوں کے بال اکھاڑنے اور زیرِ ناف کے بال مونڈنے کا حکم دینا چاہیے، جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔

اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے علاوہ کسی دوسرے کی سیرت زیادہ کامل ہے یا کسی ولی کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت سے نکلنا ممکن ہے، جس طرح خضر، موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کے دائرے سے نکل گئے تھے تو ایسا شخص کافر ہے، جس کو پہلے توبہ کرائی جائے، اگر نہ مانے تو قتل کر دیا جائے، کیوں کہ موسیٰ علیہ السلام کی دعوت عام نہیں تھی اور خضر پر موسیٰ علیہ السلام کی فرمانبرداری فرض نہیں تھی، بلکہ خضر علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا: ''مجھے اللہ نے وہ علم دیا ہے جو آپ کو نہیں دیا اور آپ کو اللہ نے وہ علم دیا ہے جو میں نہیں جانتا۔''

مگر حضرت محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب تمام جنوں، انسانوں، عربیوں، عجمیوں، نزدیک و دور کے باشندوں، بادشاہوں اور رعایا اور عابدوں اور غیر عابدوں سب کی طرف اللہ کے رسول ہیں، ارشاد ہے:

﴿ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ﴾ [السبا: ٢٨]

''اور ہم نے تجھے نہیں بھیجا مگر تمام لوگوں کے لیے خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا۔''

نیز فرمایا:

﴿ قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعَاۨ الَّذِیْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ ﴾ [الأعراف: ١٥٨]

''کہہ دے اے لوگو! بے شک میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں، وہ (اللہ) کہ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی صرف اسی کی ہے۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

«وَكَانَ النَّبِيُّ يُبْعَثُ إِلَى قَوْمِهِ خَاصَّةً وَبُعِثْتُ إِلَى النَّاسِ عَامَّةً»[1]

''نبی خاص اپنی قوم کی طرف مبعوث ہوتا ہے اور میں تمام لوگوں کی طرف مبعوث ہوا ہوں۔''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی نبی کا انتظار ہے نہ کسی نئی کتاب کا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٢٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٢١)

ہیں، آپ ﷺ پر جو کتاب نازل ہوئی وہ پہلی کتابوں کی تصدیق کرنے والی اور ان کی نگہبان ہے۔

جو کسی بھی عالم، عابد یا بادشاہ سے متعلق یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی اتباع، فرمانبرداری اور کتاب وسنت سے علم حاصل کرنے سے ماورا ہے، وہ کافر ہے۔

اسلامی، ایمانی، نبوی، شرعی اور اللہ اور اس کے رسول اور اہلِ ایمان کی محبوب عبادتوں اور بدعی گمراہی اور جاہلیت کی عبادات کے درمیان فرق کرنا ناگزیر ہے، جن کے متعلق اللہ نے فرمایا ہے:

﴿ اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا لَمْ يَاْذَنْۢ بِهِ اللّٰهُ ﴾ [الشوریٰ: ۲۱]

''یا ان کے لیے کچھ ایسے شریک ہیں جنھوں نے ان کے لیے دین کا وہ طریقہ مقرر کیا ہے جس کی اللہ نے اجازت نہیں دی۔''

چاہے بعض اکابر عباد اور زہاد ایسی کچھ عبادات کے اسیر ہی کیوں نہ ہوں۔ صحاح میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو بتایا گیا کہ آپ ﷺ کے کچھ ساتھیوں میں سے ایک نے کہا: میں مسلسل روزے رکھوں گا، دوسرے نے کہا: میں ساری رات قیام کروں گا، تیسرے نے کہا: میں شادی نہیں کروں گا، چوتھے نے کہا: میں گوشت نہیں کھاؤں گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''لیکن میں روزہ رکھتا بھی ہوں، چھوڑتا بھی ہوں، قیام بھی کرتا ہوں، سوتا بھی ہوں، شادی بھی کرتا ہوں اور گوشت بھی کھاتا ہوں، جس نے میری سنت سے بے رغبتی دکھائی وہ مجھ سے نہیں۔''

بے رغبتی دکھانا یہ نہیں کہ جسے وہ پسند نہیں کرتا اور جسے کرنا نہیں چاہتا اس سے بے رغبتی کا اظہار کرنا، بلکہ اس چیز میں رغبت ظاہر کرنا اور اسے کرنے کا ارادہ کرنا ہے جو اس کام کے منافی ہے جو اللہ اور اس کے رسول نے پسند کیا اور اسے شریعت کا درجہ دیا ہے۔ ایسے شخص سے رسول اللہ ﷺ نے براءت کا اظہار فرمایا ہے، مثلاً کوئی شخص ہمیشہ ننگا رہے، یا ہمیشہ چپ رہے، یا ہمیشہ جنگل میں اور اکیلا رہے، یا ہمیشہ گوشت یا روٹی کھانا چھوڑ دے، یا ہمیشہ کے لیے راہبانہ طرزِ عبادت اختیار کرے اور دل میں یہ سمجھتا رہے کہ اللہ اور اس کے رسول کو یہ اعمال پسند ہیں جو عرف مین لوگ لباس پہنتے، کھاتے اور بات کرتے ہیں وہ پسند نہیں۔

اگر یہ مقدمہ واضح ہو گیا ہے تو پھر سوال میں مذکور پہاڑ یا وہاں رہنے والے کے لیے جس میلان یا جہاد کے ارادے یا کسی دوسرے جائز کام کی نیت اور ارادے کے بغیر وہاں جانے کا ذکر ہوا ہے، وہ سب کام جہالتوں اور گمراہیوں کا مجموعہ ہیں۔ اسی طرح وہاں کے درختوں پر لگنے والے پھلوں سے برکت حاصل کرنا جاہلیت کی بدعات ہیں جو عیسائی اور شرکیہ گمراہیوں ہی کی دوسری شکل ہیں۔ ایک معروف حدیث میں ہے کہ بصرہ بن ابی بصرہ غفاری نے جب دیکھا کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اس طور پہاڑ کی زیارت کے لیے گئے ہیں، جس پر اللہ نے موسیٰ علیہ السلام سے کلام کیا تھا تو کہا:

اگر میں تجھے وہاں جانے سے پہلے دیکھ لیتا تو کبھی تمھیں وہاں جانے نہ دیتا، کیوں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

«لَا تُشَدُّ الرِّحَالُ إِلَّا إِلَی ثَلَاثَةِ مَسَاجِدَ: اَلْمَسْجِدِ الْحَرَامِ، وَالْمَسْجِدِ الْأَقْصَی، وَمَسْجِدِيْ هٰذَا»[1]

''مسجدِ حرام، مسجدِ اقصیٰ اور میری مسجد؛ ان تین مساجد کے سوا کسی جگہ کی زیارت کے لیے رختِ سفر نہ باندھا جائے۔''

اگر طور کا سفر ناجائز ہے جس پر اللہ نے موسیٰ علیہ السلام سے کلام کیا تھا اور اس کو ''وادیِ مقدس'' اور ''بقعہ مبارکہ'' کا نام دیا تھا تو پھر دیگر طوروں کی زیارت کیا معنی رکھتی ہے؟ طور بھی تو پہاڑ ہی ہے۔

رہی وہ مشہور قبر جو کرک میں ہے اور جس سے متعلق دعویٰ کیا جاتا ہے کہ وہ نوح علیہ السلام کی قبر ہے، تو وہ بالکل بے بنیاد اور محال بات ہے، کسی صاحبِ علم و معرفت نے کبھی نہیں کہا کہ یہ نوح علیہ السلام یا کسی دوسرے نبی یا ولی کی قبر ہے، بلکہ تاریخ میں اصلاً اس قبر کا کوئی ذکر اور خبر نہیں ملتی، بلکہ یہ جگہ شجر کاری کے لیے مخصوص تھی اور ماضی قریب تک جولاہوں کے زیرِ تصرف تھی، وہاں لوگوں نے ایک قبر دیکھی، جس میں ایک بہت بڑی ہڈی تھی اور اس سے انھیں خوش بو آنے لگی تو جاہل سمجھ بیٹھے، ہو نہ ہو کہ کسی نبی کی قبر ہو، اس لیے تو اس سے خوش بو آ رہی ہے، پھر انھوں نے غور کیا کہ کون سا نبی بڑا ہوسکتا ہے؟ تو وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ وہ نوح علیہ السلام ہی ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا رافضیوں کی حکومت میں اس پر مزار کھڑا کر دیا گیا، جو حلب کے والی ناصر کے حلیف تھے۔ اس کے بعد ظاہر کے عہدِ حکومت میں اس میں اضافہ کر دیا گیا۔ اس طرح یہ بت بن گیا اور جاہل یہاں شرک کرنے لگے۔ حالانکہ رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ نے مٹی پر انبیا کا گوشت کھانا حرام کر دیا ہے۔''[2] اگر یہ کسی نبی کی قبر ہوتی تو محض ہڈی نہ ہوتی۔

مجھے وہاں کے رہنے والے ثقہ اور قابلِ اعتماد لوگوں نے بتایا ہے کہ ان کو ان کے بڑوں نے بتایا تھا کہ انھوں نے وہاں اس طرح کی کئی بڑی بڑی ہڈیاں دیکھی ہیں اور انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ وہاں پہلے درخت لگائے جاتے تھے اور جولاہے کپڑا بنا کرتے تھے۔ مزید یہ کہ مجھے ثقہ لوگوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ انھوں نے اس قبر کے قریب کئی قبروں میں بڑے بڑے سر بھی دیکھے ہیں، جو ان ہڈیوں کے ساتھ مطابقت رکھتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ عمالقہ قوم کی ہڈیاں ہوں گی جو زمانہ قدیم میں وہاں بستے تھے۔

اگر کسی نبی یا ولی کی قبر بھی ہو تب بھی اس پر مسجد بنانا بالاجماع اور مشہور احادیثِ رسول کی روشنی میں ناجائز

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١١٣٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٣٩٧)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٠٤٧) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٠٥٨) صحيح الجامع، رقم الحديث (٢٢٠٨)

ہے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ یہود و نصاریٰ پر لعنت کرے! انھوں نے اپنے نبیوں کی قبروں کو مساجد بنا لیا۔''[1]

آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم سے پہلے لوگ قبروں کو مساجد بناتے تھے، خبردار! قبروں کو مساجد نہ بنانا، میں تم کو اس سے منع کرتا ہوں۔''[2] کسی نبی یا دوسرے کی قبر کے پاس کوئی فرض یا نفل نماز پڑھنا بالاجماع مستحب نہیں، بلکہ اس سے منع کیا جاتا ہے۔ اور اکثر علما نصوص کی بنا پر اس نماز کو باطل کہتے ہیں۔ وہ خطے جن کو اللہ پسند کرتا ہے اور ان میں نماز اور عبادات پسند کرتا ہے وہ مساجد ہیں، جن کے متعلق اللہ کا فرمان ہے:

﴿ فِيْ بُيُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَيُذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ يُسَبِّحُ لَهٗ فِيْهَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ﴾ [النور: ٣٦]

''ان گھروں میں جن کے بارے میں اللہ نے حکم دیا ہے کہ وہ بلند کیے جائیں اور ان میں اس کا نام یاد کیا جائے، اس کی تسبیح بیان کرتے ہیں ان میں صبح و شام۔''

نیز فرمایا:

﴿ اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَلَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ فَعَسٰۤى اُولٰٓئِكَ اَنْ يَّكُوْنُوْا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ ۝ ﴾ [التوبة: ١٨]

''اللہ کی مسجدیں تو وہی آباد کرتا ہے جو اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان لایا اور اس نے نماز قائم کی اور زکات ادا کی اور اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈرا۔ تو یہ لوگ امید ہے کہ ہدایت پانے والوں سے ہوں گے۔''

رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا: اللہ کو کون سا بقعہ زمین زیادہ پسند ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''مساجد'' پوچھا گیا: زمین کا کون سا ٹکڑا اللہ کو سب سے زیادہ ناپسند ہے؟ فرمایا: ''بازار۔''[3]

رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''جو صبح مسجد جاتا ہے یا شام کو، اللہ نے اس کے لیے ہر صبح اور شام کے چکر کے لیے مہمان نوازی تیار کر رکھی ہے۔''[4]

فرمایا: ''بندہ جب طہارت حاصل کرتا ہے اور اچھی طرح وضو کرتا ہے، پھر مسجد کی طرف نکلتا ہے۔ وہ مسجد کی طرف صرف نماز کے لیے نکلتا ہے تو اس کا ہر اٹھتا ہوا قدم ایک درجہ بلند کرتا ہے اور دوسرا قدم ایک غلطی مٹاتا ہے۔''[5]

---

1. صحيح البخاري، رقم الحديث (١٣٢٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٢٩)
2. صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٣٢)
3. صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٧١)
4. صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٣١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٦٩)
5. صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٢٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٤٩)

دینِ اسلام ان تمام انواع کے محبوب اعمال کو بجا لانے، جو اللہ نے اپنے رسول کو دے کر مبعوث کیا اور ان تمام بدعات، گمراہیوں اور ہمہ قسم کے ممنوع اعمال سے اجتناب کرنے کا نام ہے جو اللہ اور اس کے رسول کو ناپسند ہیں۔

اسلامی عبادات میں تمام قسم کی شرعی نمازیں، جماعتیں، جمعے، تلاوتِ قرآن، شرعی ذکر، دعا اور اس کے تابع قلبی احوال اور بدنی اعمال اسی طرح صدقات و زکات کی تمام انواع، لوگوں کے ساتھ حسنِ سلوک کے تمام اعمال و مظاہر، کیوں کہ ہر اچھائی صدقہ ہے، الغرض تمام مشروع عبادتیں ان میں شامل ہیں۔ اللہ ہمیں اور ہمارے سارے اہلِ ایمان بھائیوں کو ان پر ثابت قدم رکھے۔ واللہ أعلم [1]

قبر پرستی کے اسباب ونتائج اور درگاہوں کی حقیقت

سوال قبر پرستی کے اسباب ونتائج اور درگاہوں کی حقیقت کیا ہے؟

جواب صحیحین میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مرض الموت میں فرمایا:

«لَعَنَ اللّٰهُ الْيَهُوْدَ وَالنَّصَارَى اتَّخَذُوْا قُبُوْرَ أَنْبِيَائِهِمْ مَسَاجِدَ» [2]

''یہود ونصاریٰ پر اللہ کی لعنت ہو، انھوں نے اپنے انبیا کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا۔''

''اگر یہ خدشہ نہ ہوتا تو آپ کی قبر ظاہر اور نمایاں کی جاتی، مگر یہ ڈر پیدا ہوا کہ کہیں اسے سجدہ گاہ نہ بنا لیا جائے۔'' یہ بخاری کے الفاظ ہیں۔

صحیحین میں حضرت عائشہ ہی سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مرض الموت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک زوجہ محترمہ نے ایک گرجے کا ذکر کیا جو اس نے سرزمینِ حبشہ میں دیکھا تھا۔ اس کا نام ''ماریہ'' تھا۔ اس کی خوب صورتی اور اس میں موجود تصویروں کا ذکر ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا سر اٹھایا اور فرمایا: ''ان لوگوں میں جب کوئی نیک آدمی فوت ہوتا تو اس کی قبر پر مسجد بنا دیتے، پھر اس میں وہ تصویریں بناتے، یہ لوگ اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ بد ہیں۔'' [3]

اس مفہوم کی احادیث صحاح، سنن اور مسانید وغیرہ میں مستفیض و مشہور ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبروں کو سجدہ گاہ بنانے سے منع کر کے شرک کی جڑ کاٹ دی ہے کہ جو دین کو خراب کرتا ہے اور اس کے ساتھ مشرکوں کا دین غالب ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قومِ نوح کے متعلق فرمایا:

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۲۷/۵۰۔۶۳)

[2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۱۳۲۴) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۵۲۹)

[3] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۴۲۴) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۵۲۸)

﴿وَقَالُوا لَا تَذَرُنَّ آلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَلَا سُوَاعًا وَلَا يَغُوثَ وَيَعُوقَ وَنَسْرًا ۝ وَقَدْ أَضَلُّوا كَثِيرًا﴾ [نوح: ٢٣، ٢٤]

''اور انھوں نے کہا تم ہرگز اپنے معبودوں کو نہ چھوڑنا اور نہ کبھی ودّ کو چھوڑنا ور نہ سواع کو اور نہ یغوث اور یعوق اور نسر کو۔ اور بلاشبہہ انھوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کر دیا۔''

صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ قومِ نوح کے بت عرب میں پوجے جانے لگ گئے۔ ''ودّ'' دومۃ الجندل میں بنوکلب کا بت تھا، ''سُواع'' ہذیل کا بت تھا، ''یغوث'' بنی مراد کا بت تھا۔ اس کے بعد جرف میں سبا کے نزدیک بنی غطیف کا بت بن گیا، ''یعوق'' ہمدان کا بت تھا اور ''نسر'' آلِ ذی الکلاع کے حمیر قبیلے کا بت تھا۔

یہ قومِ نوح کے نیک لوگوں کے نام تھے۔ جب وہ فوت ہو گئے تو شیطان نے ان کی قوم کے دل میں یہ بات ڈال دی کہ جہاں وہ بیٹھا کرتے تھے، وہاں ان کے مجسمے نصب کر دیں اور ان مجسموں کو ان کے نام دے دیں۔ انھوں نے ایسے ہی کیا، لیکن ان کی پوجا نہ کی، جب وہ نسل ختم ہو گئی اور لوگوں کو اصل بات کا علم نہ رہا تو ان کی عبادت شروع ہو گئی۔[1]

کتبِ تفسیر اور قصص الانبیاء میں اسلاف سے قریب قریب یہی مفہوم منقول ہے۔ کچھ نے یہ اضافہ کیا ہے کہ وہ ان کی قبروں پر اعتکاف کرتے۔ کچھ نے کہا ہے کہ انھوں نے ان کی تصویریں بنا لیں۔ کچھ نے کہا ہے کہ وہ سفر میں جاتے وقت ان کی مورتیاں ساتھ لے لیتے اور ان کو سامنے رکھ کر دعا کرتے مگر ان کی عبادت نہ کرتے۔ اس کے بعد بتوں کی پوجا شروع ہو گئی۔

یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی ایک احادیث میں قبروں اور تصویروں کا ذکر ایک ساتھ کیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قبر پرستی اور بت پرستی کو رواج دینے میں تصویروں کا بنیادی کردار ہے۔ ابو الہیاج اسدی کہتے ہیں: مجھ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا: میں تجھے اس کام کے لیے نہ بھیجوں جس کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بھیجا تھا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے حکم دیا کہ جو بلند قبر نظر آئے اس کو برابر کر دوں اور جو تمثیل نظر آئے اس کو مٹا دوں۔''[2] اس حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبر برابر کرنے اور تصویر مٹانے کا حکم دیا۔ ایک دوسری صحیح حدیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ان لوگوں میں جب کوئی نیک شخص فوت ہو جاتا تو اس کی قبر پر مسجد بناتے اور اس میں وہ تصاویر بنا لیتے۔ یہ لوگ قیامت کے دن اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ برے ہوں گے۔''[3]

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٤٦٣٦)

[2] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٩٦٩)

[3] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٤٢٤) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٥٢٨)

قبروں کو مسجدیں بنانے اور قبرستان میں نماز پڑھنے کی ممانعت کی احادیث بہت زیادہ ہیں۔

کچھ علما کا خیال ہے کہ قبرستان میں نماز کی ممانعت نجاست کی وجہ سے ہے، کیوں کہ وہاں کی مٹی مردوں کی پیپ اور گوشت سے آلودہ ہو جاتی ہے، لیکن یہ علت حدیث میں مذکور ہے نہ نص کی دلالت ہی سے ثابت ہے۔ اس کی صحیح علت یہ ہے کہ قبرستان میں نماز پڑھنا مشرکوں کے ساتھ مشابہت اور شرک کا ذریعہ بن سکتا ہے، اس لیے انبیا کی قبروں کو مساجد بنانے سے منع کیا گیا ہے۔

قبروں کو مساجد بنانا دو چیزوں کو شامل ہے، ایک تو یہ ہے کہ ان کے اوپر مسجد تعمیر کی جائے اور دوسرا مفہوم یہ ہے کہ وہاں عمارت تو نہ بنائی جائے مگر قبر کے پاس نماز پڑھی جائے۔ رسول اللہ ﷺ کو بھی اسی کا خدشہ تھا اور صحابہ کو بھی یہی خطرہ لاحق تھا کہ اگر رسول اللہ ﷺ کی قبر نمایاں کر دی گئی تو کہیں اس کے پاس نماز نہ شروع ہو جائے، ایسی صورت میں آپ ﷺ کی قبر مسجد یعنی سجدہ گاہ بن جائے گی، جب کہ آپ ﷺ یہ دعا کرتے تھے: ''اے اللہ! میری قبر کو بت نہ بنانا، جس کی پوجا کی جائے۔''[1] آپ ﷺ نے خود یہ حکم دیا: ''میری قبر پر میلہ نہ لگانا، مجھ پر درود بھیجو، تم جہاں بھی ہو گے تمھارا درود مجھ تک پہنچ جائے گا۔''[2]

یہ تو سب کو معلوم ہے کہ اگر انبیائے کرام اور نیک بزرگوں کی قبروں کے پاس دعا کرنا دیگر جگہوں کی نسبت دعا کرنے سے بہتر اور افضل عمل ہوتا تو وہاں نماز پڑھنا مستحب ہونا چاہیے تھا اور انھیں مساجد بنانا چاہیے تھا، کیوں کہ دعا نماز کے ساتھ متصل ہے، اس لیے کوئی مسلمان یہ نہیں کہتا کہ اونٹوں کا باڑہ، قبرستان اور پلید جگہیں جہاں نماز پڑھنا منع ہے، وہاں دعا کرنا دوسری جگہوں کی نسبت بہتر ہے، بلکہ جو یہ بات کہتا ہوا پایا جائے وہ رسول کا مخالف ہے اور وہ شرک اور اسبابِ شرک سے رسول کی ممانعت کو توحید اور ایک اللہ کی عبادت کے حکم کے برابر یا اس سے بہتر قرار دیتا ہے۔

منافقوں نے اسلام میں جو جو داخل کیا ہے اسی راستے سے کیا ہے۔ جس نے رافضی دین ایجاد کیا وہ زندیق یہودی تھا۔ اس نے مسلمانوں کے دین میں فساد اور بگاڑ پیدا کرنے کے لیے اسلام کا لبادہ اوڑھا اور دل میں کفر ہی رکھا۔ یہ وہی راستہ ہے جو پولس نے عیسائیت میں بگاڑ پیدا کرنے کے لیے اختیار کیا تھا، چنانچہ اس نے مسلمانوں میں فتنے کی آگ لگا دی، جس کے نتیجے میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل کر دیا گیا۔

مومنوں میں منافقوں کی ہاں میں ہاں ملانے والے مل جاتے ہیں، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ لَوْ خَرَجُوْا فِيْكُمْ مَّا زَادُوْكُمْ اِلَّا خَبَالًا وَّلَاَوْضَعُوْا خِلٰلَكُمْ يَبْغُوْنَكُمُ الْفِتْنَةَ وَفِيْكُمْ سَمّٰعُوْنَ لَهُمْ ﴾ [التوبة: ٤٧]

---

[1] الموطأ (١٧٢/١) مسند أحمد (٢٤٦/٢)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٠٤٢) صحيح الجامع (٧٢٢٦)

''اگر وہ تم میں نکلتے تو خرابی کے سوا تم میں کسی چیز کا اضافہ نہ کرتے اور ضرور تمھارے درمیان (گھوڑے) دوڑاتے، اس حال میں کہ تم میں فتنہ تلاش کرتے، اور تم میں کچھ ان کی باتیں کان لگا کر سننے والے ہیں۔''

پھر جب امت فرقوں میں بٹ گئی تو اس زندیق نے امامت میں نص (وصیت) اور عصمت کا عقیدہ پیش کیا اور ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے خلاف علانیہ بدزبانی اور تبرّا بازی کی۔ اس کی یہ بات اور نظریہ ایسے دلوں میں جگہ پکڑ گیا جن میں جہالت بھی تھی اور ظلم بھی تھا، گو وہ کافر نہیں تھے۔ اس طرح تشیع (شیعیت) کی بدعت کا آغاز ہوا جو شرک کے دروازے کی چابی ہے۔

جب زندیقوں کو غلبہ حاصل ہوا تو انھوں نے درگاہیں تعمیر کرنے اور مساجد کو ویران کرنے کا حکم دیا اور دلیل یہ دی کہ جمعہ اور جماعت صرف امام معصوم کے پیچھے ہو سکتی ہے۔ انھوں نے درباروں کو روشن کرنے، ان کی تعظیم و تکریم بجا لانے اور وہاں دعا کرنے کی فضیلت میں ایسی جھوٹی روایات گھڑ لیں کہ اہلِ کتاب کے جھوٹوں میں بھی ان کی مثال نہیں ملتی۔ یہاں تک کہ ان کے ایک بڑے ابن نعمان نے "مناسك حج المشاهد" (درباروں کے حج کے فرائض و عبادات) میں ایک کتاب لکھ ماری۔ اس میں انھوں نے رسول اللہ ﷺ اور اہلِ بیت کی طرف ایسے جھوٹ منسوب کیے کہ دین کا حلیہ بگاڑ دیا اور آپ ﷺ کی ملت کو بدل کر رکھ دیا۔ انھوں نے توحید کے منافی شرک ایجاد کیا اور شرک و کذب کے جامع ٹھہرے۔ اللہ نے بھی قرآن کریم میں کئی مقامات پر شرک اور جھوٹ کو ایک ساتھ ذکر کیا ہے اور ہم قرین بتایا ہے، ارشاد ہے:

﴿ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ ۝ حُنَفَآءَ لِلّٰهِ غَيْرَ مُشْرِكِيْنَ بِهٖ ﴾ [الحج: ٣٠، ٣١]

''اور جھوٹی بات سے بچو۔ اس حال میں کہ اللہ کے لیے ایک طرف ہونے والے ہو، اس کے ساتھ کسی کو شریک کرنے والے نہیں۔''

رسول اللہ ﷺ نے دو مرتبہ کہا: ''جھوٹی گواہی اللہ کے ساتھ شرک کرنے کے برابر ٹھہرائی گئی ہے، پھر اس آیت کی تلاوت کی، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ سَيَنَالُهُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَذِلَّةٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُفْتَرِيْنَ ۝ ﴾ [الأعراف: ١٥٢]

''بے شک جن لوگوں نے بچھڑے کو پکڑا عنقریب انھیں اللہ کی طرف سے بہت بڑا غضب پہنچے گا اور بڑی رسوائی دنیا کی زندگی میں اور ہم جھوٹ باندھنے والوں کو اسی طرح بدلہ دیتے ہیں۔''[1]

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٥٩٩) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٣٠٠) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٣٧٢) السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (١١١٠)

فرمایا:

﴿ وَيَوْمَ يُنَادِيهِمْ فَيَقُولُ أَيْنَ شُرَكَائِيَ الَّذِينَ كُنتُمْ تَزْعُمُونَ ﴿٧٤﴾ وَنَزَعْنَا مِن كُلِّ أُمَّةٍ شَهِيدًا فَقُلْنَا هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ فَعَلِمُوا أَنَّ الْحَقَّ لِلَّهِ وَضَلَّ عَنْهُم مَّا كَانُوا يَفْتَرُونَ ﴿٧٥﴾ ﴾

[القصص: ٧٤، ٧٥]

''اور جس دن وہ انھیں آواز دے گا، پس کہے گا کہاں ہیں میرے وہ شریک جو تم گمان کرتے تھے؟ اور ہم ہر امت میں سے ایک گواہ نکالیں گے، پھر ہم کہیں گے لاؤ اپنی دلیل، تو وہ جان لیں گے کہ بے شک سچ بات اللہ کی ہے اور ان سے گم ہو جائے گا جو وہ گھڑا کرتے تھے۔''

اللہ کی توحید کا اثبات اور شرک کا انکار اللہ کا حق ہے، جس طرح حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی حدیث میں مذکور ہے۔[1] اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَإِلَىٰ عَادٍ أَخَاهُمْ هُودًا ۚ قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ ۖ إِنْ أَنتُمْ إِلَّا مُفْتَرُونَ ﴾

[هود: ٥٠]

''اور عاد کی طرف ان کے بھائی ہود کو (بھیجا)۔ اس نے کہا اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا تمھارا کوئی معبود نہیں۔ تم تو محض جھوٹ باندھنے والے ہو۔''

قرآن میں ایسی آیات بے شمار ہیں جن میں اہلِ شرک کو افترا پردازی کے ساتھ متصف کیا گیا ہے، اسی لیے ان سے برہان اور دلیل کا مطالبہ کیا گیا ہے، ارشاد ہے:

﴿ وَمَن يَدْعُ مَعَ اللَّهِ إِلَٰهًا آخَرَ لَا بُرْهَانَ لَهُ بِهِ فَإِنَّمَا حِسَابُهُ عِندَ رَبِّهِ ۚ ﴾ [المؤمنون: ١١٧]

''اور جو اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو پکارے، جس کی کوئی دلیل اس کے پاس نہیں تو اس کا حساب صرف اس کے رب کے پاس ہے۔''

﴿ قُلْ أَرَأَيْتُم مَّا تَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ أَرُونِي مَاذَا خَلَقُوا مِنَ الْأَرْضِ أَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمَاوَاتِ ۖ ائْتُونِي بِكِتَابٍ مِّن قَبْلِ هَٰذَا أَوْ أَثَارَةٍ مِّنْ عِلْمٍ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ﴿٤﴾ ﴾ [الأحقاف: ٤]

''کہہ دے کیا تم نے دیکھا جن چیزوں کو تم اللہ کے سوا پکارتے ہو، مجھے دکھاؤ انھوں نے زمین میں سے کون سی چیز پیدا کی ہے، یا آسمانوں میں ان کا کوئی حصہ ہے؟ لاؤ میرے پاس اس سے پہلے کی کوئی کتاب، یا علم کی کوئی نقل شدہ بات، اگر تم سچے ہو۔''

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٦٢٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٠)

﴿ فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۚ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۚ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ۚ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۙ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿٣٠﴾ مُنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ وَاتَّقُوْهُ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿٣١﴾ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا ؕ كُلُّ حِزْبٍۭ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ﴿٣٢﴾ وَاِذَا مَسَّ النَّاسَ ضُرٌّ دَعَوْا رَبَّهُمْ مُّنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ ثُمَّ اِذَآ اَذَاقَهُمْ مِّنْهُ رَحْمَةً اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ بِرَبِّهِمْ يُشْرِكُوْنَ ﴿٣٣﴾ لِيَكْفُرُوْا بِمَآ اٰتَيْنٰهُمْ ؕ فَتَمَتَّعُوْا ٚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿٣٤﴾ اَمْ اَنْزَلْنَا عَلَيْهِمْ سُلْطٰنًا فَهُوَ يَتَكَلَّمُ بِمَا كَانُوْا بِهٖ يُشْرِكُوْنَ ﴿٣٥﴾ ﴾ [الروم: ۳۰۔۳۵]

''پس تو ایک طرف کا ہو کر اپنا چہرہ دین کے لیے سیدھا رکھ، اللہ کی اس فطرت کے مطابق، جس پر اس نے سب لوگوں کو پیدا کیا، اللہ کی پیدایش کو کسی طرح بدلنا (جائز) نہیں، یہی سیدھا دین ہے اور لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ اس کی طرف رجوع کرتے ہوئے اور اس سے ڈرو اور نماز قائم کرو اور شرک کرنے والوں سے نہ ہو جاؤ۔ ان لوگوں سے جنھوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور کئی گروہ ہو گئے، ہر گروہ اسی پر جو ان کے پاس ہے، خوش ہیں۔ اور جب لوگوں کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے وہ اپنے رب کو اس کی طرف رجوع کرتے ہوئے پکارتے ہیں، پھر جب وہ انھیں اپنی طرف سے کوئی رحمت چکھاتا ہے تو اچانک ان میں سے کچھ لوگ اپنے رب کے ساتھ شریک ٹھہرانے لگتے ہیں۔ تاکہ جو کچھ ہم نے انھیں دیا ہے اس کی ناشکری کریں۔ سو فائدہ اٹھالو کہ جلد ہی جان لوگے۔ یا ہم نے ان پر کوئی دلیل نازل کی ہے کہ وہ بول کر وہ چیزیں بتاتی ہے جنھیں وہ اس کے ساتھ شریک ٹھہرایا کرتے تھے۔''

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿٣١﴾ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا ؕ ﴾ [الروم: ۳۱،۳۲]

''اور شرک کرنے والوں سے نہ ہو جاؤ۔ ان لوگوں سے جنھوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور کئی گروہ ہو گئے۔''

کیوں کہ توحید اللہ کا وہ دین ہے جو اس نے اولین اور آخرین کو دے کر بھیجا، ارشاد ہے:

﴿ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ﴾

[الأنبياء: ۲۵]

''اور ہم نے تجھ سے پہلے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس کی طرف یہ وحی کرتے تھے کہ بے شک حقیقت یہ ہے کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں، سو میری عبادت کرو۔''

﴿ وَسْئَلْ مَنْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُّسُلِنَآ اَجَعَلْنَا مِنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ اٰلِهَةً يُّعْبَدُوْنَ ﴾

[الزخرف: ٤٥]

''اور ان سے پوچھ جنھیں ہم نے تجھ سے پہلے اپنے رسولوں میں سے بھیجا، کیا ہم نے رحمان کے سوا کوئی معبود بنائے ہیں جن کی عبادت کی جائے؟''

﴿ وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ﴾ [النحل: ٣٦]

''اور بلاشبہ یقیناً ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیجا کہ اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت سے بچو۔''

یہی وجہ ہے کہ قبروں کو مسجدیں اور سجدہ گاہیں بنانے والے چونکہ شرک میں ملوث ہوتے ہیں، اس لیے وہ مختلف گروہوں میں بٹے ہوئے ہوتے ہیں۔ ہر قوم اپنے متبوع کی تعظیم کرتی ہے، کہتے ہیں اس کی قبر کے پاس دعا قبول ہوتی ہے۔ ان کے دل اسی کے ساتھ وابستہ ہو جاتے ہیں اور ان میں کسی دوسرے نیک، بزرگ یا ولی کے لیے جگہ نہیں ہوتی، گو وہ اس سے افضل ہو، جس طرح ستاروں اور بتوں کو پوجنے والے سب اپنے اپنے خدا بنا کر بیٹھے ہوتے ہیں، جس کو معبود سمجھتے ہیں، اسی کی عبادت کرتے ہیں، اگرچہ دوسرا اس سے افضل ہو۔

پھر یہ لوگ اپنے اس عمل کو ''زیارت'' کا نام دیتے ہیں جو شرعی لفظ ہے مگر وہ اس کو غیر شرعی مفہوم کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

شرعی زیارت جو رسول اللہ ﷺ نے اپنی امت کے لیے مقرر کی ہے وہ میت کے لیے دعا اور اس کو سلام کہنے پر مشتمل ہے، جس طرح جنازہ پڑھا جاتا ہے اور اس کا مقصود میت کے لیے دعا کرنا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ دعا کرنے والے کی دعا کی وجہ سے میت پر رحم کرتا ہے اور دعا کرنے والے کو ثواب دیتا ہے۔ عبرت حاصل کرنے کے لیے کافر کی قبر کی زیارت کرنا بھی جائز ہے، مگر استغفار کے لیے نہیں۔

قبر کے پاس دعا کرنے کے لیے، اس کو وسیلہ بنانے کے لیے، یا اس کے ذریعے سفارش طلب کرنے کے لیے قبروں کی زیات کرنا زیارت کا غیر شرعی مفہوم ہے جو شریعت میں قطعاً مذکور نہیں۔

اس باب میں جتنی روایات بیان کی جاتی ہیں، سب کمزور، بلکہ موضوع ہیں اور دلیل کے قابل نہیں۔

قبروں پر دربار کب بنے؟ قرونِ اولیٰ میں درباروں کا کوئی تصور نہیں ملتا۔ یہ بنی بویہ کی حکومت کے زمانے میں سامنے آئے اور کثرت کے ساتھ بنائے گئے۔ جب مشرق و مغرب میں قرامطیہ کا اقتدار قائم ہوا، ان میں اکثر زندیق و کافر تھے، جن کا مقصدِ حیات اسلام کو تبدیل کرنا تھا۔ بنو بویہ میں بھی ان کے ہم خیال موجود تھے، جہمیہ، معتزلہ اور رافضہ بھی ان کے ہم نوا تھے تو انھوں نے یہ جھوٹے اور خود ساختہ دربار بنا لیے، جیسے حضرت علی کا دربار ہے۔ اس کے بعد انھوں نے ان درباروں کو آباد کرنے کے لیے ان کی زیارت، ان میں دعا کرنے اور نماز پڑھنے کی فضیلت کے متعلق احادیث گھڑیں۔ اس طرح یہ زنادقہ اور ان کے ہم نوا بدعتی ان درباروں کی تعظیم کرنے لگے اور مساجد کی

توہین۔ یہ کام چونکہ دینِ اسلام کی ضد اور اس کے الٹ ہے، اس لیے وہ شیعیت کی آڑ لے کر انھیں جائز قرار دیتے۔

قبروں کو مساجد بنانے کی ممانعت کی متواتر احادیث ان دونوں بدعات کی تردید کرتی ہیں جو شرک کی اصل ہیں اور اسلام کو تبدیل کر دیتی ہیں۔

اس کی وضاحت اس سے بھی ہوتی ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ''درگاہوں'' اور مشاہد کا کہیں ذکر نہیں کیا اور ان میں نماز پڑھنے کا حکم بھی نہیں دیا، بلکہ مساجد کا حکم دیا ہے، ارشاد ہے:

﴿ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِيْ خَرَابِهَا ﴾ [البقرۃ: ۱۱۴]

''اور اس سے زیادہ ظالم کون ہے جو اللہ کی مسجدوں سے منع کرے کہ ان میں اس کا نام لیا جائے اور ان کی بربادی کی کوشش کرے؟''

یہاں اللہ تعالیٰ نے ''مشاهد الله'' کا لفظ استعمال نہیں کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حکم دیا تھا کہ ہر بلند قبر برابر کر دیں اور ہر تمثیل مٹا دیں۔ آپ ﷺ نے قبروں کو مساجد بنانے سے منع کیا اور ایسا کرنے والوں پر لعنت بھیجی۔ ان نصوص سے تو مشاہد کو برباد کرنے کا حکم ملتا ہے، آباد کرنے کا نہیں، خواہ یہ آبادی اور تعمیر صورتاً ہو یا معناً۔ فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ فِي الْمَسٰجِدِ ﴾ [البقرۃ: ۱۸۷]

''اور ان سے مباشرت مت کرو جب کہ تم مسجدوں میں معتکف ہو۔''

یہاں بھی ''مشاهد'' نہیں کہا۔ ایک جگہ فرمایا:

﴿ قُلْ اَمَرَ رَبِّيْ بِالْقِسْطِ وَاَقِيْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ ﴾ [الأعراف: ۲۹]

''کہہ دے میرے رب نے انصاف کا حکم دیا ہے اور اپنے رخ ہر نماز کے وقت سیدھے رکھو''۔

یہاں بھی ''کل مشهد'' نہیں کہا۔ فرمان ہے:

﴿ مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ ﴾ [التوبۃ: ۱۷]

''مشرکوں کا کبھی حق نہیں کہ وہ اللہ کی مسجدیں آباد کریں۔''

یہاں بھی ''مشاهد الله'' نہیں کہا، لہٰذا مشاہد (دربار اور درگاہیں) کو آباد کرنے والے مشرک ہیں یا ان سے ملتے جلتے ہیں۔ آگے فرمایا:

﴿ اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ ﴾ [التوبۃ: ۱۸]

''اللہ کی مسجدیں تو وہی آباد کرتا ہے جو اللہ پر ایمان لایا۔''

یہاں بھی "إنما یعمر مشاھد اللّٰه" نہیں فرمایا، بلکہ مشاہد اور درگاہوں کو آباد کرنے والے اللہ سے نہیں غیر اللہ سے ڈرتے ہیں، مردوں سے ڈرتے ہیں مگر اللہ سے نہیں ڈرتے، ان کی عبادت کرتے ہیں، حالانکہ نہ کتاب وسنت میں ان کی عبادت کا حکم ہوا ہے اور نہ کوئی اور دلیل ہی ان پر اتری ہے۔ حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام سے جب مشرکوں نے بحث مباحثہ اور مناظرہ کیا تو ان کو اپنے معبودوں سے ڈرانے لگے۔ اس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کیا خوب کہا:

﴿ وَكَيْفَ اَخَافُ مَآ اَشْرَكْتُمْ وَلَا تَخَافُوْنَ اَنَّكُمْ اَشْرَكْتُمْ بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا ۭ فَاَيُّ الْفَرِيْقَيْنِ اَحَقُّ بِالْاَمْنِ ۚ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴾ [الأنعام: ٨١]

"اور میں اس سے کیسے ڈروں جسے تم نے شریک بنایا ہے، حالانکہ تم اس بات سے نہیں ڈرتے کہ بے شک تم نے اللہ کے ساتھ اس کو شریک بنایا ہے جس کی کوئی دلیل اس نے تم پر نہیں اتاری، تو دونوں گروہوں میں سے امن کا زیادہ حق دار کون ہے، اگر تم جانتے ہو۔"

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ ﴾ [الأنعام: ٨٢]

"وہ لوگ جو ایمان لائے اور انھوں نے اپنے ایمان کو بڑے ظلم کے ساتھ نہیں ملایا۔"

صحابہ نے جب یہ بات سنی تو یہ ان پر بجلی بن کر ٹوٹی اور وہ کہنے لگے: اے اللہ کے رسول! "أینا لم یظلم نفسه" "کون ہے جو اپنے نفس پر ظلم نہیں کرتا؟" یہ سن کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اس سے شرک مراد ہے، کیا تم نے اللہ کے نیک بندے کی یہ بات نہیں سنی: ﴿ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ﴾ [لقمان: ١٣] "بے شک شرک یقیناً بہت بڑا ظلم ہے۔"

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَتِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَيْنٰهَآ اِبْرٰهِيْمَ عَلٰي قَوْمِهٖ ۭ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَاۗءُ ﴾ [الأنعام: ٨٣]

"اور یہ ہماری دلیل ہے جو ہم نے ابراہیم کو اس کی قوم کے مقابلے میں دی، ہم درجوں میں بلند کرتے ہیں جسے چاہتے ہیں۔"

زید بن اسلم وغیرہ کا کہنا ہے کہ ہم جس کے درجات بلند کرنا چاہتے ہیں، علم کے ساتھ کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا ﴾ [الجن: ١٨]

"اور یہ کہ بلاشبہ مساجد اللہ کے لیے ہیں، پس اللہ کے ساتھ کسی کو مت پکارو۔"

یہ نہیں کہا: "أن المشاھد للّٰه" بلکہ اہلِ مشاہد اللہ تعالیٰ کے ساتھ غیر کو بھی پکارتے ہیں۔

اس لیے قبروں پر مساجد تعمیر کرنا جنھیں مشاہد اور دربار کہا جاتا ہے اور ان کی تعظیم کرنا مسلمانوں کا دین نہیں، مشرکوں کے دین کا ایک عمل ہے جو محفوظ نہیں۔ اللہ نے اس ذکر کو محفوظ کرنے کی ضمانت دی ہے جو اس نے نازل کیا ہے، ارشاد ہے:

﴿ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ﴾ [الحجر: ٩]

''بے شک ہم نے ہی یہ نصیحت نازل کی ہے اور بے شک ہم اس کی ضرور حفاظت کرنے والے ہیں۔''

اللہ نے اپنے رسول کو جو کتاب اور حکمت دے کر بھیجی ہے وہ آج تک محفوظ ہے، مگر مشاہد کا معاملہ غیر محفوظ ہے، بلکہ وہ عام قبریں جن پر یہ دربار ایستادہ ہیں مشکوک ہیں یا یقینی طور پر جعلی ہیں، مثلاً کُرک میں ایک قبر ہے جس کے بارے میں مشہور ہے کہ یہ حضرت نوح علیہ السلام کی قبر ہے، اسی طرح دمشق میں ایک قبر ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی قبر ہے۔ جو دوسرے کونے پر ہے اس کے بارے میں عام ہے کہ وہ اویس قرنی کی قبر ہے یا وہاں جو قبریں ہیں، جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ازواجِ مطہرات کی قبریں ہیں، یا نجف کے اندر قبر کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی قبر ہے۔ اسی طرح قاہرہ کے ایک دربار اور حلب کے ایک دربار کے متعلق عام ہے کہ وہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی قبر ہے۔ اس طرح کے جتنے دربار ہیں سب جھوٹ ہیں اور اس پر اہلِ علم کا اتفاق ہے۔

حمص کی وہ قبر جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی قبر ہے یا داریا میں ابو مسلم خولانی کی قبر تو اس طرح کی قبریں مشکوک ہیں، ہمیں بسا اوقات اجمالاً یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ کوئی میت فلاں جگہ فوت ہوئی، لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اسی خطے پر اس کی قبر بھی ہو، جس طرح ظاہر دمشق میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی قبر ہے اور مدینہ میں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی قبر۔ عام لوگ جو اس کے دعوے کرتے ہیں، انھیں اس کا علم یا خواب سے ہوتا ہے یا ناقابلِ اعتبار حوالے سے یا کسی اور ذریعے سے، ان قبروں میں سے کچھ کے بارے میں تو یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے اور کچھ کے بارے میں نہیں، لیکن اس سے ان بدعتی احکام میں سے کوئی حکم ثابت نہیں ہوتا، اس لیے سلف صالحین اس دروازے کو بند کر دیتے تھے۔

مسلمانوں نے جب ''تستر'' فتح کیا تو انھیں وہاں ایک میت کی باقیات ملیں۔ ان کو بتایا گیا کہ یہ ''دانیال'' نبی کی قبر ہے۔ ان کو اس کے پاس ایک کتاب بھی ملی، جس میں واقعات درج تھے۔ اس علاقے کے رہنے والے اس کو وسیلہ بنا کر بارش طلب کرتے تھے۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے اس کی بابت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو لکھا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: دن کے وقت میں تیرہ قبریں کھودی جائیں، پھر رات کے وقت ان میں سے کسی ایک میں اس

کو دفنا کر اس کے آثار مٹا دیے جائیں، تا کہ لوگ کسی فتنے میں نہ پڑ جائیں۔

اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے یہ بھی منقول ہے کہ انھیں علم ہوا کہ کچھ لوگ اس درخت کی زیارت کرتے ہیں جس کے نیچے بیعتِ رضوان ہوئی اور وہاں نماز پڑھتے ہیں تو انھوں نے اسے کٹوا دیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہی سے ثابت ہے کہ وہ ایک سفر میں تھے۔ انھوں نے کچھ لوگوں کو دیکھا کہ وہ باری باری زمین کے ایک ٹکڑے پر نماز پڑھتے۔ انھوں نے پوچھا: ایسا کیوں کر رہے ہو؟ انھوں نے جواب دیا: اس جگہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھی تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس پر تعجب کا اظہار کیا اور کہا: کیا تم اپنے انبیا کے آثار کو سجدہ گاہ بنانا چاہتے ہو؟ بنی اسرائیل اسی وجہ سے ہلاک ہوئے تھے۔ جو یہاں نماز کا وقت پالے وہ یہاں نماز پڑھ لے، ورنہ گزر جائے۔

یقین کیجیے کہ یہ لوگ جو ایسی باتیں کرتے ہیں، ان کے پاس حکایتوں کے سوا کوئی دلیل نہیں، مثلاً فلاں پیر صاحب نے کہا: اگر تمھیں اللہ سے کوئی کام ہو تو میری قبر پر آ کر اس سے مانگنا۔ یا کہا: فلاں کی قبر مجرب تریاق ہے، وغیرہ وغیرہ۔ اس طرح کی حکایات سچی بھی ہو سکتی ہیں اور جھوٹی بھی۔ فرض کر لیتے ہیں کہ یہ سچی ہیں، لیکن کہنے والا معصوم تو نہیں۔ جو انسان معصوم نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت اور منقول بات کی مخالفت ایسی منقول بات سے کرتا ہے جو ثابت بھی نہ ہو اور غیر معصوم سے بیان کی جاتی ہو تو وہ گمراہ اور شیطان کا بھائی ہی ہوگا۔

یہ اس طرح بے سروپا باتیں اور حکایات دراصل شرک کے اسباب اور دین میں تبدیلی کا موجب ہیں۔

اگر یہ کہا جائے کہ بعض اوقات وہاں جانے والوں کے کام ہو جاتے ہیں تو ہم کہیں گے کیا یہ ان کے ارادے کو جائز کرنے کے لیے کافی ہے؟ نہیں یہ متعدد وجوہ کی بنا پر ان کے اس نیت سے قبروں پر جانے کو جائز نہیں کر سکتا۔

پہلی وجہ:

بہت سے مشرک اور اہلِ کتاب جو بتوں کے پاس مقدس ہستیوں کی تصویروں اور تمثیلوں کے پاس اور اپنے مقدس مقامات، کے پاس، جو اسلام میں مقدس نہیں، دعائیں کرتے ہیں، ان کے بہت سے کام ہو بھی جاتے ہیں تو کیا کوئی مسلمان یہ کہتا ہے کہ یہ ان کے حرام کام کو جائز کرنے کے لیے کافی ہے؟

خواہش پرستوں اور بدعتیوں کے پاس بدعت گھڑنے کے جو اسباب ہیں، اس طرح کے اسباب آپ کو مشرکوں کے ہاں بھی ملیں گے، جنھوں نے ان کو کفر تک پہنچا دیا۔

اس نکتے پر تھوڑا سا غور کرنے سے یہ بات عام امور میں نظر آئے گی، کیوں کہ بدعتیں کفر سے مشتق ہیں اور کمال ایمان اسی چیز میں ہے کہ جو اللہ اور اس کے رسول نے حکم دیا ہے، اس پر عمل کیا جائے اور جس سے روکا ہے اسے چھوڑ دیا جائے۔ اگر کچھ چیزیں چھوڑ دی جائیں اور ان کے عوض کچھ ممنوع چیزیں اختیار کر لی جائیں تو اسی قدر

ایمان میں نقص واقع ہو جاتا ہے۔

بدعت کبھی بھی محض حق نہیں ہوتی۔ اگر اس طرح ہوتی تو مشروع اور جائز ہوتی۔ اس کی مصلحت بھی اس کی مفسدت پر راجح نہیں ہوتی۔ اگر اس طرح ہوتا تو پھر بھی مشروع اور جائز ہوتی۔

اس کو باطلِ محض بھی نہیں کہا جا سکتا جس میں حق کا شائبہ بھی نہ ہو، کیوں کہ اگر اس طرح نہ ہوتا تو لوگوں کو اس سے اشتباہ نہ پڑتا، بلکہ اس میں کچھ حق ہوتا ہے اور کچھ باطل۔

مشرکوں اور اہلِ کتاب کا دین بھی اسی طرح ہے، ان کی بتائی ہوئی ہر خبر اور بات جھوٹ نہیں ہوتی اور ان کا ہر حکم بھی فساد اور خرابی کا حامل نہیں ہوتا، بلکہ ان کی خبر میں کچھ سچ کا ہونا اور ان کے اقرار اور حکم میں کچھ مصلحت کا ہونا ضروری ہے، اس کے باوجود وہ حق چھوڑنے اور باطل اختیار کرنے کی وجہ سے کافر ہیں۔

دوسری وجہ:

اس باب میں جھوٹ کی آمیزش بے شمار ہوتی ہے، چونکہ جھوٹ شرک کا قرین ہے اور سچ اخلاص (توحید) کا ساتھی، جس طرح قرآن سے ثابت ہے تو مومن اہلِ صدق و اخلاص ہوتے ہیں اور کفار اہلِ کذب و شرک۔

ان درباروں پر جو شرک ہوتا ہے اس کے ساتھ کئی پہلوؤں سے جھوٹ ملا ہوا ہوتا ہے:

1. یہ دعویٰ کرنا کہ یہ فلاں عظیم انسان کی قبر ہے یا یہاں اس کا سر دفن ہے، یہ اکثر جھوٹ ہوتا ہے۔
2. اس بزرگ کے بارے میں ایسی باتیں اور کرامتیں سنانا جو اکثر جھوٹ پر مبنی ہوتی ہیں۔
3. اس طرح کی باتیں مشہور کرنا کہ یہاں ہر ایک کا کام ہو جاتا ہے۔ قبروں کے مجاور لوگوں کو قائل کرنے کے لیے صاحبِ قبر کی کئی کرامتیں سناتے ہیں اور لوگوں کی کہانیاں بتاتے ہیں کہ فلاں شخص نے یہاں چڑھاوا چڑھایا اور اس کا کام ہو گیا، حالانکہ یہ اکثر جھوٹی اور بے بنیاد باتیں ہوتی ہیں۔
4. بتایا جاتا ہے کہ یہ صاحبِ قبر فلاں نبی یا ولی کی طرف نسبت رکھتا ہے، اس سلسلے میں آلِ رسول پر جتنا جھوٹ باندھا جاتا ہے اس کی تو کوئی حد ہی نہیں۔ عبیدی جو فاطمی اور علوی ہونے کا دعویٰ کرتے، وہ تقریباً دو سو سال تک بادشاہ رہے۔ قاہرہ بھی انھی نے تعمیر کیا۔ وہ اسلام کی تقریباً آدھی سلطنت پر قابض ہو گئے، ایک وقت ایسا آیا کہ بغداد پر بھی غالب آ گئے۔ ان کے بارے میں ابو حامد غزالی کا تبصرہ ہے: ”ان کا مذہب ظاہری طور پر رافضیت تھا، مگر باطنی طور پر خالص کفر تھا۔“

قاضی ابوبکر بن طیب نے ان کی حقیقت سے پردہ اٹھانے کے لیے ”كشف الأسرار وهتك الأستار“ لکھی۔ قاضی ابو یعلی، ابو عبداللہ محمد بن عبدالکریم شہرستانی اور اسی طرح دیگر علمائے اسلام نے بھی ان کے بارے میں

بہت کچھ لکھا۔ سارے اہلِ علم جانتے ہیں کہ وہ حضرت فاطمہ کی اولاد سے نہیں تھے، بلکہ ایک مجوسی کی اولاد تھے اور ایک قول کے مطابق ایک یہودی کی نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ رسول اللہ ﷺ کے دین اور سنت سے کوسوں دور تھے۔ ان کا باطنی دین مجوسیت اور صائبیت کا مرکب تھا اور ظاہری دین رافضیت تھا، جو ان میں سب سے اچھا دین دار ہوتا وہ رافضی ہوتا، وہ عام طور پر ان کے جاہل اور عوام ہوتے اور عوام میں سے جو ان کے دین کو قبول کرتا وہ ان کو مسلمان ہی سمجھتا اور دینِ اسلام کی حقانیت پر ایمان رکھتا، مگر جو ان کے خاص علما اور بادشاہ تھے انھیں اچھی طرح علم تھا کہ وہ اسلام یا یہودیت اور عیسائیت جیسے تمام آسمانی دینوں سے خارج ہیں اور ان کے سب سے قریب فلسفی ہیں، گو وہ کسی خاص فلسفی کے نظریے پر کاربند نہیں تھے۔

یہی وجہ ہے کہ فلاسفہ کے گروہ ان سے نسبت رکھتے تھے۔ ابن سینا کو لیں۔ اس کے گھر والے اسماعیلی باطنی تھے۔ ابن ہیثم وغیرہ بھی انہی کے پیروکار تھے۔ مبشر بن فاتک ان کا ماننے والا تھا۔ اخوان الصفا کے رسائل انہی کے منہج پر لکھے گئے اور ان کو لکھنے والے اسماعیلی بھی تھے۔ تاہم یہ ان کے تفصیلی حالات بیان کرنے کا موقع نہیں، صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ یہ سب سے زیادہ جھوٹے اور مشرک تھے، وہ نسب میں بھی جھوٹ بولتے اور دیگر امور میں بھی۔ اس لیے آپ دیکھیں گے کہ اکثر مشہدی جو علوی نسب کے دعوے دار ہیں، جھوٹے ہیں، وہ یا تو بنی ہاشم کے ساتھ نسبتِ ولاء رکھتے ہیں یا نسب اور ولاء دونوں طرح کا تعلق نہیں رکھتے مگر کہتے ہیں: ہم علوی ہیں اور یہ کہہ کر ''علوی المذہب'' مراد لیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے: ''رافضیت'' حضرت علی رضی اللہ عنہ کا دین تھا۔ یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ پر اسی الزام پر اکتفا نہیں کرتے، بلکہ اپنے آپ کو ان کے اہلِ بیت کی طرف بھی منسوب کرتے ہیں۔

قصہ کوتاہ! قبروں کے متعلق بولا جانے والا جھوٹ اس قدر زیادہ ہے کہ اس فتوے میں اس کی تفصیل سما نہیں سکتی۔

5 رافضی علی الاطلاق امت کا سب سے بڑا جھوٹا گروہ ہے۔ یہ اسلام کا دعویٰ کرنے والے گروہوں میں سب سے زیادہ غلو اور شرک کا ارتکاب کرتے ہیں۔ قراء کے متعلق سب سے پہلے الوہیت کا دعویٰ جس نے کیا وہ انہی میں سے تھا۔ یہ دعویٰ بھی انہی کا تھا کہ محمد ﷺ نبی نہیں، علی رضی اللہ عنہ نبی تھے، مختار بن عبید ثقفی نے اپنی نبوت کا دعویٰ کر دیا۔

رافضہ کے بعد جاہل غالی پیر پرستوں کا درجہ ہے، رافضیوں کے بعد یہی سب سے زیادہ قبروں کی تعظیم کرتے ہیں، باقی لوگوں نے ان کے بعد ہی غلو کا راستہ اختیار کیا، یہ بھی سب سے زیادہ جھوٹ بولنے والا طبقہ ہے۔

دونوں گروہوں میں عیسائیوں کی مشابہت پائی جاتی ہے۔ عیسائیوں کا جھوٹ، شرک اور غلو تو ہر خاص و عام کو معلوم ہے اور ان گروہوں میں اتنا شرک اور جھوٹ پایا جاتا ہے کہ جو احاطۂ شمار سے باہر ہے۔

تیسری وجہ:

اگر کوئی مسلمان کسی قبر کے پاس دعا کرتا ہے اور اس کا کام ہو جاتا ہے تو یہ کہاں سے ثابت ہوتا ہے کہ اس میں اس قبر کی کچھ تاثیر ہے؟ یہ کسی کام کے ہونے پر قبروں کے پاس یا کسی دوسری جگہ نذر ماننے جیسا مسئلہ ہے۔

صحیحین میں آنحضرت ﷺ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے نذر سے منع کیا اور فرمایا: ''یہ خیر نہیں لاتی، اس کے ذریعے تو صرف بخیل سے کچھ نکلوایا جاتا ہے۔''[1] ایک روایت میں ہے: ''نذر ابن آدم کے پاس کوئی ایسی چیز لے کر نہیں آتی جو اس کے مقدر میں نہ ہو، لیکن نذر اس کو اس تقدیر کی طرف لے جاتی ہے جو اس کے مقدر میں ہو۔''[2]

اس صحیح حدیث سے ثابت ہوا کہ نذر جلبِ منفعت یا دفعِ مضرت میں سے معلق اشیا کو دور کرنے کا سبب نہیں، باوجودیکہ نذر اس کام کا بدلہ ہے اور وہ اس کے ساتھ معلق ہوتا ہے، پھر وہ لوگ جو اپنے کام نذر کے ساتھ معلق کرتے ہیں، بڑی کثرت کے ساتھ ان کے کام ہو جاتے ہیں، مگر قبریں قبولیت اور کام ہو جانے کا سبب ہونے سے کوسوں دور ہیں۔ پھر انسان کا جو کام ہو جاتا ہے وہ کسی دوسرے کی دعا کی وجہ سے ہو جاتا ہے، یا اس کی اپنی دعا کی وجہ سے، اگر پہلی صورت ہو تو اس میں کوئی کلام نہیں، اگر دوسری صورت ہو تو اس کا مطلب ہے کہ اس نے دعا اتنی محنت اور اصرار سے کی ہے کہ اگر اس جگہ کے علاوہ کہیں بھی اتنے اصرار سے کرتا یا صلیب کے پاس ہی کرتا، تب بھی اس کا کام ہو جاتا۔ تو سببِ دعا میں کوشش اور الحاح ہے، خاص طور پر قبر نہیں۔

چوتھی وجہ:

مان لیتے ہیں کہ اس میں قبر کی کچھ تاثیر ہوتی ہے، جس طرح فلسفیوں اور ان کی ہم نوائی میں ابن سینا اور ابو حامد نے کہا ہے کہ روحِ مفارقہ، روحِ داعی کے ساتھ ملتی ہے تو اس میں قوت پیدا ہو جاتی ہے یا کوئی اور سبب ہو تو کیا ہر وہ سبب جس کے نتیجے میں انسان کا کام ہو جائے وہ جائز یا مشروع ہوتا ہے؟ ہرگز نہیں، صرف اس وقت جائز ہوتا ہے جب اس میں مصلحت مفسدت پر بھاری ہو، اگر مفسدت غالب آ جائے تب وہ جائز نہیں، بلکہ ممنوع ہو جاتا ہے، گو اس سے کچھ فائدہ حاصل ہو جائے۔

جادو کو جو منع کیا گیا ہے، حالانکہ اس کی تاثیر اور اس سے کچھ کام ہو جاتے ہیں، کواکب کی عبادت اور ان کو پکارنا، جنوں کو حاضر کرنا، کہانت، تیروں سے قسمت معلوم کرنا اور شریعت میں دیگر حرام امور وہ سب اسی باب سے تعلق رکھتے ہیں، حالانکہ ان کی بسا اوقات کوئی تاثیر یا ان سے کسی طرح کا کشف ہو جاتا ہے، تاہم اس میں اجمالاً ان

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٣١٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٣٩)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٤٠)

سارے اسباب پر تنبیہ موجود ہے، جن کے نتیجے میں لوگوں کے کام ہو جاتے ہیں۔

سمجھ دار انسان جانتا ہے کہ کوئی بھی امت کسی بھی کام پر بلا سبب ہی جمی نہیں رہی، بلکہ انھیں اس کا کچھ نہ کچھ فائدہ نظر آتا تھا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا کی تھی:

﴿ وَاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ ﴿35﴾ رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ ﴾ [إبراهيم: ٣٥، ٣٦]

''اور مجھے اور میرے بیٹوں کو بچا کہ ہم بتوں کی عبادت کریں۔ اے میرے رب! بے شک انھوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کر دیا۔''

جو بتوں کی پوجا کے حوالے سے یہ سمجھتا ہے کہ مشرک ان کو جہان کا خالق، یا بارش اتارنے والا، یا کھیتی اگانے والا یا جانور پیدا کرنے والا سمجھ کر ان کی پوجا پاٹ کرتے تھے تو اس کو ان کے عقیدے کا علم نہیں، بلکہ بتوں کی پوجا کرنے والوں، قبروں کی تعظیم کرنے والوں اور پادریوں کی قبروں پر جانے والے عیسائیوں کا مقصد ایک ہی ہوتا تھا اور وہ تھا ان کو سفارشی ذریعہ اور وسیلہ بنانا۔ اگر قبروں کو سجدہ کرنے والوں کو دیکھا جائے تو ان میں سے اکثر ایسے کام کر جاتے ہیں جو بتوں کی پوجا کرنے والے بھی نہیں کرتے۔ تاہم مسلمان کے لیے اتنا جاننا ہی کافی ہے کہ اللہ نے جو چیز بھی حرام کی ہے وہ یا تو خالص مفسدت پر مبنی ہے یا اس میں مفسدت راجح اور زیادہ ہے، جو سراسر مصلحت ہو یا اس میں مصلحت راجح ہو وہ حلال ہے، کیوں کہ رسولوں کی بعث کا مقصد ہی مصلحتوں کا حصول و تکمیل اور مفاسد کا خاتمہ اور کمی کرنا ہے۔

شرک جس طرح جھوٹ کے ساتھ ذکر ہوا ہے اسی طرح جادو کے ساتھ بھی ذکر ہوا ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ وَيَقُوْلُوْنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا هٰۤؤُلَاۤءِ اَهْدٰى مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَبِيْلًا ﴿51﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ ۭ وَمَنْ يَّلْعَنِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ نَصِيْرًا ﴿52﴾ ﴾ [النساء: ٥١، ٥٢]

''کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنھیں کتاب کا ایک حصہ دیا گیا، وہ بتوں اور باطل معبود پر ایمان لاتے ہیں اور جن لوگوں نے کفر کیا ان کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ ان سے زیادہ سیدھے راستے پر ہیں جو ایمان لائے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی اور جس پر اللہ لعنت کرے پھر تو کوئی اس کی مدد کرنے والا ہرگز نہ پائے گا۔''

جبت سحر کو کہتے ہیں اور طاغوت شیطان و بت کو۔ اس ملت کی طرف نسبت رکھنے والے اکثر لوگوں کی یہی

حالت ہے کہ وہ جادو اور شرک کی تعظیم کرتے ہیں اور بہت سے پابندِ شریعت مسلمانوں پر کافروں کو ترجیح دیتے ہیں۔ اس سے زیادہ تفصیل کی گنجایش نہیں۔ ملخصاً، واللہ أعلم [1]

انبیا بشمول حضرت محمد ﷺ کی قبر کی زیارت اور اس سفر میں قصر کا حکم

سوال [2] ایک شخص نے انبیا و صالحین کی قبروں، مثلاً حضرت محمد، یا کسی دوسرے نبی کی قبر کی زیارت کی نیت سے رختِ سفر باندھا، کیا اس کے لیے اس سفر میں نماز قصر کرنا جائز ہے؟ نیز کیا یہ زیارت شرعی ہے یا نہیں؟ ایک حدیث میں بھی مروی ہے کہ آپ ﷺ نے "مَنْ حَجَّ وَلَمْ يَزُرْنِي فَقَدْ جَفَانِي" [3] "جس نے حج کیا اور میری زیارت نہ کی، اس نے مجھ سے جفا کی۔" اور "مَنْ زَارَنِي بَعْدَ مَوْتِي كَمَنْ زَارَنِي فِي حَيَاتِي" [4] "جس نے میری وفات کے بعد میری زیارت کی وہ اسی طرح ہے جس نے میری زندگی میں زیارت کی۔" نیز آپ ﷺ سے یہ بھی مروی ہے: «لَا تُشَدُّ الرِّحَالُ إِلَّا إِلَى ثَلَاثَةِ مَسَاجِدَ: اَلْمَسْجِدِ الْحَرَامِ، وَمَسْجِدِي هَذَا، وَالْمَسْجِدِ الْأَقْصَى» [5] فتویٰ عنایت فرمائے، اللہ آپ پر رحم فرمائے اور آپ کو اجر سے نوازے۔

جواب الحمد للہ رب العالمین. جو شخص صرف انبیا اور صالحین کی قبروں کی خاطر سفر کرتا ہے، کیا اس کے لیے نماز قصر کرنا جائز ہے؟ اس میں علما کے دو معروف اقوال ہیں:

پہلا قول: یہ ابو عبداللہ بن بطہ، ابو الوفاء بن عقیل اور بہت سے ایسے متقدم علما کا قول ہے جو سفرِ معصیت میں قصر کے قائل نہیں۔ ان کے نزدیک اس جیسے سفر میں قصر جائز نہیں، کیوں کہ یہ ممنوعہ سفر ہے۔ مالک، شافعی اور احمد کا مذہب ہے کہ وہ سفر جس سے شریعت میں منع کیا گیا ہو، اس میں نماز قصر نہیں کی جائے گی۔

دوسرا قول: قصر جائز ہے۔ یہ ان فقہا کے نزدیک ہے جو حرام سفر میں قصر کے جواز کے قائل ہیں اور یہ امام ابو حنیفہ

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۲۷/۱۵۵۔۱۸۰)

[2] شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے جب یہ فتویٰ دیا تو اس کے سترہ سال بعد کچھ لوگوں نے اسے توڑ موڑ کر امام صاحب کے خلاف ایک مہم شروع کی۔ بات حاکمِ مصر تک پہنچائی گئی اور اس نے اپنے علاقے کے قاضیوں اور علما کے مشورے سے امام صاحب کو قید کرنے کا حکم نامہ جاری کر دیا، سات شعبان ۷۲۶ھ کو پروانہ جاری ہوا اور آپ کو قلعۂ دمشق میں محبوس کر دیا گیا۔ جب بعد میں امام صاحب کے ہاتھ کا لکھا ہوا صحیح اور اصل فتویٰ شام و عراق اور مصر کے بڑے بڑے مالکی و شافعی علما کے سامنے پیش کیا گیا تو انھوں نے اس کو اچھی طرح پڑھنے کے بعد امام صاحب کے فتوے کی تصدیق کی۔

[3] السلسلة الضعيفة (٤٥)

[4] سنن الدارقطني (٢/٢٧٨) شعب الإيمان (٣/٤٨٨) السلسة الضعيفة (١٠٢١)

[5] صحيح البخاري، رقم الحديث (١١٣٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٣٩٧)

کا مذہب ہے۔ ابو حامد غزالی، ابو الحسن بن عبدوس الحرانی اور ابو محمد بن قدامہ المقدسی جیسے بعض متاخر اصحابِ شافعی اور احمد کے نزدیک جو انبیا و صالحین کی قبروں کی زیارت کی نیت سے سفر کے جواز کے قائل ہیں، یہ سفر حرام نہیں، اس لیے اس میں قصر جائز ہے۔ انھوں نے اس حدیث کے عموم سے استدلال کیا ہے کہ «زُوْرُوا الْقُبُوْرَ»[1] "قبروں کی زیارت کرو۔" اسی طرح کچھ ایسے علما جن کو حدیث میں مہارت حاصل نہیں وہ ان احادیث سے بھی استدلال کرتے ہیں جو رسول اللہ ﷺ کی قبر کی زیارت سے متعلق وارد ہوئی ہیں، جیسے کہ:

«مَنْ زَارَنِيْ بَعْدَ مَمَاتِيْ فَكَأَنَّمَا زَارَنِيْ فِيْ حَيَاتِيْ» (رواه الدارقطني وابن ماجه)[2]

یہ جو روایت بیان کی جاتی ہے: "من حج ولم يزرني فقد جفاني"[3] "جس نے حج کیا اور میری زیارت نہ کی تو اس نے مجھ سے جفا کی۔" اس کو کسی عالم نے روایت نہیں کیا، یہ اسی طرح کی روایت ہے جس طرح کی یہ ہے: "من زارني وزار أبي إبراهيم في عام واحد ضمنت له على الله الجنة"[4] "جس نے ایک ہی سال میں میری اور میرے باپ ابراہیم کی زیارت کی، میں اس کو اللہ تعالیٰ سے جنت لے کر دینے کی ضمانت دیتا ہوں۔"

اس حدیث کو بھی باتفاق علما کسی نے بھی روایت نہیں کیا اور کسی نے اس سے استدلال بھی نہیں کیا، البتہ کچھ لوگ دارقطنی کی روایت سے استدلال ضرور کرتے ہیں۔

ابو محمد مقدسی نے قبروں کے سفر کے جواز پر رسول اللہ ﷺ کے مسجد قبا کی زیارت کرنے سے استدلال کیا ہے اور انھوں نے حدیث «لَا تُشَدُّ الرِّحَالُ» کو نفی استحباب پر محمول کیا ہے۔

پہلے موقف کے قائلین صحیحین کی اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں، جس میں ہے:

«لَا تُشَدُّ الرِّحَالُ إِلَّا إِلَى ثَلَاثَةِ مَسَاجِدَ: اَلْمَسْجِدِ الْحَرَامِ، وَمَسْجِدِيْ هٰذَا، وَالْمَسْجِدِ الْأَقْصَى»[5]

"مسجدِ حرام، میری مسجد اور مسجدِ اقصیٰ؛ ان تین مساجد کے سوا کسی جگہ کی زیارت کے لیے رختِ سفر نہ باندھا جائے۔"

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٩٧٦)

[2] سنن الدارقطني (٢/٢٧٨) السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (١٠٢١)

[3] السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٤٥)

[4] السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٤٦)

[5] صحيح البخاري، رقم الحديث (١١٣٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٣٩٧)

اس حدیث کی صحت پر ائمہ کا اتفاق ہے اور اسی پر عمل ہے، لہٰذا اگر کوئی شخص ان تین مساجد کے علاوہ کسی دوسری مسجد یا مشہد میں نماز پڑھنے یا وہاں اعتکاف کرنے کی نیت سے سفر کرنے کی نذر مانے تو باتفاق ائمہ اس پر اس کو پورا کرنا واجب نہیں، لیکن اگر مسجدِ حرام میں حج یا عمرہ وغیرہ کرنے کے لیے سفر کی نذر مانے تو اس کو پورا کرنا بالاتفاق واجب ہے۔

اسی طرح اگر کوئی مسجدِ نبوی یا مسجدِ اقصیٰ میں نماز یا اعتکاف کی نذر مانے تو امام مالک، احمد اور شافعی کے ایک قول میں اس پر اس نذر کو پورا کرنا واجب اور لازم ہے، مگر امام ابوحنیفہ کے نزدیک یہ اس پر واجب نہیں، کیوں کہ ان کے نزدیک نذر کے ساتھ صرف وہ کام واجب ہوسکتا ہے جس کی جنس شریعت میں واجب ہو۔

جمہور ہر نیکی کی نذر کو پورا کرنا واجب قرار دیتے ہیں، کیوں کہ صحیح بخاری میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے اللہ کی اطاعت کی نذر مانی وہ اللہ کی اطاعت کرے اور جس نے اللہ کی نافرمانی کی نذر مانی وہ اس کی نافرمانی نہ کرے۔''[1] ان دونوں مساجد کا سفر چونکہ نیکی اور طاعت ہے، اس لیے اس نذر کو پورا کرنا واجب ہے۔

تین مساجد کے علاوہ کسی دوسرے خطے یا بقعے کے سفر کی نذر پوری کرنا کسی عالم نے واجب قرار نہیں دیا، بلکہ علما نے یہاں تک کہا ہے کہ مسجدِ قبا کا رختِ سفر بھی نہ باندھا جائے، کیوں کہ یہ تین مساجد میں داخل نہیں، حالانکہ اہلِ مدینہ کے لیے مسجد قبا کی زیارت مستحب ہے، کیوں کہ اس میں رختِ سفر نہیں، صحیح حدیث میں ہے: ''جس نے اپنے گھر میں وضو کیا، پھر مسجد قبا آیا، وہ نماز کے علاوہ اور کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا تو وہ عمرے کی طرح ہی ہے۔''[2]

یہ علما کہتے ہیں، چونکہ انبیا و صالحین کی قبروں کی زیارت بدعت ہے، صحابہ و تابعین میں سے کسی نے یہ کام نہیں کیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی کسی کو اس کا حکم نہیں دیا اور ائمہ اسلام میں سے کسی نے بھی اس کو مستحب اور پسند نہیں سمجھا، اس لیے جو اسے عبادت سمجھتا ہے اور کرتا ہے وہ سنت اور اجماعِ ائمہ کی مخالفت کرتا ہے۔

ابوعبداللہ بن بطہ نے ''الإبانة الصغریٰ'' میں اسے سنت اور اجماع کے مخالف بدعات میں گنوایا ہے۔

اسی دلیل سے ابومحمد مقدسی کی دلیل کا باطل ہونا بھی ظاہر ہو جاتا ہے، کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارتِ مسجدِ قبا رختِ سفر باندھنے کے زمرے میں نہیں آتی، نیز وہ یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ اس کا سفر نذر کے ساتھ واجب نہیں ہوتا۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٣١٨)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٢٤) سنن النسائي، رقم الحديث (٦٩٩) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٤١٢) صحيح الجامع، رقم الحديث (٦١٥٤)

رہی ان کی یہ بات کہ حدیث: «لَا تُشَدُّ الرِّحَالُ» نفی استحباب پر محمول ہے تو اس کا جواب دو صورتوں میں ہے:

① انھوں نے یہ بات تسلیم کی ہے کہ یہ سفر کوئی صالح عمل، کوئی نیکی اور کوئی طاعت نہیں اور حسنات میں سے بھی نہیں۔ اگر ایسے ہی ہے تو جو یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ انبیا اور صالحین کی قبروں کی زیارت کوئی نیکی، عبادت اور طاعت ہے۔ وہ اجماع کی مخالفت کرتا ہے۔ اگر وہ اس کو نیکی سمجھ کر سفر کرتا ہے تو یہ باجماع اہلِ اسلام حرام ہوا، لہٰذا تحریم اس کو نیکی سمجھ کر کرنے کے پہلو سے ہوئی اور یہ تو معلوم ہی ہے کہ جو بھی ان قبروں کے لیے سفر کرتا ہے، اس کی نیت یہی ہوتی ہے۔ اگر کوئی شخص کسی جائز مقصد کے لیے وہاں سفر کرنے کے لیے نیت کرتا ہے تو یہ جائز ہے اور اس کا اس باب سے کوئی تعلق نہیں۔

② دوسری صورت: یہ حدیث نہی کا تقاضا کرتی ہے اور نہی تحریم کا، انھوں نے رسول اللہ ﷺ کی قبر کی زیارت کے متعلق جتنی روایات نقل کی ہیں، وہ حدیث کا علم رکھنے والوں کے اتفاق کے ساتھ ساری کی ساری ضعیف بلکہ موضوع اور حدیث کی کسی بھی معتبر کتاب میں نہیں ملتی اور کسی بھی امام نے ان میں سے کسی بھی روایت سے استدلال نہیں کیا، بلکہ اہلِ مدینہ جو سب سے زیادہ اس مسئلے کے حکم کا علم رکھتے ہیں، ان کے امام مالک نے تو یہ کہنا بھی مکروہ سمجھا ہے کہ کوئی کہے: ''میں نے آپ ﷺ کی قبر کی زیارت کی۔'' اگر یہ لفظ ان کے ہاں معروف یا مشروع یا رسول اللہ ﷺ سے منقول ہوتا تو عالم اہلِ مدینہ اسے مکروہ نہ کہتے۔

امام احمد اپنے زمانے میں سب سے زیادہ سنت کا علم رکھنے والے تھے، ان سے جب اس مسئلے سے متعلق پوچھا گیا تو ان کے پاس حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی اس حدیث کے علاوہ کوئی حدیث نہیں تھی، جس پر وہ اعتماد کر سکتے اور وہ حدیث یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو آدمی مجھ پر سلام بھیجتا ہے تو اللہ میری روح مجھ میں لوٹا دیتا ہے، تاکہ میں اس کا جواب دے سکوں۔''[1] ابو داود نے اپنی سنن میں اسی پر اعتماد کیا ہے۔ اسی طرح مالک نے موطا میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے یہ نقل کیا ہے کہ جب وہ مسجدِ نبوی میں داخل ہوتے تو کہتے: ''اَلسَّلَامُ عَلَيكَ يَا رَسُولَ اللّٰه، السلام عليك يا أبا بكر، السلام عليك يا أَبَتِ''[2] پھر چلے جاتے۔

سنن ابو داود میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میری قبر کو عید (تہوار) نہ بنانا، مجھ پر درود بھیجو، تم جہاں بھی ہو، تمھارا درود مجھ تک پہنچ جاتا ہے۔''[3]

① سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٠٤١) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٢٦٦)

② الموطأ (٣/٤٤٨) مصنف عبد الرزاق (٣/٥٧٦) مصنف ابن أبي شيبة (٣/٢٨) سنن البيهقي الكبرىٰ (٥/٢٤٥) شیخ البانی رحمہ اللہ نے فضل الصلاة على النبي (ص: ٨١) میں اسے صحیح کہا ہے۔

③ سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٠٤٢) صحيح الجامع، رقم الحديث (٧٢٢٦)

سنن سعید بن منصور میں ہے کہ عبداللہ بن حسن بن حسین بن علی بن طالب نے ایک آدمی کو رسول اللہ ﷺ کی قبر پر آتے جاتے اور وہاں دعا کرتے دیکھا تو کہا: ''او فلاں! رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: میری قبر پر میلہ نہ لگانا۔ مجھ پر درود بھیجو۔ تم جہاں بھی ہو۔ تمھارا درود مجھ تک پہنچ جاتا ہے۔'' تم اور اندلس میں بیٹھا ہوا شخص دونوں برابر ہیں۔[1]

صحیحین میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے مرض الموت میں فرمایا: ''اللہ یہود و نصاریٰ پر لعنت کرے! انھوں نے اپنے انبیا کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا۔''[2] آپ ﷺ نے ان کے فعل سے خبردار کیا، اگر یہ وجہ نہ ہوتی تو آپ ﷺ کی قبر کو ظاہر اور نمایاں کر دیا جاتا، لیکن آپ ﷺ نے اس کو سجدہ گاہ بنانا ناپسند فرمایا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے رسول اللہ ﷺ کو خلافِ معمول حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرے میں دفن کیا، صحرا میں دفن نہیں کیا، تاکہ کوئی آپ کی قبر کے پاس نماز پڑھنا اور سجدہ گاہ بنانا شروع نہ کر دے، مبادا کہ آپ ﷺ کی قبر کو صنم بنا لیا جائے۔

رسول اللہ ﷺ کا حجرہ مبارک، ولید بن عبدالملک کے زمانے تک مسجد سے علاحدہ رہا۔ اس وقت صحابہ اور تابعین میں سے کوئی بھی وہاں نماز پڑھنے، قبر کو چھونے اور دعا کرنے کے لیے نہیں آتا تھا۔ یہ سارے کام وہ مسجد میں کیا کرتے تھے۔

صحابہ و تابعین میں سے جب کوئی رسول اللہ ﷺ پر سلام بھیجنا اور دعا کرنا چاہتا تو قبلہ رخ ہو کر دعا کیا کرتے تھے، قبر کی طرف منہ نہیں کرتے تھے۔ اکثر علما کہتے ہیں کہ جب خاص طور پر آپ ﷺ پر سلام بھیجنا مقصود ہو تب قبر کی طرف منہ کیا جائے۔ یہ کسی نے نہیں کہا کہ دعا کرتے وقت قبر کی طرف منہ کرنا چاہیے۔ اس سلسلے میں ایک جھوٹی روایت امام مالک سے نقل کی جاتی ہے، مگر ان کا مذہب اس کے خلاف ہے۔

تمام علما کا اتفاق ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی قبر کو چھوا جائے نہ چوما جائے۔ یہ سارے اقدام توحید کی محافظت کے لیے ہیں، کیوں کہ اللہ کے ساتھ شرک کی اصل اور جڑ قبروں کو سجدہ گاہ بنانا ہے، سلف کے ایک گروہ نے اس آیت:

﴿ وَقَالُوا لَا تَذَرُنَّ آلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَلَا سُوَاعًا وَلَا يَغُوثَ وَيَعُوقَ وَنَسْرًا ﴾ [نوح: ٢٣]

''اور انھوں نے کہا تم ہرگز اپنے معبودوں کو نہ چھوڑنا اور نہ کبھی وڈ کو چھوڑنا اور نہ سواع کو اور نہ یغوث اور یعوق اور نسر کو۔''

کی تفسیر میں کہا ہے: ''یہ قومِ نوح کے نیک لوگ تھے، جب وہ فوت ہو گئے تو لوگوں نے ان کی قبروں پر ڈیرے ڈال لیے، پھر ان کی شکلوں کی مورتیاں بنا لیں اور ایک لمبا عرصہ گزرنے کے بعد ان کی عبادت شروع ہو گئی۔'' امام بخاری نے صحیح میں یہی مفہوم عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ذکر کیا ہے، محمد بن جریر طبری وغیرہ نے اپنی تفسیر میں کئی

---

[1] مصنف عبد الرزاق (٣/٧١) علامہ ہیثمی رحمہ اللہ نے مجمع الزوائد (٢/٥١٣) میں کہا ہے کہ اس کی سند میں عبداللہ بن نافع راوی ضعیف ہے۔

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٣٢٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٢٩)

اسلاف سے یہی نقل کیا ہے اور وثیمہ وغیرہ نے کئی ایک اسناد سے ''قصص الانبیاء'' میں بھی اس کا تذکرہ کیا ہے، ان مسائل کے اصول پر تفصیلی بحث کسی دوسری جگہ گزر چکی ہے۔ قبروں پر بنی ہوئی درگاہوں کی زیارت کے لیے سفر کرنے کے موضوع پر سب سے پہلے یہ روایات رافضہ جیسے بدعتیوں نے گھڑیں جو مساجد کو بے آباد اور درگاہوں کی تعظیم کرتے ہیں۔ اللہ کے ان گھروں کو چھوڑتے ہیں جو اس کا ذکر بلند کرنے اور اس اکیلے کی عبادت کے لیے تعمیر کیے جاتے ہیں اور ان درگاہوں کی تعظیم و تقدیس کرتے ہیں جہاں شرک ہوتا ہے، جھوٹ بولا جاتا ہے اور ایسا دین ایجاد کیا جاتا ہے جس کی اللہ کی طرف سے کوئی سند اور دلیل نہیں۔

کتاب و سنت میں مساجد کا ذکر ہے، مشاہد اور درگاہوں کا نہیں، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ قُلْ اَمَرَ رَبِّیْ بِالْقِسْطِ وَاَقِیْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّ ادْعُوْهُ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ ﴾ [الأعراف: ٢٩]

''کہہ دے میرے رب نے انصاف کا حکم دیا ہے اور اپنے رخ ہر نماز کے وقت سیدھے رکھو اور اس کے لیے دین کو خالص کرتے ہوئے اس کو پکارو۔''

نیز فرمایا:

﴿ وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ فِی الْمَسٰجِدِ ﴾ [البقرة: ١٨٧]

''اور ان سے مباشرت مت کرو جب کہ تم مسجدوں میں معتکف ہو۔''

مزید فرمایا:

﴿ وَاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا ﴾ [الجن: ١٨]

''اور یہ کہ بلاشبہ مساجد اللہ کے لیے ہیں، پس اللہ کے ساتھ کسی کو مت پکارو۔''

ایک جگہ فرمایا:

﴿ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ یُّذْكَرَ فِیْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰی فِیْ خَرَابِهَا ﴾ [البقرة: ١١٤]

''اور اس سے زیادہ ظالم کون ہے جو اللہ کی مسجدوں سے منع کرے کہ ان میں اس کا نام لیا جائے اور ان کی بربادی کی کوشش کرے؟''

صحیح میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم سے پہلے لوگ قبروں کو مساجد بناتے تھے، خبردار! تم قبروں کو مساجد نہ بناؤ، میں تم کو اس سے منع کرتا ہوں۔''[1] واللہ أعلم[2]

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٥٣٢)

[2] مجموع الفتاویٰ (١٨٢/٢٧۔١٩٢)

حضرت علی اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما کے مزاروں کی تحقیق

سوال حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کے بیٹے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے نام پر جو مزارات مشہور ہیں، وہ صحیح ہیں یا نہیں؟ نیز حضرت علی رضی اللہ عنہ کی قبر کہاں ثابت ہے؟

جواب ان مشہور مزارات میں سے کچھ تو قطعی طور پر جھوٹے اور غلط ہیں، مثلاً نواحی دمشق میں ابی بن کعب کا مزار، اویس قرنی کا مزار، مصر میں حضرت حسین کا مزار وغیرہ۔ شام، عراق، مصر اور تمام بلاد میں ایسے بہت سے مزارات ہیں، جن کا ذکر باعثِ طوالت ہوگا۔ عبدالعزیز الکنانی جیسے علما کی ایک جماعت نے تو یہاں تک کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کے سوا جتنی قبروں کی نسبت مختلف انبیائے کرام کی طرف کی جاتی ہے، ان میں سے کوئی نسبت بھی درست نہیں، البتہ کچھ علما نے خلیل علیہ السلام کی قبر ثابت کی ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مزار کے بارے میں اکثر علما کی رائے ہے کہ وہ ان کی قبر نہیں، بلکہ ایک قول کے مطابق وہ حضرت مغیرہ بن شعبہ کی قبر ہے، کیوں کہ اس قبر کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے تقریباً تین سو سال بعد بنی بویہ کے ایامِ حکومت میں ظاہر کیا گیا اور انھوں نے اس کی بنیاد اس حکایت پر رکھی کہ ہارون الرشید اس جگہ آیا اور اس نے آ کر وہاں اپنے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اولاد کے درمیان ہونے والے تنازعات پر معذرت کی۔ تاہم اس طرح کی حکایت دلیل نہیں بن سکتی، کیوں کہ خود ہارون کو بھی اس کا کوئی علم نہیں۔ اگر یہ حکایت اس سے درست منقول بھی ہو تو شاید جس طرح دوسروں کو یہی بتایا گیا، اس کو بھی یہی بتایا گیا ہو۔ جمہور اہلِ علم و معرفت کہتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کوفہ کے قصرِ امارت یا اس کے آس پاس دفن کیے گئے، سنت بھی یہی ہے۔ کیوں کہ ان کی میت کو کوفہ سے اٹھا کر کسی ایسے دور دراز مقام پر دفن کرنا، جس کی کوئی فضیلت بھی نہ ہو، آلِ علی رضی اللہ عنہ سے کم از کم ایسے کام کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ یہ گمان بھی غلط ہے کہ ان کی قبر تین سو سال تک آلِ علی اور مسلمانوں پر پوشیدہ رہی ہو اور اس کو مفاد پرست عجمی اور جاہل لوگوں نے ظاہر کیا ہو۔

اسی طرح نواحِ دمشق میں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی قبر سے متعلق بھی ایک قول یہ ہے کہ یہ ان کی قبر نہیں، بلکہ ان کی قبر مسجدِ دمشق کی دیوار کے ساتھ ہے، جس کو ہود علیہ السلام کی قبر کہا جاتا ہے۔

اصل میں عمومی طور پر ان قبروں اور مزارات کا معاملہ بے یقینی اور خود ساختگی کا شکار ہے، بمشکل ہی کسی کی حقیقت کا پتا چلایا جا سکتا ہے، وہ بھی بہت زیادہ تلاش و جستجو اور تحقیق کے بعد، کیوں کہ ان کی پہچان برقرار رکھنا اور ان پر مساجد تعمیر کرنا اسلامی شریعت کا حکم نہیں اور نہ یہ اس ذکر کی حیثیت ہی رکھتی ہیں، جس کی حفاظت کی ذمے داری خود باری تعالیٰ نے اٹھائی ہے اور فرمایا ہے:

﴿ إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحٰفِظُونَ ﴾ [الحجر: ٩]

''بے شک ہم نے ہی یہ نصیحت نازل کی ہے اور بے شک ہم اس کی ضرور حفاظت کرنے والے ہیں۔''

بلکہ رسول اللہ ﷺ نے ایسے تمام کاموں سے منع کیا ہوا ہے جو وہاں بدعت پرست کرتے ہیں۔ صحیح مسلم میں جندب بن عبداللہ سے مروی ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے آپ کی وفات سے پانچ دن قبل سنا، آپ ﷺ فرما رہے تھے: ''تم سے پہلے لوگ قبروں کو مساجد بناتے تھے، خبردار! تم قبروں کو مساجد نہ بنانا، میں تم کو اس سے منع کرتا ہوں۔''[1] آپ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ یہود و نصاریٰ پر لعنت کرے، انھوں نے اپنے انبیا کی قبروں کو مساجد (سجدہ گاہ) بنا لیا۔''[2]

ائمہ اسلام کا اتفاق ہے کہ قبروں پر یہ مزارات تعمیر کرنا، ان کو مساجد بنانا، وہاں نماز پڑھنا اور نماز، اعتکاف، استغاثہ یا گریہ زاری جیسی عبادات کے لیے وہاں کا قصداً رخ اور سفر کرنا وغیرہ شریعت میں جائز نہیں، ان کے نزدیک وہاں نماز پڑھنا مکروہ ہے اور اکثر کے نزدیک باطل ہے، کیوں کہ رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع کیا ہے۔

جو شخص کسی مسلمان میت کی زیارت کرے، وہ کسی نبی کی قبر ہو یا نیک آدمی یا کسی دوسرے کی، اس کے لیے سنت یہ ہے کہ وہ اس کو سلام کہے اور اس کے لیے دعا کرے جو اس کی نمازِ جنازہ پڑھنے کا قائم مقام ہو، اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے ان دونوں کو اکٹھا کرتے ہوئے منافقوں کے متعلق ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

﴿ وَلَا تُصَلِّ عَلَىٰٓ أَحَدٍ مِّنْهُم مَّاتَ أَبَدًا وَلَا تَقُمْ عَلَىٰ قَبْرِهِۦٓ ﴾ [التوبة: ٨٤]

''اور ان میں سے جو کوئی مر جائے اس کا کبھی جنازہ نہ پڑھنا اور نہ اس کی قبر پر کھڑے ہونا۔''

دلیلِ خطاب اور مفہومِ مخالف کا تقاضا ہوا کہ مومنوں کا جنازہ پڑھا جائے اور ان کی قبروں پر کھڑے ہو کر دعا کی جائے۔ سنن میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب اپنے کسی صحابی کی میت دفن کرتے تو اس کی قبر پر کھڑے ہوتے اور فرماتے: ''اس کے لیے ثابت قدمی کی دعا کرو، کیوں کہ اب اس سے سوال جواب ہو رہے ہیں۔''[3] صحیح میں ہے کہ آپ ﷺ نے صحابہ کو قبروں کی زیارت کرتے وقت یہ دعا پڑھنا سکھائی:

«اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ أَهْلَ دَارِ قَوْمٍ مُؤْمِنِيْنَ، وَإِنَّا إِنْ شَاءَ اللّٰهُ بِكُمْ لَاحِقُوْنَ، وَيَرْحَمُ اللّٰهُ الْمُتَقَدِّمِيْنَ مِنَّا وَمِنْكُمْ وَالْمُتَاخِرِيْنَ، نَسْأَلُ اللّٰهَ لَنَا وَلَكُمُ الْعَافِيَةَ، اَللّٰهُمَّ لَا تَحْرِمْنَا

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٣٩)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٣٢٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٢٩)

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٢٢١) صحيح الجامع، رقم الحديث (٩٤٥)

أَجْرَهُمْ وَلَا تَفْتِنَّا بَعْدَهُمْ وَاغْفِرْ لَنَا وَلَهُمْ »[1]

اللہ کا دین یہ ہے کہ اللہ وحدہ لا شریک لہ کے گھروں کی تعظیم کی جائے جو مساجد ہیں، جہاں جماعت اور غیر جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا، اعتکاف کرنا، تمام بدنی عبادات اور تلاوت، ذکر اور اللہ سے دعا جیسی قلبی عبادات بجا لانا مشروع ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا ﴾ [الجن: ١٨]

''اور یہ کہ بلاشبہہ مساجد اللہ کے لیے ہیں، پس اللہ کے ساتھ کسی کو مت پکارو۔''

فرمایا:

﴿ قُلْ اَمَرَ رَبِّيْ بِالْقِسْطِ وَاَقِيْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ ﴾ [الأعراف: ٢٩]

''کہہ دے میرے رب نے انصاف کا حکم دیا ہے اور اپنے رخ ہر نماز کے وقت سیدھے رکھو۔''

فرمایا:

﴿ اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَلَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ فَعَسٰٓى اُولٰٓئِكَ اَنْ يَّكُوْنُوْا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ ﴾ [التوبة: ١٨]

''اللہ کی مسجدیں تو وہی آباد کرتا ہے جو اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان لایا اور اس نے نماز قائم کی اور زکات ادا کی اور اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈرا۔ تو یہ لوگ امید ہے کہ ہدایت پانے والوں سے ہوں گے۔''

نیز فرمایا:

﴿ فِيْ بُيُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَيُذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ يُسَبِّحُ لَهٗ فِيْهَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ۝ رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ يَخَافُوْنَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيْهِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ ۝ لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَيَزِيْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝ ﴾ [النور: ٣٦۔٣٨]

''ان گھروں میں جن کے بارے میں اللہ نے حکم دیا ہے کہ وہ بلند کیے جائیں اور ان میں اس کا نام یاد کیا جائے، اس کی تسبیح بیان کرتے ہیں ان میں صبح و شام۔ وہ لوگ جنھیں تجارت اور خرید و فروخت، اللہ کے ذکر اور نماز قائم کرنے اور زکات دینے سے غافل نہیں کرتی، وہ اس دن سے ڈرتے ہیں جس میں دل اور آنکھیں الٹ پلٹ جائیں گے۔ تا کہ اللہ انھیں اس کا بہترین بدلہ دے جو انھوں نے کیا اور انھیں اپنے

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٩٧٥) سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (١٥٤٦، ١٥٤٨٧) "اللهم لا تحرمنا أجرهم ولا تفتنا بعدهم" کے الفاظ مسلم میں اور "واغفر لنا ولهم" کے الفاظ ابن ماجہ میں نہیں ہیں۔

فضل سے زیادہ دے اور اللہ جسے چاہتا ہے بے حساب دیتا ہے۔''

یہ مسلمانوں کا دین ہے جو اخلاص کے ساتھ اللہ کی عبادت کرتے ہیں۔ قبروں کو پوجا گاہ اور بت بنانا مشرکوں کا دین ہے، جس سے سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم نے منع کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کے احوال کی اصلاح فرمائے۔ والحمد لله رب العالمين وصلى الله على محمد.[1]

حضرت حسین وسیدہ نفیسہ رضی اللہ عنہما کی قبروں سے جڑے بدعقیدے

سوال حضرت حسین اور سیدہ نفیسہ کی قبر کی زیارت کرنا قبر کے پاس نماز پڑھنا، اور یہ عقیدہ رکھنا کہ سیدہ نفیسہ قیدی کو آزاد کرتی ہے، ڈرے ہوئے کو پناہ دیتی ہے اور اللہ کے پاس حاجات پیش کرنے کا دروازہ ہے، کیا یہ سب جائز ہے یا نہیں؟

جواب اس پر سب کا اتفاق ہے کہ حضرت حسین کا سر مصر نہیں لے جایا گیا، اسی طرح شام میں بھی نہیں لے جایا گیا۔ جس کا عقیدہ ہے کہ نفیسہ یا کوئی بھی میت ڈرے ہوئے کو پناہ، قیدی کو آزاد کرتی ہے اور حاجات کا دروازہ ہے، وہ گمراہ اور مشرک ہے۔ اللہ ہی پناہ دیتا ہے، اس کے مقابلے میں پناہ نہیں دی جاتی۔ اللہ کے پاس حاجات پیش کرنے کا دروازہ صدق و اخلاص کے ساتھ اس سے دعا کرنا ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ ۖ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ ﴾ [البقرة: ١٨٦]

''اور جب میرے بندے تجھ سے میرے بارے میں سوال کریں تو بے شک میں قریب ہوں، میں پکارنے والے کی دعا قبول کرتا ہوں جب وہ مجھے پکارتا ہے۔''[2]

اولیا کی قبروں کے پاس دعا کرنے کا حکم

سوال نیک بزرگوں اور اولیاء اللہ کی قبروں کے پاس دعا کرنا جائز ہے یا ناجائز؟ کیا وہاں دعا کرنا دیگر مقامات کی نسبت زیادہ امکانِ قبولیت رکھتا ہے یا نہیں؟ نیز کن جگہوں پر دعا کرنا زیادہ بہتر اور افضل ہے؟

جواب قبروں کے پاس دعا کرنا مساجد اور دیگر مقامات پر دعا کرنے کی نسبت زیادہ بہتر اور افضل نہیں، سلف صالحین اور ائمہ کرام میں سے کسی ایک سے بھی یہ منقول نہیں کہ اس نے کہا ہو کہ قبروں کے پاس دعا کرنے کے لیے وہاں جانا مستحب ہے، خواہ وہ کسی نبی کی قبر ہو یا غیر نبی ہی کی، بلکہ صحیح بخاری میں یہ مروی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ

---

[1] مجموع الفتاویٰ (٢٧/٤٤٦۔٤٥٠)

[2] مجموع الفتاویٰ (٢٧/٤٩٠)

نے استسقا کے لیے رسول اللہ ﷺ کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو وسیلہ بنایا اور کہا: اے اللہ! ہم اپنے نبی کے ذریعے تجھ سے بارش طلب کیا کرتے تھے اور تو ہمیں بارش سے نوازتا تھا، اب ہم اپنے نبی کے چچا کے ذریعے تجھ سے بارش طلب کرتے ہیں تو ہمیں بارش سے نواز، تو ان پر بارش برس پڑتی۔[1]

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جس طرح رسول اللہ ﷺ کے ذریعے بارش طلب کیا کرتے تھے، اسی طرح انھوں نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے ذریعے بارش طلب کی، کیوں کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے چچا تھے، لیکن وہ نہ تو آپ ﷺ کی قبر کے پاس جا کر بارش طلب کرتے نہ وہاں کسی دوسری دعا ہی کے لیے جاتے، بلکہ صحاح میں یہ حدیث مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ یہود و نصاریٰ پر لعنت کرے! انھوں نے اپنے نبیوں کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا، یہ بات آپ ﷺ نے ان کے فعل سے خبردار کرتے ہوئے کہی۔''[2] آپ ﷺ نے اپنی وفات سے پانچ دن قبل فرمایا تھا: ''تم سے پہلے قبروں کو مساجد بناتے تھے، خبردار! تم قبروں کو مساجد نہ بنانا، میں تم کو اس سے منع کرتا ہوں۔''[3] سنن میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ قبروں پر آنے جانے والی عورتوں اور وہاں مساجد بنانے اور دیے جلانے والوں پر لعنت کرے۔''[4] اگر آپ ﷺ نے قبروں کو مساجد بنانے اور وہاں روشنی کرنے سے منع کیا ہے تو معلوم ہوا کہ آپ ﷺ نے ان کو خدا کی عبادت اور اس سے دعا کرنے کی جگہ کا درجہ نہیں دیا، بلکہ جو قبرستان جاتا ہے، اس لیے یہ طریقہ متعین کیا ہے کہ وہ وہاں جا کر مردے کو سلام کہے اور اس کے لیے دعا کرے، جس طرح آپ ﷺ نے اس کو دفنانے سے پہلے اس کا جنازہ پڑھنا اور اس کے لیے دعا کرنا مسنون قرار دیا ہے۔ مقصود، مسنون طریقے کے مطابق میت کے لیے دعا کرنا ہے، نہ کہ اس کو پکارنا۔ واللّٰه أعلم[5]

کسی قبر کے پاس جا کر قربانی کرنے کا حکم

سوال کچھ لوگ قاہرہ میں رہتے ہیں، مگر قربانی کرنے کے لیے قرافہ جاتے ہیں، کیا کسی قبر کے پاس جا کر قربانی کرنا جائز ہے؟

جواب قربانی کا جانور یا کوئی بھی جانور قبروں پر ذبح کرنا جائز نہیں، بلکہ نماز، روزے اور صدقے جیسی اصل عبادتوں

---

(1) صحيح البخاري، رقم الحديث (٩٦٤)

(2) صحيح البخاري، رقم الحديث (١٣٢٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٢٠)

(3) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٣٢)

(4) سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٢٣٦) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٢٠) سنن النسائي، رقم الحديث (٢٠٤٣) السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٢٢٥)

(5) مجموع الفتاویٰ (٢٧/١٨٠۔١٨١)

میں سے کوئی عبادت بھی قبر کے پاس جائز نہیں، جو سمجھتا ہے کہ قبروں پر قربانی کا جانور ذبح کرنا مستحب یا افضل عمل ہے، وہ انسان لاعلم، گمراہ اور اجماع کا مخالف ہے، بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبروں کے پاس جانور ذبح کرنے سے منع فرمایا ہے۔ زمانۂ جاہلیت میں کچھ لوگوں کی عادت تھی کہ جب کوئی ان کا بڑا فوت ہوتا تو اس کی قبر کے پاس جانور ذبح کرتے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو قبروں کو سجدہ گاہ بنانے سے منع کیا اور اپنی امت کو قبروں کی تعظیم اور عبادت کرنے والے مشرکوں کی مشابہت اختیار کرنے سے خبردار کرتے ہوئے اس طرح کے کام کرنے والوں پر لعنت کی۔ لہٰذا قبر کو قربان گاہ بنانا کس طرح جائز ہوسکتا ہے؟ یہ بھی مشرکوں سے ایک طرح کی مشابہت ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا تھا:

﴿ قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَ نُسُكِیْ وَ مَحْیَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴾ [الأنعام: ١٦٢]

''کہہ دے بے شک میری نماز اور میری قربانی اور میری زندگی اور میری موت اللہ کے لیے ہے، جو جہانوں کا رب ہے۔''

اس لیے نماز میں اخلاص اختیار کرنا اور قربانی صرف اللہ کے لیے کرنا ضروری ہے۔

اگرچہ بندے کا مقصد قبر کے لیے ذبح کرنا نہ ہو، لیکن شریعت سدِ ذرائع کے طور پر بہت سے کاموں سے منع کرتی ہے، مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سورج کے غروب اور طلوع ہوتے وقت نماز پڑھنے سے منع کیا، کیوں کہ اس وقت کافر اس کو سجدہ کرتے ہیں، اگرچہ جو اس وقت اللہ کے لیے نماز پڑھتا ہے، اس کا مقصد سورج کی عبادت نہیں ہوتا۔

اسی طرح قبروں کو سجدہ گاہ بنانا منع ہے، گو نماز پڑھنے والا اللہ ہی کے لیے نماز پڑھتا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

''وہ ہم سے نہیں جس نے ہمارے غیر کی مشابہت روا رکھی۔''[1]

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جس نے جس قوم سے مشابہت رکھی، وہ انہی میں سے ہے۔''[2] واللہ أعلم.[3]

سفرِ معصیت میں ڈوب کر مرنے والے کا حکم

سوال ایک شخص تکروری (ایک قبر کا مقام) سیر کے لیے جاتا ہے اور وہاں سمندر میں ڈوب جاتا ہے، کیا وہ گناہ گار ہے یا شہید؟

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٦٩٥) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢١٩٤)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٠٣١) صحيح الجامع، رقم الحديث (٢٨٣١)

[3] مجموع الفتاویٰ (٢٧/٤٩٥ـ٤٩٦)

جواب اگر وہ اس قبر کے پاس نماز پڑھنے، اس کے وسیلے سے دعا کرنے، قبر پر ہاتھ پھیر کر برکت حاصل کرنے اور اس کو چومنے جیسے منع کردہ کاموں کے لیے وہاں گیا یا شراب نوشی، گانا سننے اور فحاشی کے کام کرنے کے لیے وہاں گیا یا نہی عن المنکر کیے بغیر محض میلہ دیکھنے اور ان گناہ گاروں کا نظارہ کرنے کے لیے وہاں گیا تو اس کا یہ سفر سفرِ معصیت ہے، اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے، تاہم ڈوبنے کی وجہ سے ان کے لیے اللہ کی رحمت کی امید ہے۔ واللہ أعلم.[1]

رجالِ غیب کی اصلیت

سوال کیا اس امت میں کچھ ایسے نیک لوگ موجود ہیں جن کو اللہ نے لوگوں کی نگاہوں سے پوشیدہ رکھا ہے اور صرف انھیں نظر آ سکتے ہیں، جن کو نظر آنا چاہیں اور اگر وہ لوگوں کے درمیان ہوں تو ان سے محجوب ہوتے ہیں؟

جواب ایسے لوگوں کا وجود جو ہمیشہ لوگوں سے پوشیدہ رہتے ہوں اور انھیں نظر نہ آتے ہوں، لغو ہے۔ یہ خصوصیت کسی نبی کو حاصل رہی ہے نہ کسی ولی کو اور نہ کسی جادوگر ہی کو، البتہ وقتی طور پر کوئی شخص کسی کی نگاہ سے اوجھل ہوسکتا ہے، یہ اس کی کرامت بھی ہوسکتی اور جادو کا کرشمہ بھی۔

ان احوال میں سے کچھ رحمانی احوال ہوتے ہیں اور کچھ شیطانی اور نفسانی۔ رحمانی احوال اللہ کے ان اولیا کی کرامات ہیں جو کتاب و سنت کے پیروکار ہوتے ہیں اور وہ درحقیقت متقی مومن ہیں۔ نفسانی یا شیطانی احوال کی صورت یہ ہے کہ بسا اوقات کسی کافر کو کوئی کشف ہوسکتا ہے، کسی کاہن کو بھی کبھی شیطان کچھ بتا دیتے ہیں اور بدعت پرست لوگوں پر طاری ہونے والے احوال بھی اسی قبیل سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں سے کسی کو شیاطین کبھی ہوا میں اڑا دیتے ہیں، کوئی فضا میں رقص کرتا نظر آتا ہے، کسی کو شیطان کوئی ایسا لباس پہنا دیتا ہے جو لوگوں کو نظر نہیں آتا، جس کی وجہ سے اس کو ضرب کا احساس نہیں ہوتا یا آگ میں پھینک دیا جائے تو وہ اس کو محسوس نہیں کرتا، لیکن وہ آگ اس کے لیے ٹھنڈک اور سلامتی والی نہیں بنتی، یہ صرف رحمانی احوال والوں کا خاصہ ہے۔ جو ڈھکوسلے باز ہوتے ہیں اور جادو منتر سے کام لیتے ہیں، ان میں سے عام لوگ بہتان باز اور جھوٹے ہوتے ہیں اور جو ان میں خاص ہوتے ہیں، ان پر شیطانی احوال طاری ہوتے ہیں، لیکن ان میں ولی اللہ کوئی نہیں ہوتا، یہ سب شیطان کے بھائی ہیں۔ اللہ کے ولی وہ ہوتے ہیں جو نبی امی ﷺ کے پیروکار اور سنت پر کاربند رہتے ہوں اور انسان پر طاری ہونے والے احوال اس کے اعمال کا نتیجہ ہوتے ہیں، رزقِ حلال کھانا اور نیک عمل کرنا، رحمانی احوال پیدا کرتا ہے، جن میں کشف اور خدا

[1] مجموع الفتاویٰ (۲۸/۴۹۷۔۵۰۰)

اور اس کے رسول کو پسند تاثیرات شامل ہیں۔ حرام کھانا اور برے عمل کرنا شیطانی احوال کو جنم دیتا ہے، جن سے اللہ اور اس کا رسول نفرت کرتے ہیں۔

اگر کوئی شیطانی احوال کا حامل کسی رحمانی احوال کے حامل شخص سے ملاقات کرے تو اس کے شیاطین بھاگ جاتے ہیں، یہ شیطان کافروں اور جاہلوں کے سامنے ہی ظاہر ہوتے ہیں، جب کوئی کتاب وسنت کا متبع آ جائے تو اس وقت ان کے ساتھ احوال باطل ہو جاتے ہیں۔ ملخصاً، واللہ أعلم [1]

بعثت سے پہلے رسول اللہ ﷺ کی عبادت

سوال رسول اللہ ﷺ بعثت سے پہلے کس طرح عبادت کیا کرتے تھے؟

جواب الحمد للہ. یہ ایک ایسا مسئلہ ہے کہ ہماری شریعت میں اس کی ضرورت نہیں۔ ہم آپ ﷺ کے رسول بننے کے بعد آپ ﷺ کی اقتدا اور پیروی کے مکلّف ہیں، بعثت سے پہلے آپ ﷺ کا غارِ حرا میں عبادت کے لیے خلوت نشین ہونا، امت کے لیے سنتِ مسنونہ نہیں، اس لیے اسلام کے بعد کوئی صحابی بھی غارِ حرا میں عبادت کے لیے نہیں گیا اور نہ وہ اس طرح کی چیزیں تلاش ہی کرتے تھے۔

اسلام کے بعد ہمارے لیے غاروں میں خلوت نشین ہونا مسنون نہیں، بلکہ مساجد میں اعتکاف کرنا مشروع اور مسنون ہے۔

غاروں میں خلوت نشین ہونا اور حصولِ برکت کے لیے کوہِ طور، کوہِ حرا، کوہِ یثرب جیسے پہاڑوں کا قصد کرنا بھی مشروع نہیں، بلکہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: تین مساجد کے سوا رختِ سفر نہ باندھا جائے۔ [2] رسول اللہ ﷺ بعثت سے پہلے حج کرتے، صدقہ کرتے، ناتواں کا بوجھ اٹھاتے، مہمان نوازی کرتے، حق کے معاملات میں مدد کرتے، لیکن آپ ﷺ اپنی مشرک قوم کے دین پر نہیں تھے۔ صلی اللہ علیہ وأصحابہ وسلم تسلیما کثیرا.

انبیا کے آثار پر عبادت کا حکم:

وہ جگہ جہاں انبیا عبادت اور نماز کے لیے قصداً نہ گئے ہوں، بلکہ سفر کے دوران میں وہاں ٹھہرے ہوں یا وہاں سے گزرے ہوں تو ایسی جگہوں پر نماز اور عبادت کے لیے قصداً جانا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما یا کسی دوسرے صحابی کا فعل نہیں اور اگر ہو بھی تو اس کے طرح کے ان کے فعل یا قصد کی پیروی کسی پر لازم نہیں۔

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۲۷/۴۹۷۔۵۰۰)

[2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۱۱۳۲) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۳۹۷)

رسول اللہ ﷺ اپنے سفر یا اقامت کے دوران میں جہاں قیام کرتے تھے، صحابہ ان جگہوں پر عبادت کے لیے نہیں جاتے تھے۔

رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''قبور کو مساجد نہ بناؤ، میں تمھیں اس سے منع کرتا ہوں۔''[1]

اس مفہوم کی احادیث انبیا کی قبروں کو سجدہ گاہ بنانے سے صریحاً منع کرتی ہیں، حالانکہ وہ ان میں مدفون ہوتے ہیں اور اپنی قبروں میں زندہ ہوتے ہیں اور ان کو سلام کہنے کے لیے وہاں جانا مستحب عمل ہے، اس کے باوجود وہاں نماز پڑھنے کے لیے جانا اور ان کو سجدہ گاہ بنانا منع ہے۔

یہ منع اس لیے ہے کہ یہ کام شرک کا ذریعہ ہے اور اس سے منع کر کے آنحضرت ﷺ نے یہ چاہا کہ مساجد خالص اللہ کے لیے ہوں، صرف اس کی عبادت کے لیے تعمیر کی جائیں اور اس میں کسی کو اس کے ساتھ شریک نہ بنایا جائے، اس لیے میت کے لیے یا کسی اور اثر اور نشان کے لیے مسجد بنانا حرام ہے، کیوں کہ دونوں جگہوں پر شرک کا امکان رہتا ہے۔

اس لیے عیسائی کسی نبی یا نیک آدمی کی قبر اور اس کے نشان پر اور اس کے نام کے ساتھ گرجے بناتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بھی امت کے اسی کام میں پڑنے کا خدشہ محسوس ہوا اور نبی اکرم ﷺ نے جب امت کو اس سے منع کیا تو آپ ﷺ کے پیشِ نظر بھی یہی حکمت تھی، اللہ تعالیٰ نے اسی لیے فرمایا ہے:

﴿ وَاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا ﴾ [الجن: ١٨]

''اور یہ کہ بلاشبہہ مساجد اللہ کے لیے ہیں، پس اللہ کے ساتھ کسی کو مت پکارو۔''

فرمایا:

﴿ قُلْ اَمَرَ رَبِّيْ بِالْقِسْطِ ۣ وَاَقِيْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ﴾

[الأعراف: ٢٩]

''کہہ دے میرے رب نے انصاف کا حکم دیا ہے اور اپنے رخ ہر نماز کے وقت سیدھے رکھو اور اس کے لیے دین کو خالص کرتے ہوئے اس کو پکارو۔''

فرمایا:

﴿ مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ شٰهِدِيْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ښ وَفِي النَّارِ هُمْ خٰلِدُوْنَ ⑰ اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَلَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ ۣ فَعَسٰٓى اُولٰۗىِٕكَ اَنْ يَّكُوْنُوْا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ ⑱ ﴾

[التوبة: ١٧، ١٨]

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٥٣٩)

''مشرکوں کا کبھی حق نہیں کہ وہ اللہ کی مسجدیں آباد کریں، اس حال میں کہ وہ اپنے آپ پر کفر کی شہادت دینے والے ہیں۔ یہ وہ ہیں جن کے اعمال ضائع ہو گئے اور وہ آگ ہی میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔ اللہ کی مسجدیں تو وہی آباد کرتا ہے جو اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان لایا اور اس نے نماز قائم کی اور زکات ادا کی اور اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈرا۔ تو یہ لوگ امید ہے کہ ہدایت پانے والوں سے ہوں گے۔''

اگر یہ عمل مستحب ہوتا تو صحابہ اور تابعین آپ ﷺ کی ازواجِ مطہرات کے تمام گھروں اور ان تمام جگہوں پر نماز پڑھنا مستحب سمجھتے، جہاں جہاں آپ ﷺ اپنے سفروں کے دوران میں ٹھہرے اور جہاد کے لیے نکلے اور ان تمام جگہوں پر مساجد تعمیر کرنا بھی مستحب ہوتا، لیکن سلف نے ایسا کوئی کام نہیں کیا، اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے مسلمانوں کے لیے نماز کا قصد کرنے کے لیے مساجد اور عبادت کا ارادہ کرنے کے لیے مشاعر کے سوا کوئی جگہ مخصوص نہیں کی، مساجد کے برخلاف عرفات، مزدلفہ اور منیٰ میں وقوف جیسے مشاعرِ حج کا قصد و ارادہ، ذکرِ الٰہی، دعا اور تکبیر کے لیے کیا جاتا ہے، نماز کے لیے نہیں۔ نماز کے لیے صرف مساجد کا قصد کیا جاتا ہے۔ مساجد اور مشاعر کے سوا کوئی جگہ نہیں، جہاں نماز اور نسک (مناسکِ حج وعمرہ) کے لیے جانے کا ارادہ اور قصد کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَ نُسُكِیْ وَ مَحْیَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿١٦٢﴾ لَا شَرِیْكَ لَهٗ ۚ وَ بِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ ﴿١٦٣﴾ ﴾ [الأنعام: ١٦٢، ١٦٣]

''کہہ دے بے شک میری نماز اور میری قربانی اور میری زندگی اور میری موت اللہ کے لیے ہے، جو جہانوں کا رب ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں اور مجھے اسی کا حکم دیا گیا ہے۔''

زمین کے ان ٹکڑوں کے سوا جتنے ٹکڑے اور خطے ہیں کسی کو بھی، نماز، دعا اور ذکر کے لیے مخصوص کر کے (جس کا ذکر شریعت میں نہیں ہوا) وہاں جانا مستحب نہیں، چاہے وہ کسی نبی کا گھر، جائے سکونت یا گزرگاہ ہی رہی ہو۔

دین کی اصل ان کاموں میں رسول اللہ ﷺ کی متابعت اور موافقت ہے، جن کا آپ ﷺ نے حکم دیا اور جن کو امت کے لیے مشروع اور سنت قرار دیا ہے۔ اسی طرح آپ ﷺ کے ان افعال کی پیروی کرنا بھی ضروری ہے جن میں آپ ﷺ کی اقتدا جائز ہے۔ رہے آپ ﷺ کے خصائص تو وہ آپ ﷺ کے ساتھ خاص ہیں، امت ان کی مکلّف نہیں۔

وہ فعل جس کا آپ ﷺ نے ہمیں حکم دیا نہ جائز قرار دیا اور نہ اس کو کر کے ہمارے لیے سنت بنایا کہ ہم اس میں آپ ﷺ کی پیروی کریں تو وہ کام عبادات اور قربِ الٰہی کے کاموں میں شمار نہیں ہوتا، اس کو عبادت بنا لینا رسول اللہ ﷺ کی مخالفت ہے۔ آپ ﷺ نے جو مباح کام عبادت کے طور پر نہیں کیے وہ ہمارے لیے بھی اسی طرح

مباح ہیں، لیکن کیا ہم ان کو عبادت بنا سکتے ہیں، اس میں دو اقوال ہیں، لیکن اکثر سلف اور علما کا یہی کہنا ہے کہ ہم ان کو عبادت نہیں بنا سکتے، بلکہ ان میں آپ کی پیروی کریں گے، اگر آپ ﷺ نے اس کو بطورِ مباح کیا تھا تو ہم بھی اس کو بطورِ مباح کریں گے، اگر آپ ﷺ نے اس کو بطورِ قرب اور نیکی کیا تو ہم بھی اس کو بطورِ قرب کریں گے۔ جو اس کو عبادت قرار دیتے ہیں، ان کے نزدیک یہ آپ ﷺ کے نمونے اور اسوۂ حسنہ کی مکمل پیروی اور مشابہت ہے اور اس میں ایک طرح کی برکت ہے۔

(1) مجموع الفتاویٰ (۲۷/۵۰۰-۵۰۱)

جہاد

رباط فی سبیل اللہ کی افضلیت

سوال رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''ساحلِ سمندر پر ایک رات کی چوکیداری آدمی کے اپنے گھر میں ایک ہزار برس تک عمل کرتے رہنے سے افضل ہے۔''[1] اس حدیث کی وضاحت مطلوب ہے، نیز مکہ مکرمہ، مدینہ طیبہ اور بیت المقدس میں عبادت کے لیے وقف ہو جانا افضل ہے یا دمیاط، اسکندریہ اور طرابلس وغیرہ میں جہاد کی نیت سے رباط اور قیام کرنا؟

جواب الحمد لله. سرحدی علاقے جہاں انسان جہاد میں شرکت کے لیے ہر وقت تیار اور انتظار میں رہتا ہے، یا ان کی حفاظت کے لیے وہاں قیام کرتا ہے، اس کو شریعت کی اصطلاح میں رباط کہا جاتا ہے، یہ عمل تینوں مذکورہ مساجد میں عبادت کے لیے ان کے جوار میں رہنے سے افضل ہے۔ مجھے اس مسئلے میں اہلِ علم کا اختلاف معلوم نہیں، بلکہ بہت سے ائمہ نے اس کا صراحت سے ذکر کیا ہے، کیوں کہ رباط جہاد کی جنس سے تعلق رکھتا ہے اور ان مساجد کی مجاورت کو زیادہ سے زیادہ حج کی جنس سے قرار دیا جا سکتا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَآجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَجٰهَدَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ لَا يَسْتَوٗنَ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿١٩﴾ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۙ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ ؕ ﴾ [التوبة: ١٩، ٢٠]

''کیا تم نے حاجیوں کو پانی پلانا اور مسجد حرام کو آباد کرنا اس جیسا بنا دیا جو اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان لایا اور اس نے اللہ کے راستے میں جہاد کیا۔ یہ اللہ کے ہاں برابر نہیں ہیں اور اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔ جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے ہجرت کی اور اللہ کے راستے میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ جہاد کیا، اللہ کے ہاں درجے میں زیادہ بڑے ہیں۔''

صحیحین میں ہے کہ آنحضرت ﷺ سے پوچھا گیا: افضل عمل کون سا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ اور اس

---

[1] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٧٧٠) السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (١١٣٤)

کے رسول پر ایمان لانا، پوچھا گیا: پھر؟ آپ ﷺ نے فرمایا: پھر اللہ کی راہ میں جہاد کرنا، پوچھا گیا: پھر؟ آپ ﷺ نے فرمایا: پھر حجِ مبرور (مقبول)۔[1]

ایک حدیث میں آیا ہے: ''اللہ کی راہ میں غزوہ اور جنگ کرنا ستر حجوں سے افضل ہے۔''[2]

صحیح مسلم میں حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''اللہ کی راہ میں ایک دن اور رات کا رباط ایک مہینے کے روزوں اور قیام سے افضل ہے، جو رباط کی حالت میں فوت ہوا، وہ مجاہد فوت ہوا، اس کے لیے جنت سے رزق جاری کر دیا جاتا ہے اور وہ فتنہ قبر (قبر کے سوال و جواب) سے محفوظ رہتا ہے۔''[3]

سنن میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ کی راہ میں ایک دن کا رباط اس کے سوا منازل میں ایک ہزار دن سے بہتر ہے۔''[4]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے رسولِ اللہ ﷺ کی یہ بات آگے پہنچاتے ہوئے منبرِ رسول پر ارشاد فرمائی تھی۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا قول ہے: ''میں ایک رات اللہ کی راہ میں رباط کر لوں، یہ میرے لیے حجرِ اسود کے پاس لیلۃ القدر پانے سے بہتر ہے۔''

اللہ کی راہ میں گھوڑے باندھنے، جہاد کے لیے تیار رہنے اور چوکیداری کے اتنے فضائل ہیں جو اس فتوے میں سما نہیں سکتے۔ واللّٰہ أعلم[5]

اسلام میں جنگی تربیت اور مقاماتِ مقدسہ کی مجاورت

سوال تیر اندازی، نیزے بازی اور تلوار بازی سیکھنے اور دیگر جنگی ہتھیاروں کی تربیت حاصل کرنے سے متعلق اسلام کی تعلیمات کیا ہیں، نیز جو شخص ان کی تربیت حاصل کرنے کے بعد ان فنون کو بھلا دیتا ہے، اس کا کیا حکم ہے؟

جواب اللہ کی راہ میں تیر اندازی، نیزے بازی اور تلوار بازی، یہ تینوں کام ایسے ہیں جن کا اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے حکم دیا ہے، اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے قرآن کریم کی درج ذیل آیات میں ان تینوں کاموں کا ذکر کیا ہے:

﴿ فَإِذَا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا فَضَرْبَ الرِّقَابِ حَتَّىٰ إِذَا أَثْخَنتُمُوهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ فَإِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَإِمَّا فِدَاءً حَتَّىٰ تَضَعَ الْحَرْبُ أَوْزَارَهَا ﴾ [محمد: ٤]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٨٣)

[2] مذکورہ الفاظ میں روایت نہیں ملی ہے۔ مجمع الزوائد (٥/٢٧٩) میں دیگر اعداد کی روایات مروی ہیں۔

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٩١٣)

[4] سنن الترمذي، رقم الحديث (١٦٦٧) سنن النسائي، رقم الحديث (٣١٦٩) صحيح الترغيب والترهيب (٢/٣٣)

[5] مجموع الفتاویٰ (٢٨/٥۔٦)

''تو جب تم ان لوگوں سے ملو جنھوں نے کفر کیا تو گردنیں مارنا ہے، یہاں تک کہ جب انھیں خوب قتل کر چکو تو (ان کو) مضبوط باندھ لو، پھر بعد میں یا تو احسان کرنا ہے اور یا فدیہ لے لینا، یہاں تک کہ لڑائی اپنے ہتھیار رکھ دے۔''

﴿ فَاضۡرِبُوۡا فَوۡقَ الۡاَعۡنَاقِ وَاضۡرِبُوۡا مِنۡهُمۡ كُلَّ بَنَانٍ ﴾ [الأنفال: ١٢]

''پس ان کی گردنوں کے اوپر ضرب لگاؤ اور ان کے ہر ہر پور پر ضرب لگاؤ۔''

﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَيَبۡلُوَنَّكُمُ اللّٰهُ بِشَىۡءٍ مِّنَ الصَّيۡدِ تَنَالُهٗۤ اَيۡدِيۡكُمۡ وَرِمَاحُكُمۡ ﴾ [المائدة: ٩٤]

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! یقیناً اللہ تمھیں شکار میں سے کسی چیز کے ساتھ ضرور آزمائے گا، جس پر تمھارے ہاتھ اور نیزے پہنچتے ہوں گے۔''

﴿ وَاَعِدُّوۡا لَهُمۡ مَّا اسۡتَطَعۡتُمۡ مِّنۡ قُوَّةٍ وَّمِنۡ رِّبَاطِ الۡخَيۡلِ تُرۡهِبُوۡنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمۡ وَاٰخَرِيۡنَ مِنۡ دُوۡنِهِمۡ ﴾ [الأنفال: ٦٠]

''اور ان کے (مقابلے کے) کی قوت سے اور گھوڑے باندھنے سے تیاری کرو، جتنی کر سکو، جس کے ساتھ تم اللہ کے دشمن کو اور اپنے دشمن کو اور ان کے علاوہ کچھ دوسروں کو ڈراؤ گے۔''

صحیح مسلم میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے منبر پر یہی آیت پڑھی، اس کے بعد فرمایا:

«اَلَا إِنَّ الْقُوَّةَ الرَّمْيُ، اَلَا إِنَّ الْقُوَّةَ الرَّمْيُ، اَلا إِنَّ الْقُوَّةَ الرَّمْيُ »[1]

''یاد رکھو، قوت تیر اندازی ہے، یاد رکھو! قوت تیر اندازی ہے، یاد رکھو! قوت تیر اندازی ہے۔''

رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''تیر اندازی کرو اور گھڑ سواری کرو، تم تیر اندازی کرو، یہ مجھے اس سے زیادہ پسند ہے کہ تم گھڑ سواری کرو، جس نے تیر اندازی سیکھی، پھر اس کو بھلا دیا، وہ ہم سے نہیں۔''[2]

ایک روایت میں ہے: ''جس نے تیر اندازی سیکھی، پھر اسے بھلا دیا تو یہ نعمت تھی جس کا اس نے انکار کر دیا۔''[3]

سنن میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہر کھیل جو انسان کھیلتا ہے، لغو ہے، سوائے اس کے کہ وہ تیر اندازی کرے، اپنا گھوڑا سدھائے اور اپنی بیوی سے دل لگی کرے، یہ حق ہیں۔''[4] آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم پر زمینیں کھول

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٩١٧)

[2] سنن النسائي، رقم الحديث (٣٥٧٩) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٨١٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٩١١٩) بلفظ "من علم الرمي ثم تركه فليس منا أو قد عصى" صحيح الجامع، رقم الحديث (٦١٤٢)

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٥١٣) سنن النسائي، رقم الحديث (٣٥٧٨) صحيح الجامع، رقم الحديث (٦١٤٢)

[4] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٥١٣) سنن النسائي، رقم الحديث (٣٥٧٩) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٨١٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٩١٩) بلفظ "من علم الرمي ثم تركه فليس منا أو قد عصى" صحيح الجامع (٦١٤٢)

دی جائیں گی، اللہ تمھیں کفایت کرے گا، لہٰذا تم میں سے کوئی بھی اپنے تیروں کے ساتھ کھیلنے میں تقصیر نہ کرے۔''[1]

مکحول بیان کرتے ہیں: حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اہلِ شام کو خط لکھا: ''اپنے بچوں کو تیر اندازی اور گھڑ سواری سکھاؤ۔''

صحیح بخاری میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اے بنی اسماعیل! تیر اندازی کرو، تمھارا باپ تیر انداز تھا۔ تیر اندازی کرو، میں فلاں کے ساتھ ہوں۔ یہ سننا تھا کہ دونوں فریقوں نے اپنا ہاتھ روک لیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: تمھیں کیا ہوا، تم تیر کیوں نہیں پھینک رہے؟ انھوں نے کہا: ہم کس طرح تیر پھینکیں، جب آپ ان کے ساتھ ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم سب تیر اندازی کرو، میں تم سب کے ساتھ ہوں۔''[2] حضرت سعد بن ابی وقاص فرماتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم احد کے دن مجھے تیر پکڑاتے جاتے اور کہتے: ''پھینک! میرے ماں باپ تجھ پر قربان ہوں۔''[3]

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''میں نے نہیں دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سعد کے سوا کسی کے لیے اس طرح اپنے ماں باپ دونوں کو اکٹھا کیا ہو۔''[4]

سنن میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے اللہ کی راہ میں ایک تیر بھی پھینکا، چاہے وہ دشمن کو لگا یا نہ لگا، وہ اس کے لیے ایک گردن آزاد کرنے کے برابر ہے۔''[5]

سنن میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ ایک تیر کی وجہ سے تین اشخاص کو جنت میں داخل کرے گا، ایک جس نے اس کو اچھائی کی نیت سے بنایا، دوسرا وہ جس نے اس کو پھینکا اور تیسرا وہ جس نے اس کو پکڑایا۔''[6]

کیوں کہ یہ سارے جہاد کے کام ہیں اور انسان اپنی رضا اور خوش دلی سے جو نیک اعمال کرتا ہے، جہاد ان سب سے افضل ہے، نفلی جہاد نفلی حج سے افضل ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَآجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَجٰهَدَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ لَا يَسْتَوٗنَ عِنْدَ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿19﴾ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۙ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ﴿20﴾ يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ وَّجَنّٰتٍ لَّهُمْ فِيْهَا نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ ﴿21﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۚ

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٩١٨)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٧٤٣)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٥١٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤١٢)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٨٣٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤١١)

[5] سنن النسائي، رقم الحديث (٣١٤٢) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٨١٢) صحيح الجامع، رقم الحديث (٦٢٦٧)

[6] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٥١٣) سنن النسائي، رقم الحديث (٣٥٧٩) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٨١٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٩١٩) بلفظ "من علم الرمي ثم تركه فليس منا أو قد عصى" صحيح الجامع (٦١٤٢)

﴿ إِنَّ اللَّهَ عِندَهُ أَجْرٌ عَظِيمٌ ﴾ [التوبة: ۱۹، ۲۲]

''کیا تم نے حاجیوں کو پانی پلانا اور مسجد حرام کو آباد کرنا اس جیسا بنا دیا جو اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان لایا اور اس نے اللہ کے راستے میں جہاد کیا۔ یہ اللہ کے ہاں برابر نہیں ہیں اور اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔ جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے ہجرت کی اور اللہ کے راستے میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ جہاد کیا، اللہ کے ہاں درجے میں زیادہ بڑے ہیں اور وہی لوگ کامیاب ہیں۔ ان کا رب انھیں اپنی طرف سے بڑی رحمت اور عظیم رضا مندی اور ایسے باغوں کی خوشخبری دیتا ہے جن میں ان کے لیے ہمیشہ رہنے والی نعمت ہے۔ جس میں وہ ہمیشہ رہنے والے ہیں ہمیشہ۔ بے شک اللہ ہی ہے جس کے پاس بہت بڑا اجر ہے۔''

صحیح میں ہے کہ ایک آدمی نے کہا: مجھے کوئی پروا نہیں کہ اسلام کے بعد مسجد حرام کی آباد کاری کے سوا کوئی عمل نہ کروں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جہاد فی سبیل اللہ ان سب سے افضل ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہنے لگے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منبر کے نزدیک آوازیں بلند نہ کرو، جب نماز ہو جائے گی تو میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے بارے میں پوچھوں گا۔ انھوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی بابت پوچھا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی، جس میں بیان کیا کہ ایمان اور جہاد مسجد حرام کی آباد کاری، حج، عمرے، طواف اور حاجیوں کو پانی پلانے جیسی نیکیوں سے افضل ہیں۔ اسی لیے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا تھا: ''میں اللہ کی راہ میں ایک رات رباط کرلوں، یہ مجھے حجرِ اسود کے نزدیک لیلۃ القدر گزارنے سے زیادہ پسند ہے۔''

اس بنا پر سرحدی مقامات پر رباط کرنا مکے اور مدینے کی مجاورت سے افضل ہے۔ سرحدی اور جنگی مقامات پر تیر اندازی کی مشق نفل نماز سے بہتر ہے۔

صحیحین میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے: ''جنت میں سو درجے ہیں، ایک درجے سے لے کر دوسرے درجے تک اتنا فاصلہ ہے جتنا زمین آسمان کا فاصلہ ہے، اللہ نے یہ سب اس کی راہ میں جہاد کرنے والوں کے لیے تیار کیے ہیں۔''[1]

ان تمام اعمال میں سے جو عمل وقت کی ضرورت پوری کرتا ہو، اس وقت وہی افضل ہوتا ہے۔ جب دشمن کے ساتھ دو بدو مقابلہ ہو رہا ہو، اس وقت تلوار بازی افضل ہوتی ہے، جب دشمن قریب ہو، اس وقت نیزے بازی بہتر ہوتی ہے اور جب دور ہو یا درمیان میں کوئی نہر یا قلعے وغیرہ کی طرح کی کوئی رکاوٹ ہو تو اس وقت تیر اندازی بہتر ہوتی ہے۔ جو ہتھیار دشمن کے لیے زیادہ کاری اور مسلمانوں کے لیے زیادہ مفید ہو وہی افضل ہوتا ہے۔ تاہم اس میں صورت حال بدلتی رہتی ہے اور لڑنے والے اس طرح کے معاملات سے اچھی طرح آگاہ ہوتے ہیں۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٦٣٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٨٨٤)

ان تمام فنون کو سیکھنا اور ان صنعتوں کو پروان چڑھانا، اس کے لیے نیک اعمال میں شمار ہوتا ہے جو ان کو اللہ کی رضا کی خاطر کرے۔ ان کو سکھانے والا بھی مجاہد کے اجر میں شریک ہوتا ہے جس طرح قرآن کی تعلیم دینے والا قرآن پڑھنے والے کے اجر میں شامل ہوتا ہے۔ سیکھنے والے کو چاہیے کہ وہ اپنی نیت نیک رکھے اور اللہ کی رضا کا حصول مدِنظر رکھے، سکھانے والے کو چاہیے کہ وہ بھی نیک نیتی اور اخلاص و محنت کے ساتھ سکھائے۔ سیکھنے والے کو استاد کی عزت اور قدر کرنی چاہیے اور اس کا شکر گزار ہونا چاہیے، کیوں کہ جو بندوں کا شکر نہیں کرتا وہ اللہ کا شکر بھی نہیں کرتا۔ معلّمین کو چاہیے کہ وہ نیکی اور اچھائی کے کاموں میں ایک دوسرے کا تعاون کریں، ٹانگیں نہ کھینچیں، جس طرح رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، وہ اس کو کسی کے سپرد کرتا ہے نہ اس پر ظلم ہی کرتا ہے۔''[1]

معلّمین کو چاہیے کہ سکھاتے وقت شاگرد کے ساتھ نرمی سے پیش آئیں اور اپنے قول و فعل سے انھیں ناحق اذیت نہ پہنچائیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ بِغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوْا فَقَدِ احْتَمَلُوْا بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا ﴾

[الأحزاب: ٥٨]

''اور جو لوگ مومن مردوں اور مومن عورتوں کو تکلیف دیتے ہیں، بغیر کسی گناہ کے جو انھوں نے کمایا ہو تو یقیناً انھوں نے بڑے بہتان اور صریح گناہ کا بوجھ اٹھایا۔''

اسی طرح کسی کو کسی ناکردہ گناہ کی سزا بھی نہیں دینی چاہیے، کیوں کہ یہ ظلم ہے اور ظلم حرام ہے، اللہ نے حدیثِ قدسی میں فرمایا: ''میرے بندو! میں نے ظلم اپنی جان پر بھی حرام کیا ہے اور تمھارے درمیان بھی حرام ہی رکھا ہے، اس لیے ایک دوسرے پر ظلم نہ کرو۔''[2]

اسی طرح اگر کسی شخص سے کوئی جرم سرزد ہو جائے تو اس کو اپنی مرضی کی اور غیر شرعی سزا نہ دی جائے، کیوں کہ یہ اہلِ اسلام کا وتیرہ نہیں۔

اسی طرح معلّمین کو گروہ بندی سے بھی بچنا چاہیے۔

جب ہر بندہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت اور ایک دوسرے کے ساتھ نیکی میں تعاون کے جذبے سے سرشار ہو اور سچائی عدل، احسان، امر بالمعروف نہی عن المنکر مظلوم کی مدد، خواہشِ نفس سے دوری، فرقے بندی اور

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٣١٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٦٤)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٧٧)

اختلاف سے نفرت، جیسے اوصافِ حمیدہ سے متصف ہو تو کوئی شکر رنجی باقی نہیں رہتی۔ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ یہ سارے کام جہاد فی سبیل اللہ میں معاونت فراہم کرتے ہیں اور جہاد فی سبیل اللہ کا مقصود اللہ کے دین کا غلبہ ہے، اس لیے ہر حال میں شریعت کی پاسداری لازمی ہے۔ واللہ أعلم[1]

لڑائی کے وقت ریشم یا سونے چاندی کی کوئی چیز پہننے کا حکم

سوال کیا سپاہی کے لیے لڑائی کے وقت یا دشمن سے ملاقات کے وقت ریشم اور سونے چاندی کی کوئی چیز پہننا جائز ہے؟

جواب الحمد للہ. لڑائی کے وقت ضرورت کے لیے ریشم کا لباس باتفاق اہلِ اسلام جائز ہے، بالخصوص جب کوئی دوسرا بچاؤ اور اسلحے کو روکنے میں اس کے قائم مقام نہ ہو، البتہ دشمن پر رعب طاری کرنے کے لیے اسے پہننے میں علما کے دو اقوال ہیں جن میں سے ظاہر تر اور راجح قول کے مطابق یہ جائز ہے۔ شام کے سپاہیوں نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے نام خط میں لکھا: ''ہم جب دشمن سے ملتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ وہ اپنے ہتھیاروں کو ریشم میں ڈھانپ کر رکھتے ہیں تو ہم اس سے اپنے دلوں میں رعب محسوس کرتے ہیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب میں لکھا: ''تم بھی اپنے ہتھیاروں کو اسی طرح ریشم میں ڈھانپ لیا کرو جس طرح وہ اپنے ہتھیار ڈھانپتے ہیں۔''

نیز ریشم کا لباس پہننے میں اتراہٹ کا اظہار ہوتا ہے جو اللہ کو لڑائی کے دوران میں پسند ہے، سنن میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«إِنَّ مِنَ الْخُيَلَاءِ مَا يُحِبُّهُ اللّٰهُ وَمِنَ الْخُيَلَاءِ مَا يُبْغِضُهُ اللّٰهُ، فَأَمَّا الْخُيَلَاءُ الَّتِي يُحِبُّهَا اللّٰهُ فَالْاِخْتِيَالُ عِنْدَ الْحَرْبِ وَعِنْدَ الصَّدَقَةِ وَأَمَّا الْخُيَلَاءُ الَّتِي يُبْغِضُهَا اللّٰهُ، فَالْخُيَلَاءُ فِي الْبَغْيِ وَالفَخْرِ »[2]

''ایک وہ اتراہٹ ہے جو اللہ کو پسند ہے اور ایک وہ جو اس کو ناپسند ہے۔ وہ اتراہٹ جو اللہ پسند کرتا ہے یہ وہ ہے جو آدمی جنگ کے وقت اور صدقہ کرتے وقت اختیار کرتا ہے، وہ اتراہٹ جو اللہ کو ناپسند ہے یہ وہ ہے جو بغاوت (زیادتی) اور فخر میں ہو۔''

اُحد کے موقع پر حضرت ابو دجانہ انصاری رضی اللہ عنہ صفوں کے درمیان اترا اترا کر چلتے تھے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یہ وہ چال ہے جسے اللہ اس موقع کے علاوہ ناپسند کرتے ہیں۔''[3]

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۲۸/۷-۲۶)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (۲۶۵۹) سنن النسائي، رقم الحديث (۲۵۵۸) صحيح الجامع (۲۲۲۱)

[3] المعجم الكبير (۷/۱۰۴) علامہ ہیثمی رحمہ اللہ نے مجمع الزوائد (۶/۱۵۷) میں کہا ہے کہ اس کی سند میں غیر معروف راوی ہیں۔

اگر معمولی سا ریشم استعمال کیا جائے، مثلاً جھنڈا جس کا عرض چار پانچ انگلیوں کے برابر ہوتا ہے تو یہ مطلقاً جائز ہے، سونے کے جھنڈے کے استعمال میں علما کا اختلاف ہے، تاہم اس کا جواز ہی راجح ہے۔ سنن میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سونے سے منع کیا ہے، مگر یہ کہ وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو۔[1] واللہ أعلم.[2]

اپنے مال کے دفاع کا حکم

سوال (1) اس حدیث کا کیا مطلب ہے: «مَنْ قُتِلَ دُوْنَ مَالِهِ فَهُوَ شَهِيْدٌ»[3] ''جو اپنے مال کے دفاع میں قتل ہو گیا وہ شہید ہے۔''

(2) کیا لڑنے سے پہلے اپنے مال کا ایک تہائی حصہ دے دینا ضروری ہے جس طرح لوگوں کے ہاں متداول ہے یا جائز ہے؟

(3) کیا انسان مال دینے سے انکار کر دے اور اپنی جان، اہل اور مال کا دفاع کرے؟

جواب رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«مَنْ قُتِلَ دُوْنَ مَالِهِ فَهُوَ شَهِيْدٌ، وَمَنْ قُتِلِ دُوْنَ دَمِهِ فَهُوَ شَهِيْدٌ، وَمَنْ قُتِلَ دُوْنَ حُرْمَتِهِ فَهُوَ شَهِيْدٌ، وَمَنْ قُتِلَ دُوْنَ دِيْنِهِ فَهُوَ شَهِيْدٌ»[4]

''جو اپنے مال کے دفاع میں قتل ہوا وہ شہید ہے، جو اپنے خون کے دفاع میں مارا گیا وہ شہید ہے، جو اپنی عزت کے دفاع میں قتل ہوا وہ شہید ہے اور جو اپنے دین کے دفاع میں مارا گیا وہ شہید ہے۔''

علمائے کرام کا اتفاق ہے کہ جب مسافروں کا رہزنوں سے سامنا ہو جائے اور وہ ان کا مال لوٹنا چاہتے ہوں تو وہ اپنے مال کے دفاع میں ان سے لڑیں، اگر وہ لڑائی کے بغیر نہ رکیں اور وہ ان کو اپنے مال سے تھوڑا یا زیادہ تہائی یا غیر تہائی کچھ نہ دیں، لیکن اگر وہ خود لڑنا نہ چاہیں اور مال دے کر جان چھڑانا چاہیں تو ان کو اختیار ہے، مگر یہ ان پر واجب اور ضروری نہیں، البتہ اگر وہ لڑنے کی طاقت نہ رکھتے ہوں تو جو ممکن ہو اس پر مصالحت کریں اور اس طرح نہ لڑیں کہ اپنی جانیں بھی گنوا بیٹھیں اور مال بھی لٹا بیٹھیں۔ جہاں تک وجوبِ قتال کی بات ہے تو ان پر اپنے مال کے

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٢٣٩) سنن النسائي، رقم الحديث (٥١٤٩) صحيح الترغيب والترهيب (١/١٨٩)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٣١٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤١)

[3] مجموع الفتاوىٰ (٢٨/٢٧_٢٨)

[4] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٧٧٢) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٤٢١) سنن النسائي، رقم الحديث (٤٠٩٥) صحيح الجامع، رقم الحديث (٦٤٤٥)

دفاع میں لڑنا فرض نہیں، بلکہ اختیاری ہے، چاہیں تو لڑیں، چاہیں تو مال دے دیں، کیوں کہ ان کے لیے ان کو مال دینا بھی جائز ہے اور روکے رکھنا بھی۔ انسان کو وہ کام کرنا چاہیے جو اس کے لیے زیادہ فائدہ مند ہو۔

جہاں تک عزت کے دفاع کی بات ہے، مثلاً ظالم انسان کی بیوی یا ماں بہن یا بیٹی بیٹے یا خود اس کے ساتھ بدکاری کرنا چاہتا ہو تو اس پر دفاع واجب ہے، کیوں کہ بدکاری کی تمکین یعنی اجازت وسہولت کاری ناجائز ہے، جس طرح مال صرف کرنا ناجائز ہے، لہٰذا اس انسان پر حسبِ امکان لڑنا واجب ہے اگر لڑائی کے بغیر اس کو روکنا ممکن نہ ہو اور وہ لڑنے پر قادر ہو تو لڑے۔

خون کا دفاع کرنا بھی جائز ہے، لیکن اس کے وجوب میں امام احمد کے مذہب میں دو روایات ہیں: ایک روایت کے مطابق نہیں، کیوں کہ جب آدم علیہ السلام کے مظلوم بیٹے کے بھائی نے اس کو قتل کرنا چاہا تو اس نے اپنا دفاع نہیں کیا تھا، بلکہ کہا تھا:

﴿لَىِٕنْۢ بَسَطْتَّ اِلَیَّ یَدَكَ لِتَقْتُلَنِیْ مَاۤ اَنَا بِبَاسِطٍ یَّدِیَ اِلَیْكَ لِاَقْتُلَكَ ۚ اِنِّیْۤ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۲۸﴾ اِنِّیْۤ اُرِیْدُ اَنْ تَبُوْٓاَ بِاِثْمِیْ وَ اِثْمِكَ فَتَكُوْنَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ ۚ وَ ذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الظّٰلِمِیْنَ﴾ [المائدۃ: ۲۸، ۲۹]

''اگر تو نے اپنا ہاتھ میری طرف اس لیے بڑھایا کہ مجھے قتل کرے تو میں ہرگز اپنا ہاتھ تیری طرف اس لیے بڑھانے والا نہیں کہ تجھے قتل کروں، بے شک میں اللہ سے ڈرتا ہوں، جو سارے جہانوں کا رب ہے۔ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ تو میرا گناہ اور اپنا گناہ لے کر لوٹے، پھر تو آگ والوں میں سے ہو جائے اور یہی ظالموں کی جزا ہے۔''

اسی طرح جب خوارج امیر المومنین حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے کے لیے آئے تو انھوں نے اپنا دفاع نہ کیا اور جو ان کے غلام، اقارب نیز حضرت حسن بن علی اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم وغیرہم ان کا دفاع کرنے کے لیے آئے تھے، انھوں نے ان کو بھی لڑنے سے منع کر دیا تھا اور یہ بات ان کے فضائل میں شمار کی جاتی ہے۔

دوسرے قول کے مطابق اپنا دفاع کرنا ضروری اور واجب ہے، کیوں کہ اپنی جان کو ناحق قتل کرنا حرام ہے، لہٰذا حرام کام کو کرنے میں اس ظالم کو سہولت کاری اور تمکین دینا جائز نہیں۔

یہ اس صورت میں ہے جب فتنہ نہ ہو، جب مسلمانوں کے درمیان فتنہ ہو، یعنی دو آدمی یا دو گروہ بادشاہی، سرداری یا قبائلی، موالی، گروہی، قومی، نسلی اور فقہی تعصب اور تعلق ذاتی مفادات کی خاطر ایک دوسرے سے لڑیں، یہ قتال فتنہ ہے جس سے دونوں کو منع کیا جائے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

«إِذَا الْتَقَى الْمُسْلِمَانِ بِسَيْفَيْهِمَا فَالْقَاتِلُ وَالْمَقْتُولُ فِي النَّارِ. قَالُوا يَا رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ هَذَا الْقَاتِلُ، فَمَا بَالُ الْمَقْتُولِ؟ قَالَ: إِنَّهُ أَرَادَ قَتْلَ صَاحِبِهِ »[1]

''جب دو مسلمان اپنی تلواروں کے ساتھ باہم پیکار ہوتے ہیں تو قاتل اور مقتول آگ میں جائیں گے۔ صحابہ نے پوچھا: اے اللہ کے رسول! یہ تو قاتل ہے، مقتول کا کیا قصور؟ فرمایا: وہ بھی اپنے مقابل کو قتل کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔''

صحیح مسلم میں ہے:

«مَنْ قُتِلَ تَحْتَ رَأْيَةٍ عُمِّيَةٍ يَغْضِبُ لَعَصَبَةٍ وَيَدْعُوا لَعَصَبَةً فَلَيْسَ مِنَّا، أَوْ قَالَ: هُوَ فِي النَّارِ »[2]

''جو گمراہی یا فتنے کے جھنڈے تلے مارا گیا، عصبیت کے لیے غضب ناک ہوتا ہے اور عصبیت کی دعوت دیتا ہے، وہ ہم سے نہیں، یا یہ فرمایا کہ وہ آگ میں ہے۔''

آپ ﷺ نے فرمایا: ''عنقریب فتنہ ہوگا جس میں بیٹھا کھڑے سے بہتر ہوگا اور کھڑا اس کی طرف چلنے والے سے اور چلنے والا اس کی کوشش کرنے والے سے اور اس کی کوشش کرنے والا اس سے لوٹنے والے سے۔''[3]

فتنے کے وقت لڑائی سے ممانعت سے متعلق بہت سی صحیح احادیث مروی ہیں، بلکہ جو فتنے کی آگ بھڑکانے کی دعوت دیتا ہے اس کی حوصلہ شکنی میں آپ ﷺ نے فرمایا:

«مَنْ سَمِعْتُمُوْهُ يَتَعَزَّى بِعِزَاءِ الْجَاهِلِيَّةِ، فَأَعِضُّوْهُ هَنَ أَبِيهِ وَلَا تَكْنُوْا »[4]

''جس کو جاہلیت کی سی تعزیت کرتے سنو اس کو کھلے الفاظ میں باپ کی عار دلا دو۔''

صحیحین میں مروی ہے کہ ایک سفر میں مسلمان آپ ﷺ کے ہم رکاب تھے کہ ایک انصاری سے ایک مہاجر کا جھگڑا ہوگیا، مہاجر نے آواز لگائی: کہاں ہو مہاجرو! انصاری نے آواز لگائی: کہاں ہو انصاریو! رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کیا جاہلیت کی آوازیں لگائی جا رہی ہیں، حالانکہ میں تمھارے درمیان موجود ہوں؟! اسے چھوڑ دو، یہ بدبودار ہے۔''[5]

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣١، ٦٤٨١، ٦٦٧٢) صحيح مسلم، رقم الحديث ٢٨٨٠)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٨٤٨)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٤٠٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٨٦)

[4] مسند أحمد (١٣٦/٥) الأدب المفرد (٩٦٣) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٦٩)

[5] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٦٢٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٨٤)

﴿ وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ﴾ [البقرۃ: ۱۹۳]

''اور ان سے لڑو، یہاں تک کہ کوئی فتنہ نہ رہے اور دین اللہ کے لیے ہو جائے۔''

نیز فرمایا:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ۠ وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝ وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَھُمُ الْبَيِّنٰتُ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ لَھُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝ يَّوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ ﴾ [آل عمران: ۱۰۲۔۱۰۶]

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ سے ڈرو، جیسا اس سے ڈرنے کا حق ہے اور تم ہرگز نہ مرو، مگر اس حال میں کہ تم مسلمان ہو۔ اور سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لو اور جدا جدا نہ ہو جاؤ اور اپنے اوپر اللہ کی نعمت یاد کرو، جب تم دشمن تھے تو اس نے تمھارے دلوں کے درمیان الفت ڈال دی تو تم اس کی نعمت سے بھائی بھائی بن گئے اور تم آگ کے ایک گڑھے کے کنارے پر تھے تو اس نے تمھیں اس سے بچا لیا۔ اس طرح اللہ تمھارے لیے اپنی آیات کھول کر بیان کرتا ہے، تاکہ تم ہدایت پاؤ۔ اور لازم ہے کہ تم میں ایک ایسی جماعت ہو جو نیکی کی طرف دعوت دیں اور اچھے کام کا حکم دیں اور برائی سے منع کریں اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔ اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو الگ الگ ہو گئے اور ایک دوسرے کے خلاف ہو گئے، اس کے بعد کہ ان کے پاس واضح احکام آچکے اور یہی لوگ ہیں جن کے لیے بہت بڑا عذاب ہے۔ جس دن کچھ چہرے سفید ہوں اور کچھ چہرے سیاہ ہوں گے۔''

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے: اہلِ سنت والجماعت کے چہرے سفید ہوں گے اور اہلِ بدعت و ضلالت کے چہرے کالے ہوں گے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَاۗىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا ۭ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ﴾ [الحجرات: ۱۳]

''اے لوگو! بے شک ہم نے تمھیں ایک نر اور ایک مادہ سے پیدا کیا اور ہم نے تمھیں قومیں اور قبیلے بنا دیا، تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو، بے شک تم میں سب سے زیادہ عزت والا اللہ کے نزدیک وہ ہے جو تم

میں سب سے زیادہ تقویٰ والا ہے۔‘‘

رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ’’کسی عربی کو عجمی پر، کسی عجمی کو کسی عربی پر، کسی گورے کو کالے پر اور کسی کالے کو کسی گورے پر کوئی فضیلت نہیں۔ ماسوائے تقویٰ کے، لوگ آدم علیہ السلام سے ہیں اور آدم علیہ السلام مٹی سے۔‘‘[1]

فرمانِ مصطفیٰ ﷺ ہے: ’’مومنوں کی آپس میں مودت، رحمدلی اور شفقت کی مثال جسم واحد کی مثال ہے، جب ایک عضو بیمار پڑ جاتا ہے تو وہ سارے جسم کو بخار اور شب بیداری میں بلا لیتا ہے۔‘‘[2]

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے مومنوں کی آپس کی لڑائی کے باوجود انھیں بھائی ہی بنایا ہے اور ان کے درمیان عدل سے کام لینے کا حکم دیا ہے، ارشاد ہے:

﴿ وَإِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا فَإِنْ بَغَتْ إِحْدَاهُمَا عَلَى الْأُخْرَى فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِي حَتَّى تَفِيءَ إِلَى أَمْرِ اللَّهِ فَإِنْ فَاءَتْ فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَأَقْسِطُوا إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ ۝ إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ فَأَصْلِحُوا بَيْنَ أَخَوَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللَّهَ ﴾

[الحجرات: ۹۔۱۰]

’’اور اگر ایمان والوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو دونوں کے درمیان صلح کرا دو، پھر اگر ان دونوں میں سے ایک دوسرے پر زیادتی کرے تو اس (گروہ) سے لڑو جو زیادتی کرتا ہے، یہاں تک کہ اللہ کے حکم کی طرف پلٹ آئے، پھر اگر وہ پلٹ آئے تو دونوں کے درمیان انصاف کے ساتھ صلح کرا دو اور انصاف کرو، بے شک اللہ انصاف کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔ مومن تو بھائی ہی ہیں، پس اپنے دو بھائیوں کے درمیان صلح کراؤ اور اللہ سے ڈرو۔‘‘

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں باہمی لڑائی اور بغاوت کے باوجود بھائی بنایا ہے اور ان کے درمیان عدل کا حکم دیا ہے۔ لہٰذا ہر ایک اہلِ تقویٰ اور اہلِ حق کی تعظیم کرنی چاہیے اور ان کے ساتھ کھڑا ہونا چاہیے، خواہ وہ اس کے گروہ سے تعلق رکھتے ہوں یا نہ، مقصد دین کو اللہ کے لیے خالص کرنا ہے بندوں کے لیے نہیں۔ اگر ایک گروہ کو دوسرے پر برتری دی جائے تو انسان کو ان سے علاحدہ ہو کر ان کے درمیان عدل اور صلح قائم کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اگر اس صورت میں کسی آدمی کو لڑائی کرنے کا کہا جائے اور وہ کسی سے لڑنا نہ چاہتا ہو تو کیا وہ اپنا دفاع کرنے کا اختیار رکھتا ہے؟ اس میں مذہبِ احمد میں دو روایات ہیں: ایک یہ ہے کہ وہ اپنا دفاع نہ کرے چاہے قتل ہی کر دیا جائے، تاکہ فتنے میں لڑنے والا شمار نہ ہو، کیوں کہ جب ایک سائل نے اس کی بابت رسول اللہ ﷺ سے پوچھا تو آپ ﷺ

[1] مسند أحمد (٥/٤١١) حلية الأولياء (٣/١٠٠) السلسلة الصحيحة (٢٧٠٠)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٦٦٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٨٦)

نے یہی کہا تھا: اسے چھوڑ دے حتی کہ وہ اپنے گناہ اور تیرے گناہ کا حامل ہو جائے۔"[1] دوسرے قول کے مطابق حدیث کی عمومیت کے پیشِ نظر دفاع کرنا جائز ہے۔ وہ احادیث خاص ہیں جن میں قتالِ فتنہ سے منع کیا گیا ہے، چاہے آدمی قتل ہی ہو جائے۔ اسی وجہ سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے لڑائی نہیں کی تھی، کیوں کہ ان کی رائے میں یہ فتنے کا باعث ہوسکتا تھا۔ واللہ أعلم[2]

ماردین کے دار الحرب یا دار الامن ہونے اور دشمن کی مدد کرنے والے کا حکم

سوال کیا ماردین حربی شہر ہے یا امن کا شہر، نیز وہاں مقیم مسلمانوں کے لیے بلادِ اسلام کی طرف ہجرت کرنا ضروری ہے یا نہیں۔ اگر ہجرت ضروری ہے اور کوئی ہجرت نہیں کرتا اور دشمنانِ اسلام کی مالی یا جانی مدد کرتا ہے تو کیا وہ گناہ گار ہوگا؟ نیز اگر کوئی ایسے شخص کو نفاق کا الزام دے یا گالی دے تو گناہ گار ہوگا یا نہیں؟

جواب الحمد للہ. مسلمانوں کے خون اور اموال حرمت کا درجہ رکھتے ہیں وہ ماردین میں ہوں یا کسی بھی جگہ، شریعتِ اسلام سے خارج ہو جانے والوں کی اعانت حرام ہے، وہ اہلِ ماردین ہوں یا کسی بھی علاقے کے باشندے۔ وہاں رہنے والا اگر اپنے دین پر عمل کرنے سے قاصر ہو تو اس کے لیے ہجرت واجب ہے، اگر قاصر نہ ہو تو پھر مستحب ہے واجب نہیں۔

ان کا مسلمانوں کے دشمنوں کی جانی و مالی مدد کرنا حرام ہے اور جس طرح بھی ممکن ہو اس سے بچنا چاہیے، چاہے انسان کہیں چھپ جائے، یا تعریض سے کام لے یا تصنع سے۔ اگر ایسا بھی ناممکن ہو تو پھر ہجرت لازم ہو جاتی ہے، لیکن ان کو عمومیت کے ساتھ نفاق کا الزام دینا اور گالی دینا جائز نہیں، بلکہ گالی اور منافقت کا الزام و اطلاق ان صفات ہی پر واقع ہوتا ہے جو کتاب و سنت میں مذکور ہیں، جو کچھ اہلِ ماردین پر بھی صادق آتی ہیں اور ان کے علاوہ دوسرے لوگوں پر بھی۔

یہ سوال کہ کیا یہ دارِ حرب ہے یا دارِ امن تو اصل میں یہ دونوں سے مرکب ہے۔ یہ اس دارِ امن کے قائم مقام نہیں جہاں اسلام کے احکام کا اطلاق ہوتا ہے، کیوں کہ اس کی فوج مسلمان ہے اور یہ دارِ حرب کے قائم مقام بھی نہیں، جہاں کے باشندے کافر ہوتے ہیں، بلکہ یہ تیسری قسم ہے جہاں مسلمان کے ساتھ وہی سلوک کیا جائے گا وہ جس کا مستحق ہے اور شریعتِ اسلام سے خروج کرنے والے سے وہی سلوک کیا جائے گا جس کا وہ مستحق ہے۔[3]

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٨٢٧)

[2] جامع المسائل (٤/٢٢٩_٢٣٤)

[3] مجموع الفتاویٰ (٢٨/٢٤٠_٢٤١)

امامیہ فرقے کی تکفیر اور ان سے لڑنے کا حکم

سوال کچھ لوگوں کا دعویٰ ہے کہ وہ اللہ، فرشتوں، آسمانی کتابوں، رسولوں اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں اور ان کا عقیدہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد امامِ حق علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ ہیں، نبی اکرم ﷺ نے ان کی امامت کی وصیت اور نامزدگی کی تھی، صحابہ نے ان پر ظلم کرتے ہوئے ان کو ان کا حق نہ دیا، اس وجہ سے وہ کافر ہو گئے، کیا ایسے لوگوں (یعنی امامیہ شیعہ) کو اس عقیدے کی وجہ سے کافر کہنا جائز ہے اور ان سے لڑنا فرض ہے؟

جواب الحمد لله رب العالمين.

علما کا اتفاق ہے کہ ہر وہ گروہ جو اسلام کے ظاہر اور متواتر احکام میں سے کسی ایک حکم کو بھی ماننے یا ادا کرنے سے انکار کر دے تو اس سے لڑنا فرض ہو جاتا ہے، تا آنکہ سارا دین اللہ کے لیے ہو جائے۔

اگر وہ کہیں: ہم نماز پڑھیں گے، لیکن زکات نہیں دیں گے، یا پانچ نمازیں پڑھیں گے، لیکن جمعہ نہیں پڑھیں گے، یا باجماعت نہیں پڑھیں گے، یا اسلام کے ارکانِ پنج گانہ کو تو قائم کریں گے، لیکن مسلمانوں کے خون اور مال کو حرام نہیں سمجھیں گے، یا سود، شراب نوشی اور جوا نہیں چھوڑیں گے، یا قرآن کی پیروی کریں گے، لیکن رسول اللہ ﷺ کی اتباع نہیں کریں گے اور آپ ﷺ سے ثابت شدہ احادیث پر عمل نہیں کریں گے، یا ہم یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ یہود و نصاریٰ جمہور مسلمانوں سے بہتر ہیں، اہلِ قبلہ کافر ہو گئے ہیں اور صرف چند اشخاص کے سوا ان میں کوئی بھی مومن باقی نہیں رہا، یا کہیں ہم مسلمانوں کے ساتھ مل کر کافروں کے خلاف جہاد نہیں کریں گے، یا اس طرح کے کسی بھی ایسے معاملے کا عقیدہ رکھیں جو رسول اللہ ﷺ کی شریعت اور اجماعِ امت کے خلاف ہو تو ایسے تمام گروہوں سے لڑنا فرض ہو جاتا ہے، جس طرح مسلمانوں نے زکات نہ دینے والوں کے خلاف جہاد کیا تھا اور خوارج اور ان کی اقسام اسی طرح خرمیہ، قرامطہ اور باطنیہ جیسے خارجِ اسلام اور مختلف بدعت پرستوں اور خواہش کے بندوں کے خلاف جہاد کیا تھا۔

کیوں کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے قرآن کریم میں ارشاد فرمایا ہے:

﴿ وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ﴾ [البقرة: ١٩٣]

''اور ان سے لڑو، یہاں تک کہ کوئی فتنہ نہ رہے اور دین اللہ کے لیے ہو جائے۔''

اگر کچھ دین اللہ کے لیے ہو اور کچھ غیر اللہ کے لیے ہو تو ایسے لوگوں سے اس وقت تک لڑنا فرض ہو جاتا ہے، جب تک سارا دین اللہ کے لیے نہ ہو جائے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ ﴾ [التوبة: ٥]

''پھر اگر وہ توبہ کر لیں اور نماز قائم کریں اور زکات ادا کریں تو ان کا راستہ چھوڑ دو۔''

یہاں اس وقت تک ان کی راہ چھوڑنے کا حکم نہیں دیا، جب تک وہ نماز قائم کرنے اور زکات ادا کرنے کے بعد کفر کی تمام انواع سے توبہ نہ کر لیں۔ فرمایا:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ ذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰٓوا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ﴾ [البقرۃ: ۲۷۸، ۲۷۹]

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ سے ڈرو اور سود میں سے جو باقی ہے چھوڑ دو، اگر تم مومن ہو۔ پھر اگر تم نے یہ نہ کیا تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے بڑی جنگ کا اعلان سن لو۔''

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اگر سود خور سود سے باز نہ آئے تو وہ اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کرتا ہے، سود وہ چیز ہے جسے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں سب سے آخر میں حرام کیا تو جو اس سے پہلے حرام کیا، اس کی حرمت اس سے بھی زیادہ تاکیدی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ يَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا اَوْ يُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ وَ اَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ﴾ [المائدۃ: ۳۳]

''ان لوگوں کی جزا جو اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کرتے ہیں اور زمین میں فساد کی کوشش کرتے ہیں، یہی ہے کہ انھیں بری طرح قتل کر دیا جائے، یا انھیں بری طرح سولی دی جائے، یا ان کے ہاتھ اور پاؤں مختلف سمتوں سے بری طرح کاٹے جائیں، یا انھیں اس سرزمین سے نکال دیا جائے۔''

چنانچہ ہر وہ مسلح گروہ جس نے اللہ اور اس کے رسول کی ماتحتی اور زیرِ اطاعت آنے سے انکار کر دیا، اس نے اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کی اور جس نے زمین میں کتاب اللہ اور سنتِ رسول کے خلاف عمل کیا، اس نے زمین میں فساد پھیلانے کی کوشش کی۔

اس بنا پر سلف صالحین نے اس آیت کی تفسیر میں کفار اور اہلِ قبلہ دونوں کو شامل کیا ہے، بلکہ عام ائمہ نے ایسے رہزنوں کو بھی اس کا مصداق ٹھہرایا ہے جو صرف مال لوٹنے کے لیے اسلحہ لہراتے ہیں، اس بنا پر انھیں زمین میں فساد کرنے والے اور اللہ اور اس کے رسول کے خلاف لڑنے والے قرار دیا گیا ہے، اگرچہ وہ اپنے کام کو حرام ہی سمجھتے ہوں اور اللہ اور اس کے رسول پر ایمان بھی رکھتے ہوں۔

مگر جو مسلمان کا خون بہانا یا مال لوٹنا اور ان سے لڑنا جائز سمجھتا ہو وہ ان ڈاکوؤں سے بڑھ کر زمین میں فساد مچانے کی کوشش کرنے والوں اور خدا اور رسول سے جنگ کرنے والوں میں شمار ہوگا۔

جس طرح حربی کافر جو مسلمانوں کا خون بہانا، ان کا مال لوٹنا اور ان سے لڑنا جائز سمجھتا ہے، وہ اس فاسق سے بڑھ کر لڑائی کیے جانے کے قابل ہے جو ان چیزوں کی حرمت کا قائل ہو۔ اسی طرح وہ بدعتی جو شریعت کے بعض احکام کا انکار کر دے اور سنت پر قائم مسلمانوں کے خون اور مال کو حلال سمجھتا ہو وہ فاسق سے بڑھ کر لڑائی کیے جانے کے قابل ہے، خواہ وہ اپنے اس کام کو دین ہی سمجھ کر کرتا ہو، جس طرح یہود و نصاریٰ مسلمانوں کے خلاف لڑنا دینی فریضہ سمجھتے اور اس کو کارِ ثواب سمجھتے ہیں۔

لہٰذا ائمہ اسلام کا اتفاق ہے کہ یہ سخت اور گھمبیر قسم کی بدعات ایسے گناہوں سے زیادہ بری ہیں جن کو کرنے والے گناہ ہی سمجھتے ہوں، یہی سنتِ رسول ہے۔ آپ ﷺ نے سنت سے خروج کرنے والے خارجیوں سے لڑنے کا حکم دیا، لیکن ظالم ائمہ یعنی سربراہوں کا ظلم برداشت کرنے اور ان کے گناہوں کے باوجود ان کے پیچھے نماز پڑھنے کا حکم دیا، بلکہ بعض گناہ پر اصرار کرنے والے اپنے ساتھیوں کی اللہ اور اس کے رسول کے لیے محبت کی گواہی دی اور ان پر لعنت بھیجنے سے منع کیا۔ اس کے عکس ذوالخویصرہ اور اس کے ساتھیوں کے بارے میں بتایا کہ وہ اسلام سے اس طرح نکل جائیں گے، جس طرح تیر کمان سے چھوٹ جاتا ہے، حالانکہ وہ بظاہر بڑے عابد اور پرہیزگار تھے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں فرمایا ہے:

﴿ فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ﴾ [النساء: ٦٥]

''پس نہیں! تیرے رب کی قسم ہے! وہ مومن نہیں ہوں گے، یہاں تک کہ تجھے اس میں فیصلہ کرنے والا مان لیں جو ان کے درمیان جھگڑا پڑ جائے، پھر اپنے دلوں میں اس سے کوئی تنگی محسوس نہ کریں جو تو فیصلہ کرے اور تسلیم کر لیں، پوری طرح تسلیم کرنا۔''

لہٰذا ہر وہ شخص جو اللہ کے رسول ﷺ کی سنت اور شریعت سے نکل آتا ہے اس کی مخالفت کرتا ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنی مقدس ذات کی قسم کھا کر کہا ہے کہ وہ اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک اپنے تمام دینی و دنیاوی اختلافات میں رسول اللہ ﷺ کے فیصلے پر راضی نہ رہے اور اس کے دل میں اس سے متعلق کوئی حرج اور اعتراض باقی نہ رہے، اس اصل اور قاعدے کے قرآنی دلائل بہت زیادہ ہیں۔ یہی رسول اللہ ﷺ کی سنت اور آپ ﷺ کے خلفائے راشدین کا طریقہ بھی تھا۔ صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

''جب رسول اللہ ﷺ فوت ہو گئے اور عربوں میں سے جس نے مرتد ہونا تھا، ہو گیا تو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے کہا: آپ ان لوگوں سے کس طرح لڑ سکتے ہیں؟ رسول اللہ ﷺ

نے تو یہ فرمایا ہے: ''مجھے لوگوں سے اس وقت تک لڑنے کا حکم دیا گیا ہے جب تک وہ ایک اللہ کی شہادت اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی گواہی نہ دیں، وہ ایسا کریں تو مجھ سے اپنا خون اور مال بچا لیں گے، مگر اس کے حق کے علاوہ اور ان کا حساب اللہ پر ہے؟ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں کہا تھا کہ ''مگر اس کے حق کے علاوہ''؟ تو زکات مال کا حق ہے، اللہ کی قسم! اگر انھوں نے وہ ایک چھوٹی بکری بھی نہ دی جو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیتے تھے تو میں اسے نہ دینے پر بھی ان سے لڑوں گا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: اللہ کی قسم! مجھے بعد میں سمجھ آئی کہ اللہ تعالیٰ نے لڑائی کے لیے ابوبکر کا سینہ کھول دیا تو میں نے جان لیا کہ یہی حق ہے۔''[1]

اس طرح صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ایسے لوگوں سے لڑنے پر اتفاق کیا جو نماز پڑھتے اور روزہ رکھتے تھے، مگر انھوں نے زکات کے فرض کو ادا کرنے سے انکار کر دیا۔

صدیقِ امت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا یہ استدلال صراحت کے ساتھ بھی مروی ہے۔ صحیحین میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''مجھے لوگوں سے لڑنے کا حکم دیا گیا ہے، یہاں تک کہ وہ "لا إله إلا الله محمد رسول الله" کہہ لیں، نماز قائم کریں اور زکات ادا کریں۔ اگر وہ یہ کر لیں تو مجھ سے اپنے خون اور اموال بچا لیں گے، مگر ان کے حق کے علاوہ۔''[2]

اس حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسے لوگوں سے اس وقت تک لڑنے کا حکم دیا گیا ہے جب تک وہ ان واجبات اور فرائض کو ادا نہ کریں۔

یہ بات کتاب اللہ کے بھی مطابق ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کئی طرق سے تواتر کے ساتھ ثابت ہے۔ اصحابِ صحیح نے ان میں سے دس طرق کے ساتھ روایت کیا ہے، جن کو امام مسلم نے اپنی کتاب صحیح مسلم میں نقل کیا ہے اور بخاری نے بھی ان طرق کے علاوہ اپنے طرق سے روایت کیا ہے۔ امام احمد کا قول ہے، خوارج کے بارے میں حدیث دس وجوہ سے صحیح ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

''تم میں سے کوئی ایک اپنی نماز کو ان کی نمازوں کے سامنے، اپنے روزے کو ان کے روزے کے سامنے اور اپنی تلاوتِ قرآن کو ان کی تلاوت کے سامنے حقیر (بہت تھوڑا) سمجھے گا، وہ قرآن پڑھیں گے، مگر وہ

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٣٣٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٠)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٢)

ان کے گلوں سے نیچے نہیں اترے گا، وہ اسلام سے اس طرح نکل جائیں گے جس طرح تیر شکار کو چیر کر نکل جاتا ہے، وہ لوگ جو ان سے لڑیں گے، اگر جان لیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے ان کے لیے کیا (وعدے) ہیں تو وہ کوئی عمل ہی نہ کریں۔''[1]

ایک روایت میں ہے: ''اگر میں نے ان کو پا لیا تو انھیں قتلِ عاد کی طرح قتل کروں گا۔''[2]

ایک دوسری روایت میں ہے: ''وہ آسمان تلے سب سے برے مقتول ہیں۔ جو ان کو قتل کریں گے، وہ سب سے بہتر مقتول ہوں گے۔''[3]

سب سے پہلے حرورا کے مقام پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے صحابہ کے ساتھ مل کر ان سے لڑائی لڑی۔

ان لوگوں نے اہلِ سنت والجماعت سے خروج کیا، مسلمانوں کا خون اور مال حلال قرار دیا، عبداللہ بن خباب کو قتل کیا اور مسلمانوں کے مویشی لوٹ لیے۔ اس وقت امیر المومنین حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے خطبہ ارشاد فرمایا، اس میں اس حدیث کا ذکر کیا اور انھیں بتایا کہ ان لوگوں نے مسلمانوں کو قتل کر کے ان کا مال لوٹا اور ان سے لڑنا جائز قرار دیا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ان سے لڑنے پر بہت زیادہ خوشی محسوس ہوئی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کا سب سے بڑا کارنامہ خوارج کے خلاف لڑنا اور ان کا قلع قمع کرنا تھا۔ یہ لوگ جمہور مسلمانوں، بلکہ حضرت عثمان وعلی رضی اللہ عنہما کو بھی کافر کہتے تھے اور اپنے زعم میں قرآن پر عمل کرتے تھے، لیکن سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر عمل نہیں کرتے تھے، کیوں کہ اسے قرآن کے خلاف سمجھتے تھے جس طرح آج بھی سارے بدعتی کثرتِ عبادت و ورع کے باوجود سنت کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھتے۔

صحیح بخاری و دیگر کتبِ حدیث میں اسّی کے قریب طرق و وجوہ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ قول ثابت ہے: ''نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اس امت کا سب سے بہتر فرد ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، پھر عمر فاروق رضی اللہ عنہ ہے۔'' ان سے یہ بھی ثابت ہے کہ انھوں نے ان غالی روافض کو جلا دیا تھا جو ان کے بارے میں خدائی کا عقیدہ رکھتے تھے۔

ان سے جید اسناد سے مروی ہے: ''میرے پاس کوئی ایسا آدمی نہ لایا جائے جو مجھے ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما پر فضیلت دیتا ہو، مگر میں اس پر افترا پرداز کی حد لگاؤں گا۔''

انھی سے مروی ہے کہ جب انھیں بتایا گیا کہ عبداللہ بن سبا ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کو گالیاں دیتا ہے تو انھوں نے اس کو قتل کرنے کے لیے طلب کیا، مگر وہ بھاگ گیا۔

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٦٦)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣١٦٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٦٤)

[3] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٠٠٠) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٧٦) شیخ البانی رحمہ اللہ نے اسے صحیح کہا ہے۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے بھی ایک آدمی کو کوڑے مارنے کا حکم دیا جس نے ان کو ابوبکر رضی اللہ عنہ پر فضیلت دی۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے جب صبیغ بن عسل کو خوارج میں سے سمجھا تو کہا: "اگر میں نے تجھ کو گنجا دیکھا تو تیری کھوپڑی پر ماروں گا۔"

یہ امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ کی سنت ہے۔ انھوں نے تینوں اقسام کے شیعہ کو سزا دینے کا حکم دیا۔ ان میں سب سے ہلکے درجے کے وہ ہیں جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو شیخین پر فضیلت دیتے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو بھی کوڑے مارنے کا حکم دیا۔ جو غالی شیعہ ہیں، وہ بالاتفاق واجب القتل ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خدا اور نبی قرار دیتے ہیں، مثلاً: نصیریہ اور اسماعیلیہ جن کو بیت الصاد اور بیت السین بھی کہا جاتا ہے۔ اسی طرح معطلہ بھی انھی میں داخل ہیں جو وجودِ باری تعالیٰ کا انکار کرتے ہیں یا قیامت کے منکر ہیں یا نمازِ پنج گانہ، رمضان کے روزے اور حجِ بیت اللہ جیسے شریعت کے ظاہر احکام کا انکار کرتے ہیں اور ان کی باطنی تاویل کرتے ہوئے کہتے ہیں: نماز سے مراد ان کے مذہب کے اسرار کی معرفت، روزے سے مراد ان کے اسرار کو چھپانا اور حج سے مراد ان کے شیوخ اور پیروں کی زیارت ہے۔ یہ لوگ اپنے لیے شراب نوشی حلال اور محرم رشتے داروں سے نکاح کرنا جائز سمجھتے ہیں۔ یہ سارے کافر یہود و نصاریٰ سے بھی بڑے کافر ہیں، اگر ان میں سے کسی سے یہ عقیدہ ظاہر نہ ہو تو وہ منافق ہے، جن کا ٹھکانا جہنم کا سب سے نچلا گڑھا ہے۔ جو ان عقائد کو ظاہر کرے، وہ سب کافروں سے بڑا اور شدید کافر ہے۔ ایسے شخص کو مسلمانوں کے درمیان رکھنا جائز نہیں، نہ جزیہ لے کر اور نہ ذمی ہی قرار دے کر۔ ان کی عورتوں سے شادی کرنا بھی جائز نہیں اور ان کا ذبیحہ کھانا بھی حلال نہیں، کیوں کہ یہ سارے مرتدوں سے بڑے مرتد ہیں۔ اگر یہ لوگ وہ گروہ ہو جو اسلام کے کسی حکم پر عمل کرنے سے انکار کر دے تو ان سے لڑنا اسی طرح فرض ہے جس طرح مرتدوں سے جہاد اور لڑائی کرنا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے مسیلمہ کذاب سے لڑائی کی تھی۔ اگر ایسے لوگ مسلمانوں کی بستیوں میں رہتے ہوں تو ان کو وہاں اکٹھے نہیں رہنے دینا چاہیے، اگر توبہ کر لیں اور اسلام کے ان احکام کا التزام کر لیں جو مسلمانوں پر فرض ہیں تو اس کے بعد انھیں مسلمانوں کے درمیان بسایا جا سکتا ہے۔

یہ صرف غالی رافضہ کا حکم نہیں، بلکہ ہر اس شخص کا حکم ہے جو کسی پیر فقیر کے بارے میں یہ غلو آمیز عقیدہ رکھتا ہے کہ وہ مجھے رزق دیتا ہے، اس سے نماز ساقط ہو گئی ہے۔ وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے افضل ہے۔ اس کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کی کوئی ضرورت نہیں، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت سے ہٹ کر اس کے پاس اللہ تک پہنچنے کا اپنا طریقہ ہے۔ یا یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ فلاں پیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہوتا ہے، جس طرح خضر موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ تھے۔

یہ سب کافر ہیں، جن سے لڑنا بالا جماع فرض ہے، بلکہ ان میں سے کسی ایک کو قتل کرنا بھی مقدور ہو تو اس کو قتل کر دینا چاہیے۔

خوارج اور روافض میں سے کسی کو قتل کرنا اور مقدور ہو تو ان دونوں کے بارے میں حضرت عمر اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کا فتویٰ یہی ہے کہ ان کو قتل کر دیا جائے، گو اس میں فقہا کا اختلاف ہے کہ اگر ان فرقوں سے تعلق رکھنے والے کسی ایک کو قتل کرنا مقدور ہو تو اس کو قتل کرنا چاہیے یا نہیں، لیکن اگر یہ گروہ کی شکل اختیار کر لیں اور اسلام کے ان احکام پر عمل کرنے سے انکار کر دیں تو تب ان سے لڑنے میں کسی کا اختلاف نہیں، کیوں کہ لڑائی، یعنی قتال قتل سے زیادہ وسیع لفظ اور کام ہے۔

جس طرح دشمن، باغی اور حد سے تجاوز کرنے والے لڑائی کرتے ہیں۔ اگر ان میں سے کسی ایک فرد کو پکڑ لیا جائے اور اس کو قتل کرنا مقدور ہو تو اس کو وہی سزا دی جائے گی جو اللہ اور اس کے رسول نے متعین کی ہے۔

خوارج کے متعلق یہ نصوص اور احادیث جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تواتر کے ساتھ ثابت ہیں، علمائے کرام نے ان نصوص کے الفاظ اور معانی میں ایسے تمام خواہش پرست لوگوں اور گروہوں کو شامل کیا ہے جو شریعتِ اسلام اور مسلمانوں کی جماعت سے خروج کرتے ہیں اور اس معنی میں ان کے ساتھ شریک ہیں، بلکہ ان فرقوں میں کچھ تو ایسے ہیں جو خوارج سے بھی زیادہ برے ہیں، مثلاً: خرمیہ، قرامطہ اور نصیریہ وغیرہ جو بشر کو خدا قرار دیتے ہیں اور اللہ کے بھیجے ہوئے نبیوں کے علاوہ دیگر انسانوں کو بھی نبوت کے منصب پر بٹھاتے ہیں، یہی نہیں، بلکہ اس عقیدے کی بنیاد پر مسلمانوں سے لڑائی بھی کرتے ہیں، لہٰذا یہ حروریٰ کے خوارج سے بھی زیادہ برے اور بدعقیدہ ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حروریٰ کے خوارج کا تذکرہ اس لیے کیا تھا کہ وہ سب سے پہلے بدعتی تھے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد، بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہی میں ظاہر ہو چکے تھے، چونکہ وہ سب بدعتیوں سے زیادہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے قریب تھے، اس لیے تخصیص کے ساتھ ان کا ذکر کر دیا اور یہ انھی کے ساتھ خاص نہیں، بلکہ اللہ اور اس کے رسول نے اور بھی بہت سی ایسی اشیا کا بالتخصیص ذکر ہے جو اس زمانے میں رونما ہوئیں، مثلاً فرمایا:

﴿ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ﴾ [بني إسرائيل: ٣١]

''اور اپنی اولاد کو مفلسی کے ڈر سے قتل نہ کرو۔''

فرمایا:

﴿ مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ ﴾ [المائدة: ٥٤]

''جو کوئی اپنے دین سے پھر جائے تو اللہ عنقریب ایسے لوگ لائے گا کہ وہ ان سے محبت کرے گا اور وہ اس سے محبت کریں گے۔''

اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے انصار کے کئی قبائل کی تعیین کی اور کچھ احکام میں بنو اسلم، بنو غفار، بنو جہینہ، بنو تمیم، بنو اسد اور بنو غطفان وغیرہ کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا، کیوں کہ ان میں وہ معانی اور خصوصیات پائی گئیں، لہٰذا جس میں وہ خصوصیات پائی جائیں، اس کو ان کے ساتھ ملایا جا سکتا ہے، کیوں کہ تخصیص کے ساتھ کسی کا نام ذکر کرنا اس حکم اور خصوصیت میں اس کے اختصاص کی وجہ سے نہیں، بلکہ مخاطبوں کی ضرورت کی وجہ سے ہوتا ہے، اگر اس حکم کے الفاظ ان کو شامل نہ ہوں۔ یہ رافضہ اگر منصوص اور احادیث میں متعین کیے گئے خوارج سے شر میں زیادہ نہیں تو کچھ کم بھی نہیں، کیوں کہ خوارج نے تو صرف حضرت عثمان وعلی رضی اللہ عنہما اور ان کے پیروکاروں کو کافر قرار دیا، ان کو نہیں جنھوں نے لڑائی میں شرکت نہ کی یا اس سے پہلے ہی فوت ہو گئے، لیکن یہ روافض تو ابوبکر وعمر، عثمان وعلی، عام مہاجر و انصار صحابہ، نیکی میں ان کی پیروی کرنے والے (تابعین) رضي الله عنهم ورضوا عنه اور متقدم ومتاخر جمہور امتِ محمد ﷺ کو کافر کہتے ہیں، بلکہ ہر اس شخص کو بھی کافر کہتے ہیں جو ابوبکر وعمر اور انصار ومہاجرین کو عادل، نیک نام کہتا ہے، یا ان کو "رضي الله عنهم" کہتا ہے یا اللہ کے حکم پر عمل کرتے ہوئے ان کے لیے بخشش کی دعا کرتا ہے۔ اسی بنا پر یہ لوگ سعید بن مسیّب ابومسلم خولانی، اویس قرنی، عطا بن ابی رباح، ابراہیم نخعی، مالک، اوزاعی، ابوحنیفہ، حماد بن زید، حماد بن ابی سلمہ، ثوری، شافعی، احمد بن حنبل، فضیل بن عیاض، ابوسلیمان دارانی، معروف کرخی، جنید بن محمد، سہل بن عبداللہ تستری وغیرہم جیسے امت کے ائمہ اور نامور شخصیات کو کافر کہتے ہیں۔ یہ لوگ ہر اس شخص کو مباح الدم (جس کا خون بہانا جائز ہو) کہتے ہیں جو ان کی مخالفت کرتا ہے اور ان کے مذہب کو قبول نہیں کرتا، یہ ان کے مذہب کو مذہبِ جمہور کہتے ہیں، جس طرح متفلسفہ اور معتزلہ وغیرہ اہلِ سنت کے مذہب کو مذہبِ حشو، مذہبِ عامہ یا مذہبِ اہلِ حدیث وغیرہ کہتے ہیں۔

اہلِ شام، مصر، حجاز، مراکش (مغرب) یمن، عراق، جزیرہ عرب اور تمام بلادِ اسلام کے باشندوں کے متعلق ان کا عقیدہ ہے کہ ان سے نکاح جائز ہے نہ ان کا ذبیحہ کھانا حلال ہے۔ مسلمانوں کی تمام مائع چیزیں جیسے: پانی، دودھ، گھی اور تیل وغیرہ سب نجس ہیں، ان کے نزدیک مسلمانوں کا کفر یہود ونصاریٰ کے کفر سے بھی زیادہ غلیظ، یعنی سخت ہے، کیوں کہ یہود ونصاریٰ تو ان کے نزدیک اصلی کافر ہیں، مگر یہ مسلمان مرتد ہیں اور کفرِ ارتداد بالاجماع کفر اصلی سے زیادہ غلیظ اور شدید ہوتا ہے، اسی وجہ سے یہ لوگ جمہور مسلمانوں کے خلاف کافروں کا ساتھ دیتے ہیں، جمہور کے خلاف تاتاریوں کی مدد کرتے ہیں۔

اسلامی ممالک پر چنگیز خان کی یورش، عراق میں ہلاکو خان کے دخول، تاتاریوں کا حلب پر قبضہ جمانے اور صالحیہ کو لوٹنے میں انھی کا ہاتھ، سازشیں اور خباثتیں تھیں۔ اسی سبب سے یعنی مسلمانوں کو مرتد سمجھنے کی وجہ سے جب

پہلی مرتبہ مسلمانوں کی فوج مصر جاتے وقت ان کے پاس سے گزری تو انھوں نے اس کو لوٹا۔ اسی وجہ سے یہ لوگ مسلمانوں کے قافلے لوٹتے ہیں، مسلمانوں کے خلاف تاتاریوں اور فرنگیوں کی مدد کرتے ہیں، اسلام کو جب فتح حاصل ہو تو ان کے چہرے اتر جاتے ہیں۔ جب مسلمانوں نے ساحلی پٹی عکا وغیرہ فتح کی تو ان میں سے کچھ لوگوں نے عیسائیوں کی مدد کی اور ان کو مسلمانوں پر ترجیح دی۔ یہ ساری باتیں جو میں نے ان کے متعلق بیان کی ہیں، ان کے صرف چند ایک کرتوت ہیں، ورنہ معاملہ اس سے کہیں زیادہ سنگین ہے۔

حالات و واقعات اور تاریخ کا علم رکھنے والے اچھی طرح جانتے ہیں کہ اہلِ قبلہ کی طرف سے مسلمانوں کے خلاف جب شدید ترین کشت وخون اور تباہی و بربادی کی لہر اٹھی اور جنگوں کی بساط بچھائی گئی تو وہ انھی کی طرف نسبت رکھنے والے گروہوں کی کارستانی تھی۔

یہ دین اور اہلِ دین کے لیے سب سے زیادہ نقصان رساں اور حرورا کے خوارج سے بھی زیادہ اسلام کے احکام وشرائع سے دور ہیں، اس لیے یہ امت کے تمام فرقوں سے زیادہ جھوٹا فرقہ ہے، اہلِ قبلہ کی طرف نسبت رکھنے والے جتنے گروہ اور فرقے ہیں، یہ ان سب سے زیادہ جھوٹ بولنے والے اور ان سب سے زیادہ جھوٹ کی تصدیق کرنے والے اور سچ کی تکذیب کرنے والے ہیں، خصوصیت کے ساتھ اس فرقے میں نفاق سب سے زیادہ عیاں ہے، بلکہ یہ ان کا امتیازی نشان ہے۔

اسی کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: ''منافق کی تین نشانیاں ہیں: جب بات کرتا ہے تو جھوٹ بولتا ہے، جب وعدہ کرتا ہے تو وعدہ خلافی کرتا ہے اور جب اس کے پاس کوئی امانت رکھوائی جائے تو اس میں خیانت کرتا ہے۔''[1]

ایک حدیث میں ہے: ''جس میں چار علامات پائی جائیں، وہ خالص منافق ہے۔ جس میں ان میں سے ایک خصلت بھی پائی جائے تو اس میں نفاق کی خصلت ہے، یہاں تک کہ اس کو چھوڑ دے: جب بات کرے تو جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے تو خلاف ورزی کرے، جب معاہدہ کرے تو اسے توڑ دے اور جب جھگڑا کرے تو گالی دے۔''[2]

جس جس کو اس فرقے سے واسطہ رہا ہے، اس نے ان کو ان خصلتوں اور عادتوں کا خوگر دیکھا ہے۔ اسی وجہ سے یہ تقیہ استعمال کرتے ہیں جو منافقوں اور یہودیوں کی علامت ہے اور تقیہ بھی مسلمانوں سے کرتے ہیں۔

﴿ يَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِهِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ ﴾ [آل عمران: ١٦٧]

''اپنے مونہوں سے وہ باتیں کہتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں۔''

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٩)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٨)

قسمیں کھا کر مسلمانوں کو یقین دلاتے ہیں اور ان کو خوش کرنے کی کوشش کرتے ہیں، حالانکہ اللہ اور اس کا رسول زیادہ حق رکھتے ہیں کہ ان کو راضی کیا جائے۔ یہ لوگ بہت سے امور میں یہودیوں سے بالخصوص ان کے سامری فرقے سے بہت زیادہ مشابہت رکھتے ہیں، چند ایک مشابہتیں درج ذیل ہیں:

1. ان کا دعویٰ ہے کہ امامت کسی مخصوص شخص یا مخصوص قبیلے کا حق ہے، اس کے علاوہ جو بھی حق لے کر آئے، اس کو تسلیم نہیں کرنا چاہیے۔
2. خواہشات کی پیروی۔
3. تحریفِ نصوص وکلمات۔
4. نمازِ مغرب میں تاخیر اور افطار تاخیر سے کرنا۔
5. دوسروں کے ذبیحے کو حرام قرار دینا وغیرہ۔

بشر میں غلو، عبادات میں بدعت سازی اور شرک وغیرہ جیسے امور میں یہ عیسائیوں سے مشابہت رکھتے ہیں۔

اسی طرح یہ لوگ مسلمانوں کے خلاف یہود و نصاریٰ اور مشرکوں سے دوستی رکھتے ہیں، یہ بھی منافقوں کی علامتیں ہیں، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰٓى اَوْلِيَآءَ ۘ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۚ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ ۗ ﴾ [المائدة: ٥١]

”اے لوگو جو ایمان لائے ہو! یہودیوں اور عیسائیوں کو دوست نہ بناؤ، وہ آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں، اور تم میں سے جو کوئی ان سے دوستی رکھے گا تو بے شک وہ انھی میں سے ہوگا۔“

فرمایا:

﴿ تَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يَتَوَلَّوْنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ لَهُمْ اَنْفُسُهُمْ اَنْ سَخِطَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَفِي الْعَذَابِ هُمْ خٰلِدُوْنَ ۝ وَلَوْ كَانُوْا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالنَّبِيِّ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَا اتَّخَذُوْهُمْ اَوْلِيَآءَ وَلٰكِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ۝ ﴾ [المائدة: ٨٠، ٨١]

”تو ان میں سے بہت سوں کو دیکھے گا وہ ان لوگوں سے دوستی رکھتے ہیں جنھوں نے کفر کیا۔ یقیناً برا ہے جو ان کے نفسوں نے ان کے لیے آگے بھیجا کہ اللہ ان پر غصے ہو گیا اور عذاب ہی میں وہ ہمیشہ رہنے والے ہیں۔ اور اگر وہ اللہ اور نبی پر اور اس پر ایمان رکھتے ہوتے جو اس کی طرف نازل کیا گیا ہے تو انھیں دوست نہ بناتے اور لیکن ان میں سے بہت سے نافرمان ہیں۔“

ان کے پاس عقل ہے نہ نقل، نہ صحیح دین ہے نہ دنیا کی کامیابی وہ نہ جمعہ پڑھتے ہیں نہ جماعت کا التزام کرتے ہیں، حالانکہ خوارج جمعہ اور جماعت کا اہتمام کرتے تھے۔ یہ لوگ مسلمان ائمہ اور جرنیلوں کی سرپرستی میں کافروں سے لڑنا، ان کے پیچھے نماز پڑھنا، اللہ کی فرماں برداری میں ان کی فرماں برداری کرنا اور ان کے احکام کو نافذ کرنا جائز نہیں سمجھتے، کیوں کہ ان کا عقیدہ ہے کہ یہ سارے امور صرف امام معصوم کی زیرِ سرپرستی و امامت ادا کیے جا سکتے ہیں جو چار سو چالیس سال سے زیادہ عرصہ ہوا، سرداب (غار) میں چھپا بیٹھا ہے اور ابھی تک باہر نہیں نکلا (اب تقریباً ہزار سال ہو چکا ہے) اس کو کسی نے نہیں دیکھا، کسی نے اس سے دینی علم حاصل نہیں کیا اور اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوا، بلکہ الٹا نقصان ہو رہا ہے! اس کے باوجود ان کے نزدیک کسی کا ایمان اس وقت تک صحیح نہیں ہو سکتا جب تک وہ اس پر ایمان نہ رکھے، مومن صرف وہ ہے جو اس پر ایمان رکھے اور جنت میں صرف اس کے پیروکار جائیں گے (پہاڑی اور دیہاتی علاقوں کے جاہل گمراہ یا ابن عودہ جیسے شیطان کے فریب خوردہ، جس نے خود ان کی گمراہیوں سے اس سے زیادہ پردہ اٹھایا ہے جو ہم نے ذکر کیا ہے اور ہماری ان باتوں کی تصدیق کی ہے)۔

یہ ان کی اپنی مذہبی حالت ہے۔ اس کے باوجود ہر اس شخص کو کافر کہتے ہیں جو کتاب و سنت کی تعلیمات کے مطابق اللہ تعالیٰ کے اسما و صفات، قدرتِ کاملہ، مشیتِ شاملہ، قضا و قدر پر ایمان رکھتے ہیں! ان کے اکثر محققینِ مذہب کا یہ عقیدہ ہے کہ ابوبکر و عمر، اکثر مہاجرین و انصار، ازواجِ رسول ﷺ خصوصاً حضرت عائشہ اور حفصہ رضی اللہ عنہما اور مسلمانوں کے تمام ائمہ اور عام لوگ اللہ پر ایک لمحے کے لیے بھی ایمان نہیں لائے، کیوں کہ وہ ایمان جو کفر پر منتج ہو، ان کے نزدیک اصلاً باطل ہوتا ہے، کچھ علمائے سنت کا موقف بھی یہی ہے۔ ان میں سے کچھ کی یہ رائے ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی شرم گاہ کو، جس نے عائشہ و حفصہ (رضی اللہ عنہما) سے مجامعت کی۔ نعوذ باللہ۔ آگ چھوئے گی، تاکہ اس کے نتیجے میں۔ ان کے گمان کے مطابق۔ کافر عورتوں سے مجامعت کی آلائش سے پاک ہو جائے! کیوں کہ ان کے نزدیک کافر عورتوں سے مجامعت حرام ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ یہ لوگ اہلِ علم کے نزدیک رسول اللہ ﷺ کی ثابت اور متواتر احادیث کو بھی قبول نہیں کرتے، مثلاً: بخاری و مسلم کی احادیث، یہی نہیں بلکہ یہ حمیری، کوشیار دیلمی اور عمارۃ یمنی جیسے رافضی شعرا کی شاعری بخاری و مسلم کی احادیث سے بہتر سمجھتے ہیں۔ ہم نے ان کی کتابوں میں نبی اکرم ﷺ، آپ ﷺ کے صحابہ اور اہلِ بیت کی طرف منسوب اتنا جھوٹ اور افترا دیکھا ہے جو اہلِ کتاب کی کتابوں: تورات و انجیل میں بھی نہیں۔ اسی طرح یہ لوگ مساجد کو ویران کرتے ہیں، اللہ نے جن کو آباد کرنے اور ان میں اپنا نام بلند کرنے کا حکم دیا ہے، لہٰذا جمعہ اور جماعت کا اہتمام نہیں کرتے، سچی جھوٹی قبروں پر دربار تعمیر کر کے انھیں آباد کرتے ہیں، حالانکہ رسول اللہ ﷺ نے

اس کام سے منع کیا ہے اور ایسا کرنے والے پر لعنت بھیجی ہے۔ ان کے نزدیک ان جھوٹے سچے درباروں کی زیارت اور حج سب سے بڑی عبادت ہے، بلکہ ان کے کچھ مشائخ قبروں کے حج کو بیت اللہ کے حج پر ترجیح دیتے ہیں۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا یہ تمام اہلِ اہواء اور خواہش پرستوں سے بدتر ہیں اور خوارج سے بڑھ کر قتال کے لائق ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عرفِ عام میں اہلِ بدعت سے رافضی مراد لیے جاتے ہیں اور سُنی کا متضاد صرف رافضی سمجھا جاتا ہے، کیوں کہ یہ لوگ تمام اہلِ اہواء سے بڑھ کر رسول اللہ ﷺ کی سنت اور احکام کی مخالفت کرتے ہیں اور عناد ظاہر کرتے ہیں۔

خوارج تو پھر بھی اپنے فہم کے مطابق قرآن کی پیروی کرتے تھے، مگر یہ لوگ اپنے ایسے امام معصوم کے پیروکار ہیں جس کا وجود ہی نہیں، تو خوارج کا ماخذ ان کے ماخذ سے بہتر ہوا! پھر خوارج میں کوئی زندیق اور غالی نہیں تھا، مگر ان میں زندیقوں اور غالیوں کی اتنی بہتات ہے کہ احاطۂ شمار سے باہر ہے۔

اہلِ علم نے ذکر کیا ہے کہ رفض، یعنی رافضیت کا آغاز عبداللہ بن سبا زندیق سے ہوا۔ اس نے اسلام کا چوغہ پہنا، یہودیت کو اپنے باطن میں چھپا کر رکھا اور اسلام کو خراب کرنے کی سعی کی، جس طرح پولس عیسائی نے عیسائیت کو خراب کیا جو دراصل یہودی تھا۔

مزید برآں ان کے اکثر ائمہ زنادقہ ہیں۔ وہ رفض کا لبادہ اوڑھتے ہیں، کیوں کہ یہ اسلام کو تباہ کرنے کا آسان راستہ ہے، معتصم کے زمانے میں بابک خرمی کی معیت میں آذر بائی جان کی سرزمین میں نکلنے والے ''خرمیہ'' اور ''محمرہ'' جیسے ملحدوں، عراق کی سرزمین میں ظاہر ہونے والے قرامطہ، باطنیہ، حجرِ اسود کو چرانے والوں اور ابوسعید جنابی وغیرہ کے پیروکار جو ارضِ مغرب میں نمودار ہوئے، اس کے بعد مصر آئے، قاہرہ کی تعمیر کی اور فاطمی ہونے کا دعویٰ کیا، ان سب نے رافضیت کا لباس پہنا اور اسلام میں نقب زنی شروع کر دی، حالانکہ ماہرینِ انساب کا اتفاق ہے کہ ان فاطمیوں کا رسول اللہ ﷺ کے نسب شریف سے کوئی رشتہ نہیں تھا، بلکہ ان کا نسب یہودیوں اور مجوسیوں سے ملتا تھا اور رسول اللہ ﷺ کے دین کے جاننے والے سب علما کا اتفاق ہے کہ یہ لوگ رسول اللہ ﷺ کے دین سے یہود و نصاریٰ سے بھی زیادہ دور ہیں۔ یہ غالی حضرت علی اور ائمہ کو خدا قرار دیتے ہیں، انھی ملحدوں کے پیروکار خراسان، شام اور یمن وغیرہ میں ان کی دعوت عام کرتے رہے۔

ان لوگوں نے مسلمانوں کے خلاف تاتاریوں کی بڑھ چڑھ کر مدد کی اور اپنی زبان اور ہاتھ سے ان کی معاونت کی، کیوں کہ ان کا عقیدہ مسلمانوں اور یہود و نصاریٰ کے عقیدے کے بھی خلاف ہے۔ اسی بنا پر کافروں کا بادشاہ ہلاکو خان ان کو پسند کرتا اور ان کو عہدوں پر متعین کرتا۔

نیز خوارج زبان کے کھرے اور وعدے کی پاسداری کرنے والے تھے، مگر یہ لوگ سب سے بڑے جھوٹے اور سب سے زیادہ وعدہ توڑنے والے ہیں۔

فتویٰ پوچھنے والے نے جو سوال میں یہ ذکر کیا ہے کہ یہ لوگ ان تمام باتوں پر ایمان رکھتے ہیں جو محمد ﷺ لے کر آئے، یہ عین جھوٹ ہے، بلکہ یہ لوگ ان تمام باتوں کا اتنا انکار کرتے ہیں کہ اسے شمار نہیں کیا جا سکتا۔ کبھی یہ آپ ﷺ سے ثابت نصوص کی تکذیب کرتے ہیں، کبھی قرآنی معانی کی تکذیب کرتے ہیں۔ مذکورہ بالا سطور میں ہم نے ان کی جو بدعقیدگیاں اور رسوائیاں ذکر کی ہیں ان سے ہر ایک کو معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ ساری چیزیں ان تعلیمات کے خلاف ہیں جو محمد ﷺ لے کر مبعوث ہوئے۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنی کتاب میں صحابہ (رضوان اللہ علیہم) کی تعریف کی ہے اور ان کو بخشنے کا ذکر کیا ہے، مگر یہ لوگ اس کی حقیقت کا انکار کرتے ہیں۔ اس نے قرآن میں جمعہ قائم کرنے، جہاد کرنے اور اولو الامر کی اطاعت کا حکم دیا ہے، یہ اس سے خارج ہیں۔ اس نے مومنوں کے ساتھ اخوت، محبت اور دوستی رکھنے اور ان کے درمیان اصلاح کرنے کا حکم دیا ہے، مگر یہ اس کے حکم سے خارج ہیں۔ اس نے کافروں سے دوستی اور محبت رکھنے سے منع کیا ہے، یہ اس حکم سے بھی خارج ہیں۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں مسلمانوں کے خونوں، مالوں اور عزتوں کی حرمت اور غیبت، اشارے بازی اور لعن طعن کی تحریم ذکر کی ہے، مگر یہ لوگ ان کو بڑی جرأت کے ساتھ حلال قرار دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں جماعت بندی اور باہمی الفت کا حکم دیا ہے اور اختلاف اور فرقے بندی سے منع کیا ہے، لیکن یہ لوگ اس حکم میں سب سے زیادہ دور ہیں۔ اس نے قرآن میں رسول ﷺ کی اطاعت، محبت اور آپ ﷺ کے حکم کی اتباع کا حکم دیا ہے، یہ لوگ اس کے بھی مخالف ہیں۔ اس نے قرآن میں رسول اللہ ﷺ کی ازواج کے حقوق ذکر کیے ہیں، یہ لوگ ان سے بھی بری ہیں، قرآن میں توحید، اخلاص اور ایک اللہ کی عبادت کا ذکر ہے، مگر یہ لوگ اس سے بھی خارج ہیں، بلکہ یہ مشرک ہیں، جس طرح حدیث میں آیا ہے، کیوں کہ یہ لوگ سب سے زیادہ قبروں کی تعظیم کرتے ہیں، جن کو خدا کے سوا بت بنا لیا گیا ہے، قرآن میں اللہ کے جن ناموں اور صفات کا ذکر ملتا ہے، یہ ان کا انکار کرتے ہیں۔ قرآن میں انبیا کے واقعات مذکور ہیں اور مشرکوں کے لیے استغفار سے منع کیا گیا ہے، لیکن یہ لوگ اس حکم کا بھی انکار کرتے ہیں۔ قرآن میں اللہ کے ہر چیز پر قادر ہونے، ہر چیز کا خالق ہونے اور اس بات کا ذکر ہے کہ وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے، اس کی مدد کے بغیر انسان کو کوئی قوت نہیں ملتی، مگر وہ اس کے بھی منکر ہیں۔ یہ بڑا طویل جواب ہے اور یہ فتویٰ مختصر اشاروں سے زیادہ کا متحمل نہیں۔

یہ بات قطعیت کے ساتھ معلوم ہے کہ جو کچھ محمد ﷺ لے کر آئے، خوارج ان سے زیادہ اس پر ایمان رکھتے تھے۔ اگر امیر المومنین علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے ان کو قتل کیا، ان کا لشکر لوٹا اور ان کی فوج میں جتنے گھوڑے، مال اور اسلحہ تھا، سب لوٹ لیا لہٰذا ان لوگوں سے لڑنا اور جنگ میں ان کا مال چھیننا، ان سے کہیں اولیٰ ہے جس طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خوارج کا مال چھینا تھا۔

جن اصحابِ علم و دانش کا یہ خیال ہے کہ ان سے لڑنا ان باغیوں سے لڑنے کی طرح ہے جو کسی سائغ اور جائز تاویل کی بنا پر امامِ وقت کے خلاف خروج کرتے ہیں، جس طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اہلِ جمل اور صفین سے لڑائی لڑی تھی تو ان کا یہ خیال غلط اور شریعتِ اسلام کی حقیقت سے ناواقفیت پر مبنی ہے۔

کیوں کہ اگر یہ لوگ، یعنی خوارج اگر کسی ملک پر قبضہ کر لیں اور شریعتِ اسلام کے مطابق اس کا نظامِ حکومت چلائیں تو یہ تمام بادشاہوں کی طرح بادشاہ ہوں گے، مگر یہ غالی روافض رسول اللہ ﷺ کی نفیس شریعت و سنت سے خوارجِ حروریہ سے بھی زیادہ برے انداز میں خارج ہیں، ان کی تاویل تاویلِ سائغ نہیں، کیوں کہ سائغ وہ جائز تاویل ہوتی ہے جس کو اختیار کرنے والے کو اس پر برقرار رکھا جاتا ہے، جب اس میں جواب نہ ہو، یعنی ایسی تاویل لفظ جس کا احتمال رکھتا ہو، مگر وہ معنی متبادر نہ ہو، مثلاً: اجتہاد کے مقامات پر جب علما اختلاف کرتے ہوئے تاویل کرتے ہیں، مگر ان لوگوں (روافض) کی تاویل کو کتاب و سنت اور اجماع کی معاونت حاصل نہیں، بلکہ ان کی تاویل زکات نہ دینے والوں، خوارج، یہود اور نصاریٰ کی تاویل کی قبیل سے تعلق رکھتی ہے، بلکہ ان کی تاویل تمام اہلِ اہواء کی تاویلات سے بدتر ہے۔ تاہم ان فقہا کو اپنی اپنی فقہی مختصر کتابوں میں ان مسائل کی تحقیق نہیں ملتی اور اکثر شریعت و فقہ کے باب میں کتابیں تصنیف کرنے والے ائمہ نے اپنی کتابوں میں زکات نہ دینے والوں اور خوارج کی طرح کے اعتقادی و علمی اصولِ شریعت سے نکل جانے والے لوگوں سے لڑائی کرنے کے متعلق اپنی کتابوں میں جو کچھ ذکر کیا ہے، وہ اہلِ جمل اور اہلِ صفین جیسے امامِ وقت کے خلاف خروج کرنے والوں سے لڑنے کے ضمن میں کیا ہے، مستقل نہیں جو غلط ہے، کیوں کہ کتاب و سنت اور اجماعِ صحابہ نے ان دونوں اصناف میں فرق کیا ہے، جس طرح فقہ، سنت و حدیث اور تصوف و کلام کے اکثر ائمہ نے اس کا ذکر کیا ہے۔

نیز رسول اللہ ﷺ سے ایسی نصوص اور الفاظ بھی مروی ہیں جو ان کو بھی شامل ہیں اور دوسروں کو بھی، مثلاً: صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”جو فرماں برداری سے نکلا، جماعت سے علاحدہ ہوا، پھر مر گیا تو وہ جاہلیت کی موت مرا۔ جس نے کسی اندھے جھنڈے کے نیچے لڑائی لڑی، عصبیت کے لیے غصے میں آیا اور عصبیت کے لیے لڑتا ہے، وہ مجھ

سے نہیں، جس نے میری امت کے خلاف خروج کیا اور امت کے نیک و بد کو مارا، مومن سے اجتناب نہ کیا اور کسی ذمی کے ذمے داری کی پاسداری نہ کی تو وہ مجھ سے نہیں۔''[1]

یہاں آپ ﷺ نے بغاوت کرنے والوں، سلطان کی اطاعت اور مسلمانوں کی جماعت سے نکلنے والوں کا ذکر کر کے فرمایا کہ اگر ان میں سے کوئی مر گیا تو وہ جاہلیت کی موت مرے گا، کیوں کہ زمانۂ جاہلیت کے لوگ کسی کو اپنا امام اور سربراہ مقرر نہیں کرتے تھے، بلکہ ہر گروہ دوسرے پر غلبہ پانے میں لگا رہتا، اس کے بعد آپ ﷺ نے اہلِ عصبیت کے لڑنے کا ذکر کیا، مثلاً: جو حسب و نسب پر لڑتے ہیں، جیسے قیس اور یمن۔ اس کے بعد بتایا کہ جو بھی ان جھنڈوں کے نیچے لڑتا ہے وہ آپ ﷺ کی امت سے تعلق نہیں رکھتا۔ اس کے بعد ظلم و زیادتی کرنے والے حملہ آوروں اور خارجیوں وغیرہ کی لڑائی کا ذکر کیا اور بتایا کہ جس نے یہ کام کیا اس کا آپ ﷺ سے کوئی تعلق نہیں۔ ان لوگوں میں یہ تینوں اوصاف بھی پائے جاتے ہیں اور ان کے علاوہ بھی، یہ لوگ اطاعت اور جماعت سے خارج ہیں، مومن سے بھی لڑتے ہیں اور ذمی سے بھی اور مسلمانوں کے کسی والی اور سربراہِ ریاست کی فرماں برداری جائز نہیں سمجھتے، چاہے وہ نیک نام ہو یا فاسق، صرف اس کی فرماں برداری فرض سمجھتے ہیں جس کا وجود ہی نہیں۔ پھر یہ لوگ ایسی عصبیت کے لیے لڑتے ہیں جو حسب و نسب کی عصبیت سے بھی زیادہ بری ہے، یہ فاسد دین کی عصبیت ہے۔ ان کے دلوں میں چھوٹے بڑے اور نیک بد مسلمانوں کے خلاف اتنا بغض اور کینہ پایا جاتا ہے جو کسی کے دل میں نہیں پایا جاتا۔ ان کی سب سے بڑی عبادت اللہ کے نیک بندوں اور پہلے و پچھلے مسلمانوں پر لعنت بھیجنا ہے۔ جو ان میں سب سے معتدل ہوتا ہے وہ وہ ہوتا ہے جو نہ لعنت بھیجتا ہے، نہ ان کے لیے استغفار ہی کرتا ہے۔

جہاں تک ان کا خروج ہے تو یہ مومن سے بھی لڑتے ہیں اور ذمی سے بھی، یہ وصف بھی ان میں پایا جاتا ہے، حالانکہ ان کا دعویٰ ہے کہ صرف وہ مومن ہیں اور باقی ساری امت کافر ہے۔

صحیح مسلم میں محمد بن شریح سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''بہت سے فتنے جنم لیں گے۔ جس نے اس امت کے اتحاد کو پارہ پارہ کرنا چاہا اس کو تلوار سے مارو۔''[2]

ایک روایت میں ہے: ''جو تمھارے پاس اس حالت میں آئے کہ تم سب ایک آدمی پر اکٹھ کر چکے ہو اور وہ تمھارے اتحاد کو پارہ اور تمھاری جماعت کو تقسیم کرنا چاہے اس کو قتل کرو۔''[3]

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۸۴۸)

[2] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۸۵۲)

[3] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۸۵۲)

دیکھا جائے تو یہ لوگ مسلمانوں کے اتحاد اور جماعت کو ٹکڑوں میں تقسیم کرنے میں سب سے آگے اور حرص مند واقع ہوئے ہیں۔ یہ ولی امر کی فرماں برداری کا اقرار نہیں کرتے، وہ نیک ہو یا بد اور کسی معاملے میں اس کی فرماں برداری نہیں کرتے، بلکہ ان کے دین کا سب سے اہم اصول خلفائے راشدین، علمائے مسلمین اور مشائخِ اسلام جیسے بہترین والیانِ امور کو کافر کہنا اور ان کو سب وشتم کا نشانہ بنانا ہے، کیوں کہ ان کا عقیدہ ہے کہ ہر وہ شخص جو امام معصوم پر ایمان نہیں رکھتا (جس کا وجود ہی نہیں!) وہ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان نہیں لایا۔

یہ گروہ حرورا کے خوارج اور دیگر اہلِ اَہواء سے بھی بدتر ہے، کیوں کہ ان کا مذہب ایسے عقائد پر مشتمل ہے جو خوارج کے مذہب سے بدتر اور کہیں برے ہیں۔ حروریٰ کے خوارج وہ پہلے اہلِ اہواء تھے جو سنت اور جماعت سے خارج ہوئے، اس وقت کچھ خلفائے راشدین بھی موجود تھے اور مہاجرین و انصار کے باقی لوگ بھی، امت میں علم و ایمان اور عدل کا غلبہ تھا، نورِ نبوت سلطانِ حجت اور سلطانِ قدرت کا سورج نصف النہار پر تھا اور اگر اللہ تعالیٰ نے حجت وقدرت (طاقت) کے ساتھ اپنے دین کو تمام ادیان پر غالب کر دیا تھا۔

ان کے خروج کا سبب امیر المومنین حضرت عثمان غنی وعلی مرتضی رضی اللہ عنہما اور ان دونوں کے ہم نواؤں سے صادر ہونے والے کچھ اس انواع کے افعال تھے کہ جو تاویلِ سائغ پر مبنی تھے، مگر کچھ ان لوگوں نے اس احتمال کو قبول نہ کیا اور موارِدِ اجتہاد (یعنی مقاماتِ اجتہاد) بلکہ حسنات کو گناہ اور گناہوں کو کفر قرار دے دیا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے زمانے میں نہ نکلے، کیوں کہ یہ تاویلات بھی غیر موجود تھیں اور وہ کمزور تھے۔

یہ بات عیاں ہے کہ جب نورِ نبوت ظاہر و غالب ہو تو اس کے سامنے بدعتِ مخالفہ کمزور تر ہوتی ہے، اس لیے پہلی بدعت دوسری سے خفیف تر تھی اور بعد والی پہلی بدعت کے مندرجات پر بھی مشتمل ہوتی ہے اور مزید اضافوں پر بھی، اسی طرح جب سنت کی اصل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جتنی قریب ہوتی ہے، اتنی افضل ہوتی ہے۔ سنتیں بدعتوں کی ضد اور الٹ ہیں۔ بنا بریں جو سیرت و کردار زمانے کے لحاظ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جتنے زیادہ قریب ہو، جس طرح ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی سیرت ہے، وہ اس سے اتنا افضل ہے جو سیرت و کردار آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے دور ہو، جس طرح عثمان و علی رضی اللہ عنہما کی سیرت ہے اور بدعات اس کے الٹ ہوتی ہیں، یعنی جو بدعت جتنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے دور ہوتی ہے وہ اس کی نسبت اتنی ہی بری ہوتی ہے، جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے قریب ہو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے قریب ترین جو بدعت ظاہر ہوئی وہ خوارج کی بدعت تھی، ان کا اپنی بدعت کا اظہار کرنا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ظاہر ہو چکا تھا، مگر ان کی قوت اور اجتماعیت امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ کی خلافت میں ظاہر ہوئی۔

اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانے میں رافضیت کا آغاز ہو چکا تھا، لیکن حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے

بعد ان کو قوت اور اجتماعیت حاصل ہوئی، بلکہ لفظِ رفض پہلی صدی کے بعد اس وقت سننے میں آیا جب زید بن علی بن حسین نے خروج کیا اور ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کو "رحمة الله عليهما" کہا تو رافضیوں نے ان کی یہ بات ماننے سے انکار کر دیا جس کی بنا پر ان کو رافضہ (انکار کرنے والے) کہا جانے لگا۔ انھوں نے ابوجعفر کے بارے میں امام معصوم کا عقیدہ بنا لیا، کچھ لوگوں نے زید بن علی کو امام مانا اور وہ ''زیدیہ'' کہلائے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اواخرِ زمانہ میں قدریہ اور جبریہ کی باتیں نکلنے لگیں۔ ابن عمر، ابن عباس، جابر بن عبداللہ، ابو سعید اور واثلہ بن اسقع جیسے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جو اس وقت بقیدِ حیات تھے۔ انھوں نے ان کی تردید کی۔ ان کو اس وقت کوئی شوکت اور پہچان حاصل نہ ہو سکی، لیکن جب اس کے بعد معتزلہ اور مرجئہ کی کثرت ہوگئی تو ان کو بھی غلبہ اور جمعیت حاصل ہوگئی۔ تابعین کے زمانے کے اخیر میں جہمیہ اور صفاتِ باری تعالیٰ کی نفی کی بدعت نمودار ہوئی، لیکن ان کو بھی جماعت اور اقتدار دوسری صدی کے بعد اس وقت حاصل ہوئی جب ابو العباس مامون الرشید مسندِ خلافت پر متمکن ہوا۔ اس نے جہمیت کو مذہب قرار دیا اور اس کی بنیاد پر لوگوں کو فتنے اور امتحان میں ڈالا۔ پھر اس نے رومیوں، یونانیوں اور دیگر عجمیوں کی کتابوں کو عربی میں ترجمہ کروایا۔ اسی کے زمانے میں ''خرمیہ'' نامی فرقہ نمودار ہوا۔ یہ زندیق اور منافق تھے جنھوں نے اسلام کا نام استعمال کیا۔ اس کے بعد یہ قرامطہ، باطنیہ اور اسماعیلیہ میں تقسیم ہو گئے۔ ان میں سے اکثر ظاہر میں رافضیت کی طرف نسبت رکھتے ہیں۔

تیسری صدی کے بعد بنی بویہ کے زمانے میں امامیہ رافضیوں، یعنی اثنا عشری شیعوں میں ان گمراہ کن اہلِ اہواء کی کثرت ہوگئی۔ خروج، رفض، قدر اور تجہم ان میں عام تھا۔ ان لوگوں نے کتاب وسنت کی نصوص کی اتنی مخالفت کی ہے جو احاطۂ شمار میں نہیں آ سکتی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں وہ ساری خرابیاں پائی جاتی ہیں جو خوارج میں تھیں، بلکہ بہت سی ان سے زیادہ ہیں۔

نیز حروریٰ کے خوارج نے اپنی آرا کی روشنی میں قرآن کی پیروی کو اپنا مذہب بنایا تھا اور وہ ان سنتوں کی پیروی چھوڑتے تھے جن کو قرآن کریم کے خلاف سمجھتے تھے، مگر رافضہ نے اہلِ بیت کی پیروی کو اپنا مذہب بنایا۔ ان کا عقیدہ ہے کہ ان میں، یعنی اہلِ بیت میں وہ ''معصوم'' ہے جس پر کسی چیز کا علم پوشیدہ نہیں، وہ عمداً غلطی کرتا ہے نہ سہواً اور نہ رشداً یعنی سمجھ کر۔

قرآن کریم کی اتباعِ امت پر فرض، بلکہ ایمان کی اصل اور اللہ کی وہ ہدایت ہے جو اس نے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو دے کر مبعوث کیا۔

اسی طرح اہلِ بیتِ رسول ﷺ کی محبت و موالات اور ان کے حقوق کی پاسداری جن کی رسول اللہ ﷺ نے وصیت کی ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں مکے اور مدینے کے درمیان غدیرِ خم نامی ایک جگہ پر خطبہ دیا، جس میں کہا:

''لوگو! میں تم میں ثقلین (دو نفیس ترین چیزیں) چھوڑ کر جا رہا ہوں۔''[1] ایک روایت میں ہے: ''ان میں سے ایک دوسری سے زیادہ عظیم ہے۔'' ایک اللہ کی کتاب ہے، اس میں ہدایت اور نور ہے۔[2] ایک روایت میں ہے: ''وہ اللہ کی رسی ہے، جس نے اس کی پیروی کی وہ ہدایت پر ہوا، جس نے اس کو چھوڑا، وہ گمراہی پر ہوا۔'' اور میری عترت (آل) میرے اہلِ بیت ہیں، میں تمھیں اپنے اہلِ بیت کی بابت اللہ کو یاد رکھنے کا کہتا ہوں (یہ بات تین مرتبہ کہی)۔''[3] زید بن ارقم سے پوچھا گیا: آپ ﷺ کے اہلِ بیت کون ہیں؟ فرمایا: ''جن پر صدقہ حرام ہے، آلِ عباس، آلِ علی، آلِ جعفر اور آلِ عقیل۔''[4]

وہ نصوص جو قرآن کریم کی اتباع اور پیروی پر دلالت کرتی ہیں، بہت زیادہ ہیں، اگر انھیں یہاں ذکر کرنا شروع کر دیا جائے تو ختم ہونے میں نہ آئیں۔

حسن اسناد سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اپنے اہلِ بیت کے متعلق فرمایا:

«وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهِ، لَا يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتَّى يُحِبُّوْكُمْ مِنْ أَجْلِيْ»

''اللہ کی قسم! وہ اس وقت تک جنت میں داخل نہیں ہوں گے، جب تک تم سے صرف میرے لیے محبت نہ کریں۔''

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ہمیں آلِ محمد ﷺ پر درود بھیجنے کا حکم دیا ہے۔ ان کو صدقے سے پاک کیا ہے جو لوگوں کی میل کچیل ہوتی ہے اور خمس اور فے (مالِ غنیمت) میں ان کا حق رکھا ہے۔

صحیح میں ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

''اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے بنی اسماعیل کو چنا، بنی اسماعیل سے کنانہ کو چنا، کنانہ سے قریش کو چنا، قریش سے بنی ہاشم کو چنا اور بنی ہاشم سے مجھے چنا۔ میں نفس اور نسب کے اعتبار سے تم میں سے بہتر ہوں۔''[5]

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤٠٨)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤٠٨) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٧٨٨)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤٠٨)

[4] أيضاً.

[5] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٢٧٦)

اگر ہم رسول ﷺ کی قرابت داری اور آپ ﷺ کے صحابہ کے حقوق ذکر کرنا شروع کر دیں تو گفتگو بڑی طویل ہو جائے گی، کیوں کہ کتاب وسنت میں اس کے دلائل بے شمار ہیں۔

اسی بنا پر اہلِ سنت والجماعت صحابہ اور قرابتِ رسول کے حقوق کی پاسداری کرنے پر اتفاق رکھتے ہیں اور ناصبیوں سے براءت کا اظہار کرتے ہیں، جو صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تکفیر وتفسیق کرتے ہیں اور اہلِ بیت کی حرمت میں کمی اور تنقیص کرتے ہیں، مثلاً: وہ لوگ جو بادشاہت کی بنا پر ان سے عداوت رکھتے ہیں، ان کے واجب حقوق سے پہلو تہی کرتے ہیں، یزید بن معاویہ کی تعظیم میں ناجائز غلو اور مبالغہ آرائی کرتے ہیں۔ اسی طرح اہلِ سنت ان رافضیوں سے بھی بے گانگی کا اظہار کرتے ہیں جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جمہور اہلِ ایمان اور عام صالحین اہلِ قبلہ کو طعن و تعریض اور سب وشتم کا نشانہ بناتے ہیں۔ انھیں علم ہے کہ یہ روافض خوارج سے زیادہ گمراہ اور گناہ گار ہیں، ہم ذکر کر آئے ہیں کہ لڑنے والے روافض خوارج سے زیادہ بدتر ہیں۔

ان دونوں گروہوں میں سے ہر ایک نے ثقلین (عترتِ رسول اور قرآن کریم) میں سے ایک چیز کو پکڑ کر فرقہ اور مذہب بنا لیا، لیکن قرآن کریم زیادہ عظیم ہے۔ اس بنا پر خوارج روافض سے گمراہی میں کم ہیں، حالانکہ دونوں گروہ ہی کتاب وسنت اور صحابہ وقرابت کے مخالف اور خلفائے راشدین اور عترتِ رسول، یعنی اہلِ بیتِ رسول ﷺ کی سنت وطریقے کے مخالف ومعاند ہیں۔ حنبلی فقہا وغیرہ کا اختلاف ہے کہ آیا خلفائے راشدین کا اجماع اور عترتِ رسول کا اجماع حجت اور واجب الاتباع ہے یا نہیں؟ لیکن صحیح موقف یہ ہے کہ دونوں کا اجماع حجت ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے: ''میری سنت اور میرے بعد میرے خلفائے راشدین مہدیین کی سنت اختیار کرو، اس کو مضبوطی سے تھام لو اور ڈاڑھوں سے پکڑ لو۔''[1] یہ حدیث صحیح ہے اور سنن میں موجود ہے۔

آپ ﷺ نے فرمایا: ''میں تم میں ثقلین (دو نفیس ترین چیزیں) کتاب اللہ اور اپنی عترت (اولاد) چھوڑ کر جا رہا ہوں، یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے، یہاں تک کہ حوض پر میرے پاس آئیں گے۔''[2] (رواہ الترمذي وحسنه) یہ محلِ نظر ہے، اسی طرح خلفائے راشدین کے زمانے کا اجماع اہلِ مدینہ بھی یہی مرتبہ رکھتا ہے۔

یہاں یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ مسلمانوں سے لڑنے والے رافضی محارب گروہ ان خوارج سے بدتر ہیں جن سے لڑنے کی ترغیب وتحریک رسول اللہ ﷺ کے الفاظ سے ثابت ہے۔ یہ بات حقیقت شناسِ اسلام علما کے نزدیک

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٦٠٧) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٦٧٦) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٢) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٧٣٥)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤٠٨) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٧٨٨)

اتفاقی ہے۔ خوارج کے متعلق احادیث میں کچھ علما کے نزدیک رسول اللہ ﷺ کے کہے ہوئے الفاظ سب کو شامل ہیں اور کچھ دوسروں کے نزدیک خوارج ان الفاظ میں بطورِ تنبیہ اور بتقاضائے فحوائے کلام شامل ہیں یا پھر اس وجہ سے کہ وہ ان کے مفہوم میں داخل ہیں۔ یہ حدیث متنوع الفاظ سے مروی ہے، بخاری کے الفاظ ہیں: ''حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انھوں نے کہا: جب میں تمھیں رسول اللہ ﷺ سے کوئی حدیث سناؤں تو اگر میں آسمان سے گر جاؤں تو یہ مجھے آپ سے جھوٹ بیان کرنے سے زیادہ پسند ہوگا اور اگر میں تمھیں کوئی ایسی بات بیان کروں جو میرے اور تمھارے درمیان ہو تو جنگ دھوکے کا نام ہے، میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا، آپ ﷺ نے فرمایا: ''آخرِ زمان میں ایک قوم کا ظہور ہوگا، وہ نوعمر اور کم عقل ہوں گے، ان کی بات سارے انسانوں سے بہتر ہوگی، ان کا ایمان ان کے حلقوں سے نیچے نہیں اترے گا، وہ دین سے اس طرح نکلیں گے، جس طرح تیر شکار سے نکل جاتا ہے، پس تم انھیں جہاں پاؤ، قتل کرو، جس نے ان کو قتل کیا، ان کے قتل کرنے میں اس کو قیامت کے دن اجر ملے گا۔''[1]

صحیح مسلم میں زید بن وہب سے مروی ہے:

''میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی قیادت میں خوارج سے لڑنے والی فوج میں شامل تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا: لوگو! میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''میری امت سے ایک ایسی قوم نکلے گی جو قرآن پڑھے گی۔ ان کی قراءت، نماز اور روزے کے مقابلے میں تمھاری قراءت، روزہ اور نماز کوئی حیثیت نہیں رکھے گی، وہ قرآن پڑھیں گے اور سمجھیں گے کہ ان کے حق میں ہے مگر وہ ان کے خلاف ہو گا۔ ان کی نماز ان کے سینے سے تجاوز نہیں کرے گی۔ وہ اسلام سے اس طرح نکل جائیں گے جس طرح تیر شکار سے نکل جاتا ہے۔ وہ فوج جو اُن کو پالے گی، اگر انھیں علم ہو جائے کہ ان کے نبی کی زبان سے اس کے متعلق کیا نکلا ہے تو وہ عمل کرنا چھوڑ دیں۔ اس کی نشانی یہ ہے کہ ان میں ایک آدمی ہوگا جس کا بازو مونڈھے سے کہنی تک ہوگا اور بازو کے آخری سرے پر سرِ پستان جیسا ابھار ہوگا، جس پر سفید بال ہوں گے۔''[2] اللہ کی قسم! مجھے امید ہے کہ یہی وہ قوم ہے انھوں نے حرام خون کو بہایا اور لوگوں کے مویشیوں پر حملہ کیا ہے، اللہ کا نام لو اور ان کی طرف چلو۔''

صحیح مسلم میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے کاتب عبداللہ بن رافع سے مروی ہے:

''جب حروریہ نے خروج کیا، اس وقت وہ ان کے ساتھ تھا۔ انھوں نے کہا: ''لا حكم إلا الله'' ''اللہ

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٤١٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٦٤)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٦٦)

کے سوا کسی کا حکم اور فیصلہ نہیں۔" حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا: "كلمة حق أريد بها الباطل" "بات تو سچی ہے، مگر اس سے غلط بات مراد لی گئی ہے۔" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ لوگوں کی صفات ذکر کیں، مجھے وہ صفات ان میں نظر آتی ہیں۔ یہ اپنی زبانوں سے حق کہتے ہیں جو ان کے حلق سے نیچے نہیں اترتا۔ یہ اللہ کو مبغوض ترین لوگ ہیں۔ ان میں ایک کالا شخص ہے جس کا ایک ہاتھ بکری کے تھن یا سرِ پستان جیسا ہے۔ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کو قتل کیا تو کہا: دیکھو، انھوں نے دیکھا، مگر وہ انھیں نہ ملا، انھوں نے کہا: واپس جاؤ، اللہ کی قسم! نہ میں نے جھوٹ بولا نہ میرے ساتھ جھوٹ بولا گیا (انھوں نے یہ بات دو تین مرتبہ کہی) پھر انھوں نے اس کو ایک ویران جگہ پر پالیا اور اس کو لے کر ان کے پاس آئے اور ان کے سامنے رکھ دیا۔"[1]

یہ علامت جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی ہے یہ ان میں سب سے پہلے نکلنے والے کی علامت ہے، یعنی سب سے پہلے خارجی کی علامت ہے، وہ اسی قوم کے ساتھ خاص نہیں ہیں، کیوں کہ دوسری احادیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان کیا ہے، وہ دجال کے زمانے تک خروج کرتے رہیں گے۔ سب مسلمانوں کا اتفاق کہ خوارج صرف اسی لشکر کے ساتھ مختص نہیں۔

نیز وہ صفات جو بیان ہوئی ہیں وہ اس لشکر کے ساتھ ہی خاص نہیں، بلکہ دیگر لشکروں پر بھی صادق آتی ہیں، اس لیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ان احادیث کو مطلق ہی سمجھتے تھے، مثلاً: صحیحین میں ابو سلمہ اور عطا بن یسار سے مروی ہے کہ وہ دونوں ابو سعید کے پاس آئے اور حروریہ کے متعلق پوچھنے لگے کہ کیا آپ نے سنا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا ذکر کیا ہو؟ انھوں نے کہا: مجھے یہ تو معلوم نہیں، البتہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: "اس امت میں (یہ نہیں کہا اس امت سے) ایک ایسی قوم نکلے گی، تم ان کی نمازوں کے ساتھ اپنی نمازوں کو حقیر سمجھو گے۔ وہ قرآن پڑھیں گے جو ان کے گلوں/حلقوں سے آگے نہیں بڑھے گا۔ وہ دین سے اس طرح نکلیں گے جس طرح تیر شکار سے نکل جاتا ہے۔ تیر پھینکنے والا اپنے تیر کے بھالے اور تانت کو دیکھتا ہے تو شک کرتا ہے کہ کیا تیر کے سوفار (چٹکی) پر کچھ خون لگا ہے؟"[2]

یہ مسلم کے الفاظ ہیں۔ صحیحین میں ذوالخویصرہ کی حدیث بھی معروف ہے۔[3] ان سب لوگوں کی اصل گمراہی یہ تھی کہ یہ ائمہ ہدیٰ اور مسلمانوں کی جماعت کو عدل سے باہر اور گمراہ سمجھتے تھے۔ سنت سے خروج کرنے والے رافضہ کا

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٦٦)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٧٧١) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٦٤)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٤١٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٦٤)

ماخذ بھی یہی ہے، پھر وہ لوگ جس کو ظالم سمجھتے ہیں، اس کو کفر خیال کرتے ہیں اور کفر پر ان سب احکام کی بنا رکھتے ہیں جو انھوں نے خود بنائے ہوئے ہیں۔

یہ حروریٰ کے خوارج اور رافضہ جیسے دین سے الگ ہونے والے گروہوں کے تین مقامات ہیں (ہر مقام میں) انھوں نے دین کے کچھ اصول چھوڑے ہیں جس کی بنا پر دین سے اس طرح الگ ہو گئے ہیں جس طرح تیر شکار کو چیر کر آر پار ہو جاتا ہے۔ صحیحین میں حضرت ابوسعید کی حدیث میں ہے: ''وہ اہلِ اسلام سے لڑیں گے اور اہلِ اوثان (بت پرستوں) کو چھوڑ دیں گے، اگر میں نے ان کو پا لیا تو ان کو قتلِ عاد کی طرح قتل کروں گا۔''[1]

یہ رافضی اور دیگر تمام خوارج کی خصوصیت اور امتیازی وصف ہے۔ یہ اہلِ قبلہ کو مرتد سمجھتے ہوئے ان کے خون کو گرانا کافروں کا خون گرانے سے بھی زیادہ حلال سمجھتے ہیں جو مرتد نہیں، کیوں کہ سب سے زیادہ برا ہے۔

ابوسعید کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی امت سے نکلنے والی ایک قوم کا ذکر کیا اور فرمایا: وہ ایک فرقے کی شکل میں نکلیں گے۔ سر منڈوانا ان کی نشانی ہوگی۔ وہ مخلوق میں سے بدتر ہیں۔ ان کو دو گروہوں میں سے وہ گروہ قتل کرے گا جو حق کے زیادہ قریب ہوگا۔''[2] یہ نشانی ان کے پہلے انسان کی نشانی ہے، جس کی کہنی پر پستان جیسا ابھار تھا۔ وہ بھی سر منڈا ہی تھا۔ یہ سر منڈوانا ان کا امتیازی وصف اور لازمی وصف تھا۔

بخاری و مسلم میں اس معنی میں سہل بن حنیف سے بھی مروی ہے۔[3] بخاری میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے[4] اور مسلم میں ابوذر،[5] رافع بن عمرو جابر بن عبداللہ[6] اور دیگر صحابہ سے بھی خوارج کے متعلق ذکر منقول ہے۔

نسائی میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''آخر زمان میں ایک قوم نکلے گی، جو انھی میں سے ہوگی (جس نے آپ ﷺ کی تقسیم پر اعتراض کیا تھا) وہ قرآن پڑھیں گے۔ مگر وہ ان کے سینوں سے تجاوز نہیں کرے گا۔ وہ اسلام سے اس طرح نکل جائیں گے جس طرح تیر شکار کے آر پار ہو جاتا ہے۔ ان کی علامت سر منڈوانا ہوگی۔ وہ نکلتے رہیں گے، حتی کہ ان کا آخری خروج دجال کے ساتھ ہوگا۔ اگر تم انھیں پا لو تو انھیں قتل کر دینا۔ وہ بدترین مخلوق ہیں۔''[7]

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحديث (٣١٦٦) صحیح مسلم، رقم الحديث (١٠٦٤)

[2] صحیح البخاري، رقم الحديث (٧١٢٣)

[3] صحیح البخاري، رقم الحديث (٦٥٣٥) صحیح مسلم، رقم الحديث (١٠٦٨)

[4] صحیح البخاري، رقم الحديث (٦٥٣٣)

[5] صحیح مسلم، رقم الحديث (١٠٦٧)

[6] رافع بن عمرو کی روایت نہیں ملی۔

[7] سنن النسائي، رقم الحديث (٤١٠٣) السلسلة الصحيحة (٢٤٠٦)

یہ سارے معانی اور علامتیں ان لوگوں میں موجود تھیں جن سے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے لڑائی لڑی تھی، اگر ہم کہیں: ''حضرت علی رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے خوارج سے لڑائی لڑی تھی۔'' تو یہ ایسے ہی ہے جیسے یہ کہا جائے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کافروں سے لڑائی لڑی، یعنی جنسِ کفار سے لڑائی لڑی، گو کفر کی متعدد انواع ہیں، اسی طرح شرک کی بھی مختلف انواع ہیں، اگرچہ ہندوستان اور چین کے مشرک ان بتوں کی پوجا نہیں کرتے جن کی پوجا مشرکینِ مکہ کیا کرتے تھے، مگر لفظِ شرک اور اس کا مفہوم ان پر پورا اترتا ہے۔

اسی طرح خروج اور مروق (دین سے علاحدہ ہو جانا) ہر اس شخص پر صادق آتا ہے جس میں ان لوگوں کی خصوصیات اور علامتیں پائی جاتی ہیں اور ان سے بھی اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے جہاد و قتال کرنا فرض ہے جس طرح پہلے خوارج سے لڑنا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے فرض ہوا، گو دین اور اسلام سے خروج کی انواع مختلف ہیں اور یہ ہم بیان کر آئے ہیں کہ روافض کا خروج اور مروق خوارج کے خروج سے بہت زیادہ ہے۔

اب یہ بات ہے کہ حروری یا رافضی جیسے کسی ایک خارجی کو قتل کرنا کہ جس کو قتل کرنا مقدور ہو جائز ہے یا ناجائز؟

اس میں فقہا کے دو اقوال ہیں، وہ دونوں امام احمد سے مروی ہیں۔ صحیح یہ ہے کہ ایک کو قتل کرنا بھی جائز ہے، مثلاً: جو اپنے مذہب کی دعوت دیتا ہے، یا اس طرح کا کام کرتا ہے جو فساد پر مبنی ہو، کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم انھیں جہاں پاؤ قتل کر دو۔''[1] اور فرمایا: ''اگر میں نے ان کو پا لیا تو ان کو قتلِ عاد کی طرح قتل کروں گا۔''[2] حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صبیغ بن عسل سے کہا تھا: اگر میں نے تجھے سر منڈوائے ہوئے دیکھا تو تمھاری کھوپڑی اڑا دوں گا۔'' حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جب پہلے رافضی عبداللہ بن سبا کو قتل کرنے کے لیے طلب کیا تو وہ بھاگ گیا، نیز یہ لوگ زمین پر سب سے بڑے فسادی ہیں۔ اگر ان کا فساد ان کو قتل کیے بنا نہ رک سکتا ہو تو ان کو قتل کر دینا چاہیے۔ ان میں سے ہر ایک کو قتل کرنا ضروری نہیں۔ اگر وہ اس قول اور نظریے کا اظہار نہ کرے، یا اس کو قتل کرنے میں کوئی راجح مفسدت اور خرابی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتداءً اس خارجی کو قتل نہ کیا، تاکہ لوگ یہ نہ کہنا شروع کر دیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ہی ساتھیوں کو قتل کرتا ہے۔ اس وقت اس میں کوئی عام فساد بھی نہیں تھا، اس لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی شروع میں جب ان کا ظہور ہوا تو ان کو قتل نہ کیا، کیوں کہ وہ بہت زیادہ تھے اور ظاہری طور پر جماعت مسلمین اور اطاعتِ خلیفہ کے ماتحت تھے۔ انھوں نے اہلِ جماعت سے لڑائی نہ کی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سامنے یہ بھی ابھی واضح نہیں تھا کہ یہ وہی ہیں۔

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٣٤١٤) صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٠٦٤)

[2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٣١٦٦) صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٠٦٤)

جہاں تک ان کی تکفیر اور مخلد فی النار ہونے کا مسئلہ ہے تو اس میں بھی دو مشہور اقوال ہیں اور وہ دونوں امام احمد سے روایت ہیں۔ صحیح یہ ہے کہ ان کے اقوال و نظریات جن کے متعلق یقینی طور پر رسول اللہ ﷺ کی پیش کردہ تعلیمات و عقائد کے خلاف ہونا معلوم ہے، کفریہ ہیں۔ اسی طرح ان کے افعال بھی کفریہ افعال کی جنس سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس کے دلائل میں نے کسی دوسری جگہ بیان کیے ہیں، لیکن ان میں سے کسی شخص کو متعین و مخصوص کر کے اس کی تکفیر کرنا اور اس کو ابدی جہنمی قرار دینا اس شخص میں شروطِ تکفیر کے وجود اور موانع کے عدمِ وجود پر موقوف ہے، ہم وعد و وعید اور تکفیر و تفسیق کی نصوص کی روشنی میں مطلقاً تو کہہ سکتے ہیں، مگر ان تمام نصوص میں کسی مخصوص فرد کو شامل کرنے کا فیصلہ اس وقت تک نہیں دے سکتے جب تک اس مخصوص شخص کے اندر وہ تمام شروط اور وہ بھی کسی معارض کے بغیر نہ پائی جائیں۔ میں نے ''قاعدۂ تکفیر'' میں اس کا شرح و بسط سے ذکر کیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے تو اس شخص پر بھی کفر کا حکم نہیں لگایا جس نے کہا تھا: ''جب میں مر جاؤں تو مجھے جلا کر میری راکھ سمندر میں بہا دینا۔ اللہ کی قسم! اگر اللہ مجھ پر قادر ہوا تو وہ مجھے عذاب دے گا جو اس نے دنیا جہان میں کسی کو نہ دیا ہوگا۔''[1] حالانکہ یہ شخص اللہ کی قدرت اور دوبارہ لوٹانے پر قادر ہونے میں متشکک تھا۔

بنا بریں علما کسی ایسے شخص کو کافر نہیں کہتے جو نیا نیا مسلمان ہو، یہ کسی دور دراز کی بستی میں پلا بڑھا ہو اور محرمات میں سے کسی چیز کو حلال قرار دے، کیوں کہ کفر کا حکم اس وقت نہیں لگایا جا سکتا جب تک رسالت اور اسلام کا پیغام نہ پہنچ جائے۔ ہو سکتا ہے کہ ان میں سے اکثر لوگوں تک وہ نصوص ہی نہ پہنچی ہوں جو ان کی رائے کے خلاف ہوں اور ان کو علم ہی نہ ہو کہ رسول اللہ ﷺ کو یہ دے کر مبعوث کیا گیا ہے۔ لہٰذا مطلقاً کہا جائے گا کہ یہ کفریہ قول ہے اور صرف اس کی تکفیر کی جائے گی، جس پر وہ حجتِ تکفیر قائم ہو جائے، دوسرے کی نہیں۔ واللہ أعلم[2]

مسلمانوں کو تباہ کرنے والے کلمہ گو تاتاریوں کا حکم

سوال فقہائے کرام اور ائمہ دین ان تاتاریوں سے متعلق کیا رائے رکھتے ہیں جنھوں نے ۶۹۹ھ کو یلغار کی اور مسلمانوں کو قتل کیا، کچھ بچوں کو قیدی بنایا، مال لوٹا، مسلمانوں کو ذلیل کر کے اور مساجد کی توہین کر کے مسلمانوں کی حرمت پامال کی، بالخصوص بیت المقدس میں فساد مچایا، بیت المال کے خزانے چھین لیے اور بے شمار مسلمانوں کو بے گھر کیا۔ ان تمام تباہ کاریوں کے باوجود وہ کلمہ توحید کو اختیار کرنے اور اپنے آپ کو اصل اسلام کے پیروکار قرار دیتے ہوئے اپنے لڑاکوں سے لڑنے کے حرام ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور اپنے تئیں مسلمانوں

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۷۰۶۷) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۲۷۵۶)

[2] مجموع الفتاویٰ (۲۸/ ۴۸۸۔۱۰۵)

کے استیصال اور بیخ کنی سے اجتناب کا دعویٰ بھی کرتے ہیں۔ کیا ان سے لڑنا جائز ہے یا واجب؟ اگر جائز یا واجب ہے تو کن وجوہ سے؟

جواب الحمد لله. جو گروہ بھی خواہ وہ اس قوم سے تعلق رکھتا ہو یا کسی دوسری قوم سے، اگر اسلام کے کسی بھی ظاہر اور متواتر حکم کو ادا کرنے سے انکار کر دے تو ان سے اس وقت تک لڑنا واجب اور ضروری ہو جاتا ہے جب تک اس کے پابند نہ ہو جائیں، گو وہ اللہ کی توحید، رسول اللہ ﷺ کی رسالت کا اقرار کرتے ہوں اور کچھ احکام کے پابند بھی ہوں، جس طرح حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے زکات دینے سے انکار کرنے والوں سے جنگ کی تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے اس موضوع پر مباحثہ کرنے کے بعد تمام فقہا کا اسی پر اتفاق ہے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی کتاب وسنت پر عمل کرتے ہوئے اسلام کے حقوق کے لیے لڑائی لڑنے پر اتفاق کیا تھا۔

خوارج سے متعلق حدیث دس طرق سے ثابت ہے، آپ ﷺ نے ان کو بدترین لوگ قرار دیا ہے، حالانکہ آپ ﷺ نے ان سے متعلق یہ بھی فرمایا ہے: ''ان کی نمازوں اور روزوں کے سامنے تم اپنی نمازوں اور روزوں کو حقیر سمجھو گے۔''[1] اس سے معلوم ہوا کہ اسلام کے احکام کی پابندی کے بغیر محض اسلام سے تمسک قتال کو ساقط نہیں کرتا۔ قتال اس وقت تک واجب ہے جب تک سارے کا سارا دین اللہ کے لیے نہ ہو جائے اور فتنہ مٹ جائے۔ جب دین غیر اللہ کے لیے ہوگا تو قتال واجب ہوگا۔ پس جو گروہ بعض فرض نمازوں کو ادا کرنے یا روزے رکھنے یا حج کرنے سے انکار کر دے، یا مسلمانوں کے خون اور مال کی حرمت، یا شراب نوشی، زنا کاری، جوئے بازی اور محارم سے نکاح جیسے کی حرمت کے التزام سے، یا کافروں کے خلاف جہاد کرنے، یا اہلِ کتاب پر جذیہ عائد کرنے جیسے دین کے واجبات اور محرمات کے التزام سے انکار کر دیتا ہے، جن کے انکار کا کسی کے پاس کوئی عذر نہیں ہوتا اور جن کے وجوب کا انکار کرنے والا کافر ہو جاتا ہے تو ایسے گروہ سے لڑا جائے گا گو وہ ان کا اقرار کرتا ہو، اس مسئلے میں مجھے علما کا اختلاف معلوم نہیں۔ ایسے انکار کرنے والے گروہ کے متعلق اختلاف ہے جو فجر کی سنتوں، اذان واقامت (ان کے نزدیک جو ان کے وجوب کا قائل ہے) اور ان جیسے بعض دینی شعائر کے ترک پر اصرار کرتا ہے، آیا اس کے خلاف لڑا جائے گا یا نہیں؟ مگر مذکورہ واجبات اور محرمات وغیرہ کو ادا کرنے سے انکار کرنے والے کے خلاف لڑنے میں کوئی اختلاف نہیں۔

یہ لوگ محقق علما کے نزدیک امامِ وقت کے خلاف خروج کرنے والے یا اس کی فرمانبرداری اور بیعت سے انکار کرنے والے باغیوں کے قائم مقام نہیں، جیسے اہلِ شام نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ یہ رویہ اپنایا تھا۔ وہ لوگ متعین اور مخصوص امام کی فرمانبرداری کرنے سے انکار کرتے ہیں یا اس کی امارت ختم کرنے کے لیے اس کے خلاف بغاوت

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٧٧١) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٦٤)

کرنے والے ہیں، مگر یہ مذکورہ لوگ تو زکات نہ دینے والوں اور ان خوارج کی طرح، جن سے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جنگ کی تھی، دائرۂ اسلام سے خارج ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اہلِ بصرہ، اہلِ شام اور اہلِ نہروان سے لڑنے کے متعلق حضرت علی رضی اللہ عنہ کا موقف اختلاف کا شکار تھا۔ اہلِ بصرہ اور اہلِ شام کے ساتھ ان کا رویہ بھائی کا بھائی کے ساتھ رویے جیسا تھا، مگر خوارج کے ساتھ ان کا رویہ بالکل عکس اور واضح تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث اور فرامین کی روشنی میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زکات نہ دینے والوں کے خلاف جنگ کے فیصلے اور خوارج سے لڑنے پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اجماع ہو چکا تھا، مگر اہلِ شام اور بصرہ کے ساتھ رونما ہونے والے فتنے کے برخلاف کہ وہاں نصوص کا جو مدلول تھا وہ تو تھا ہی پر وہاں صحابہ اور تابعین نے اختلاف کیا تھا۔ کچھ ائمہ فقہا کی رائے ہے کہ وہ اہلِ بغاوت جن سے لڑنا ضروری ہو جاتا ہے یہ وہ ہیں جو کسی سائغ اور جائز تاویل کی بنا پر امام کے خلاف خروج کریں۔ وہ نہیں جو اس کی فرمانبرداری سے خارج ہو جائیں، جب کہ دوسرے کچھ فقہا دونوں قسموں کو باغی قرار دیتے ہیں۔ تاہم باغیوں اور تاتاریوں کے درمیان فرق واضح ہے جو لوگ اسلام کے ظاہر اور متواتر احکام کا التزام اور پابندی نہیں کرتے، میرے علم کے مطابق ان سے لڑنے کے وجوب میں کوئی اختلاف نہیں۔

یہ قاعدہ طے ہو جانے کے بعد اس قوم کی طرف آتے ہیں جن سے متعلق سوال کیا گیا ہے۔ ان کی فوج دو طرح کے لوگوں پر مشتمل ہوتی ہے: ایک کافر جن میں عیسائی اور مشرک ہیں اور دوسرے اسلام سے نسبت رکھنے والے، اُن کی تعداد زیادہ ہے۔ اگر ان سے کلمہ سنا جائے تو سناتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم کرتے ہیں۔ ان میں سے بہت کم ہیں جو نماز پڑھتے ہیں۔ البتہ روزے رکھنے والے نماز پڑھنے والوں سے زیادہ ہیں۔ ان کے نزدیک مسلمان دوسروں کی نسبت زیادہ عظیم ہے۔ یہ مسلمان بزرگوں کی عزت و احترام بھی کرتے ہیں۔ ان لوگوں کے پاس کچھ نہ کچھ اسلام موجود ہے، تاہم یہ اس میں متفاوت ہیں، مگر ان کے عام لوگ جس موقف کے حامل ہیں اور جس مقصد کے لیے لڑتے ہیں۔ وہ اسلام کے بہت سے یا اکثر احکام کے ترک پر مشتمل ہے، کیوں کہ یہ اسلام کو ضروری قرار نہیں دیتے اور نہ تارکِ اسلام کے خلاف لڑتے ہی ہیں، بلکہ جو مغلوں کی حکومت اور حمایت کے لیے لڑے، وہ ان کے لیے بہت معزز اور معظم ہوتا ہے، خواہ وہ کافر اور اللہ اور اس کے رسول کا دشمن ہی ہو اور جو شخص مغل حکومت کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرے اور خروج کرے، اس سے لڑنا حلال سمجھتے ہیں، خواہ وہ بہترین مسلمان ہی کیوں نہ ہوں۔ یہ کافروں سے جہاد نہیں کرتے۔ اہلِ کتاب پر جزیہ اور ذلت عائد نہیں کرتے اور اپنی فوج میں کسی کو بھی کسی بھی چیز کی پوجا کرنے سے نہیں روکتے، وہ چاہے سورج کی پوجا کرے یا چاند کی یا کسی اور چیز کی، بلکہ ان کے رویے سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمان ان کے نزدیک مسلمانوں میں عادل، نیک، آدمی یا عبادت گزار شخص کی طرح ہے اور کافر اُن کے نزدیک

مسلمانوں میں فاسق یا نیکیوں کے تارک کی طرح ہے۔ اسی طرح ان کے عام لوگ مسلمانوں کے خون اور مال کی حرمت کے قائل بھی نہیں، سوائے اس کے کہ ان کا سلطان ان کو اس سے روکے، یعنی ان کے مال اور خون پر ہاتھ صاف کرنے سے از خود نہیں رکتے۔ اگر کوئی ان کو اس سے یا کسی دوسرے کام سے روکے تو اس کو فرمانِ شاہی سمجھتے ہوئے اس پر عمل کرتے ہیں، محض دین کی وجہ سے اس پر عمل نہیں کرتے۔

ان کے عام لوگ نماز، زکات اور حج جیسے فرائض پر عمل بھی نہیں کرتے اپنے فیصلوں کے لیے اللہ کی شریعت سے رجوع نہیں کرتے، بلکہ اپنے وضعی قوانین سے رجوع کرتے ہیں، جو کبھی اسلام کے مطابق ہوتے ہیں اور کبھی خلاف۔ صرف تیز برون اسلامی احکام کا پابند تھا۔ اسی نے ان اسلامی احکام کا پرچار کیا جو لوگوں میں مشہور ہوئے، لیکن یہ باقی لوگ اسلام میں داخل تو ہوئے مگر انھوں نے اسلامی احکام کی پابندی نہیں کی۔ اس قسم کے لوگوں سے لڑنا بالاجماع واجب اور ضروری ہے۔ جو دینِ اسلام کو اچھی طرح جانتا ہے اور ان لوگوں کی حقیقت سے بھی آگاہ ہے، وہ کبھی اس میں شک نہیں کرے گا۔ یہ جس اسلام پر ہیں وہ اور دینِ اسلام کبھی اکٹھے نہیں ہو سکتے، اگر کردی، اعرابی اور دیگر دیہاتی جو اسلامی احکام کی پابندی نہیں کرتے، ان سے لڑنا فرض ہو جاتا ہے، گو ان کا شر شہروں کے باسیوں تک نہ بھی پہنچے تو ان سے لڑنا کیونکر ضروری نہیں ہوگا؟! البتہ ان سے لڑائی کرتے وقت شریعت کے طریقے کی پابندی کرنا ضروری ہے، جس کے مطابق انھیں پہلے اسلامی احکام کی پابندی کرنے کی دعوت دی جائے گی اگر اسلامی احکام کی پابندی کرنے کی دعوت ان تک نہ پہنچی ہو جس طرح حربی کافر کو پہلے اسلام قبول کرنے کی دعوت دی جاتی ہے اگر اس تک اسلامی دعوت نہ پہنچی ہو۔

اگر کسی کو ان سے اس کامل طور پر لڑنے کا اتفاق ہو جس کا مقصد اللہ کی رضا کا حصول، اس کے کلمے کو بلند اور معزز کرنا اس کا دین قائم کرنا اور اس کے رسول کی فرمانبرداری ہے، اور یہی اصل مقصود ہے گو ان میں فاسق اور ریاست کی خاطر یا بعض معاملات میں ان پر زیادتی کرنے کی وجہ سے لڑنے والے بدنیت ہی ہوں اور اس کیفیت میں ان سے لڑائی نہ کرنے کی مفسدت دین کے لیے ان سے لڑنے کی مفسدت سے زیادہ خطرناک ہو تو ایسی صورت میں دو مفسدتوں میں سے بڑی مفسدت کو ختم کرنے کے لیے چھوٹی کا ارتکاب کرنے کی علت کی بنا پر بھی ان سے لڑنا واجب ٹھہرتا ہے۔ یہ ایک اسلامی قاعدہ ہے جس کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے۔ اس لیے اہلِ سنت و الجماعت کا یہ قاعدہ ہے کہ ہر فاجر اور نیک کے ساتھ مل کر جنگ کرنا، کیوں کہ اللہ فاجر شخص اور بد اخلاق اقوام کے ساتھ بھی اس دین کی تائید و نصرت کرتا ہے، جس طرح رسول اللہ ﷺ نے بتایا ہے، کیوں کہ انسان جب فاجر امرا یا ایسی فوج کے ساتھ لڑنے پر مجبور ہو جس میں فاجر زیادہ ہوں تو اس کے پاس صرف دو اختیارات رہتے ہیں یا ان کے ساتھ مل کر نہ لڑے اور دوسرے لوگ جو دین اور دنیا کے لیے زیادہ خطرناک اور نقصان دہ ہوں، غالب آ جائیں، یا فاجر اور بدکار

امیر کے ساتھ مل کر لڑے اور دو فاجروں میں سے بڑے فاجر کا راستہ روک دے اور مکمل اسلام نہیں تو اکثر احکامِ اسلام کو قائم کر سکے۔ اس صورت میں اور اس سے ملتی جلتی تمام صورتوں میں یہی واجب ٹھہرتا ہے، بلکہ خلفائے راشدین کے بعد ہونے والی اکثر جنگوں میں یہی صورت تھی۔

رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''گھوڑوں کی پیشانیوں میں قیامت تک اجر اور غنیمت کی دو صورتوں میں خیر باندھ دی گئی ہے۔''[1] یہ صحیح حدیث اس دوسری حدیث کے مفہوم پر دلالت کرتی ہے جس میں ہے: ''جس دن اللہ نے مجھے مبعوث کیا، اس دن سے لے کر میری امت کے آخری شخص کے دجال سے لڑائی کرنے تک غزوہ اور لڑائی جاری رہے گی، اس کو کسی ظالم کا ظلم معطل نہیں کر سکے گا نہ کسی عادل کا عدل ہی۔''[2] مشہور حدیث ہے: ''میری امت کا ایک گروہ حق پر ظاہر رہے گا، قیامت تک ان کی مخالفت کرنے والا ان کو نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔''[3]

یہ اور اس طرح کی کئی نصوص ہیں جن کو بنیاد بنا کر رافضہ اور خوارج کے علاوہ اہلِ سنت کے تمام فرقے (کیوں کہ یہ اہلِ سنت ہیں) اچھے یا برے امرا کی معصیت میں ان لوگوں کے خلاف جہاد کرتے ہیں جن سے جہاد کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ رسول اللہ ﷺ نے یہ پیشین گوئی بھی فرمائی ہے: ''لوگ ظالم، بددیانت اور بدکار امرا کے ساتھ آزمائے جائیں گے، جس نے ان کے جھوٹ کی تصدیق کی اور ان کی اعانت کی وہ نہ مجھ سے ہے نہ میں اس سے، وہ میرے پاس حوض پر بھی وارد نہیں ہوگا، جس نے ان کے جھوٹ کی تصدیق نہ کی اور ان کے ظلم پر ان کی اعانت نہ کی، وہ مجھ سے ہے اور میں اس سے، اور وہ عن قریب میرے پاس حوض پر وارد ہوگا۔''[4]

اگر انسان کو قیامت تک جہاد کرنے والے امرا سے متعلق رسول اللہ ﷺ کے احکام وفرامین یاد ہوں اور یہ یاد ہو کہ ان کے ظلم پر ان کی اعانت نہیں کرنی تو اس کو معلوم ہو جائے گا کہ بہترین طریقہ وہ ہی ہے جو خالص اسلام کا ہے، جس کے مطابق ہر اس امیر اور گروہ کی معیت میں جو اسلام کے زیادہ قریب ہو اور جہاد کی یہی ایک صورت ہو تو ہر ایسے گروہ کے خلاف جہاد کیا جائے گا جو اس کا حق رکھتا ہے، جس طرح یہ قوم ہے جس کے متعلق فتویٰ پوچھا گیا ہے، جو گروہ ان سے لڑ رہا ہو، کسی بھی نافرمانی میں ان کی اعانت سے اجتناب کیا جائے گا، صرف اللہ کی اطاعت میں ان کی اطاعت کی جائے گی اور اللہ کی نافرمانی کے کاموں میں اس گروہ کی فرمانبرداری نہیں کی جائے گی، کیوں کہ

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٦٩٧)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٥٣٢) ضعيف الجامع، رقم الحديث (٢٥٣١)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧١) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٩٢٠)

[4] مسند أحمد (٣٨٤/٥) سنن النسائي، رقم الحديث (٤٢٠٨) شیخ البانی رحمہ اللہ نے اسے صحیح کہا ہے۔

خالق کی نافرمانی میں مخلوق کی فرمانبرداری کرنا جائز نہیں۔ اس امت کے قدیم و جدید بہترین افراد کا یہی طریقہ اور انداز رہا ہے۔ یہی ہر مکلف پر واجب ہے اور یہی حروریہ (خوارج) اور ان جیسے کم علمی کی بنا پر فاسد پرہیزگاری کے مسلک کے پیروکاروں اور مرجہ جیسے امرا کی اندھا دھند پیروی کرنے والوں کے، خواہ وہ بدکار ہوں، مذہب کے مابین مسلکِ اعتدال ہے۔ اللہ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اور ہمارے مسلمان بھائیوں کو ایسے اقوال و افعال کی توفیق دے جو اس کو پسند ہیں۔ والله أعلم، وصلى الله وسلم على نبينا محمد، وآله وصحبه وسلم.[1]

شراب نوش اور حرام خور کلمہ گو کا حکم

سوال شراب نوش اور حرام خور کلمہ گو مسلمان ہے یا نہیں؟

جواب اگر وہ ظاہر اور باطن میں کلمے کا اقرار کرتا ہے تو اس کی شراب نوشی اور حرام خوری کا گناہ اس کو اسلام سے اور تمام ایمان سے کلیتاً خارج کرنے والا نہیں، بلکہ صحابہ، تابعین اور ائمہ اربعہ وغیرہم کا مذہب ہے کہ جس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان ہوا وہ آگ میں ہمیشہ نہیں رہے گا۔ جو اللہ کی توحید اور محمد رسول اللہ ﷺ کی رسالت کا اقرار کرتا ہے وہ محض معصیت اور گناہ کی وجہ سے کافر نہیں ہو جاتا، البتہ خوارج اور معتزلہ کا عقیدہ ہے کہ کبیرہ گناہ کرنے والے کے پاس ایمان اور اسلام میں سے کوئی چیز نہیں ہوتی، یہ عقیدہ کتاب و سنت اور اجماعِ اسلافِ امت کے خلاف ہے۔

لیکن یہ (نافرمان) اگر گروہ کی شکل اختیار کر کے اسلامی احکام کی پابندی سے انکار کر دیں تو ان سے لڑا جائے گا، تاوقتیکہ یہ اسلام کے احکام و شرائع کی پابندی اختیار کر لیں، فردِ واحد ایک پر ممکن حد تک شرعی حدود نافذ کی جائیں، ورنہ ایک مومن اپنی بساط کے مطابق جو کر سکتا ہے کرے، جس طرح رسول اللہ ﷺ نے راہنمائی فرمائی ہے: ''جو تم میں سے کوئی برائی دیکھے تو اس کو اپنے ہاتھ سے تبدیل کرے۔ اگر اس کی استطاعت نہ رکھتا ہو تو اپنی زبان سے روکے۔ اگر اس کی استطاعت بھی نہ رکھتا ہو تو اپنے دل سے برا جانے اور یہ کمزور ترین ایمان ہے۔''[2]

ایسے مالوں کا حکم جن کے مستحق نامعلوم ہوں

سوال وہ اموال جن کے مستحق بالکل نامعلوم ہوں یا ان پر ابہام کا پردہ پڑا ہو، ان کا کیا جائے؟

جواب اس طرح کے اموال مفادِ عامہ میں استعمال ہوں گے، کیوں کہ بسا اوقات لوگوں کے ہاتھ مال لگتا ہے اور

---

① مجموع الفتاویٰ (۲۸/۵۰۱_۵۰۸)

② صحیح مسلم، رقم الحدیث (۴۹) جامع المسائل (۱۰_۱۱)

انھیں علم ہوتا ہے کہ یہ دوسرے کا حق ہے، اس لیے ان کے لیے حرام ہے، خواہ وہ لوٹ، چوری یا خیانت کی صورت میں ظلماً لیا جائے یا سود اور جوئے جیسے کسی فاسد عقد کے نتیجے میں کمایا جائے اور اس کا عین مستحق نہ معلوم ہو۔

اس کے متعلق امام احمد، امام ابو حنیفہ، مالک اور عام سلف کا یہ مذہب ہے کہ یہ اس کو دیا جائے جو اس کا سب سے زیادہ اہل اور قریبی ہو۔ امام شافعی کا مذہب ہے کہ اس کو محفوظ کر لیا جائے اور خرچ نہ کیا جائے، تا آنکہ اس کا مالک سامنے آ جائے۔

جس مال کا مالک نہ معلوم ہو، اس کے متعلق احمد اور ابو حنیفہ کا مذہب ہے کہ اس کو اس کے مالک کی طرف سے مفادِ عامہ میں صرف کر دیا جائے، مثلاً فقیروں پر صدقہ کرنا۔

کون سا مال حرام ہے اور کون سا حرام نہیں، اس کے متعلق شریعت کا ایک قاعدہ ہے جس کی تفصیل اس طرح ہے کہ محرمات کی دو اقسام ہیں: ایک وہ جس کا وجود ہی حرام ہو، جیسے: خون، مردار جیسی نجاستیں، اس کو محرم بعینہ کہا جاتا ہے اور دوسری محرم لحق الغیر، یعنی دوسرے کا حق ہونے کی وجہ سے حرام۔ یہ وہ چیزیں ہیں جو کھانے، پینے، پہننے، رہنے، سواری اور پیسوں جیسی مباح اور جائز چیزوں سے تعلق رکھتی ہیں، ان سب کی تحریم کا سبب ظلم ہے، چنانچہ یہ ان دو اسباب کی بنا پر حرام ہیں:

1. مالک کی مرضی و رضا مندی کے بغیر اس کو لینا، یہ بڑا ظلم ہے، مثلاً: چوری، خیانت اور لوٹ وغیرہ۔
2. شارع علیہ السلام کی اجازت کے بغیر لینا، چاہے مالک اجازت بھی دے دے، مثلاً سود اور جوئے جیسے حرام کاروبار اور معاہدے۔ جس شخص کے ہاتھ اس طرح کا مال لگے، اس کا فرض بنتا ہے کہ وہ اس کو اس کے اصل مالک و مستحق تک پہنچائے۔ اگر یہ ناممکن ہو تو نامعلوم معدوم کی طرح ہوتا ہے۔ کوئی گم شدہ چیز ملنے کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے بھی یہ بات ثابت ہوتی ہے:

"اگر اس کا مالک مل جائے تو اس کو لوٹا دیا جائے، ورنہ وہ اللہ کا مال ہے، جسے چاہے دے۔"[1]

اسی طرح اہلِ اسلام کا اتفاق ہے کہ اگر کوئی شخص فوت ہو جائے اور اس کا کوئی وارث معلوم نہ ہو تو وہ مسلمانوں کے مصالح اور مفاد میں صرف کر دیا جائے، حالانکہ زیادہ تر لوگوں کے متعلق یہ گمان ہوتا ہے کہ ان کا کوئی نہ کوئی دور دراز کا عصبہ وارث موجود ہو گا، مگر وہ جب معلوم نہیں اور اس کی پہچان کی امید بھی نہیں تو اس کو معدوم کے مانند قرار دے دیا گیا، مال کی یہ نوع اس لیے حرام ہے کہ وہ کسی دوسرے کا حق ہوتی ہے۔ اب اگر وہ دوسرا معدوم ہو یا نامعلوم اور رسائی سے باہر تو اس مال کے ساتھ اس کا جو حق وابستہ تھا وہ ساقط ہو جائے گا۔ اب جب یقین ہو جائے

---

[1] مسند أحمد (٨٠/٥) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٥٠٥) صحيح الجامع، رقم الحديث (٦٤٦٢)

کہ اس مال کو اس دوسرے تک پہنچانا ممکن نہیں تو اس کو مفادِ عامہ اور جہاد وغیرہ میں صرف کرنا اس کو ظالموں کے ہاتھ میں رہنے دینے سے زیادہ بہتر ہے۔

یہ مال تین صورتوں سے خالی نہیں ہوگا: یا اسے ضائع کر دیا جائے، یا جامد کر دیا جائے، یا خرچ کر دیا جائے۔

مال کو تلف اور ضائع کرنا اس کو خراب کرنا ہے اور اللہ خرابی پسند نہیں کرتا، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی مال ضائع کرنے سے منع کیا ہے۔

اس کو نامعلوم انتظار کی بھینٹ چڑھاتے ہوئے دائمی طور پر جامد کر دینا کہ جب اس کے مالک کی پہچان کی کوئی امید باقی نہ ہو اور اس کو اس تک پہنچانے کی قدرت بھی نہ ہو تو یہ بھی اس کو ضائع کرنے کے مترادف ہے، کیوں کہ اس میں دو خرابیاں ہیں: ایک یہ کہ لوگوں کو جس کی ضرورت ہے ان کو اس سے فائدہ نہ اٹھانے دینا اور دوسری یہ کہ ایسے اموال عموماً ظالموں کے ہاتھ لگ جاتے ہیں اور وہ ان کو اپنی مرضی کے مطابق استعمال کرتے ہیں۔ اگر اہلِ انصاف اس کو خرچ نہ کریں تو اس کو روکے رکھنا، گویا ایسے ظالموں کی معاونت کرنا ہے۔ اگر ایسے مال کو ضائع کرنا حرام ہے اور روکے رکھنا اس سے بھی زیادہ خطرناک ہے تو معلوم ہوا کہ اس کو خرچ کر دینا چاہیے، لیکن اس کا کوئی مخصوص مصرف نہیں، نیکی اور اچھائی کے تمام کاموں میں صرف کیا جا سکتا ہے، کیوں کہ اللہ نے لوگوں کو اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے اور ان کے لیے مال اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ اس کی عبادت میں اس سے معاونت حاصل کریں۔ واللہ أعلم [1]

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۲۸/۵۹۲-۵۹۷)

خرید وفروخت

چھلکے بند اجناس اور زمین دوز سبزیوں کی خرید وفروخت کا حکم

سوال بادام، اناس، پستے، بندق، مونگ پھلی اور چنے جیسی چھلکا بند اجناس ومغزیات اور شلجم، گاجر اور اروی وغیرہ جیسی زمین میں دبائی ہوئی سبزیوں کی فروخت جائز ہے یا ناجائز؟

جواب الحمد للہ. امام شافعی کے مذہب کے مطابق ان اشیا کی خرید وفروخت جائز نہیں، لیکن جمہور فقہا کی رائے اس کے برعکس ہے اور وہی صحیح ہے۔ امام شافعی سے بھی ایک قول مروی ہے کہ انھوں نے اپنے مرض الموت میں سبز لوبیا خریدا۔ رسول اللہ ﷺ، صحابہ کرام اور تابعین کے زمانے سے تمام شہروں اور زمانوں میں اسی پر عمل رہا ہے۔

''رسول اللہ ﷺ نے دانے کی بیع اور انگور کی بیع سے بھی اس وقت تک منع کیا ہے، جب تک دانہ پک نہ جائے اور انگور پک کر سیاہ نہ ہو جائے۔''[1]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جب دانہ پک جائے، اس وقت اس کی بیع جائز ہوتی ہے، چاہے وہ ابھی سٹے ہی میں ہو۔ اس بنا پر جس نے لوبیے کی چھلکے میں بیع سے منع کیا ہے، صحیح نہیں، بلکہ طرسوی وغیرہ نے اس کو بدعت کہا ہے، کیوں کہ سلف میں سے کسی سے اس کی ممانعت منقول نہیں۔

جو حضرات ان اشیا کی بیع سے منع کرتے ہیں، ان کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بیع غرر سے منع کیا ہے۔ اور وہ ان اشیا کو مجہول اور نامعلوم سمجھتے ہیں، لیکن اس طرح نہیں۔ یہ اشیا اسی طرح پہچانی جاتی ہیں جس طرح وہ دوسری قابلِ فروخت اشیا جن کا [illegible] اور نمونہ دیکھ کر یا جزو دیکھ کر کل پر استدلال کیا جاتا ہے۔

اسی طرح امام شافعی کا مشہور مذہب ہے کہ عقود، یعنی معاہدوں میں صیغوں، یعنی مخصوص الفاظِ ایجاب وقبول کا بولنا ضروری ہے، لہٰذا بیع معاطاۃ (پیسے دو چیز لو) درست نہیں، لیکن جمہور فقہا اس کے مخالف ہیں۔ امام مالک کا مذہب ہے کہ ہر وہ طریقہ جس کو لوگ بیع شمار کریں، وہ بیع ہوتی ہے، لہٰذا تھوڑے زیادہ سب میں بیع معاطاۃ جائز ہے۔ حنبلی ظاہر مذہب

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٣٧١) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٢٢٨) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٢١٧) شیخ البانی رحمہ اللہ نے إرواء الغلیل (٥/٢١١) میں اسے صحیح کہا ہے۔

بھی یہی ہے۔ حنفی مذہب میں بیع معاطاۃ معمولی چیزوں میں جائز ہے، کچھ شافعی علما کا موقف بھی یہی ہے۔ نیز عقود میں عرف کو دیکھا جاتا ہے۔ جس معاملے کو لوگ بیع یا اجارہ یا ہبہ قرار دیں وہ بیع یا اجارہ یا ہبہ ہوگا، کیوں کہ ان اسما کی کوئی لغوی اور شرعی تعریف نہیں تو ہر وہ اسم جس کی لغوی اور شرعی تعریف نہ ہو، اس کی تعریف میں عرف سے رجوع کیا جاتا ہے۔

وہ چیزیں جنھیں زمین میں دبایا جاتا ہے اور وہ اس میں پوشیدہ ہوتی ہیں، جیسے: گاجر، شلجم اور اروی وغیرہ، ان کی خرید وفروخت امام مالک کے نزدیک جائز ہے اور حنبلی مذہب میں ایک قول ہے۔ حنفی و شافعی مذہب اور معروف حنبلی مذہب میں جائز نہیں، لیکن صحیح ترین قول جواز کا ہے، کیوں کہ ماہرین اور تجربہ کار ان اشیا کے پتوں سے اندازہ لگا لیتے ہیں، نیز لوگوں کو ان اشیا کی بیع کی ضرورت بھی ہوتی ہے اور شارع کسی ایسی چیز کی بیع کو جس کی لوگوں کو ضرورت ہو، محض اس وجہ سے حرام نہیں کرتا کہ اس میں غرر کی ایک نوع یا شائبہ پایا جاتا ہے، بلکہ شریعت اسے مباح کرتی ہے، جس کی ضرورت ہو، جس طرح پھلوں کی پکنے سے پہلے اور کاٹنے تک ان کو باقی رکھنے کی بیع مباح اور جائز رکھی گئی ہے، اگرچہ ابھی تک مبیع یعنی فروخت شدہ چیز کا کچھ حصہ وجود ہی میں نہیں آیا ہوتا۔ اسی طرح پیوند لگائی گئی کھجور کے پھل کی شرط لگانا بھی مشتری کے لیے جائز ہوتا ہے، یہ بھی اس کے پکنے سے پہلے اسے خریدنا ہے، مگر وہ درخت کے تابع ہے۔ بیع عرایا بھی اندازے کے ساتھ جائز ہے، جس میں فروخت کے وقت اندازے کو ماپنے کے قائم مقام قرار دیا جاتا ہے، حالانکہ یہ ربا میں داخل ہے جو بیع غرر سے کہیں زیادہ خطرناک ہے! یہ شریعت کا قاعدہ ہے کہ دو مصلحتیں ہوں تو ان میں اعلیٰ کو حاصل کیا جائے اور ادنیٰ کو چھوڑ دیا جائے، اسی طرح دو مفسدتیں ہوں تو ادنیٰ کو اختیار کر لیا جائے۔ لہٰذا انار، کیلا، بادام اور ناریل وغیرہ کی طرح کی اشیا جن کا چھلکا ان کی حفاظت کے لیے ہوتا ہے اور وہ علاحدہ علاحدہ چھلکے میں ہوتی ہیں، ان کی بیع ائمہ کے اتفاق سے جائز ہے۔[1]

شراب نچوڑنے والے کو انگور بیچنے کا حکم

جواب کیا ایسے شخص کو انگور بیچنا جائز ہے جو ان سے شراب نچوڑتا ہو، نیز اگر انسان مجبور ہو؟

جواب ایسے شخص کو انگور فروخت کرنا جائز نہیں جو انھیں شراب بنانے کے لیے استعمال کرتا ہو، بلکہ رسول اللہ ﷺ نے تو شراب بنانے کے لیے انگور نچوڑنے پر لعنت کی ہے، تو فروخت کرنے والے پر کیوں نہیں جو نچوڑنے سے بڑھ کر اس کی معاونت ہے؟ اس کی کوئی مجبوری نہیں، اگر اس کے لیے انھیں تر حالت میں بیچنا ممکن نہ ہو تو وہ انھیں خشک کر کے منقہ بنا کر یا پھر سرکہ یا شیرہ بنا کر بیچ سکتا ہے۔[2]

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۲۸/۲۲۵۔۲۲۷)

[2] مجموع الفتاویٰ (۲۸/۲۳۶)

پرمٹ کے حامل ذخیرہ اندوز سے خریدنا

سوال ایک شخص کوئی خاص صنف کی چیز فروخت کرنے کے لیے حکومت سے پرمٹ حاصل کرتا ہے، اس علاقے میں وہ صنف صرف اس کے پاس ہو تو کیا اس ذخیرہ اندوز سے اس کو خریدنا جائز ہے؟

جواب اس شخص کو یہ کام دو وجوہات کی بنا پر نہیں کرنا چاہیے:

ایک اس وجہ سے کہ وہ اپنے علاوہ دوسروں کو حلال کاروبار سے روکتا ہے اور دوسرے اس وجہ سے کہ وہ لوگوں کو وہ چیز اپنی دکان سے خریدنے پر مجبور کرتا ہے اور ان سے زیادہ قیمت وصول کر کے ان پر ظلم کرتا ہے۔

اب اس سے جو خریدا جاتا ہے اگر خریدار نے اپنے حلال مال سے خریدا ہے تو وہ خریدنا حرام نہیں، کیوں کہ یہاں مشتری مظلوم ہے اور جو خریدتا ہے وہ گناہ گار نہیں جو اس نے خریدا ہے وہ بائع کے ظلم کی وجہ سے حرام نہیں، اس جیسی صورت میں ظالم پر حرام ہے مظلوم پر نہیں۔ اگر اس شخص کا اصل مال حلال ہو، لیکن اس نے اس کاروبار کے ذریعے نفع کما کر اپنا مال بڑھایا ہو تو اس میں اسی قدر شبہہ پیدا ہو گیا ہے جس قدر لوگوں کا مال شامل ہے، اس کو حرام کہا جا سکتا ہے نہ محض حلال، لیکن اگر حلال غالب ہو تو اس سے خریدنا جائز ہے، مگر نہ خریدنا ہی پرہیزگاری کا تقاضا ہے۔ ملخصاً، واللہ أعلم[1]

ٹیکس زدہ اشیا کی خرید وفروخت اور حرام خور سے معاملے کا حکم

سوال وہ خوردنی اشیا جن پر ٹیکس وصول کیا جاتا ہے اور کوئی ایک شخص ہی ان کو بیچنے کا مجاز ہوتا ہے یا ان کو ذخیرہ کیا جاتا ہے، کیا ان کو خریدنا اور کھانا جائز ہے؟ نیز کسی ایسے شخص سے معاملہ کرنا جس کی آمدنی حرام ہوتی ہے، مثلاً ٹیکس آفیسر، انسان کو فاسق بنا دیتا ہے؟

جواب الحمد للہ. اگر کوئی شخص خوردنی اشیا کا کاروبار کرتا ہے، یا کوئی اور کاروبار کرتا ہے اور حکومت تاجر یا گاہک سے اس پر ٹیکس وصول کرتی ہے تو اس سے وہ سامان اور چیز حرام نہیں ہوتی، اسی طرح اس کو خریدنا بھی حرام نہیں ہوتا، اس میں اصلاً کوئی شبہہ نہیں۔

اسی طرح اگر ٹیکس میں اس چیز سے کچھ وصول کیا جائے، مثلاً اگر غلہ ہو تو اس سے کچھ مقدار لی جائے، یا ذبح شدہ جانور کی باقی ماندہ اشیا۔ اس میں کوئی شبہہ سمجھتا ہے تو وہ غلط ہے، کیوں کہ یہ مال جو بائع یا مشتری سے ظلماً لیا جاتا ہے ضروری نہیں کہ اس سے باقی ماندہ مال شبہے والا ہو جائے، جس طرح اگر کوئی بھی انسان کسی کا مال ظلم کرتے ہوئے

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۲۸/۲۳۸-۲۳۹)

لیتا ہے تو اس سے اس کے باقی بچے ہوئے مال میں شبہہ پیدا نہیں ہوتا۔

یہ ٹیکسز جو کسی شرعی دلیل کے بغیر لگا دیے جاتے ہیں، کچھ تو صرف بائع، یعنی بیچنے والے سے وصول کیے جاتے ہیں، جس طرح جانوروں کی منڈی میں ہوتا ہے۔ جب کوئی شخص اپنا جانور بیچتا ہے تو اس سے کچھ پیسے ظلماً لے لیے جاتے ہیں، اس کا باقی مال حلال ہوتا ہے۔ خریدنے والا اپنے مال سے خریدتا ہے، بسا اوقات اس ٹیکس کی وجہ سے قیمت میں اضافہ کر دیا جاتا ہے اور وہ اضافہ مشتری کو دینا پڑتا ہے تو اس میں کس طرح شبہہ پیدا ہوتا ہے؟ اگر وہ ٹیکس مشتری سے وصول کیا جائے تو اس نے بائع کو قیمت پوری دے دی ہوتی ہے اور اضافہ حکومتی ٹیکس کی وجہ سے ہے۔ اب اس میں بائع اور مشتری دونوں کے مال میں کوئی شبہہ نہیں، کیوں کہ جو فوائد حاصل کیے گئے، قیمت کے بدلے ہی حاصل کیے گئے۔ مشتری نے واجب الادا قیمت کے ساتھ اضافہ بھی ادا کیا۔

حقیقت میں بائع اور مشتری دونوں ہی اس حکومتی ٹیکس سے متاثر ہوتے ہیں اور دونوں ہی مظلوم، اس لیے اس پہلو سے ان کے مال میں شبہہ واقع نہیں ہوتا۔

اگر کوئی انسان کوئی سامان فروخت کرنے کا اکیلا پرمٹ حاصل کر لے اور کوئی دوسرا اس کو فروخت نہ کر سکے تو یہ دو پہلوؤں سے ظالم ہے: ایک اس پہلو سے کہ وہ دوسرے کو بیچنے سے روک دیتا ہے اور دوسرا اس پہلو سے کہ وہ لوگوں سے اپنی مرضی کی قیمت وصول کرتا ہے۔

ٹیکس وصول کرنے والے، سود خور اور مصوری، نجوم اور اس طرح کے حرام پیشوں سے منسلک افراد کے ساتھ معاملات کا جہاں تک تعلق ہے تو اگر ان کا مال حلال وحرام کا مجموعہ ہو تو ان کے ساتھ معاملت کرنے میں شبہہ ہے۔ اس وقت تک تحریم کا حکم نہیں لگایا جا سکتا جب تک یہ معلوم نہ ہو کہ جو وہ دے رہا ہے وہ حرام سے دے رہا ہے، اسی طرح حلت کا حکم بھی اس وقت تک نہیں لگایا جا سکتا، جب تک یہ یقین نہ ہو کہ جو وہ دے رہا ہے، حلال سے دے رہا ہے۔ اگر حلال اغلب ہو تو اس کے ساتھ معاملت پر حرام ہونے کا حکم نہیں لگایا جائے گا، اگر حرام اغلب ہو تو ایک قول ہے کہ اس کے ساتھ معاملہ کرنا حرام ہے اور دوسرا قول ہے کہ حلال ہے۔ سودی معاملات کرنے والے کا وہ مال حلال ہے جو سود سے خالی ہو اور جو سود اس نے زیادہ لیا ہو وہ حرام ہے۔ اگر اس کے مال میں حلال حرام سے مل جائے تو اس کی وجہ سے جو حلال ہے وہ حرام نہیں ہوتا، جس قدر حرام ہو اس کو نکال دیا جائے تو باقی حلال ہو گا۔ ملخصاً، واللّٰہ أعلم.[1]

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۲۸/۲۵۲۔۲۶۳)

شریعت میں محرمات کی اصل:

شریعت میں جو امور حرام کیے گئے ہیں وہ دراصل ظلم کی وجہ سے ہیں، خواہ وہ ظلم اللہ کے حق میں ہو یا بندے کے حق میں یا حقوق العباد میں، حقوق العباد میں ظلم خود بندے کا اپنی جان پر ظلم بھی ہوتا ہے، لیکن اس کے عکس نہیں۔ تمام گناہ بندے کے اپنی جان پر ظلم کے زمرے میں داخل ہیں۔

اس بات کا اعتراف سب سے پہلے ابوالبشر سیدنا آدم علیہ السلام نے کیا، جب انھوں نے اپنے رب سے کلماتِ توبہ سیکھے اور کہا:

﴿ رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴾ [الأعراف: ٢٣]

''اے ہمارے رب! ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا اور اگر تو نے ہمیں نہ بخشا اور ہم پر رحم نہ کیا تو یقیناً ہم ضرور خسارہ پانے والوں سے ہو جائیں گے۔''

ان کلمات میں آدم علیہ السلام نے اپنے گناہ کا اعتراف کیا اور اپنے رب سے مغفرت و رحمت کا اس انداز میں سوال کیا کہ وہ اس کے محتاج ہیں۔ مغفرت کا مطلب ہے برائیوں کا ازالہ اور رحمت کا مطلب ہے بھلائیوں کو اتارنا۔

یہ ان کا اپنی جان پر ظلم تھا، کسی دوسرے پر نہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب اپنے اس فعل کا تذکرہ کیا جو ان سے سرزد ہوا تو کہا:

﴿ فَقَضٰى عَلَيْهِ ۖ قَالَ هٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ ۖ اِنَّهٗ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِيْنٌ ۝ قَالَ رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ فَاغْفِرْ لِيْ فَغَفَرَ لَهٗ ۚ ﴾ [القصص: ١٥، ١٦]

''تو اس کا کام تمام کر دیا۔ کہا یہ شیطان کے کام سے ہے، یقیناً وہ کھلم کھلا گمراہ کرنے والا دشمن ہے۔ کہا اے میرے رب! یقیناً میں نے اپنے آپ پر ظلم کیا، سو مجھے بخش دے۔ تو اس نے اسے بخش دیا۔''

یہاں انھوں نے اپنی جان پر ظلم کا اعتراف کیا، کیوں کہ انھوں نے اس شخص کو بے گناہ مار کر گناہ کیا۔ یونس علیہ السلام نے کہا:

﴿ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴾ [الأنبياء: ٨٧]

''تیرے سوا کوئی معبود نہیں، تو پاک ہے، یقیناً میں ظلم کرنے والوں سے ہو گیا ہوں۔''

صحیح بخاری میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو نماز میں پڑھنے کے لیے جو دعا سکھائی، اس کے الفاظ یہ ہیں:

«اَللّٰهُمَّ إِنِّي ظَلَمْتُ نَفْسِي ظُلْماً كَثِيراً وَلَا يَغْفِرُ الذُّنُوبَ إِلَّا أَنْتَ فَاغْفِرْ لِي مَغْفِرَةً مِنْ عِنْدِكَ وَارْحَمْنِي إِنَّكَ أَنْتَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ»[1]

یہ دعا نفس پر ظلم کے اعتراف اور مغفرت و رحمت کی طلب میں آدم علیہ السلام کی دعا کے مطابق اور ہم آہنگ ہے۔

رسولِ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم جب اپنی سواری پر بیٹھتے تو الحمد للہ، سبحان اللہ، اللہ اکبر کہتے اور یہ دعا پڑھتے:

«لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ سُبْحَانَكَ ظَلَمْتُ نَفْسِي فَاغْفِرْ لِي»[2]

پھر ہنستے، یہ الفاظ حدیثِ علی میں محفوظ ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ ظلم کی دو انواع ہیں: حق میں کوتاہی کرنا اور حق میں تجاوز کرنا۔ ترکِ واجب ظلم ہے تو حرام کام کا ارتکاب بھی ظلم ہے، جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: ''مال دار آدمی کا ٹال مٹول کرنا ظلم ہے۔''[3] ٹال مٹول کا مطلب ہے کہ واجب الادا کو ادا کرنے میں تاخیر سے کام لینا، اگر محض تاخیر ظلم ہے تو ترک کیوں نہیں ظلم ہوگا؟!

یہ بھی بیان ہو چکا ہے کہ واجب کو ادا کرنا حرام کو ترک کرنے سے زیادہ اہم ہے اور وجودی نیکیاں عدمی نیکیوں سے زیادہ عظیم ہیں تو معلوم ہوا جو ظلم واجب حقوق کو ترک کر کے کیا جائے وہ اس ظلم سے زیادہ سنگین ہے جو حدود میں تجاوز کی جنس سے تعلق رکھتا ہو۔ یہ بھی طے ہے کہ ورع، یعنی پارسائی اور پرہیز گاری صرف حرام کو چھوڑنے کا نام نہیں، بلکہ واجب کو ادا کرنے اور حرام کو چھوڑنے کا نام ہے، اسی طرح تقویٰ بھی واجبات کو ادا کرنے اور محرمات کو ترک کرنے سے عبارت ہے، اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں یہی اس کی تعریف ذکر کی ہے:

﴿ لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓىِٕكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآىِٕلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ۭ اُولٰٓىِٕكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ۭ وَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ﴾ [البقرة: ١٧٧]

''نیکی یہ نہیں کہ تم اپنے منہ مشرق اور مغرب کی طرف پھیرو اور لیکن اصل نیکی اس کی ہے جو اللہ یوم آخرت اور فرشتوں اور کتاب اور نبیوں پر ایمان لائے اور مال دے اس کی محبت کے باوجود قرابت والوں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافر اور مانگنے والوں کو اور گردنیں چھڑانے میں۔ اور نماز قائم کرے اور زکات

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٩٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٠٥)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٦٠٢) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٤٤٦) السلسلة الصحيحة (١٦٥٣)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢١٦٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٥٦٤)

دے اور جو اپنا عہد پورا کرنے والے ہیں جب عہد کریں اور خصوصاً جو تنگ دستی اور تکلیف میں اور لڑائی کے وقت صبر کرنے والے ہیں، یہی لوگ ہیں جنھوں نے سچ کہا اور یہی بچنے والے ہیں۔''

یہاں بہت سے لوگ غلطی کھا جاتے ہیں۔ وہ فعل یا مال میں اس کراہت کو دیکھتے ہیں جو اس کو ترک کرنا لازمی قرار دیتی ہے مگر اس میں جو حکم ہوتا ہے جو اس کو کرنا لازمی قرار دیتا ہے، اس کو نہیں دیکھتے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ امام مالک سے سوال ہوا: ایک آدمی اس حال میں فوت ہوا کہ اس نے جو مال چھوڑا وہ شبہے سے آلودہ ہے مگر اس پر قرض بھی ہے۔ اب وارث یہ پوچھتا ہے کہ کیا وہ اس مشتبہ مال کو لے لے یا اس کو چھوڑ دے؟ امام صاحب نے جواب دیا: کیا تو اپنے باپ کے ذمے کو اسی طرح گروی ہی رہنے دے گا؟! یہ بات ابو طالب اور ابن حامد نے ذکر کی ہے۔

یہ عین فقہ ہے، کیوں کہ قرض ادا کرنا فرض ہے اور مقروض کا حق اس ترکے سے متعلق ہے۔ اگر وارث قرض ادا نہیں کرتا تو وہ ترکے سے وصول کرے گا، اس لیے وہ مشتبہ ترکہ جس کے ساتھ مقروض کا حق وابستہ ہو اس کو ضائع کرنا جائز نہیں۔ اسی طرح میت کے ذمے کو اسی طرح گروی میں پڑا رہنے دے کر اس کو نقصان سے دوچار کرنا بھی جائز نہیں۔ اس ترکے کو چھوڑنے میں میت کو بھی نقصان پہنچانا ہے اور مستحق کو بھی، یہ دو ظلم ہیں جو دو واجبوں کو ترک کرنے کی وجہ سے وجود پذیر ہوں گے، لہٰذا وہ مشتبہ مال لینا جائز ہے جس میں مظلوم کا نقصان ہو تو امام احمد نے وارث سے کہا: اپنے باپ کا قرض اتار کر اس کو بری الذمہ کر۔

اسی طرح تمام لوگوں پر کچھ واجبات ہوتے ہیں، جن میں اپنا خرچہ، اپنے اقارب کا خرچہ اور قرض چکانا وغیرہ کی طرح کی کئی ذمے داریاں عائد ہوتی ہیں۔ اگر وہ ان کو ترک کر دیں تو یقینی ظلم کرنے والے ہوں گے۔ اگر وہ یہ ذمے داریاں مشتبہ مال سے ادا کریں تو ان کا ظلم متحقق نہیں ہوگا۔ لہٰذا ایک طرف احتمالِ ظلم ہو اور دوسری طرف متحقق ظلم تو ایک مسلمان متحقق ظلم کا ارتکاب کر کے احتمالی ظلم سے بچنے کی کوشش تو نہیں کرتا؟! اسی بنا پر حضرت سعید بن مسیّب نے کہا ہے: اس شخص میں کوئی خیر نہیں جو مال پسند نہیں کرتا کہ جس کے ساتھ وہ اپنے رب کی عبادت کرے، اس کی امانت ادا کرے، اپنے نفس کی حفاظت کرے اور لوگوں سے مستغنی رہے۔ سنن میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''تین لوگوں کی مدد کرنا اللہ کے ذمے ہے: ایک پاکدامنی کی نیت سے نکاح کرنے والا، ادا کرنے کی نیت سے مکاتبت کرنے والا غلام اور قرض ادا کرنے کا ارادہ رکھنے والا مقروض۔''[1]

اس حدیث میں ذکر کیا گیا ہے کہ پاکدامنی اختیار کرنا، آزادی حاصل کرنا اور واجب الادا ذمے داروں سے

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (١٦٥٥) سنن النسائي، رقم الحديث (٣١٢٠) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٥١٨) صحيح الجامع، رقم الحديث (٣٠٥٠)

بری الذمہ ہونا مومن کی ضرورت ہے۔ اس میں آپ ﷺ نے یہ بتایا ہے کہ یہ واجبات اللہ کی عبادت کی ایک صورت ہے اور قرض ادا کرنا، نفس کو بچانا اور لوگوں سے بے نیاز ہونا مال کے بغیر مکمل نہیں ہوتے اور جس کے بغیر واجب مکمل نہ ہو وہ بھی واجب ہوتا ہے۔ جو شخص اس جیسے عظیم الشان واجب کو ادا کرنا پسند نہیں کرتا کہ جس کے بغیر دین قائم نہیں ہوتا تو اس میں کوئی خیر اور بھلائی نہیں۔ یہ اجمال تھا اس کی تفاصیل بے شمار ہیں۔ واللہ أعلم

نہی کے متعلق ایک اصولی بحث:

اصل مسئلہ یہ ہے کہ نہی اس پر دلالت کرتی ہے کہ منہی عنہ (جس سے منع کیا گیا ہو) کا فساد اور بگاڑ اس کی صلاح اور بہتری پر راجح ہے اور فساد کا التزام مشروع نہیں۔ ہر وہ کام اللہ نے جس سے بعض حالات میں منع اور اس کو حرام قرار دیا ہوتا ہے اور بعض میں حلال تو حرام حلال کی طرح صحیح اور نافذ نہیں ہوتا کہ اس پر اسی طرح حکم مرتب ہو جس طرح حلال پر مرتب ہوتا ہے، تاکہ اس سے بھی اسی طرح مقصود حاصل ہو جس طرح حلال سے حاصل ہوتا ہے۔ فقہا کا جو کہنا ہے: "النهي يقتضي الفساد" "نہی فساد کا تقاضا کرتی ہے۔" اس کا مفہوم یہی ہے جو اوپر بیان ہوا ہے۔ صحابہ، تابعین، ائمہ اسلام اور جمہور فقہا کا یہی موقف ہے۔

بہت سے معتزلہ اور اشاعرہ اس اصول کے خلاف ہیں، لیکن یہ لوگ فقہا نہیں اور شریعت کے دلائل کی تفصیل سے واقفیت نہیں رکھتے۔ اگر ان سے پوچھا جائے کہ عبادت اور عقد کا فاسد ہونا کیسے معلوم ہوتا ہے؟ یہ جواب میں کہتے ہیں کہ شارع کسی چیز کے بارے میں کہے: "یہ صحیح ہے" اور "یہ فاسد ہے" تو اس سے اس کا صحیح یا فاسد ہونا معلوم ہوگا، مگر یہ لوگ شریعت کی واقعاتی دلیلوں سے نابلد ہیں، بلکہ ایسی اشیا فرض کر لیتے ہیں جو شاید نہ واقع ہوں اور کچھ اشیا کو شارع کے کلام کی قبیل سے گمان کر لیتے ہیں۔

شارع علیہ السلام نے کبھی ان الفاظ کے ساتھ رہنمائی نہیں کی، نہ آپ ﷺ کے کلام میں کبھی یہ ذکر ہوا ہے کہ "یہ بیع اور نکاح کی شرطیں ہیں" یا یہ عبادت صحیح ہے، یہ عقد صحیح ہے وغیرہ، بلکہ یہ ساری عبارتیں اہلِ رائے اور اہلِ کلام کی ایجاد کردہ ہیں۔

شارع علیہ السلام نے لوگوں کو امر و نہی اور تحلیل و تحریم کے ساتھ ہدایات دی ہیں، عقود کے حوالے سے آپ سے یہ منقول ہے: "هذا لا يصلح" "یہ مناسب نہیں" آپ سے ایک مُد کے بدلے دو مُد کھجور بیچنے کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: "لا يصلح"۔

صحابہ کرام، تابعین اور تمام ائمہ کسی عقد کی محض نہی سے اس کے فاسد ہونے پر استدلال کرتے تھے، مثلاً

قرآن کریم میں محرم خواتین سے نکاح کرنے سے منع کیا گیا ہے، اسی طرح دو بہنوں کو ایک ساتھ نکاح میں لینے سے بھی منع کیا گیا ہے تو اس سے انھوں نے ان کے نکاح کے فاسد ہونے پر استدلال کیا۔

اسی طرح جس عورت کو تین طلاقیں ہو جائیں، وہی مرد اگر اس کے ساتھ نکاح کر لے تو وہ نکاح فاسد ہوگا، دلیل یہ آیت ہے:

﴿ فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتَّى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ ﴾ [البقرة: ۲۳۰]

''پھر اگر وہ اسے (تیسری) طلاق دے دے تو اس کے بعد وہ اس کے لیے حلال نہیں ہوگی، یہاں تک کہ اس کے علاوہ کسی اور خاوند سے نکاح کرے۔''

صحابہ کرام نے نکاحِ شغار کے فاسد ہونے پر استدلال بھی اس سے ''نہی'' ہی سے کیا ہے، یہ فساد سے تعلق رکھتا ہے، صلاح سے نہیں۔ اللہ تعالیٰ فساد پسند نہیں کرتا، بلکہ صلاح پسند کرتا ہے۔ وہ جس کو پسند کرتا ہے اس سے منع نہیں کرتا، بلکہ جس کو پسند نہیں کرتا، اس سے منع کرتا ہے۔ اس سے صحابہ نے یہ اخذ کیا کہ منہی عنہ (جس سے منع کیا گیا ہے) فاسد ہے، صالح اور راست نہیں۔ اگر اس میں کوئی مصلحت ہو بھی تو وہ مصلحت اس میں موجود مفسدت کی بنا پر مرجوح ہوگی۔ ان کو یہ بھی علم تھا کہ شریعت کی منشا فساد زائل کرنا اور اس سے روکنا ہے، اس کو واقع اور لازمی کرنا نہیں۔ اگر وہ حرام عقود کے موجب اور نتیجے کو لازم کر دیتے تو وہ فساد کرنے والے ہوتے، اصلاح کرنے والے نہیں اور اللہ مفسدوں کا عمل پسند نہیں کرتا۔

اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان:

﴿ وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ ﴾ [البقرة: ۱۱]

''اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد مت ڈالو۔''

یعنی اللہ کی معصیت اور نافرمانی پر عمل نہ کرو، لہٰذا ہر وہ شخص جو اللہ کی معصیت پر عمل کرتا ہے وہ مفسد ہے۔ محرمات اللہ کی معصیت ہیں۔ شارع فساد کو روکنے اور دور کرنے کے لیے ان سے روکتا ہے۔ نہی کی صورتوں میں قطعاً کوئی ایسی صورت موجود نہیں جس میں صحتِ نص یا اجماع سے ثابت ہو۔ حرام طلاق یا غصب شدہ زمین میں نماز کے متعلق فقہا کا اختلاف ہے، لیکن صحت پر کوئی ایسی نص نہیں جس کی پیروی کرنا ضروری ہو، لہٰذا ان دونوں سے استدلال کرنے والے کے پاس کوئی دلیل نہیں بچتی۔

لیکن بیوع کی کچھ صورتیں ایسی ہیں جن سے اس وجہ سے منع کیا گیا ہے کہ ان میں دوسرے فریق پر ظلم ہوتا ہے، مثلاً: بیع مصراۃ (جانور کا دودھ روک لینا) عیب دار چیز کی فروخت، بازار اور منڈی سے باہر سودے بازی، بولی

بڑھانا وغیرہ، لیکن شارع نے حلال بیوع کی طرح ان بیوع کو لازم قرار نہیں دیا، بلکہ غیر لازم ہی رکھا ہے اور مظلوم کو اختیار دیا ہے چاہے تو ان کو ختم کر دے، چاہے ثابت رکھے، اس میں اس کو حق دیا ہے اور شارع نے ان سے اس طرح منع نہیں کیا جس طرح ان امور میں منع کیا ہے جن میں خاص اللہ کا حق ہے، جیسے فواحش سے منع ہے، بلکہ ان عقود میں اگر مظلوم کو ابتدائے عقد میں صورتِ حال معلوم ہو جائے پھر بھی وہ ان کو طے کرنے اور ثابت رکھنے پر راضی ہوتو یہ جائز ہے۔ اسی طرح اگر عقد کے بعد اس کو معلوم ہو اور وہ اس پر راضی ہو تب بھی یہ جائز ہے۔ اگر راضی نہ ہو تو فسخ کر سکتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عقد واقع تو ہو گیا ہے، مگر غیر لازم ہے، بلکہ اس کی اجازت پر موقوف ہے، صاحبِ حق چاہے تو اس کی اجازت دے، چاہے تو رد کر دے۔

یہ عیب دار چیز کی بیع میں متفق علیہ امر ہے، جس میں عیب سے سلامتی کی شرط پر رضا مندی ہوتی ہے۔ اگر یہ شرط نہ پائی جائے تب وہ دوسرے خریدار کی اجازت پر موقوف ہے، لہٰذا اگر وہ بیع شرط کے مطابق ہوتو لازم ہے، اگر شرط کے مطابق نہ ہوتو لازم نہیں ہوتی۔

اگر وہ بیع مطلقاً غیر لازم ہو، بلکہ اجازت دینے والے کی رضا مندی پر موقوف ہوتو اس میں علما کا اختلاف ہے، اکثر علما ایسے عقود و معاملات کے موقوف ہونے کے قائل ہیں۔

یہاں یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ اس نوع کے معاملے کو کچھ علما من جملہ منہی عنہ سے شمار کرتے ہیں، دوسرے کہتے ہیں کہ یہ فاسد نہیں، جب کہ نہی لازمی طور پر فساد کا تقاضا کرتی ہے۔ ایک تیسرا گروہ کہتا ہے کہ یہ فساد ہے۔ اب ان میں کچھ بیع نجش (بولی کی بیع) کو فاسد قرار دیتے ہیں، خصوصاً جب بیچنے والا بولی بڑھائے یا بولی بڑھانے والے کی ہم نوائی کرے۔ اسی طرح منگنی پر منگنی کرنے والے کے نکاح، دوسرے کے دوسرے پر سودا کرنے والے کے سودے کو بھی فاسد قرار دیتے ہیں، جب کہ کچھ دوسرے ان معاملات کو صحیح کہتے ہیں۔

ان جیسے امور میں محقق قول یہ ہے کہ یہ نوع اللہ کے حق کی وجہ سے منہی عنہ نہیں، جس طرح محرمات سے نکاح، تین طلاق یافتہ سے نکاح اور سودی بیع جیسے معاملات ہیں، بلکہ اس نوع میں ممانعت بندے کے حق کی وجہ سے ہے کہ اگر مشتری کو معلوم ہو جائے کہ سامان کا مالک بولی کو بڑھاوا دے رہا ہے یا کوئی دوسرا یہ کام کر رہا ہے اور وہ اس پر راضی ہوتو یہ جائز ہے، اسی طرح اگر پہلا خاطب (منگنی کا پیغام دینے والا) اجازت دے دے تو دوسرے کا پیغام بھیجنا اور نکاح کرنا جائز ہے۔ چونکہ یہاں نہی آدمی کے حق کی وجہ سے ہے اس لیے شارع نے اس کو ''حلال'' کی طرح صحیح اور لازم قرار نہیں دیا، بلکہ مظلوم کا حق ثابت رکھا ہے اور اس کو اختیار کا حق بھی دیا ہے، چاہے تو معاملے کو جاری رکھے، چاہے تو فسخ کر دے۔

اسی طرح غصب شدہ زمین پر نماز پڑھنا، غصب شدہ آلے سے جانور ذبح کرنا، غصب شدہ ایندھن سے سالن پکانا اور اس سے پانی گرم کرنا، یہ سب معاملات اس وجہ سے حرام ہیں کہ ان میں انسان پر ظلم ہوتا ہے اور یہ ظلم مظلوم کو اس کا حق دے کر زائل کیا جا سکتا ہے۔ جب انسان مظلوم کو اس کا حق دے کر راضی کرے اور توبہ کرے تو وہ اللہ اور بندے کے حق سے بری ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد اس کی نماز بھی ایسے ہی ہو جائے گی، جیسے مباح جگہ پر پڑھی جاتی ہے اور دیگر معاملات بھی۔ اگر وہ شخص اس طرح نہیں کرتا تو چھری والا ذبح کی اجرت کا حق دار ہے، مگر محض اس شبہے کی وجہ سے وہ ساری بکری حرام نہیں ہوگی۔ اسی طرح ایسی جگہ نماز پڑھنے والے پر ظلم کا گناہ تو باقی رہے گا اور اسی کے مطابق اس کی نماز میں نقص واقع ہوگا، لہٰذا جس طرح مکمل نماز پڑھنے والا نماز سے بری الذمہ ہو جاتا ہے، یہ اس طرح اس سے بری الذمہ نہیں ہوگا اور نماز نہ پڑھنے والے کی طرح قابلِ سزا بھی نہیں، بلکہ اس کے گناہ کے مطابق اس کو سزا ملے گی، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ﴾ [الزلزال: ۷، ۸]

''تو جو شخص ایک ذرہ برابر نیکی کرے گا اسے دیکھ لے گا۔ اور جو شخص ایک ذرہ برابر برائی کرے گا اسے دیکھ لے گا۔''[1]

انجانے میں حلال مال سے بباطن حرام چیز خریدنے کا حکم

سوال ایک شخص حلال مال سے کوئی سامان خریدتا ہے، لیکن اس کو سامان کی اصلیت کے بارے میں معلوم نہیں کہ یہ حلال ہے یا حرام؟ لیکن وہ باطن میں حرام ہے، کیا یہ شخص یہ معاملہ کرنے کی وجہ سے گناہ گار ہوگا یا نہیں؟

جواب جب مشتری کو یقین ہو کہ بائع جو بیچ رہا ہے اس کا مالک ہے اور وہ ظاہر کو مدِنظر رکھ کر اس سے خرید لیتا ہے تو اس پر کوئی گناہ نہیں، اگرچہ باطن میں بائع نے اسے چرایا ہی ہو، اس بنا پر مشتری پر کوئی گناہ ہے نہ دنیا اور آخرت میں کوئی سزا ہی۔ اس کا تاوان وہی بھرے گا جس نے اس کو دھوکا دیا اور وہ سامان بیچا۔ اگر بعد میں سامان کا اصل مالک سامنے آ جائے تو سامان اس کو واپس کر دیا جائے گا، مشتری کو اس کی قیمت واپس کر دی جائے گی اور ظالم بائع کو سزا دی جائے گی۔ جو علما جاننے والے اور نہ جاننے والے کے درمیان فرق کرتے ہیں ان کا عمل درست ہے اور جو نہیں کرتے ان کا عمل درست نہیں۔ واللہ أعلم[2]

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۲۹/۲۷۷۔۲۸۰)

[2] مجموع الفتاویٰ (۲۹/۲۹۳)

ادھار خریدی ہوئی گندم کی ادائی پیسوں کے بجائے گندم سے ادا کرنے کا حکم

سوال ایک آدمی نے ادھار گندم خریدی، جب ادا کرنے کا وقت آیا تو اس وقت مقروض کے پاس صرف گندم تھی کیا وہ اس سے گندم لے سکتا ہے؟

جواب ہاں، اس کے لیے اس سے گندم لینا جائز ہے اور یہ جمہور ابوحنیفہ، شافعی اور حنابلہ کے ایک گروہ کے نزدیک سود نہیں، نیز اس میں مقروض کے لیے سہولت ہے۔ اگر اس کو گندم بیچ کر پیسے دینے کا کہا جائے تو اس میں اس کے لیے مشکل ہوگی، لہٰذا قرض خواہ گندم لے سکتا ہے۔ واللہ أعلم [1]

مسئلہ تورّق کا حکم

سوال ایک آدمی کے ذمے کسی کا قرض ہے اور مقروض کا ایک بیٹا ہے، مقروض کے بیٹے نے قرض دینے والے سے کہا: مجھے کوئی سامان ادھار بیچ دے، میں اس کو نقد بیچتا ہوں، تاکہ اپنے باپ کا قرض اتار سکوں، اس مسئلے کی کیا حیثیت ہے؟

سوال الحمد للہ. اگر مشتری کا مقصود پیسوں کا حصول ہے اور وہ ادھار سامان خرید کر اسے نقد بیچ کر اس کی قیمت لینا چاہتا ہے تو اس مسئلے کو ''مسئلہ تورّق'' کہا جاتا ہے، کیوں کہ اس کا مقصود سامان نہیں، ورق (پیسے) کا حصول ہوتا ہے، اس کی کراہت میں علما کا اختلاف ہے، اسے عمر بن عبدالعزیز اور مالکیہ میں سے اہلِ مدینہ کے ایک گروہ نے مکروہ کہا ہے۔ امام احمد سے بھی ایک روایت یہی ہے، دوسروں نے اس کی رخصت دی ہے، تاہم اس کی کراہت زیادہ قوی ہے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز کا قول ہے: "التورّق أخيّة الربا" ''تورّق سود کا چھوٹا بھائی ہے۔'' واللہ أعلم [2]

بائع کے علم میں لائے بغیر دلال کا اضافہ کرنا اور اپنے پاس رکھنا

سوال کسی ہوٹل میں کچھ دلال ہیں، جن میں سے تین کسی سے کسی کے لیے کچھ خریدتے ہیں، پھر خریدنے میں اضافہ کرتے ہیں اور فائدہ آپس میں تقسیم کر لیتے ہیں، کیا ان کا یہ عمل جائز ہے؟

جواب الحمد للہ. دلال جو درحقیقت آواز لگانے کے لیے بائع یعنی فروخت کنندہ کا وکیل اور نائب ہوتا ہے، اس کے لیے بائع کے علم میں لائے بغیر اضافہ کرنے والے کا شریک بننا جائز نہیں، کیوں کہ حقیقت میں یہی شخص اضافہ کرنے والا اور معنوی طور پر خریدنے والا ہے اور یہ بائع کی خیانت ہے، جو اس طرح کا کام کرتا ہے اس

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۲۹/۳۰۰)

[2] مجموع الفتاویٰ (۲۹/۳۰۱)

کے لیے کسی کو اضافہ کرنا زیب نہیں دیتا، بائع کو وہ اضافہ طلب کرنے کا نہ کہا جائے اور آواز لگانے کا معاہدہ ختم کر دینا چاہیے۔

اگر کچھ لوگ بطورِ پیشہ اس کام کو اختیار کریں اور پہلے سے آپس میں طے کر لیں تو ان کو سخت ترین سزا دی جانی چاہیے جس کی ایک صورت یہ ہے کہ ان کو دلالی سے روک دیا جائے، تا آنکہ وہ توبہ کر لیں۔ واللہ أعلم [1]

وراثت میں ملنے والے سودی مال کا حکم

سوال ایک شخص سودی کاروبار کرتا تھا، اس نے مرنے کے بعد مال بھی چھوڑا اور ایک بیٹا بھی، بیٹے کو اس کا علم ہے، کیا وہ مال جو اس کو وراثت میں ملا، اس کے لیے حلال ہو گا؟

جواب لڑکے کو جتنی سودی مقدار کا علم ہے اسے نکال دے۔ نکالنے کی صورت یہ ہے کہ اگر ممکن ہو تو وہ جن کا مال ہے ان کو لوٹا دے، یا پھر اس کا صدقہ کر دے، باقی اس کے لیے حرام نہیں، لیکن جس قدر مشتبہ ہے اسے چھوڑ دینا اس کے لیے مستحب ہے۔ اس کو قرض ادا کرنے یا بچوں پر خرچ میں صرف کرنا ضروری نہیں۔ اگر باپ ایسے سودی معاملات کرتا تھا جن میں فقہا نے رخصت دی ہے تو وارث کے لیے اس سے فائدہ اٹھانا جائز ہے۔ اگر حلال حرام کے ساتھ خلط ملط ہو گیا ہو اور حرام کی مقدار معلوم نہ ہو تو اس کو آدھا آدھا کر لے۔ واللہ أعلم [2]

توبہ کے بعد مشتبہ مال سے صدقے کا حکم

سوال ایک عورت پیشہ ور گلوکارہ تھی۔ اس نے اپنی جہالت کے ایام میں ڈھیر سارا پیسہ کمایا، پھر اس نے توبہ کی اور حج کیا۔ اب وہ اللہ تعالیٰ کی فرماں برداری کے مطابق زندگی گزار رہی ہے۔ وہ مال جو اس نے حلال و غیر حلال کمایا تھا، اس کو استعمال کرے یا صدقہ کرے تو اجر کی مستحق ہو گی؟

جواب کمایا ہوا مال اگر فی نفسہ مباح ہو، خواہ مادی اور عینی چیز ہو یا منفعت مگر قصد کی وجہ سے حرام ہو جائے، جس طرح کوئی شخص شراب کشید کرنے والے یا اس کام میں کسی بھی طرح کا تعاون کرنے والے کو انگور فروخت کرتا ہے، گو وہ یہ کام معاوضہ وصول کر کے کرتا ہے، لیکن اس کی کمائی حلال نہیں، اگر وہ عینی چیز یا منفعت فی ذاتہ حرام ہو جس طرح زنا کے عوض حاصل کیا گیا مال اور شراب کی قیمت۔ یہاں قبضے میں کرنے سے پہلے اس مال کا فیصلہ اس کے حق میں نہیں کیا جائے گا۔ اگر وہ شخص (زانی) اس کو یعنی زانیہ کو معاوضہ دے، پھر وہ عورت توبہ

---

① مجموع الفتاویٰ (۳۰۵/۲۹)

② مجموع الفتاویٰ (۳۰۷/۲۹)

کر لے تو ضروری نہیں کہ وہ مال اس مرد کو واپس کر دے، کیوں کہ ایسا کرنا گناہ پر معاونت کرنا ہے اور عوض و معوض (حاصل کردہ منفعت) کو یکجا کرنا۔ یہ مال زانی اور شرابی کے لیے حلال نہیں، اس کو مسلمانوں کے مفادِ عامہ کے کاموں میں خرچ کر دیا جائے۔ یہ زانیہ اور شرابی جو توبہ کر لیتا ہے اگر غریب ہو تو اس مال سے ان کی ضرورت کے مطابق انھیں دیا جا سکتا ہے۔ اگر وہ کوئی کاروبار کرنا چاہے یا کوئی پیشہ اختیار کرنا چاہے اور اس کو اس کاروبار یا پیشے کے لیے جتنے بنیادی سرمائے کی ضرورت ہو، اتنا اس کو اس سے دیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح اگر وہ کام کرنے کے لیے اس مال سے قرض لے لیں اور اس قرض کا عوض ان کو واپس نہ کریں تو یہ بہتر ہے۔ اگر وہ اس کو حلال سمجھتے ہوئے صدقہ کرنا چاہے تو کر سکتا ہے۔ اس کو اس کا ثواب ملے گا، لیکن اگر اس حیثیت سے صدقہ کرے جس حیثیت سے مالک اپنی زیرِ ملکیت چیز کا صدقہ کرتا ہے تو اس کو اللہ قبول نہیں کرتا، کیوں کہ اللہ صرف پاکیزہ مال قبول کرتا ہے اور یہ خبیث ہے، جس طرح رسولِ امین ﷺ کا فرمان ہے:

«مَهْرُ الْبَغِيِّ خَبِيثٌ»[1]

''زانیہ جو عوض لیتی ہے وہ خبیث ہے۔'' واللہ أعلم[2]

موجودہ زمانے میں حلال کھانے کے عدمِ امکان کی حقیقت

سوال ایک شخص نے کسی فقیہ کا یہ قول نقل کیا کہ ''حلال کھانا ناممکن ہے اور یہ موجودہ زمانے میں ناپید ہے'' اس شخص سے اس کی وجہ معلوم کی گئی تو اس نے کہا: واقعہ منصورہ (ایک صلیبی جنگ جس میں مسلمان فتح مند ہوئے) میں مالِ غنیمت تقسیم نہیں کیا گیا تھا اور اُس میں اموال معاملات سے خلط ملط ہو گئے تھے۔ اگر آدمی حلال کام کر کے اس کی مزدوری حاصل کرے تو وہ حلال ہی ہوتا ہے۔ اس نے کہا: درہم بذاتِ خود حرام ہے۔ اسے جواب دیا گیا کہ درہم حرام سبب کی وجہ سے حرام ہوتا ہے اور حلال سبب کی وجہ سے حلال۔ اس مسئلے کی وضاحت درکار ہے؟

جواب الحمد للہ. یہ بات کہنے والا باتفاق ائمہ غلط کہہ رہا ہے، اس طرح کی بات کچھ بدعتی، کچھ فاسد فقہ کے حامل اور کچھ فاسد زہد کا لبادہ اوڑھنے والے کہتے تھے اور ائمہ کرام نے ان کی تردید کی، حتی کہ امام احمد بن حنبل جو زہد و ورع میں ایک نام رکھتے تھے۔ وہ بھی اس طرح کی بات کی تردید کرتے تھے۔ ان کے پاس ایک زاہد اور

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۵۶۸)

[2] مجموع الفتاویٰ (۲۹/ ۳۰۸۔۳۰۹)

عبادت گزار آیا اور اس نے اسی طرح کی کوئی بات کی تو انھوں نے کہا: اس خبیث کو دیکھو، مسلمانوں کے اموال حرام کر رہا ہے!

یہ شبہہ کہ لوٹ مار کی کثرت اور فاسد معاملات کی بہتات کی وجہ سے لوگوں کے مالوں میں حرام غالب ہو چکا ہے اور حلال وحرام کی تمیز باقی نہیں رہی، صرف انہی زہاد اور عباد تک محدود نہیں، بلکہ کچھ علما اور فقہا بھی اس کے شکار ہوئے ہیں، اس بنا پر انھوں نے فتویٰ دیا ہے کہ انسان صرف بقدرِ ضرورت لے سکتا ہے۔ ایک دوسرے گروہ نے جب اس طرح کا حرج دیکھا تو ورع اور پرہیز گاری کا دروازہ بند کر دیا، اس طرح ان کے دو گروہ ہو گئے۔

ایک مباحیہ، جو حلال وحرام میں کوئی تمیز نہیں کرتے، بلکہ جو ان کے ہاتھ آ جائے وہ حلال ہے اور جسے حرام کر دیں وہ حرام ہے، کیوں کہ یہ بھی اسی فاسد گمان کے شکار ہوئے ہیں کہ حرام ساری زمین پر چھا چکا ہے۔ انھوں نے جب یہ دیکھا کہ انسان کے لیے کھانے اور لباس کا ہونا بنیادی ضرورت ہے اور اس کے بنا چارہ نہیں تو یہ چیزیں ان کو جہاں اور جیسے میسر آ جائیں یہ انھیں حاصل کرنے میں کچھ تامل نہیں کرتے۔ عقل مند کو غور کرنا چاہیے کہ اس فاسد ورع اور پرہیز گاری کا کیا انجام نکلتا ہے اور یہ کس طرح دین سے انحلال اور خروج کا باعث بنتا ہے۔ یہ لوگ فاسد ورع اور غیر شرعی پرہیز گاری کے متعلق بہت سی کہانیاں بیان کرتے ہیں جو اکثر جھوٹ بیانی پر مبنی اور غلط ہیں۔

کچھ لوگ اس حد تک ورع میں افراط کا شکار ہوتے ہیں کہ اپنی طرف سے اجتہاد کرتے ہوئے کوئی معیار مقرر کر لیتے ہیں، ایسے لوگوں کو حسنِ نیت کا ثواب ہوتا ہے، گو شریعت میں جس کام کا حکم ہے وہ اس کے خلاف ہی ہو، مثلاً: کوئی شخص بازاروں میں بکنے والی اشیا نہیں کھاتا، صرف وہ کھاتا ہے جو صحرا میں اگتا ہے، مسلمانوں کے مال سے نہیں کھاتا، بلکہ کھیتی باڑی کرنے والوں کے مال سے کھاتا ہے، اس طرح کے لوگ جن کی نیت اچھی ہو اور ان کے پاس اپنے عمل کی تاویل بھی ہو، تاہم صواب اور مشروع اس کے خلاف ہے، کیوں کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے لوگوں کو اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے اور ان کو اسی کا حکم دیا ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے جس بات کا حکم رسولوں کو دیا ہے، اس کا حکم مومنوں کو دیا ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ يَاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صٰلِحًا ﴾ [المؤمنون: ٥١]

''اے رسولو! پاکیزہ چیزوں میں سے کھاؤ اور نیک عمل کرو۔''

فرمایا:

﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ﴾ [البقرة: ١٧٢]

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! ان پاکیزہ چیزوں میں سے کھاؤ جو ہم نے تمھیں عطا فرمائی ہیں۔''

پھر آپ ﷺ نے ایک ایسے شخص کا ذکر کیا جو لمبا سفر طے کر کے آتا ہے، اس کے بال بکھرے ہوئے اور جسم غبار آلود ہے، وہ آسمان کی طرف اپنے ہاتھ پھیلا کر کہتا ہے: یا رب! یا رب! اس کا کھانا حرام، لباس حرام اور اس کی پرورش حرام سے ہوئی ہے، اس وجہ سے اس کی دعا کیوں کر قبول ہو!''[1]

اس حدیثِ مبارک میں آنحضرت ﷺ نے بیان فرمایا ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے جس طرح اپنے رسولوں کو حلال کھانے اور عملِ صالح کرنے کا حکم دیا ہے، اسی طرح مومنوں کو بھی حلال کھانے اور نیک عمل کرنے کا حکم دیا ہے۔ عملِ صالح کھانے، پینے، پہننے، گھر، سواری، اسلحہ اور کتابوں جیسی بنیادی ضروریات کے بغیر ممکن نہیں ہوتا۔ اسلحہ انسان جہاد کے لیے استعمال کرتا ہے اور کتابیں علم سیکھنے کے لیے اس طرح کی وہ تمام اشیا جن کے بغیر اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا حکم وجود پذیر نہ ہو سکے، ان کا حصول ضروری ہے اور یہ شرعی قاعدہ ہے کہ ''ما لا یتم الواجب إلّا به فهو واجب'' ''جس کے بغیر واجب پورا نہ ہو سکے، وہ بھی واجب ہوتا ہے۔''

اگر واجبات ادا کرنا تمام بندوں پر فرض ہے اور یہ واجبات ان اموال کے بغیر پورے نہیں ہو سکتے تو کس بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ آج کے دور میں حلال کم ہو چکا ہے؟ بلکہ یہ کثیر اور غالب ہے اور لوگوں کے اموال میں اکثریت اسی کی ہے۔ اگر لوگوں کے مالوں میں حرام ہی غالب ہو اور دین عوام میں اس کے بغیر قائم نہیں ہو سکتا تو دو باتوں میں سے ایک لازم آئے گی۔ اکثر لوگوں سے واجبات ساقط کر دیے جائیں اور وہ انھیں چھوڑ دیں، یا اکثر لوگوں کے لیے حرام جائز کر دیا جائے، حالانکہ یہ دونوں ہی باطل ہیں۔

''ورع'' شریعت کی اساسیات میں داخل ہے۔ صحیح بخاری میں حضرت عثمان بن بشیر سے مروی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

> ''حلال بھی واضح ہے، حرام بھی واضح ہے۔ ان دونوں کے درمیان کچھ متشابہ امور ہیں، جنھیں اکثر لوگ نہیں جانتے۔ جس نے شبہات ترک کر دیے، اس نے اپنا دین اور عزت بچا لی۔ جو شبہات میں پڑ گیا، وہ حرام میں پڑ گیا۔ اس چرواہے کی طرح جو چراگاہ کے ارد گرد چراتا ہے تو قریب ہے کہ اس میں منہ مروائے۔ ہر بادشاہ کی ایک چراگاہ ہوتی ہے، اللہ کی چراگاہ اس کے حرام کردہ امور ہیں۔ یاد رہے کہ جسم میں ایک ٹکڑا ہے، جب وہ صحیح رہے تو سارا جسم صحیح رہتا ہے اور جب وہ خراب ہو جائے تو اس کی وجہ سے سارا جسم خراب ہو جاتا ہے، وہ دل ہے۔''[2]

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۰۱۵)

[2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۵۲) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۵۹۹)

ایک حدیث میں اس طرح ذکر ہوا ہے:

«دَعْ مَا يُرِيبُكَ إِلَى مَا لَا يُرِيبُكَ »[1]

''اسے چھوڑ دے جو تجھے شک میں ڈال دے اور اسے اختیار کر لے جو تجھے شک میں نہ ڈالے۔''

آپ ﷺ نے ایک کھجور زمین پر پڑی دیکھی تو کہا: ''اگر مجھے یہ خدشہ نہ ہوتا کہ یہ صدقے کی ہے تو میں اسے کھالیتا۔''[2]

یہاں چند اصول ذکر کیے جاتے ہیں جن سے یہ مسئلہ واضح ہو جائے گا:

پہلا قاعدہ:

ہر وہ چیز جسے مخصوص فقیہ حرام کہے تو وہ اس کے کہنے سے حرام نہیں ہوتی، بلکہ حرام وہ ہے جس کی تحریم کتاب و سنت، اجماع، یا راجح قیاس سے ثابت ہو، جس میں علما کا اختلاف ہو، اس کو انہی اصول کی طرف لوٹایا جائے گا۔

کچھ لوگ کسی خاص امام کے مذہب کے پیروکار ہوتے ہیں، یا کسی مخصوص فقیہ سے فتویٰ دریافت کرتے ہیں، یا کسی عالم سے کوئی کہانی سنتے ہیں تو سب مسلمانوں کو اس کا پابند بنانا چاہتے ہیں جو سراسر غلط ہے، اس کی کئی مثالیں اور نظائر ہیں۔ ان میں سے ایک مسئلہ مالِ غنیمت کی تقسیم کا بھی ہے۔ اس کی تقسیم کا سنت طریقہ یہ ہے کہ اسے اکٹھا کیا جانے کے بعد اس سے خمس (پانچواں حصہ) علاحدہ کیا جائے، پھر مالِ غنیمت۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا امام خمس نکال کر باقی کے چار اخماس سے کسی کو اس کے حصے سے زائد دے سکتا ہے کہ نہیں، اس میں فقہا کے دو اقوال ہیں۔

فقہائے ثغور (مجاہدین) ابو حنیفہ، احمد اور محدثین کے نزدیک یہ جائز ہے۔ اس کی دلیل سنن میں یہ حدیث ہے:

«أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ نَفَلَ فِي بَدْأَتِهِ الرُّبعَ بَعْدَ الْخُمُسِ، وَنَفَلَ فِي رَجْعَتِهِ الثُّلُثَ بَعْدَ الْخُمُسِ »[3]

''نبی اکرم ﷺ اپنے سفرِ جنگ کے آغاز میں (دشمن سے مڈبھیڑ ہونے کی صورت میں) خمس کے بعد ربع سے غازی کو اس کے متعین حصے سے زیادہ دیتے اور واپسی کے سفر میں (دشمن سے مڈبھیڑ ہونے کی صورت میں) خمس کے بعد ثلث سے زیادہ دیتے۔''

سعید بن المسیب، مالک اور شافعی کے نزدیک ایسا کرنا جائز نہیں، بلکہ امام مالک کے نزدیک خمس ہی سے

---

[1] صحيح البخاري (٧٢٣/٢) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٥١٨) سنن النسائي، رقم الحديث (٥٣٩٧) صحيح الجامع، رقم الحديث (٣١٩٤)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٢٩٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٧١)

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٧٤٩) شیخ البانی رحمہ اللہ نے اسے صحیح کہا ہے۔

(نفل) زیادہ دینا ہے۔ امام شافعی کے نزدیک خمس کے خمس سے کسی کو زیادہ دیا جا سکتا ہے۔ امام احمد بن حنبل سعید بن مسیّب اور امام مالک پر تعجب کیا کرتے تھے کہ کیونکر ان تک یہ سنت نہیں پہنچ سکی، حالانکہ ان کا علم ٹھاٹھیں مارتا تھا؟!

صحیحین میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، وہ کہتے ہیں: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں نجد کی طرف ایک سریے میں بھیجا۔ ہمارے حصے میں بارہ بارہ اونٹ آئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں ایک ایک اونٹ زائد دیا۔''[1]

اگر حصے میں بارہ اونٹ آئیں تو خمس کے خمس سے کسی صورت میں ہر ایک کے لیے ایک ایک اونٹ نہیں نکل سکتا۔ یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب حصے میں آنے والے اونٹ چوبیس ہوں۔

اسی طرح امام کچھ نمازیوں کو کسی راجح مصلحت و مفاد کے پیش نظر زیادہ دے سکتا جس طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سلمہ بن اکوع کو غزوۂ ذی قرد میں ایک پیدل اور گھڑ سوار کا حصہ دیا تھا۔ لہٰذا علما کے دو اقوال میں سے صحیح تر کے مطابق ایسا کرنا جائز ہے، گو کچھ علما اسے ناجائز کہتے ہیں جس طرح پہلے گزر چکا۔ اسی طرح جب امام یہ اعلان کر دے کہ جو شخص جو چیز پکڑے گا وہ اسی کی ہو جائے گی۔ یہ بھی علما کے دو اقوال سے ایک کے مطابق جائز ہے۔ امام احمد کا ظاہر مذہب بھی یہی ہے۔ ایک دوسرے قول کے مطابق یہ جائز نہیں اور یہ امام شافعی کا ظاہر مذہب ہے، پھر ان دونوں مذاہب میں اختلاف ہے۔

دورِ واپسیں میں مسلمانوں کے حاصل ہونے والے اموالِ غنیمت کی تقسیم کے پسِ پردہ یہی قاعدہ اور فقہا کا اختلاف کارفرما ہے، مثلاً ابو محمد جوینی اور نووی جیسے کچھ فقہا نے یہ فتویٰ دیا کہ سلجوقی ترکوں کو ملنے والے مالِ غنیمت اور شام و مصر کے سرحدی علاقوں میں مسلمانوں کو عیسائیوں سے حاصل ہونے والے مالِ غنیمت سے کسی مسلمان کے لیے کوئی چیز خریدنا ناجائز نہیں اور اس سے ملنے والے کسی لونڈی سے جنسی تعلقات استوار کرنا جائز نہیں، اسی طرح وہ اس جیسے کسی مال کا مالک نہیں بن سکتا۔

اس قول کے نتیجے میں جو فساد اور بگاڑ وجود پذیر ہو سکتا ہے اس کے پھیلاؤ کا اندازہ اللہ کے سوا کسی کو نہیں۔ ابو محمد بن سباع شافعی نے ان فقہا سے اختلاف کرتے ہوئے یہ فتویٰ دیا کہ امام کے لیے کسی بھی صورت میں مالِ غنیمت تقسیم کرنا ضروری نہیں اور خمس نکالنا بھی ضروری نہیں۔ وہ پیدل کو زیادہ دے سکتا ہے، کسی غنیمت پانے والے کو محروم رکھ سکتا ہے اور بعض کو مخصوص بھی کر سکتا ہے، کیونکہ اس کے گمان کے مطابق سیرتِ نبوی کا یہی تقاضا ہے، مگر یہ قول اجماع کے خلاف ہے اور جو اس سے پہلے ذکر ہوا وہ باطل اور ناقابلِ تسلیم ہے، درحقیقت یہ دونوں اقوال ہی انحراف پر مبنی ہیں۔

اس جیسے مسئلے میں درست رائے یہ ہے کہ امام جب یہ اعلان کرے کہ ''جو شخص جو چیز پکڑے وہ اسی کی ہو

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٤٠٨٣) صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٧٤٩)

جائے گی'' اگر اسے جائز کہا جائے تو اس اساس پر جو شخص جو چیز پکڑے گا وہ اس کا مالک بن جائے گا اور اس سے خمس نکالا جائے گا، چاہے یہ بات امام صراحت کے ساتھ نہ بھی کہے۔

یا یہ کہا جائے کہ اس کے لیے مال کو انصاف کی بنیاد پر تقسیم کرنا ضروری ہے اور اس کے لیے لوٹ کی اجازت دینا جائز نہیں، تو یہاں غنیمت میں ملنے والا مالِ غنیمت پانے والوں کے درمیان مشترک مال کی حیثیت رکھتا ہے جس میں ان کے علاوہ کسی دوسرے کا حق نہیں۔ اب جو اپنے حق کی مقدار کے مطابق لے لے وہ اس کے لیے جائز ہو گا اور اگر اس کو اس میں شک ہو تو یا احتیاط اور مستحب پرہیزگاری کے مطابق لے لے، یا اپنے غالب گمان کو بنیاد بنا لے: ﴿ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۚ ﴾ اس کی ایک دوسری مثال ''مزارعت'' کا مسئلہ ہے جس میں بیج عامل مہیا کرے۔ اسے کچھ لوگ ''مخابرت'' کا نام بھی دیتے ہیں اس میں بھی فقہا کا اختلاف ہے، لیکن صحیح سنتِ رسول اس کے جواز کا ثبوت مہیا کرتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اہلِ خیبر کے ساتھ جو معاملہ طے کیا تھا اس میں یہ تھا کہ اہلِ خیبر اپنے مال سے زمین آباد کریں گے اور اس کی آدھی پیداوار مسلمانوں کو دیں گے۔ جہاں تک ''مخابرت'' سے ممانعت کا مسئلہ ہے تو صحیح میں اس کی تفسیر اس طرح بیان ہوئی ہے کہ اس سے یہ مراد ہے کہ جب مالک زمین کے کسی خاص حصے کی پیداوار لینے کی شرط عائد کرے اس وقت یہ جائز نہیں۔ زمین ٹھیکے پر دینے کا مسئلہ بھی اسی نوعیت کا ہے۔ ابو حنیفہ، شافعی اور مشہور قول کے مطابق احمد نے اسے جائز کہا ہے اور مالک اور ایک روایت میں احمد نے اس سے منع کیا ہے۔

دوسرا قاعدہ:

کوئی مسلمان جب کوئی معاملہ کرتا ہے اور اسے جائز سمجھتا ہے، پھر اس کے نتیجے میں حاصل ہونے والا مال اپنے قبضے میں لے لیتا ہے تو دوسرے مسلمان کے لیے اس جیسے مال میں اس کے ساتھ معاملہ کرنا جائز ہوتا ہے، چاہے وہ اس معاملے کے جواز کا قائل نہ ہو۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے سامنے ان کے ایک عامل کی شکایت لگائی گئی کہ وہ ذمیوں سے جزیے کے بدلے شراب لیتا ہے۔ انھوں نے سن کر کہا: اللہ اس کو تباہ کرے! کیا اس کو علم نہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: اللہ یہودیوں کو تباہ کرے! ان پر چربی حرام کی گئی تو انھوں نے اس کو پگھلا کر بیچا اور اس کی قیمت کھائی۔''[1] پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ان سے کہو! وہ اسے بیچیں، تم ان سے اس کی قیمت لو۔'' اس طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ذمیوں سے وہ درہم لینے کا حکم دیا جو انھوں نے شراب فروخت کر کے حاصل کیے تھے، کیوں کہ وہ اپنے دین میں اسے بیچنا جائز سمجھتے تھے۔

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢١١٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٥٨٢)

اس بنا پر علمانے کہا ہے: کافر جب آپس میں معاملات کریں، جنھیں جائز سمجھتے ہوں اور ان کے نتیجے میں مال کمائیں، پھر وہ مسلمان ہو جائیں تو ان کے وہ اموال ان کے لیے حلال ہوں گے۔ اگر وہ ہمارے پاس فیصلہ کروانے کے لیے آئیں تو ہم وہ اموال ان کے ہاتھوں ہی میں رہنے دیں گے، چاہے اسلام سے پہلے فیصلہ کروانے کے لیے آئیں یا بعد میں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَ ذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰٓوا اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ﴾ [البقرۃ: ۲۷۸]

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ سے ڈرو اور سود میں سے جو باقی ہے چھوڑ دو، اگر تم مومن ہو۔''

اس آیت میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اس سود کو چھوڑنے کا حکم دیا ہے جو ان کے ذمے باقی تھا۔ جو لے لیا اسے واپس کرنے کا حکم نہیں دیا، کیوں کہ وہ اسے حلال سمجھتے تھے۔

لہٰذا مسلمان جب ایسے معاملات کرے، جنھیں جائز سمجھتا ہو، مثلاً: سودی حیلے، جن کا بعض حنفی علما فتویٰ دیتے ہیں، یا اس شرط پر مزارعت کرنا کہ بیج کسان کا ہوگا، پھر وہ مال قبضے میں لے لے تو دوسرے مسلمانوں کے لیے اس مال میں اس کے ساتھ معاملات کرنا جائز ہے، چاہے وہ اس معاملے کے جواز کے قائل نہ ہوں۔ اسی طرح اگر ایسے شخص کے سامنے بعد میں اس معاملے میں تحریم کا راجح ہونا ظاہر ہو جائے تو بھی اس کے لیے وہ مال نکالنا لازمی نہیں جو اس نے تاویل سائغ (جائز) کے ذریعے کمایا تھا۔ اگر تاویل کرنے والے کافر کے معاملے کو قبول کیا جا سکتا ہے تو ایک مسلمان عذر خواہی اور درگزر کے زیادہ قابل ہے۔ جب کچھ فقہا نے اس طرح کے معاملات کو پرہیزگاروں اور اہلِ ورع کے لیے مشکل بنا دیا تو انھوں نے کافروں سے معاملات کرنا اختیار کر لیا اور مسلمانوں کے ساتھ معاملت کرنا چھوڑ دیا! یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے مسلمان کو یہ حکم نہیں دیا کہ وہ کافروں کا مال کھائیں اور مسلمانوں کو چھوڑ دیں، بلکہ مسلمان ہر خیر کا زیادہ حق دار ہے اور کافر ہر شر کا۔

تیسرا قاعدہ: حرام کی دو انواع ہیں:

① کسی وصف کی وجہ سے حرام، جیسے مردار خون اور خنزیر کا گوشت ہے، یہ جب کسی مائع چیز، پانی اور دیگر خوردنی اشیا کے ساتھ مخلوط ہو جائے اور اس کا ذائقہ، رنگ یا بو تبدیل کر دے تو اسے بھی حرام کر دیتا ہے، اگر تبدیل نہ کرے تو اس میں اختلاف ہے، جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔

② کسب کی وجہ سے حرام، مثلاً: کسی سے کوئی چیز چھین لی جائے یا فاسد عقد کے ذریعے حاصل کی جائے، اگر حلال کے ساتھ اس کا اختلاط ہو جائے تو یہ اس کو حرام نہیں کرتا۔ اگر کوئی شخص کسی سے روپے چھینتا ہے یا آٹا یا گندم

وغیرہ اور اسے اپنے مال کے ساتھ ملا لیتا ہے تو وہ ان دونوں پر سارا حرام نہیں ہوگا، بلکہ اگر وہ دونوں یکساں ہوں اور اسے تقسیم کرنا ممکن ہو تو ہر کوئی اپنے حق کے مطابق لے لے۔

یہ بڑا کارآمد قاعدہ ہے۔ بہت سے لوگ سمجھ بیٹھتے ہیں کہ اگر حلال روپیہ حرام کے ساتھ مل جائے تو سارا ہی حرام ہو جاتا ہے، یہ غلط ہے۔ بعض علما نے اس صورت میں احتیاط برتی ہے، جب ان کی مقدار تھوڑی ہو۔ اگر کثرت کے ساتھ ہو تو اس میں میں کسی کا اختلاف نہیں جانتا۔

چوتھا قاعدہ:

جب مال کے مالک کی پہچان مشکل ہو جائے تو جمہور علما، یعنی مالک اور احمد وغیرہما کے نزدیک اسے مسلمانوں کے مفاد و مصالح میں صرف کر دیا جائے۔ اگر کسی انسان کے پاس لوٹ کا مال امانتاً اور عاریتاً رکھی ہوئی یا گروی رکھی ہوئی کوئی چیز ہو اور وہ ان کے مالکوں کے بارے میں جاننے سے مایوس ہو جائے تو وہ ان کو ان کی طرف سے صدقہ کر دے، یا مسلمانوں کے مفاد میں صرف کر دے یا کسی عادل تقسیم کار کے سپرد کر دے جو انھیں مسلمانوں کے شرعی مفادات میں صرف کر دے۔

کچھ فقہا کہتے ہیں: دائمی توقف کیا جائے، تاآنکہ ان کے مالک سامنے آ جائیں، لیکن پہلا قول ہی درست ہے، کیوں کہ اگر مال کو اس شخص کے انتظار میں دائمی طور پر محبوس کر دیا جائے، جس کے ملنے کی کوئی امید نہ ہو تو ایسے مال کو روکے رکھنے میں کوئی فائدہ نہیں، بلکہ وہ تباہ ہو جائے گا یا ظالموں کے قبضے میں چلا جائے گا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ایک لونڈی خریدی۔ پیسے لانے کے لیے اپنے گھر گئے۔ جب واپس آئے تو وہ بیچنے والا انھیں کہیں نظر نہ آیا۔ انھوں نے اس بائع کی طرف سے نیت کر کے اس کی قیمت مسکینوں پر صدقہ کر دی اور کہا: ”اے اللہ! یہ اس لونڈی کے مالک کی طرف سے ہے۔ اگر قبول کرے تو اس کے لیے ہے۔ اگر نہ کرے تو میرے لیے ہے اور قیامت کے دن اس کے برابر اس کا حق مجھ پر لازم ہوگا۔“ اسی طرح ایک شخص نے مالِ غنیمت میں خیانت کی اور بعد میں ان سب کے بکھرنے کے بعد توبہ کر لی تو ایک تابعی نے اس کو یہی فتویٰ دیا کہ وہ اسے ان کی طرف سے اسے صدقہ کر دے۔ شام میں حضرت معاویہ اور دیگر صحابہ و تابعین کو جب اس فتوے کے متعلق معلوم ہوا تو انھوں نے اسے پسند کیا۔ یہ قاعدہ پانچویں قاعدے کو واضح کرتا ہے جو اس مسئلے کے راز سے پردہ اٹھاتا ہے۔

پانچواں قاعدہ:

مجہول یعنی نامعلوم شریعت میں معدوم اور معجوز عنہ (انسان جس کو کرنے سے عاجز ہو) کی طرح ہوتا ہے۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا:

﴿ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۚ ﴾ [البقرة: ٢٨٦]

''اللہ کسی جان کو تکلیف نہیں دیتا مگر اس کی گنجایش کے مطابق۔''

فرمایا:

﴿ فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ ﴾ [التغابن: ١٦] ''سو اللہ سے ڈرو جتنی طاقت رکھو۔''

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((إِذَا أَمَرْتُكُمْ بِأَمْرٍ فَأْتُوْ مِنْهُ مَا اسْتَطَعْتُمْ))[1]

''جب میں تمھیں کوئی حکم دوں تو اپنی استطاعت کے مطابق اسے بجا لاؤ۔''

اللہ سبحانہ وتعالیٰ جب ہمیں کوئی حکم دیتے ہیں تو وہ اس کو کرنے کی قدرت کے ساتھ مشروط ہوتا ہے، لہٰذا جب ہم اس کو پہچاننے سے قاصر ہوں یا اس پر عمل کرنے سے عاجز ہوں تو وہ ہم سے ساقط ہو جاتا ہے، اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے ''لقطہ'' (گری ہوئی چیز) کے متعلق ارشاد فرمایا تھا: اگر اس کا مالک آ جائے تو اس کو دے دے، ورنہ وہ اللہ کا مال ہے جس کو چاہتا ہے دیتا ہے۔''[2] یہ ''لقطہ'' کسی مالک کی ملکیت ہی میں تھا، مگر اس سے گر گیا، جب اس کے مالک کو جاننا ناممکن اور دشوار ترین ہو گیا تو آپ ﷺ نے کہا: ''یہ اللہ کا مال ہے، جس کو چاہتا ہے دے دیتا ہے۔'' اس سے معلوم ہوا کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اس کو اس مالک کی ملکیت سے زائل کر کے اس اٹھانے والے کو دے دیا جو ایک سال تک اس کا اعلان کرتا رہا۔ اس بات میں ائمہ کے ہاں کوئی اختلاف نہیں کہ ایک سال تک اس کا اعلان کرنے کے بعد اٹھانے والا اس کو صدقہ بھی کر سکتا ہے اور اگر غریب ہو تو اپنی ملکیت میں بھی لے سکتا ہے، لیکن اگر وہ مالدار ہو تو کیا تب بھی اپنی ملکیت بنا سکتا ہے؟ اس میں دو مشہور اقوال ہیں؛ شافعی اور احمد کے نزدیک جائز ہے اور احناف کے نزدیک ناجائز۔

اگر کوئی شخص فوت ہو جاتا ہے اور اس کے کسی وارث کا کوئی اتا پتا نہیں ملتا تو اس کا مال مسلمانوں کے مصالح و مفادات میں صرف کر دیا جائے گا، گو نفسِ امر میں اس کا کوئی غیر معروف وارث ہو۔ جب وارث سامنے آ جائے اور اس کی تصدیق ہو جائے تو اس وقت وہ مال اس کے سپرد کر دیا جائے گا، لیکن اس کے سامنے آنے سے پہلے وہ مال جس کو دے دیا گیا اور اس نے استعمال کیا تو اس کا استعمال کرنا جائز ہو گا، حرام نہیں ہو گا۔

اگر یہ بات واضح ہو چکی ہے تو وہ تمام اموال جو چھینے گئے اور ناجائز معاملات کے ذریعے حاصل کیے گئے،

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٨٥٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٣٣٧)

[2] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٥٠٥) السلسلة الصحيحة (٦٢٠)

اگر کسی مسلمان کو ان کی حقیقت معلوم ہو جائے تو اس کو ایسے اموال سے اجتناب کرنا چاہیے، انھیں بطور ہبہ لینا چاہیے نہ بطور معاوضہ، نہ بطور اجرت نہ بطور قیمت اور نہ بطور ادائی قرض، کیوں کہ یہ اس مظلوم کا مال ہے، لیکن اگر کسی نے وہ مال کسی امام کے مذہب میں تاویلِ سائغ جائز کی بنیاد پر لیا ہو تو اس سے ایسا مال کسی چیز کی قیمت یا اجرت کے طور پر اور قرض وغیرہ کے لیے لینا جائز ہوتا ہے۔ اگر وہ مجہول الحال ہو تو مجہول معدوم کی طرح ہوتا ہے۔

مسلمان کے ہاتھ میں جو ہوتا ہے اس میں اصل یہی ہے کہ اگر وہ اس کی ملکیت کا دعویٰ کرے تو وہ اس کی ملکیت ہی سمجھی جائے، یا وہ اس کا سرپرست ہو گا، جس طرح وقف کا ناظم، یتیم کا سرپرست اور بیت المال وغیرہ کا سرپرست ہوتا ہے، یا وہ اس میں وکیل ہو گا۔ جس مال میں مسلمان یا ذمی ملکیت یا ولایت (سرپرستی) کے ذریعے تصرف کرے اس کا تصرف جائز ہوتا ہے۔

اگر انسان کو اس مال کی اصلیت کا علم نہیں جو دوسرے کے پاس ہو تو معاملے کی بنیاد اصل پر رکھی جائے گی، گو وہ پیسہ نفسِ امر میں چھینا جھپٹی کا ہو، مجھے اگر اس کا علم نہیں تو میں اس کے متعلق جاہل اور لاعلم ہوں اور مجہول معدوم کی طرح ہوتا ہے۔ لہٰذا کسی چیز کی قیمت کے عوض یا کسی کام کی اجرت کے طور پر وہ پیسہ لینا میرے لیے حلال ہو گا، لیکن اگر اس شخص کے متعلق مشہور ہو کہ اس کے پاس حرام کا مال ہے تو میں ورع کی بنیاد پر اس سے معاملات کرنا ترک کر دوں گا، لیکن اگر اس کے مال میں زیادہ حرام ہو تو اس میں علما کا اختلاف ہے۔

وہ مسلمان جس کی حالت پوشیدہ ہو، اس کے ساتھ معاملات کرنے میں اصلاً کوئی شبہہ نہیں، جو شخص ایسے شخص سے ورع کی بنیاد پر معاملات کرنا ترک کرتا ہے وہ دین میں ایسی بدعت نکالتا ہے جس کی کوئی دلیل خدا نے نازل نہیں کی۔

اس تفصیل سے ان تمام اموال کا حکم واضح ہو جاتا ہے، چنانچہ وہ تمام اموال جو مسلمانوں اور یہود و نصاریٰ کے پاس ہیں، جن کے بارے میں کسی علامت یا دلالت سے معلوم نہیں ہوتا کہ وہ چھینے گئے ہیں یا اس انداز میں قبضے میں لیے گئے ہیں کہ جس کے ساتھ قابض کا معاملہ کرنا جائز نہ ہو تو بلاشبہہ ان کے ساتھ معاملات کرنا جائز ہے اور اس میں کسی امام کا اختلاف کم از کم مجھے معلوم نہیں۔

یہ تو معلوم ہے کہ لوگوں کے غالب اموال ایسے ہی ہیں، وہ قبضہ جو ملکیت کا فائدہ نہیں دیتا وہ ہے جو ظلمِ محض کی بنیاد پر حاصل کیا گیا ہو، کیوں کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فاسد معاملات کو اس وجہ سے حرام کیا ہے کہ ان میں ظلم ہوتا ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ﴾ [الحدید: ٢٥]

”بلاشبہہ یقیناً ہم نے اپنے رسولوں کو واضح دلیلوں کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور ترازو کو نازل کیا، تاکہ لوگ انصاف پر قائم رہیں، اور ہم نے لوہا اتارا جس میں سخت لڑائی (کا سامان) ہے اور لوگوں کے لیے بہت سے فائدے ہیں اور تاکہ اللہ جان لے کہ کون دیکھے بغیر اس کی اور اس کے رسولوں کی مدد کرتا ہے۔ یقیناً اللہ بڑی قوت والا، سب پر غالب ہے۔“

غصب یعنی لوٹ کا مال اور اس کی تمام اقسام، چوری اور خیانت سب ظلم میں داخل ہیں۔

رہا یہ سوال کہ وہ مال جو عقدِ فاسد کی بنیاد پر لیا جائے، جیسے سود اور قمار بازی وغیرہما ہے، کیا وہ ملکیت کا فائدہ دیتا ہے، اس میں فقہا کے تین اقوال ہیں:

1. حنفی مذہب میں وہ ملکیت کا فائدہ دیتا ہے، یعنی وہ ملکیت بن جاتا ہے۔
2. شافعی اور معروف حنبلی مذہب میں ایسا مال ملکیت کا فائدہ نہیں دیتا۔
3. مالکی مذہب کے مطابق اگر وہ فوت ہو جائے تو ملکیت کا فائدہ دیتا ہے، اگر اس کو اس کے مالک کو واپس کرنا ممکن ہو اور وصف یا ریٹ میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہوئی ہو تو ملکیت کا فائدہ نہیں دیتا۔

ان امور اور قواعد کی تفصیل کسی دوسری جگہ بیان ہو چکی ہے، تاہم اشتباہ سے بچنا اسلام کا ایک بنیادی قاعدہ ہے۔ امام احمد وغیرہ سے منقول ہے کہ اسلام کے اصول ان تین احادیث کے گرد گھومتے ہیں:

1. حلال بھی واضح ہے، حرام بھی۔[1]
2. اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔[2]
3. جس نے کوئی ایسا عمل کیا جس پر ہمارا حکم نہیں تو وہ مردود ہے۔[3]

اعمال کی دو اقسام ہیں:

1. مامورات (جن کا حکم دیا گیا ہے)۔
2. محظورات (جن سے منع کیا گیا ہے)۔

پہلی حدیث میں مامورات (حلال) اور محظورات (حرام) کا ذکر ہے، دوسری میں دل کے ارادے کا ذکر ہے، جسے نیت کہا جاتا ہے اور تیسری میں یہ ذکر ہوا ہے کہ ظاہری عمل میں وہ جائز ہے جو سنت کے مطابق ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٢)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٩٠٧)

[3] صحيح البخاري (٧٥٣/٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧١٨)

﴿ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ﴾ [الملك: ٢]

''تاکہ تمھیں آزمائے کہ تم میں سے کون عمل میں زیادہ اچھا ہے۔''

اس آیت کی تفسیر میں حضرت فضیل بن عیاض سے منقول ہے کہ احسن عمل سے مراد اخلص اور اصوب ہے۔ ان سے پوچھا گیا: اخلص اور اصوب کیا ہے؟ انھوں نے کہا: عمل اگر خالص ہو، لیکن صواب (درست) نہ ہو تو قبول نہیں ہوتا، اور اگر صواب ہو، لیکن خالص نہ ہو تب بھی قبول نہیں ہوتا۔ قبولیت کے لیے خالص اور صواب ہونا ضروری ہے۔ خالص یہ ہے کہ صرف اللہ کے لیے ہو اور صواب یہ ہے کہ سنت کے مطابق ہو۔

گزشتہ معروضات سے واضح ہوتا ہے کہ کہنے والے کی یہ بات کہ موجودہ زمانے میں حلال کھانا دشوار ترین، بلکہ ناممکن ہے، غلط اور اجماع کے خلاف ہے، بلکہ لوگوں کے اموال میں حلال غالب ہے اور حرام سے زیادہ ہے۔ یہ صوفیوں اور فقہا کے ایک گروہ کا قول ہے جو عراق سے ہوتا ہوا مصر پہنچا، پھر جس نے یہ کہا: اس کی منشا کھانے کے دروازے کو بند کرنا نہیں تھی، بلکہ یہ کہنا تھا کہ ایسی صورت میں ورع کی کوئی راہ نہیں۔ چنانچہ صاحبِ عقل کو غور کرنا چاہیے اور اس کو معلوم ہونا چاہیے کہ جو انسان نبوی شرعی اور محمدی قانون سے بغاوت کرتا ہے جو کتاب وسنت کی دلالت اور اجماعِ امت سے ثابت ہے، اس کو ایک دوسرا متناقض قانون بنانے کی ضرورت پیش آتی ہے، جسے عقل قبول کرتی ہے نہ دین، لیکن جو شخص مجتہد ہو اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کی وجہ سے کسی آزمائش سے دوچار ہو تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ اس کو اس کے اجتہاد کا ثواب عطا کرتے ہیں اور اس کی غلطی معاف کر دیتے ہیں۔

﴿ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴾ [الحشر: ١٠]

''اے ہمارے رب! ہمیں اور ہمارے ان بھائیوں کو بخش دے جنھوں نے ایمان لانے میں ہم سے پہل کی اور ہمارے دلوں میں ان لوگوں کے لیے کوئی کینہ نہ رکھ جو ایمان لائے، اے ہمارے رب! یقیناً تو بے حد شفقت کرنے والا، نہایت رحم والا ہے۔'' واللہ أعلم.

سوال میں جو یہ شبہہ ذکر کیا گیا ہے کہ واقعہ منصورہ میں مالِ غنیمت تقسیم نہیں کیا گیا تھا اور غنیمت کا مال دوسرے مال سے مخلوط ہو گیا تھا اس لیے وہ مشتبہ ہو گیا تو اس کے جواب میں دو باتیں عرض ہیں:

پہلی بات یہ ہے کہ ایسا خالص حرام مال جسے طاقتور عہدے دار اور جاگیر دار یا فتنہ پرور لوگوں سے چھین کر اپنے قبضے میں کرتے ہیں یا وہ مال جو بددیانتی کے ذریعے کمایا جاتا ہے اور پھر لوگوں کے مال میں اس کی آمیزش ہو جاتی ہے، اس کی مقدار اس مشتبہ مال سے کہیں زیادہ ہے، خاص طور پر مصر میں ایسے معاملات کی بہتات ہے اور یہاں

پر ہونے والا ظلم شام اور مغرب میں ہونے والے ظلم سے کہیں زیادہ ہے۔ یہاں بد دیانتی، دھوکے بازی اور کسی کے حق کا انکار کرنے کو برائی نہیں سمجھا جاتا، ڈاکوؤں، کسانوں اور دیہاتیوں میں یہ ظلم عام ہے تو ان جیسے مالوں کو حرام قرار دینا اس مال سے اولیٰ اور زیادہ قرینِ قیاس ہے جس کی غنیمت کے ساتھ آمیزش ہو۔

دوسری بات یہ ہے کہ ان غنیموں کے متعلق ہم نے فقہا کا مذہب پیش کر دیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ اگر امام تقسیم کے بغیر لینے کی اجازت دے دے تو یہ صحیح ہے اور اگر اسے ناجائز بھی کہا جائے اور کوئی اپنے حصے سے زیادہ نہ لے تو اس کے لیے یہ لینا جائز ہے۔ اگر وہ اپنے حصے سے زیادہ لے لے اور اس کے لیے اسے ان لوگوں کو واپس کرنا ناممکن ہو جن کا حق ہو، کیونکہ وہ ان کو جانتا نہیں تو ان کی طرف سے صدقہ کر دے۔ اگر وہ ان کی طرف سے صدقہ نہ کرے اور اس میں تصرف کرتا رہے، جب کسی کے پاس اس طرح کے مال سے کوئی چیز آئے اور اس کو اس کی اصلیت کا علم نہ ہو تو وہ نہ اس کے لیے حرام ہے اور نہ اس کو اس کا کوئی گناہ ہی ہے، یہ حکم ان تمام غصب شدہ اموال میں جاری ہے۔

دوسرا شبہہ یہ ہے کہ درہم نے کس طرح تبدیلی قبول کر لی اور حرام سبب کی وجہ سے حرام ہو گیا اور تبدیلی قبول نہیں کی کہ جائز سبب کی وجہ سے حلال ہو جائے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اس نے حرام لوصفہ ہونے کی وجہ سے تبدیلی قبول کی ہے، حرام لکسبہ کی وجہ سے نہیں۔ پہلے کی مثال کے طور پر شراب کو لے لیں۔ یہ جب رس کی صورت میں تھی اس وقت حلال طاہر نہیں ہوئی تھی بلکہ جب پختہ ہو کر شراب کی شکل اختیار کر گئی تب حرام اور نجس ہو گئی۔ اگر وہ اس از خود بغیر کسی انسانی قصد کے پڑا رہنے کی وجہ سے سرکے کی شکل اختیار کرے اور سرکے کی شراب بن جائے تو وہ بالاتفاق حلال اور طاہر ہے۔ اگر اس کو سرکے کی شراب بنانے میں کوئی ارادہ و قصد شامل ہو تب اس کے حرام ہونے میں اختلاف ہے۔ اسی طرح تمام نجاستیں جب تحلیل ہو کر کوئی نئی شکل اختیار کر لیں تو ان کی حلت و حرمت میں اختلاف ہے، مثلاً نجاست راکھ بن جائے، یا خنزیر نمک بن جائے تو شافعی کے نزدیک یہ طاہر نہیں اور مالک اور احمد کے مذہب میں ایک قول کے مطابق یہ طاہر ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ غصب شدہ مال ظلم کے ساتھ چھیننے کی وجہ سے حرام ہوتا ہے، اگر صحیح حق کی وجہ سے قبضے میں کر لیا جائے، مثلاً مالک چھیننے والے کو اجازت دے دے، یا اس کو ہبہ کر دے، یا اس کو فروخت کر دے، پھر غاصب کسی ایسے شخص کو وہ مال دے جس کو اس کے غصب شدہ ہونے کا علم نہ ہو تو اس کا قبضہ صحیح ہو گا، کیونکہ اللہ نے کسی کو اس بات کا مکلف نہیں بنایا جسے وہ نہیں جانتا۔ واللہ أعلم [1]

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۲۹/۳۱۱۔۳۳۲)

قرض سے فائدہ اٹھانے کا حکم

سوال ایک آدمی نے ایک شخص سے ایک ہزار درہم کا گھر خریدا، حالانکہ وہ دو ہزار کے برابر ہے، پھر فوراً اسی تاریخ میں خریدنے والے نے بیچنے والے کو وہ گھر کچھ مہینوں کے لیے مقررہ درہموں کے عوض کرائے پر دے دیا، جب کہ باطنی طور پر وہ ان دونوں کے درمیان بیع امانت ہے۔ کیا یہ عقد اور معاملہ صحیح ہے، کیا کرائے کی مدت میں اصل فروخت کرنے والے پر کرایہ ادا کرنا لازم ہے؟

حضرت ابی بن کعب، ابن مسعود اور ابن عباس رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے قرض سے منع کیا جو نفع کش ہو۔[1] کیا یہ معاملہ اس نوعیت سے تعلق رکھتا ہے؟

نیز کیا کسی حدیث میں یہ ذکر ہوا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی سے اونٹ ادھار لیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جب صدقے کے اونٹ آئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آدمی کو اونٹ دینے کا حکم دیا، لیکن صدقے میں جو اونٹ آئے تھے وہ اس کے اونٹ سے بہتر تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ بہتر اونٹ اس شخص کو دینے کا حکم دیا اور فرمایا: ''تم میں سے بہتر وہ ہے جو ادا کرنے میں بہتر ہو۔''[2]

جواب اگر مقصود یہ ہے کہ ایک شخص دوسرے سے درہم لے اور جتنی مدت تک درہم اس کے ذمے ہوں، اتنی مدت تک دینے والا اس کی زمین سے فائدہ اٹھائے، جب وہ درہم واپس کرے تو اس کی زمین اس کو لوٹا دے، یہ بلاشبہ حرام اور درہم کے بدلے برابر درہم اور ساتھ زمین کا فائدہ ہے، یہ بالکل واضح سود ہے۔

علما کا اتفاق ہے کہ قرض دینے والا جب اپنے قرض پر اضافے کی شرط لگائے تو وہ حرام ہو جائے گا، اسی طرح علما کے صحیح قول کے مطابق اگر وہ دونوں اس کام پر آپس میں اتفاق کر لیں، تب بھی وہ سود ہی ہوگا۔

صحیح حدیث ہے:

«لَا يَحِلُّ سَلَفٌ وَّبَيْعٌ، وَلَا شَرطَانِ فِي بَيْعٍ، وَلَا رِبْحَ مَا لَمْ يَضْمَنْ، وَلَا بَيْعَ مَا لَيْسَ عِنْدَكَ»[3]

''قرض اور بیع، ایک بیع میں دو شرطیں، غیر مضمون نفع اور جو پاس موجود نہ ہو اس کی بیع حلال نہیں۔''

---

[1] سنن البيهقي الكبرىٰ (٥/٣٤٩، ٣٥١)، (٦/٣٩) شیخ البانی رحمہ اللہ نے إرواء الغليل (١/٢٧٤) میں اسے صحیح کہا ہے۔

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢١٨٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٠١)

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٥٠٤) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٢٣٤) سنن النسائي. رقم الحديث (٤٦١١) صحيح الجامع، رقم الحديث (٧٦٤٤)

رسول اللہ ﷺ نے قرض اور بیع کو جمع کرنا حرام قرار دیا ہے، کیوں کہ جب کوئی انسان کسی کو قرض دے اور اس کو فروخت بھی کرے تو وہ قرض کی وجہ سے لامحالہ اس کے ساتھ جانبداری کا مظاہرہ کرے گا۔ اسی طرح کرائے پر دینے اور ساتھ ہی فروخت کرنے میں بھی یہی قباحت موجود ہے۔ بظاہر انھوں نے جس کو بیع امانت کا نام دیا ہے، جس میں اس بات پر معاہدہ ہے کہ وہ جب اس کی قیمت لے آئے گا تو وہ اس کو وہ فروخت شدہ چیز واپس کر دے گا۔ یہ معاہدہ تمام ائمہ کے نزدیک باطل ہے، چاہے انھوں نے معاہدے میں یہ شرط رکھی ہو یا معاہدے سے پہلے ہی اس پر آپس میں اتفاق کر رکھا ہو۔ صحیح ترین قول یہی ہے۔ اس جیسے معاملے میں وہ زمین اس کے مالک کو اور مال، مال کے مالک کو واپس کیا جائے اور ان دونوں اشخاص کو تعزیری سزا دی جائے، اگر انھیں اس کی حرمت کا علم ہے تو۔

وہ قرض جو نفع لاتا ہو، اس کے متعلق نہی کئی صحابہ کرام کی روایت سے ثابت ہے۔ ان میں سے کچھ کا ذکر سائل نے کیا ہے اور کچھ یہ ہیں: حضرت عبداللہ بن سلام، حضرت انس بن مالک، یہی حدیث ابن ماجہ وغیرہ میں مرفوع بھی مروی ہے۔

صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ سے منقول ہے:

”تو ایک ایسی زمین کا باشندہ ہے، جہاں سود عام ہے۔ جب تو کسی شخص کو قرض دے اور وہ تحفے میں تجھے (جانور کو کھلائی جانے والی توڑی کے) ایک تنکے کے وزن کے برابر دے تو اس کو بھی اس کے قرض میں شمار کر لینا۔“[1]

ایک آدمی نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے کہا: میں نے ایک مچھلی فروش کو بیس درہم بطور قرض دیے۔ اس نے مجھے تحفے میں ایک مچھلی دی۔ میں نے اس کی قیمت تیرہ درہم نکالی تو انھوں نے کہا: اس سے صرف سات درہم لینا۔“ اونٹ والی حدیث صحیح ہے۔

اگر مقروض قرض خواہ کو، پہلے سے کسی معاہدے اور اتفاق کے بغیر کوئی بہتر چیز لوٹاتا ہے تو یہ جائز ہے، اور اگر وہ اس کو اس کے قرض سے زیادہ لوٹاتا ہے تو اس میں علما کے دو اقوال ہیں۔

اس کی تفصیل اس طرح ہے کہ یہ اضافہ قرض ادا کرنے کے بعد ہے، اس تحفے کے عکس جو ادا کرنے سے پہلے اس کو دیا جائے، کیوں کہ اگر وہ اس (تحفے کو) اس کے قرض میں شمار نہیں کرتا تو قرض اس کے ذمے باقی رہے گا، جس کو وہ تحفے کے باوجود اس سے وصول کرے گا، جب کہ یہ تحفہ صرف اس قرض کی وجہ سے تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

”کیسی عجیب بات ہے کہ ایک آدمی کو ہم عامل بناتے ہیں تو وہ کہتا ہے: یہ تمھارا ہے اور یہ مجھے تحفے میں ملا ہے۔ وہ ذرا اپنے باپ یا ماں کے گھر بیٹھتا، پھر دیکھا جاتا کہ اس کو تحفہ ملتا ہے یا نہیں؟!“[2]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٦٠٣)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٧٧٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٨٣٢)

اس میں یہ بات بیان ہوئی ہے کہ تحفہ جس سبب سے ہو، اس کو اسی کے ساتھ ملایا جائے گا، اسی لیے صحابہ کرام اور جمہور ائمہ سے منقول ہے کہ قرض ادا کرنے سے پہلے کا تحفہ مقروض کے حق میں شمار ہوگا، ادا کرتے وقت صفتِ ادا میں اضافے کے برخلاف۔

رہی بات صورتِ مسئولہ کی جس میں ان دونوں نے اس پر اتفاق کیا ہے کہ وہ پیسے دے کر اس سے وہ زمین خرید لے، پھر اس کو ایک مدت کے لیے کرائے پر دے دے، جب وہ قیمت لے کر اس کے پاس آئے تو وہ زمین اس کو واپس کر دے۔ یہاں یہ مقصود ہے کہ جس کو کچھ دیا گیا ہے اس نے اتنی مدت تک اجرت ادا کی ہے، جتنی دیر مال اس کے ذمے باقی رہا۔ یہاں منفعت حاصل کرنے اور منفعت کے عوض میں کوئی فرق نہیں، سب حرام ہے۔ یہاں گو کچھ فقہا نے اس بنیاد پر رخصت دی ہے کہ معاہدے میں یہ شرط نہیں رکھی گئی تھی اور مواطات اور نیت معاہدوں پر کچھ اثر انداز نہیں ہوتے، لیکن درست قول، جس پر کتاب وسنت بھی دلالت کرتے ہیں اور صحابہ کا اتفاق بھی ہے، اکثر ائمہ کا قول ہی ہے جو اس جیسے معاملات کے حرام ہونے کے قائل ہیں اور ان کے نزدیک نیتیں معاہدوں میں معتبر ہوتی ہیں، کیوں کہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''بلاشبہہ اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔''[1] ہر بندے کے لیے وہ ہے جو اس نے نیت کی۔'' اور شرط متقدم (پہلے لگائی گئی شرط) شرطِ مقارن، یعنی اسی شرط کی طرح ہے جو معاہدہ کرتے وقت ساتھ لگائی جاتی ہے۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے سورت قلم اور ہفتے والوں کے قصے میں ایسے لوگوں کو سرزنش کی ہے جو حیلوں، بہانوں اور دھوکے بازیوں سے فرائض کو ساقط اور محرمات کو حلال کرتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: ''اس کا ارتکاب نہ کرو، جس کا ارتکاب یہود و نصاریٰ نے کیا کہ تم ادنیٰ حیلوں کے ذریعے اللہ کی حرام کردہ چیزوں کو حلال کر دو۔''[2]

حضرت ایوب سختیانی کا قول ہے: ''وہ اللہ کو اس طرح دھوکا دیتے ہیں جس طرح بچوں کو دھوکا دیا جاتا ہے، اگر وہ حکم پر اسی طرح عمل کرتے جس طرح کہا گیا ہے تو یہ (مجھ پر) بہت آسان ہوتا۔'' واللہ أعلم

شرط کے متعلق جامع قاعدہ:

دین کی اصل یہ ہے کہ واجب، حرام، مکروہ، حلال یا مستحب وہ چیز ہوگی جسے اللہ اور اس کے رسول نے واجب، حرام، مکروہ، حلال یا مستحب قرار دیا ہے، چنانچہ وہی حلال ہے جسے شریعت حلال قرار دے اور وہی حرام ہے

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۱) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۹۰۷)
[2] شیخ البانی رحمہ اللہ نے إرواء الغلیل (۳۰۳/۱) میں اسے صحیح کہا ہے۔

جس کو خدا اور اس کا رسول حرام کہے۔ دین صرف وہ ہے جسے خدا اور رسول نے شریعت بنایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے مشرکوں کی دین سازی اور چیزوں کو حلال وحرام کرنے کی مذمت کی ہے۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ بندے پر جو حکم واجب کرتے ہیں، اس کو کبھی ابتداءً ہی کرتے ہیں، جس طرح ہر بندے پر ایمان وتوحید کو اختیار کرنا واجب ہے اور کبھی اس وجہ سے واجب و لازم کرتے ہیں کہ بندہ خود اس کام کو اپنے اوپر لازم کر لیتا ہے، اگر اس طرح نہ ہو، یعنی بندہ اس کو اپنے اوپر لازم نہ کرے تو اللہ بھی اس کو اس پر لازم نہیں کرتے، جس طرح کوئی شخص نذر مانتا ہے تو اس کو پورا کرنا اس پر لازم ہو جاتا ہے یا وہ تمام التزامات اور شروط جن کو بندہ بیع، نکاح اور طلاق وغیرہ جیسے مباح اور جائز کاموں میں عائد کرتا ہے۔ اگر یہ واجب نہ ہو تو وہ کبھی ان دو امور کی وجہ سے واجب کر دیتا ہے:

1. سننے اور ماننے میں رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کی بیعت۔
2. ائمہ اور والیانِ اسلام کی بیعت، مثلاً اللہ اور اس کے رسول کے حکم پر عمل کرنے کے لیے لوگوں کا معاہدہ اور عہد کر لینا۔

اسلامی احکام کا التزام اسی باب سے تعلق رکھتا ہے۔ مومن ایمان اور کلمہ شہادت کے موجب ان کو اپنے اوپر لازم کرتا ہے، کیوں کہ یہ شہادت اپنے موجب کی پاسداری لازم کرتی ہے، جس کا مطلب ہے: رسول کو اللہ کی طرف سے جو کچھ دیا گیا ہے اس کی تصدیق کرنا اور جو رسول نے حکم دیا ہے اور لازم کیا ہے اس کو بجا لانا، کیوں کہ رسول کی اطاعت اللہ کی اطاعت اور رسول کی نافرمانی، اللہ کی نافرمانی ہے۔

یہاں یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ اصلِ شریعت یہی ہے کہ بندے پر جو کچھ لازم اور واجب ہوتا ہے وہ شارع کے لازم کرنے سے ہوتا ہے یا پھر بندے کا خود اپنے اوپر لازم کرنے سے۔ جب فقہا اس اصل کی کسی فرع میں اختلاف کریں تو اس فرع کو اسی اصل کی طرف لوٹایا جائے گا۔ یہ قاعدہ بھی ہے کہ شروط میں اصل صحت یعنی صحیح ہونا اور لزوم ہے مگر وہ کہ جس کے خلاف کوئی دلیل آ جائے۔ یہ بھی قول ہے کہ شروط میں اصل عدمِ صحت ہے مگر وہ کہ کوئی دلیل اس کی صحت پر دلالت کرے۔ اس کی دلیل حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے جس میں رسول اللہ ﷺ نے ان کو ولاء کی شرط پر لونڈی خریدنے کا کہا تھا۔ تاہم پہلا قاعدہ ہی صحیح ہے، کیوں کہ کتاب وسنت وعدوں اور معاہدوں کو پورا کرنے پر دلالت کرتے ہیں اور وعدہ خلافی اور غداری کی مذمت کرتے ہیں، لیکن یہ اس وقت ہے جب مشروط کتاب اللہ اور اس کی شرط کے خلاف نہ ہو، اگر مشروط کتاب اللہ اور اس کی شرط کے مخالف ہو تو وہ شرط باطل ہوگی۔ رسول اللہ ﷺ نے جو یہ فرمایا ہے:

«مَنِ اشْتَرَطَ شَرْطاً لَيْسَ فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ فَهُوَ بَاطِلٌ وَإِنْ كَانَ مِائَةَ شَرْطٍ كِتَابُ اللّٰهِ أَحَقُّ وَشَرْطُ اللّٰهِ أَوْثَقُ» [1]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٤٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٥٠٤)

”جس نے ایسی شرط لگائی جو کتاب اللہ میں نہیں تو وہ لغو ہے، خواہ سو شرطیں ہوں۔ کتاب اللہ کا زیادہ حق ہے اور اللہ کی شرط زیادہ ثقہ ہے۔“

اس حدیث کا مفہوم وہی ہے جو اوپر ذکر ہوا ہے۔

آپ ﷺ کا فرمانا: «مَنِ اشْتَرَطَ شَرْطاً» یہاں شرط سے مراد مشروط ہے اور «لَيْسَ فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ» کا مفہوم ہے وہ مشروط کتاب اللہ میں نہ ہو، تو وہ اللہ کی مباح کردہ نہیں، مثلاً: غیر معتق کے لیے ولا کی شرط غیر والد کے لیے نسب کی شرط، نکاح یا مملوکیت کے بغیر جماع کرنے کی شرط وغیرہ، اسی طرح مہر کے بغیر نکاح کی شرط اور اس قبیل کی وہ تمام شرائط جو کسی صورت جائز نہیں۔ اسی وجہ سے آپ ﷺ نے فرمایا: «كِتَابُ اللّٰهِ أَحَقُّ وَشَرْطُ اللّٰهِ أَوْثَقُ» یعنی جب مشروط کتاب اللہ اور اس کی شرط کے مخالف ہو تو کتاب اللہ اور اس کی شرط کو مقدم رکھنا واجب اور ضروری ہے۔

اگر وہ نفسِ شرط اور مشروط ایسی چیز ہو جس کی حلت کی کوئی نص نہ ہو، بلکہ وہاں کتاب اللہ خاموش ہو تو وہ کتاب اللہ اور اس کی شرط کے مخالف نہیں، بہرحال شرط سے مراد مصدر یا مفعول یعنی مشروط جب کہ ان دونوں میں سے کوئی ایک چیز بھی کتاب اللہ کی مخالف ہو گی تو لامحالہ دوسری بھی اس کے مخالف ہی ہو گی، لیکن وہ نہیں جس کے متعلق کتاب اللہ خاموش ہو، یہ قاعدہ ہے۔

دوسرا قاعدہ: اگر فریقین صرف اس شرط پر راضی ہوں جو کتاب اللہ کے مخالف ہو تو وہ ایسی چیز کا التزام کریں گے جس کو اللہ نے حرام کیا ہے، اس لیے وہ لازم نہیں ہو گی، جس طرح کوئی شخص نافرمانی کی نذر مانتا ہے، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا وہ دونوں اس کی حرمت کو جانتے ہوں یا نہ جانتے ہوں۔

اگر ایک فریق نے دوسرے پر ایسی شرط رکھی جس کے جواز کا قائل ہو اور وہ اس کے علاوہ کسی اور بات پر متفق اور راضی نہ ہو تو وہ عقد اور معاہدہ اس پر لازم نہیں ہو گا، إلا یہ کہ اس نے اللہ کے لیے اس کا التزام کیا ہو۔

ایسی صورت میں جو اللہ کے لیے ہو گا وہ لازم ہو گا جو اللہ کے لیے نہیں ہو گا، وہ لازم نہیں ہو گا، جس طرح وقف، نذر اور وصیت وغیرہ جیسے امور ہیں، جن میں سودا متفرق ہوتا ہے اگر اس کو معلوم ہو جائے کہ وہ معاملہ اور اس کی شرط حرام ہے تو وہ اہلِ بریرہ رضی اللہ عنہا کی شرط کی طرح ہے، یعنی اس کی شرط باطل ہے، لیکن عقد باطل نہیں۔

یہاں نکاح اور بیع اور دیگر عقود، یعنی معاہدوں میں کوئی فرق نہیں، کچھ فقہا نکاح میں بہت سی شرطوں کو بلا دلیل ہی باطل کہتے ہیں، بلکہ نکاح کی شروط زیادہ تاکیدی ہیں، کیوں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

«إِنَّ أَحَقَّ الشُّرُوْطِ أَنْ تُوْفُوْا بِهِ مَا اسْتَحْلَلْتُمْ بِهِ الْفُرُوْجَ» [1]

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۲۵۷۲) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۴۱۸)

''وہ شرط جس کے ذریعے تم شرم گاہوں کو حلال کرتے ہو، سب سے زیادہ پورا کرنے کا حق رکھتی ہے۔''

تاہم ہر وہ شرط جو مباح ہو، وہ لازم ہو جاتی ہے اور اسے پورا کرنا ضروری ہو جاتا ہے، اگر اسے پورا نہ کیا جائے تو فسخ ثابت ہو جاتا ہے۔ اگر شرط باطل ہو اور شرط لگانے والے کو اس کے باطل ہونے کا علم نہ ہو تو عقد لازم نہیں ہوگا، بلکہ اگر وہ شرط کے بغیر راضی ہو جائے تو معاملہ طے ہو جائے گا، ورنہ فسخ ہو جائے گا۔ یہی اصل اور قاعدہ ہے۔ اگر ایسا عقد لازم کیا جائے جس پر دوسرا فریق راضی نہ ہو اور شریعت بھی اس کو لازم نہ کرتی ہو تو یہ بات اصولِ شریعت کے خلاف اور عدلِ الٰہی کے بھی خلاف ہے۔ (ملخصاً)[1]

سودا باقی رکھنے یا ختم کرنے کے اختیار کا مسئلہ

جواب دو آدمیوں نے ایک چیز کی خرید و فروخت کی اور دونوں نے مدتِ مقررہ میں بیع کو فسخ کرنے اور جاری رکھنے کی شرط لگائی۔ سوال یہ ہے کہ اختیار فسخ کا ہے یا امضاء (تکمیل تک پہنچانے) کا؟ یا صرف فسخ کا اور جاری رکھنے کا ذکر لغو سمجھا جائے یا دونوں ہی غیر معتبر ہوں؟ اگر امضاء کا ذکر لغو سمجھا جائے تو کوئی اشکال نہیں، لیکن اگر دونوں الفاظ کو معتبر سمجھا جائے تو حکم میں دونوں لفظوں کا اثر ہوگا، اگر ایک امضاء (جاری رکھنے) کو اختیار کرے اور دوسرا فسخ کو تو کس کی بات معتبر ہوگی؟ فتویٰ عنایت فرما کر عند اللہ ماجور ہوں۔

جواب الحمد للہ. اگر معاملہ ایسے ہی ہے جیسے سوال میں ذکر ہوا ہے اور ایک نے بیع کو فسخ کرنا چاہا ہے تو وہ دوسرے کی رضا مندی کے بغیر اسے فسخ کر سکتا ہے، چاہے دوسرے نے امضاء کو پہلے اختیار کر لیا ہو، فسخ کے ساتھ متصل امضاء کا مقصد ترکِ فسخ ہوتا ہے، یعنی دونوں ہی اس کو فسخ بھی کر سکتے ہیں اور نہیں بھی، اگر مدت ختم ہونے تک ان دونوں میں کوئی ایک بھی اس کو فسخ نہ کرے تو اس سے یہ مقصود نہیں ہوتا کہ دوسرا عقد کا التزام کرے، کیوں کہ اس کی یہ تشریح اس بات کے منافی ہے کہ دوسرے کو فسخ کا اختیار ہو، حالانکہ اس نے دونوں کو فسخ کا اختیار دیا ہے۔

اگر امضاء سے مراد یہ ہے کہ اس نے اپنی طرف سے عقد کو جاری کر دیا ہے، یعنی اپنا حقِ اختیار ختم کر دیا ہے تو یہ بات صحیح ہے، لیکن اگر اس نے اپنا حقِ اختیار چھوڑ دیا ہے تو اس سے دوسرے کا حقِ اختیار ساقط نہیں ہوتا۔ تاہم اس جیسی عبارت کا معروف مفہوم یہی ہے کہ دونوں میں سے ہر ایک کو اس کو فسخ کرنے اور فسخ نہ کرنے کا اختیار حاصل ہے، اگر کوئی ایک اس کو فسخ نہیں کرتا تو وہ اس کو جاری ہی کرتا ہے۔ اس کی نظیر اور مثال یہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۲۹/۳۳۳۔۳۳۶)

﴿ وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ أَوْ سَرِّحُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ ﴾

[البقرة: ٢٣١]

''اور جب تم عورتوں کو طلاق دو، پس وہ اپنی عدت کو پہنچ جائیں تو انھیں اچھے طریقے سے رکھ لو، یا انھیں اچھے طریقے سے چھوڑ دو۔''

تسریح یعنی چھوڑ دینا ترکِ امساک ہے، یعنی وہ اس عورت کو محبوس نہ رکھے، بلکہ چھوڑ دے۔ اب تسریح احداثِ طلاق (نئے سرے سے طلاق دینے) کی محتاج نہیں، اسی طرح امضائے عقد بھی احداثِ امضاء کا محتاج نہیں، بلکہ وہ خود بخود ختم ہو جاتا ہے۔ واللہ أعلم [1]

مقررہ قیمت سے بڑھا کر بیچنے کا حکم

سوال ایک شخص سامان بیچتے وقت اس حد تک سودے بازی بڑھا دیتا ہے کہ وہ اس چیز کو معتاد اور معمول کی قیمت سے بہت زیادہ مہنگا کر کے بیچتا ہے اور بعض اوقات خریدنے والا اصل قیمت سے لاعلم ہوتا ہے، کیا ایسا کرنا جائز ہے؟

جواب اگر خریدنے والا چیز کی قیمت سے ناواقف ہو تو بیچنے والے کے لیے اس کو عرف اور معمول کی قیمت سے زیادہ مہنگا کر کے غبن کرنا (ٹھگنا) جائز نہیں، بلکہ معتاد قیمت یا اس کے برابر برابر قیمت پر فروخت کرے۔ اگر وہ اس کے ساتھ کھلا غبن کرے تو خریدار کو سودا فسخ کرنے کا بھی اختیار ہے اور امضاء یعنی جاری رکھنے اور تکمیل تک پہنچانے کا بھی۔ حدیث میں آیا ہے:

((غَبْنُ الْمُسْتَرْسِلِ رِباً)) [2]

''مسترسل، (قیمت سے ناواقف شخص اور سودے بازی نہ کرنے والے) کو ٹھگنا سود ہے۔''

صحاح میں حدیث ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے باہر سے سامان لے کر آنے والے قافلے کو بازار میں سامان اتارنے سے پہلے ملنے سے منع کیا، [3] کیوں کہ فروخت کرنے والا بازار اور منڈی میں آنے سے پہلے سامان کی قیمت اور ریٹ سے ناواقف ہوتا ہے، اس لیے آنحضرت ﷺ نے خریدار کو بازار میں آنے سے پہلے، اس کے پاس جانے اور خریدنے سے منع کیا، کیوں کہ اس میں دھوکے بازی اور تلبیس کاری کا قوی امکان ہوتا ہے۔ بنا بریں آپ ﷺ نے مُسترسل کو اختیار کا حق دیا ہے۔ جب اس کے سامنے حقیقتِ حال واضح ہو جائے تو وہ اس کو ختم کرنا چاہے تو ختم کر

---

[1] مجموع الفتاویٰ (٢٩/٣٥٧-٣٥٨)

[2] المعجم الكبير (١٢٦/٨) سنن البيهقي الكبرىٰ (٣٤٩/٥) السلسلة الضعيفة (٦٦٧، ٦٦٨)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٠٤٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٥٢١)

سکتا ہے، جاری رکھنا چاہے تو جاری رکھ سکتا ہے۔ لہٰذا جو شخص قیمت سے ناواقف ہو اس کو کسی طرح بھی دھوکا دینا اور ٹھگنا جائز نہیں۔ جو بازار کا ریٹ ہو اس کے مطابق ہی اس کو سودا فروخت کیا جائے۔

غبن، یعنی بہت زیادہ نفع کمانے کی حد کیا ہے۔ کچھ علما کو اس کا ایک تہائی کے برابر قرار دیتے ہیں۔ کچھ چھٹے حصے کے برابر اور کچھ کا کہنا ہے کہ اس میں عرف کا لحاظ کیا جائے گا، یعنی عرف میں جس کو غبن تصور کیا جائے۔ جو شخص سودے بازی کر کے قیمت کم کرا لیتا ہے۔ تاجر اس کی کسر ایسے شخص سے نکالتے ہیں جو سودے بازی نہیں کرتا اور جتنے پیسے مانگے جائیں، بلاچون و چرا ادا کر دیتا ہے۔

جس شخص کے متعلق معلوم ہو کہ یہ غبن کرتا ہے، اس کو سزا دی جائے اور مسلمانوں کے بازار میں بیٹھنے سے روک دیا جائے۔ جس کے ساتھ دھوکا کیا گیا ہو وہ سامان واپس کرے اور اپنے پیسے واپس لے۔ غبن کرنے والا ظالم اگر توبہ کرے تو وہ مظلوموں کے حقوق واپس کرے۔ اگر ایسا ممکن نہ ہو تو غبن اور ظلم کی مقدار کے مطابق صدقہ کرے، تاکہ اس سے بری الذمہ ہو۔

سودے بازی اگر ایسے لوگوں سے ہو جو اکثر اوقات خریدتے ہیں اور ریٹ سے واقف ہوتے ہیں تو جس طرح دوسرے لوگوں کو سامان بیچا جاتا ہے ان کو بھی اسی طرح بیچا جائے، مُسترسِل سے دوسروں کی نسبت زیادہ قیمت وصول نہ کی جائے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص کسی سے کچھ خریدنے پر مجبور ہو تو اس کی مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھا کر چیزیں مہنگی بیچنا بھی جائز نہیں، چاہے وہ ضروریاتِ زندگی کی اشیا ہوں۔ سنن میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مضطر، یعنی مجبوری کی بیع سے منع کیا ہے۔

اسی طرح ایسی ملاوٹ شدہ چیز جس میں ملاوٹ کی مقدار معلوم ہو، خریدار کو معلوم بھی ہو اور وہ دوسرے کو دھوکے میں نہ رکھے تو اس کو فروخت کرنا جائز ہے۔ اگر اس کی مقدار نامعلوم ہو، مثلاً: پانی ملا دودھ جس میں پانی کی مقدار معلوم نہیں ہوتی، یہ منع ہے، چاہے خریدار کو اس کے ملاوٹ شدہ ہونے کا علم ہو، کیوں کہ رسول اللہ ﷺ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے دودھ بیچنے کے لیے اس میں پانی ملانے سے منع کیا۔[1] جو انسان ملاوٹ شدہ چیز بیچتا ہے، اس کی ساری قیمت اس پر حرام نہیں ہوتی، بلکہ جتنی ملاوٹ ہوئی ہے، اتنی قیمت حرام ہوتی ہے، اس لیے وہ اس کو اتنے پیسے واپس کر دے۔ اگر ایسا ممکن نہ ہو تو اتنی مقدار میں صدقہ کر دے، مثلاً: کوئی کسی کو ملاوٹ شدہ چیز دس روپے میں فروخت کرتا ہے، اگر وہ چیز خالص ہوتی تو تب اس کی قیمت دس روپے تھی، ملاوٹ کی صورت میں وہ آٹھ روپے کی رہ جاتی ہے۔ اگر مشتری کو معلوم ہو جائے تو وہ چاہے تو سودا ختم کر دے اور چاہے تو دو روپے واپس لے لے۔ اگر بائع کے لیے مشتری کو تلاش کرنا ممکن نہ ہو تو وہ روپے صدقہ کر دے۔ واللہ أعلم[2]

---

[1] الضعفاء للعقيلي (٤/٢٠٥)

[2] مجموع الفتاویٰ (٢٩/٣٥٩-٣٦٢)

سیمیاء (جادوگری) اور کیمیا گری کی حقیقت اور حکم

سوال کہا جاتا ہے کہ سیمیاء (جادوگری) اور کیمیا گری انبیا اور اولیا کے علوم میں سے دو علم ہیں، اس کی کیا حقیقت ہے؟

جواب جو کہتا ہے کہ سیمیاء اور کیمیا گری انبیا اور اولیا کے علوم ہیں، وہ جھوٹا اور افترا پرداز ہے۔ کسی نبی کے بارے میں ایسی کوئی بات معروف نہیں کہ اس نے ان کے بارے میں کچھ کہا ہو۔ اسی طرح امت کے ہاں قبولیت حاصل کرنے والے کسی ولی سے بھی ان علوم کے متعلق کچھ بھی منقول نہیں۔

سیمیاء جادو ہے اور جادو کے متعلق قرآن کا ارشاد ہے:

﴿ وَلَا يُفْلِحُ السَّاحِرُ حَيْثُ اَتٰى ﴾ [طٰهٰ: ٦٩]

''اور جادوگر کامیاب نہیں ہوتا جہاں بھی آئے۔''

بلاشبہ جادوگر بعض اوقات انبیا اور اولیا کی مشابہت اختیار کر لیتے ہیں اور ایسی چیزیں پیش کرتے ہیں جن کے بارے میں گمان کیا جاتا ہے کہ اس سے ملتا جلتا کام کوئی نبی ہی کر سکتا ہے، جس طرح فرعون کے جادوگروں نے وہ چیز پیش کی جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزے سے ملتی جلتی تھی۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَاَلْقٰى مُوْسٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِيَ تَلْقَفُ مَا يَاْفِكُوْنَ ۝ فَاُلْقِيَ السَّحَرَةُ سٰجِدِيْنَ ﴾ [الشعراء: ٤٥، ٤٦]

''پھر موسیٰ نے اپنی لاٹھی پھینکی تو اچانک وہ ان چیزوں کو نگل رہی تھی جو وہ جھوٹ بنا رہے تھے۔ تو جادوگر نیچے گرا دیے گئے، اس حال میں کہ سجدہ کرنے والے تھے۔''

کیمیا گری سونے اور چاندی جیسی چیز بنانے کا نام ہے۔ کیمیا گری صرف انہی دو دھاتوں کے ساتھ خاص نہیں، بلکہ کیمیا کے ذریعے جواہر بھی بنائے جاتے ہیں، خوشبویات بھی اور کئی خوردنی اشیا بھی۔ یہ کیمیا گری یقیناً لغو کام ہے اور شرعی طور پر حرام ہے، کیوں کہ اس میں نقلی اور جعلی چیزیں بنا کر دھوکا دیا جاتا ہے اور فرمانِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

((مَنْ غَشَّ فَلَيْسَ مِنَّا))[1] ''جس نے دھوکا دیا، وہ ہم سے نہیں۔''

لہٰذا کیمیا گری بھی دھوکے کی قبیل سے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز قدر اور اندازے کے ساتھ پیدا کی ہے اور مخلوق یعنی لوگ اللہ کی تخلیق کی طرح نہیں بنا سکتے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ اَمْ جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ خَلَقُوْا كَخَلْقِهٖ ﴾ [الرعد: ١٦]

''یا انھوں نے اللہ کے لیے کچھ شریک بنا لیے ہیں جنھوں نے اس کے پیدا کرنے کی طرح پیدا کیا۔''

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠١)

صحیح حدیثِ قدسی میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

''اس سے بڑا ظالم کون ہے جو مجھ جیسی تخلیق کرنے چلا، وہ ایک ذرہ ہی بنا دیں یا جو کا ایک دانہ ہی؟!''[1]

فلسفیوں کا کہنا ہے: مصنوعی چیز فطری چیز کی طرح کام نہیں کرتی، یعنی مصنوعی سونا اور چاندی فطری سونے چاندی کی طرح نہیں ہوتے جو جسموں میں جاری قوتِ طبعی سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس لیے مخلوق نے جو کچھ بنایا ہے، اس میں سے کوئی چیز بھی خالق کی بنائی ہوئی چیز کی طرح نہیں، البتہ بعض وجوہ میں مشابہت ہوتی ہے۔ مخلوق مصنوع نہیں ہوتی اور مصنوع مخلوق نہیں۔ یہ قاعدہ مسلمانوں کے ہاں بھی ثابت ہے اور طبیعات پر بحث کرنے والے متقدمین فلاسفہ کے ہاں بھی۔

کیمیا گری کے موضوع پر لکھنے والے سب سے پہلے اور پچھلے دانشور اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس سے اصل سونا نہیں بنتا، بلکہ یہ سونے کے مشابہ ہے۔ معدنی سونے کی طرح سونا بنانا ممکن نہیں۔ مصنوعی سونے کی حقیقت آج نہیں تو کل کھل ہی جاتی ہے، تاہم مصنوعی سونا کبھی اتنی کاریگری سے بنایا جاتا ہے کہ وہ اصل کے ساتھ شدید مشابہت رکھتا ہے اور کبھی اس طرح کا بنتا ہے کہ وہ دور سے بھی اصل جیسا نہیں لگتا۔ واللہ أعلم[2]

جادو کی حقیقت اور اس کا حکم

سوال کیا جادو موجود ہے اور اس کو سیکھنا سکھانا جائز ہے؟ نیز کیا تردید کی غرض سے سیکھنا سکھانا جائز ہے؟

جواب الحمد للّٰه. ہاں جادو موجود ہے، مگر اس کو سیکھنا سکھانا اور عمل میں لانا جائز نہیں۔ اگرچہ ایسی مہارت ہونا ضروری ہے جس کے ذریعے جادو اور غیر جادو میں فرق کیا جا سکے، جس طرح کوئی بھی مسلمان شراب اور مشروب میں چکھے بغیر اور بدکاری اور نابدکاری کو ذاتی تجربے میں لائے بغیر فرق کر سکتا ہے۔ اسی طرح کسی حرام عقیدے اور عمل کو اس پر یقین رکھنے اور عمل کرنے کی نیت سے تفصیلی طور پر سیکھنے اور جاننے کے عکس صرف صحیح اور غلط میں فرق کرنے کی نیت سے اس کی پہچان ہونا ضروری ہے۔ جس طرح مسلمان یہود و نصاریٰ اور مشرکوں کے نظریات سے واقفیت حاصل کرتے ہیں تو مقصود ان کی تردید و مذمت کرنا اور ان سے روکنا ہوتا ہے نہ کہ ان کو عقیدہ وعمل میں جگہ دینے کے لیے سیکھنا۔

لہٰذا جو انسان جادو وغیرہ جیسے کفریہ نظریات و اعمال کو بطور عقیدہ اختیار کرنے یا عمل کرنے کی غرض سے سیکھتا

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧١٢٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢١١١)

[2] مجموع الفتاویٰ (٢٩/٣٨٩)

سکھاتا ہے وہ کافر ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَمَا يُعَلِّمَانِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَاۤ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ﴾ [البقرۃ: ۱۰۲]

''حالانکہ وہ دونوں کسی ایک کو نہیں سکھاتے تھے، یہاں تک کہ کہتے ہم تو محض ایک آزمایش ہیں، سو تو کفر نہ کر۔''

جمہور ائمہ اسلام کے نزدیک جادوگر اور کاہن کی سزا قتل ہے اور یہ سزا حضرت عمر بن خطاب، عثمان بن عفان، عبداللہ بن عمر، حفصہ بنت عمر اور جندب بن عبداللہ بجلی رضی اللہ عنہم جیسے صحابہ سے اتفاق کے ساتھ ثابت ہے۔ اس میں کسی صحابی نے اختلاف نہیں کیا، بلکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے والیوں کے نام یہ مراسلہ جاری کیا تھا کہ وہ ہر جادوگر اور جادوگرنی کو قتل کر دیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ محترمہ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے بھی ثابت ہے۔ انھوں نے اپنی ایک لونڈی کو اس پاداش میں قتل کروا دیا تھا۔ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ تک یہ بات پہنچی تو عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے ان کو بتایا کہ اس لونڈی نے ان پر جادو کیا تھا اور اس نے اپنے جرم کا اقرار کر لیا تھا، تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس فیصلے کی تصدیق کی۔ اس مسئلے میں متعدد آثار منقول ہیں۔ واللہ أعلم[1]

سود اور سودی معاملات کی راہ ہموار کرنے والے امور کا حکم

سوال کچھ لوگ ایسے معاملات کرتے ہیں جو سود کی راہ ہموار کرتے ہیں، مثلاً: ایک شخص نے قرض لیا، جب ادا کرنے کا وقت آیا تو اس وقت اس کے پاس ادا کرنے کے لیے کچھ نہیں تھا تو قرض خواہ نے قرض کو کچھ اضافی مال کے عوض ایک دوسرے معاملے میں تبدیل کر دیا، ایسے معاملے کی کیا حیثیت ہے؟

جواب سودی لین دین کتاب و سنت اور اجماع کی دلیل سے حرام ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سود کھانے والے، کھلانے والے، وکیل بننے والے، لکھنے والے اور گواہ بننے والوں پر لعنت بھیجی ہے۔[2]

جاہلیت میں اصل ربا کی صورت یہ تھی کہ کسی آدمی کے ذمے کسی کی رقم واجب الادا ہوتی۔ جب اسے ادا کرنے کا وقت آتا تو وہ کہتا: ادا کرتے ہو یا زیادہ کرتے ہو؟ اگر وہ ادا کر دیتا تو دوسرا قبول کر لیتا، اگر نہ کرتا تو وہ مدت بڑھا کر مال میں بھی اضافہ کر دیتا۔ اس طرح مال بڑھتا رہتا اور اصل سرمایہ اپنی جگہ قائم رہتا، یہ بالاجماع حرام ہے۔ اگر مقصود یہی ہو، مگر لوگ اس کے لیے کوئی دوسرا راستہ اور حیلہ اختیار کریں تو اس میں متاخرین کے ہاں اختلاف ہے،

---

[1] جامع المسائل (۳۶۲/۹۔۲٦٤)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (۵۰۳۲) صحيح مسلم، رقم الحديث (۱۵۹۸)

لیکن صحابہ کے ہاں اس کے حرام ہونے میں کوئی اختلاف نہیں تھا، کیوں کہ اعمال کا دار و مدار نیتوں پر ہے۔

سود کی حرمت کی علت ضرورت مندوں کو ضرر پہنچانا اور باطل طریقے سے مال کھانا ہے۔ یہ تمام سودی معاملات میں موجود ہے۔ جب ادا کرنے کا وقت آ جائے اور مقروض تنگ دست ہو تو اس کو بالا جماع اس طرح کے کسی دوسرے معاملے میں تبدیل کرنا جائز نہیں، بلکہ مہلت دی جائے۔ اگر مقروض خوش حال ہو تو ادا کرے۔ اس کی تنگ دستی یا خوش حالی کسی بھی حالت میں قلبِ معاملت یعنی معاملہ تبدیل کرنے کی ضرورت نہیں۔

والیانِ ریاست سودی معاملات کرنے والوں کو تعزیری سزا دیں اور مقروض کو اصل مال لوٹانے کا حکم دے کر اس سے سودی اضافہ ساقط کریں۔ اگر وہ تنگ دست ہو اور اس کے پاس غلے وغیرہ کی صورت میں کوئی مال ہو تو حسبِ امکان اس سے اس کا قرض وصول کرلیا جائے۔ واللہ أعلم [1]

بیع عرایا اور حدیثِ مصراۃ کی شرح

سوال حدیث ہے: «رُخِّصَ فِي الْعَرَايَا أَنْ تُبَاعَ بِخَرْصِهَا» [2] ''بیع عرایا کو اندازے کے ساتھ بیچنے کی رخصت ہے۔'' نیز «نَهَى عَنْ بَيْعِ الْمُصَرَّاةِ وَالْمُحَفَّلَةِ» [3] ''دودھ روکے ہوئے جانور کی بیع منع ہے۔'' ان احادیث کا کیا مفہوم ہے؟

جواب الحمد للہ. مصراۃ اور محفلۃ اس اونٹنی اور بکری وغیرہما کو کہا جاتا ہے جس کا دودھ کئی دنوں تک نہیں دھویا جاتا اور وہ تھن میں جمع ہوتا رہتا ہے، پھر اس کو فروخت کے لیے پیش کیا جاتا ہے۔ خریدنے والا سمجھتا ہے کہ یہ ہر روز اتنا ہی دودھ دیتی ہے، لہٰذا وہ اس کو خرید لیتا ہے۔ یہ تدلیس اور دھوکے بازی ہے جو بالعموم حرام ہے اور خصوصی طور پر اس معاملے میں بھی حرام ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ایسے مشتریوں کو اختیار کا حق دیا ہے۔ وہ تین دن تک اس کا دودھ دوہے، اگر پسند آئے تو رکھ لے، اگر ناپسند آئے تو واپس کر دے اور اس دودھ کا معاوضہ ادا کرے جو خریدتے وقت موجود تھا۔ آپ ﷺ نے اس کا معاوضہ ایک صاع (سوا دو سیر) کھجوریں متعین کیں۔

بیع غرر کی وہ صورت جس میں بائع فروخت شدہ سامان مہیا نہ کرسکتا ہو، مثلاً کوئی بھاگے ہوئے غلام کو فروخت کر دے، یا گم شدہ گھوڑے یا اونٹ کو بیچ دے یا پنجروں سے نکلے ہوئے پرندے کو فروخت کرے، وغیرہ وغیرہ، یہ قمار بازی کے باب سے ہے۔ اگر خریدار فروخت شدہ چیز حاصل کر سکے تو وہ قمار کرتا ہے، کیوں کہ اس نے وہ چیز کم

---

[1] مجموع الفتاویٰ (٢٩/٤١٨)

[2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٢٠٨٠) صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٥٣٩)

[3] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٢٠٤١) صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٥١٥)

قیمت میں خریدی ہوتی ہے، اگر اسے حاصل نہ کر سکے تو بیچنے والا خریدنے والے کو لوٹ لیتا ہے۔ دونوں ہی صورتوں میں وہ ناجائز طریقے سے ایک دوسرے کا مال کھاتے ہیں۔ اسی طرح حیوان کے پیٹ کے بچے کی بیع کرنا، پھل پکنے سے پہلے فروخت کرنا یہ سب غرر کی انواع ہیں۔ نبی اکرم ﷺ نے غرر سے عموماً اور ان معاملات میں خصوصاً منع کیا ہے اور یہ سب جوے کی شکلیں ہیں جو قرآن میں حرام قرار دیا گیا ہے۔

اسی طرح کنکریوں کی بیع بھی حرام ہے جس میں بیچنے والا کہتا ہے: میں یہ کنکری پھینکتا ہوں اور جہاں تک یہ پہنچے گی وہاں تک کی زمین میں نے تجھے فروخت کی، یا جس کپڑے یا چیز پر یہ کنکری گرے گی وہ میں تجھے فروخت کرتا ہوں۔ اس میں فروخت شدہ چیز کی مقدار نامعلوم ہوتی ہے، یا اس کا وجود یا اس کی کیفیت۔

بیع عرایا کو رسول اللہ ﷺ نے ''بیع مزابنہ'' اور ''محاقلہ'' سے مستثنیٰ قرار دیا ہے۔ بیع مزابنہ یہ ہے کہ کوئی شخص درخت پر لگی ہوئی کھجور کو اندازے کے ساتھ خریدے۔ محاقلہ یہ ہے کہ کوئی شخص گندم کو اندازے سے خریدتے، جب وہ ابھی سٹے میں ہو۔ اس میں خریدار کسان سے پوچھتا ہے کہ اس درخت پر کتنا پھل ہے؟ یا اس کھیت میں کتنی گندم ہے؟ تو وہ اندازے سے بتاتا ہے، مثلاً: پانچ من تو وہ کہتا ہے کہ یہ پانچ من میں خریدتا ہوں۔ یہ حکم ہر اس چیز میں عام ہے، جس کو ماپ تول کر اور برابر مقدار میں بیچا جاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

> ''سونے کو سونے کے بدلے نہ بیچو، مگر برابر برابر، چاندی کو چاندی کے بدلے نہ بیچو مگر برابر برابر، گندم کو گندم کے بدلے نہ بیچو، مگر برابر برابر، کھجور کو کھجور کے بدلے نہ بیچو، مگر برابر برابر، نمک کو نمک کے بدلے نہ بیچو، مگر برابر برابر۔''[1]

آپ ﷺ نے غلے کے ایسے ڈھیر کو جس کی مقدار معلوم نہ ہو، متعین اور معلوم ڈھیر کے بدلے میں فروخت کرنے سے بھی منع کیا ہے۔[2] اگر ان جیسی اشیا کی خرید وفروخت ان کی مثلیات کے ساتھ اندازے کے ساتھ کی جائے تو یہ جائز نہیں، کیوں کہ نبی اکرم ﷺ نے ان کو برابر برابر بیچنے کا حکم دیا ہے۔ اگر ان میں تماثل اور برابری معلوم نہ ہو سکے تو ان کو بیچنا جائز نہیں ہوتا، اسی بنا پر فقہا کہتے ہیں: ''تساوی میں جہالت اور نامعلومیت تفاضل میں علم کی طرح ہے۔'' تماثل ماپنے اور وزن کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔ جہاں تک اندازوے کا تعلق ہے تو ضرورت اور حاجت کے وقت اس سے کام لیا جاتا ہے، لیکن جہاں ماپنے اور وزن کرنے کا امکان ہو وہاں اندازے سے کام نہیں لیا جاتا، اسی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے مزابنہ اور محاقلہ سے منع کیا ہے، کیوں کہ ان میں لوگ ضرورت کے بغیر بیع

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٥٨٧)

[2] صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٥٣٠)

کرتے ہیں۔ حاجت کی وجہ سے عرایا میں آپ ﷺ نے اس کی اجازت دی ہے، کیوں کہ اس میں خریدار کو ضرورت کی وجہ سے کھانے کے لیے رُطب، یعنی تر کھجور کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس میں آپ ﷺ نے اتنی قلیل مقدار کی اجازت دی ہے جو ضرورت کا تقاضا ہوتی ہے اور یہ نصاب سے یعنی پانچ وسق سے کم میں ہے۔ اسی طرح یہ ضرورت کے تحت بیچنے والے کے لیے بھی جائز ہے۔

لفظ عرایا سے مراد وہ کھجور کے درخت ہیں جو آدمی دوسرے کو عاریتاً کھانے کے لیے دیتا ہے، تاکہ وہ پھل کھا کر درخت واپس کر دے۔

جس طرح ''منیحہ'' اس جانور کو کہا جاتا ہے جو آدمی دوسرے کو سواری کے لیے یا دودھ کے لیے عاریتاً دیتا ہے اور پھر واپس لے لیتا ہے، یہ اس لفظ کا اصل مفہوم ہے، لیکن کیا عرایا صرف ان درختوں کے ساتھ خاص ہے جو بائع مشتری کو ہبہ کرتا ہے، یا عام ہے، اس میں فقہا کا اختلاف ہے۔ پہلا مذہب مالک کا ہے اور دوسرا شافعی کا اور حنبلی مذہب میں دونوں اقوال ہیں۔ واللہ أعلم [1]

قرض کے ساتھ قرض کی بیع کا حکم

سوال ایک شخص نے متعین قیمت اور مقرر وقت تک کے لیے گندم خریدی، پھر گندم کے مالک کو کچھ بھی نہ ملا، اس کے بعد اس نے معاہدے پر نظر ثانی کی اور اس سے کوئی چیز بطور رہن لی اور اس کو اس عقد کی رو سے خرید وفروخت کے حقوق سمیت لے لیا، کیا یہ بیع جائز ہے؟

جواب جب اس نے ادھار گندم خریدی، پھر بائع کو اس کی قیمت کے عوض کوئی اور سامان دیا اور وہ بھی ادھار تو یہ جائز نہیں، کیوں کہ یہ قرض کے ساتھ قرض کی بیع ہے۔ اسی طرح اگر وہ قیمت زیادہ کرنے کے لیے کوئی حیلہ اختیار کرے اور اس صورت میں مہلت زیادہ کر دے کہ اس میں سود ظاہر ہو رہا ہو تو یہ جائز نہیں۔ اس کے پاس اس کا صرف پہلا قرض ہوگا۔ یہی وہ ربا اور سود ہے جس کی حرمت قرآن میں اتری ہے۔ واللہ أعلم [2]

ایک سودی معاملہ

سوال ایک آدمی کو کچھ روپے قرض لینے کی مجبوری درپیش ہوئی، اس کو ایک آدمی کے سوا کوئی قرض دینے والا نہ ملا اور اس نے بھی فائدہ لینے کی شرط پر قرض دینے پر آمادگی ظاہر کی۔ اس نے بازار سے اس کے لیے پچاس روپے

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۲۹/۴۲۶۔۴۲۹)

[2] مجموع الفتاویٰ (۲۹/۴۲۹)

میں کوئی سامان خریدا اور اس کو ایک مخصوص منافعے پر متعین مدت کے لیے ادھار بیچ دیا، کیا یہ سود کا راستہ ہے؟

جواب اگر اس نے اس کے لیے سامان خریدا، پھر اس کو بیچا، پھر اس سے خرید لیا، یا کسی تیسرے کو بیچا، جس سے قرض دینے والے نے خریدا تو یہ سود ہے۔ اس کی حرمت پر دلالت کرنے والی احادیث بہت زیادہ ہیں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں ہے: ''زید بن ارقم کی ام ولد نے کہا: اے ام المومنین! میں نے زید بن ارقم سے آٹھ سو درہم کا غلام خریدا، پھر اس کو اسی کے ہاتھوں چھے سو درہم میں نقد بیچ دیا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا: یہ بہت بری خرید و فروخت کی ہے۔ زید کو بتا، اس نے یہ کام کر کے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کیا ہوا اپنا جہاد ضائع کر دیا ہے، اِلا یہ کہ وہ توبہ کرے۔ وہ کہنے لگے: اے ام المومنین! آپ کا کیا خیال ہے کہ اگر میں صرف اپنی راس پاؤں تو؟ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا:

﴿فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ وَاَمْرُهٗۤ اِلَى اللّٰهِ ؕ وَمَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ﴾ [البقرة: ٢٧٥]

''پھر جس کے پاس اس کے رب کی طرف سے نصیحت آئے پس وہ باز آ جائے تو جو پہلے ہو چکا وہ اسی کا ہے اور اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے اور جو دوبارہ ایسا کرے تو وہی آگ والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے بھی اس جیسا مسئلہ دریافت ہوا تو انھوں نے بھی اس کو حرام کہا، لیکن اگر وہ سامان بائع کی طرف کسی حال میں لوٹ کر نہ آئے، بلکہ مشتری کسی دوسری جگہ سے اپنے پڑوسی کے لیے خریدے تو اس کو ''تورق'' کہا جاتا ہے جس کے مکروہ ہونے میں علما کا اختلاف ہے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز اور امام احمد بن حنبل ایک روایت میں اس کے مکروہ ہونے کے قائل ہیں۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز کا قول ہے: ''التورق أخية الربا'' ''تورق سود کا چھوٹا بھائی، یعنی اصل ربا ہے۔'' یہی قول زیادہ قوی ہے۔ تاہم اس طرح کے معاملات کرنے والوں کا مقصود اگر درہم کے بدلے مؤجل درہم کا حصول ہے تو اس کے لیے جو وسیلہ اور حیلہ اختیار کریں گے، یہ حرام ہی رہے گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: ''جس نے ایک سودے میں دو سودے کیے تو اس کے لیے کم تر ہوگا یا سود۔''[1]

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا: ''قرض اور بیع جائز نہیں۔''[2] واللّٰه أعلم[3]

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٤٦١) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٣٢٦)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٥٠٤) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٢٣٤) سنن النسائي، رقم الحديث (٤٦١١) صحيح الجامع، رقم الحديث (٧٦٤٤)

[3] مجموع الفتاویٰ (٢٩/٤٣٠)

مختلف کرنسیوں کی خرید وفروخت کا حکم

سوال فلوس (سونے چاندی کے علاوہ تانبے وغیرہ کے سکے جو بطور کرنسی رائج تھے) کی فلوس کے ساتھ اضافے کے ساتھ خرید و فروخت اور ان کو درہم و دینار میں تبدیل کرنے (معاصر معانی میں مختلف کرنسیوں کی خرید و فروخت) کا کیا حکم ہے؟

جواب اگر کوئی شخص درہم دے کر آدھی چاندی اور آدھے فلوس مانگے تو یہ جائز ہے، کچھ فقہا اسے مکروہ کہتے ہیں اور اس کو مسئلہ ''مدعجوۃ'' میں شمار کرتے ہیں، کیوں کہ اس شخص نے چاندی اور تانبے کو چاندی اور تانبے کے عوض فروخت کیا۔ مسئلہ ''مدعجوۃ'' یہ ہے کہ انسان کسی ربا والے مال کی بیع اس کی جنس سے کرے اور ان دونوں اجناس کے ساتھ یا ایک جنس کے ساتھ کوئی ایسی چیز بھی ہو جو ان دونوں کی جنس سے نہ ہو، اس میں علما کے تین اقوال ہیں:

1. امام شافعی اور احمد سے ایک روایت کے مطابق یہ بالکل ناجائز ہے۔
2. امام ابوحنیفہ اور امام احمد سے دوسری روایت کے مطابق یہ مطلقاً جائز ہے۔
3. امام مالک اور امام احمد سے مشہور روایت کے مطابق ربا والی چیز کی اپنی جنس کے ساتھ بیع کا مقصود اگر تفاضل اور اضافہ نہ ہو تو جائز ہے، ورنہ نہیں۔

جو فلوس کو دراہم میں تبدیل کرنے کو مکروہ کہتا ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ یہ چاندی اور تانبے کی تانبے سے بیع ہے۔ صحیح قول یہ ہے کہ یہ جائز ہے اور یہی جمہور کا مذہب ہے۔ جہاں تک رائج فلوس کی چاندی کے ساتھ بیع کا سوال ہے کہ کیا اس میں حلول و تقابض کی شرط ہے جو درہم کو دینار میں تبدیل کرتے وقت ضروری ہے؟ اس میں فقہا کے دو اقوال ہیں اور یہ دونوں ہی امام احمد سے مروی ہیں:

1. حلول و تقابض (فوراً قبضے میں لینا) ضروری ہے، کیوں کہ یہ صرف یعنی ایک جنس کو اسی کی جنس سے تبدیل کرنے کی قبیل سے ہے، کیوں کہ رائج فلوس اثمان (قیمت) کے مشابہ ہیں، تو اثمان کی جنس سے ان کی بیع کرنا صَرف (کرنسی ایکسچینج) میں شمار ہوگا۔
2. اس میں حلول و تقابض کی شرط نہیں، کیوں کہ یہ صرف سونے اور چاندی کی جنس میں معتبر ہے، خواہ وہ ثمن (قیمت) ہو، صرف ہو یا مکسور، فلوس کے عکس، کیوں کہ فلوس اصل میں عروضِ تجارت، یعنی تجارتی سامان کی قبیل سے ہیں، ثمنیت یعنی قیمت ان کی عارضی صفت ہے، یہ ایک دوسرے قاعدے پر بھی مبنی ہے کہ کیا تفاضل اور اضافے کے ساتھ تانبے کی تانبے سے بیع جائز ہے؟ اسی طرح دیگر وہ تمام اشیا جو تول کر فروخت ہوتی ہیں، مثلاً: لوہے کی لوہے سے بیع، سیسے کی سیسے سے بیع، روئی کی روئی سے بیع وغیرہ وغیرہ۔

امام ابو حنیفہ اور امام احمد سے مشہور روایت کے مطابق ایک ہی چیز کی اس کی جنس سے تفاضل کے ساتھ بیع جائز نہیں۔ امام مالک، شافعی اور دوسری روایت میں امام احمد کے نزدیک یہ جائز ہے۔

جو تحریم کے قائل ہیں، ان میں پھر اس بات میں اختلاف ہے کہ ان اشیا سے جو چیزیں بنائی جاتی ہیں، کیا ان میں بھی سود جاری ہوتا ہے یا صرف اصل مادے میں جاری ہوتا ہے؟ اس بنا پر کچھ تانبے میں سود کے جاری ہونے کے قائل ہیں اور کچھ نہیں، لیکن جو موزون یا مکیل ہونے کے نہیں، ثمنیت کے قائل ہیں تو کیا اس جہت سے ان میں سود جاری ہوتا ہے کہ نہیں، اس میں بھی دو اقوال ہیں۔

درہم و دینار میں ربا کی حرمت کی علت میں فقہا کا اختلاف ہے۔ زیادہ ظاہر اور واضح یہی ہے کہ ان میں علت ثمنیت ہونا ہے، وزن نہیں، لہٰذا تمام لوہے، ریشم، کاٹن اور سیسے جیسی تمام وزن والی اشیا کے تبادلے میں تفاضل حرام نہیں، ثمنیت کو علت قرار دینا مناسب وصف ہے، کیوں کہ اثمان یعنی قیمتوں کا مقصود اموال کا معیار بنتا ہے، جن کے ذریعے اموال کی مقداروں کو معلوم کیا جا سکے۔ بعینہٖ ان سے فائدہ اٹھانا مقصود نہیں ہوتا، لہٰذا جب ان کو ایک دوسرے کے ساتھ ادھار فروخت کیا جائے تو اس وقت ان کی تجارت مقصود ہوتی ہے جو ثمنیت کے مقصود کے خلاف ہے، ان میں حلول و تقابض کی شرط ان کے اس مقصود کی تکمیل ہے کہ یہ درحقیقت تحصیلِ مطلوب، یعنی اموال کی مقداروں کو معلوم کرنے کا ذریعہ ہیں اور یہ مقصد جب ہی پورا ہو سکتا ہے جب ان کو قبضے میں لیا جائے، نہ کہ ان کو واجب الذمہ ثابت کر دیا جائے، چونکہ یہ دونوں اطراف سے ثمن ہیں، اس لیے شارع علیہ السلام نے ثمن (قیمت) کو ثمن کے بدلے ادھار فروخت کرنے سے منع کر دیا۔ اگر فلوس اثمان (قیمتیں) ہیں تو ان میں یہ مفہوم پایا جاتا ہے، لہٰذا ثمن کی ثمن کے ساتھ ادھار بیع جائز نہیں۔[1]

فصل پکنے سے پہلے بیچنے کا حکم

سوال ایک آدمی نے فصل پکنے سے پہلے سبز ہی بیچ دی، کیا یہ جائز ہے؟

جواب باقی رکھنے کی شرط پر فصل کی بیع بالاتفاق ناجائز ہے۔ اگر کاٹنے کی شرط پر خریدے تو پھر بالاتفاق جائز ہے۔ اگر مطلقاً فروخت کر دے تو جمہور کے نزدیک ناجائز ہے، کیوں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دانے کو پکنے اور مضبوط ہونے اور انگور کو پک کر سیاہ ہونے سے پہلے فروخت کرنے سے منع کیا ہے۔[2]

---

① مجموع الفتاویٰ (۲۹/۴۵۷-۴۶۰)

② مجموع الفتاویٰ (۲۹/۴۷۷)

مختلف پھلوں پر مشتمل باغ کی فروخت کی صورت اور حکم

سوال ایک شخص کے پاس مختلف پھلوں پر مشتمل باغ ہے، کچھ پھل جلدی پک جاتے ہیں اور کچھ تاخیر سے۔ اگر پھل پکنے سے پہلے اس کی فروخت جائز نہیں تو یہ شخص اپنا سارا باغ کس طرح فروخت کرے گا؟ فتویٰ درکار ہے۔

جواب الحمد لله رب العالمين. اس مسئلے کی دو صورتیں ہیں:

ایک صورت یہ ہے کہ باغ کی ذمے داری اٹھا لی جائے اور ذمے داری اٹھانے والا ہی زمین کاشت کرے اور درختوں کو سیراب کرے جس طرح کوئی بھی زمین کرائے پر لینے والا یہ سب کام کرتا ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ خریدنے والا صرف پھل خریدے اور باغ کو پانی لگانے اور اس کی دیکھ بھال کی ذمے داری اور خرچہ بیچنے والے ہی کے سر ہو۔

پہلی صورت کے متعلق علما کے تین اقوال ہیں:

① یہ پھل کو پکنے سے پہلے فروخت کرنے کی ممانعت میں داخل ہے، بنابریں کچھ اس کے جواز کے لیے کئی طرح کے حیلے کرتے ہیں، مثلاً زمین کو کرائے پر دے دیا جائے اور مساقات کا معاملہ کر لیا جائے جس میں زمین مالک ہی کی رہتی ہے اور دوسرا شخص پیداوار سے مخصوص شرح طے کر کے دیکھ بھال کی ذمے داری قبول کرتا ہے۔ یہ کچھ اصناف شوافع اور حنابلہ میں سے قاضی ابو یعلیٰ کا مذہب ہے جس نے کتاب ''ابطال الحیل'' میں اس کا ذکر کیا ہے۔ امام احمد کا منصوص مذہب ان حیلوں کا انکار و نفی کرنا ہے۔ امام مالک وغیرہ کا مذہب بھی یہی ہے اور بہت سی صورتیں اجماع کے ساتھ باطل ہوتی ہیں۔

② دوسرا قول زمین کے کم یا زیادہ ہونے میں فرق کرتا ہے۔ اگر سفید زمین میں دو تہائیوں سے زیادہ ہو اور درخت ایک تہائی سے کم ہو تو زمین کو اجارے پر دینا جائز ہو گا اور اس میں پھل کی خرید و فروخت ضمناً اور تبعاً داخل ہو گی۔ یہ امام مالک کا قول ہے۔

③ تیسرے قول میں یہ مطلقاً جائز ہے، چاہے زمین کم ہو یا زیادہ۔ یہ سلف و خلف کی ایک جماعت کا قول ہے جن میں اصحابِ احمد میں سے ...... عقیل کا نام آتا ہے، صحابہ سے بھی یہی منقول ہے۔ ...... اور ابو زرعہ دمشقی وغیرہما نے ثابت شدہ سند سے نقل کیا ہے کہ جب حضرت اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ فوت ہوئے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کے باغ کی ذمے داری لے لی اور تین سال تک اسے کرائے پر دے دیا اور ان کا قرض اتارا۔ یہ ایک مشہور واقعہ ہے اور کسی نے اس کا انکار نہیں کیا۔ لہٰذا یہ صحیح ترین قول ہے اور اس کی توجیہ میں دو مزید باتیں ہیں:

زمین کو کرائے پر دینا ایک ناگزیر امر ہے جو درختوں کے بغیر ممکن نہیں، اس لیے حصوں میں تقسیم و تبعیض کے عدمِ امکان کی وجہ سے اور ضرورت کے پیشِ نظر یہ جائز ہے، مثلاً جس طرح جب درخت کے کچھ پھل پک جائیں تو بالاتفاق سب کو بیچنا جائز ہوتا ہے بلکہ اگر کسی مخصوص جنس کے درخت کا پھل پک جائے تو جمہور کے نزدیک باغ میں اس جنس کے تمام درختوں کا پھل پکا ہوا شمار کیا جائے گا، البتہ سارے باغوں میں اختلاف ہے۔

کیونکہ عقود (معاہدات) فرد میں بالتبع وہ کچھ داخل ہوتا ہے جو مستقلاً داخل نہیں ہوتا جس طرح دیواروں کی بنیادیں، اندرون، جانوروں کا کام اور پکنے کے بعد ہونے والا اضافہ سب اس میں داخل ہوتا ہے۔ صحیحین میں آپ ﷺ کا فرمان ہے:

«مَنْ بَاعَ نَخْلًا قَدْ أُبِّرَتْ فَثَمَرَتُهَا لِلْبَائِعِ إِلَّا أَنْ يَشْتَرِطَ الْمُبْتَاعُ» [1]

''جو پیوند زدہ کھجور کے درخت بیچے ان درختوں کا پھل بیچنے والے کا ہے مگر یہ کہ خریدار انھیں حاصل کرنے کی شرط عائد کر دے۔''

چنانچہ اگر خریدار پیوند زدہ پھل خریدنے کی شرط لگاتا ہے تو یہ نص اور اجماع کی دلیل سے جائز ہے۔ یہ وہ پھل ہوتا ہے جس کا پکنا ابھی ظاہر نہیں ہوتا مگر دوسری چیز کے بالتبع اس کی خرید وفروخت جائز ہو جاتی ہے۔ نیز حاجت اور ضرورت کے پیش نظر وہ چیز ہو جاتی ہے جو حاجت کے بغیر جائز نہیں ہوتی، جس طرح بیع عرایا جائز ہے۔ اسی طرح قائلین کے نزدیک مضاربت، مساقات اور مزارعت بالتبع جائز ہوتی ہے، حالانکہ ان کے مذہب کے قیاس کے مطابق یہ جائز نہیں کیونکہ ان کے ہاں اجارہ ہے۔ یہ ابوحنیفہ، مالک اور شافعی کا مذہب ہے۔

جن فقہا نے اسے مشارکت قرار دیا ہے اور اسے ایک دوسری اصل قرار دیا ہے تو یہ نص کی دلیل سے جائز ہے، قیاس کی دلیل سے نہیں، لیکن یہ قیاس کے مخالف بھی نہیں۔ جمہور سلف حنفیہ میں سے صاحبین، شافعیہ میں سے خطابی اور امام احمد وغیرہ کا مذہب ہے۔

دوسری توجیہ:

نبی اکرم ﷺ نے پھل کو پکنے کے ظاہر ہونے سے پہلے اسے فروخت کرنے سے منع کیا ہے، اسی طرح دانے کو پختہ ہونے سے پہلے اور انگور کو پک کر سیاہ ہونے سے پہلے فروخت سے منع کیا ہے۔ اس کے باوجود ائمہ اربعہ کے نزدیک ایسے شخص کو زمین اجارے پر دینا جائز ہے جو اس پر کام کرے، یہاں تک کہ فصل اگ آئے اور یہ دانے کے

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (۲۰۹۰) صحيح مسلم، رقم الحديث (۱۵٤۳)

تابع نہیں۔ اسی طرح درخت کا معاملہ ہے۔ یہ اس شخص کو دیا جائے جو اس پر کام کرے تا آنکہ اس پر پھل آ جائے اور یہ پھل کے تابع نہیں، کیا آپ دیکھتے نہیں کہ زمین کی پیداوار کی ایک مخصوص مقدار پر زمین مزارعت کے لیے دینے اور درخت کی ایک مخصوص پیداوار پر درخت مساقات پر دینے میں کوئی فرق نہیں۔ زمین عاریتاً دینا درخت عاریتاً دینے کی طرح ہی ہے جس طرح اہلِ وقف وقف کی زمین کی فصل سے فائدہ اٹھاتے ہیں اسی طرح درختوں کے پھل سے بھی فائدہ اٹھاتے ہیں، لہٰذا پھل (اگرچہ عینی یا مادی وجود رکھنے والی چیز ہے) فوائد، نیز وقف، مضاربت اور مساقات کے نفعے کے قائم مقام ہے کیونکہ یہ اپنا متبادل پیچھے چھوڑ جاتا ہے، اس لیے پھل پکنے کے بعد اس کی خرید و فروخت کے باب میں پھل کے مکمل پکنے کا خرچہ اور ذمے داری بائع پر ہوتی ہے۔ رہا وہ قبالہ جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کیا تھا اس میں درختوں کو پانی لگانے کی ذمے داری تھی اور حصولِ ثمر کا خرچہ، اس لیے اسے اس پر قیاس نہیں کیا جا سکتا، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو پھل کو پکنے سے پہلے منع کیا ہے، یہ قبالہ اس میں نہیں آتا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ خریدار صرف پھل خریدے، درختوں کو پانی لگانے وغیرہ کے خرچ کا ذمے دار فروخت کرنے والا ہی ہو، اس صورت میں اگر باغ مختلف انواع کے پھلوں پر مشتمل ہو تو اس میں علما کے دو اقوال ہیں۔

لیث بن سعد کا قول ہے کہ اگر ایک نوع پک جائے تو سارا باغ فروخت کرنا جائز ہے، جس طرح ایک نوع کا اگر کچھ حصہ پک جائے تو وہ ساری نوع فروخت کرنا جائز ہوتا ہے، کیوں کہ یہاں تفریق ضررِ عظیم کا باعث بنتی ہے، کیوں کہ کبھی ایک قسم خریدنے والا دوسری قسم خریدنے میں دلچسپی رکھتا ہے اور کبھی باغ کا مالک سارے پھل ایک ہی خریدار کو دینے میں دلچسپی رکھتا ہے۔ یہ قول دوسرے قول سے زیادہ قوی ہے جو مطلقاً عدمِ جواز کا ہے اور مشہور بھی یہی ہے، لیکن یہاں جواز صرف حاجت کی وجہ سے ہے، کیوں کہ بیع مزابنہ، پھل پکنے سے پہلے فروخت کرنے کے معاملے سے زیادہ سنگین ہے۔ وہ بیع ربوی، یعنی سودی بیع ہے، جس میں ایک جنس کو اندازے کے ساتھ اس کی جنس سے فروخت کیا جاتا ہے۔ ربا، یعنی سود بالخصوص غرر یعنی دھوکے سے زیادہ سنگین ہے۔ پھل پکنے سے پہلے فروخت کرنے کی ممانعت سے کچھ جگہیں مخصوص اور مستثنیٰ ہیں، جس طرح پھل سمیت درخت بیچنے کا اختصاص اور استثنا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ یہ ممانعت دوسرے کے ساتھ اس کی بیع پر مطلقاً صادق نہیں آتی، بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ ممانعت اکیلا بیچنے میں ہے، تو کچھ چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو اکیلی بیچنا منع ہوتی ہیں، لیکن دوسری کے ساتھ مل کر جائز ہوتی ہیں۔ اگر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیع مزابنہ میں سے حاجت اور ضرورت کی وجہ سے ''بیع عرایا'' کی اجازت دی ہے اور اس کو اس سے مستثنیٰ قرار دیا ہے تو ایک نوع کی دوسری نوع کے ساتھ بالتبع بیع کرنا، جب حاجت بھی زیادہ ہو، کیوں جائز نہیں ہوگی، اسے اکیلا منع کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ کسی دوسرے کے ساتھ مل کر ہو تو تب بھی منع

ہی ہو گی۔ دیکھیے کسی جانور کے پیٹ کا بچہ اکیلا فروخت کرنا منع ہے، لیکن حمل والے جانور کو فروخت کرنا جائز ہے اور حمل بھی بالتبع فروخت ہوتا ہے۔

ایسے تمام معاملات میں شریعت کا راز یہ ہے کہ کوئی کام جب مفسدت پر مشتمل ہو تو منع ہوتا ہے، لیکن اگر کوئی راجح مصلحت اس کے معارض ہو تو وہ جائز ہو جاتا ہے، جس طرح مجبور کے لیے مردار کھانا مباح ہو جاتا ہے۔ بیع غرر سے اس لیے منع کیا گیا ہے کہ یہ جوے کی ایک قسم ہے جو باطل طریقے سے لوگوں کا مال کھانے کا سبب بنتا ہے، اگر کوئی اس سے بڑا نقصان اور ضرر اس کے معارض ہو تو دو خرابیوں میں سے بڑی خرابی سے بچنے کے لیے ادنیٰ خرابی کو برداشت کرنا اس کام کو مباح بنا دیتا ہے۔ واللہ أعلم [1]

زمین کے اندر اگنے والی اشیا کی اکھاڑنے سے پہلے خرید وفروخت

سوال ایک آدمی گنا، گاجر، شلجم، مولی اور اس طرح کی چیزیں اگاتا ہے جو زمین کے اندر ہوتی ہیں، کیا زمین کے اندر ہی ان کی بیع درست ہے؟

جواب کھڑا گنا فروخت کرنا یا اکھاڑ کر فروخت کرنا، چاہے چھلکے میں ڈھکا ہوا ہو، جائز ہے، جس طرح سٹے کے اندر گندم اور چھلکا سمیت گری اور بادام کی بیع جائز ہے۔ تمام اگلے پچھلے فقہا کے نزدیک ان تمام اشیا کی بیع جائز ہے اور رسول اللہ ﷺ کے زمانے سے لے کر آج تک اس پر عمل چلا آ رہا ہے۔

اس کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے پھل پکنے سے پہلے اور دانہ مضبوط ہونے سے پہلے فروخت کرنے سے منع کیا ہے، پکنے کے بعد نہیں۔

نیز یہ بیع غرر بھی نہیں، کیوں کہ عام طور پر اس کا علم ہوتا ہے اور یہ عرف میں معلوم ومتعین ہوتی ہے۔

گاجر، مولی، شلجم اور ان جیسی اشیا کی بیع کے متعلق فقہا کے دو اقوال ہیں:

1. امام ابو حنیفہ، شافعی اور احمد کے مشہور مذہب کے مطابق ان اشیا کی بیع ناجائز ہے، کیوں کہ یہ چھپی ہوئی ہوتی ہیں اور ان کا وصف متعین نہیں کیا جا سکتا، جس طرح وہ تمام اشیا جو دیکھی جا سکتی ہوں، نہ ان کے اوصاف بیان کیے جا سکتے ہوں تو ان کی بیع منع ہوتی ہے۔
2. امام مالک اور امام احمد کے دوسرے قول کے مطابق اگر یہ اشیا زمین سے نکل آئیں اور معروف طریقے سے دیکھی جا سکتی ہوں تو ان کی بیع جائز ہے۔ یہ درست ترین قول ہے اور زمانہ قدیم سے لے کر آج تک اسی پر

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۲۹/۴۷۸۔۴۸۳)

مسلمانوں کا عمل ہے، نیز اس کے بغیر لوگوں کی مصلحت بھی پوری نہیں ہو گی، کیوں کہ ان کو اکھاڑ کر فروخت کرنے تک موخر رکھنا کبھی دشوار ہو جاتا ہے اور مال خراب کرنے کا باعث بن سکتا ہے، صرف زمین میں پوشیدہ ہونا غرر نہیں ہوتا، بلکہ جب سامان کو اس حد تک دیکھ لیا جائے جو عرف میں دیکھنے کے لیے معتبر ہو تو بالاتفاق اس کی بیع درست ہوتی ہے۔ اسی طرح جس چیز کو مکمل طور پر دیکھنا باعثِ حرج ہو تو اس میں جس قدر دیکھنا ممکن ہو اسی پر اکتفا کر لیا جاتا ہے، لہٰذا درست یہی ہے کہ اس طرح کی بیع جائز ہے۔ واللہ أعلم[1]

بیع سلم اور زیادہ قیمت میں ادھار بیچنے کا حکم

سوال ایک شخص کے پاس اٹھارہ درہم کی قیمت کی گندم ہے، وہ اس کو ادھار پچیس درہم میں بیچتا ہے، کیا یہ جائز ہے؟ نیز کیا غلے میں بیع سلم جائز ہے یا نہیں؟

جواب بیع سلم بالاجماع جائز ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

''جو بیع سلم کرے تو معلوم مقدار، معلوم وزن اور متعین مدت تک کرے۔''[2]

جب کسی سامان کی نقد قیمت مقرر کی جائے، پھر اس کو زیادہ قیمت پر ادھار فروخت کیا جائے تو یہ علما کے صحیح قول کے مطابق منع ہے، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے: ''جب تو نقد قیمت متعین کرے، پھر نقد بیچے تو کوئی حرج نہیں، لیکن جب نقد قیمت متعین کرے اور اس کو ادھار بیچے تو یہ درہم کے بدلے درہم کی بیع جیسا معاملہ ہے۔'' واللہ أعلم[3]

زیادہ قیمت پر ادھار بیچنے کا حکم

سوال ایک انسان نے ایک سو اسّی (۱۸۰) درہم کا گھوڑا خریدا، کسی دوسرے شخص نے اس سے وہ گھوڑا تین مہینے کے ادھار پر تین سو (۳۰۰) میں خرید لیا، کیا یہ جائز ہے؟

جواب اگر خریدنے والے کا مقصد اس سے فائدہ اٹھانا یا اس کی تجارت کرنا ہے تو ادھار بیع میں کوئی مضائقہ نہیں، لیکن ضرورت مند سے وہی نفع لینا چاہیے جو معمول کے مطابق ہو۔

اگر اس شخص کو پیسوں کی ضرورت ہے، اس نے وہ گھوڑا اس نیت سے ادھار خریدا ہے کہ اس کو کہیں نقد بیچ کر

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۲۹/۴۹۰۔۴۹۲)

[2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۲۱۲۵) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۶۰٤)

[3] مجموع الفتاویٰ (۲۹/٤۹٥)

پیسے حاصل کر لے۔ اگر وہ یہ گھوڑا اسی شخص کو فروخت کرنے پر مجبور ہو تو یہ ناجائز ہے۔ اگر کسی تیسری جگہ فروخت کرے تو یہ راجح مذہب کے مطابق مکروہ ہے۔

پیسے حاصل کرنے کے لیے حیلہ اختیار کرنے اور زیادہ پیسوں کے عوض ادھار خرید فروخت کا حکم

سوال ایک شخص کو سو درہم (روپے) کی ضرورت محسوس ہوئی، وہ ایک آدمی کے پاس آیا اور اس نے سو درہم مانگے، اس نے جواب میں کہا: میرے پاس صرف کپڑا ہے، کیا اس کے لیے اس آدمی کو سو درہم کا کپڑا، ادھار ڈیڑھ سو درہم میں بیچنا جائز ہے؟ یا وہ اس کے لیے کسی دوسرے سے کپڑا خریدے، پھر اس کو فائدے یعنی نفع کے ساتھ ایک مدت کے لیے یعنی ادھار بیچ دے؟ نیز کیا اس کے لیے سامان خریدنے سے پہلے اس سے نفع لینے کی شرط عائد کرنا جائز ہے؟ اگر انسان سو درہم کی چیز ایک سال کی مدت کے لیے ادھار بیچتا ہے تو اس سے کس مقدار اور نسبت سے نفع لے سکتا ہے؟ نیز نقد خرید و فروخت میں درہموں کا وزن کرتے وقت سودے بازی اور کم کرانا جائز ہے یا نہیں؟ اگر بائع اپنی خوشی سے دیتا ہے تو کیا اس کے لیے اس چیز کو ادھار سو درہم میں بیچنا جائز ہے جس کی قیمت پچاس درہم ہو؟ وہ جب سامان منگوائے تو اپنی تجارت کس طرح کر سکے گا؟ اور کس طرح اس کو ادھار دے گا؟

جواب الحمد لله رب العالمين.

جب مانگنے والا اس سے کہے: مجھے درہم یعنی پیسوں کی ضرورت ہے، اس کے بعد وہ اس کے لیے درہم یعنی پیسے حاصل کرنے کے لیے جو طریقہ بھی اختیار کریں جس میں اس کو پیسے مل جائیں اور وہ پیسے درہم اس شخص کے ذمے ایک مقرر وقت تک واجب الاداء ہو جائیں، یہ فاسد معاملہ ہے۔ یہی سود کی حقیقت ہے، کیوں کہ سود اصل میں یہ ہے کہ کوئی شخص کسی دوسرے کو سونے کے بدلے سونا یا چاندی کے بدلے چاندی ادھار فروخت کرے۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے سود حرام کیا ہے، کیوں کہ اس میں محتاجوں کا نقصان اور ناجائز طریقے سے لوگوں کا مال کھایا جاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''اعمال کا دار و مدار نیتوں پر ہے، ہر شخص کے لیے وہی ہے جو اس نے نیت کی۔''[2] جب مقصود وہ ہو جس کو اللہ اور رسول نے حرام قرار دیا ہے تو اس تک ہر ذریعے سے پہنچنا حرام ہوتا ہے۔ انسان کے لیے صرف جائز خرید و فروخت اور تجارت کو حاصل کرنے کے لیے کوئی ذریعہ اختیار کرنا جائز ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بیع یعنی خرید و فروخت کو حلال اور سود کو حرام کیا ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۲۹/۵۰۱)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (۱) صحيح مسلم، رقم الحديث (۱۹۰۷)

﴿لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ﴾ [النساء: ٢٩]

''اپنے مال آپس میں باطل طریقے سے نہ کھاؤ، مگر یہ کہ تمھاری آپس کی رضا مندی سے تجارت کی کوئی صورت ہو۔''

وہ تاجر جو کوئی سامان بیچنے اور نفع کمانے کے لیے خریدتا ہے، چاہے وہ اس کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرے یا ایک وقت کے لیے محفوظ اور سٹاک کرے، اس انسان کا مقصود وہ سامان ہوتا ہے جس سے وہ نفع کما سکتا ہے۔ وہ نہ تو اس کو کم قیمت میں فروخت کرنے کے لیے خریدتا ہے، نہ برابر برابر بیچنے کے لیے۔ وہ بیع جس میں سامان سے فائدہ اٹھانا مقصود ہو خواہ وہ کوئی کھانے کی چیز ہو یا پینے کی یا پہننے کی یا کوئی سواری وغیرہ اور اس طرح کی چیزیں جن سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے، اللہ نے ان اشیا کو مال کے بدلے خریدنا اور بیچنا حلال قرار دیا ہے۔

اگر کسی انسان کا مقصود مال سے فائدہ اٹھانا نہیں، نہ نفع کمانے کے لیے بیچنا ہے، بلکہ اس کو بیچ کر اس کی قیمت لینا ہے تو اس انسان کا مقصود سود کا مقصود ہے۔ جب دوسرا انسان اس کے ساتھ یہ معاملہ طے کر لے تو وہ سود خور ہو گا، خواہ یہ بات طے ہو کہ وہ اس کو ادھار سامان بیچے گا پھر اس سے کم قیمت میں خرید لے گا، جس طرح زید بن ارقم کی امِ ولد (لونڈی) نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کہا: اے ام المومنین! میں نے زید بن ارقم سے عطیے کی رقم آنے کے وعدے پر آٹھ سو درہم میں ایک غلام خریدا، پھر اس کو چھے سو درہم میں (نقد) بیچ دیا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا: تو نے بری خرید کی ہے، تو نے بری خرید کی ہے۔ زید کو بتا اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کیے اپنے جہاد کو باطل اور کالعدم کر لیا ہے، اِلا یہ کہ توبہ کرے۔''[1]

ایک شخص نے کسی کو ریشم بیچا پھر اسی سے کم قیمت میں خرید لیا۔ اس معاملے کے بارے میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے پوچھا گیا تو انھوں نے کہا: یہ درہم کے بدلے درہم ہی ہیں۔ درمیان میں صرف ریشم داخل ہوئی ہے۔ اس سے متعلق حضرت انس رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا تو انھوں نے جواب دیا: یہ اللہ اور رسول نے حرام قرار دیا ہے۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: جب تو نقد کی قیمت لگوائے پھر نقد ہی بیچ دے تو اس میں کوئی حرج نہیں، لیکن جب قیمت نقد کی لگوائے اور بیچ ادھار دے تو یہ ادھار کے بدلے ادھار کی بیع ہے۔

سنن میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے ایک بیع (سودا) میں دو سودے کیے تو اس کے لیے وہ ہے جو کم تر ہو یا پھر سود ہے۔''[2]

---

[1] السنن الكبرىٰ للبيهقي (٥/٣٣٠، ٣٣١) مصنف عبد الرزاق (٨/١٨٥) مسند ابن جعد (١/٨٠)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٤٦١) السلسلة الصحيحة (٢٣٢٦)

جب خریدنے والا اور بیچنے والا یہ طے کر لے کہ خریدار وہ سامان خرید کر اسی کو فروخت کر دے گا تو اس نے ایک سودے میں دو سودے طے کر لیے۔ اس صورت میں وہ کم تر قیمت کا حق دار ہو گا، مثلاً یہ طے ہو کہ دکاندار اس کو وہ چیز ادھار سو روپے میں دے گا اور اس سے اسّی روپے میں نقد خریدے گا، تو مالک دوسرے سودے کے ساتھ ہی فروخت کر سکے گا، یعنی طلب گار اسّی روپے ہی دے گا، وہ اس سے کم تر قیمت کا مطالبہ کرنے کا حق دار ہو گا جو اسّی روپے بنتے ہیں۔

اسی طرح اگر سامان کا مالک ضرورت مند ہو، مثلاً کسی سپاہی یا کسان کو قرض کی ضرورت ہو، وہ کسی سے کہے: تو مجھ سے میرا گھوڑا یا بیل نقد اسّی درہم میں خرید لے اور مجھے ہی سو روپے میں ادھار بیچ دے تو وہ صرف اسّی دینے کا حق دار ہو گا۔

وہ شرط جو عقد، یعنی معاملے سے پہلے ہو وہ عقد کے وقت ہونے والی شرط ہی کی طرح ہوتی ہے جب تک کوئی ایک فریق اسے ختم نہ کرے۔ عرفی شرط جو معمول کا حصہ بن جائے، لفظی شرط کی طرح ہی ہوتی ہے۔ عقود یعنی معاملات میں مقاصد اور نیتوں کا اعتبار ہوتا ہے، کیوں کہ اعمال کا دار و مدار نیتوں پر ہے۔ اسی طرح جب وہ دو یہ طے کر لیں کہ ایک کسی تیسرے سے نقد چیز خرید کر اس کو اس کی قیمتِ خرید سے زیادہ قیمت پر ادھار بیچ دے گا، پھر خریدار اس چیز کو دوکاندار کو واپس کر دے گا تو یہ سہ فریقی حیلہ ہے۔ جب دکاندار کو ان دونوں کی نیت کا علم ہو گیا، وہ سود میں ان دونوں کا شریک ہو جائے گا۔

ایسے معاملے میں چونکہ چیز خریدنے سے پہلے نفعے کی شرط لگائی جاتی ہے اور ان دونوں کا مقصود اصلی درہم کے بدلے درہم کا ادھار تبادلہ ہوتا ہے، لیکن اگر خریدار کوئی چیز فائدہ اٹھانے یا تجارت کی غرض سے خریدتا ہے، اس کو نقد بیچ کر قیمت حاصل کرنا اس کا مقصود نہیں ہوتا، تو یہ جائز ہے۔ جب اس چیز کی ضرورت ہو تو جائز اور معروف نفع لے کر اس کو فروخت کرنا جائز ہے۔ اسی طرح جو سودے بازی نہیں کرتا، اس سے بھی اتنا ہی نفع لیا جائے جتنا عام لوگوں سے لیا جاتا ہے، کیوں کہ جو انسان سودے بازی نہیں کرتا، اس سے بھاری نفع کمانا بھی سود ہی ہے۔

جب خریدار اور بیچنے والا سودے پر راضی خوشی ہو کر جدا ہو جائیں تو وہ بیع لازم اور نافذ ہو جاتی ہے۔ اس وقت خریدار کو چاہیے ساری قیمت دے اور اس سے کچھ بھی کم نہ کرے، بلکہ اگر مالدار ہو تو کمی کرنے کا مطالبہ کرنا ہی جائز نہیں، کیوں کہ مالدار کا دوسرے سے مانگنا تک منع ہے، جب کہ یہ اس سے اس کا حق ساقط کرنے کا مطالبہ کر رہا ہے۔ اسی طرح جب وہ اپنے کسی نوکر وغیرہ کو بھیجے تو اس کو یہ اختیار نہ دے کہ وہ قیمت میں سے اس سے کچھ مانگتا پھرے، ہاں اگر بیچنے والا راضی خوشی اس کو کچھ دے دیتا ہے تو یہ اس پر صدقہ ہو گا اور صدقہ لوگوں کا میل کچیل ہوتا ہے۔ اگر وہ بغیر ضرورت لوگوں کا میل کچیل لینا پسند کرتا ہے تو اس نے اپنے لیے وہ چیز پسند کی جو کوئی عقل مند پسند نہیں کرتا۔

ہاں اگر کوئی کسی دوسرے کو ذاتی فائدہ حاصل کرنے یا تجارت کرنے کے لیے کوئی چیز ادھار فروخت کرتا ہے تو

یہ جائز ہے۔ اگر وہ اس کو وہ چیز بولی لگا کر فروخت کرتا ہے تو اس کی کوئی حد مقرر نہیں کی جا سکتی۔ اگر متعین نفع کی بنیاد پر فروخت کرے تو جو نفع وہ دونوں طے کر لیں اور اس پر راضی ہوں وہی ہو گا جب خریدار مجبور نہ ہو۔ اگر خریدار مجبور ہو تو اس سے وہی نفع لینا چاہیے جو غیر مجبور سے لیا جاتا ہے۔ واللہ أعلم [1]

ایک ساتھ بیع اور قرض کا حکم

سوال ایک شخص نے دوسرے شخص کو ایک ہزار درہم بطور قرض دیے۔ جب ادا کرنے کا وقت آیا تو مقروض نے کہا: میرے پاس کچھ نہیں، البتہ اگر تو مجھے چھے ماہ کی مہلت دے تو میں تجھ سے کوئی چیز زائد پیسوں میں خرید لیتا ہوں۔ کیا یہ جائز ہے؟

جواب رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: «لَا يَحِلُّ بَيْعٌ وَسَلَفٌ» [2] ''بیع اور قرض جائز نہیں۔'' لہٰذا یہ حرام ہے اور دونوں تعزیر کے مستحق ہیں، اگر اس کو اس کی ممانعت کا علم ہے۔ قرض اور سامان اس کے مالک کو واپس کیا جائے۔ اگر یہ ناممکن ہو تو وہ صرف قرض کا بدل دے اور سامان کا بدل اس کی مثلی قیمت دے، وہ اس پر کسی اضافے کا مستحق نہیں۔ واللہ أعلم [3]

واجب الادا حقوق نکلوانے کے لیے قانونی چارہ جوئی اور سزا

سوال ایک شخص نے تاجروں سے ادھار مال لیا۔ جب اس سے واپسی کا تقاضا کیا گیا تو اس نے ادا کرنے کی قدرت کے باوجود ادا کرنے سے انکار کر دیا۔ انھوں نے اس کے خلاف قانونی چارہ جوئی کرتے ہوئے اس کو گرفتار کروا دیا۔ سوال یہ ہے کہ کیا حاکم یا کوتوال اس سے واجب الاداء حقوق نکلوانے کے لیے اس کو سزا دے سکتا ہے، نیز اس کے بارے میں شریعت کیا کہتی ہے؟

جواب اگر کوئی شخص لوگوں کے تمام حقوق ادا کرنے کے لیے اپنے مال کو ظاہر کرنے اور اس تک رسائی سے روک دے، اس کا مال ظاہر ہو اور ادا کرنے کے لیے اس کی اجازت اور تصرف کی ضرورت ہو مگر وہ روکے رکھنے پر اصرار کرے تو عام فقہا کے مذہب کے مطابق اس کو جسمانی سزا دی جا سکتی ہے، تاکہ وہ اپنے اوپر واجب الاداء حقوق ادا کرے، بلکہ عراقی و شامی شوافع اور اصحابِ مالک و احمد وغیرہ نے یہ بات صریحاً کہی ہے۔ ہمارے علم

---

[1] جامع المسائل (١/٢٢٣_٢٢٦)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٥٠٤) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٢٣٤) سنن النسائي، رقم الحديث (٤٦١١) صحيح الجامع، رقم الحديث (٧٦٤٤)

[3] مجموع الفتاوىٰ (٥٢٨/٢٩)

کے مطابق اس میں کوئی اختلاف نہیں، بلکہ انھوں نے یہ مسئلہ اپنی کتابوں میں ایک سے زیادہ جگہوں پر تکرار کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

فقہائے کرام نے کافروں سے نکاح کے باب میں بھی اس کا ذکر کیا ہے کہ اگر کوئی کافر مسلمان ہو جائے اور اس کی زوجیت میں چار سے زیادہ بیویاں ہوں اور وہ انتخاب سے انکار کر دے تو انھوں نے اسی مسئلے کو اصل قرار دے کر قیاس کرتے ہوئے کہا ہے: اس کو مارا جائے، تاآنکہ وہ انتخاب کرے، کیوں کہ اس نے اس کام کے کرنے سے انکار کیا ہے جو اس پر فرض ہے، لہٰذا اس کو مارا جائے گا، تاوقتیکہ وہ اس کو کرے، جس طرح واجب الاداء قرض ادا کرنے سے انکار کرنے والے کو مارا جاتا ہے، تاوقتیکہ وہ اس کو ادا کر دے۔

رسول اللہ ﷺ نے صحیحین کی متفق علیہ حدیث میں فرمایا ہے: «مَطْلُ الْغَنِيِّ ظُلْمٌ»[1] ''مالدار کا ٹال مٹول کرنا ظلم ہے۔'' ظالم سزا کا مستحق ہوتا ہے، سنن میں حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «لَيُّ الْوَاجِدِ يُحِلُّ عِرْضَهُ وَعُقُوْبَتَهُ»[2] ''مال رکھتے ہوئے ٹال مٹول کرنے والے کی عزت اور سزا حلال ہو جاتی ہے۔'' اس حدیث میں آنحضرت ﷺ نے قدرت رکھتے ہوئے ٹال مٹول کرنے والے کی عزت دری حلال کی ہے اور تعزیری سزا باتفاقِ علما ہر اس جرم کے لیے ہے، جس کے لیے حد یا کفارہ مقرر نہ ہو۔

معاصی یعنی جرائم دو طرح کے ہوتے ہیں، ایک مامور یعنی جس کا حکم دیا گیا ہو اس کو ترک کرنا اور دوسرے ممنوع کا ارتکاب کرنا، اگر ترک واجب کی سزا ہو، جیسے یہ اور اس طرح کے واجبات ترک کرنے والے لوگ، تو اس شخص کو اس وقت تک سزا دی جائے گی، جب تک وہ اس کو کرنے نہ لگ جائے۔ یہی وجہ ہے جن مالکیوں، شافعیوں اور حنبلیوں نے اس مسئلے کا ذکر کیا ہے، انھوں نے کہا ہے: اس کو بار بار مارا جائے جب تک وہ اس کو ادا نہ کر دے۔ کچھ نے ہر مرتبہ ضرب لگانے کی مقدار ۳۹ کوڑے مقرر کی ہے۔ کچھ نے مقرر نہیں کی، کیوں کہ تعزیر کے مقرر اور غیر مقرر ہونے میں اختلاف ہے۔ حاکم انکار کرنے پر اس کو تعزیری سزا دے سکتا ہے اور اس وقت تک سزا دینے کا اختیار رکھتا ہے جب تک وہ واجب الادا حقوق ادا نہیں کرتا۔ تاہم اس کا مال فروخت کر کے قرض ادا کرنے کی ذمے داری حاکم پر عائد نہیں ہوتی گو یہ اس کے لیے جائز ہے، مگر جب وہ یہ سمجھے کہ اس کو مال فروخت کرنے اور قرض ادا کرنے کا پابند بنانا اس جیسے ٹال مٹول کرنے والے کے لیے زجر و توبیخ کا سبب بنے گا یا وہ کسی دوسرے کام میں مشغول ہو یا

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢١٦٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٥٦٤)

[2] صحيح البخاري (٢/٨٤٥) سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٦٢٨) سنن النسائي، رقم الحديث (٤٦٨٩) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٤٢٧) صحيح الجامع، رقم الحديث (٥٤٨٧)

اس کے نتیجے میں کسی خرابی کا اندیشہ ہو تو اس کو مارنے کی سزا دینا جائز ہے، تا آنکہ وہ اپنی ذمے داری ادا کر دے۔

اگر وہ کہے: اس وقت اس کو نقد بیچنے میں نقصان ہے، اس لیے میں ادھار بیچوں گا اور پھر اس سے لے لینا، وہ کہتے ہیں ہم اس سے نہیں لیں گے، لیکن ہم اس بات پر راضی ہیں کہ اس کو اس مدت تک فروخت کر دیا جائے اور حق وصول کر لیا جائے۔ اس صورت میں جو نقصان ہوگا وہ مشتری ہی کا ہوگا، قرض داروں کی بات تسلیم کی جائے گی، حاکم اس کے مال کو فروخت کرے اور کسی کی ذمے داری لگائے جو قرض داروں کو ان کا حق وصول کر کے دے اور اس شخص کو ترک واجب پر سزا دے۔ قرض دار جلد از جلد نقداً فروخت کرنے کا مطالبہ کر سکتے ہیں۔ اگر اس کو مثلی قیمت پر فروخت کرنا ممکن ہو تو فروخت کر دیا جائے، وہ ان کے مطالبے پر عمل کرے گا اور حاکم اپنی ذمے داری میں یہ کام کروائے گا اور اس کو ترک واجب پر تعزیری سزا بھی دے گا۔ واللّٰہ أعلم [1]

سزا کے ذریعے واجب الادا حق کا اقرار کروانا

سوال کسی شخص کے ذمے کسی کا کوئی حق واجب الادا ہو مگر وہ ادا نہ کرے تو کیا اس کو سزا دلوا کر اس کا اقرار کروایا جا سکتا ہے؟

جواب جس پر کسی کا کوئی حق واجب الادا ہو اور وہ اسے ادا کرنے پر قادر ہو مگر ادا کرنے سے انکار کر دے تو اس کو اس وقت تک قید وضرب کی سزا دی جا سکتی ہے جب تک وہ حق ادا نہ کرے، خواہ وہ حق قرض کی صورت میں ہو، امانت کی صورت میں، غصب شدہ مال کی شکل میں یا کوئی چیز بطور ادھار اس نے لی یا مسلمانوں کا کوئی بھی مال ہو۔ دوسری صورت یہ ہے کہ وہ حق کوئی کام ہو، مثلاً بیوی کا خاوند کو حقِ زوجیت ادا کرنے سے روکنا، مزدور کا وہ کام کرنے سے انکار کرنا جس کی اجرت اس نے لی ہو، یہ سب کتاب وسنت اور اجماع سے ثابت ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَالّٰتِيْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ ﴾ [النساء: ٣٤]

''اور وہ عورتیں جن کی نافرمانی سے تم ڈرتے ہو، سو انھیں نصیحت کرو اور بستروں میں ان سے الگ ہو جاؤ اور انھیں مارو۔''

اس آیت میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے خاوند کو ایسی صورت میں اپنی بیوی کو ضرب لگانے کی اجازت دی ہے۔ جب وہ خاوند کو حقِ زوجیت ادا کرنے سے روکے اور بستر پر آنے سے انکار کر دے۔

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۳۰/۲۲۔۲۴)

نبی اکرم ﷺ کا فرمان ہے:

« مَطْلُ الْغَنِيِّ ظُلْمٌ » (بخاري و مسلم)[1] ''مالدار کا ٹال مٹول کرنا ظلم ہے۔''

آپ ﷺ نے فرمایا:

« لَيُّ الْوَاجِدِ يُحِلُّ عِرْضَهُ وَعُقُوبَتَهُ »[2]

''جس کے پاس مال موجود ہو اور وہ پھر بھی ادا کرنے میں ٹال مٹول کرے تو اس کی عزت دری اور سزا حلال ہو جاتی ہے۔''

اس سے معلوم ہوا کہ ٹالنے والے کو سزا دینا جائز ہے۔

صحیح بخاری میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے اہلِ خیبر کے ساتھ سونے چاندی اور اسلحہ پر صلح کی۔ آپ ﷺ نے حیی بن اخطب کے چچا سے اس کے خزانے کے بارے میں پوچھا تو اس نے کہا: وہ اخراجات کی نذر ہو گیا ہے۔ آپ ﷺ نے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ سے کہا: اس سے معلوم کرو۔ حضرت زبیر نے اس کو تھوڑی سی جسمانی اذیت پہنچائی تو اس نے بتایا کہ وہ فلاں ویران جگہ پر بیل کی کھال میں ہے۔[3] جب رسول اللہ ﷺ کو معلوم ہوا کہ یہ شخص اس مال کی جگہ کے بارے میں جانتا ہے جو آپ ﷺ کا استحقاق تھا اور اس نے اسے چھپا کر رکھا ہوا تھا تو آپ ﷺ نے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کو اس کو سزا دینے کا حکم دیا، تاکہ وہ اس کا پتا بتائے۔ جس نے مال چھپایا تھا، وہ سزا کا زیادہ مستحق ہے۔ یہ مسئلہ تمام فقہا نے ذکر کیا ہے اور میرے علم کے مطابق اس میں کوئی اختلاف نہیں۔

ان فقہا نے ذکر کیا ہے کہ جو شخص قرض وغیرہ ادا کرنے سے انکار کرے اور نہ دینے پر اصرار کرے تو اس کو سزا دی جائے اور بار بار مارا جائے، تاآنکہ وہ اس کو ادا کرے۔

اس مسئلے میں علما کا اجماع ہے کہ تعزیر ہر اس نافرمانی میں جائز ہے جس کی حد اور کفارہ نہ ہو۔ نافرمانیوں کی دو اقسام ہیں؛ فرض چھوڑنا اور حرام کا ارتکاب کرنا۔ جو استطاعت کے باوجود قرض ادا نہیں کرتا، وہ نافرمان ہے اور سزا و تعزیر کا مستحق۔ واللہ أعلم[4]

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٢١٦٦) صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٥٦٤)

[2] صحیح البخاري (٨٤٥/٢) سنن أبي داود، رقم الحدیث (٣٦٢٨) سنن النسائي، رقم الحدیث (٤٦٨٩) سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (٢٤٢٧) صحیح الجامع (٥٤٨٧)

[3] سنن أبي داود، رقم الحدیث (٣٠٠٦) بخاری میں یہ روایت نہیں ملی۔

[4] مجموع الفتاویٰ (٣٧/٣٠۔٣٩)

مقروض کو حج کروانا

سوال ایک شخص مقروض ہے مگر قرض ادا کرنے کی طاقت نہیں رکھتا، کیوں کہ اس کے پاس کوئی چیز ہی نہیں جس سے قرض چکا سکے۔ اس کا باپ مالدار ہے، لیکن اس نے اس کی طرف سے کچھ بھی ادا نہیں کیا۔ وہ اس کو اپنے ساتھ حج پر لے جانا چاہتا ہے۔ کیا مقروض ہونے کی وجہ سے اس سے فرض ساقط ہو جائے گا؟ حج کرنے کے لیے بھی اس کے پاس کچھ نہیں۔ اس کا باپ ہی اس کو حج کروا رہا ہے؟

جواب الحمد لله. ہاں جب اس کا باپ اس کو اپنے مال سے حج کروا دے تو باتفاقِ علما اس سے فریضہ ساقط ہو جاتا ہے، البتہ اس میں اختلاف ہے کہ جب اس کا باپ مال خرچ کرے تو کیا اس پر حج فرض ہو جائے گا؟ اس مسئلے میں اختلاف مشہور ہے، تاہم فرض اس سے ساقط ہو جائے گا، چاہے اس کا باپ اس کو مال دے دے، یا اس پر خرچ کرے یا اس کو مالک بنائے بغیر سوار کروا دے۔

اگر وہ مقروض ہو اور قرض دار اس کو حج کی اجازت دے دیں تو سفر کے جواز میں کوئی شک نہیں، لیکن اگر روک دیں، تاکہ وہ وہیں ٹھہر کر کام کرے اور ان کے پیسے لوٹائے تو وہ اس کا اختیار رکھتے ہیں۔ بہتر یہی ہے کہ وہاں رہ کر کمائی کرے اور قرض چکائے۔ اگر قرض داروں کو اس کا تنگ دست ہونا معلوم ہو تو اس سے مطالبہ نہیں کرنا چاہیے اور اس کو حج سے نہ روکیں۔ اگر قرض دار کہیں ہمیں خدشہ ہے یہ واپس نہیں آئے گا، اس لیے ہمیں ایسا ضامن چاہیے جو اس کی واپسی اور حاضری کی ضمانت دے تو ان کا یہ مطالبہ قابلِ توجہ ہے، کیوں کہ ان کے حقوق باقی ہیں، لیکن وہ ان کو ادا کرنے سے قاصر ہے، اگر وہ ادا کرنے پر قادر ہوتا تو وہ بلاشبہہ اس کو روک سکتے تھے۔

اسی طرح اگر اس نے قرض واپس کرنے کا کوئی وقت مقرر کیا ہو جو اس کی سفر سے واپسی سے پہلے کا ہو تو اس صورت میں بھی وہ اس کو روک سکتے ہیں، تا آنکہ وہ ضامن یا رہن کے ذریعے اس کی یقین دہانی نہ کروا لیں۔ اگر واپس کرنے کا وقت اس کے سفر سے واپس آنے کے بعد کا ہو اور سفر بھی پرامن ہو تو اس صورت میں اس کو روکنے سے متعلق دو اقوال مشہور ہیں جو دونوں امام احمد سے روایات ہیں۔ اگر سفر پرخطر، مثلاً سفرِ جہاد وغیرہ اور اس کا نام متعین ہو چکا ہو تب بھی وہ اس کو روک سکتے ہیں۔ جب قرض دار اپنا اپنا قرض وصول کر لیں تو مالک، شافعی اور احمد جیسے جمہور فقہا کے نزدیک وہ اس کو چھوڑ دیں گے اور ابو حنیفہ کے نزدیک وہ اس کے ساتھ ہی رہیں گے، یہ حالتِ حضر میں ہے۔ واللہ أعلم [1]

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۳۰/۲۷۔ ۲۹)

یتیم کے مال میں، بغرضِ تجارت تصرف کرنا

سوال ایک شخص کی کفالت میں ایک یتیم ہے اور اس کا مال بھی اسی کے اختیار میں ہے۔ وہ اپنے مال سے یتیم کی کفالت کر رہا ہے۔ کیا وہ حاکم کی اجازت کے بغیر اس کے مال میں تجارت یا زمین خریدنے کے لیے تصرف کر سکتا ہے، تاکہ اس کے مال میں اضافہ ہوتا رہے؟

جواب ہاں جائز ہے، بلکہ اس کو ضرور ایسا کرنا چاہیے، اگر وہ وصی ہے تو حاکم کی اجازت کی ضرورت نہیں۔ اگر وصی نہیں اور یتیموں کے مال کا منتظم عادل حاکم ہو جو اس کی حفاظت اور اس کے مفادات کا نگران ہو تو تب اس کی اجازت ضروری ہے۔ اگر اس کی اجازت مال ضائع کرنے کا سبب بنے، مثلاً: حاکم یا اس کا نائب فاسق، جاہل، عاجز یا یتیموں کے اموال کی حفاظت نہ کرتا ہو تو نگران اس کی حفاظت کرے اور حاکم کی اجازت کے بغیر ایسا تصرف کر سکتا ہے جو اس کے مفاد میں ہو۔[1]

دلال کا وکیل کو بے خبر رکھ کر مہنگا سامان دلانا

سوال ایک آدمی نے دلال کو اپنے لیے کوئی سامان خریدنے کے لیے کہا۔ اس نے وہ سامان خریدا مگر بیچنے والے نے اس کو کچھ کمیشن دے کر وہ سامان مہنگے داموں فروخت کیا، کیا یہ جائز ہے؟

جواب یہ ناجائز ہے؛ کیوں کہ دلال نے اپنے موکل کے لیے رشوت لے کر وہ چیز مہنگے داموں خریدی۔ یہ گویا اس کے ساتھ دھوکا ہے۔ یہ اس صورت میں ہے جب دلال اور بائع کے درمیان اتفاق ہو چکا ہو، یا یہ معلوم ہو، لیکن اگر بائع اسے وہ چیز بطور ہبہ دیتا ہے جس میں رشوت رسانی کا کوئی عنصر نہ ہو تو اس کی تفصیل کسی دوسری جگہ گزر چکی ہے۔ واللہ أعلم[2]

دلال کا وکیل کی اجازت کے بغیر تصرف

سوال ایک آدمی نے اپنا کوئی سامان فروخت کرنے کے لیے کسی کو اپنا وکیل مقرر کیا۔ اس نے وہ سامان ادھار بیچ دیا اور کچھ قیمت ضائع ہو گئی۔ اب مالک اس کی موجودہ قیمت کا مطالبہ کرے گا یا ادھار قیمت کے مثل جو زیادہ ہے؟

جواب اگر اس نے اس کو ادھار فروخت کرنے کی اجازت نہیں دی تھی تو مالک کو اختیار ہے چاہے اس کی نقد قیمت کا مطالبہ کرے یا ادھار ساری قیمت کا۔ نقصان اس سامان والے سے پورا کیا جائے گا، کیوں کہ اس نے اس کی

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۳۰/۴۹)

[2] مجموع الفتاویٰ (۳۰/۵٤)

اجازت کے بغیر یہ تصرف کیا، یہ اس طرح ہے جس طرح غاصب تصرف کرتا ہے۔ غاصب کے پاس جب سامان تلف ہو جائے تو مالک کو بعینہٖ اس کا مطالبہ کرنے کا اختیار بھی ہوتا ہے اور بدلِ مطلق کا بھی جو اس کے مثل کوئی چیز ہوسکتی ہے یا اس کی قیمت۔ یہ اس صورت میں ہے جب مشتری کو اس کے غصب شدہ ہونے کا علم نہ ہو اس وقت صرف طے شدہ قیمت ذمے ہوتی ہے۔[1]

شراکتِ ابدان کا حکم

سوال کچھ لوگ ایک دوسرے کی رضا مندی کے بغیر شراکتِ ابدان میں شامل ہوئے اور انھوں نے کچھ کام اکٹھے کیے، کچھ علاحدہ علاحدہ، کیا یہ شراکت جائز ہے؟ اس میں ہر ایک اپنے کام کی وجہ سے اجرت کا مستحق ہو گا یا نہیں؟ نیز جس نے کوئی کام کیا وہ دوسرے کے کام کی وجہ سے اور رضا مندی کے بغیر اجرت لے سکتا ہے؟

جواب شراکتِ ابدان میں علما کا اختلاف ہے اور اس کی دو انواع ہیں:

1. وہ جس کام کو کرنے کی ذمے داری اٹھائیں اس میں شراکت کریں، جیسے کپڑے سینا، کپڑے بننا اور چوب کاری جیسے مختلف پیشے کہ جن کی اجرت کام کی بنیاد پر ہوتی ہے، وقت کی بنیاد پر نہیں۔ اس کو مشترک اجیر (مزدور) کہا جاتا ہے۔ ان کے ذمے کام اس طرح ہوتا ہے کہ وہ یہ کام کسی دوسرے سے بھی کروا سکتے ہیں، کام عینی چیزوں کے قرضوں کی طرح ان کے ذمے قرض ہوتا ہے۔ یہ اجیر خاص کی طرح ان پر فرضِ عین نہیں ہوتا۔ ابو حنیفہ، مالک اور احمد نے ان کا اشتراکِ عمل جائز قرار دیا ہے۔ یہ ان کے نزدیک شراکتِ وجوہ کے مانند ہے، جس میں ایک شریک اپنے واسطے اور جاہ و مرتبت سے اپنے لیے اور اپنے شریک کے لیے کچھ خریدتا ہے، جس طرح شریک اپنے لیے اور اپنے شریک کے لیے کام قبول کرتا اور پکڑتا ہے۔
2. فقہا کہتے ہیں یہ شراکت وکالت پر مبنی ہے۔ اس میں ہر شریک اپنے لیے جو بھی تصرف کرتا ہے وہ مالک کی حیثیت سے ہوتا ہے اور جو دوسرے کے لیے کرتا ہے وہ بطور وکیل ہوتا ہے۔

یہ امام شافعی کے نزدیک ناجائز ہے، کیوں کہ ان کے مذہب میں شراکت عقد کے ساتھ ثابت نہیں ہوتی، بلکہ شراکت خاص طور پر شراکتِ املاک ہوتی ہے۔ اگر وہ دونوں مال میں شریک ہوں تو مال کے نفع اور نقصان دونوں میں شریک ہوں گے۔ اس بنا پر ان کے مذہب میں اگر دونوں مالوں کی جنس مختلف ہو تو شراکتِ عنان جائز نہیں۔ اگر دونوں مالوں کی جنس مختلف نہ ہو تب جائز ہے اور نفع دونوں مالوں کی مقدار کے مطابق ہو گا۔

---

[1] مجموع الفتاویٰ (٣٠/٦٥)

جمہور فقہا اس مسئلے میں ان سے اختلاف کرتے ہیں اور کہتے ہیں: شراکت کی دو اقسام ہیں:

① شراکتِ املاک ② شراکتِ عقود

شراکتِ عقد اصلاً شراکتِ املاک کی محتاج نہیں، جس طرح شراکتِ املاک شراکتِ عقود کی ضرورت نہیں رکھتی گو کسی صورت میں اکٹھی بھی ہو جاتی ہیں۔ مضاربہ بالا جماع شراکتِ عقود ہے، لیکن شراکتِ املاک نہیں، کیوں کہ اس میں مال ایک کا ہوتا ہے اور کام دوسرے کا۔ اسی طرح مساقات اور مزارعہ کا مسئلہ ہے۔ اگرچہ کچھ فقہا اسے اجارۃ کے باب میں شمار کرتے ہیں اور اس کو خلافِ قیاس سمجھتے ہیں، لیکن درست یہ ہے کہ یہ ایک مستقل اصل اور قانون ہے۔ یہ مشارکت ہی سے تعلق رکھتی ہے، خاص اجارہ سے نہیں اور یہ مشارکات کے قیاس کے بالکل مطابق ہے۔

جب شراکت کی بنیاد اس قاعدے پر استوار ہوئی تو اس میں وکیل بنانے کے جواز کی بنا پر فقہا نے مباحات کے اکتساب اور کمانے میں شراکت میں اختلاف کیا، امام احمد نے اسے جائز کہا اور امام ابو حنیفہ نے ناجائز، امام احمد نے حضرت سعد، عمار اور ابن مسعود رضی اللہ عنہم کی حدیث سے دلیل لی۔

کہا جا سکتا ہے یہ (شراکت) دوسری نوع سے تعلق رکھتی ہے۔ جب وہ اس معاملے میں شریک ہوں جس میں اپنے اجسام اور سواریوں کو اجارۂ خاص پر دیں۔ اس اجارہ کے متعلق دو اقوال مروی ہیں: امام ابو حنیفہ کے مذہب میں یہ باطل ہے۔ حنبلی مذہب میں ابو الخطاب اور قاضی اسے جائز قرار دیتے ہیں۔ قیاسِ مذہب اسی کا تقاضا کرتا ہے، کیوں کہ کسی کام میں جائز شراکت کرتے وقت ضمانت کی شرط نہیں ہوتی، مثلاً دو لوگ مچھلیاں پکڑنے یا ایندھن اکٹھا کرنے میں شراکت داری اختیار کریں، کیوں کہ اس میں یہ نہیں ہوتا کہ جو کام ایک پر لازم ہو تو دوسرے پر بھی وہی ہو۔ یہ تو مویشیوں کی اور باغ کی پیداوار وغیرہ میں اشتراک جیسا معاملہ ہے۔

جو اسے جائز کہتا ہے، اس کے نزدیک یہ مباح اور جائز اکتسابات میں اشتراک کے مثل ہے، کیوں کہ اس میں دونوں میں سے کسی ایک کے ذمے بھی کام ثابت نہیں ہوتا، لیکن شراکت کی صورت وہ اپنی طرف سے بھی کرتا ہے اور اپنے شریک کی طرف سے بھی، اس طرح یہاں اس معاملے میں وہ جو اجرت طے کرتا ہے، تو وہ دونوں کے لیے ہوتی ہے، کیوں کہ وہ دونوں جو کام کرتے ہیں، وہ اپنی طرف سے بھی کرتے ہیں اور اپنے حصے دار کی طرف سے بھی، یہی قول زیادہ درست ہے بالخصوص جو دونوں کے اموال کے عدمِ اختلاف اور دونوں کی اجناس کے اختلاف کے باوجود شراکتِ عنان کے جواز کے قائل ہیں، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ ﴾ [المائدۃ: ۱] ''عہد پورے کرو۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«اَلْمُسْلِمُوْنَ عِنْدَ شُرُوْطِهِمْ إِلَّا شَرْطاً أَحَلَّ حَرَاماً أَوْ حَرَّمَ حَلَالًا »[1]

''مسلمانوں کی شرائط کی پاسداری کی جائے سوائے اس شرط کے جو کسی حلال کو حرام یا کسی حرام کو حلال کرتی ہو۔''

میرا خیال ہے یہ امام مالک کا قول ہے۔ جہاں تک گواہیوں میں اشتراک کا مسئلہ ہے تو اس کے بارے میں کہا جا سکتا ہے یہ شراکتِ ابدان سے تعلق رکھتا ہے جس میں فقہا کا اختلاف ہے، کیوں کہ گواہی ثابت الذمہ نہیں ہوتی اور اس میں وکیل بنانا بھی درست نہیں ہوتا کہ ایک شریک اپنے مال میں تو بطورِ مال تصرف کرے اور دوسرے کے مال میں وکیل کے طور پر تصرف کرنے والا بن جائے۔ پھر گواہی میں جو معاوضہ دیا جائے وہ جعالہ (اجرت) کے باب سے ہے، اجارہ لازم کے باب سے نہیں۔

یہ عقد اور معاہدے میں اشتراک ہے، عقدِ شراکت نہیں۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی چند لوگوں سے کہے: میری یہ دیوار بنا دو میں تم کو دس روپے دوں گا۔

اگر وہ شخص اجرت مقرر نہ کرے اور اسے معلوم ہو یہ لوگ اجرت پر کام کرتے ہیں تو جمہور فقہا کے نزدیک وہ اجرت مثل کے مستحق ہوں گے، لہٰذا شراکتِ ابدان کے متعلق جمہور فقہا؛ ابوحنیفہ، مالک اور احمد کا مذہب ہی درست ہے اور کتاب وسنت اور قیاس بھی اسی پر دلالت کرتے ہیں۔ بنا بریں اس میں ان سب کے درمیان عدل کو ملحوظ رکھا جائے، کسی کا جو کام ہو اس کو اس سے نہ روکا جائے اور کسی ایک کو خصوصی طور پر نہ نوازا جائے۔ واللّٰہ أعلم[2]

مضاربہ میں نقصان کی صورت میں عامل کی ذمے داری

سوال ایک شخص کسی کام میں کچھ لوگوں کے سرمائے کے بغیر شریک بنا، کسی ایک شریک نے بتایا کہ مال ڈوب گیا ہے، ایسی صورت میں کیا مذکورہ شخص جرمانہ بھرنے میں شریک ہوگا؟

جواب الحمد للّٰہ. اگر شراکت اس بنیاد پر ہوئی کہ کچھ کام کریں گے اور کچھ پیسہ لگائیں گے، اس کے بعد سارا یا کچھ مال کسی کوتاہی اور زیادتی کے بغیر ضائع ہو گیا۔ عامل نے کسی طرح کی کوتاہی نہ کی تو اس پر کسی طرح کا مالی تاوان عائد نہیں ہوگا، چاہے مضاربہ صحیح تھا یا فاسد۔ اس پر سب علما کا اتفاق ہے۔ واللّٰہ أعلم[3]

---

[1] صحيح البخاري (٧٩٤/٢) سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٥٩٤) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٣٥٢) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٣٥٣) شیخ البانی رحمہ اللہ نے إرواء الغليل (١٤٤/٥) میں اسے صحیح کہا ہے۔

[2] مجموع الفتاویٰ (٧٣/٣٠۔٧٨)

[3] مجموع الفتاویٰ (٨٢/٣٠)

حجام کی اجرت کی شرعی حیثیت

سوال کیا حجام (سینگی لگانے والے) کی اجرت حرام ہے؟ نیز کیا اس کے ہاتھ پلید ہوتے ہیں؟

جواب الحمد لله. اگر اس کے ہاتھ میں کوئی نجاست اور گندگی نہ لگی ہو تو وہ تمام مسلمانوں کے ہاتھ کی طرح ہے، اگر وہ خون آلود ہوں تو جس طرح استنجا کرنے کے بعد ہاتھ دھونے سے پاک ہو جاتے ہیں، اسی طرح خون دھونے سے بھی پاک ہو جاتے ہیں۔

صحیح بخاری ومسلم میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: رسول اللہ ﷺ نے سینگی لگوائی اور حجام یعنی سینگی لگانے والے کو اجرت دی۔[1] اگر یہ حرام ہوتی تو آپ ﷺ اس کو کبھی نہ دیتے۔ صحیحین میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے سینگی لگانے کے پیشے کے بارے میں پوچھا گیا تو انھوں نے کہا: رسول اللہ ﷺ نے سینگی لگوائی۔ ابو طیبہ نے آپ ﷺ کو سینگی لگائی۔ آپ ﷺ نے اس کو دو صاع غلہ دینے کا حکم دیا اور آپ ﷺ نے اس کے مالکوں سے بات کی تو انھوں نے اس کے ٹیکس میں کمی کر دی۔[2]

جمہور علما کے نزدیک حجام اپنے کام کی اجرت کا استحقاق رکھتا ہے اور ایک ضعیف قول کے مطابق اس کی اجرت جائز نہیں۔

حدیثِ محیصہ میں ہے کہ ان کے والد نے رسول اللہ ﷺ سے حجام کے خراج کی اجازت چاہی۔ آپ ﷺ نے اس کو اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ وہ مسلسل کہتا رہا تا آنکہ آپ ﷺ نے فرمایا:

''اسے اپنے غلام کو کھلاؤ اور اپنے اونٹ کے چارے کے لیے استعمال کر لو۔'' (رواه أبو حاتم و ابن حبان في صحيحه)[3]

اکثر علما نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے کہ یہ حرام نہیں، بلکہ آزاد کے لیے مکروہ تنزیہی ہے، کیوں کہ اگر حرام ہوتا تو آپ ﷺ نے اسے غلاموں کو کھلانے کا حکم نہ دیتے، کیوں کہ وہ عبادت کرنے والے ہیں اور یہ محال ہے کہ رسول اللہ ﷺ غلام کو حرام کھلانے کی اجازت دیں۔

کچھ علما اسے حرام کہتے ہیں، ان کی دلیل حضرت رافع بن خدیج کی یہ حدیث ہے جو صحیح مسلم میں مروی ہے: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢١٥٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٢٠٢)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٩٩٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٥٧٧)

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٤٢٢) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٢٧٧) السلسلة الصحيحة (٤٠٠٠)

«كَسْبُ الْحَجَّامِ خَبِيثٌ، وَثَمَنُ الْكَلْبِ خَبِيثٌ، وَمَهْرُ الْبَغِيِّ خَبِيثٌ» [1]

''حجام کی کمائی، کتے کی قیمت اور زانیہ کا مہر (اجرت) خبیث ہے۔''

صحیحین میں حضرت ابن ابی جحیفہ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں: میں نے اپنے باپ کو دیکھا، اس نے ایک حجام خریدا اور اس کے اوزار توڑ دیے۔ میں نے اپنے والد سے اس کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے کہا: ''رسول اللہ ﷺ نے خون کی قیمت وصول کرنے سے منع کیا ہے۔'' [2]

ان علما کے نزدیک اس کی کمائی کو خبیث کہنا اس کے حرام ہونے کا تقاضا کرتا ہے، جس طرح زانیہ کا مہر اور کاہن کا نذرانہ حرام ہے۔

جو جواز کے قائل ہیں وہ کہتے ہیں: رسول اللہ ﷺ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''جس نے ان دو خبیث پودوں کو کھایا وہ ہماری مسجد کے قریب نہ آئے۔'' [3]

آپ ﷺ نے ان کی خبیث اور گندی بو کی وجہ سے انھیں خبیث کہا ہے، لیکن یہ حرام نہیں۔ ایک حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم میں سے کوئی شخص اس حالت میں نماز نہ پڑھے، جب کہ وہ دو خبیث چیزوں کو روک رہا ہو۔'' [4] یہاں دو خبیث چیزوں سے بول اور براز مراد ہیں۔ ان کو خبیث ان کی نجاست کی وجہ سے کہا ہے، حرام ہونے کی وجہ سے نہیں۔

آپ ﷺ نے حجام کو اجرت دی ہے اور اسے غلاموں اور جانوروں کو کھلانے کی اجازت دی ہے، مگر زانیہ کا مہر اور کاہن کی مٹھائی ایسی چیزیں ہیں جن کا وہ استحقاق نہیں رکھتے اور وہ غلام اور جانوروں کو بھی نہیں کھلائی جاتیں۔ بہرحال ضرورت مند کی حالت بے نیاز کی حالت کی طرح نہیں ہوتی۔ کسی بزرگ کا قول ہے: ''ایسی کمائی اور پیشہ، جس میں کچھ حقارت ہو، لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلانے سے بہتر ہے۔''

شریعت کے تمام اصول اس قاعدے پر مبنی ہیں، منہیات (منع کردہ امور) اور مامورات (حکم کردہ امور) میں ضرورت مند اور غیر ضرورت مند کے درمیان فرق کیا جاتا ہے، لہٰذا ضرورت کے وقت محرمات اور ممنوع امور جائز ہو جاتے ہیں، بالخصوص جب یہ خدشہ ہو کہ انسان نے اگر یہ پیشہ چھوڑ دیا تو بھکاری بن جائے گا، کیوں کہ بھیک مانگنا اس سے زیادہ شدت کے ساتھ حرام ہے۔ علما کہتے ہیں: فرائض ادا کرنا ضروری ہوتا ہے، خواہ یہ شبہات کے بغیر ناممکن ہو۔

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٥٦٨)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢١٢٣)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٨١٥-٨١٨)

[4] صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٦٠)

ابو طالب اور ابو حامد نے ذکر کیا ہے کہ ایک آدمی نے امام احمد سے پوچھا: میرا ایک مقروض بیٹا فوت ہو گیا ہے اور اس کے کچھ ایسے قرضے ہیں جن کا تقاضا کرنا مجھے مکروہ لگتا ہے۔ امام صاحب نے جواب دیا: کیا تو اپنے بیٹے کو قرض کا گروی ہی رکھنا چاہتا ہے؟ قرض ادا کرنا فرض ہے اور فرض ادا کرنے کے لیے شبہہ چھوڑ دینے کا حکم ہے۔

بنا بریں علما کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ضرورت کے وقت حاکم اور اس کے ہم معنی لوگوں کو خرچہ دیا جائے، البتہ عدمِ حاجت میں اختلاف ہے، کتاب اللہ میں اس کی اصل یتیم کے سربراہ کے متعلق اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے:

﴿ وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ ۖ وَمَنْ كَانَ فَقِيرًا فَلْيَأْكُلْ بِالْمَعْرُوفِ ۚ ﴾ [النساء: ٦]

''اور جو غنی ہو تو وہ بہت بچے اور جو محتاج ہو تو وہ جانے پہچانے طریقے سے کھالے۔''

یہی اس کے تمام نظائر کا حکم ہے، کیوں کہ شریعت کی بنیاد حصول وتکمیلِ مقاصد اور ابطال وتقلیلِ مفاسد پر ہے۔ پرہیزگاری یہی ہے کہ جب دو اچھے کام ہوں تو ان میں سے بہتر کو اختیار کیا جائے اور جب دو شر سامنے آ جائیں تو ان میں سے کم تر کو اختیار کیا جائے۔ حجامۃ (سینگی لگوانا) کے متعلق بہت سی احادیث مروی ہیں۔ صحیحین میں ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: میری امت کی شفا تین چیزوں میں ہے: شہد پینا، حجام کا نشتر اور آگ سے داغنا، لیکن میں داغ لگوانا پسند نہیں کرتا۔''[1] حجامۃ کو بطور علاج اختیار کرنا متواتر احادیث اور اتفاقِ علما سے ثابت ہے۔[2]

جانور کو دودھ کے لیے کرائے پر دینے یا لینے کا حکم

سوال گائے بھینس اور بکری کو دودھ کے لیے کرائے پر دینا یا لینا جائز ہے یا ناجائز؟

جواب اس مسئلے میں اور اس جانور سے ایک مخصوص مدت تک مخصوص مقدار میں قسط وار دودھ خریدنے میں علمائے سلف کا اختلاف ہے۔ یہ احناف، شوافع اور حنابلہ کے نزدیک مشہور قول کے مطابق ناجائز ہے، ان کے دلائل حسبِ ذیل ہیں:

1. یہ ایسی چیز کی بیع ہے جو دیکھی گئی ہے نہ بیان کی گئی ہے، بلکہ معدوم اور غیر موجود چیز کی بیع ہے۔
2. اجارہ اشیا سے حاصل کیے جانے والے فوائد اور منافع پر ہوتا ہے، اعیان، یعنی موجود اشیا پر نہیں ہوتا اور یہ جانور اعیان (موجود اور ٹھوس چیز) ہیں۔
3. رضاعت اور دودھ پلانے کے لیے کسی دایہ کا اجارہ یعنی اس کو اجرت اور کرائے پر رکھنا خلافِ قیاس ہے۔ یہ صرف ضرورت کے لیے جائز ہے۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٣٥٦) صحیح مسلم میں یہ روایت نہیں ملی۔

[2] مجموع الفتاویٰ (٣٠/١٩٠۔١٩٤)

اس اجارے میں بھی ان اصحاب کا اختلاف ہے۔ ابن عقیل وغیرہ کا قول ہے کہ یہ اجارہ خدمت ہے اور رضاعت اس کے تابع ہے۔ قاضی ابو یعلیٰ وغیرہ کا قول ہے کہ اجارہ رضاعت کے لیے کیا گیا ہے اور خدمت اس کے تابع ہے۔

امام مالک اس سب میں رخصت کے قائل ہیں۔ یہ لوگ بعض اوقات کہتے ہیں کہ دایہ کا رضاعت کے لیے اجارۃ دودھ کے تابع ہوتا ہے، کیوں کہ دایہ اس دودھ کے تابع ہے جو ابھی پیدا نہیں ہوا، یہ اس بنا پر کہ یہ اعیان پر عقد ہے اور اعیان پر عقد بیوع کے باب سے تعلق رکھتا ہے۔ تاہم یہ لفظی نزاع ہے اور موجود و معدوم اور منافع اور اعیان کو شامل عام بیع میں داخل ہے۔ یہ بیع خاص کے مسمیٰ کے تحت نہیں آتی جو موجود اعیان کے ساتھ خاص ہوتی ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ عقود میں معانی کا اعتبار کیا جاتا ہے، صرف الفاظ کا نہیں۔

سوال میں جس اجارے کے بارے میں پوچھا گیا ہے وہ جائز ہے، اس کے عوض اور قیاس کے جواز پر دلالت کرنے والی شرعی دلیلیں اس اجارے کو بھی شامل ہیں، کوئی دلیل ایسی نہیں جو اس کی نفی کرتی ہو۔ مانعین نے جو یہ بات کہی ہے کہ دایہ کا اجارہ خلافِ قیاس ہے، یہ فاسد اور غلط ہے، کیوں کہ ہماری شریعت میں یہی ایک اجارہ ہے جو قرآن کریم میں منصوص اور مذکور ہے، ارشاد ہے:

﴿ فَإِنْ أَرْضَعْنَ لَكُمْ فَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ ﴾ [الطلاق: ٦]

''پھر اگر وہ تمھارے لیے دودھ پلائیں تو انھیں ان کی اجرتیں دو۔''

فرمایا:

﴿ وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ ﴾ [البقرۃ: ٢٣٣]

''اس کے ذمے معروف طریقے کے مطابق ان (عورتوں) کا کھانا اور ان کا کپڑا ہے۔''

سنت اور اجماع بھی اس کے جواز کی دلیل ہیں۔ یہ خلافِ قیاس تب ہوگا جب کسی دوسری نص کا قیاس اس کے معارض ہو، لیکن تمام نصوص اور قیاسات میں سے کوئی ایک نص اور قیاس بھی اس کے معارض اور خلاف نہیں۔

دوسرا یہ اعتراض کہ اجارہ فوائد اور منافع پر ہوتا ہے، اعیان پر نہیں تو یہ اللہ کی بات ہے نہ رسول کی، نہ صحابہ کی اور نہ ائمہ کی، بلکہ علما کے ایک گروہ کا قول ہے۔ اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ ہم یہ بات تسلیم نہیں کرتے کہ اجارہ صرف منافع میں ہوتا ہے، بلکہ ہر اس چیز میں اجارہ ہوتا ہے جو قابلِ تجدید و تحدیث ہو، وہ اپنے پیچھے اپنا بدل چھوڑے، مگر اس کی اصل باقی رہے، جس طرح کنویں کا پانی وغیرہ، خواہ وہ عین ہو یا منفعت، اس طرح وقف شدہ چیز جو تجدد پذیر ہوتی رہتی ہو اور وقتاً فوقتاً اس کا فائدہ سامنے آتا رہتا ہو، خواہ وہ فائدہ منفعت ہو یا عین جیسے کھجور، دودھ اور چشمے کا پانی۔ اسی طرح عاریتاً دی گئی چیز سے فائدہ اٹھانے کا مسئلہ ہے۔ اگر کوئی کسی کو سواری کے لیے جانور، دودھ

پینے کے لیے اونٹنی اور کھانے کے لیے کھجور کا درخت دیتا ہے تو وہ ان اشیا سے فائدہ اٹھا کر انھیں واپس کر دیتا ہے۔

اسی طرح کسی بکری، گائے یا اونٹنی کو مقررہ مدت تک کے لیے دودھ پینے کے لیے کرائے پر دینا یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی جانور سواری کے لیے کسی کو ایک متعین مدت پر کرائے پر دے۔ اگر کبھی اس عرف میں تبدیلی آ جائے تو اُجرت پر لینے والا چاہے تو اسے فسخ کر دے یا تاوان بھر لے۔ اسی طرح اگر وہ کسی کو ایک دو سال کے لیے باغ کرائے پر دے دے جس طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسید بن حضیر کے باغ کی ذمے داری لی اور اسے تین سال کے لیے کرائے پر دے دیا اور اس کی پیداوار سے ان کا قرض چکایا۔ اسی طرح اگر کرائے پر لینے والا ہی ان جانوروں کی دیکھ بھال بھی کرتا ہو تو یہ اجارہ ہی ہے جو دودھ پلانے والے کے اجارے سے جواز کا زیادہ حق رکھتا ہے۔ اگر جانوروں کا مالک ہی ان کے چارے پانی کا ذمے دار ہو اور دودھ کا طلب گار صرف دودھ سے واسطہ رکھتا ہو اور اس نے اس جانور کو اپنے پینے کے لیے کرائے پر لیا ہو تو یہ دایہ کے اجارے کی طرح ہے جسے مطلق رضاعت کے لیے رکھا جاتا ہے، کسی مخصوص بچے کو دودھ پلانے کے لیے نہیں، اسے بیع بھی کہا جاتا ہے، اجارہ بھی، یہ محض لفظی نزاع ہے۔ یہ جو اعتراض کیا گیا ہے کہ یہ بیع معدوم ہے تو شریعت ہر معدوم بیع سے منع نہیں کرتی، بلکہ وہ معدوم جس کی بیع کی ضرورت ہو اور وہ عرف میں معروف ہو، اس کی بیع جائز ہے، جس طرح پھل پکنے کے بعد اس کی بیع جمہور علما کے نزدیک جائز ہے، سنت بھی اس پر دلالت کرتی ہے، حالانکہ وہ اجزا جو معدوم ہونے کے بعد وجود میں آتے ہیں، وہ عقدِ بیع میں داخل ہو چکے ہوتے ہیں۔ واللہ أعلم[1]

تنخواہ پر امامت کروانے اور قرآن پڑھانے کا حکم

سوال تنخواہ پر نمازیں پڑھانا اور قرآن و حدیث کی تعلیم دینا جائز ہے یا ناجائز؟

جواب اجرت پر امامت کروانا احناف، حنابلہ اور مالکیوں کے نزدیک مشہور روایت کے مطابق ناجائز اور شافعی مذہب اور امام احمد اور امام مالک سے مروی دوسرے قول کے مطابق جائز ہے۔ اذان میں بھی یہ اختلاف ہے۔ مالکی مذہب میں مشہور روایت کے مطابق اذان اور امامت ایک ساتھ جائز ہے، مگر اکیلی امامت نہیں۔ امام احمد کے مذہب میں ایک تیسرا قول یہ بھی ہے کہ یہ حاجت کے وقت جائز ہے، اس کے بغیر نہیں۔

بلا اجرت قرآن و علم کی تعلیم دینا افضل اور اللہ کو محبوب ترین عمل ہے۔ یہ بات دینِ اسلام میں ضروریات کا درجہ رکھتی ہے جو کسی ایسے شخص پر پوشیدہ نہیں ہو سکتی جس کی اسلامی دیار میں پرورش ہوئی ہو، صحابہ کرام، تابعین، تبع تابعین

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۳۰/۱۹۷-۲۰۱)

اور قرآن و حدیث اور فقہ کے مشہور علمائے امت اجرت کے بغیر ہی تعلیم دیتے تھے، ان میں بالکل ایسا کوئی شخص نہیں تھا جو اجرت پر تعلیم دیتا۔

علما، انبیا کے وارث ہیں اور انبیا درہم و دینار نہیں علم چھوڑ کر گئے، جس نے اس سے کچھ لے لیا، اس نے وافر حصہ پایا۔ انبیائے کرام بھی اجرت کے بغیر علم سکھاتے تھے، حضرت نوح علیہ السلام نے کہا:

﴿ وَمَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ [الشعراء: ١٠٩]

''اور میں اس پر تم سے کسی اجرت کا سوال نہیں کرتا، میری اجرت تو رب العالمین کے ذمے ہے۔''

ہود، صالح، شعیب، لوط اور دیگر نے بھی یہی کہا، اسی طرح خاتم المرسلین ﷺ نے بھی اس طرح کہا:

﴿ قُلْ مَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِيْنَ ﴾ [صٓ: ٨٦]

''کہہ دے میں تم سے اس پر کوئی اجرت نہیں مانگتا اور نہ میں بناوٹ کرنے والوں سے ہوں۔''

فرمایا:

﴿ قُلْ مَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِلَّا مَنْ شَآءَ اَنْ يَّتَّخِذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ﴾ [الفرقان: ٥٧]

''کہہ دے میں تم سے اس پر کسی مزدوری کا سوال نہیں کرتا مگر جو چاہے کہ اپنے رب کی طرف کوئی راستہ اختیار کرے۔''

علما کا اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ اجرت کے بغیر قرآن و حدیث کی تعلیم دینا جائز ہی نہیں، عملِ صالح ہے، بلکہ فرضِ کفایہ ہے، نبی اکرم ﷺ کا فرمان ہے:

« بَلِّغُوْا عَنِّيْ وَلَوْ آيَةً »[1] ''مجھ سے لوگوں تک پہنچاؤ، چاہے ایک آیت ہی ہو۔''

یہ بھی فرمایا:

''حاضر غائب کو پہنچا دے۔''[2]

اجرت پر قرآن و حدیث کی تعلیم دینے کے جواز میں تین اقوال ہیں:

1. امام ابوحنیفہ وغیرہ کے نزدیک یہ ناجائز ہے۔
2. امام شافعی کے نزدیک یہ جائز ہے۔
3. امام احمد کا ایک دوسرا قول ہے کہ یہ حاجت کے وقت جائز ہے اور حاجت کے بغیر ناجائز، جیسے اللہ تعالیٰ نے یتیم

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٢٧٤)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٣٥٤)

کی پرورش اور سرابراہی کرنے والے کے متعلق فرمایا:

﴿ وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ ۖ وَمَنْ كَانَ فَقِيرًا فَلْيَأْكُلْ بِالْمَعْرُوفِ ۚ ﴾ [النساء: ٦]

''اور جو غنی ہو تو وہ بہت بچے اور جو محتاج ہو تو وہ جانے پہچانے طریقے سے کھا لے۔''

تعلیم کا کام کرنے والوں کو مسلمانوں کے مال سے دینا اسی طرح جائز ہے جس طرح موذن، امام اور قاضی کو اور یہ حاجت کے ساتھ جائز ہے، لیکن کیا مالدار ہوتے ہوئے اس کام کو رزق حاصل کرنے کا ایک ذریعہ اختیار کرنا چاہیے یا نہیں؟ اس میں بھی علما کے دو اقوال ہیں۔ کسی عالم نے یہ نہیں کہا کہ یہ کام اجرت کے بغیر ناجائز ہیں۔

تاہم اگر کوئی غریب ہو اور سمجھتا ہو کہ اگر اس نے اجرت کے بغیر پڑھانا شروع کر دیا تو اہل وعیال کی روزی کا بندوبست نہیں کر پائے گا، جب کہ اہل وعیال کے لیے کمانا فرض اور متعین ومقرر ہے تو ایسی صورت میں واجب متعین کو چھوڑ کر غیر متعین واجب کو اختیار کرنا جائز نہیں۔ اس کے باوجود اگر ایسا شخص حاجت کے ہوتے ہوئے یا مطلقاً اجرت پر تعلیم دینا جائز سمجھتا ہے تو وہ تاویل کرنے والا ہوگا، اس لیے اس کی تکفیر یا تفسیق جائز نہیں، بلکہ وہ صحیح ہوگا یا غلط۔

ان امور کو اجرت پر ادا کرنے کے عدمِ جواز میں علما کو یہ تحفظ ہے کہ یہ ایسے امور ہیں جنھیں ادا کرنے والا قربِ الٰہی کا جویندہ ہوتا ہے، اس لیے یہ کام کوئی مسلمان ہی کر سکتا ہے، کافر نہیں، اس نفع، یعنی کام کے عکس جو مسلمان بھی کرتے ہیں اور کافر بھی، مثلاً: کپڑے سینا، گھر بنانا، کپڑا بننا وغیرہ۔ اگر وہ یہ عمل اجرت پر کرے تو یہ اللہ کے لیے عبادت نہیں رہے گی، بلکہ عوض کے لیے کیا گیا عمل ہوگا، لہٰذا وہ عمل جو عوض کے لیے کیا جائے وہ عبادت نہیں رہتا، جس طرح دیگر کام جو اجرت اور عوض کے لیے کیے جاتے ہیں، یہ بھی انھی میں شمار ہوگا۔ لہٰذا ان کاموں کو عبادت کے علاوہ کسی صورت میں وجود میں لانا جائز نہیں، جس طرح نماز، روزے اور تلاوت کو عبادت کے علاوہ کسی اور صورت میں وجود میں لانا جائز نہیں۔ جو علما جواز کے قائل ہیں وہ کہتے ہیں: یہ ایک نفع ہے جو اجرت پر رکھنے والے کو پہنچتا ہے، اس لیے تمام منافع کی طرح اس پر اجرت لینا جائز ہے۔ اگر یہ اس حالت میں عبادت نہیں کہ جو بصورتِ عبادت وقوع پذیر نہیں ہو رہی تو اس کو بصورتِ عبادت وقوع پذیر کرنا بھی جائز اور ممکن ہے اور دوسری صورت میں بھی، کیوں کہ اس میں نفع ہے۔

جن علما نے محتاج اور غیر محتاج میں فرق کیا ہے اور یہی اقرب الی الصحت ہے۔ وہ کہتے ہیں: اگر محتاج اس کے ذریعے کماتا ہے تو اس کے لیے اپنے عمل کی نیت اللہ کے لیے کرنا ممکن ہے۔ وہ اس اجرت سے اللہ کی عبادت میں مدد ومعاونت حاصل کرتا ہے، کیوں کہ بچوں کے لیے کمانا بھی فرض ہے۔ اس طرح وہ اس سے اپنے فرائض ادا کرتا ہے، مالدار کے عکس، کیوں کہ اس کو کمانے کی ضرورت نہیں ہوتی، اس لیے اس کو غیر اللہ کے لیے کوئی عمل کرنے کی ضرورت

نہیں ہوتی، بلکہ اگر اللہ نے اس کو غنی بنایا ہے اور یہ کام فرضِ کفایہ ہے تو وہی اس کا مخاطب ہو گا۔ اگر وہ اس کے علاوہ کوئی اور نہ کر سکے تو تب وہ اس پر فرضِ عین ہو جائے گا۔ واللہ أعلم[1]

بانسری کی آواز سننے اور بجانے والے کو پیسے دینے کا حکم

سوال بانسری بجانے، سننے اور بجانے والے کو پیسے دینے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

جواب بانسری سننے کے جواز میں یہ حدیث نقل کی جاتی ہے کہ نبی اکرم ﷺ ایک چرواہے کے پاس سے گزرے۔ وہ بانسری بجا رہا تھا۔ آپ ﷺ کے ساتھ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بھی تھے۔ آپ ﷺ نے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے پوچھتے رہے، کیا تو بانسری کی آواز سن رہا ہے؟ آپ ﷺ اسی طرح پوچھتے رہے، تا آنکہ انھوں نے بتایا کہ اب آواز نہیں آ رہی تو آپ ﷺ نے اپنے کانوں سے انگلیاں نکال کر انھیں کھول دیا۔ اس سے استدلال کرنے والے کہتے ہیں، اگر بانسری سننا حرام ہوتا تو آپ ﷺ اپنے ساتھی کو بھی کان بند کرنے کا حکم دیتے یا چرواہے کو روک دیتے۔ لہٰذا یہ غیر انبیا کے حق میں جواز کی دلیل ہے۔

یاد رہے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اس خبر کو نقل کرنا ثابت نہیں، یہ بالکل باطل روایت ہے، البتہ ابوداود میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، وہ ایک چرواہے کے پاس سے گزرے، جس کے پاس ایک بانسری تھی، وہ نافع سے پوچھتے رہے کہ کیا تو اس کی آواز سن رہا ہے؟ جب اس نے بتایا کہ اب آواز نہیں آ رہی تو اس وقت انھوں نے اپنے کانوں سے انگلیاں نکال لیں۔ انھوں نے بتایا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے اور آپ ﷺ نے ایسے ہی کیا تھا۔ ابو داود نے یہ حدیث نقل کرنے کے بعد کہا: یہ منکر حدیث ہے۔[2] ابو بکر خلال نے بھی اسے متعدد اسناد سے روایت کیا ہے جو ایک دوسرے کی تصدیق کرتی ہیں۔

تاہم اگر یہ روایت ثابت بھی ہو جب بھی اس میں بانسری کے جواز کی دلیل نہیں، بالخصوص جب چاروں ائمہ بانسری کو حرام کہتے ہیں۔ اس مسئلے میں مذاہبِ اربعہ کے متقدمین میں تو کوئی اختلاف نہیں، البتہ خراسان کے متاخر شوافع نے اس میں دو وجوہ ذکر کی ہیں، لیکن عراقی شوافع نے، جو اکثریت میں ہیں، اسے قطعی طور پر حرام کہا ہے، جس طرح دیگر تمام مذاہب کا موقف ہے۔ بہر حال یہ شافعی مذہب میں ایک ضعیف قول ہے۔ امام شافعی کا قول ہے: ''گانا مکروہ ہے۔ باطل سے مشابہت رکھتا ہے۔ جو بکثرت شغف رکھتا ہو وہ بے وقوف ہے اور اس کی گواہی رد کی جائے۔'' ان

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۳۰/۲۰۲-۲۰۷)

[2] سنن أبي داود، رقم الحدیث (۴۹۲۴، ۴۹۲۵) شیخ البانی رحمہ اللہ نے اسے صحیح کہا ہے۔

کا دوسرا قول ہے، میں نے بغداد میں ایسی چیز چھوڑی جو زندیقوں نے ایجاد کی، وہ اسے تغبیر کا نام دیتے ہیں اور اس کے ذریعے لوگوں کو قرآن سے روکتے ہیں، لہو ولعب کے آلات رکھنا ناجائز ہے اور ائمہ اربعہ کے نزدیک انھیں کرائے پر لینا بھی ناجائز ہے۔

لہٰذا اگر یہ حدیث ثابت بھی ہو تو اس میں بانسری کے جواز کی دلیل نہیں، بلکہ یہ کئی وجوہ سے منع پر دلالت کرتی ہے:

(1) حرام استماع (ارادے اور توجہ سے سننا) ہے محض سماع (غیر ارادی طور پر سننا) نہیں۔ اگر کوئی شخص غیر ارادی طور پر کفر، جھوٹ، غیبت، گانا اور بانسری وغیرہ سنے، مثلاً وہ کہیں سے گزر رہا ہو اور یہ آوازیں اس کے کانوں میں پڑ جائیں تو وہ بالاتفاق گناہ گار نہیں ہوگا۔

لیکن اگر وہ ارادتاً کہیں بیٹھ کر ان چیزوں کو سنے اور انھیں اپنے دل، زبان یا ہاتھ سے نہ روکے تو وہ بالاتفاق گناہ گار ہوگا، فرمانِ الٰہی ہے:

﴿وَاِذَا رَاَيْتَ الَّذِيْنَ يَخُوْضُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖ ۭ وَاِمَّا يُنْسِيَنَّكَ الشَّيْطٰنُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰي مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝ وَمَا عَلَي الَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّلٰكِنْ ذِكْرٰي لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ۝﴾ [الأنعام: ٦٨، ٦٩]

''اور جب تو ان لوگوں کو دیکھے جو ہماری آیات کے بارے میں (فضول) بحث کرتے ہیں تو ان سے کنارہ کر، یہاں تک کہ وہ اس کے علاوہ بات میں مشغول ہو جائیں اور اگر کبھی شیطان تجھے ضرور ہی بھلا دے تو یاد آنے کے بعد ایسے ظالم لوگوں کے ساتھ مت بیٹھ۔ اور ان لوگوں کے ذمے جو بچتے ہیں، ان کے حساب میں سے کوئی چیز نہیں اور لیکن یاد دہانی ہے، تاکہ وہ بچ جائیں۔''

دوسری جگہ فرمایا:

﴿وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِھَا وَيُسْتَهْزَاُ بِھَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَھُمْ حَتّٰي يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖٓ ڮ اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُھُمْ ۭ﴾ [النساء: ١٤٠]

''اور بلاشبہ اس نے تم پر کتاب میں نازل فرمایا ہے کہ جب تم اللہ کی آیات کو سنو کہ ان کے ساتھ کفر کیا جاتا ہے اور ان کا مذاق اڑایا جاتا ہے تو ان کے ساتھ مت بیٹھو، یہاں تک کہ وہ اس کے علاوہ کسی اور بات میں مشغول ہو جائیں۔ بے شک تم بھی اس وقت ان جیسے ہو۔''

ان آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ جو بیٹھا رہے اور منع کیے بغیر شوق سے سنتا رہے وہ کرنے والے کے قائم مقام ہے۔

اس بنا پر کہا جاتا ہے کہ جو دلچسپی سے چغلی سنتا ہے وہ چغل خور کا شریک ہوتا ہے۔ ایک اثر میں ہے:

''جو کسی معصیت میں حاضر ہو مگر اسے ناپسند کر رہا ہو وہ ایسے ہے جیسے حاضر نہیں، مگر جو وہاں حاضر تو نہ ہو، لیکن اسے پسند کرتا ہو، وہ حاضر کی طرح ہے۔''

لہٰذا اگر کوئی انسان کسی مجبوری یا ضرورت کے پیشِ نظر کسی برائی کی مجلس میں شریک ہو تو کم از کم اپنے دل میں اسے برا جانے، کیوں کہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«مَنْ رَآى مِنْكُمْ مُنْكَراً فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهِ ... أَضْعَفُ الْإِيمَانِ»[1]

اسی طرح اگر کوئی شخص کہیں سے گزر رہا ہو اور قرآن کی آواز اس کے کان میں پڑ جائے تو اگر وہ اسے توجہ سے نہیں سنتا تو اس کو اجر نہیں ملتا، اجر ارادی استماع کا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَ اِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴾ [الأعراف: ٢٠٤]

''اور جب قرآن پڑھا جائے تو اسے کان لگا کر سنو اور چپ رہو، تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔''

اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا:

﴿ فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوْحٰى ﴾ [طٰهٰ: ١٣] ''پس غور سے سن جو وحی کیا جاتا ہے۔''

اس سے یہ حقیقت سامنے آئی کہ امر و نہی اور وعد و وعید کا تعلق استماع سے ہے، محض سماع سے نہیں، اس لیے نبی اکرم ﷺ اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما محض راہ گزر تھے، مستمع، یعنی ارادتاً سننے والے نہیں تھے۔ اسی طرح عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نبی اکرم ﷺ کے ساتھ اور نافع عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے ساتھ سامع تھے، مستمع نہیں، اس لیے ان کو کان بند کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔

(٢) رسول اللہ ﷺ نے حد درجے کی احتیاط سے کام لیتے ہوئے اپنے کان بند کیے، تاکہ اصلاً اور بالکل نہ سنیں۔ اس سے معلوم ہوا، گو سماع میں کوئی گناہ نہیں، پھر بھی سننے سے رکنا سن لینے سے بہتر ہے۔ اگر آواز مباح اور جائز ہوتی تو آپ مباح کو سننے سے اپنے کان بند نہ کرتے۔ آپ ﷺ نے تو نہ سننے کے لیے کان بند کیے، اگر محض سماع گناہ نہیں، پھر بھی آپ ﷺ نے اسے نہ سنا، تو اس سے معلوم ہوا استماع سے اپنے آپ کو روکنا اولیٰ اور زیادہ ضروری ہے۔ اس حدیث میں سننے کی اجازت دینے کی نسبت استماع سے منع کی زیادہ دلالت ہے۔

(٣) فرض کریں استماع ناجائز ہے کہ اگر وہ دونوں ہی کان بند کر لیں تو معلوم ہی نہیں ہوگا کہ آواز کب ختم ہوگی، اس لیے متبوع کان بند نہ کرے۔

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٤٩)

④ یہ بھی معلوم نہیں کہ رفیقِ سفر بالغ تھا یا نابالغ بچہ، بچوں کو کھیل کود اور لہو و لعب کی کچھ اجازت ہوتی ہے جو بالغوں کو نہیں ہوتی۔

⑤ چرواہے کی بانسری اور گانے بجانے کے لیے استعمال ہونے والی بانسری میں فرق ہے، لہٰذا اگر اس کی اجازت متصور ہو تو اس سے ہر ایسی بانسری اور آواز کی اجازت متصور نہیں جو جذبات کو بھڑکاتی ہے۔

⑥ ابن منذر نے گانے بجانے اور نوحہ گری کو اجرت پر کروانے کے ناجائز ہونے پر اجماع نقل کیا ہے۔ اگر نوحہ گر اور گانے والی عورت کو اجرت پر منگوانے کے ناجائز ہونے پر اہلِ علم کا اجماع ہے تو بانسری کیوں ناجائز نہیں جس کو کسی عالم نے شادی یا غیر شادی کسی موقعے پر بھی جائز قرار نہیں دیا۔ ایسے فتوے غیر معروف اور ناقابلِ اعتبار لوگوں کے ہیں۔ لہٰذا بانسری بجانے والے کو دینا بھی جائز نہیں۔ اگر یہ جائز بھی ہو تب بھی اس کی وجہ سے دینا ناجائز ہے، حالانکہ یہ لغو اور ممنوع ہے، کیوں کہ یہ ضروری نہیں کہ ہر جائز فعل کا معاوضہ دینا بھی جائز ہو۔

بڑی مشہور حدیث ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

«لَا سَبَقَ إِلَّا فِيْ خُفٍّ أَوْ حَافِرٍ أَوْ نَعْلٍ» [1]

''اونٹ اور گھوڑا دوڑانے اور نیزا بازی کے علاوہ کہیں مقابلے بازی جائز نہیں۔''

آپ ﷺ نے تین چیزوں کے علاوہ دیگر اشیا کی دوڑ اور مقابلے بازی سے منع کیا ہے۔ اس کے باوجود پہلوانی کبھی جائز ہوتی ہے۔ آپ ﷺ نے خود رکانہ سے کشتی لڑی۔ اسی طرح دوڑ لگانا بھی جائز ہے، جس طرح آپ ﷺ نے خود حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ دوڑ لگائی اور غزوۃ الغابۃ اور ذوقرد میں سلمہ بن اکوع کو اجازت دی۔ آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا ہے:

''تیر اندازی، گھوڑے کی تربیت اور بیوی کے ساتھ دل لگی کے سوا ہر کھیل باطل ہے۔'' [2]

یہ کھیل جائز ہیں۔ باطل اور لغو کھیل کے ذریعے کمائی کرنا بھی باطل کے ذریعے کھانا ہے۔ اس کے باوجود اس میں رخصت ہے، جس طرح بچوں کو کھیل کی اجازت ہے، عید کے ایام میں دو انصاری بچیاں حضرت عائشہ کے گھر میں گاتیں۔ نبی اکرم ﷺ ان کو نہ دلچسپی سے سنتے، نہ منع ہی کرتے۔ جب حضرت ابوبکر نے کہا: کیا رسول اللہ ﷺ کے گھر میں

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٥٧٤) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٧٠٠) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٨٧٨) صحيح الجامع، رقم الحديث (٧٤٩٨)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٥١٣) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٦٣٧) سنن النسائي، رقم الحديث (٣٥٧٨) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٨١١)

شیطان کی بانسری ہے؟ تو آپ ﷺ نے کہا: ''ابوبکر! ان کو رہنے دو، ہر قوم کی عید ہوتی ہے اور یہ ہماری عید ہے۔''[1]

اس سے معلوم ہوا کہ جن کو کھیلنے کی اجازت ہو، وہ عید کے مواقع پر کھیل سکتے ہیں، اگر چہ مرد یہ کام نہیں کرتے اور اس کے لیے مال خرچ نہیں کرتے۔ اس ساری بحث سے معلوم ہوا کہ اس حدیث سے بانسری سننے اور اس کی اجرت دینے پر استدلال کرنے والے کا استدلال کئی وجوہ سے درست نہیں۔ یہ اس صورت میں ہے جب حدیث صحیح ہو، مگر یہ حدیث بھی صحیح نہیں۔[2]

آفت کا شکار ہونے والی فصل کی ضمانت

سوال ایک شخص کھیتی کے لیے زمین کرائے پر لیتا ہے۔ وہ آفت کا شکار ہو کر تباہ ہو جاتی ہے۔ کیا یہ جائحہ (ایسی آسمانی آفت جو کل یا بعض پھل کو تباہ کر دے) کے زمرے میں داخل ہو گی یا نہیں؟

جواب اگر کوئی کھیتی کے لیے زمین کرائے پر لے اور وہ آفت کا شکار ہو جائے تو یہ مسئلہ پھلوں میں آفتوں کی وجہ سے پہنچنے والے نقصان کو وضع (منہا) کرنے سے تعلق رکھتا ہے۔ اگر کوئی شخص پکنے سے پہلے پھل خریدتا ہے اور وہ پکنے سے پہلے ہی آفت کا شکار ہو کر تلف اور ضائع ہو جاتا ہے تو فقہائے مدینہ یعنی امام مالک وغیرہ کے نزدیک اس کا ضامن فروخت کنندہ ہے اور وہی اس کا تاوان بھرے گا۔ امام احمد کا قول بھی یہی ہے اور امام شافعی کا یہ قول اس حدیث کی صحت کے ساتھ مشروط قول ہے، حدیث صحیح مسلم میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«إِنْ بِعْتَ مِنْ أَخِيكَ تَمْرًا فَأَصَابَتْهَا جَائِحَةٌ فَلَا يَحِلُّ لَكَ أَنْ تَأْخُذَ مِنْهُ شَيْئًا، بِمَ تَأْخُذُ مَالَ أَخِيكَ بِغَيْرِ حَقٍّ؟»[3]

''جب تو اپنے بھائی کو پھل فروخت کرے اور وہ آفت کا شکار ہو جائے تو تیرے لیے اپنے بھائی کے مال سے کچھ بھی لینا حلال نہیں، تم میں سے کوئی ایک اپنے بھائی کے مال سے ناحق کیوں لے؟''

صحیح قیاس بھی اسی قول کی تائید کرتا ہے، کیوں کہ فروخت شدہ مال خریدار کے قبضے میں لینے سے پہلے ہی تلف اور تباہ ہو چکا ہے، یہ بالکل اسی طرح ہے جس طرح کوئی کسی سے کوئی چیز کرائے پر لیتا ہے مگر اس کے لینے پر قادر ہونے سے پہلے ہی اس سے اٹھایا جانے والا فائدہ تلف ہو جاتا ہے۔ اگر اعتراض کیا جائے کہ یہ پھل قبضے میں لینے کے بعد اور اس پھل کو قبضے میں لینے سے پہلے تلف ہوا ہے جو ابھی مکمل پکا نہیں اور یہ فوائد قبضے میں لینے کی قبیل سے

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٩٠٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٨٩٢)

[2] مجموع الفتاوىٰ (٣٠/٢١١_٢١٦)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٥٥٤)

ہے، کیوں کہ مقصود مکمل پک جانے کے بعد کاٹ لینا ہے، اس لیے جب اس کے پکنے کے بعد خریدار اس کو قبضے میں لینا شروع کرے اس وقت وہ اس کا ضامن ہوگا، اب کیا وہ اس کو کاٹنے سے پہلے فروخت کر سکتا ہے یا نہیں؟ اس میں فقہا کا اختلاف ہے اور اس میں دو اقوال ہیں جو دونوں ہی امام احمد سے مروی ہیں۔

ایک قول ہے: جائز نہیں، کیوں کہ یہ فروخت شدہ چیز کو قبضے میں لینے سے پہلے فروخت کرنا ہے۔ اگر وہ اس کے قبضے میں ہوتی تو اس کا ضامن بھی وہی ہوتا۔

دوسرا قول ہے: اس کو فروخت کرنا جائز ہے اور یہی صحیح قول ہے، کیوں کہ اس نے ایسا قبضہ لے لیا ہے جو اس کو اس میں تصرف کرنے کا حق دیتا ہے، گو وہ قبضہ نہیں لیا جو ضمانت کو نقل کر دیتا ہے، جس طرح کرائے پر لی گئی اشیا کا قبضہ ہوتا ہے۔ یہ قبضہ اس سے حاصل ہونے والے فوائد میں تصرف کا اختیار دیتا ہے، اگر چہ ضائع ہو جائے تو کرائے پر دینے والا ہی ضامن ہوگا، لیکن اس بات میں فقہا کا اختلاف ہے کہ کیا وہ اس کو اس قیمت سے زیادہ قیمت پر کرائے پر دے سکتا ہے جس قیمت پر اس نے خود کرائے پر لیا ہے یا نہیں۔ یہاں تین اقوال ہیں جو تینوں ہی امام احمد سے مروی ہیں:

ایک قول ہے کہ جائز ہے اور امام شافعی کا قول بھی یہی ہے۔

دوسرا قول ہے نا جائز ہے۔ امام ابو حنیفہ اور صاحبین کا قول بھی یہی ہے، کیوں کہ غیر ضمانت شدہ نفع ہے۔

تیسرا قول ہے: اگر اس میں کوئی عمارت بنائے تو جائز ہے، ورنہ نہیں۔

پہلا قول ہی زیادہ صحیح ہے، کیوں کہ اس کی ضمانت قبضے کے ساتھ مشروط ہے، یعنی اگر وہ اس چیز کو پورا پورا وصول نہیں کرتا تو وہ اس کی ضمانت سے تلف ہوگی، کرائے پر دینے والے کی ضمانت سے نہیں جس طرح پھل پکنے اور اس کو کاٹنے کے قابل ہونے کے بعد ضائع ہو جائے، لیکن اگر کرائے پر دی گئی چیز ہی ضائع ہو جائے تو فوائد کرائے پر دینے والے کی ضمانت سے تلف ہوں گے، کیوں کہ کرائے پر لینے والا اس سے استفادہ کرنے پر قادر ہی نہیں ہوا، لہٰذا قادر ہونے سے پہلے اور بعد کے حالات میں فرق کیا جانا چاہیے۔

اگر کوئی بویائی کے لیے زمین کرائے پر لیتا ہے اور وہ آفت کا شکار ہو جاتی ہے تو اس صورت میں کھیتی، کرائے پر لینے والے کے اس کو لینے پر قادر ہونے کے بعد تلف ہوتی ہے، مثلاً وہ غلے کے کھلیان میں ہو اور چوری ہو جائے، یا وہ اس کی کٹائی میں تاخیر کر دے جس کی وجہ سے وہ ضائع ہو جائے تو یہاں کرائے پر لینے والے پر اس کی اجرت عائد ہوتی ہے۔ اگر آفت بویائی میں رکاوٹ پیدا کرے تو اس صورت میں وہ اجرت کا ذمے دار نہیں اور اس میں کوئی

اختلاف نہیں۔ اگر فصل اُگ آئے مگر آفت اس کے پکنے میں رکاوٹ بنے، مثلاً اس کو آگ لگ جائے یا وہ ہوا، آندھی، ژالہ باری یا اس طرح کی کسی آفت کا شکار ہو جائے جو اس کو خراب کر دے اور اگر وہاں کوئی اور فصل بھی ہوتی تو وہ بھی تباہ ہو جاتی تو اس مسئلے میں دو اقوال ہیں، جن میں سے راجح قول کے مطابق اس کا تاوان کرائے پر دینے والا ہی بھرے گا، کیوں کہ اس آفت نے اس فائدے کو ضائع کر دیا ہے جو اس معاہدے سے مقصود تھا، کیوں کہ معاہدے سے مقصود وہ فائدہ تھا جس کے ساتھ کھیتی ثابت ہو اور وہ اس کو کاٹنے پر قادر ہو سکے۔ اگر زمین کسی ایسی آفت کا شکار ہو جائے جو اس فائدے میں مطلقاً رکاوٹ بنے تو اس کو قبضے میں لینے اور پورا پورا وصول کرنے پر قادر ہونے سے پہلے اس کا ضائع ہو جانا معاہدے کا مقصود ہی ختم کر دیتا ہے۔

ایسے ہی اگر زمین بنجر ہو اور فصل ضائع ہو جائے، یا سمندر یا دریا کے کنارے ہو اور پانی فصل پکنے سے پہلے ہی اس زمین کو تباہ کر دے یا اس جیسی کوئی بھی صورت ہو تو تاوان کرائے پر دینے والا ہی بھرے گا، کرائے پر لینے والے کے ذمے کوئی اجرت اور کرایہ نہیں، کیوں کہ وہ اس کے لیے کارآمد نہیں رہی، جیسے کرائے کا جانور مر جائے یا پانی بند ہو جائے اور معاہدے کے مطابق انسان اس سے مطلوبہ فائدہ اٹھانے کے قابل نہ رہے، لیکن اگر کسی کا مال چوری ہو جائے یا گھر میں جل جائے تو یہ مسئلہ پہلے مسئلے جیسا نہیں، کیوں کہ یہاں معاہدے سے مقصود فائدہ تبدیل نہیں ہوا، وہ یا کوئی بھی اس کو چور سے یا آگ سے محفوظ رکھ کر اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ اسی کی نظیر یہ صورت ہے کہ وہ مال ہی ضائع ہو جائے، جس کو اٹھانے کے لیے کسی نے جانور کرائے پر لیا ہو تو وہ اس کا کرایہ دینے کا ذمے دار ہے، لیکن اس کے عکس کہ جب آفت اس کے لیے یا کسی دوسرے کے لیے اس سے فائدہ اٹھانے میں مانع ہو تو یہ جانور کے مرنے یا کرائے پر لیے ہوئے گھر کے جل جانے کے قائم مقام ہے۔ گھر سے سامان چوری ہونے کی نظیر یہ ہے کہ کوئی چور اس کی فصل چرا لے جائے۔ اسی طرح اگر کوئی لشکر حملہ آور ہو اور کھیت تباہ کر دے تو یہ بھی آسمانی آفت ہی ہے۔ اس کی ضمانت دینا ممکن ہے نہ اس سے احتراز ہی ممکن ہے۔ اسی طرح اگر کوئی فوج حملہ کر کے لوگوں کو ان کے گھروں سے بے گھر کر دے تو یہ بھی اسی طرح ہی ہے۔[1]

لوٹے ہوئے مال کی نمو کی ملکیت، اس سے زکات نکالنا اور کبیرہ گناہوں کی توبہ

سوال اہلِ بادیہ کے ہاں لوٹ کا مال گردش کرتا رہتا ہے۔ اس مال میں جانور بھی ہوتے ہیں، جن کا سلسلۂ افزائشِ نسل چلتا رہتا ہے۔ منافع آور اشیا بھی ہوتی ہیں اور پھلدار درخت بھی۔ سوال یہ ہے کہ کیا اس جانور کی نسل، اشیا کا

[1] مجموع الفتاویٰ (۳۰/۳۲۲-۳۲۸)

منافع اور درخت کا پھل غاصب کا ہے، کیوں کہ وہی جانور کی پرورش کرتا ہے، وہی مال کو تجارت میں استعمال کرتا ہے اور درخت کو پانی پلاتا ہے یا وہ مغصوب (جس سے چھینا گیا ہے) کا مال ہے؟ نیز کیا اہلِ بادیہ ان اموال کی زکات دیں گے جو ان کے پاس ہے یا نہیں، پھر یہ کہ غاصب تائب ہو جائے اور اس کو مال کے اصل مالکوں کا علم نہ ہو تو اس کا حکم کیا ہے، کیا وہ سارا مال صدقہ کرے گا یا کچھ اور؟ یہ سوال بھی ہے کہ کیا زنا اور چوری سے توبہ درست ہوتی ہے؟

جواب الحمد للّٰہ رب العالمین. اگر غاصب غصب شدہ مال کو کام میں لائے اور نتیجتاً اس میں نشوونما اور بڑھوتری ہو تو اس سے متعلق فقہا کے کئی اقوال ہیں، آیا وہ نما اور بڑھوتری اکیلے مالک کی ہے یا وہ دونوں اس کا صدقہ کر دیں گے یا وہ دونوں میں تقسیم ہو جائے گی جس طرح مضاربت، مساقات اور مزارعت کی صورتوں میں ہوتا ہے؟ مثلاً کوئی کسی کو اس شرط پر جانور دے کہ وہ اس کے دودھ اور نسل کے متعین حصے میں شریک ہوگا یا عامل کے لیے مثلی اجرت ہوگی، اگر یہی رواج ہو، جس طرح حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے معاملے میں کیا تھا۔

حضرت ابو موسیٰ نے اپنے دو بیٹوں کو مالِ فے سے دو لاکھ درہم بطور قرض دیے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کو ان دونوں کی ناجائز طرف داری سمجھا۔ مال میں بے تحاشا منافع اور اضافہ ہو گیا جو آٹھ لاکھ درہم تک جا پہنچا۔ انھوں نے ان دونوں کو منافع سمیت سارا مال بیت المال میں جمع کرانے کا حکم دیا اور حکم دیا کہ ان دونوں کا منافع میں کوئی حصہ نہیں، کیوں کہ انھوں نے ناحق مال لیا تھا۔ ان کے بیٹے حضرت عبداللہ نے کہا: آپ کے لیے ایسا کرنا جائز نہیں۔ اگر مال تباہی اور خسارے سے دوچار ہوتا تو وہ دونوں اس کا تاوان بھرتے۔ اگر آپ ہمیں منافع نہیں دیتے تو ہم پر تاوان بھرنا کیوں لاگو کرتے ہیں؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے توقف کیا، تو کسی صحابی نے کہا: ہم اس مال کو ان کے اور مسلمانوں کے درمیان مضاربت کی شکل دے لیتے ہیں۔ آدھا منافع ان کا اور آدھا مسلمانوں کا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پھر اسی پر عمل کیا۔

فقہا نے بھی مضاربت ہی پر اعتماد کیا ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا فیصلہ بھی یہی قرار پایا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی ان سے اتفاق کیا۔ عدل کا تقاضا بھی یہی ہے، کیوں کہ نما اور بڑھوتری ایک کے مال کے ساتھ اور دوسرے کی محنت کے نتیجے میں پیدا اور حاصل ہوئی تو اس میں دونوں کا حق ہوا، بلکہ ان دونوں میں منافع بھی برابر کا تقسیم ہوگا، جس طرح شرکتِ مضاربت میں ہوتا ہے۔

اسی طرح جو کسی دوسرے کے باغ، زمین یا جانوروں میں کام کرتا ہے اور نتیجے میں کھیتی، دودھ یا نسل کی پیداوار ہو، اس مسئلے میں کچھ علما نما اور بڑھوتری میں شراکت اور مضاربت کے قائل نہیں۔ ان کے نزدیک صرف اجارہ

جائز ہے، تاہم علما کے صحیح تر قول کے مطابق مساقات اور مزارعت دونوں جائز ہیں، خواہ بیج مالک مہیا کرے یا عامل یا دونوں، جس طرح رسول اللہ ﷺ نے اہلِ خیبر کے ساتھ خیبر کی زمینوں کی نصف پیداوار پر معاملہ طے کیا تھا اور شرط یہ رکھی تھی کہ وہ اس کو اپنے مال سے آباد کریں گے۔ (رواہ البخاري)[1]

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے حضرت سعد بن ابو وقاص اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما وغیرہما اپنی زمینیں لوگوں کو مزارعت کے لیے دیتے، بیج عامل کی طرف سے ہوتا اور پیداوار دونوں میں تقسیم ہوتی، اس وقت عام مہاجر اور انصار گھرانے مزارعت کرتے تھے۔

رسول اللہ ﷺ نے ان کو مخابرت سے منع کیا تھا، جس میں زمین کا مالک اپنے لیے کھیت کے ایک مخصوص حصے کی پیداوار کی شرط لگاتا تھا، جس طرح صحیحین میں ہے، یہ جس سے رسول اللہ ﷺ نے منع کیا ہے، بالاتفاق حرام ہے، جیسے کوئی مضاربت میں اپنے لیے مخصوص رقم کی شرط عائد کرے۔ عدل کا تقاضا ہے کہ وہ اس رزق میں شریک ہوں جو اللہ بڑھوتری کے ذریعے عطا کرتا ہے، اس کے لیے بھی ایک مشترک حصہ ہو اور دوسرے کے لیے بھی مشترک حصہ، منافع میں بھی دونوں شریک ہوں اور خسارے میں بھی، اگر کچھ بھی حاصل نہ ہو تو ایک کا سرمایہ ضائع ہو اور دوسرے کی محنت۔

دوسری بات یہ ہے کہ وہ اموال جو ان لوٹ مار کرنے والے اہلِ بادیوں کے ہاتھوں میں ہوتے ہیں، اگر ان کا اصل مالک معلوم نہ ہو تو ان کی زکات نکالی جائے گی۔ اگر یہ مال جس کے ہاتھ میں ہے اور وہی اس کا مالک بھی ہے تو اس کی زکات نکالنا اس کے ذمے ہے، اگر اس کا مالک نامعلوم ہے تو اس سب مال کا صدقہ کر دیا جائے۔ اگر زکات کی مقدار کے مطابق صدقہ کرے تو یہ کچھ بھی صدقہ نہ کرنے سے بدرجہا بہتر ہے، زکات کی مقدار کے مطابق اس سے نکالنا نہ نکالنے کی نسبت ہر اندازے کے لحاظ سے بہتر ہے۔

اگر وہ آپس میں لوٹ مار کرتے ہوں اور یہ لوٹ ماری کا بازار دو معروف گروہوں کے درمیان گرم ہو تو دیکھا جائے گا کہ دونوں گروہوں نے کتنا مال لوٹا ہے۔ اگر برابر ہوں تو ایک دوسرے سے تقاضا کریں گے اور ہر گروہ اس مال کا اعتراف کرے گا جو اس کے پاس ہے، چاہے جس سے لوٹا گیا ہے اس کے اصل مال کی پہچان نہ ہو سکے، جیسے اگر جاہلیت پر مبنی لڑائی لڑیں، ایک دوسرے کو قتل کریں اور ایک دوسرے کا مال تباہ کریں تو دونوں گروہوں سے قصاص لیا جائے گا اور جانوں کو جانوں کے مقابلے میں مال کو مال کے مقابلے میں رکھا جائے گا۔ اگر ایک گروہ کی کوئی چیز زیادہ ہو تو وہ دوسرے سے اس کا مطالبہ کرے گا۔ اس کی دلیل یہ فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلَى ۖ الْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْأُنْثَىٰ بِالْأُنْثَىٰ ﴾ [البقرة: ۱۷۸]

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۲۲۰۳) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۵۵۱)

''تم پر مقتولوں میں بدلہ لینا لکھ دیا گیا ہے، آزاد (قاتل) کے بدلے وہی آزاد (قاتل) اور غلام (قاتل) کے بدلے وہی غلام (قاتل) اور (قاتلہ) عورت کے بدلے وہی (قاتلہ) عورت (قتل) ہوگی۔''

کئی ایک اسلاف نے کہا ہے کہ یہ آیت عرب کے دو قبیلوں کے بارے میں نازل ہوئی جو ایک دوسرے سے نبرد آزما تھے، اللہ تعالیٰ نے مقتولوں کا قصاص لینے کا حکم دیتے ہوئے فرمایا: ان میں سے آزاد کے بدلے آزاد، غلام کے بدلے غلام اور عورت کے بدلے عورت کو قصاص میں قتل کر دیا جائے۔ پھر فرمایا:

﴿ فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ ﴾ [البقرة: ۱۷۸]

''پھر جسے اس کے بھائی کی طرف سے کچھ بھی معاف کر دیا جائے تو معروف طریقے سے پیچھا کرنا اور اچھے طریقے سے اس کے پاس پہنچا دینا (لازم) ہے۔''

کہا: ایک کی کوئی چیز دوسرے کے ہاں زائد ہو جائے اور بچ جائے تو وہ معروف اور احسن انداز میں اس کو لوٹا دے، یہاں اتباع سے مراد مطالبہ ہے، جس طرح حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« مَطْلُ الْغَنِيِّ ظُلْمٌ، وَإِذَا أُتْبِعَ أَحَدُكُمْ عَلَى مَلِيءٍ فَلْيَتْبَعْ »[1]

''مالدار کا ٹال مٹول کرنا ظلم ہے، جب کسی مالدار سے مطالبہ کیا جائے تو وہ اس کو پورا کرے۔''

اسی لیے اطاعت سے انکار کرنے والے گروہ جو لڑائی میں ایک دوسرے کے معاون ہوں ضمانت میں بھی براہِ راست لڑائی کرنے والا اور پکڑ دھکڑ کرنے والا اور نقصان کرنے والا اور اس کی اعانت کرنے والا برابر کے شریک ہوں گے، یہ جمہور علما کا موقف ہے۔ بنابریں جمہور کے مذہب میں راہزنی میں براہِ راست ملوث اور شریکِ جرم دونوں قتل کیے جائیں۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے محاربوں کے راہبر اور راستے کے امور کے نگران کو بھی قتل کر دیا تھا۔ اس لیے ظلم و زیادتی میں اعانت کرنے والے تاوان بھرنے جیسی سزا کے مستحق ہیں۔

عام فقہا کے نزدیک عصبیت وحصولِ اقتدار کی جنگ لڑنے والے دونوں گروہ ایک دوسرے کے جانی و مالی نقصان کے ذمے دار ہیں اور پورے گروہ پر تاوان لازم ہے، خواہ بعینہٖ نقصان پہنچانے والے کا پتا نہ لگایا جا سکے، اگر لوٹے ہوئے مال کی مقدار نامعلوم ہو اور یہ پتا نہ لگایا جا سکے کہ کس نے کس سے کتنا لوٹا ہے تو اس کو برابری پر محمول کیا جائے گا، بالکل اسی طرح جس طرح جس کا مال حرام و حلال کا مجموعہ ہو اور یہ معلوم نہ کیا جا سکے کہ زیادہ مقدار کس کی ہے تو وہ آدھا مال نکال دے اور باقی آدھا اس کے لیے حلال ہوگا، جس طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مالی امور پر مقرر ذمے داران کے ساتھ کیا تھا، آپ نے شام و مصر اور عراق پر مقرر اپنے نمایندوں سے آدھا مال لے لیا تھا اور آدھا

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢١٦٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٥٦٤)

ان کو دے دیا تھا، کیوں کہ آپ کی رائے کے مطابق ان کا مال مسلمانوں کے مال سے مخلوط ہو گیا تھا اور اس کی مقدار بلکہ اشیا بھی معلوم نہیں ہو سکی تھیں کہ کس نے کس سے کیا اور کتنا لیا ہے اور اپنے حق سے زیادہ لینے اور کم لینے دونوں کا احتمال تھا۔ اس جیسی صورتِ حال میں جو گناہ اور زیادتی پر تعاون سے توبہ کر لے وہ اس کا اقرار کر لے جو اس کے پاس ہے۔ نامعلوم معدوم کی طرح ہے، جس سے تکلیف (شرعی حکم) ساقط ہو جاتا ہے۔ وہ اسی طرح اس مال کی زکات دے جس طرح اصل مالک اپنے مال کی زکات دیتا ہے۔

اگر آدمی کو معلوم ہو کہ اس کے پاس کتنا مال حلال ہے، جس کا وہ مالک ہے اور کتنا مال حرام ہے جس کا وہ مالک نہیں اور اس کی مقدار بھی معلوم ہو تو وہ حلال و حرام کی مقدار کے مطابق مال تقسیم کرے۔ حلال کو اپنے پاس رکھ لے اور حرام کو اس کے مالک کی طرف سے صدقہ کر دے۔ جس طرح کسی شخص کے پاس نامعلوم مالکوں کا مال ہو، خواہ وہ غصب شدہ ہو یا امانت یا عاریتاً رکھوایا ہو یا کوئی اور تو امام مالک، ابو حنیفہ اور احمد بن حنبل وغیرہ جیسے جمہور کے نزدیک وہ اس کا صدقہ کر دے، اس جیسے مسئلے میں صحابہ کرام سے بھی یہی منقول ہے۔

اگر اس کو حلال و حرام کی مقدار معلوم نہ ہو تو مال کے دو حصے کرے، ایک حصہ اپنے پاس رکھ لے اور دوسرا اس کے مالک تک پہنچائے، اگر مالک نامعلوم ہو تو صدقہ کر دے۔ جو صدقہ کرے وہ مسلمانوں کے مفادِ عامہ میں استعمال کیا جائے، یعنی اس میں سے زکات کے مستحق کو بھی دیا جائے، مہمان کی مہمان نوازی بھی کی جائے، حاجی کی مدد بھی کی جائے، جہاد میں خرچ کیا جائے اور نیکی کے اُن تمام کاموں میں صرف کیا جائے جو اللہ اور اس کے رسول کو پسند ہیں۔ تمام مجہول اور نامعلوم اموال کو اسی طرح استعمال کیا جاتا ہے۔ اسی طرح جس کے پاس حرام مال ہو اور وہ اس سے توبہ کر لے، لیکن اس کو اس کے اصل مالک کا علم نہ ہو تو اسی طرح صرف کرے۔

ظالم کو معاف کرنے کی صورت میں مظلوم کا اجر

سوال ایک شخص نے کسی کا ناجائز مال کھایا، اس کی بے عزتی کی اور اس کو جسمانی اذیت بھی پہنچائی، لیکن مظلوم نے آخرت میں ملنے والے اجر کو ترجیح دیتے ہوئے ظالم سے قصاص نہ لیا۔ سوال یہ ہے کہ کیا مظلوم کا ظالم کو معاف کر دینا اس کو آخرت میں ملنے والے اجر کو ساقط کرنے یا کم کرنے کا باعث بنتا ہے یا نہیں؟ یا اس کو پورا اجر ملے گا؟ نیز قیامت کے دن مظلوم ظالم سے انتقام لینے کا مطالبہ کرے، یہ بہتر ہے یا اس کو معاف کر کے اللہ کے سپرد کر دے؟

جواب مظلوم کا ظالم کو معاف کرنا اس کے اجر کے ساقط یا کم ہونے کا باعث نہیں، بلکہ جو ظالم کو معاف کرتا ہے اس کا

اجر اللہ کے ذمے ہو جاتا ہے۔ اگر وہ معاف نہ کرے تو ظالم پر اس کا حق باقی رہتا ہے۔ وہ ظلم کی مقدار کے برابر قصاص لینے کا حق رکھتا ہے، لیکن جب درگزر کر کے صلح کر لے تو پھر اس کا اجر اللہ کے ذمے ہوتا ہے اور اس کا وہ اجر جو اللہ کے ذمے ہو وہ ظاہر ہے، بہت خوب اور ہمیشہ باقی رہنے والا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۚ فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ﴾ [الشوریٰ: ٤٠]

''اور کسی برائی کا بدلہ اس کی مثل ایک برائی ہے، پھر جو معاف کر دے اور اصلاح کر لے تو اس کا اجر اللہ کے ذمے ہے۔ بے شک وہ ظالموں سے محبت نہیں کرتا۔''

اس آیتِ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ برائی کا بدلہ برائی کی مقدار کے برابر ہے اور اس میں زیادتی جائز نہیں۔ خون، عزت اور مال وغیرہ کے معاملے میں یہی قصاص ہے۔ اس کے بعد فرمایا:

﴿ فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ۭ ﴾ [الشوریٰ: ٤٠]

''پھر جو معاف کر دے اور اصلاح کر لے تو اس کا اجر اللہ کے ذمے ہے۔''

امام احمد کو جب فتنۂ خلقِ قرآن کے موقع پر شدید ترین آزمایش سے گزرنا پڑا اور ظلم سہنا پڑا تو کہا جاتا ہے کہ وہ اس وقت تک باہر نہ نکلے جب تک ظالم کو معاف نہ کر دیا اور کہا: مجھے ایک حدیث یاد آ گئی تھی جو مبارک بن فضالہ نے حسن سے روایت کی، اس نے کہا:

"إذا كان يوم القيامة نادى منادٍ: ألا ليقم من وجب أجره علي فلا يقوم إلا من عفا وأصلح"

''قیامت کے دن ایک آواز لگانے والا آواز لگائے گا: توجہ کریں! جس کا اجر میرے ذمے ہے وہ کھڑا ہو جائے تو وہی کھڑا ہوگا جس نے معاف کر کے صلح کر لی ہوگی۔''

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ ۭ وَلَىِٕنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ ﴾ [النحل: ١٢٦]

''اور اگر تم بدلہ لو تو اتنا ہی بدلہ لو جتنی تمھیں تکلیف دی گئی ہے اور بلاشبہہ اگر تم صبر کرو تو یقیناً وہ صبر کرنے والوں کے لیے بہتر ہے۔''

اس میں ظالم کو سزا دینے کی اجازت دی گئی ہے، مگر ظلم کے برابر، پھر فرمایا:

﴿ وَلَىِٕنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ ﴾ [النحل: ١٢٦]

''اور بلاشبہہ اگر تم صبر کرو تو یقیناً وہ صبر کرنے والوں کے لیے بہتر ہے۔''

اس سے معلوم ہوا کہ صبر کرنا ظالم کو اس کے ظلم کے مثل سزا دینے سے بہتر ہے، اس لیے یہ کس طرح ہو سکتا کہ معاف کر دینے سے اس کا اجر ضائع یا کم ہو جائے؟! ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ ۚ فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهٖ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ ۚ ﴾ [المائدة: ٤٥]

''اور سب زخموں میں برابر بدلہ ہے، پھر جو اس (قصاص) کا صدقہ کر دے تو وہ اس کے لیے کفارہ ہے۔''

یہاں ظالم پر واجب اور لازم قصاص میں صدقہ کر دینا یعنی قصاص نہ لینا معاف کرنے والے کے لیے کفارہ بن جاتا ہے، لیکن قصاص لے لینا کفارہ نہیں بنتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ معاف کر دینا قصاص لینے سے بہتر ہے۔

معاف کر دینا اس طرح کفارہ بنتا ہے کہ مومن کو جو مصیبت پہنچتی ہے وہ اس کے گناہوں کا کفارہ بنتی ہے، صبر کرنے پر اس کو اجر بھی ملتا ہے اور خدا کی رضا پر راضی رہنے کی وجہ سے درجات بھی بلند ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۗ وَمَنْ يُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهٗ ۚ ﴾ [التغابن: ١١]

''کوئی مصیبت نہیں پہنچی مگر اللہ کے اذن سے اور جو اللہ پر ایمان لے آئے وہ اس کے دل کو ہدایت دیتا ہے۔''

سلف کہتے ہیں: اس سے مراد وہ آدمی ہے جس کو مصیبت پہنچتی ہے اور اس کو علم ہوتا ہے کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے، پھر تسلیم و رضا کے ساتھ اس کا چہرہ جھک جاتا ہے۔ صحیح بخاری و مسلم میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''مومن کو جو دکھ، درد، تھکاوٹ، غم اور اذیت پہنچتی ہے، حتی کہ کانٹا بھی چبھتا ہے تو اللہ اس کے ذریعے اس کی خطائیں مٹا دیتا ہے۔''[1]

مسند احمد میں ہے، جب یہ آیت اتری:

﴿ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ ﴾ [النساء: ١٢٣]

''جو بھی کوئی برائی کرے گا اسے اس کی جزا دی جائے گی۔''

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کہا: اللہ کے رسول! یہ تو کمر توڑ آیت اتری ہے، ہم میں سے کون برائی نہیں کرتا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''ابوبکر! تو تھکتا نہیں، غم زدہ نہیں ہوتا، تجھے پریشانی لاحق نہیں ہوتی؟ یہی ہے جس کی جزا تمھیں دی جائے گی۔''[2] اس میں یہ الفاظ بھی ہیں: ''مصیبتیں اس طرح انسان سے خطاؤں کو اتار دیتی ہیں، جس طرح درخت سے پتے اتر جاتے ہیں۔''[3]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٣١٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٧٣)

[2] مسند أحمد (١١/١) شیخ احمد شاکر رحمہ اللہ نے مسند پر اپنی تحقیق میں اسے ضعیف کہا ہے۔

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٣٢٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٧١)

مصیبتوں کے کفارہ بننے کے دلائل بے شمار ہیں۔ جب بندہ صبر کرے تو صبر پر اجر پاتا ہے۔ ثواب اور جزا عمل کا ہوتا ہے، جو صبر ہے، لیکن مصیبت بذاتِ خود اللہ کے فعل کا نتیجہ ہے، بندے کے فعل کا نہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندے کو اس کے گناہوں کی جزا اور اس کے گناہ مٹانے کا ایک ذریعہ ہے۔ مسند احمد میں ہے: صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حضرت ابوعبیدہ بن جراح کی عیادت کے لیے آئے۔ انھوں نے کہا: اللہ آپ کو آپ کے مرض کا اجر دے گا۔ حضرت ابوعبیدہ نے کہا: مرض پر اجر کیسا، یہ تو مصیبت ہے جو گناہ مٹانے کا سبب بنتی ہے۔ انھوں نے یہ بات واضح کی کہ نفسِ مرض کا اجر نہیں، بلکہ اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ خطائیں مٹا دیتا ہے۔[1] اکثر اجر سے گناہوں کی بخشش مراد لی جاتی ہے تو اس اعتبار سے اس میں اجر ہوگا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں: تعویض، اس میں اجر اور امتنان و احسان مندی کا ہونا ضروری ہے اور کبھی عمل کے بغیر بھی ثواب مل جاتا ہے، جس طرح کسی کی طرف سے نیکی کے کام کیے جاتے ہیں۔

مصیبتوں پر صبر کا اجر عظیم اور بے حساب ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۝ اُولٰۗىِٕكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۣ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ۝ ﴾ [البقرة: ١٥٥_١٥٧]

"اور صبر کرنے والوں کو خوش خبری دے دے۔ وہ لوگ کہ انھیں کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو کہتے ہیں بے شک ہم اللہ کے لیے ہیں اور بے شک ہم اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن پر ان کے رب کی طرف سے کئی مہربانیاں ہیں اور بڑی رحمت ہے اور یہی لوگ ہدایت پانے والے ہیں۔"

اگر کوئی شخص کسی پر ظلم کرتے ہوئے اس کو زخم لگاتا ہے تو یہ زخم وہ مصیبت ہوگی جس کے ذریعے اس کے گناہ مٹیں گے اور صبر اور ظالم کو معاف کر کے اس پر احسان کرنے کی وجہ سے اس کو اجر ملے گا، احسان جلبِ منفعت اور دفعِ مضرت کے ساتھ ہوتا ہے، اس لیے اسے اللہ نے اسے صدقے سے تعبیر کیا ہے۔

ایک جگہ فرمایا:

﴿ وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ ۙ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّاۗءِ وَالضَّرَّاۗءِ وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴾ [آل عمران: ١٣٣، ١٣٤]

"اور ایک دوسرے سے بڑھ کر دوڑو اپنے رب کی جانب سے بخشش کی طرف اور اس جنت کی طرف جس

[1] مسند أحمد (١/١٩٥، ١٩٦) علامہ ہیثمی رحمہ اللہ نے مجمع الزوائد (٣/٢٧) میں کہا ہے کہ اس کی سند میں بشار بن ابی سیف راوی کی توثیق کرنے والا مجھے کوئی نہیں ملا ہے، جب کہ باقی کے رجال ثقہ ہیں۔

کی چوڑائی آسمانوں اور زمین (کے برابر) ہے، ڈرنے والوں کے لیے تیار کی گئی ہے۔ جو خوشی اور تکلیف میں خرچ کرتے ہیں اور غصے کو پی جانے والے اور لوگوں سے درگزر کرنے والے ہیں اور اللہ نیکی کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔''

یہاں یہ بتایا کہ وہ احسان کرنے والوں اور لوگوں کو معاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ معاف کرنا احسان میں شامل ہے۔ احسان برائی کرنے کے عکس اور متضاد ہے۔ یہ حسن اور اچھے فعل کو کہا جاتا ہے، خواہ وہ آدمی تک محدود رہے یا دوسروں تک متعدی ہو، اسی مفہوم میں یہ آیت بھی ہے:

﴿ مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا ۚ وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزٰۤى اِلَّا مِثْلَهَا ﴾ [الأنعام: ١٦٠]

''جو شخص نیکی لے کر آئے گا تو اس کے لیے اس جیسی دس نیکیاں ہوں گی اور جو برائی لے کر آئے گا سو اسے جزا نہیں دی جائے گی، مگر اسی کی مثل۔''

غصہ پینے والا اور لوگوں کو معاف کرنے والا اپنے ساتھ بھی اچھا کرتا ہے اور لوگوں کے ساتھ بھی۔ یہ وہ عمل ہے جو اپنی ذات کے ساتھ بھی نیکی ہے اور لوگوں کے ساتھ بھی۔ تو جو لوگوں کے ساتھ اچھا کرتا ہے حقیقت میں اپنے ساتھ ہی اچھا کرتا ہے۔

کسی بزرگ کا قول ہے:

"ما أحسنت إلى أحد، وما أسأت إلى أحد، وإنما أحسنت إلى نفسي وأسأت إلى نفسي"

''میں نے کسی کے ساتھ اچھا یا برا نہیں کیا، جو اچھا یا برا کرتا ہوں اپنے ہی ساتھ کرتا ہوں۔''

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا ۚ ﴾ [حمٓ السجدة: ٤٦]

''جس نے نیک عمل کیا سو اپنے لیے اور جس نے برائی کی سو اسی پر ہوگی۔''

اگر لوگوں کے ساتھ نیکی کرنا محسن اور نیکی کرنے والے کے ساتھ احسان نہ ہوتا اور اس کا فائدہ اس کو نہ پہنچتا تو وہ گناہ یا نقصان کا کام کرنے والا ہوتا، کیوں کہ جس کام کا فائدہ کرنے والے کو نہ پہنچے، اس کی دو صورتیں ہیں:

1 اس میں کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔

2 یا وہ عبث اور شر ہوتا ہے۔

لٰہذا وہ کرنے والے کے لیے نقصان دہ ہوتا ہے۔ ظلم کو معاف کرنا صدقے کی دو اقسام: ① معروف اور

② حسنِ سلوک میں سے ایک ضرور ہوتا ہے، اور اس سب کی اصل اور بنیاد زکات ہے۔

اللہ سبحانہ و تعالیٰ ہمیشہ نماز کے ساتھ زکات کا حکم دیتے ہیں جو صدقہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان بھی ہے:

«كُلُّ مَعْرُوفٍ صَدَقَةٌ»[1] ''ہر معروف (نیکی اور معاشرے کی نگاہ میں اچھا کام) صدقہ ہے۔''

صدقے کی دو صورتیں ہوتی ہیں:

① یہ صدقہ کرنے والے کو نفع پہنچاتا ہے۔

② یہ اس سے ضرر دور کرتا ہے۔

اگر مظلوم ظلم کی سزا دینے کا استحقاق رکھتا ہے، اس کا نفس بھی اسی پر اکساتا ہے، مگر وہ اپنے نفس کو اس سے روک لیتا ہے اور دوسرے کو نقصان پہنچانے کی اس خواہش کو دبا دیتا ہے تو یہ اس کا اس کے ساتھ حسنِ سلوک اور اس پر صدقہ ہے۔ اللہ تعالیٰ صدقہ کرنے والے کو اجر دیتے ہیں اور حسنِ سلوک کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتے، اس لیے اس سے معاف کرنے والے کا اجر ساقط نہیں ہوتا۔ یہ تمام حقوق العباد میں عام ہے، اس لیے جہاں اللہ نے حقوق العباد کا ذکر کیا ہے۔ وہیں عدل کا ذکر بھی کیا ہے اور ساتھ احسان کی ترغیب بھی دی ہے۔ عدل و احسان اللہ کا حکم ہے، ارشاد ہے:

﴿ وَ اِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ ؕ وَ اَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴾

[البقرة: ٢٨٠]

''اور اگر کوئی تنگی والا ہو تو آسانی تک مہلت دینا لازم ہے اور یہ بات کہ صدقہ کر دو تمھارے لیے بہتر ہے، اگر تم جانتے ہو۔''

اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے تنگدست مقروض کا قرض ساقط کر کے اس پر صدقہ کرنے کو اس کو محض مہلت دینے سے زیادہ اچھا اور بہتر کہا ہے، ارشاد ہے:

﴿ وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَـًٔا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يَّصَّدَّقُوْا ؕ ﴾

[النساء: ٩٢]

''اور کسی مومن کا کبھی یہ کام نہیں کہ کسی مومن کو قتل کرے مگر غلطی سے اور جو شخص کسی مومن کو غلطی سے قتل کر دے تو ایک مومن گردن آزاد کرنا اور دیت دینا ہے، جو اس کے گھر والوں کے حوالے کی گئی ہو، مگر یہ کہ وہ صدقہ (کرتے ہوئے معاف) کر دیں۔''

یہاں دیت ساقط کرنے کو صدقہ کہا، فرمایا:

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٦٧٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٠٥)

﴿ وَإِنْ طَلَّقْتُمُوهُنَّ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَمَسُّوهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ إِلَّا أَنْ يَعْفُونَ أَوْ يَعْفُوَ الَّذِي بِيَدِهِ عُقْدَةُ النِّكَاحِ وَأَنْ تَعْفُوا أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ ﴾

[البقرة: ٢٣٧]

''اور اگر تم انھیں اس سے پہلے طلاق دے دو کہ انھیں ہاتھ لگاؤ، اس حال میں کہ تم ان کے لیے کوئی مہر مقرر کر چکے ہو تو تم نے جو مہر مقرر کیا ہے اس کا نصف (لازم) ہے، مگر یہ کہ وہ معاف کر دیں، یا وہ شخص معاف کر دے جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے اور یہ (بات) کہ تم معاف کر دو تقویٰ کے زیادہ قریب ہے۔''

یہاں غیر مدخولہ کو طلاق دینے کی صورت میں جب حق مہر مقرر ہو چکا ہو، آدھا دینے کا حکم ہے، مگر اس کو بھی معاف کرنے کو تقوے کے زیادہ قریب کہا۔ عورت کے عفو سے مراد یہ ہے کہ عورت اس آدھے کو بھی ساقط کر دے۔ اس پر امت کا اتفاق ہے۔ جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے اس سے مراد خاوند ہو تو اس کا عفو یہ ہے کہ وہ عورت کو پورا حق مہر دے۔ اس طرح یہ عفو اس عفو کی جنس سے ہو گا۔ یہ عفو یہ ہے کہ سارا حق مہر دیا جائے اور وہ عفو یہ ہے کہ سارا ہی ساقط کر دیا جائے۔ جن علما نے ﴿ الَّذِي بِيَدِهِ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ﴾ سے خاوند مراد لیا ہے، ان کی رائے کے مطابق عورت کا واجب حق عورت کے علاوہ کسی کو ساقط کرنے کا اختیار نہیں، جس طرح عورت کے ساتھ قرضوں کو اس کے علاوہ کوئی دوسرا ساقط نہیں کر سکتا۔

دوسرے علما نے اس سے عورت کا وہ مستقل ولی مراد لیا ہے جس کو اس کی اجازت کے بغیر اس کا نکاح کرنے کا حق حاصل ہوتا ہے، جس طرح نابالغ کنواری کے لیے باپ اور لونڈی کے لیے آقا ہوتا ہے۔ اس قول کی بنا پر دونوں عفو ایک ہی جنس کے ہوں گے، اس لیے اللہ نے یہ نہیں کہا: "إلا ان يعفون أو يعفوهم" جب کہ آیت میں ازواج کو مخاطب کیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت لقمان کی وصیت نقل کرتے ہوئے فرمایا جو انھوں نے اپنے بیٹے کو کی:

﴿ وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا أَصَابَكَ إِنَّ ذَٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ ﴾

[لقمان: ١٧]

''اور نیکی کا حکم دے اور برائی سے منع کر اور اس (مصیبت) پر صبر کر جو تجھے پہنچے، یقیناً یہ ہمت کے کاموں سے ہے۔''

دوسری جگہ فرمایا:

﴿ وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰٓئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْلٍ ﴿٤١﴾ اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَيَبْغُوْنَ فِى الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۚ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿٤٢﴾ وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ﴿٤٣﴾ ﴾ [الشوریٰ: ٤١۔٤٣]

''اور بے شک جو شخص اپنے اوپر ظلم ہونے کے بعد بدلہ لے لے تو یہ وہ لوگ ہیں جن پر کوئی راستہ نہیں۔ راستہ تو انھی پر ہے جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں اور زمین میں حق کے بغیر سرکشی کرتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن کے لیے دردناک عذاب ہے۔ اور بلاشبہہ جو شخص صبر کرے اور معاف کر دے تو بے شک یہ یقیناً بڑی ہمت کے کاموں سے ہے۔''

لقمان علیہ السلام کی وصیت میں مصیبت پر صبر کا ذکر کیا اور کہا: ﴿ اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ﴾ اور یہ بات اس بات کے بعد کہی:

﴿ وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰٓئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْلٍ ﴿٤١﴾ اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَيَبْغُوْنَ فِى الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۚ ﴾ [الشوریٰ: ٤١۔٤٣]

''اور بے شک جو شخص اپنے اوپر ظلم ہونے کے بعد بدلہ لے لے تو یہ وہ لوگ ہیں جن پر کوئی راستہ نہیں۔ راستہ تو انھی پر ہے جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں اور زمین میں حق کے بغیر سرکشی کرتے ہیں۔''

لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اس ظلم کے باب میں جو مظلوم کے اختیار کے بغیر ہو، تین اصناف ذکر کیں:

① عادل۔ ② ظالم۔ ③ محسن۔

عادل وہ ہے جو ظلم کا بدلہ لے لیتا ہے۔ چونکہ یہ ظلم کا بدلہ ہے، اس لیے مظلوم پر کوئی اعتراض نہیں، لہٰذا اس کی وجہ سے وہ قابلِ تعریف ہے نہ قابلِ مذمت۔

ظالم کو ان الفاظ میں ذکر کیا:

﴿ اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَيَبْغُوْنَ فِى الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۚ ﴾ [الشوریٰ: ٤٢]

''راستہ تو انھی پر ہے جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں اور زمین میں حق کے بغیر سرکشی کرتے ہیں۔''

ان لوگوں سے قصاص لینا اور ان کو سزا دینا جائز ہے۔

محسنین کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

﴿ وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ﴾ [الشوریٰ: ٤٣]

''اور بلاشبہہ جو شخص صبر کرے اور معاف کر دے تو بے شک یہ یقیناً بڑی ہمت کے کاموں سے ہے۔''

قرآن کریم میں جامع کلمات ہیں۔

سورت بقرہ کے آخر میں بھی مالی معاملات میں لوگوں کی تین اصناف ذکر ہوئی ہیں، ایک محسن جو صدقہ کرنے والا، دوسرا ظالم سود خور اور تیسرا عادل جو بائع اور تاجر ہے۔ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے صدقات، سود اور بیع وقرض کے احکام بیان کیے ہیں۔

لہٰذا جو سمجھتا ہے کہ عفو سے اس کا حق ساقط ہو جائے گا یا اس میں کمی واقع ہو جائے گی تو وہ جاہل، گمراہ اور غلط فہمی کا شکار ہے، بلکہ عفو کے ساتھ اس کا اجر بڑھ جاتا ہے۔ اسی طرح جو یہ سمجھتا ہے کہ معاف کرنے سے وہ ذلیل ہو جائے گا اور ظالم معزز اور مغرور تو اس کا یہ خیال بھی درست نہیں۔ صحیح بخاری وغیرہ میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''تین باتیں تو میں قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں: ① معاف کرنے کی وجہ سے اللہ کسی بندے کو ذلیل نہیں کرتا، بلکہ اس کی عزت میں اضافہ ہی کرتا ہے ② صدقہ مال میں کمی نہیں کرتا ③ اللہ کے لیے کوئی تواضع نہیں کرتا، مگر اللہ اس کو بلند ہی کرتا ہے۔''[1]

یہ خواہشِ نفس اور گمان کی پیروی کرنے والے کو جواب ہے جو سمجھتا ہے کہ معاف کرنا ذلیل کر دے گا، صدقہ دینے سے مال میں کمی آئے گی اور تواضع اس کو پست وحقیر کر دے گی۔

صحیحین میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے: ''رسول اللہ ﷺ نے کبھی اپنے کسی خادم کو، بیوی کو، سواری کو یا کسی چیز کو نہیں مارا، مگر یہ کہ جب آپ اللہ کی راہ میں جہاد کر رہے ہوں۔ آپ نے کبھی اپنی ذات کے لیے انتقام نہیں لیا، مگر یہ کہ اللہ کے محارم (حرمتوں) کو پامال کیا جائے۔ جب اللہ کے محارم کو پائمال کیا جاتا تو جب تک آپ اللہ کے لیے انتقام نہ لے لیتے آپ کا غصہ ٹھنڈا نہ ہوتا۔''[2]

رسول اللہ ﷺ کا اخلاق قرآن کی عملی تفسیر تھا اور اخلاقیات کا اکمل نمونہ، آپ ﷺ کے اخلاق کی ایک جھلک یہ تھی کہ آپ ﷺ اپنی ذات کے لیے انتقام نہیں لیتے تھے، مگر جب اللہ کی حرمتوں کو پائمال کیا جاتا تو اس وقت آپ جب تک انتقام نہ لے لیتے، چین سے نہ بیٹھتے، اپنا حق معاف کر دیتے، مگر اللہ کا حق وصول کرتے۔

یہاں لوگوں کی چار اقسام ہیں:

1. جو اپنے لیے اور اپنے رب کے لیے انتقام لیتا ہے، اس میں دین بھی ہوتا ہے اور غصہ بھی۔
2. جو اپنے لیے انتقام لیتا ہے نہ اپنے رب کے لیے، یہ جاہل اور دین میں کمزور ہوتا ہے۔

---

① صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٨٨) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٠٢٩)

② صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٣٦٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٢٨)

3 جو اپنے لیے تو انتقام لیتا ہے، مگر اپنے رب کے لیے نہیں، یہ بدتر ہے۔

4 جو اللہ کے حق کا بدلہ لیتا ہے، مگر اپنا حق معاف کر دیتا ہے، یہ کامل ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں: میں نے دس سال رسول اللہ ﷺ کی خدمت کی۔ آپ ﷺ نے مجھے کبھی اُف تک نہیں کہا۔ مجھے یہ کبھی نہیں کہا کہ تو نے یہ کام کیوں کیا اور یہ کیوں نہ کیا؟ اگر آپ ﷺ کے گھر کا کوئی فرد مجھے کبھی کسی وجہ سے ڈانٹتا تو آپ ﷺ کہتے: ''اس کو رہنے دو۔ اگر یہ قسمت میں ہوتا تو ہو جاتا۔''[1] یہ اس عفو کی بات ہے جو آپ ﷺ کے اپنے حق سے تعلق رکھتا تھا، جہاں تک حدود اللہ کی بات ہے تو جب آپ ﷺ کے چہیتے صحابی اسامہ بن زید نے بنی مخزوم کی معزز خاتون پر چوری کی حد نہ لگانے کے لیے سفارش کی تو آپ ﷺ غصے میں آ گئے۔[2] اسی طرح حضرت اسامہ نے جب بتایا کہ انھوں نے ایک شخص کو ''لا إله إلا الله'' کہنے کے باوجود قتل کر دیا تو آپ ﷺ نے اس پر سخت برہمی کا اظہار فرمایا،[3] دوسری طرف اپنے حق میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے درگزر سے کام لیا۔

ظالم کو معاف کرنے کے استحباب اور اس کے اجرِ عظیم پر دلالت کرنے والی احادیث و آثار بہت زیادہ ہیں، بلکہ یہ انسانوں کی فطرت میں شامل علم سے تعلق رکھنے والی چیز ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی سے کہا:

﴿ خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ ﴾ [الأعراف: ۱۹۹]

''درگزر اختیار کر اور نیکی کا حکم دے اور جاہلوں سے کنارہ کر۔''

یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو لوگوں کے اخلاق میں سے ''عفو'' کو اختیار کرنے کا حکم دیا۔ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو لوگوں کے اخلاق میں ''عفو'' کو اختیار کرنے، معروف کا حکم دینے اور جاہلوں سے اعراض کرنے کا حکم دیا۔ اس آیت میں تمام کریمانہ اخلاق آ جاتے ہیں اور یہ بڑا وسیع باب ہے۔ واللہ أعلم[4]

انکار کرنے والے مقروض کے مال سے قرض وصول کرنا

سوال کسی آدمی نے کسی کو ادھار پیسے دیے۔ جب واپسی کا تقاضا کیا تو اس نے انکار کر دیا، پھر قرض دار کے ہاتھ مقروض کا کوئی مال لگا جو اس کے قرض کی نوع سے تعلق رکھتا تھا تو کیا وہ اس سے اپنے قرض کی مقدار کے مطابق لے سکتا ہے؟

---

1 صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٦٩١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٠٩)

2 صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٢٨٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٨٨)

3 صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٠٢١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٩٦)

4 مجموع الفتاویٰ (٣٠/٣٦١۔٣٧١)

جواب جب کسی کے ذمے کا کوئی حق ہو، خواہ وہ نقد کی صورت میں ہو یا ادھار کی شکل میں، تو کیا وہ اس سے اس کی اجازت کے بغیر لے سکتا ہے؟ اس کی دو انواع ہیں:

پہلی نوع: استحقاق کا سبب بالکل ظاہر ہو اور اثبات دعویٰ کا محتاج نہ ہو، مثلاً: خاوند پر عورت کے خرچے کا استحقاق، باپ پر بچے کے خرچے کا استحقاق اور میزبان پر مہمان کا استحقاق۔

اس صورت میں استحقاق رکھنے والا بلاشبہہ اس کی اجازت کے بغیر اپنا حق لے سکتا ہے۔ صحیحین میں ہے، ہند بنت عتبہ بن ربیعہ نے کہا: اے اللہ کے رسول! ابوسفیان ایک کنجوس شخص ہے، مجھے میری اور میرے بیٹے کی ضرورت کے مطابق خرچہ نہیں دیتا۔ آپ ﷺ نے کہا: ''اپنے لیے اور اپنے بیٹے کے لیے عرف کے مطابق اتنا لے لو، جو تم دونوں کے لیے کافی ہو۔''[1]

اس حدیث میں آپ ﷺ نے اس کو عرف کے مطابق اپنے سرپرست کی اجازت کے بغیر لینے کی اجازت دی۔ اسی طرح جس کے متعلق سب کو معلوم ہو کہ اس نے فلاں شخص کا مال لوٹا ہے تو جس کا مال لوٹا گیا ہو، وہ لوٹنے والے کے مال سے اس کے مطابق لے سکتا ہے۔ اگر کسی نے کسی کا قرض دینا ہو اور مقروض ٹال مٹول سے کام لے، معاملہ عدالت کے پاس چلا جائے تو عدالت اس کے قرض کے مطابق اس کے مال سے لے کر اس کو دلوا سکتی ہے۔

دوسری نوع: استحقاق کا سبب ظاہر نہ ہو، مثلاً: مقروض قرض کا انکار کر دے، یا جس نے لوٹا ہے وہ انکار کر دے اور مدعی کے پاس کوئی دلیل نہ ہو، اس میں علما کے دو اقوال ہیں:

1. مالکیہ اور حنابلہ کے نزدیک وہ اس کے مال سے لینے کا مجاز نہیں۔
2. شافعی کے نزدیک وہ اس سے لے سکتا ہے۔ ابوحنیفہ صرف اس مال سے لینے کو جائز کہتے ہیں جو اس کے حق کی جنس سے تعلق رکھتا ہو، کیوں کہ اس سے وہ اپنا حق وصول کرتا ہے، لیکن کسی دوسری جنس سے لینا جائز نہیں، کیوں کہ یہ درحقیقت معاوضہ ہوتا ہے جو قرض دار کی رضا مندی پر موقوف ہے۔

جائز کہنے والے یہ دلیل دیتے ہیں کہ جب اس نے اپنے اوپر واجب الادا حق ادا کرنے سے انکار کر دیا تو ضرورت کی وجہ سے اس کی اجازت کے بغیر معاوضہ ثابت ہو جاتا ہے۔ جو حق ظاہر نہ ہونے کی صورت میں ناجائز کہتے ہیں، ان کی دلیل یہ حدیث ہے جو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«أَدِّ الْأَمَانَةَ إِلَى مَنِ ائْتَمَنَكَ وَلَا تَخُنْ مَنْ خَانَكَ»[2]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٠٩٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧١٤)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٥٣٥) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٢٦٤) السلسلة الصحيحة (٤٢٣)

''جس نے تمھارے پاس امانت رکھوائی ہے اس کی امانت واپس کر اور اس کے ساتھ خیانت نہ کر جس نے تیرے ساتھ خیانت کی ہے۔'' (رواه السنن)

مسند احمد میں بشیر بن خصاصیہ سے مروی ہے کہ اسحاق نے کہا: اے اللہ کے رسول! ہمارے کچھ پڑوسی ہیں جو ہماری کوئی چیز نہیں چھوڑتے۔ اگر ہم بھی ان کی کسی چیز پر اختیار پا لیں تو کیا اسے لے لیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''نہیں، تو اس کی امانت ادا کر اور خیانت نہ کر۔''[1]

سنن میں حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے کہا گیا کہ زکات جمع کرنے والے ہم پر زیادتی کرتے ہیں۔ کیا ہم اس قدر اپنا مال چھپا لیں جس قدر وہ ہم پر زیادتی کرتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''نہیں۔'' (رواه أبو داود وغيره)[2]

یہ احادیث بیان کرتی ہیں کہ اگر مظلوم کے حق کا سبب ظاہر نہ ہو تو اس کا لینا خیانت متصور ہوگا، چاہے وہ اپنے حق کے برابر ہی لینا چاہے، لیکن وہ اس کے مال میں خیانت کا مرتکب ہوتا ہے، جس نے وہ اس کے پاس رکھوایا ہوتا ہے۔ اگر وہ کہے کہ میں نے اس سے جو لیا ہے، حقیقت میں اس کا حق رکھتا ہوں، لیکن اس کا دعویٰ ظاہر اور دلائل سے معلوم نہیں تو وہ ایسے ہی ہے جیسے کسی شخص نے کسی عورت سے شادی کی، لیکن عورت نے اس شادی کا انکار کر دیا اور اس کے پاس کوئی دلیل بھی نہیں اب وہ ظاہری حجت کے بغیر اس کو مجامعت پر مجبور کرنے کا جواز نہیں رکھتا۔

اسی طرح اگر قاضی کسی دلیل کی بنا پر، جسے وہ سچا سمجھتا ہو، مگر باطن میں وہ جھوٹی ہو، کسی شخص کی طلاق کا فیصلہ دے دیتا ہے تو وہ باطنی امر کی بنیاد پر اس سے مجامعت کا جواز نہیں رکھتا۔

اگر کوئی کہے کہ اس سے ظاہر میں تو منع کیا جائے مگر اس کو چاہیے کہ اس کو لوگوں کے سامنے ظاہر نہ کرے۔ وہ اس کا انکار کریں گے، کیوں کہ وہ ظاہر میں حرام ہے، مگر وہ رازدارانہ انداز میں اس کے مطابق کرے جو صحیح ہے اور اس کے اور اللہ کے درمیان راز ہے۔

اس کے جواب میں کہا جائے گا، اس کام کو رازدارانہ انداز میں کرنا کئی خرابیوں کو جنم دے گا، جو منع ہیں، اسی طرح یہ تاویل کا دروازہ بھی کھولے گا اور اس مظلوم کی طرح ہو جائے گا جس کے لیے ظلم کے بغیر اپنے ظلم کا بدلہ لینا ممکن نہ ہو، یا جس کے لیے زیادتی کے بغیر قصاص لینا ناممکن ہو، تو اس کے لیے قصاص لینا جائز نہیں رہتا، کیوں کہ خیانت بذاتِ خود حرام کام ہے، اس کے ذریعے اپنا حق وصول کرنا جائز نہیں۔ اگر کوئی شخص کسی کو زبردستی شراب پلا دے، یا لواطت بالجبر کرے، یا جھوٹی گواہی دینے پر مجبور کرے تو بدلے میں اس کے ساتھ یہ کام کرنا جائز نہیں،

---

[1] مسند أحمد (٨٣/٥)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٥٨٦) شیخ البانی رحمہ اللہ نے اسے ضعیف کہا ہے۔

کیوں کہ یہ کام حرام ہیں اور خیانت جھوٹ کی قسم سے ہے جو حرام ہے۔ اگر کوئی یہ کہے کہ خیانت نہیں، بلکہ اپنا حق وصول کرنا ہے اور نبی اکرم ﷺ نے تو خیانت کرنے والے سے خیانت کرنے سے منع کیا ہے، جو یہ ہے کہ وہ اس کے مال سے اپنے مال کی مقدار اور نظیر سے زیادہ لے، یہ اعتراض کئی وجوہ سے کمزور ہے:

① حدیث میں ہے، کچھ لوگ ایسے ہیں جو ہماری کوئی چیز نہیں چھوڑتے، کیا ہم اس کی مقدار کے مطابق ان کے مال سے لے لیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''نہیں، اس کی امانت ادا کر جس نے رکھوائی ہے، جس نے تمھارے ساتھ خیانت کی ہے تو اس کے ساتھ خیانت نہ کر۔''[1] اسی طرح زکات کی حدیث میں بھی آپ ﷺ نے مال چھپانے سے روکا۔

② آپ ﷺ نے فرمایا: ''اس کی خیانت نہ کر جس نے تیری خیانت کی۔'' اگر خیانت سے مراد مقابلے اور ادلے کے بدلے کے انداز میں لینا مراد ہوتا تو پھر خیانت کرنے اور نہ کرنے والے میں کوئی فرق نہ رہتا، اس کا حرام ہونا بالکل واضح ہے اور محتاجِ بیان نہیں۔ حالانکہ آپ ﷺ نے فرمایا ہے: ''اس کی خیانت نہ کر، جس نے تیری خیانت کی۔'' اس سے معلوم ہوا کہ آپ ﷺ نے کہا: ''اگر اس نے خیانت کی ہے تو مقابلے میں خیانت نہ کر کہ جس طرح کا کام اس نے کیا ہے تو بھی وہی کرے۔''

③ یہ بلاشک وشبہہ خیانت ہے، اگر قصاص کے طور پر اس کو جائز قرار دینے کی کوشش کی جائے تو قصاص قتل وغیرہ میں تو جائز ہوتا ہے، مگر فحاشی اور جھوٹ میں نہیں۔ پہلی صورت کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ﴾ [الشوریٰ: ٤٠]

''اور کسی برائی کا بدلہ اس کی مثل ایک برائی ہے۔''

﴿ وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ ﴾ [النحل: ١٢٦]

''اور اگر تم بدلہ لو تو اتنا ہی بدلہ لو جتنی تمھیں تکلیف دی گئی ہے۔''

﴿ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ ﴾ [البقرة: ١٩٤]

''پس جو تم پر زیادتی کرے سو تم اس پر زیادتی کرو اس کی مثل جو اس نے تم پر زیادتی کی ہے۔''

یعنی بالمثل سزا اور زیادتی کی اجازت دی، مگر یہاں فرمایا:

((وَلَا تَخُنْ مَنْ خَانَكَ))[2]

---

[1] مسند أحمد (٨٣/٥) السلسلة الصحيحة (٤٢٣)

[2] مسند أحمد (٨٣/٥) السلسلة الصحيحة (٤٢٣)

''جس نے تیری خیانت کی تو اس کی خیانت نہ کر۔''

اس سے معلوم ہوا کہ اس کام میں بالمثل سزا جائز نہیں۔ واللہ أعلم ①

امانت میں بغیر اجازت تصرف

سوال امانت سے اجازت کے بغیر قرض لینا کیسا ہے؟

جواب اگر تو امانت رکھنے والے کو علم اور اطمینان ہو کہ امانت رکھوانے والے کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا، اس میں کوئی حرج نہیں۔ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ سے اس کا ثبوت ملتا ہے، اگر اس کو شک ہو کہ وہ راضی نہیں ہوگا تب جائز نہیں۔ ②

نامعلوم مال کی ملکیت اور اس میں تصرف

سوال ایک جہاز دریا میں غرق ہوگیا اور کسی دوسرے علاقے میں جا کر ظاہر ہوگیا۔ اس پر گرم تیل کا ایک مٹکا بھی تھا۔ اس بستی والوں نے اس کو دریا سے باہر نکالا اور تیل کو بھی جتنا بچا پائے، بچا لیا۔ سوال یہ ہے کہ وہ تیل ان کے لیے حلال ہے یا حرام، کیوں کہ اس کا مالک نامعلوم ہے؟

جواب جنھوں نے تیل اکٹھا کیا، انھوں نے معصوم کا مال تباہ ہونے سے بچایا ہے، اس لیے وہ مثلی اجرت کے مستحق ہوں گے، تیل مالک ہی کا ہوگا۔ اس میں کوئی خاص اختلاف نہیں، البتہ حسن سے مروی ہے کہ یہ اسی کا ہے جس نے اسے بچایا ہے۔

کیا بچانے والے کو مثلی اجرت دینا ضروری ہے؟ اس میں بھی علما کے دو اقوال ہیں اور صحیح تر قول کے مطابق یہ ضروری ہے۔ یہی امام احمد سے منصوص ہے۔ یہ بچانے والا درحقیقت رضا کار ہے۔ اس قول کے قائلین کے نزدیک اگر اس نے اس کو اللہ کے لیے بچایا ہے تو اجر اللہ سے پائے گا۔ اگر عوض کے لیے بچایا ہے تو عوض کا مستحق ہے، کیوں کہ اگر وہ یہ کام نہ کرتا تو مال تباہ ہو جاتا اور لوگ عموماً ایسے مال کو تباہ ہونے سے نہیں بچاتے جس کے بچانے میں انھیں کوئی فائدہ محسوس نہ ہو۔ جو شخص مسلمانوں کا مال کافروں سے خرید کر بچاتا ہے، اس کے متعلق صحابہ سے مروی ہے کہ اس سے جو لے گا، قیمت دے کر لے گا، کیوں کہ اس نے اسے قیمت دے کر اسے بچایا ہے۔ اگر وہ اس طرح نہ لیتا تو وہ مال تباہ ہو جاتا، اس لیے اس کا بچانا مباح اور جائز کام ہے اور یہ کام کر کے اس نے کوئی نافرمانی نہیں کی۔ اب

---

① مجموع الفتاویٰ (۳۰/۳۷۱۔۳۷۵)

② مجموع الفتاویٰ (۳۰/۳۹٤)

یہ مال بچانے والے کے عمل کی وجہ سے بچا ہے اور حقیقت میں دوسرے کا ہے، اس لیے دونوں میں مشترک ہو جائے گا، لیکن شرکت متعین شخص پر عائد نہیں ہوتی، اس لیے مثلی اجرت ضروری ہو جاتی ہے۔ نیز اس طرح کا کام عموماً عرف میں اجازت شدہ ہوتا ہے اور لوگ عموماً بچانے والے کو اجرت دے کر اس سے لے لیتے ہیں۔

اِجارہ عرف و عادات سے بھی ثابت ہو جاتا ہے، مثلاً کوئی شخص شرط طے کیے بغیر کسی کشتی پر سوار ہو جائے، کھانا پکانے والے کو پکانے کے لیے سامان دے، دھوبی کو کپڑے دے، وغیرہ وغیرہ۔

ایک اثر میں منقول ہے کہ اگر مال جانور کی شکل میں ہو تو اس کو مرنے سے بچانے والا اس کا مالک بن جاتا ہے، کیوں کہ جانور کی ذاتی حرمت ہے، سامان کے عکس کہ اس کی حرمت اس کے مالک کی حرمت کی وجہ سے ہوتی ہے۔ لہٰذا جانور کو ہلاک ہونے سے بچانا جانور کا حق ہے جس کے بچنے سے اس کا مالک مایوس ہو چکا ہوتا ہے، سامان کے برخلاف کہ اس کا مالک بچانے والے سے کہہ سکتا ہے کہ اس میں میرا حق ہے، تیرے لیے اس وقت جائز تھا جب میں اس کو چھوڑ دیتا، اگر تو مجھے میرا حق نہیں دیتا تو میں نے تجھے اس کو بچانے کی اجازت بھی نہیں دی۔

اگر ملنے والی چیز پھل ہو تو وہ لقطہ کے حکم میں ہے۔ اگر لقطہ کے مالک کے ملنے کی امید ہو تو ایک سال تک اعلان کرایا جاتا ہے، اگر مالک کے ملنے کی امید نہ ہو تو اس میں دو اقوال ہیں، لیکن دونوں اقوال کے مطابق وہ انار کو بیچ بھی سکتے ہیں اور کھا بھی سکتے ہیں۔ بیچیں تو اس کے پیسے محفوظ رکھیں، پھر اس کے بعد اعلان کروائیں۔ واللّٰہ أعلم [1]

[1] مجموع الفتاویٰ (۳۰/ ٤١٤۔ ٤١٦)

اوقاف اور وصیت

وقف کی شرائط کی پابندی اور غیر شرعی اعمال کے لیے وقف کی حیثیت

سوال ایک شخص نے وقف جاری کیا اور اس میں قراء کی ایک جماعت کے لیے کچھ شرائط متعین کیں جن کے مطابق وہ ہر روز صبح کی نماز کے بعد وہاں حاضر ہوں اور طلوعِ آفتاب تک جتنا قرآن پڑھ سکتے ہیں پڑھیں، پھر دن کو آپس میں دو دو حصے کر کے تقسیم کر لیں۔ عصر کی نماز کے بعد بھی آئیں اور ہر کوئی دو دو حزب پڑھے۔ اسی طرح ہر جمعہ کی رات اکٹھے ہوں۔ اسی طریقے سے ایک مہینے میں اس کی قبر کے پاس ان کا اکٹھ ستتر (۷۷) مرتبہ ہو گا۔ اسی طرح یہ شرط بھی لگائی کہ وہاں اس کی تربت کے پاس ہر رات گزاریں گے۔ اس نے ہر ایک کے لائق رہنے کا انتظام بھی کر دیا اور وقف کی آمدنی سے ان کے لیے رقم بھی مخصوص کر دی جس کو وہ ہر دن اور ہر مہینے وصول کر لیں گے۔ سوال یہ ہے کہ کیا وہ وہاں حاضری کے لیے اس کی عائد کردہ شرطوں کے پابند ہوں گے یا کسی بھی جگہ اور کسی بھی وقت پڑھائی کا وظیفہ اور کام کر سکتے ہیں۔ دلائل کے ساتھ شافی جواب عنایت فرمایئے۔
جزاکم اللہ

جواب اس مسئلے کی اصل یہ ہے کہ وہ اعمال جو اللہ کے قرب کے حصول کے لیے کیے جاتے ہیں، ان کے کرنے والوں کے لیے وصیت کرنا اور نذر ماننا۔ ان اعمال کا ان نیکیوں میں سے ہونا ضروری ہے جو اللہ اور رسول کو محبوب ہیں۔ اگر وہ منع ہوں تو ان کے لیے وقف جاری کرنا جائز نہیں ہوتا اور وقف میں ان کی شرط لگانا بھی درست نہیں ہوتا۔ اس پر سب مسلمانوں کا اتفاق ہے۔ اسی طرح وقف و نذر وغیرہ میں یہ دیکھا جائے گا۔ اس میں اصلاً کوئی اختلاف نہیں۔

اس کے دلائل حسبِ ذیل ہیں:

- صحیح بخاری میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جس نے اللہ کی فرمانبرداری کرنے کی نذر مانی وہ اسے پورا کرے اور جس نے اللہ کی نافرمانی کرنے کی نذر مانی وہ اس کی نافرمانی نہ کرے۔“[1]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٣١٨)

صحیح بخاری و مسلم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے مروی ہے، جب بریرہ کے مالکوں نے آزاد کرنے والے کے علاوہ کسی دوسرے کے لیے وِلاء کی شرط لگانا چاہی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر براجمان ہوئے اور خطبہ ارشاد فرماتے ہوئے فرمایا: ''لوگوں کو کیا ہے ایسی شرطیں لگا رہے ہیں جو کتاب اللہ میں نہیں؟ جس نے ایسی شرط لگائی جو کتاب اللہ میں نہیں وہ باطل اور لغو ہے، خواہ سو شرطیں ہی ہوں، کتاب اللہ (اتباع کا) زیادہ حق رکھتی ہے اور اللہ کی شرط زیادہ مضبوط و ثقہ ہے۔''[1]

یہ حدیث مشہور ہے اور اس کو علما کے ہاں قبولیت کا درجہ حاصل ہے۔ اس بارے میں سب علما کا اتفاق ہے کہ یہ تمام عقود (معاہدات) کی شرطوں میں عام ہے اور کسی کے نزدیک بھی خرید و فروخت کے معاملات کی شرطوں کے ساتھ خاص نہیں، بلکہ جو وقف، عتق (آزاد کرنا)، ہبہ، بیع، نکاح، اجارہ، نذر یا کسی بھی معاملے میں ایسی شرط عائد کرتا ہے جو اس معنی میں کتاب اللہ کی شرطوں کے خلاف ہو کہ کسی ایسے معاملے پر مشتمل ہو جس سے اللہ نے منع کیا ہو یا کسی ایسی چیز سے روک رہی ہو، اللہ نے جس کا حکم دیا ہو یا حلال کو حرام یا حرام کو حلال کرنے پر مشتمل ہو تو یہ ساری شرطیں بشمول وقف تمام عقود و معاہدات میں بالاتفاق باطل و لغو ہیں۔ سنن ابو داود وغیرہ میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مسلمانوں کے درمیان صلح کروانا جائز ہے مگر ایسی صلح جائز نہیں جو حرام کو حلال یا حلال کو حرام کرے، مسلمانوں کی شرطوں کا لحاظ رکھا جائے گا سوائے اس شرط کے جو حرام کو حلال یا حلال کو حرام کرے۔''[2]

گو حدیثِ عائشہ رضی اللہ عنہا کا ایک خاص پس منظر اور سببِ ورود ہے مگر وہ عام ہے، اکثر علما کہتے ہیں کہ اس میں لفظ کے عموم کو لیا جائے گا اور اس کے سبب پر اکتفا نہیں کیا جائے گا۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ وہ تمام عمومی نصوص جن کے ورود اور نزول کا ایک خاص سبب ہوتا ہے، وہ اسباب کے ساتھ خاص نہیں ہوتیں، جیسے: وراثت، جہاد، ظہار، لعان، قذف، محاربہ، قضا، فے، سود اور صدقات وغیرہ کی آیات۔ یہ عام آیات مخصوص و متعین اسباب کی بنا پر نازل ہوئی ہیں جو حدیث، تفسیر، فقہ اور مغازی کی کتابوں میں مشہور اور مذکور ہیں، لیکن امت کا اتفاق ہے کہ ان کا حکم ان مخصوص افراد کے علاوہ دوسرے لوگوں کے حق میں بھی عام ہے جو تمام وجوہ سے ان کے مسائل سے مماثلت رکھتے ہوں۔

اسی طرح احادیث کے عموم میں بھی اتفاق ہے جن میں یہ حدیثِ عائشہ بھی ہے اور یہ ان جامع کلمات سے تعلق رکھتی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا ہوئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ ہیں:

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۲۰۶۰) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۵۰٤)

[2] سنن أبي داود، رقم الحدیث (۳۵۷۷) سنن الترمذي، رقم الحدیث (۱۳۵۲) سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (۲۳۵۳) صحیح الجامع (۳۸٦۲)

«مَنِ اشْتَرَطَ شَرْطًا لَيْسَ فِي كِتَابِ اللّٰهِ فَهُوَ بَاطِلٌ وَإِنْ كَانَ مِائَةَ شَرْطٍ، كِتَابُ اللّٰهِ أَحَقُّ وَشَرْطُ اللّٰهِ أَوْثَقُ »[1]

لیکن بیع، اجارہ اور نکاح جیسے مباح عقود میں فقہا کا اختلاف ہے کہ کیا ان میں حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ جس نے غیر ثابت شدہ شرط لگائی اس نے ایسی شرط لگا کر شریعت کی مخالفت کی ہے، یا جس نے ایسی شرط لگائی جس کے غیر شرعی ہونے کے متعلق اس کو علم ہو؟ کیونکہ حدیث کے آخر میں آپ ﷺ کے یہ الفاظ ہیں: ''اللہ کی کتاب زیادہ حق رکھتی ہے اور اللہ کی شرط زیادہ ثقہ اور مضبوط ہے۔'' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو شرط کتاب اللہ کے خلاف ہو گی وہ باطل ہو گی اور آپ ﷺ کے ان الفاظ: ''جس نے ایسی شرط لگائی جو کتاب اللہ میں نہیں وہ باطل ہے۔'' سے ایسی شرط سمجھی جا سکتی ہے جو مشروع اور ثابت نہ ہو۔

پہلے قول کے قائلین کہتے ہیں: جو شرط مباحات میں ممنوع نہ ہو اس کی اجازت ہو گی اور وہ کتاب اللہ کے ساتھ ثابت ہو گی مگر نذر جیسے عقود جن کا مقصود اللہ کا تقرب اور نیکی ہوتا ہے ان میں (منذور) کا نیکی ہونا ضروری ہوتا ہے، جب مباح ہو تو اس کو پورا کرنا واجب نہیں ہوتا، تاہم اس کے کفارے کے وجوب میں علما کے ہاں اسی طرح کا مشہور اختلاف ہے جو نذر معصیت کے کفارے میں ہے، لیکن نذرِ معصیت کو پورا کرنا واجب نہیں ہوتا، نذرِ مباح میں دونوں کا اختیار ہوتا ہے، وقف بھی اسی طرح ہی ہے۔

اس میں شرطوں کا حکم دو بنیادی باتوں کو ذکر کیے بنا معلوم نہیں کیا جا سکتا، اور وہ یہ کہ وقف کرنے والا جب کچھ وقف کرتا ہے تو اس کا مقصود مرنے کے بعد اس کے ثواب سے مستفید ہونا ہوتا ہے، وہ اللہ سے اجر کا خواہاں ہوتا ہے اور دنیا میں اس سے مستفید نہیں ہوتا، کیوں کہ مرنے کے بعد فوت شدہ اجر و ثواب کے علاوہ کسی اور شکل میں مستفید نہیں ہو سکتا۔ اس لیے جس سے دنیاوی منفعت اور فائدہ مقصود ہو اور جس سے اخروی اجر و ثواب ان دونوں میں فرق کیا جائے گا۔ پہلے کی مثال بیع، اجارہ اور نکاح کی ہے، اس میں انسان کے لیے مباح دنیوی اور مستحب دینی اغراض حاصل کرنے کے لیے اپنا مال صرف کرنا جائز ہے مگر حرام مقاصد کے لیے نہیں۔

بنابریں وقف کے معاملے میں انسان اپنا مال اسی کام میں صرف کرنے کا مجاز ہے جو اس کے لیے دینی طور پر فائدہ مند ہو۔ اگر وہ اس کو ایسے کاموں میں صرف کرے گا جو دینی طور پر اس کو کوئی فائدہ نہ دیتے ہوں، جب کہ وقف میں وہ اپنے مرنے کے بعد کسی دنیاوی فائدے سے مستفید نہیں ہو سکتا تو یہ ایسے ہی ہو گا جیسے اس نے ایسے کام میں سرمایہ کاری کی اور اپنا مال صرف کیا جو اس کے دین کے کام آیا نہ دنیا ہی کے، اس لیے یہ جائز نہیں۔

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٠٦٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٥٠٤)

اس لیے علما نے مخصوص شخص اور مخصوص ادارے کے لیے وقف جاری کرنے میں فرق کیا ہے، اگر انسان کسی مخصوص فرد کے لیے وقف یا وصیت کرے تو ایسا کرنا جائز ہے، خواہ وہ ذمی کافر ہی ہو، کیوں کہ اس کے ساتھ حسنِ سلوک کرنا کتاب وسنت سے ثابت ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفًا ﴾ [لقمان: ۱۵]

''اور دنیا میں اچھے طریقے سے ان کے ساتھ رہ۔''

حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا کی حدیث میں ہے، ان کی والدہ جب آئی تو وہ مشرکہ تھی۔ انھوں نے کہا: اے اللہ کے رسول! میری ماں آئی ہے اور یہ اسلام میں رغبت رکھتی ہے، کیا میں اس کے ساتھ صلہ رحمی کروں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اپنی ماں کے ساتھ صلہ رحمی کر۔''[1] یہ حدیث صحیحین میں ہے، اس کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی:

﴿ لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ﴾ [الممتحنة: ۸]

''اللہ تمھیں ان لوگوں سے منع نہیں کرتا جنھوں نے نہ تم سے دین کے بارے میں جنگ کی اور نہ تمھیں گھروں سے نکالا کہ تم ان سے نیک سلوک کرو اور ان کے حق میں انصاف کرو، یقیناً اللہ انصاف کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔''

نیز فرمایا:

﴿ لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَاۗءَ وَجْهِ اللّٰهِ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ﴾ [البقرة: ۲۷۲]

''تیرے ذمے انھیں ہدایت دینا نہیں اور لیکن اللہ ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور تم خیر میں سے جو بھی خرچ کرو گے سو تمھارے اپنے ہی لیے ہے اور تم خرچ نہیں کرتے مگر اللہ کا چہرہ طلب کرنے کے لیے اور تم خیر میں سے جو بھی خرچ کرو گے وہ تمھیں پورا ادا کیا جائے گا اور تم پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔''

اس میں بیان ہوا ہے کہ ان جیسوں کو کچھ دینا صرف اللہ کی رضا کے لیے ہے، صحیح بخاری میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« فِيْ كُلِّ ذَاتِ كَبِدٍ رَطْبٍ أَجْرٌ »[2] ''ہر جاندار میں صدقہ ہے۔''

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (۲٤۷۷) صحيح مسلم، رقم الحديث (۱۰۰۳)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٦٦٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (۲۲٤٤)

لہٰذا جب کوئی انسان کسی خاص فرد کے لیے وقف جاری کرتا ہے یا وصیت کرتا ہے، خواہ وہ کافر یا فاسق ہی ہو تو کفر و فسق سبب استحقاق نہیں، نہ یہ اس میں شرط ہی ہے، بلکہ وہ اسی کا مستحق ہے جو دینے والا اس کو دیتا ہے۔ اگر وہ عادل اور دیانتدار اور مسلمان ہو تو معصیت عدیم التاثیر ہو گی، لیکن اگر کوئی وقف یا وصیت میں کافروں یا فاسقوں کے کسی ادارے کے لیے یا کسی خاص کافر یا فاسق گروہ کی شرط عائد کرے تو یہ بلاشبہہ علما کے نزدیک باطل ہے۔

اگر وقف کسی مباح مد مثلاً مالداروں کے لیے خاص کیا جائے تو اس کے جواز و عدمِ جواز میں دو مشہور اقوال ہیں، کتاب و سنت اور اصول کی روشنی میں صحیح قول کے مطابق یہ کالعدم اور باطل ہے، کیوں کہ اللہ نے مالِ فے (جنگ کے بغیر حاصل ہونے والا مالِ غنیمت) کے متعلق ارشاد فرمایا ہے:

﴿ كَيْ لَا يَكُونَ دُولَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنكُمْ ﴾ [الحشر: ۷]

''تاکہ وہ تم میں سے مال داروں کے درمیان ہی گردش کرنے والا نہ ہو۔''

اس آیت میں اللہ نے یہ واضح کیا ہے کہ مالِ فے فقرا اور غریبوں کو چھوڑ کر مالداروں کے درمیان ہی گردش میں نہیں رہنا چاہیے جس سے اس کی کراہت، ممانعت اور مذمت معلوم ہوتی ہے، جو انسان اغنیا اور مالداروں کے لیے وقف خاص کر دے گا وہ مال کو مالداروں کے درمیان میں گردش کرنے کے لیے چھوڑ دے گا، لہٰذا وہی نسل در نسل اس سے مستفید ہوں گے اور غریبوں کو اس سے کچھ حاصل نہیں ہو گا جو اللہ کے امر و دین کے متضاد ہے، اس لیے جائز نہیں ہے۔

سنن میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«لَا سَبْقَ إِلَّا فِي خُفٍّ أَوْ حَافِرٍ أَوْ نَصْلٍ» [1]

''اونٹ، گھوڑے اور تیر اندازی کے سوا کسی کام میں شرط لگا کر مسابقت کرنا جائز نہیں۔''

اگر مسابقت کے لیے مال صرف کرنا صرف اس کام میں جائز ہے جو نیکی اور جہاد میں معاون ہو، حالانکہ وہ دائمی نہیں ہوتا تو وقف میں یہ کیسے جائز ہو سکتا ہے؟ یہ اصولِ شریعت میں دو وجوہ سے واضح ہے:

پہلی وجہ: دینی یا دنیوی مفاد کے علاوہ مال خرچ کرنا جائز نہیں۔ یہ اتفاقی اصول ہے جو اس کی مخالفت کرتا ہے وہ سفیہ (کم عقل اور مالی تصرف کرنے کا نااہل) ہوتا ہے اور جمہور علما کے نزدیک سفیہ (کم عقل) پر مالی تصرف کرنے پر پابندی ہے، کیوں کہ وہ اس کے مال میں فضول خرچی کا سبب بنتا ہے جس سے اللہ نے قرآن میں منع کیا ہے، ارشاد ہے:

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٥٥٧) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٧٠٠) سنن النسائي، رقم الحديث (٣٥٨٥) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٨٧٨) صحيح الجامع (٧٤٩٨)

﴿ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيرًا ﴾ [بني إسرائيل: ٢٦] ''اور مت بے جا خرچ کر، بے جا خرچ کرنا۔''

فضول خرچی کا مطلب ہے: مال ضائع کرنا اور ایسے کاموں میں خرچ کرنا جن سے کوئی فائدہ اور مصلحت حاصل نہ ہوتی ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے بھی مال ضائع کرنے سے منع فرمایا ہے۔ حضرت مغیرہ بن شعبہ سے مروی ہے:

''رسول اللہ ﷺ قیل قال، کثرتِ سوال اور مال ضائع کرنے سے منع کرتے تھے۔'' (متفق علیہ)[1]

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوٰلَكُمُ الَّتِيْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا ﴾ [النساء: ٥]

''اور بے سمجھوں کو اپنے مال سے نہ دو، جو اللہ نے تمھارے قائم رہنے کا ذریعہ بنائے ہیں۔''

اکثر صحابہ اور تابعین کا کہنا ہے: یہ ایسے ہی ہے جیسے سفیہ (کم عقل) کو وکیل بنا دیا جائے، یعنی آدمی اپنا مال اپنے سفیہ بیٹے یا سفیہہ بیوی کے سپرد کر دے، خرچ کرنے کا اختیار بھی ان کو دے دے اور خود ان کا ماتحت بن جائے۔ انسان سفیہ کا مال اس کے سپرد نہ کرے، کیوں کہ اسلام نے اس وقت تک اس کا مال اس کو دینے سے منع کیا ہے جب تک ولی اس میں رشد اور معاملہ فہمی کے آثار نہیں دیکھ لیتا، تاہم آیت دونوں انواع پر دلالت کرتی ہے، اللہ تعالیٰ نے وکالۃً یا ولایۃً دونوں صورتوں میں سفیہ کو اپنے مال یا دوسرے کے مال میں تصرف کا اختیار دینے سے منع کیا ہے۔ لہٰذا جو انسان مال ایسے کاموں میں خرچ کرتا ہے جن کا کوئی دنیاوی فائدہ ہوتا ہے نہ اخروی، اس سے بڑھ کر کم عقل اور سفیہ اور کون ہو گا؟ اس لیے یہ شریعت میں منع ہے۔

یہ قانون واضح ہونے کے بعد یہ بات تو واضح ہے کہ وقف کرنے والا دنیا میں اپنے وقف سے اس طرح فائدہ نہیں اٹھا سکتا جس طرح بیع، اجارہ اور نکاح میں اپنا مال خرچ کرنے کی صورت میں مستفید ہوسکتا ہے۔ اسی طرح اگر وہ وقف کو اللہ کی راہ اور اللہ اور اللہ کے رسول کی فرمانبرداری کی راہوں میں خرچ نہیں کرتا تو اس سے آخرت میں بھی مستفید نہیں ہو گا، کیوں کہ اللہ بندوں کو صرف اس کام میں مال خرچ کرنے کا ثواب دیتے ہیں جو اللہ کی خوش نودی پر مشتمل ہو، جو کام اللہ کو پسند نہ ہو، اس میں خرچ کرنے کا کوئی ثواب نہیں۔ انسان کا اپنی ذات اور بیوی بچوں پر خرچ کرنا فرض ہے، اس لیے اس کا ثواب بھی پرائیوں (غیروں) پر نفلی خرچ کرنے سے بہت بڑھ کر ہے۔

یہ قاعدہ واضح ہونے کے بعد یہ بھی معلوم ہو جانا چاہیے کہ وہ مباحات جن پر شارع کی طرف سے کوئی ثواب مقرر نہیں، ان پر خرچ کرنے اور ان کے لیے وقف جاری کرنے کا بھی کوئی ثواب نہیں۔ اگر ان پر وقف کرنے میں کوئی فائدہ نہیں، دین میں کوئی ثواب نہیں اور دنیا کا بھی کوئی فائدہ نہیں، یعنی ان کاموں پر وقف دینی اور دنیاوی

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦١٠٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٩٣)

فائدوں سے خالی ہے تو وہ باطل اور لغو ہے۔ یہ بات اغنیا اور مالداروں کے لیے وقف کرنے میں ظاہر ہے، اگرچہ بعض اوقات اغنیا کو دینا بھی واجب یا مستحب ہو جاتا ہے، لیکن یہ اس صورت میں ہوتا ہے جب ان کو مالداروں کی وجہ سے نہیں، بلکہ قرابت، جہاد، دین یا اس طرح کے کسی اور سبب کی وجہ سے دیا جائے، لیکن اگر مالداری ہی کو سببِ استحقاق قرار دیتے ہوئے وہ وقف مالدار کو دینے کے لیے خاص کیا جائے، حالانکہ فقیر بھی مالداری کے سوا اسبابِ استحقاق میں اس کے شریک ہو، بلکہ فقیر کا استحقاق زیادہ ہو تو اس شرط کا اللہ کے ہاں ناپسندیدہ ہونا ہر دین وملت میں بالضرورۃ معلوم ہے، اس لیے وقف میں ایسی شرط لگانا جائز نہیں۔

دوسری وجہ: وقف کافروں کے لیے دائمی ہو اور اس میں انتقالِ وراثت سے روک دیا جائے، اگر اس میں کوئی راجح مفاد ہو تو صحیح ہے، ورنہ وقف کرنے والے کو اس سے روک دیا جائے، کیوں کہ اس نے مال کو وراثت کے حق داروں سے روک رکھا ہے، یہ اس کا اعتراض ہے جس کا کہنا ہے کہ اللہ کے فرائض سے روکے رکھنا جائز نہیں، لیکن یہ قول مصلحتِ راجحہ کی بنا پر متروک ہے۔ اگر راجح مصلحت نہ ہو، بلکہ مال کو ویسے ہی روک کر رکھا گیا ہو اور وارث تمام وارثان کو اس سے فائدہ اٹھانے سے روک دے اور خود بھی اس سے فائدہ نہ اٹھا رہا ہو تو بلاشبہہ اس کو جاری اور نافذ کرنا جائز نہیں۔

پھر یہ متنازع مسئلہ اس وقف سے متعلق ہے جو مالی تونگری جیسی مباح دنیوی صفات کے لیے جاری کیا گیا ہو۔ رہا وہ وقف جو قرآن، حدیث، فقہ، نماز، اذان، امامت اور جہاد وغیرہ جیسے دینی اعمال کے لیے خاص کیا جائے، اس میں بحث وہ دوسری اصل ہے، اس میں علما کا کوئی اختلاف منقول نہیں کہ وقف صرف ان اعمال کے لیے خاص کیا جانا چاہیے جو اللہ نے مشروع قرار دیے اور پسند کیے ہیں۔ مگر جو انسان ایسا عمل نکالتا ہے جو اللہ کی شریعت میں نہیں اور جسے اللہ نے دین کا درجہ بھی نہیں دیا تو اس عمل سے انسان کو روکا جائے۔ ایسے عمل کے لیے مال وقف کرنا کسی طور جائز نہیں، بلکہ یہ تو یہود ونصاریٰ کے عقیدوں کے مطابق عبادتوں کے لیے وقف کرنے کی قبیل سے ہے جو تبدیل شدہ یا منسوخ دین ہے، اس لیے ہم نے وقف میں اس بات کو ایک اصولی بات قرار دیا ہے، کیوں کہ عبادات، دینی امور اور اللہ کے قریب کرنے والے اعمال اللہ اور رسول سے اخذ کیے جاتے ہیں، کوئی بھی انسان کسی بھی چیز کو شرعی دلیل کے بغیر عبادت یا قربت قرار نہیں دے سکتا، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا لَمْ يَاْذَنْۢ بِهِ اللّٰهُ ﴾ [الشوریٰ: ۲۱]

''یا ان کے لیے کچھ ایسے شریک ہیں جنھوں نے ان کے لیے دین کا وہ طریقہ مقرر کیا ہے جس کی اللہ نے اجازت نہیں دی۔''

نیز فرمایا:

﴿ وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ﴾ [الأنعام: ١٥٣]

''اور یہ کہ بے شک یہی میرا راستہ ہے سیدھا، پس اس پر چلو اور دوسرے راستوں پر نہ چلو کہ وہ تمھیں اس کے راستے سے جدا کر دیں گے۔''

مزید فرمایا:

﴿ الٓمّٓصٓ ۝ كِتٰبٌ اُنْزِلَ اِلَيْكَ فَلَا يَكُنْ فِيْ صَدْرِكَ حَرَجٌ مِّنْهُ لِتُنْذِرَ بِهٖ وَذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ۝ اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ۗ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ﴾ [الأعراف: ١۔٣]

''الٓمّٓصٓ۔ ایک کتاب ہے جو تیری طرف نازل کی گئی ہے، تو تیرے سینے میں اس سے کوئی تنگی نہ ہو، تاکہ تو اس کے ساتھ ڈرائے اور ایمان والوں کے لیے سراسر نصیحت ہے۔ اس کے پیچھے چلو جو تمھاری طرف تمھارے رب کی جانب سے نازل کیا گیا اور اس کے سوا اور دوستوں کے پیچھے مت چلو۔ بہت کم تم نصیحت قبول کرتے ہو۔''

کتاب اللہ میں اس مفہوم کی آیات بے شمار ہیں جن میں اللہ اپنی اور اپنے رسول کی فرمانبرداری اور اپنی کتاب کی پیروی کا حکم دیتے ہیں اور ہر اس کی اتباع سے منع کرتے ہیں جو کتاب وسنت سے خارج ہے، تمام بدعات اسی حکم میں ہیں۔ بدعتِ شرعیہ یعنی شریعت میں مذموم، وہ ہے جسے اللہ نے دین وشریعت کا درجہ نہیں دیا، یعنی وہ اللہ اور اس کے رسول کے حکم اور اطاعت میں داخل نہیں، اگر وہ اس میں داخل ہو، پھر وہ شریعت سے ہوگی، بدعتِ شرعیہ سے نہیں، چاہے رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد اس پر عمل ہوا ہو، جیسے: آپ ﷺ کی وفات کے بعد یہود ونصاریٰ کو جزیرۂ عرب نے نکال دیا گیا تھا۔ قرآن کریم کو مصحف کی شکل میں جمع کیا گیا اور رمضان میں قیامِ رمضان یعنی نمازِ تراویح کے لیے امامت و جماعت کا اہتمام کیا گیا وغیرہ وغیرہ۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ جنھوں نے یہ کام کیا، گو انھوں نے اس کو بدعت کا نام دیا، لیکن یہ لفظ بدعت کا لغوی اور لفظی استعمال تھا، کیوں کہ لغت میں بدعت ہر اس کام کو کہا جاتا ہے جس کو ایسے طریقے سے کیا جائے جس کی کوئی سابقہ مثال نہ ہو، اس معنی میں انھوں نے اس کو بدعت نہیں کہا تھا جو معنی شریعت نے مقرر کیا ہے اور جس سے منع کیا ہے اس لیے ان کا یہ لفظ اور عمل اس مفہوم میں داخل نہیں جو حدیثِ جابر رضی اللہ عنہ میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنے خطبے میں کہا کرتے تھے:

« إِنَّ أَصْدَقَ الْكَلَامِ كَلَامُ اللّٰهِ، وَخَيْرَ الْهَدْيِ هَدْيُ مُحَمَّدٍ، وَشَرَّ الْأُمُورِ مُحْدَثَاتُهَا، وَكُلَّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ » (رواہ مسلم)[1]

رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان: «وَكُلَّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ» ''ہر بدعت گمراہی ہے۔'' حق اور سچ ہے۔

اسی طرح سنن میں حضرت عرباض بن ساریہ سے مروی ہے کہ ہمیں رسول اللہ ﷺ نے ایک انتہائی موثر وعظ کیا۔ آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور دل ڈر گئے۔ ہم نے کہا: اے اللہ کے رسول! یوں لگتا ہے جیسے یہ الوداعی وعظ ہو، آپ ہم سے کیا عہد لیتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''میں تمھیں اللہ سے ڈرنے کی وصیت کرتا ہوں، سمع و طاعت اختیار کیے رکھنا، چاہے وہ (تمھارا امیر) کوئی حبشی غلام ہی ہو۔ میرے بعد تم میں سے جو زندہ رہے گا وہ بہت سا اختلاف دیکھے گا، پس تم میرے بعد میری اور میرے خلفا کی سنت تھام کر رکھنا اور اسے مضبوطی سے پکڑ کر رکھنا اور محدثات (نئے نئے امور) سے بچنا، یقیناً ہر بدعت ضلالت (گمراہی) ہے۔''[2]

ایک روایت میں ہے: «فَإِنَّ كُلَّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ، وَكُلَّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ»[3] ''ہر نئی چیز بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔'' ایک روایت میں ہے: «وَكُلُّ ضَلَالَةٍ فِي النَّارِ»[4] ''اور ہر گمراہی آگ میں جائے گی۔''

اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کو اپنی اور اپنے خلفا کی سنت کی پیروی کا حکم دیا ہے اور بتایا ہے کہ محدثات یعنی بدعات جن سے آپ نے منع کیا ہے، وہ ایسے امور ہیں جو آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے خلفا کی سنت کے خلاف ہیں۔ بنا بریں تراویح وغیرہ سے متعلق اگر آپ ﷺ کے ارشادات اور افعال کی دلالت نہ بھی معلوم ہوتی تو یہ کم از کم خلفا کی سنت تو ہے، اس لیے یہ ان شرعی بدعات میں داخل نہیں، جن کو رسول اللہ ﷺ نے بدعت کا نام دیا ہے اور ان سے منع کیا ہے۔

قصہ مختصر! اس مسئلے میں علما کے ہاں کوئی اختلاف نہیں کہ جو غیر شرعی نماز، روزے، تلاوت یا جہاد کے لیے وقف جاری کرتا ہے، اس کا وقف درست نہیں، بلکہ اس پر عمل کرنے اور اس میں مال صرف کرنے سے منع کیا جائے۔ مباحات سے متعلق علما کا اختلاف اس جیسے مسئلے میں کارگر نہیں، کیوں کہ کسی چیز کو بطور عبادت اختیار کرنا اور عبادت

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٨٦٧)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٦٠٧) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٦٧٦) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٢، ٤٤) شیخ البانی رحمہ اللہ نے اسے صحیح کہا ہے۔

[3] مسند أحمد (٤/ ١٢٦، ١٢٧) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٦٠٧) شیخ البانی رحمہ اللہ نے اسے صحیح کہا ہے۔

[4] سنن النسائي، رقم الحديث (١٥٧٨)

ہونے کی حیثیت سے اس کا مال دو حالتوں سے خالی نہیں ہو گا یا شریعت نے اس کا حکم دیا ہو گا یا اس سے منع کیا ہو گا، اگر حکم دیا ہو گا تو پھر وہ واجب ہو گا یا مستحب، اس کے عبادت ہونے کا عقیدہ رکھنا عبادت کے لیے اس میں رغبت رکھنا اور اس کے ساتھ محبت رکھتے ہوئے اس پر عمل کرنا ثابت ہو گا، اگر وہ ایسا کام ہو جسے اللہ اور رسول نے پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھا تو وہ واجب ہو گا نہ مستحب ہی اور کسی کے لیے واجب یا مستحب ہونے اور نیکی و فرمانبرداری ہونے کا عقیدہ رکھنا بھی جائز نہیں ہو گا، اس کو بطور دین اختیار کرنا اور عبادت سمجھ کر اس میں رغبت رکھنا بھی درست نہ ہو گا۔ یہ ایک عظیم الشان دینی اصول ہے کہ اس مباح میں، جس کو مباح ہونے کی حیثیت سے کیا جاتا ہے اور اس میں جس کو دین و عبادت اور نیکی و طاعت سمجھتے ہوئے کیا جاتا ہے، فرق کیا جائے جو شخص غیر ثابت شدہ امر کو، جو نہ دین ہو نہ نیکی، نہ طاعت ہو نہ قربت، دین، طاعت اور نیکی بناتا ہے، اس کا یہ عمل بالاتفاق حرام ہے۔

تاہم بعض اوقات علما بعض امور میں یہ اختلاف رکھتے ہیں کہ کیا وہ قربت اور عبادات کے باب سے تعلق رکھتے ہیں یا نہیں، خواہ وہ قولی اعتقادات سے تعلق رکھتے ہوں یا عملی ارادات سے، حتی کہ کچھ علما اگر کسی ایک چیز کو واجب کہتے ہیں تو دوسرے اسی کو حرام کہتے ہیں، جس طرح کچھ مرتد کو قتل کرنا واجب کہتے ہیں اور دوسرے اس کو حرام کہتے ہیں۔ کچھ کے نزدیک اگر کوئی نشے کی حالت میں بیوی کو طلاق دے دے تو ان کے درمیان علاحدگی واجب اور دوسروں کے نزدیک حرام، کسی کے نزدیک امام کے پیچھے فاتحہ پڑھنا واجب ہے تو کسی کے نزدیک مکروہ یا مطلقاً مکروہ، یا اس وقت جب امام بلند آواز سے قراءت کرے، یہ اختلافی مسائل ہیں جو اعتقادی اور عملی لحاظ سے بھی اختلافی ہیں تو ایسے اعمال میں مال خرچ کرنا بھی اختلافی اجتہادی مسائل سے تعلق رکھتا ہے۔

مگر ہر وہ عمل جس کے بدعت اور ممنوع ہونے کا علم مسلمان کو ہو اس کا علم رکھنے والے کے لیے اس کے لیے وقف کرنا بالاتفاق ناجائز ہے، اگرچہ کئی ناواقفانِ شریعت ایسے اعمال کی شرط لگاتے ہیں، لیکن یہ درست نہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہے: "ردّوا الجهالات إلى السنة" ''تمام قسم کی جہالتوں اور لاعلمیوں کو سنت کی طرف لوٹاؤ۔'' کیوں کہ صحیح بخاری سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے ایسا عمل کیا جس پر ہمارا حکم نہیں، وہ مردود ہے۔''[1] اسی بنیاد پر علما کا اس مسئلے پر اتفاق ہے کہ جب عادل حاکم کا کوئی فیصلہ نص یا اجماع کے خلاف ہو جو اس کے علم میں نہ ہو تو وہ فیصلہ کالعدم ہو گا، اگر عادل حکمران کا فیصلہ بھی نص اور اجماع کے خلاف ہو تو کوئی حیثیت نہیں رکھتا تو ایسے شخص کا وقف کیا حیثیت رکھے گا جو شریعت کے حکم سے لاعلم ہے؟!

ایسی شرطیں جو شریعت کے مخالف ہوں، ان کی کوئی حیثیت نہیں۔ اللہ کے ہر امر و نہی پر عمل استطاعت کے

[1] صحيح البخاري (٧٥٣/٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧١٨)

مطابق واجب ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ ﴾ [التغابن: ١٦] ''سو اللہ سے ڈرو جتنی طاقت رکھو۔''

اور فرمانِ حبیب ﷺ ہے:

«وَإِذَا أَمَرْتُكُمْ بِأَمْرٍ فَأْتُوا مِنْهُ مَا اسْتَطَعْتُمْ»[1]

''جب میں تمھیں کسی کام کا حکم دوں تو اپنی استطاعت کے مطابق اس کو بجا لاؤ۔''

یہ جامع اصول اور قواعد ہیں جن پر ان جیسے مسائل کی بنیاد ہے۔ ہم نے صفحات کی گنجایش کے مطابق یہاں جامع نکات درج کیے ہیں جن سے فقہ میں دلچسپی رکھنے والا بخوبی آگاہ ہے۔

اب اس سوال کی صورت میں حکم کی علت کی تحقیق اور وجود پذیر ہونے پر غور کیا جائے، جن شرطوں کا فاسد ہونا واضح ہو جائے ان کو کالعدم کر دیا جائے اور جو کتاب و سنت کے مطابق ہوں ان پر عمل کیا جائے، جن میں اشتباہ یا اختلاف ہو ان کا حکم وہی ہوگا جو ان کے نظائر اور امثال کا ہو۔

ان باطل شرطوں میں سے کچھ ایسی ہیں جن کو تبدیل کرنے کے لیے ہمت، قوت اور اقتدار کی ضرورت ہے، جو علم اور دین سے موید ہو، ورنہ اگر کوئی شخص محض کسی دنیاوی فائدے کے لیے یا دنیاوی نقصان سے بچنے کے لیے اور اپنی خواہش کو بنیاد بنا کر اس کام کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا رنگ دے کر کرنا شروع کر دے تو شاید و باید ہی کامیاب ہو، اگر وہ مظلوم ہو تو کسی ایسے شخص سے داد رسی چاہے جو اس کا اہل ہو اور اس کی قدرت رکھتا ہو یا وہ اسی کام کے لیے خاص کردہ حکومتی محکمہ ہو۔

یہ مسئلہ کہ کسی خاص جگہ پر ہمیشہ سونا کیسا ہے؟ یاد رہے یہ نہ تو کوئی نیکی ہے اور نہ طاعت ہی اور اس میں علما کا کوئی اختلاف نہیں، البتہ بعض اوقات جب جگہ خاص کرنے میں کوئی شرعی مصلحت اور مقصد ہو تب یہ نیکی بن جاتا ہے جیسے رمضان کی راتیں مسجد میں گزارنا، رباط اور جہاد کے مقصد کے لیے سرحدی علاقے میں رات گزارنا، اللہ کی راہ میں پہرے داری کرتے وقت رات گزارنا، کسی عالم یا بزرگ سے علمی استفادہ کرنے کے لیے اس کے پاس ٹھہرنا وغیرہ، لیکن یہ کہ کوئی مسلمان کسی دینی مصلحت و مفاد کے بغیر ہمیشہ رات کا ایک حصہ کسی مخصوص جگہ گزارنے کو اپنے لیے لازم کرے تو اس کا دین سے کوئی تعلق نہیں، بلکہ اگر عارضی طور پر رات گزارنا ہو اور وہاں یہ کام ثابت بھی ہوں تب بھی یہ دینی کام نہیں۔ جو شخص وقف میں ایسی شرط عائد کرتا ہے اور اس کے لیے مال وقف کرتا ہے تو اس شرط کے باطل و ساقط ہونے میں کوئی شک نہیں، بلکہ نمازِ پنجگانہ ادا کرنے یا تلاوت کرنے کے لیے کسی جگہ کو خاص کر لینا یا غیر

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٨٥٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٣٣٧)

متعین کا ایصالِ ثواب بالاتفاق ثابت و مشروع نہیں، بلکہ اگر کوئی شخص مسجدِ حرام، مسجدِ نبوی اور مسجدِ اقصیٰ کے علاوہ کسی خاص مسجد میں نماز پڑھنے، اعتکاف کرنے یا تلاوت کرنے کی نذر مانے تو وہ متعین نہیں ہوگی۔ وہ کسی بھی مسجد میں یہ عبادات کر سکتا ہے، لیکن تعیین کے چھوٹ جانے کی وجہ سے اس پر کفارہ واجب ہے یا نہیں؟ اس میں علما کے دو اقوال ہیں۔ اسی طرح نماز، تلاوت اور روزے جیسی بدنی عبادات کے ایصالِ ثواب میں علما کا اختلاف ہے اور صحیح تر قول کے مطابق میت کو ان کا ثواب پہنچتا ہے، لیکن یہاں بھی کسی عالم نے یہ نہیں کہا کہ اگر فلاں جگہ ان اعمال کو کیا جائے تو وہاں زیادہ فضیلت ہے۔ اسی طرح ائمہ متبوعین میں سے کسی نے بھی یہ نہیں کہا کہ فلاں قبر کی نسبت فلاں کے پاس نماز پڑھنا یا قرآن پڑھنا افضل ہے، بلکہ قبر کے پاس قرآن خوانی کی کراہت ایک اختلافی مسئلہ ہے۔ امام ابو حنیفہ اور احمد وغیرہما رحمہما اللہ کے کچھ اصحاب نے اس کی رخصت بھی دی ہے، البتہ امام شافعی سے اس مسئلے میں کوئی نص ہمارے علم میں نہیں۔ یہ تو کسی عالم نے نہیں کہا کہ قبر کے پاس قرآن خوانی افضل ہے۔

جس نے یہ بات کہی ہے کہ قبر کے پاس قرآن خوانی کو میت سنتی ہے، اگر دور سے پڑھا جائے تو میت سننے کے شرف سے محروم رہتی ہے۔ اس کی یہ بات بدعت اور اجماعِ علما کے خلاف ہے، کیوں کہ مردہ مرنے کے بعد اپنے پڑھنے سننے جیسے اعمال سے کوئی فائدہ نہیں اٹھاتا، اس پر سب کا اتفاق ہے۔ وہ تو صرف اپنی زندگی میں کیے گئے اعمال کے اثرات سے مستفید ہوتا ہے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: ''جب ابن آدم فوت ہو جاتا ہے تو تین اعمال، یعنی صدقہ جاریہ، نفع بخش علم یا دعا کرنے والی نیک اولاد کے سوا اس کے تمام اعمال منقطع ہو جاتے ہیں۔''[1]

اسی طرح وہ صدقے اور ہبہ جیسی ان مالی عبادات سے بھی فائدہ اٹھاتا ہے جن کا ثواب اس کو بخشا جاتا ہے۔ اس پر سب فقہا کا اتفاق ہے، مگر صحیح تر قول کے مطابق بدنی عبادات کا ثواب بھی اس کو پہنچتا ہے۔

مسلمانوں کو کسی خاص قطعہ زمین پر عمل کرنے اور صدقہ کرنے کا پابند کرنا باطل ہے جس طرح عیسائی گرجوں کے ساتھ خاص کرتے ہیں۔ بہر حال ان مشروط اعمال پر نائب بنانا جائز ہے۔ واللہ أعلم[2]

فوت ہونے کے بعد وقف کی حیثیت اور اس کے مصارف میں تبدیلی کا اختیار

سوال ایک شخص نے مسجد بنائی اور موذن اور نامزد نگران کے لیے ایک دکان وقف کر دی۔ اس نے اپنی زندگی میں اس دکان سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ کیا اس کی وفات کے بعد اس سے نفع کمانا جائز ہے؟

---

① صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٦٣١)

② مجموع الفتاویٰ (٣١/٢٦۔٤٢)

جواب الحمد للّٰہ رب العالمین. جب کوئی انسان کوئی چیز وقف کرتا ہے اور وہ وقف اس کے ہاتھ سے نہیں نکلتا تو اس سے متعلق اہلِ علم کے دو مشہور اقوال ہیں:

1. امام مالک، ابوحنیفہ، محمد بن حسن شیبانی اور ایک روایت میں امام احمد کے مذہب میں وہ وقف باطل ہو جاتا ہے۔
2. امام شافعی، ابو یوسف اور دوسری روایت میں امام احمد کے مذہب میں وہ لازم ہی رہتا ہے۔[1]

صدقے اور تحفے میں سے افضل

سوال صدقہ دینا افضل ہے یا تحفہ دینا؟

جواب الحمد للّٰہ. جو چیز کسی خاص شخص کو قصداً اور اس سے کوئی مخصوص غرض وضرورت طلب کیے بغیر خالص اللہ کی رضا اور عبادت کے لیے دی جائے، اسے صدقہ کہا جاتا ہے، لیکن یہ صدقہ کے مستحق افراد کو دی جاتی ہے۔ تحفے کا مقصد محبت، دوستی یا کوئی ضرورت طلب کرنے کی غرض سے کسی خاص شخص کی تکریم ہوتا ہے، اس لیے نبی اکرم ﷺ تحفہ قبول کرتے اور بدلے میں تحفہ دیتے، تا کہ آپ پر کسی کا احسان نہ رہے۔ آپ ﷺ لوگوں کے گناہوں کی میل کچیل صدقہ نہ کھاتے۔

بنا بریں صدقہ افضل ہے، مگر یہ کہ تحفے میں کوئی ایسا مفہوم پنہاں ہو جو اس کو صدقے سے افضل کر دے، مثلاً: رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ مبارکہ میں آپ ﷺ سے اظہارِ محبت کے لیے آپ ﷺ کو تحفہ دینا، اسی طرح کسی عزیز اور دینی بھائی کو صلہ رحمی کے جذبے سے تحفہ دینا، یہ صدقے سے افضل ہوسکتا ہے۔ واللّٰہ أعلم[2]

ہبہ واپس لینے کا حکم

سوال کیا ہبہ واپس لینا جائز ہے؟

جواب الحمد للّٰہ. سنن میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"ہبہ کرنے والے کے لیے اسے واپس لینا جائز نہیں، سوائے باپ کے جو وہ اپنے بیٹے کو دیتا ہے۔"

یہ امام شافعی، مالک اور احمد کا مذہب ہے، لیکن اگر ہبہ سے مقصود معاوضہ ہو، یعنی کوئی کسی کو اس غرض سے عطیہ دے کہ وہ اس کو اس کے عوض میں کچھ دے یا اس کا کوئی کام کرے تو اگر وہ لفظاً اور عرفاً شرط پوری نہیں کرتا تو اس سے ہبہ واپس لینا یا اس کے برابر کوئی چیز لینا جائز ہے۔ واللّٰہ أعلم[3]

---

1. مجموع الفتاویٰ (۳۱/۶)
2. مجموع الفتاویٰ (۳۱/ ۲۶۹)
3. مجموع الفتاویٰ (۳۱/ ۲۸۳)

مصارفِ وقف میں تصرف کا اختیار

سوال کچھ لوگوں کے ہاتھ میں ڈیڑھ سو سال پرانا وقف (ٹرسٹ) ہے جو ان کے دادا نے شیث علیہ السلام کی طرف منسوب درگاہ کے لیے خاص کیا تھا اور اس کی آمدن اپنی اولاد اور فقراء کے لیے مختص کی تھی اور اس کا نگران بھی اُنھی کو بنایا تھا۔ یہ وقف پرانے زمانے سے اسی طرح چلا آ رہا ہے، بلکہ ان کے پاس نور الدین اور صلاح الدین کے دور کے کاغذات اور تصدیق نامے بھی ہیں۔ اب اس وقف کے نگران اس کا نصف غلہ درگاہ کی عمارت کے لیے خاص کرنا چاہتے ہیں اور باقی نصف اس کی اولاد ہی کے لیے چھوڑنا چاہتے ہیں، کیا ایسا کرنا جائز ہے؟

جواب یہ نگران کے لیے جائز نہیں اور نہ ان کو ایسا اختیار دینا ہی جائز ہے جس کے مطابق وہ اس وقف کو اس کے غیر قانونی مصارف میں استعمال کریں اور وقف کرنے والے کے ورثا اور فقرا کو اس سے محروم کریں جو وقف کرنے والے کی شرط میں داخل ہیں، بلکہ اس کی اولاد اور فقرا زیادہ حق رکھتے ہیں، کیوں کہ وقف کرنے والے نے درگاہ کے ساتھ ان کو دینے کی شرط بھی رکھی ہے، اس لیے ان کو اس سے محروم نہیں کیا جا سکتا، بلکہ اگر وقف صرف درگاہ کے لیے مختص ہوتا، تب بھی بچ جانے والا مال ضرورت مند ہونے کی صورت میں دوسروں کی نسبت ان کو دینا زیادہ بہتر ہوتا، بنابریں جس نے وقف کی کچھ آمدن درگاہ کے لیے خاص کی اور باقی ایسے مصارف میں جو شرط میں مذکور نہیں، بلکہ شرط میں مذکور اولاد کو محروم رکھا وہ اللہ اور رسول کا نافرمان، وقف کرنے والے کی اولاد کو وقف سے محروم رکھ کر حدود سے تجاوز کرنے والا اور وقف کو جائز کہنے والے ائمہ اسلام کے اتفاق کے ساتھ ظالم ہے، یہ صحابہ اور تابعین کے زمانہ قدیم سے آ رہا ہے۔

قبروں پر درگاہیں قائم کرنے کی ممانعت:

البتہ قبروں پر درگاہیں بنانا اور اس کے لیے املاک وغیرہ وقف کرنا بدعت ہے، خلفائے راشدین، صحابہ کرام، تابعین اور تبع تابعین کے زمانوں میں اس کا وجود نہیں ملتا۔

سب ائمہ اسلام کا اتفاق ہے کہ قبروں پر مشاہد اور دربار بنانا غیر مشروع ہے اور وقف وغیرہ کسی صورت میں اس میں اعانت نہیں کرنی چاہیے۔ ان کی نذر ماننا جائز ہے نہ وہاں اعتکاف کرنا درست ہے، وہاں نماز پڑھنے اور دعا کرنے کی کوئی فضیلت نہیں۔ اس کا اسلام کے خلاف ہونا دین میں بالضرورت معلوم ہے اور اس پر سب ائمہ کا اتفاق ہے، اگر کوئی شخص اس کام سے باز نہیں آتا تو اس سے توبہ کروائی جائے، بلکہ معتبر ائمہ کرام نے قبروں پر مساجد بنانے اور ان جیسے دربار بنانے کو کھلے لفظوں میں حرام کہا ہے، کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ یہود و نصاریٰ پر لعنت

کرے! انھوں نے اپنے انبیا کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا۔'' آپ ﷺ نے ان کے فعل سے خبردار کیا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: اگر یہ خدشہ نہ ہوتا تو آپ کی قبر کو ظاہر کیا جاتا، لیکن آپ نے اس کو مسجد بنانا ناپسند کیا (بخاری و مسلم)۔[1] آپ ﷺ نے اپنی وفات سے پانچ دن قبل فرمایا: ''تم سے پہلے لوگ قبروں کو مساجد بناتے تھے، خبردار! تم قبروں کو مساجد (سجدہ گاہ) نہ بنانا، میں تم کو اس سے منع کرتا ہوں۔''[2] سنن میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''اللہ ان عورتوں پر لعنت کرے جو کثرت سے قبروں کی زیارت کرتی ہیں اور وہاں مساجد بنانے اور چراغ جلانے والوں پر بھی۔''[3] رسول اللہ ﷺ نے تو قبر پر مسجد بنانے اور وہاں چراغ اور موم بتیاں جلانے اور قندیلیں روشن کرنے والے پر لعنت کی ہے تو ایسے کام میں مال خرچ اور وقف کرنا کس طرح جائز ہوسکتا ہے جس سے رسول اللہ ﷺ نے منع کیا ہے اور پھر ایسے لوگوں پر خرچ کرنا چھوڑ دیا جائے جن کا وقف کرنے والے نے تذکرہ کیا ہے اور وہ حق بھی رکھتے ہیں، ہاں اگر یہ قبر سے خالی مسجد ہوتی تو ایسی صورت میں وہ دونوں وقف کرنے والے کی شرط میں داخل ہوتے۔ جو مال دربار کی تعمیر میں صرف کیا جائے گا وہ خدا کی نافرمانی میں متصور ہوگا، جو اس کی اولاد کا حق ہے وہ ان میں تقسیم کرنا ضروری ہے، اگر مسجد قبر سے علاحدہ ہو تو وہ مسلمانوں کی عام مساجد کا سا حکم رکھتی ہے، لیکن اس کو کسی دوسری مسجد پر کوئی فضیلت نہیں۔ واللہ أعلم[4]

فرمانبردار اولاد کو نوازنا اور نافرمان کو محروم رکھنا

سوال ایک شخص نے اپنے فرماں بردار بیٹے کو کچھ دیا اور نافرمان کو محروم رکھا اور جس کو نہ دیا، اس نے قسم کھائی کہ اگر میرے باپ نے میرے ساتھ ہمدردی نہ کی تو میں اس کے ساتھ بات کروں تو میری بیوی کو طلاق ہو، کیا اس کے لیے اس سے نکلنے کی کوئی راہ ہے؟ کیا طلاق کی قسم عام قسم کی طرح ہی نافذ ہوتی ہے؟

جواب آدمی کو اپنی اولاد کے درمیان عدل کرنا چاہیے، یہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا حکم ہے۔ صحیحین میں ہے کہ بشیر بن سعد نے اپنے بیٹے نعمان کو کوئی تحفہ دیا اور اس پر رسول اللہ ﷺ کو گواہ بنانے کے لیے آپ ﷺ کے پاس حاضر ہوا، آپ ﷺ نے اس سے کہا: ''اللہ سے ڈرو اور اپنی اولاد کے درمیان عدل کرو'' پھر کہا: ''مجھے

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٢٦٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٢٩)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٣٢)

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٢٣٦) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٢٠) سنن النسائي، رقم الحديث (٢٠٤٣) السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٢٢٥)

[4] مجموع الفتاویٰ (٣١/١٠-١٢)

اس پر گواہ نہ بنا، میں ظلم پر گواہ نہیں بنتا۔'' اور اس سے کہا: اسے واپس لے لے، تو اس نے واپس لے لیا۔ ①

تاہم جب کوئی انسان کسی شرعی سبب کی وجہ سے کسی ایک کو خاص کرے، مثلاً: ایک محتاج ہو اور اللہ کا فرماں بردار بھی ہو اور دوسرا مالدار ہو اور نافرمان ہو اور مال کو نافرمانی کے لیے استعمال کرے تو ایسی صورت میں اگر وہ اس کو دیتا ہے جس کو دینے کا حکم اللہ نے دیا ہے اور اس کو نہیں دیتا جس کو دینے سے اللہ نے منع کیا ہے تو وہ اچھا کرتا ہے۔ واللہ أعلم

یہ جس نے قسم کھائی ہے کہ اپنے باپ سے بات نہیں کرے گا تو معلوم ہونا چاہیے کہ آدمی ایسی جو قسم بھی کھائے جو مسلمان کھاتے ہیں اور اسے پورا نہ کرے تو اس پر قسم توڑنے کا کفارہ لاگو ہوتا ہے اور انسان جو قسم کھائے پھر سمجھے اس پر اصرار کی نسبت اسے توڑ دینا ہی بہتر ہے تو وہ اس کو توڑ کر اس کا کفارہ دے۔ کتاب وسنت سے یہی ثابت ہوتا ہے، خواہ وہ اللہ کے نام کی قسم ہو یا نذر کی یا طلاق کی یا غلام آزاد کرنے کی، یا ظہار کی یا حرام کی، مثلاً کہے: اگر میں نے ایسا کیا تو میرا مال صدقہ میں چلا جائے گا، یا مجھ پر دس حج لازم آئیں گے، یا ایک سال کے روزے ہوں گے، یا میری عورتوں کو طلاق ہو جائے گی، یا میرے غلام آزاد ہو جائیں گے وغیرہ۔ وہ ساری قسمیں جو اہلِ اسلام کھاتے ہیں ان میں کفارہ کفایت کر جاتا ہے۔

دوسری طرف وہ قسمیں ہیں جو اہلِ ایمان کی نہیں، مثلاً: کعبہ کی قسم، پیروں کی قسم، باپ دادا کی قسم، بادشاہوں کی قسم، یہ سب حرام قسمیں ہیں جو منعقد اور نافذ نہیں ہوتیں اور ان کی کوئی حرمت نہیں، اللہ اور اس کے رسول کے دین وشریعت میں دو ہی قسمیں ہیں: ایک وہ جو منعقد ہو جاتی ہیں اور ان کو توڑنے کی صورت میں کفارہ کفایت کر جاتا ہے اور دوسری وہ جو منعقد نہیں ہوتیں، ان کو توڑنے میں کچھ لازم نہیں آتا۔ جس عالم نے غیر کفارہ شدہ منعقد ہونے والی قسم ثابت کی ہے، اس کا یہ قول ضعیف اور کتاب وسنت، اقوالِ صحابہ اور قیاسِ جلی کے خلاف ہے۔ واللہ أعلم ②

غیر مخصوص افراد کے لیے وقف سے کچھ مخصوص کرنا

سوال کچھ مساجد کے اوقاف ہیں جہاں مسجد کے نگران، امام اور موذن رہائش پذیر ہیں، کیا وہاں کا قاضی ان اوقاف میں سے کچھ اپنے لیے بھی مختص کر سکتا ہے؟

جواب ان اموال کو ان کے شرعی مصارف میں خرچ کرنا ہی ضروری ہے۔ ان اوقاف کو مساجد کے اماموں، موذنوں

① صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٤٤٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٢٣)

② مجموع الفتاویٰ (٣١/٢٩٤)

اور نگرانوں میں صرف کیا جائے۔ اسی طرح مساجد کی چٹائیوں، روشنی کے انتظام اور دیگر ضروریات میں بقدر کفایت خرچ کیا جائے۔ جو بچ جائے اس کو دیگر مساجد کی ضروریات میں استعمال کر لیا جائے اور دیگر ضروریات جیسے کہ علما کے ایک قول کے مطابق قاضیوں کی تنخواہ وغیرہ میں استعمال کر لیا جائے، لیکن اس کو صرف قاضیوں کے لیے خاص کر دینا اور مساجد کی ضروریات میں استعمال کرنے سے روک دینا کسی طور پر جائز نہیں۔ واللہ أعلم [1]

بیماری میں وقف کی وصیت اور قرض کی صورت میں اس سے ادائی

سوال ایک شخص نے اپنی بیماری کے عالم میں کہا: اگر میں مر گیا تو میرا فلاں گھر فلاں مسجد کے لیے وقف ہو گا، پھر وہ صحت مند ہو گیا۔ اس کے بعد مقروض ہو گیا۔ کیا یہ وقف صحیح اور لازم ہو گا یا نہیں؟

جواب وہ اس کو بیچ کر قرض اتار سکتا ہے، گو معلق کرنا علما کے ایک قول کے مطابق درست ہے، اور یہ تدبیر سے زیادہ بلیغ اور کارگر نہیں۔ رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے قرض میں مدبر غلام کی بیع کی تھی۔ واللہ أعلم [2]

وقف کا مصرف تبدیل کرنا

سوال ایک شخص نے اپنے مرنے کے بعد رسول اللہ ﷺ کی قبر مبارک پر روشنی رکھنے کے لیے شمع اور تیل کے لیے وقف مقرر کرنے کی وصیت کی، پھر اس نے اس وقف کو بدل کر قاہرہ کے فقرا اور مسکینوں کے لیے خاص کرنا چاہا، کیا ایسا کرنا جائز ہے؟ اگر یہ جائز نہیں تو کیا اس کو مدینہ طیبہ کے اردگرد رہنے والے فقرا کے لیے خاص کیا جا سکتا ہے؟

جواب انسان اپنے مرنے کے بعد جس کام کی وصیت کرتا ہے، اس میں بالاتفاق تبدیلی یا رجوع کا حق رکھتا ہے، چاہے اس نے اس پر گواہ مقرر کر کے اس کو مہر بند کر دیا ہو، خواہ وہ وقف کی وصیت ہو یا غلام آزاد کرنے کی یا اس کے علاوہ کسی کام کی، مدت کے ساتھ معلق کیے جانے والے وقف اور غلام آزاد کرنے میں دو مشہور اقوال ہیں۔

قبر پر شمع جلانے کے لیے تیل اور شمع کا وقف بالاتفاق کوئی نیکی کا کام نہیں، بلکہ رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے، آپ ﷺ نے فرمایا:

«لَعَنَ اللّٰهُ زَوَّارَاتِ الْقُبُورِ وَالْمُتَّخِذِيْنَ عَلَيْهَا الْمَسَاجِدَ وَالسُّرُجَ» [3]

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۳۱/۷۰)

[2] مجموع الفتاویٰ (۳۱/۲۰۵)

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (۳۲۳٦) سنن الترمذي، رقم الحديث (۳۲۰) سنن النسائي، رقم الحديث (۲۰۴۳) السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (۲۲۵)

''کثرت کے ساتھ قبرستان کی زیارت کرنے والی عورتوں، وہاں مساجد بنانے اور چراغ جلانے والوں پر اللہ کی لعنت ہے۔''

البتہ نمازیوں کو روشنی فراہم کرنے کے لیے مسجدِ نبوی یا کسی بھی مسجد کو روشن کرنا اچھا عمل ہے، لیکن اگر مسجد میں روشنی کا بندوبست کافی ہو تو زیادہ کا کوئی فائدہ نہیں، اس لیے اس کو روشنی کے علاوہ کسی دوسرے کام میں صرف کر دیا جائے۔ واللہ أعلم

وقف کی پیداوار دوسری جگہ استعمال کرنا

سوال اگر وقف کا نفع اور پیداوار زائد ہو جائے اور وہاں اس کی ضرورت نہ رہے تو کیا کیا جائے؟

جواب اس کو اس ادارے سے ملتے جلتے کسی ادارے میں صرف کر دیا جائے، مثلاً: اگر کسی ایک مسجد کا وقف اس کی ضروریات سے زائد ہو جائے تو اس کو کسی دوسری مسجد کی ضروریات میں خرچ کر لیا جائے، کیوں کہ وقف کرنے والے کی غرض اس جنس پر وقف کرنا ہے اور یہ جنس ایک ہی ہے۔ فرض کریں اگر پہلی مسجد بے آباد ہو گئی ہے اور اس سے فائدہ نہیں اٹھایا جا رہا تو اس کی پیداوار کو کسی دوسری مسجد میں صرف کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح جب اس کی ضروریات سے کچھ بچ جائے اور یہ بچا ہوا اس میں استعمال نہ ہو سکتا ہو اور اس کو معطل اور ضائع کرنا بھی مناسب نہیں تو اس کو اس کی جنس میں صرف کر دینا زیادہ مناسب ہوگا۔ یہ وقف کرنے والے کے مقصود کو حاصل کرنے کا قریب ترین ذریعہ ہے۔ امام احمد سے مروی ہے، انھوں نے مکاتب (اپنی آزادی حاصل کرنے کے لیے کام کرنے والے غلام) کو دینے پر ابھارا، کچھ مال بچ گیا تو اس کو دو مکاتبوں پر خرچ کر دیا گیا۔[1]

کسی کے استحقاق میں رکاوٹ ڈالنے کی مذمت

سوال قاضی نے کسی نیک آدمی کے لیے زکات وصدقات میں سے کوئی رقم جاری کی، تاکہ وہ اسے اپنے اوپر اور اپنے پاس آنے والے غریبوں پر خرچ کر لے۔ اب کسی دوسرے شخص نے اس کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے اور بزورِ بازو اس پر غلبہ پانے کی کوشش کی، کیا ایسا کرنا جائز ہے؟

جواب صحیح بخاری میں مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«اَلْمُسْلِمُ أَخُو الْمُسْلِمِ، لَا يَحِلُّ لِلْمُسْلِمِ أَنْ يَّبِيْعَ عَلىٰ بَيْعِ أَخِيْهِ وَلَا يَسْتَامَ عَلىٰ سَوْمِ أَخِيْهِ، وَلَا تَسْأَلُ الْمَرْأَةُ طَلَاقَ أُخْتِهَا لِتَكْتَفِءَ مَا فِيْ صَحْفَتِهَا، فَإِنَّ لَهَا مَا قُدِّرَ لَهَا»[2]

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۲۰۶/۳۱)

[2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۲۰۳۳) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۵۱۵)

''مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، کسی مسلمان کے لیے اپنے بھائی کی بیع پر بیع اور اپنے بھائی کے سودے پر سودا کرنا حلال نہیں اور عورت اپنی بہن کی طلاق کا مطالبہ نہ کرے، تاکہ اس کا برتن اوندھا کر دے، اس کا اپنا نصیب ہے۔''

اگر رسولِ رحمت ﷺ نے عوض والے معاملات میں اس وقت تک ایک دوسرے کے سودے پر سودا اور منگنی پر منگنی کرنے سے منع کیا ہے، جب تک وہ اس کی ملکیت میں نہ چلا جائے تو کسی شخص کے لیے یہ کیونکر جائز ہو سکتا ہے کہ وہ اس شخص کے پاس آئے جس کے لیے ولی امر نے اس کے استحقاق اور ضرورت کی وجہ سے کچھ مال مقرر کیا ہے اور وہ اس سے چھیننے کے لیے اس کی راہ میں رکاوٹ ڈالے؟ یہ سخت حرام ہے۔ واللہ أعلم [1]

مسجد کی زمین کے درختوں کا استعمال

سوال ایک مسجد کے لیے ایک زمین وقف کی گئی جس میں درخت ہیں، ان پر پھل نہیں آتا، زمین بھی ان کی وجہ سے بے کاشت ہی پڑی ہے، ان درختوں کو کاٹ کر فروخت کر دیا جائے اور ان کی قیمت مسجد کی ضروریات میں صرف کر دی جائے، پھر زمین کو کاشت کر کے مفید بنا لیا جائے تو کیا یہ جائز ہے؟

جواب ہاں، اگر درخت اکھاڑنا اس طور زمین کے لیے فائدہ مند ہو کہ وہ قابلِ کاشت اور فائدہ مند ہو سکے تو ان کو اکھاڑ دیا جائے، مگر ان کو وہی کام کرنا چاہیے جو وقف کے لیے زیادہ کارآمد ہو۔ چنانچہ وہ کاٹ کر اس کام میں ان کی قیمت صرف کرے جو وقف کے لیے زیادہ کارآمد ہو، مثلاً مسجد یا وقف کی عمارت پر خرچ کر دیا جائے اگر اس کی ضرورت ہو تو۔ واللہ أعلم [2]

وقف یا نذر کی بہتر میں تبدیلی

سوال کوئی شخص کوئی چیز وقف کرتا یا نذر مانتا ہے، پھر دیکھتا ہے کہ کوئی دوسرا عمل اس سے زیادہ بہتر یا قابلِ توجہ ہے تو کیا وہ اس کو تبدیل کر سکتا ہے جس طرح قربانی کا جانور بدلا جا سکتا ہے؟

جواب منذور جس کی نذر مانی گئی ہو اور موقوف جسے وقف کیا گیا ہو، اس کو اس سے بہتر میں تبدیل کرنا جس طرح قربانی کا جانور تبدیل کر لیا جاتا ہے، اس کی دو انواع ہیں:

1. کسی ضرورت کی وجہ سے تبدیل کیا جائے، مثلاً: وہ وقف بے کار ہو جائے اور اس کو فروخت کر کے اس کی قیمت

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۳۱/۲۰۷)

[2] مجموع الفتاویٰ (۳۱/۲۰۸)

سے ایسی چیز خریدی جائے جو اس کے قائم مقام بن سکتی ہو، مثلاً لڑائی کے لیے محبوس گھوڑا اگر لڑائی میں اس سے فائدہ اٹھایا جانا ناممکن ہو تو اس کو بیچ کر ایسی چیز خریدی جا سکتی ہے جو اس کے قائم مقام ہو، کوئی مسجد جب ویران اور خراب ہو جائے تو اس کو کسی دوسری جگہ منتقل کر دیا جائے یا اس کو فروخت کر کے اس کا متبادل خرید لیا جائے، یا وقف کرنے والے نے جس مقصد کے لیے وقف کیا تھا وہ مقصد حاصل نہیں ہو رہا تو اس کو بیچ کر اس کی قیمت سے اس کا متبادل خرید لیا جائے، یا وہ ویران ہو جائے، عمارت تباہ ہو جائے، تب بھی اس کو بیچ کر متبادل خریدنا جائز ہے، کیوں کہ ان سب حالتوں میں اصل اور کلیہ یہی ہے کہ جب ان کا مقصود حاصل نہ ہو رہا ہو تو ان کا کوئی متبادل کھڑا کر لیا جائے۔

2 مصلحتِ راجحہ کی بنا پر تبدیل کرنا، مثلاً قربانی کے جانور کو بہتر جانور میں تبدیل کرنا، پہلی مسجد فروخت کر کے اس کے بدلے میں کسی ایسی جگہ دوسری مسجد بنوانا جہاں اس کی ضرورت زیادہ ہو۔ اس طرح کے امور امام احمد وغیرہ کے نزدیک جائز ہیں۔ امام احمد نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس فعل سے استدلال کیا کہ انھوں نے کوفہ کی قدیم مسجد کو کسی دوسری جگہ منتقل کر دیا اور پہلی جگہ پر کھجور فروشوں کا بازار بن گیا، یہ مسجد کی جگہ کی تبدیلی تھی۔ جہاں تک پرانی عمارت کو نئی عمارت میں تبدیل کرنا ہے تو حضرت عمر و عثمان رضی اللہ عنہما نے مسجدِ نبوی کی ازسرِ نو تعمیر کی تھی، جس میں پہلی عمارت بالکل بدل گئی، بلکہ اس میں دونوں نے اضافہ کیا تھا۔ اسی طرح مسجدِ حرام سے متعلق بھی وارد ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے کہا:

«لَوْ لَا أَنَّ قَوْمَكِ حَدِيْثُ عَهْدٍ بِجَاهِلِيَّةٍ لَنَقَضْتُ الْكَعْبَةَ، وَلَأُلْصِقُهَا بِالْأَرْضِ وَلَجَعَلْتُ لَهَا بَابَيْنَ بَاباً يَّدْخُلُ النَّاسُ مِنْهُ وَبَاباً يَّخْرُجُ النَّاسُ مِنْهُ» [1]

”اگر تیری قوم زمانۂ جاہلیت کے قریب قریب نہ ہوتی تو میں کعبہ کو توڑ کر زمین کے ساتھ ملا دیتا اور اس کے دو دروازے بنا دیتا، ایک دروازے سے لوگ داخل ہوتے اور دوسرے سے باہر نکلتے۔“

اگر یہ راجح عذر اور معارض نہ ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کعبہ کی تعمیر میں تبدیلی کر دیتے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کسی مصلحت کے لیے وقف کو ایک شکل سے دوسری شکل میں تبدیل کرنا جائز ہے۔ جہاں تک وقف کی زمین کو دوسری زمین تبدیل کرنے کی بات ہے تو اس مسئلے میں امام احمد وغیرہ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی پیروی میں زمین میں تبدیلی کرنا صریح الفاظ میں جائز کہا ہے، کیوں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایسا کیا تھا، یہ معاملہ مشہور تھا اور کسی نے اس کا انکار یا تردید نہیں کی تھی۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٢٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٣٣٣)

جو غلہ کے لیے وقف ہو، اس کو اگر اس سے بہتر میں بدل دیا جائے، مثلاً: کسی نے کوئی گھر، دوکان، باغ یا کم پیداوار والی بستی وقف کی، پھر بعد میں اس کو کسی ایسی چیز میں بدل دیا جو وقف کے لیے زیادہ فائدہ مند ہو تو اس کو ابو ثور، قاضی مصر ابو عبید بن حرمویہ وغیرہ نے جائز کہا ہے۔ یہ مصلحت کے لیے مسجد کی زمین تبدیل کرنے میں امام احمد کے قول پر قیاس ہے۔ اگر مصلحت کے لیے مسجد کی زمین کو مسجد کے علاوہ بازار جیسی جگہ میں تبدیل کیا جا سکتا ہے تو ایک فائدے اور آمدنی کے ذریعے کو دوسرے میں تبدیل کرنا کیوں جائز نہیں؟ امام صاحب کے نزدیک قربانی کے جانور کو بہتر میں تبدیل کرنا جائز ہے اور یہ اسی پر قیاس ہے، بلکہ ان سے یہ بھی منقول ہے کہ اگر مسجد کو اوپر اٹھا دیا جائے اور اس کے نیچے کوئی پانی پلانے کا تالاب بنا دیا جائے جو ہمسائیوں کے کام آئے تو یہ بھی جائز ہے۔ تاہم کچھ اصحابِ احمد کے نزدیک مسجد، قربانی کے جانور اور وقف شدہ زمین کو تبدیل کرنا جائز نہیں۔ امام شافعی وغیرہ کا مذہب بھی یہی ہے، لیکن نصوص، آثار اور قیاس مصلحت کے لیے تبدیل کرنے کے جواز پر ہی دلالت کرتے ہیں۔ واللہ أعلم [1]

بے آباد مسجد کو بند کرنے کا مسئلہ

سوال ایک بستی میں کئی مساجد ہیں، جن کی اکثریت بے آباد ہے، صرف ایک میں نماز کا اہتمام ہوتا ہے اور ان سب مساجد کا ایک وقف ہے تو کیا بے آباد مساجد کو آباد کرنا ضروری ہے یا ان کو بند کر دیا جائے؟

جواب مسجد میں نماز کا اہتمام کر کے اس کو آباد کرنا ضروری ہے، اسی طرح مصلحت اور ضرورت کے مطابق دوسری مسجد میں امام کا انتظام کرنا بھی ضروری ہے، جو مساجد بن جائیں ان کو بند کرنا جائز نہیں، اگر وہاں کے رہنے والے بہت کم تعداد میں ہوں اور ایک ہی مسجد ان کے لیے کافی ہو تو ایسی صورت میں ان کو دوسری مساجد میں جا کر نماز پڑھنے کا پابند بنا کر منتشر کرنا ضروری نہیں۔ [2]

مسجد کی غیر آباد بالائی منزل کو گرانے کا مسئلہ

سوال ایک مسجد کے اوپر ایک منزل تعمیر ہے۔ اس کی عمارت بہت پرانی ہو چکی ہے، وہاں کوئی رہتا ہے نہ اس سے کوئی فائدہ ہی لیا جا رہا ہے، کیوں کہ وہ ٹوٹی پھوٹی ہے اور مسجد کے لیے بوجھ ہے۔ اس کی تعمیر کے لیے بھی کچھ نہیں تو کیا اس منزل کو گرا دیا جائے یا اس مسجد کو بند کر دیا جائے؟

جواب اگر باقی منزل کو گرانا مسجد کے فائدے کے لیے ہے تو اس کو توڑ کر ملبہ فروخت کر کے مسجد کے لیے استعمال کیا جائے یا اس کی کوئی چیز خرید کر مسجد کے لیے وقف کر دی جائے یا مسجد یا وقف کی عمارت میں استعمال کر لیا جائے۔ [3]

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۳۱/۲۵۲۔۲۵۳)

[2] مجموع الفتاویٰ (۳۱/۲۵۵)

[3] مجموع الفتاویٰ (۳۱/۲۵۹)

زندگی میں ایک بیٹے کو خیرات کرنے کا مسئلہ

سوال ایک عورت نے اپنی صحت وسلامتی کی حالت میں اپنے بیٹے کو اتنا مال خیرات کیا جو تقریباً تقسیم کے حصے کے مطابق تھا۔ اس بات کو تقریباً دس سال گزر گئے، پھر وہ عورت فوت ہوگئی۔ اس کے بعد اس بیٹے نے اپنی زندگی ہی میں وہ سارا حصہ اپنے بیٹے کو خیرات کر دیا۔ یہ معاملہ عدالت میں پیش ہوا اور قاضی نے بھی یہی فیصلہ دیا۔ اب اس بیٹے کے وہاں رہنے کے بعد کیا باقی ورثاء کو اس سے کچھ ملے گا یا نہیں؟

جواب اگر یہ صدقہ اور خیرات صدقہ کرنے والے کی موت تک اس کے ہاتھ سے آگے منتقل نہیں ہوا، تو یہ ائمہ کے مشہور اقوال کے مطابق بالاتفاق باطل ہے۔ اگر قاضی نے اس کی تصدیق کی ہے تو اس کی تصدیق اس معاملے کے صحیح ہونے کو ضروری قرار نہیں دے سکتی۔ اگر معاملہ یہی ہے جس میں دیگر ورثاء بھی ہیں تو کوئی علم والا قاضی اس کے صحیح ہونے کا فیصلہ نہیں دے سکتا، البتہ کوئی اور صورت ہو تو اور بات ہے۔

اگر خیرات کرنے والے نے وہ خیرات اس کو دے دی جس کے لیے کی تھی اور اس نے قانونی طور پر اس کو وصول کر لیا تو یہ علما کے ہاں ایک مشہور مسئلہ ہے۔ اس صورت میں اگر دینے والے نے باقی اولاد کو بھی اسی کے برابر نہیں دیا تو اس سے واپس لینا ضروری ہے۔ یا باقی ورثاء کو بھی اتنا دے، کیوں کہ صحیح میں لقمان بن ثابت سے مروی ہے: ''وہ کہتے ہیں: میرے باپ نے مجھے ایک غلام تحفے میں دیا، میری ماں عمرہ بنت رواحہ نے کہا: میں اس وقت تک خوش نہیں ہوں گی جب تک تو رسول اللہ ﷺ کو اس پر گواہ نہ بنا لے۔ میں رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور کہا: میں نے اپنے بیٹے کو غلام کا تحفہ دیا ہے اور اس کی ماں کہتی ہے: میں اس وقت تک خوش نہیں ہوں گی جب تک تو رسول اللہ ﷺ کو اس پر گواہ نہ بنا لے۔ آپ ﷺ نے پوچھا: کیا اس کے علاوہ بھی تیری اولاد ہے؟ میں نے کہا: ہاں۔ آپ ﷺ نے پوچھا: کیا تو نے ان سب کو اس کے برابر دیا ہے جو تو نے اس کو دیا ہے؟ میں نے کہا: نہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اس پر میرے علاوہ کسی اور کو گواہ بنا لے۔''

ایک روایت میں ہے: ''مجھے گواہ نہ بنا، میں ظلم پر گواہ نہیں بنتا۔ اللہ سے ڈرو اور اپنی اولاد کے درمیان عدل کرو۔ اسے واپس لے لے۔'' تو اس نے واپس لے لیا۔[1] واللہ أعلم[2]

---

(1) صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٤٤٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٢٣)

(2) مجموع الفتاویٰ (٣١/٢٨٠-٢٨١)

مقتدر شخص کو تحفہ دینے کا مسئلہ

سوال ایک شخص نے امیر شہر کو، کوئی کام نکلوانے، یا اس کا قرب چاہنے، یا اس کے پاس کام حاصل کرنے، یا اس طرح کے کسی مقصد کے لیے کوئی تحفہ دیا تو کیا اس صورت میں اس سے تحفہ لینا جائز ہے یا نہیں؟ اگر وہ تحفہ لے گا تو دل میں اس کام کرنے کا خیال پیدا ہوگا۔ اگر نہیں لے گا تو یہ خیال بھی پیدا نہیں ہوگا تو کیا وہ تحفہ لے کر کام کر دے یا نہ لے کر نہ کرے؟ اسی طرح امیر جس کی بات نہ ٹالتا ہو، کیا اس کے لیے بھی کسی کام کے بغیر کسی طرح کا تحفہ وصول کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اگر وہ واپس کر دے تو دینے والے کا دل ٹوٹ جائے تو ایسی صورت میں بھی لینا جائز ہے یا ناجائز؟

جواب سنن ابو داود وغیرہ میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«مَنْ شَفَعَ لِأَخِيهِ شَفَاعَةً فَأَهْدَى لَهُ هَدِيَّةً فَقَبِلَهَا فَقَدْ أَتَى بَاباً عَظِيمًا مِنْ أَبْوَابِ الرِّبَا »[1]

''جس نے اپنے بھائی کی سفارش کی، اس نے اس کو کوئی تحفہ دیا، اگر اس نے اس کو قبول کر لیا تو وہ سود کے دروازوں میں سے ایک بہت بڑے دروازے میں داخل ہوا۔''

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے ''سحت'' سے متعلق پوچھا گیا تو انھوں نے اس کی تفسیر میں فرمایا: ''تو اپنے بھائی کے لیے کوئی سفارش کرے، وہ تجھے کوئی تحفہ دے اور تو قبول کر لے۔'' ان سے کہا گیا: اگر وہ تحفہ باطل میں ہو، تب اس سے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ انھوں نے کہا: یہ کفر ہے۔ ﴿وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ﴾ [المائدة: ٤٤]

اسی لیے علما کہتے ہیں: جس نے ولی امر کو کوئی ناجائز کام کرنے کے لیے کوئی تحفہ دیا تو وہ تحفہ دینے اور لینے والے دونوں کے لیے حرام ہے۔ یہی وہ رشوت ہے جس کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«لَعَنَ اللّٰهُ الرَّاشِيَ وَالْمُرْتَشِيَ »[2]

''اللہ رشوت لینے والے اور دینے والے پر لعنت کرے۔''

رشوت کو برطیل کہا جاتا ہے اور برطیل کا معنی ہے چوڑے منہ والا پتھر، جب کوئی کسی کا ظلم روکنے یا اپنے جائز حق وصول کرنے کے لیے کسی کو کوئی تحفہ دیتا ہے تو وہ تحفہ لینے والے کے لیے حرام، جب کہ دینے والے کے لیے جائز

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٥٤١) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٣٤٦٥)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٥٨٠) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٣٣٧) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٣١٣) صحيح الجامع، رقم الحديث (٥٠٩٣)

ہے۔ جس طرح رسول اللہ ﷺ فرمایا کرتے تھے:

« إِنِّي لَأُعْطِي أَحَدَهُمُ الْعَطِيَّةَ فَيَخْرُجُ بِهَا يَتَأَبَّطُهَا نَاراً » قِيلَ: يَا رَسُولَ اللّٰهِ، فَلِمَ تُعْطِيهِمْ؟ قَالَ: « يَأْبُوْنَ إِلَّا أَنْ يَسْأَلُوْنِي، وَيَأْبَى اللّٰهُ لِيَ الْبُخْلَ » [1]

''میں ان میں سے کسی کو عطیہ دیتا ہوں، جسے لے کر وہ اپنی بغل میں جہنم کی آگ دبا کر لے جاتا ہے، آپ سے کہا گیا: پھر آپ ان کو دیتے ہی کیوں ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: وہ مانگے بنا رہتے نہیں اور اللہ نے میرے لیے بخل روا نہیں رکھا۔''

اسی طرح جو کسی کو آزاد کرتا ہے مگر اس کی آزادی چھپا کر رکھتا ہے، یا خبر چھپا لیتا ہے، یا وہ لوگوں پر ظلم کرتا ہے تو ان سب کو دینا جائز ہے مگر ان کا لینا حرام ہے۔ جہاں تک سفارش کرنے پر تحفہ دینے کی بات ہے، مثلاً کوئی شخص امیر کے پاس کسی کا مسئلہ پیش کرتا ہے یا اس کا حق دلواتا ہے، یا اس کو ایسی نوکری دلواتا ہے جس کا وہ اہل ہے، یا فوج میں کسی عہدے پر فائز کرواتا ہے جس کا وہ اہل ہے، یا اس کو فقیروں، فقہا، قراء، عابدوں یا اس طرح کے لوگوں کے لیے وقف مال سے کچھ حصہ دلواتا ہے، جب کہ وہ اس کا اہل ہے، یعنی اس طرح کی سفارش جس میں کسی واجب یا ترکِ حرام میں اعانت ہو تو ان امور میں بھی ہدیہ قبول کرنا جائز نہیں، تحفہ دینے والا اپنا حق وصول کرنے یا اپنے سے ظلم دور کرنے کے لیے خرچ کر سکتا ہے، سلف اور اکابر ائمہ سے یہی منقول ہے۔ کچھ متاخر فقہا نے اس کی رخصت دی ہے اور اس کو ''مزدوری'' کے باب سے قرار دیا ہے، لیکن یہ سنت اقوالِ صحابہ اور آراء ائمہ کے خلاف ہے اور غلط ہے، کیوں کہ یہ کام مفادِ عامہ سے تعلق رکھتے ہیں، جنھیں کرنا فرضِ عین ہوتا ہے یا فرضِ کفایہ۔ اگر اس طرح کے کاموں کی مزدوری لینی شروع کر دی جائے تو پھر جو مال دے گا اسی کو صدقات اور اموالِ غنیمت وغیرہ میں سے کچھ دیا جائے گا اور اسی سے ظلم روکا جائے گا جو اس کی مزدوری دے گا جو مال خرچ نہیں کرے گا اس کو کوئی ملازمت دی جائے گی، نہ صدقہ دیا جائے گا اور نہ اس سے ظلم ہی روکا جائے گا، چاہے وہ مال کا سب سے زیادہ حق دار ہی کیوں نہ ہو۔ ان مفادِ عامہ کے کاموں کی منفعت صرف اس خرچ کرنے والے کے لیے نہیں، بلکہ عام مسلمانوں کے لیے ہے، اس لیے ہر رتبے پر اسی کو فائز کیا جائے گا جو اس کا اہل ہے اور حکومت کی طرف سے فوجیوں، ائمہ، موذنین اور اہلِ علم کے لیے وظیفہ مقرر کیا جائے جو لوگوں کے لیے زیادہ فائدے مند ہیں اور مال کا حق زیادہ رکھتے ہیں۔ یہ سربراہِ حکومت کی ذمے داری ہے، امت کو اس معاملے میں اس کی معاونت کرنی چاہیے۔ اگر ان امور میں کسی خاص شخص سے مزدوری لے کر اس کا کام کرنے کا رواج ڈال دیا جائے تو پھر یہ سارے کام اور حکومتی عہدے بکنے شروع ہو جائیں گے، حالانکہ

[1] مسند أحمد (٣/٤، ١٦) صحيح الترغيب والترهيب (١٩٧/١)

عہدے کی طلب ویسے ہی منع ہے، چہ جائیکہ اس کو مال کے ذریعے خریدا جائے۔ اگر یہی معیار رہا تو نااہل جاہل، فاسق اور فاجر عہدوں پر بٹھا دیے جائیں گے اور اہل، عالم، عادل اور باصلاحیت پیچھے رہ جائیں گے، فاسقوں اور بزدلوں کا وظیفہ لگ جائے گا اور عادل و بہادر کو چھوڑ دیا جائے گا جس کے نتیجے میں فساد کا سیلِ رواں جاری ہو جائے گا۔

اگر کوئی شخص مال لے کر غیر مستحق کے لیے سفارش کرے، جہاں مستحق بھی بیٹھے ہوں تو ایسی صورت میں اس شخص کے لیے نہ مال لینا جائز ہے اور نہ سفارش کرنا۔ ان دونوں کو چھوڑنا ہی بہتر ہے۔ اگر مال لے کر مستحق کے لیے سفارش کرتا ہے، غیر مستحق کو چھوڑتا ہے تو ایسی صورت میں مال لے لینا مگر سفارش نہ کرنا غیر مستحق کے لیے سفارش کرنے سے زیادہ نقصان دہ ہے۔ اس سفارش کرنے والے سے کہا جائے تجھے اللہ، رسول، حکمرانوں اور عام مسلمانوں کا خیر خواہ ہونا چاہیے۔ اگر تجھے یہ مال و جاہ نہ ملتی تو اس وقت تیری کیفیت کیا ہوتی؟ تجھے چاہیے کہ جس کے سامنے سفارش کی جا رہی ہے اس کی خیر خواہی کر اور اس کو بتا کون عہدے کا مستحق اور اہل ہے اور کون نااہل۔ اس طرح تو مسلمانوں کی خیر خواہی کر اور اللہ اور رسول کی فرماں برداری کر۔ یہی سب سے بڑی فرماں برداری ہے۔ اس طرح تو مستحق کی معاونت کر سکتا ہے، پھر تجھے نماز روزے اور شریعت کے دیگر احکام کی پابندی بھی کرنی چاہیے۔ رہا وہ شخص جس کی بات سنی جاتی ہے اور ٹالی نہیں جاتی، اگر وہ شرعی ضیافت سے زیادہ لیتا ہے تو ضروری ہے وہ کھلانے والے کو اس کا متبادل دے یا زیادہ نہ کھائے، ورنہ زائد ضیافت قبول کرنا بھی ہدیہ قبول کرنے کی طرح ہوگا، جو گواہ اور سفارش کرنے والے کی قسم سے ہو جائے گا جو ضیافت یا اجرت کے عوض گواہی دیتا یا سفارش کرتا ہے، جو فساد کا بہت بڑا سبب ہے۔ واللہ أعلم[1]

مقروض کا مرتے وقت ہبہ کرنا

سوال ایک شخص مقروض ہے۔ اس کے پاس جتنا مال ہے، قرض اس سے زیادہ ہے۔ اس نے اپنے مرض الموت میں اس مال سے کسی کو کچھ ہبہ کر دیا، کیا قرض دار اس کو اس سے واپس لے سکتے ہیں یا نہیں؟

جواب الحمد للہ۔ ہاں! اگر اس کا قرض اتنا زیادہ ہے کہ اس کا سارا مال قرض میں چلا جائے گا تو وہ اپنی موت کی بیماری میں اس سے کسی کو اس وقت تک کوئی ہبہ عطیہ نہیں کر سکتا، جب تک قرض داروں سے اجازت نہ لے لے، خواہ وہ تحفہ محبت ہو یا کوئی قرض چکانے کے لیے، بلکہ وارثوں کا حق بھی قرض چکانے کے بعد ہی ہوتا ہے۔ اس پر سب مسلمانوں کا اتفاق ہے۔

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۳۱/۲۸۵۔۲۸۸)

رسول اللہ ﷺ نے بھی وصیت نافذ کرنے سے پہلے قرض ادا کرنے کا فیصلہ دیا تھا اور مرض الموت میں عطیہ کرنا ائمہ اربعہ کے اتفاق کے ساتھ وصیت کی طرح ہی ہے۔ واللہ أعلم [1]

موت کے وقت اپنا حق مہر معاف کرنا

سوال ایک عورت کا خاوند موجود ہے جس نے ابھی تک اس کا حق مہر ادا نہیں کیا۔ جب اس عورت کی موت کا وقت قریب آیا تو اس نے عادل گواہ اور کچھ عورتوں کو بلوا کر ان کی موجودگی میں خاوند کو حق مہر سے بری کر دینے کی گواہی دی، کیا اس وقت اس کا بری کرنا درست ہے یا نہیں؟

جواب اگر اس عورت کے مرض الموت تک حق مہر خاوند کے ذمے واجب الاداء ہے تو یہ اس وقت تک درست نہیں ہو گا جب تک باقی ورثاء اجازت نہ دیں۔ اگر عورت اپنی تندرستی کی حالت میں خاوند کو بری کر دے تو جائز ہے، جو امام شافعی اور احمد کے نزدیک ایک گواہ اور ایک قسم سے ثابت ہو جاتا ہے اور امام مالک اور ایک قول میں احمد کے نزدیک دو عورتوں کی گواہی اور ایک قسم سے بھی ثابت ہو جاتا ہے۔ اگر عورت اپنی بیماری کے دنوں میں یہ اقرار کرے کہ اس نے اپنی تندرستی کے دنوں میں اس کو معاف کر دیا تھا تو ابو حنیفہ اور احمد وغیرہما کے نزدیک یہ اقرار قبول نہیں کیا جائے گا، اور امام شافعی کے نزدیک قبول کیا جائے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرما دیا ہے:

« إِنَّ اللّٰهَ قَدْ أَعْطَى كُلَّ ذِيْ حَظٍّ حَظَّهُ فَلَا وَصِيَّةَ لِوَارِثٍ » [2]

''اللہ تعالیٰ نے ہر حصے دار کو اس کا حصہ دے دیا ہے، اس لیے وارث کے لیے وصیت جائز نہیں۔''

مریض بھی وارث کو اس سے زیادہ دینے کا مجاز نہیں جو اللہ نے اس کو دے دیا ہے۔ [3]

اولاد میں کسی کو کسی پر فوقیت دینا

سوال اگر کوئی شخص اپنی اولاد میں سے کچھ کو کچھ پر ترجیح دیتے ہوئے زیادہ دیتا ہے تو کیا ایسا جائز ہے؟

جواب انسان اپنی موت کی بیماری میں اپنی اولاد میں سے کسی کو بھی اس سے زیادہ دینے کا مجاز نہیں جو وراثت سے اس کا حصہ بنتا ہو۔ اس پر سب کا اتفاق ہے۔ اگر وہ ایسا کرے تو باقی ورثاء اس کو رد کر کے اپنے حقوق اور حصے

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۲۹۲/۳۱)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (۲۸۷۰) سنن النسائي، رقم الحديث (۳٦٤۱) سنن الترمذي، رقم الحديث (۲۱۲۰) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (۲۷۱۳) صحيح الجامع (۷۱۲۰)

[3] مجموع الفتاویٰ (۲۹۳/۳۱)

پورے لینے کے مجاز ہیں، بلکہ اگر کوئی اپنی تندرستی کے ایام میں بھی ایسا کام کرے تو صحیح تر قول کے مطابق یہ جائز نہیں، بلکہ اس کو چاہیے کہ اس کو واپس کرے جس طرح رسول اللہ ﷺ نے زندہ یا فوت شدہ دونوں حالتوں میں اس کو واپس کرنے کا حکم دیا ہے، لہٰذا خاص کرنے والا واپس کرے۔

مال دینے میں بیٹوں اور بیٹیوں میں عدمِ مساوات کا جرم

سوال ایک شخص کے بیٹے بھی ہیں اور بیٹیاں بھی۔ اس نے اپنی وفات سے پہلے اپنی بیٹیوں کو تحفے کی صورت میں کچھ دیا، مگر بیٹوں کو کچھ نہ دیا تو کیا اس کے ذمے کچھ باقی رہ جاتا ہے یا نہیں؟

جواب اولاد کو تحفہ اور مال دیتے وقت ان میں فرق کرنا جائز نہیں، بلکہ ان میں عدل کرنا چاہیے۔ رسول اللہ ﷺ کا یہی حکم ہے کہ ''اللہ سے ڈرو اور اپنی اولاد کے درمیان عدل کرو۔''[1] ایک شخص نے اپنے ایک بیٹے کو ایک غلام تحفے میں دیا اور رسول اللہ ﷺ کو گواہ بنانا چاہا تو آپ ﷺ نے فرمایا: میں ظلم پر گواہ نہیں بنتا۔[2] آپ ﷺ نے اس سے واپس لینے کا حکم دیا۔ اگر یہ صرف بات کی حد تک تھا اور اس نے ابھی تک بیٹیوں کو دیا نہیں کہ مر گیا یا موت کی بیماری کا شکار ہو گیا تو یہ فیصلہ بالاتفاق مردود ہے، گو اس میں شاذ اختلاف ہے کہ اگر اس نے اپنی صحت کی حالت میں ان کو دے دیا اور وصول کروا دیا تھا تو پھر اس کو ان سے واپس لینا چاہیے یا نہیں؟ اس میں علما کے دو اقوال ہیں۔ واللہ أعلم[3]

جہیز لینے والی کا وراثت میں سے حصہ

سوال ایک شخص نے اپنی اولاد میں لڑکیاں اور لڑکے چھوڑے۔ لڑکیوں کی شادی باپ کی زندگی ہی میں ہو گئی اور انھوں نے جہیز کی صورت میں کافی کچھ لے لیا۔ جب آدمی فوت ہوا تو لڑکوں کے حصے بہت تھوڑا آیا۔ کیا وراثت میں لڑکیوں کو لڑکوں کے ساتھ حصہ ملے گا؟

جواب آدمی کو چاہیے کہ اپنی اولاد کو مال دیتے وقت برابری اور انصاف سے کام لے، ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا جائز نہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے اسی کا حکم دیا ہے اور ترجیح دے کر ظلم کرنے سے منع کیا ہے۔ نیز اس کو واپس کرنے کا حکم دیا ہے۔ اگر انسان ایسا کام کر گزرے اور انصاف سے پہلے ہی فوت ہو جائے تو جس کو ترجیح دی گئی ہو

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٤٤٧)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٢٣)

[3] مجموع الفتاویٰ (٣١/٢٩٦۔ ٢٩٧)

اس کو چاہیے اپنے بھائیوں کے درمیان عدل اختیار کرے۔ وہ پہلا اور بعد والا سارا مال اکٹھا کر کے کتاب اللہ اور اس کے حکم ﴿ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ ﴾ [النساء: ۱۱] کی بنیاد پر تقسیم کریں۔ واللہ أعلم [1]

اولاد کے لیے وصیت کا حکم

سوال ایک شخص نے اپنی اولاد کے لیے مختلف حصوں کی وصیت کی اور اپنی وفات کے وقت اس پر گواہ مقرر کیے، کیا یہ وصیت نافذ ہوگی یا نہیں؟

جواب مریض کے لیے اپنی اولاد میں سے کسی ایک کو فوری روبہ عمل عطیے کے ساتھ خاص کرنا جائز نہیں۔ موت کے بعد وصیت نہیں اور نہ یہ جائز ہے کہ وہ اپنے ذمے اس کے لیے کسی چیز کا اقرار کرے۔ اگر اس نے ایسا کیا تو باقی ورثاء کی اجازت کے بغیر اس کو نافذ کرنا جائز نہیں ہوگا۔ اس پر اہلِ اسلام کا اتفاق ہے۔ اسی طرح گواہوں کو ایسی گواہی نہیں دینی چاہیے جو ظلم پر معاون ہو۔ یہ تخصیص کبیرہ گناہ ہے جو جہنم میں لے جانے والا ہے، بلکہ سنن میں ایسی روایت مروی ہے جو اس کی شدید وعید پر دلالت کرتی ہے، کیوں کہ یہ کام اس کی اولاد میں کینے اور انتشار کا سبب بن سکتا ہے، بالخصوص والد کے حق میں، کیوں کہ باقی اس کی نافرمانی پر اتر آسکتے ہیں۔ [2]

اولاد میں بے انصافی کی صورت میں وصیت فسخ کرنے کا حکم

سوال ایک شخص نے اپنی کسی بیٹی کو اچھا خاصا جہیز بنا کر دیا اور ساتھ دو لاکھ درہم بھی دیے اور دوسرے کے لیے اپنا کوئی مال وقف کر دیا، کیا وقف کرنے والے کے ورثا اس کو فسخ کر سکتے ہیں یا نہیں؟

جواب الحمد للہ. اس انسان پر اپنی اولاد کے درمیان عدل کرنا فرض ہے، جس طرح اللہ اور رسول کا حکم ہے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بشیر بن سعد رضی اللہ عنہ سے فرمایا: «اِتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْدِلُوا بَيْنَ أَوْلَادِكُمْ» [3] ”اللہ سے ڈرو اور اپنی اولاد کے درمیان عدل کرو۔“ فرمایا: «لَا تُشْهِدْنِي عَلَى جَوْرٍ» [4] ”مجھ کو ظلم پر گواہ نہ بنا۔“ آپ ﷺ نے اس کو اس سے واپس لینے اور ساری اولاد کے درمیان برابر تقسیم کرنے کا حکم دیا۔ اگر انسان عدل کیے بنا ہی فوت ہو جائے تو ظاہر تر قول کے مطابق اس کے ظلم کو کالعدم قرار دے کر برابر تقسیم کیا جائے گا۔ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے مال کے حوالے سے یہی حکم دیا تھا۔

---

1. مجموع الفتاویٰ (۲۹۷/۳۱)
2. مجموع الفتاویٰ (۳۰۸/۳۱)
3. صحیح البخاري، رقم الحدیث (۲٤٤٦) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱٦۲۳)
4. صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱٦۲۳)

ساری مظلوم اولاد اپنا حق مانگنے اور ظلم پر مبنی تخصیص کو فسخ اور ختم کروانے کا اختیار رکھتی ہے۔ ان کا حق ان تک پہنچانے میں ان کی مدد کرنا نیکی اور ثواب کا کام ہے۔ واللّٰہ أعلم[1]

پوتے کے لیے وصیت

سوال ایک شخص کے پاس کھیت اور کھجور کے درخت ہیں۔ اس نے اپنی موت کے وقت اپنے گھر والوں سے کہا: میرے مال کا تیسرا حصہ اس وقت تک فقرا اور مساکین پر خرچ کرتے رہنا جب تک میرے بیٹے کے ہاں بیٹا جنم نہ لے، پھر اس کو دے دینا۔ کیا یہ وصیت جائز ہے؟

جواب ہاں، یہ وصیت جائز ہے، کیوں کہ وہ پوتے جو وراثت سے محروم ہوتے ہیں، ان کے لیے وصیت کرنا جائز ہے۔ حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ نے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کے بیٹے کے لیے وصیت کی تھی معدوم کے لیے معدوم کی وصیت جائز ہے، جب تک اس کے بیٹے کی اولاد نہیں ہو جاتی اس وقت تک پیداوار فقرا پر خرچ کی جائے۔ واللّٰہ أعلم[2]

خاوند اور بھائی کے لیے وصیت کے بعد بچہ پیدا ہونے کی صورت میں اس کا حکم

سوال ایک عورت نے اپنی بیماری کی حالت میں اپنے خاوند اور اپنے بھائی کے لیے کسی چیز کی وصیت کی، اس کے ایک مدت بعد اس نے ایک لڑکے کو جنم دیا، اس کے بعد فوت ہوئی، کیا وصیت کا حکم ختم ہو جائے گا؟

جواب جو ترکے کے تیسرے حصے سے زیادہ ہو وہ وارث کا ہے۔ یتیم بچے کے مال میں سے کچھ بھی خیرات نہیں کیا جائے گا۔ خاوند وارث ہے۔ اس کے لیے وصیت باطل ہے۔ بھائی کے لیے وصیت صحیح ہے، کیوں کہ وہ بچے کے ہوتے ہوئے وارث نہیں، اگرچہ وصیت کے وقت وارث تھا۔ اب دیکھا جائے گا کہ اس نے بھائی اور لوگوں کے لیے کیا وصیت کی ہے، اگر تیسرا حصہ اس کو پورا آ جائے تو صحیح، ورنہ اس کی وصیتوں کے مطابق ان میں تقسیم کر دیا جائے گا۔[3]

حاملہ بیوہ اور اس کے بچوں کے خرچ کی صورت اور ترکے کی تقسیم

سوال ایک شخص یتیم بچوں کا نگران اور وصی ہے۔ ان بچوں کی والدہ حاملہ ہے۔ کیا بچوں کو ان کے نگران کو اور ان کی والدہ کو خرچہ دیا جائے گا اور کیا یہ سارے کا سارا مال کھا سکتے ہیں؟

---

[1] جامع المسائل (٣٣٩/٤)

[2] مجموع الفتاویٰ (٣٠٩/٣١)

[3] مجموع الفتاویٰ (٣١١/٣١)

جواب بیوی کو وضعِ حمل سے پہلے دیا جائے، اگر وضعِ حمل کا انتظار کیا جائے تو باقی ورثاء کو موخر کر دیا جائے اور یتیموں پر معروف کے مطابق خرچ کیا جائے۔ ان کے مال کو ماں کے مال کے ساتھ ملانا جائز ہے، تا کہ وہ اکٹھا کھائیں پکائیں۔ صحابہ نے اس سے متعلق رسول اللہ ﷺ سے پوچھا تو اللہ نے یہ آیت اتاری:

﴿ وَيَسْـَٔلُونَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى ۖ قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ ۖ وَاِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ ۚ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ ۚ ﴾ [البقرۃ: ۲۱۹]

''اور وہ تجھ سے یتیموں کے متعلق پوچھتے ہیں، کہہ دے ان کے لیے کچھ نہ کچھ سنوارتے رہنا بہتر ہے اور اگر تم انھیں ساتھ ملا لو تو تمھارے بھائی ہیں اور اللہ بگاڑنے والے کو سنوارنے والے سے جانتا ہے۔''

حمل کی وجہ سے اگر تقسیم موخر کر دی جائے تو کوئی بات نہیں، لیکن اگر جلد تقسیم کر دیا جائے تو حمل کے لیے احتیاطاً مذکر کا حصہ نکال لیا جائے۔

یہ سوال کہ کیا بیوی اس حمل کی وجہ سے رہایش اور خرچے کی حق دار ہے کہ نہیں؟ اس میں علما کے تین اقوال ہیں:

1 ابو حنیفہ، ایک قول میں احمد اور ایک قول میں شافعی کے نزدیک وہ خرچ اور رہایش کی حق دار نہیں۔

2 امام احمد سے دوسری روایت اور علما کے ایک گروہ کے مطابق وہ رہایش اور خرچے کی حق دار ہے۔

3 امام مالک کے نزدیک اور دوسری روایت میں شافعی کے مذہب میں اس کے لیے رہایش ہے، خرچہ نہیں۔[1]

خاوند اور بھانجے کا حصہ

سوال ایک عورت فوت ہوگئی اور اس نے اپنے پسماندگان میں خاوند اور ایک بھانجا چھوڑا، ان کا حصہ کیا ہوگا؟

جواب خاوند کو آدھا حصہ ملے گا، جہاں تک بھانجے کا تعلق ہے تو اس سے متعلق دو اقوال ہیں:

ایک قول کے مطابق وہ باقی ساری جائیداد کا وارث ہوگا۔ یہ ابو حنیفہ، ان کے اصحاب کا قول، امام احمد کا مشہور مذہب اور امام شافعی کے اصحاب میں سے کچھ کا موقف ہے۔

دوسرے قول کے مطابق باقی مال بیت المال کو جائے گا۔ یہ اکثر شافعی حضرات اور دوسری روایت میں احمد کا قول ہے۔ اس مسئلے میں اختلاف کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ﴿ وَاُولُوا الْاَرْحَامِ ﴾ یعنی ایسے رشتے دار جو اصحاب الفرائض (جن کا حصہ متعین ہے) ہیں نہ عصبہ (قریب ترین رشتے دار)۔ ان سے متعلق مالک، شافعی اور ایک روایت میں امام احمد کا مذہب یہ ہے کہ جب کوئی شخص اپنے پسماندگان میں اولو الارحام میں سے کسی کو چھوڑ کر جائے تو اس کا مال بیت المال میں جائے گا۔ دوسری طرف اکثر سلف، امام ابو حنیفہ، سفیان ثوری، اسحاق اور دوسری روایت میں امام احمد کے نزدیک ایسے شخص کا باقی مال اولو الارحام میں تقسیم ہوگا جو کتاب اللہ کے مطابق ﴿ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ ﴾

[1] مجموع الفتاویٰ (۳۱/۳۲۳-۳۲۴)

اور رسول اللہ ﷺ کی اس حدیث:

«اَلْخَالُ وَارِثُ مَنْ لَّا وَارِثَ لَهُ، يَرِثُ مَالَهُ وَيَفُكُّ عَانَهُ» [1]

''جس کا کوئی وارث نہ ہو اس کا ماموں وارث ہے۔ وہ اس کا وارث بھی بنے گا اور اس کا قیدی بھی چھڑائے گا۔''

کے مطابق حق دار ہیں۔[2]

مرض الموت میں دخول سے پہلے دی گئی طلاق کی حیثیت اور اثرات

سوال ایک شخص نے اپنے مرض الموت میں اپنی بیوی کو دخول سے پہلے ایک طلاق دی۔ کیا یہ طلاقِ فرار ہوگی اور اس کے ارادے کے الٹ معاملہ کیا جائے گا اور بیوی وارث بنے گی۔ حق مہر بھی پورا وصول کرے گی یا وارث نہیں ہوگی اور آدھا حق مہر وصول کرے گی؟

جواب الحمد للہ رب العالمین. اس مسئلے کی بنیاد ''مرض الموت میں داخل ہونے کے بعد طلاق دینے والے کے مسئلے پر ہے'' اس مسئلے میں جمہور سلف و خلف نے اس عورت کو وارث قرار دیا ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کی بیوی تماضر بنت اصبغ کے متعلق یہی فیصلہ دیا تھا، جس کو انھوں نے اپنی بیماری میں طلاق دی تھی۔ یہی مالک، احمد، ابوحنیفہ اور شافعی کا قدیم مذہب ہے۔ پھر اس بنیاد پر کیا وہ عدت ختم ہونے کے بعد وارث ہوگی، جب کہ اس کو دخول سے پہلے طلاق دی گئی ہے؟ اس میں علما کے دو اقوال ہیں اور صحیح تر قول کے مطابق وہ وارث بنے گی۔ یہ مالک کا مذہب، احمد کا مشہور قول اور شافعی سے ایک روایت ہے، کیوں کہ روایت میں آیا ہے کہ حضرت عثمان نے اس کو عدت گزرنے کے بعد وارث بنایا تھا، نیز یہ اس وجہ سے بھی وارث ہے کہ خاوند جس طرح مرنے کے بعد ترکے میں تصرف نہیں کرسکتا، اسی طرح مرض الموت میں مبتلا ہونے کی وجہ سے اس کے حق اور باقی تمام ورثاء کے حق میں تصرف کرنے کا اختیار نہیں رکھتا، یعنی کسی وارث کو خیرات کرنے کا حق نہیں رکھتا اور غیر وارث کو ثلث سے زیادہ نہیں دے سکتا، تو جب مرض الموت میں اپنے باقی ورثاء کے حق سے متعلق اس کا تصرف موت کے بعد تصرف جیسا ہی ہے تو وہ اس کی وراثت قطع اور ختم کرنے کا اختیار نہیں رکھتا، اور یہی علما کے ہاں ''طلاقِ فار'' کے نام سے مشہور ہے اور صحیح قول وہی جس میں وارث بنانے کا فتویٰ دیا گیا ہے۔[3]

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٩٠١) صحيح الجامع، رقم الحديث (١٤٧٤)

[2] مجموع الفتاویٰ (٣٥٨/٣١)

[3] مجموع الفتاویٰ (٣٦٨/٣١)

نکاح

اخراجات کے ڈر سے نکاح سے فرار اختیار کرنا

سوال ایک آدمی کنوارا ہے اور شادی کا بہت زیادہ شوق رکھتا ہے، مگر ڈرتا ہے کہ عورت اس پر نا قابلِ برداشت بوجھ ڈالے گی اور اس نے قسم کھا رکھی ہے کہ کبھی کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلائے گا۔ اگر وہ شادی نہیں کرتا تو کیا گناہ گار ہوگا یا نہیں؟

جواب صحیح بخاری میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''نوجوانوں کی جماعت! تم میں سے جو شادی کی قوت و استطاعت رکھتا ہے وہ ضرور شادی کرے، کیوں کہ یہ نگاہ کو زیادہ جھکا کر اور شرم گاہ کو زیادہ محفوظ رکھتی ہے، جو استطاعت نہ رکھے، وہ روزے رکھے، یہ یقیناً اس کے لیے ڈھال ہے۔''[1]

نکاح کی استطاعت سے خرچے کی قدرت مراد ہے، مجامعت کی قدرت نہیں، کیوں کہ حدیث میں انہی کو مخاطب کیا گیا ہے جو مجامعت کی قدرت و صلاحیت رکھتے ہیں، اسی لیے آپ ﷺ نے اس کو روزہ رکھنے کا حکم دیا ہے جو مالی استطاعت نہیں رکھتا۔ یہ روزہ شہوت سے اس کے لیے ڈھال بن جائے گا۔ جو مالی استطاعت نہیں رکھتا کیا اس کے لیے شادی کے لیے قرض لینا مستحب ہے؟ اس میں حنبلی مذہب میں اختلاف ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ نِكَاحًا حَتّٰى يُغْنِيَهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ﴾ [النور: ٣٣]

''اور لازم ہے کہ حرام سے بہت بچیں وہ لوگ جو کوئی نکاح نہیں پاتے، یہاں تک کہ اللہ انھیں اپنے فضل سے غنی کر دے۔''

مردِ صالح وہی ہوتا ہے جو اللہ کے حقوق بھی ادا کرتا ہے اور بندوں کے حقوق بھی۔[2]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٧٧٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٠٠)

[2] مجموع الفتاوىٰ (٦/٣٢)

غیر محرم رشتے دار خواتین کے پاس آنا جانا

سوال ایک شخص اپنی بھابھی، چچا زاد اور خالہ زاد بہنوں کے پاس آتا جاتا تھا، کیا یہ جائز ہے یا ناجائز؟

جواب اس کے لیے ان کے ساتھ علاحدگی اختیار کرنا جائز نہیں، لیکن جب کسی دوسرے کے ساتھ آئے جس میں کسی خلوت اور شک کا شائبہ نہ ہو تو جائز ہے۔ واللہ أعلم [1]

مطلقہ کا سابقہ خاوند کے گھر رہنا اور کھانا پینا

سوال ایک آدمی نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دیں۔ ان دونوں کے دو بچے بھی ہیں۔ وہ کئی سال سے خاوند کے گھر میں مقیم ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں۔ کیا اس کے لیے اس کے گھر سے کھانا جائز ہے، جو وہ کھا رہی ہے یا نہیں؟ نیز کیا اس شخص کا اس پر کوئی حکم ہے یا نہیں؟

جواب جس عورت کو تین طلاقیں ہو جائیں وہ آدمی کے لیے دیگر تمام پرائی عورتوں کی طرح پرائی ہو جاتی ہے، جس طرح آدمی کے لیے کسی بھی غیر عورت کے ساتھ خلوت نشین ہونا جائز نہیں، اس کے ساتھ بھی جائز نہیں، اس لیے آدمی غیر عورت کے جسم کے جس حصے پر نظر نہیں ڈال سکتا، اس کے جسم کے ان حصوں پر بھی نظر نہیں ڈال سکتا اور اس شخص کا اس پر اصلاً کوئی حکم اور ذمے داری نہیں۔ اسی طرح وہ اس عورت کے ساتھ اس بات پر بھی اتفاق کرنے کا حق نہیں رکھتا کہ وہ کسی دوسرے سے شادی کرے، پھر اس سے طلاق لے کر دوبارہ اس کے پاس آ جائے۔

اس کام میں خرچ کرنے کے لیے اس کو کچھ دینا بھی اس کے لیے جائز نہیں، بلکہ اگر وہ کسی دوسرے آدمی کے ساتھ معمول کے مطابق نکاح کرتی ہے، پھر اس کا خاوند فوت ہو جاتا ہے، یا اس کو تین طلاقیں دے دیتا ہے تو ایسی صورت میں بھی یہ پہلا خاوند اس کو صریح الفاظ میں نکاح کا پیغام نہیں دے سکتا۔ اس پر سب کا اتفاق ہے اور ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا عَرَّضْتُمْ بِهِ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَاءِ أَوْ أَكْنَنْتُمْ فِي أَنْفُسِكُمْ عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ سَتَذْكُرُونَهُنَّ وَلَٰكِنْ لَا تُوَاعِدُوهُنَّ سِرًّا ﴾ [البقرة: ٢٣٥]

''اور تم پر اس بات میں کچھ گناہ نہیں جس کے ساتھ تم ان عورتوں کے پیغامِ نکاح کا اشارہ کرو، یا اپنے دلوں میں چھپائے رکھو، اللہ جانتا ہے کہ تم انھیں ضرور یاد کرو گے، اور لیکن ان سے پوشیدہ عہد و پیمان مت کرو۔''

اللہ تعالیٰ نے اس وقت تک نکاح کا عزم کرنے سے منع کیا ہے جب تک اس کی عدت پوری نہیں ہو جاتی۔

---

[1] مجموع الفتاویٰ (٩/٣٢)

اگر عدت میں اس طرح کے عہد و پیمان اور عزم و ارادے سے منع کیا گیا ہے تو اس وقت ایسا کرنا کیوں منع نہیں ہوگا جب وہ اپنے خاوند کی عصمت اور بندھن میں ہو، لیکن آدمی نے ابھی اس سے شادی ہی نہیں کی کہ اس سے کہہ رہا ہے تو شادی کر، پھر طلاق لے لے، اس کے بعد میں تجھ سے شادی کرلوں گا، یہ بالاتفاق حرام ہے، خواہ نکاحِ حلالہ کو صحیح کہا جائے یا غیر صحیح۔ اس بات میں فقہا میں کوئی اختلاف ہی نہیں کہ ایسی عورت کے ساتھ نکاح کی صریح الفاظ میں بات چیت اور عزم و ارادہ کرنا جائز نہیں، جو کسی دوسرے کی وجہ سے عدت گزار رہی ہو، یا کسی دوسرے کے نکاح میں ہو یا جس کو تین طلاقیں ہوگئی ہوں، جو یہ کام کرتا ہے، بالاتفاق دنیا و آخرت میں سزا کا مستحق ہے۔[1]

بالغ بیٹی کو نکاح پر مجبور کرنے کا باپ کا حق

سوال کیا باپ اپنی بالغ بیٹی کو نکاح پر مجبور کرنے کا حق رکھتا ہے یا نہیں؟

جواب اس مسئلے میں دو مشہور اقوال ہیں اور امام احمد سے دونوں روایات مروی ہیں:

1. باپ بالغ کنواری بیٹی کو مجبور کرسکتا ہے، یہ امام مالک اور شافعی کا مذہب ہے اور حنابلہ میں سے خرقی، قاضی اور اس کے اصحاب نے یہی موقف اختیار کیا ہے۔
2. باپ بالغ کنواری کو مجبور نہیں کرسکتا۔ یہ امام ابوحنیفہ کا مذہب ہے اور حنابلہ میں سے ابوبکر عبدالعزیز بن جعفر نے اسی کو پسند کیا ہے اور یہی درست ہے۔

اس مسئلے میں وجہ اختلاف ''مناط اجبار'' مجبور کرنے کی علت کا تعین ہے کہ آیا مجبور کرنے کی علت کنوار پن ہے، کم سنی ہے یا دونوں کا بیک وقت ہونا یا دونوں میں سے ہر ایک کا ہونا؟ تاہم صحیح یہ ہے کہ علتِ اجبار کم سنی ہے، بالغ کنواری کو کوئی نکاح پر مجبور نہیں کرسکتا۔ صحیح بخاری میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

«لَا تُنْكَحُ الْبِكْرُ حَتّٰى تُسْتَأْذَنَ وَلَا الثَّيِّبُ حَتّٰى تُسْتَأْمَرَ فَقِيلَ لَهُ: إِنَّ الْبِكْرَ تَسْتَحِي؟ فَقَالَ: إِذْنُهَا صُمَاتُهَا»[2]

''کنواری کا نکاح نہ کیا جائے، جب تک اس سے اجازت نہ لے لی جائے اور اسی طرح شوہر دیدہ کا بھی، جب تک اس سے مشورہ نہ لے لیا جائے۔ آپ ﷺ سے کہا گیا: کنواری تو شرماتی ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اس کی خاموشی ہی اس کی اجازت ہے۔''

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۳۲/۱۱۔۱۲)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٨٤٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤١٩)

صحیح میں یہ الفاظ بھی ہیں:

''کنواری کا باپ اس سے اجازت لے۔''

رسول اللہ ﷺ کے یہ الفاظ: « لَا تُنْکَحُ حَتّٰی تُسْتَأْذَنَ » ''اس کی اجازت کے بغیر اس کا نکاح نہ کیا جائے۔'' منع پر دلالت کرتے ہیں اور یہ باپ اور غیر باپ سب کو شامل ہیں۔

دوسری صحیح روایت میں صریحاً آیا ہے کہ خود باپ بھی اس سے اجازت لے۔

② اگر وہ سمجھدار ہو تو باپ اس کی اجازت کے بغیر اس کے مال میں تصرف نہیں کر سکتا۔ اس کا عضوِ عفت اس کی سب سے قیمتی متاع ہے۔ اگر وہ سمجھدار بھی ہو اور راضی بھی نہ ہو تو باپ کو اس میں تصرف کا کیا حق ہے؟

③ کم سنی نصِ قرآنی اور اجماع کی روشنی میں حجر (تصرفات میں پابندی) کا سبب ہے۔ کنوارے پن کو حجر کا سبب قرار دینا اصولِ اسلام کے خلاف ہے۔ شارع نے کسی بھی اجماعی جگہ پر اس کو حجر کا سبب قرار نہیں دیا، لہٰذا اس کو حجر کی علت قرار دینا۔ شریعت میں غیر موثر وصف کو علت قرار دینا ہے۔

④ جو کہتے ہیں: باپ مجبور کرنے کا حق رکھتا ہے۔ وہ اس صورت میں پریشان ہو جاتے ہیں جب وہ لڑکی کسی کفو (شرعی اعتبار سے مناسب شخص) کو مقرر کرے اور باپ کسی دوسرے کفو کو متعین کر دے؛ اب اس لڑکی کی تعیین کو لیا جائے یا باپ کی تعیین کو، شوافع اور حنابلہ کے مذاہب میں دونوں طرح کی آرا موجود ہیں، جس نے لڑکی تعیین کو معتبر سمجھا، اس نے خود اپنے قاعدے کی مخالفت کی اور جس نے باپ کی تعیین کو معتبر جانا تو اس میں جو فساد، ضرر اور شر ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں، کیوں کہ رسول اللہ ﷺ نے حدیث میں فرمایا:

''شوہر دیدہ اپنے بارے میں اپنے ولی سے زیادہ (فیصلہ کرنے کا) حق رکھتی ہے، کنواری سے اجازت لی جائے اور اس کی خاموشی ہی اس کی اجازت ہے۔''[1]

جب شوہر دیدہ کو اپنے بارے میں فیصلہ کرنے کا زیادہ حق ہے تو معلوم ہوا کہ کنواری کو اپنے بارے میں فیصلہ کرنے کا حق نہیں، اس کے ولی کو زیادہ حق ہے اور یہ حق باپ اور دادا کے علاوہ کسی کو حاصل نہیں۔ یہ باپ کو مجبور کرنے کا حق دینے والوں کی سب سے بنیادی دلیل ہے۔

انھوں نے حدیث کی نص اور ظاہر پر عمل ترک کر دیا اور دلیلِ خطاب کو اختیار کیا، مگر مرادِ رسول نہ جان پائے، کیوں کہ آپ ﷺ کا یہ فرمان: ''شوہر دیدہ اپنے ولی سے زیادہ اپنی ذات کا حق رکھتی ہے۔'' ہر ولی کو شامل ہے، جب کہ یہ اس کو باپ اور دادا کے ساتھ خاص کرتے ہیں۔ اس حدیث کا دوسرا حصہ ہے: ''کنواری سے اجازت لی جائے۔''

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٤٢١)

مگر یہ اس کی اجازت لینا واجب نہیں سمجھتے، بلکہ اسے مستحب قرار دیتے ہیں اور قیاس کو چلاتے ہوئے کہتے ہیں کہ چونکہ یہ مستحب ہے، اس لیے اس میں خاموشی پر اکتفا کیا گیا ہے، اگر یہ واجب ہوتی تو اس کا بولنا ضروری ہوتا۔ یہ بعض شوافع اور حنابلہ کی توضیحات ہیں۔

یہ موقف ان سے پہلے اہلِ اسلام کے اجماع اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نصوص اور الفاظ کے مخالف ہے، صحیح اور مشہور سنت اور ان سے پہلے ائمہ کے اتفاق سے یہ بات ثابت ہے کہ جب کنواری لڑکی کا بھائی یا چچا اس کی شادی کرتا اور اس کی اجازت لیتا تو اس کی خاموشی اس کی اجازت ہوتی۔ مفہومِ حدیث اس طرح ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کنواری اور شوہر دیدہ میں فرق کیا ہے، ایک حدیث میں آیا ہے: «لَا تُنْكَحُ الْبِكْرُ حَتَّى تُسْتَأْذَنَ وَلَا الثَّيِّبُ حَتَّى تُسْتَأْمَرَ» اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کنواری کے لیے "إذن" اور شوہر دیدہ کے لیے "أمر" کا لفظ استعمال کیا اور پہلی کی خاموشی کو اس کا اذن قرار دیا اور دوسرے کے بولنے کو اس کا اذن۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دو فرقوں کے ساتھ کنواری اور شوہر دیدہ میں فرق کیا ہے، اجبار اور عدمِ اجبار میں ان دونوں میں فرق نہیں کیا، کیوں کہ کنواری اپنے نکاح کے موضوع پر بات کرنے میں شرم محسوس کرتی ہے، اس لیے اس کو نکاح کا پیغام نہیں دیا جاتا، بلکہ اس کے ولی کو پیغام دیا جاتا ہے، ولی اس سے اجازت لیتا ہے تو وہ اس کو اجازت دیتی ہے، وہ اس کو ابتداءً حکم نہیں دیتی، بلکہ جب وہ اجازت مانگتا ہے، اس وقت اس کو اجازت دیتی ہے اور اس کی اجازت اس کی خاموشی ہی ہوتی ہے۔ شوہر دیدہ سے کنوارے پن کی حیا اتر چکی ہوتی ہے اور وہ نکاح کے موضوع پر کھل کر بات کر سکتی ہے، اس لیے اس کو نکاح کا پیغام دیا جاتا ہے، وہ پھر ولی کو اپنا نکاح کرنے کا حکم دیتی ہے تو وہ اس کو حکم دینے والی ہوئی۔ ولی کا کام ہے کہ وہ اس کے حکم کی تعمیل کرے اور اس کے حکم کے مطابق کفو کے ساتھ اس کی شادی کرے، لہٰذا ولی شوہر دیدہ کی طرف سے مامور ہوا اور کنواری کی طرف سے اذن طلب کرنے والا، یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کا مدلول و مفہوم ہے۔

اس کی ناپسندیدگی کے باوجود اس کی شادی کر دینا اصولِ اسلام اور عقل کے خلاف ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے اس کے ولی کو اس کی اجازت کے بغیر بیع یا اجارہ جیسے کسی مالی معاملے میں اس کو مجبور کرنے کی اجازت نہیں دی، اسی طرح وہ کھانے، پینے اور لباس وغیرہ میں بھی اس کو مجبور نہیں کر سکتا تو ایسے شخص کے ساتھ زندگی گزارنے اور شب باشی پر کیسے مجبور کر سکتا ہے جس کو وہ ناپسند کرتی ہو؟ اللہ تعالیٰ نے میاں بیوی کے درمیان مودت اور رحم دلی رکھی ہے اب ایسے تعلق میں کون سی رحم دلی اور مودت ہو گی، جہاں عورت کو ایسے شخص کے ساتھ زندگی گزارنے پر مجبور کیا جائے جس کو وہ ناپسند کرتی اور اس سے دور بھاگتی ہو؟

اگر میاں بیوی کے درمیان ناچاقی پیدا ہو جائے تو اللہ نے ایک فیصل (ثالث) بیوی کے گھر والوں کی طرف سے اور ایک فیصل خاوند کے گھر والوں کی طرف سے مقرر کرنے کا حکم دیا ہے۔ ان دو فیصلہ کرنے والوں سے مراد فیصلہ کرنے والے ہی ہیں، وکیل اور نائب نہیں، جیسا کہ فقہا کا ایک قول ہے، کیوں کہ وکیل ثالث نہیں ہوتا، اس کو متعین کرنے کے لیے سرکاری حکم کی ضرورت نہیں ہوتی، اس کے لیے اہلِ خانہ زوجین سے ہونے کی شرط نہیں ہوتی اور وہ صرف ناچاقی کے موقع کے ساتھ بھی خاص نہیں۔ جب میاں بیوی کے درمیان ناچاقی ہو جائے تو اس وقت دونوں کا معاملہ سلجھانے کے لیے ولی کا ہونا ضروری ہے، کیوں کہ خود میاں بیوی ایک دوسرے کے بارے میں فیصلہ دینے کی پوزیشن میں نہیں ہوتے، اس لیے اللہ نے ان دونوں کے گھر والوں کی طرف سے دو ثالث مقرر کرنے کا حکم دیا، تاکہ وہ ان کی شادی بچانے اور ناچاقی ختم کرنے کے لیے مثبت کردار ادا کریں یا اگر ایسا ممکن نہ ہو تو عوض یا عوض کے بغیر ان کے درمیان جدائی کروا دیں۔ یہاں خاوند کی طرف سے ثالث کو اس کی اجازت کے بغیر طلاق دینے اور بیوی کی طرف سے ثالث کو اس کی اجازت کے بغیر اس کے مال سے عوض دینے کا اختیار ہوتا ہے، کیوں کہ وہ دونوں کے ولی بن جاتے ہیں۔

علی ہذا القیاس باپ اگر مصلحت دیکھے تو اپنے کم سن بیٹے یا پاگل بچے کی طرف سے طلاق دے سکتا ہے، اسی طرح اپنی کم سن بیٹی کی طرف سے خلع بھی لے سکتا ہے، اگر اس میں مصلحت دیکھے، یہ امام احمد کے مذہب میں ایک روایت ہے۔ اس کے نظائر بے شمار ہیں۔ یہاں یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ عورت اگر کسی شخص کے ساتھ نکاح نہ کرنا چاہتی ہو تو شریعت اس کو مجبور نہیں کرتی، بلکہ اگر وہ خاوند کو ناپسند کرے اور ان کے درمیان جھگڑا کھڑا ہو جائے تو اس حالت میں اللہ تعالیٰ نے اس کا معاملہ خاوند کو چھوڑ کر کسی ایسے تیسرے شخص کے ہاتھ میں دے دیتے ہیں جو اس کی بھلائی اور مصلحت کو بہتر سمجھتا ہو اور وہ خاوند کی اجازت کے بغیر اس کو اس سے خلاصی دلا سکتا ہے، وہ اپنی رضامندی کے بغیر ساری زندگی اس کی غلامی پر مجبور نہیں کر سکتا، کیوں کہ عورت خاوند کی اسیر ہوتی ہے، رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

« اتَّقُوا اللّٰهَ فِي النِّسَاءِ فَإِنَّهُنَّ عَوَانٌ عِنْدَكُمْ أَخَذْتُمُوهُنَّ بِأَمَانَةِ اللّٰهِ وَاسْتَحْلَلْتُمْ فُرُوجَهُنَّ بِكَلِمَةِ اللّٰهِ »[1]

''عورتوں کے بارے میں اللہ سے ڈرو، وہ تمھارے پاس قیدی ہیں، تم نے اللہ کی امانت کے ساتھ انھیں پکڑا ہے اور اللہ کے کلمے کے ساتھ ان کی شرمگاہوں کو حلال کیا ہے۔''[2]

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٢١٨) سنن الترمذي، رقم الحدیث (٣٠٨٧)

[2] مجموع الفتاویٰ (٣٢/٢٢-٢٨)

اقارب اور حاکم کے نہ ہونے کی صورت میں بستی کے سرکردہ شخص کے ولی ہونے کی حیثیت

سوال اگر کسی بستی کا چودھری جو حکومت کی طرف سے مقرر اور ماذون نہ ہو، ولی ہونے یا نہ ہونے کی صورت میں کسی کا نکاح کروا دے تو کیا اس کا کیا ہوا نکاح درست ہوگا، بالخصوص جب وہ معتبر مسلمانوں کو گواہ بنائے؟

جواب الحمد للہ. جس عورت کا نسبی ولی ہو یا ولاء کے تعلق سے، اس کا ولی ہی اس کی اجازت سے اس کا نکاح کرے گا۔ نسبی ولی میں عصبہ، یعنی باپ دادا، بھائی، چچا، بھتیجا، چچا زاد بھائی، باپ کا چچا اور باپ کے چچا کا بیٹا شامل ہیں اور جمہور کے نزدیک بیٹا بھی ولی ہے۔ اگر وہ آزاد کی گئی ہو تو پھر اس کو آزاد کرنے والا یا آزاد کرنے والے کے عصبہ رشتے دار اس کی ولی ہوتے ہیں، ایسی عورت کو حاکم کی ضرورت نہیں ہوتی، اس پر علما کا اتفاق ہے۔

جب دو مسلمان گواہوں کی موجودگی میں نکاح پڑھایا جائے تو نکاح صحیح ہوتا ہے، چاہے وہاں بستی کا کوئی سربراہ موجود نہ ہو، بلکہ اگر وہ ایسے گواہ ہوں کہ عدالت نے ان کی صداقت کا سرٹیفکیٹ جاری نہ کیا ہو، یعنی ان کی ظاہری حالت مستور ہو، جب وہ اس نکاح کا اظہار کریں اور اس کو نہ چھپائیں تو ائمہ اربعہ کے ظاہر مذہب کے مطابق نکاح درست ہوگا۔

امام ابو حنیفہ کے نزدیک اور امام احمد سے مروی ایک روایت کے مطابق اگر نکاح دو فاسقوں کی موجودگی میں ہو، تب بھی صحیح ہوگا اور امام مالک کے نزدیک اور امام احمد سے مروی ایک روایت کی روشنی میں اگر نکاح گواہوں کی موجودگی میں نہ ہوا ہو، بلکہ ولی نے نکاح کر دیا اور وہ لوگوں میں مشہور ہو گیا تو بھی صحیح ہوگا، یہ زیادہ ظاہر قول ہے۔

مسلمان عہدِ رسالت ہی سے عورتوں کی شادی کرتے آئے ہیں اور آپ ان کو گواہ بنانے کا حکم نہیں دیتے تھے، نکاح میں گواہ مقرر کرنے کی شرط کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں۔ صحاح، سنن اور مسانید میں کوئی ایسی حدیث نہیں ملتی، البتہ جس کا کوئی ولی نہ ہو تو بستی میں جو حکومتی نمایندہ ہو، دیہاتیوں کا امیر اور سربراہ ہو یا کوئی امام مطاع ہو تو وہ اس کی اجازت سے اس کا نکاح کر سکتا ہے۔ واللہ أعلم [1]

نکاح کے گواہوں کے لیے شرط

سوال ایک شخص نے ایک آزاد عورت کو نکاح کا پیغام دیا، جس کا ولی حاکم نہیں، وہ ایسے گواہ لے کر گیا جن کا فاسق ہونا معلوم ہے، لیکن اگر وہ حاکم کے پاس گواہی دیں تو ان کی گواہی قبول ہو جائے گی، کیا ان کی گواہی سے عورت کا نکاح صحیح ہوتا ہے یا مکروہ؟

---

[1] مجموع الفتاویٰ (٣٢/٣٤-٣٥)

جواب اس صورتِ حال میں نکاح صحیح ہے، نکاح کے گواہوں میں جس عدالت و دیانت کی شرط ہے۔ وہ یہ ہے کہ ان کی حالت مستور ہو، ظاہری طور پر فاسق نہ ہوں، گو باطنی طور پر فاسق ہی ہوں، مگر ان کا فسق ظاہر نہ ہو، ظاہری طور پر وہ مستور الحال ہی ہوں تو شافعی اور احمد کے مذہب میں علما کے صحیح تر قول کے مطابق ان کی گواہی کے ساتھ نکاح ہو جاتا ہے، کیوں کہ اگر نکاح کے گواہوں کے لیے قاضی کے نزدیک عادل و دیانت دار ہونے کی شرط لگا دی جائے تو اکثر کا نکاح اس کے بغیر درست نہیں ہوگا، جب رسول اللہ ﷺ اور ابوبکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم کے زمانوں میں لوگ حاضرین کی موجودگی میں نکاح کر لیتے تھے، چاہے حاضرین اولو الامر کے نزدیک صداقت یافتہ نہ بھی ہوتے، کچھ فقہا نے یہ شرط لگائی ہے کہ ان کی عدالت و صداقت نمایاں اور ظاہر ہو، یہ حکام کے گواہ اور ان کے نزدیک صداقت یافتہ ہوں، چاہے نفسِ امر میں ان میں کوئی فاسق ہی ہو، تاہم دونوں مفروضوں کی بنا پر ان کی گواہی سے نکاح منعقد ہو جاتا ہے، چاہے وہ باطنی طور پر فاسق ہی ہوں۔ واللہ أعلم[1]

شوہر دیدہ اور کنواری کی اجازت سے متعلقہ احادیث کی وضاحت

سوال درج ذیل احادیث کا مفہوم کیا ہے:

1. ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''بیوہ (شوہر دیدہ) کا نکاح اس سے مشورہ لیے بغیر نہ کیا جائے۔ کنواری کا نکاح اس کی اجازت لیے بغیر نہ کیا جائے۔ انھوں نے کہا: اے اللہ کے رسول! اس کی اجازت کیسے ہوگی؟ فرمایا: خاموش رہے۔'' (متفق علیہ)[2]
2. حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''بیوہ اپنے ولی کی نسبت اپنا زیادہ حق رکھتی ہے، کنواری سے اس سے متعلق اجازت لی جائے، اس کی خاموشی اس کا اقرار ہے۔'' (صحیح مسلم)[3]
3. حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، کہتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے کنواری لڑکی سے متعلق پوچھا، جس کے گھر والے اس کا نکاح کرتے ہیں، کیا اس سے مشورہ لیا جائے گا یا نہیں؟ آپ ﷺ نے ان سے کہا: ہاں، اس سے مشورہ لیا جائے گا، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا: میں نے کہا: وہ شرماتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: یہی اس کی اجازت ہے کہ وہ خاموش رہی۔[4] خنساء بنت خدام سے مروی ہے، ان کے والد نے ان کی شادی

---

[1] مجموع الفتاویٰ (٣٢/٣٨)

[2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٤٨٤٣) صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٤١٩)

[3] صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٤٢١)

[4] صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٤٢٠)

کر دی، وہ لڑکی تھی اور اس نے اس کو ناپسند کیا، وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آئی تو آپ ﷺ نے اس کا نکاح ختم کر دیا۔ (رواہ البخاري)[1]

جواب عورت کی اجازت کے بغیر اس کی شادی نہیں کرنی چاہیے، جس طرح رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا ہے، اگر وہ ناپسند کرتی ہو تو اس کو نکاح پر مجبور نہیں کیا جا سکتا، ہاں اگر وہ نابالغ ہو تو اس کا باپ اس کی شادی کر سکتا ہے۔ اس کے پاس اجازت کا حق نہیں، مگر بالغ شوہر دیدہ کی شادی اس کی اجازت کے بغیر کرنا باپ کے لیے جائز ہے نہ کسی اور ہی کے لیے، اس پر اہلِ اسلام کا اجماع ہے۔ اسی طرح بالغ کنواری کی شادی اس کی اجازت کے بغیر باپ اور دادا کے علاوہ کوئی نہیں کر سکتا، اس پر بھی اجماع ہے۔ باپ اور دادا کو اس سے اجازت لینی چاہیے، البتہ اس سے اجازت لینے کے واجب اور مستحب ہونے میں اختلاف ہے، مگر صحیح قول کے مطابق اس سے اجازت لینا واجب ہے۔ عورت کے ولی کو رشتہ طے کرتے وقت اللہ سے ڈرنا چاہیے اور دیکھنا چاہیے کہ رشتہ مناسب اور لائق بھی ہے کہ نہیں، کیوں کہ وہ اپنے مفاد کے لیے نہیں عورت کے مفاد کے لیے اس کی شادی کرتا ہے۔ اس لیے وہ اپنے کسی مفاد کے لیے اس کی ناقص اور غیر مناسب سے شادی طے کرنے کا اختیار نہیں رکھتا۔ مثلاً کچھ لوگ اس لیے کسی غیر مناسب شخص سے رشتہ طے کر دیتے ہیں کہ بدلے میں اس سے رشتہ لے سکیں یا وہاں سے اچھا خاصا مال مل رہا ہو، یا ایسے حلیفوں کے ساتھ رشتہ طے کر دیا جاتا ہے جن کے ساتھ غلط مفادات کے پیشِ نظر گٹھ جوڑ ہوتا ہے، حالانکہ دوسری طرف ایسا رشتہ ہوتا ہے جو اس سے بہتر اور زیادہ مناسب ہوتا ہے یا کچھ لوگ ولی کو رشوت اور مالی مفادات کا لالچ دے کر بھی رشتہ لے لیتے ہیں اور جو رشوت نہیں دے سکتا اس کو انکار کر دیا جاتا ہے، بھلے وہ زیادہ مناسب اور صالح ہی ہو۔

ولی کے پیچھے اصل فلسفہ یہ ہے کہ وہ جس طرح اپنی ماتحت کے مال میں تصرف کرتے وقت ایسا فیصلہ کرنے سے اجتناب کرتا ہے جو اس کے مفاد کے خلاف ہو، اسی طرح اس کی شادی کرتے وقت بھی اس کو ایسا کام ہی کرنا چاہیے جو اس کے لیے زیادہ مناسب اور صحیح ہو، اس میں صرف باپ کو استثنا حاصل ہے کہ وہ اپنی اولاد کے مال پر تصرف کرنے کا پورا اختیار رکھتا ہے جو کسی دوسرے کو حاصل نہیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

«أَنْتَ وَمَالُكَ لِأَبِيكَ»[2]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٨٤٥)

[2] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٢٩١) صحيح الجامع (١٤٨٦)

''تو اور تیرا مال تیرے باپ کا ہے۔''

باپ کے علاوہ کسی اور کو یہ حق حاصل نہیں۔ ①

نابالغ لڑکی سے نکاح کا حکم

سوال ایک شخص ایک نابالغ لڑکی کے ساتھ شادی کرنے کی تمنا رکھتا ہے، کیا حاکم (قاضی) کے لیے اس کی شادی کرنا جائز ہے یا ناجائز؟

جواب الحمد للہ. اگر نکاح کا پیغام دینے والا ہر لحاظ سے اس لڑکی کے لیے لائق اور قابل ہو تو ابو حنیفہ کے مذہب میں اور احمد سے ایک روایت کے مطابق علما کے صحیح تر قول کے مطابق اس کے لیے اس کی شادی کرنا جائز ہے۔

اس میں آگے تفصیل ہے، ابو حنیفہ کے مذہب اور دوسری روایت میں احمد کے نزدیک اس لڑکی کی اجازت کے بغیر اس کی شادی کی جا سکتی ہے، مگر اس کے پاس اختیار ہے اور احمد کے ظاہر مذہب کے مطابق جب وہ نو سال کی ہو تب وہ اس کی اجازت سے اس کی شادی کرے اور بالغ ہونے پر اس کے پاس اختیار نہیں ہوگا، کیوں کہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

''یتیمہ سے اجازت لیے بنا اس کا نکاح نہ کیا جائے۔ اگر وہ خاموش رہے تو اس نے اجازت دے دی، اگر انکار کر دے تو اس پر کوئی جواز نہیں۔'' (رواه أبو داود والنسائي) ②

یتیمہ کی شادی کرنا کتاب و سنت سے ثابت ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَيَسْتَفْتُونَكَ فِي النِّسَآءِ ۖ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيكُمْ فِيهِنَّ وَمَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ فِيْ يَتٰمَى النِّسَآءِ الّٰتِيْ لَا تُؤْتُوْنَهُنَّ مَا كُتِبَ لَهُنَّ وَ تَرْغَبُوْنَ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الْوِلْدَانِ ﴾ [النساء: ١٢٧]

''اور وہ تجھ سے عورتوں کے بارے میں فتویٰ پوچھتے ہیں، کہہ دے اللہ تمھیں ان کے بارے میں فتویٰ دیتا ہے اور جو کچھ تم پر کتاب میں پڑھا جاتا ہے وہ ان یتیم عورتوں کے بارے میں ہے جنھیں تم وہ نہیں دیتے جو ان کے لیے فرض کیا گیا ہے اور رغبت رکھتے ہو کہ ان سے نکاح کر لو اور نہایت کمزور بچوں کے بارے میں ہے۔''

---

① مجموع الفتاویٰ (٣٢/٣٩۔٤٠)

② سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٠٩٣) سنن الترمذي، رقم الحديث (١١٠٩) سنن النسائي، رقم الحديث (٣٢٧٠) صحيح الجامع، رقم الحديث (٨١٩٤)

صحیح میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے: یہ اس یتیمہ سے متعلق نازل ہوئی جس کے پاس مال ہو اور اس کا ولی اس کے نکاح میں رغبت رکھتا ہو، اگر مال نہ ہو تو پھر وہ اس کے نکاح میں دلچسپی نہیں رکھتا، اس لیے اللہ تعالیٰ ان سے نکاح سے منع کر دیا، تاآنکہ وہ ان کے حق مہر میں انصاف سے کام لیں۔ اللہ نے ولی کو یتیمہ سے نکاح کی اجازت دی ہے، اگر وہ اس کو مہرِ مثل دے۔[1] واللہ أعلم[2]

عورت کی مرضی کے بغیر اور نالائق شخص سے نکاح کر دینے کا حکم

سوال ایک شخص نے اپنی بھتیجی کی شادی اپنے بیٹے سے کی، خاوند فاسق اور بے نماز ہے، لڑکی کو دھمکا کر اس سے نکاح کی اجازت لی گئی اور اس سے کہا گیا: اگر تو اجازت نہیں دے گی تو شریعت تیرے اختیار کے بغیر ہی اس کے ساتھ شادی کر دے گی۔ اب اس شخص نے اس لڑکی کے مال پر قبضہ کر لیا ہے اور اس کی ماں وغیرہ کو اس کے پاس بھی نہیں آنے دیتا، تاکہ حقیقتِ حال کھل نہ جائے، اس کے متعلق شریعت کیا کہتی ہے؟

جواب الحمد للہ. چچا یا کوئی بھی سرپرست اپنی زیرِ سرپرستی کی شادی اس کی اجازت کے بغیر کسی نالائق اور نامناسب شخص کے ساتھ کرنے کا اختیار نہیں رکھتا، اس پر سب ائمہ کا اتفاق ہے۔ اگر وہ ایسا کرے تو ایسی سخت سزا کا مستحق ہے جو اس کو دوسروں کے لیے نمونۂ عبرت بنا دے، بلکہ اگر وہ نالائق اور نااہل کے ساتھ شادی کرنے پر رضا مند ہو تو شادی کرنے والے ولی کے علاوہ دوسرا ولی اس کا نکاح فسخ کر سکتا ہے، چچا تو بالغ عورت کو لائق اور اہل کے ساتھ شادی کرنے پر مجبور کرنے کا حق نہیں رکھتا، چہ جائیکہ وہ اس کو نالائق کے ساتھ شادی کرنے پر مجبور کرے، بلکہ وہ اس کی شادی اسی کے ساتھ کرنے کا مجاز ہے جس کے ساتھ شادی کرنے کی وہ اجازت دے، اس پر مسلمانوں کا اتفاق ہے۔

اگر اس نے اس سے کہا ہے کہ اگر تو نے اجازت نہ دی تو شریعت تیری اجازت کے بغیر تیری شادی کر دے گی، یہ سن کر اس نے اجازت دے دی تو یہ اجازت درست نہیں اور اس کے نتیجے میں وقوع پذیر ہونے والا نکاح بھی درست نہیں، کیوں کہ شریعت نے بالاتفاق باپ اور دادا کے علاوہ کسی کو بھی چھوٹی عمر کی (نابالغ) بیٹی کو نکاح پر مجبور کرنے کا اختیار نہیں دیا، البتہ باپ دادا کے بڑی عمر کی (بالغ) لڑکی کو مجبور کرنے میں علما کا اختلاف ہے۔ اگر اس نے صحیح نکاح کے ساتھ اس کی شادی کی ہے تو وہ اس کے حقوق ادا کرے، نہ اس کی ذات پر ظلم و زیادتی کرے نہ اس

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٨٣٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٠١٨)

[2] مجموع الفتاویٰ (٤٩/٣٢)

کے مال ہی پر قبضہ جمائے، بلکہ اس نے جو مال اس سے لیا ہے اس کا تاوان بھرے۔ اسی طرح اگر اس کو کوئی شکوہ ہے تو وہ اس کو کسی کے سامنے اپنا حال بیان کرنے سے روکنے کا مجاز نہیں، بلکہ یا کسی ایسے فرد مثلاً اس کی ماں وغیرہ کو اس کے پاس آنے کی اجازت دے جس کے سامنے وہ حالِ دل کھول سکے یا ایسے سچے پڑوسیوں کی ہمسائیگی میں رہے جو اس کا حال کھول سکیں۔ واللہ أعلم[1]

سوتیلے باپ کی ناپسندیدگی اور لڑکی کی اجازت کے بغیر بھائی یا چچا کا نکاح کر دینا

سوال ایک یتیم لڑکی کا ہاتھ کسی سرکاری افسر نے مانگا۔ اس لڑکی کا سوتیلا باپ اس شخص کو پسند نہیں کرتا۔ کیا اس لڑکی کا بھائی یا چچا اس لڑکی کی اجازت کے بغیر اس کے ساتھ اس کی شادی کر سکتا ہے یا نہیں؟

جواب الحمد للہ. بالغ عورت کی شادی اس کی اجازت کے بغیر باپ دادا کے علاوہ کوئی نہیں کر سکتا۔ اس پر سب ائمہ کا اتفاق ہے، بلکہ ایک قول کے مطابق باپ بھی اس کی اجازت کے بغیر اس کی شادی نہیں کر سکتا اور یہی صحیح تر قول ہے۔ امام ابوحنیفہ کا مذہب بھی یہی ہے اور احمد سے ایک روایت بھی یہی ہے، کیوں کہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

''کنواری کی شادی نہ کی جائے جب تک اس سے مشورہ نہ لے لیا جائے، کہا گیا: اے اللہ کے رسول! کنواری شرماتی ہے! آپ ﷺ نے فرمایا: اس کی خاموشی ہی اس کی اجازت ہے۔''[2]

ایک روایت میں ہے:

''اس کا باپ اس سے اجازت لے اور اس کی خاموشی اس کی اجازت ہے۔''[3]

چچا اور بھائی تو بالاتفاق اس کی اجازت کے بغیر اس کی شادی کرنے کا اختیار نہیں رکھتے۔ اگر وہ کسی شخص کے ساتھ شادی کرنے پر رضا مند ہو جو اس کے لائق اور اہل بھی ہو تو اس کا ولی پہلے بھائی پھر چچا، اس کے ساتھ اس کی شادی کرے۔ اگر وہ اس کے ساتھ اس کی شادی نہ کرے اور رکاوٹ ڈالے تو دور کا ولی اس کی شادی کرے یا حاکم اس ولی کی اجازت کے بغیر اس کی شادی کرے، اس پر بھی علما کا اتفاق ہے۔

ولی نہ تو اس کو ایسے شخص کے ساتھ شادی کرنے پر مجبور کر سکتا ہے جس کو وہ ناپسند کرتی ہو اور نہ ایسے شخص سے شادی کرنے سے روک ہی سکتا ہے جس سے وہ شادی کرنا پسند کرتی ہو اور وہ اس کے اہل بھی ہو، یہ بھی اتفاقی مسئلہ ہے۔ اس کو نکاح پر مجبور کرنا اور نکاح سے روکنا اہلِ جاہلیت اور ظالموں کا وتیرہ ہے جو اپنی مرضی اور اپنے مقاصد کے

---

[1] مجموع الفتاویٰ (٣٢/٥٦_٥٧)

[2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٤٨٤٣) صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٤١٩)

[3] صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٤٢١)

لیے اپنی عورتوں کی شادی جس کے ساتھ چاہتے ہیں کرتے ہیں اور عورتوں کی مرضی اور مصلحت ان کے پیشِ نظر نہیں ہوتی، وہ عورت کو مجبور کرتے ہیں یا اتنا شرمندہ کرتے ہیں کہ وہ ان کا فیصلہ ماننے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ اسی طرح اپنی کسی عداوت یا غرض کے لیے ایسے شخص کے ساتھ شادی نہیں کرتے جو اہلِ علم ہو۔ یہ سب ظلم و زیادتی اور جاہلیت کے کام ہیں جو اللہ اور رسول نے حرام کیے ہیں اور سب مسلمان ان کو حرام ہی سمجھتے ہیں۔ اللہ نے عورتوں کے سرپرستوں کی یہ ذمے داری لگائی ہے کہ وہ عورت کے مفاد و مصلحت کو پیشِ نظر رکھیں، اپنے اغراض و مفادات کو نہیں، یہ تمام قسم کے سرپرستوں اور نائبوں کو حکم ہے جو دوسرے کے امور میں تصرف کرنے کا اختیار رکھتے ہیں، ان کے پیشِ نظر اپنی نفس پرستی نہیں، بلکہ اس کا مفاد ہونا چاہیے، جس کے امور کے وہ نگران اور مختار ہیں، یہ امانت ہے اللہ نے اس کو اس کے مالکوں کو لوٹانے کا حکم دیا ہے، ارشاد ہے:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ﴾ [النساء: ۵۸]

''بے شک اللہ تمھیں حکم دیتا ہے کہ تم امانتیں ان کے حق داروں کو ادا کرو اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو انصاف سے فیصلہ کرو۔''

نیز یہ اس خیر خواہی سے تعلق رکھتا ہے جو ہر ایک کے لیے ضروری ہے، رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''دین نصیحت اور خیر خواہی ہے، دین خیر خواہی ہے، دین خیر خواہی ہے۔ پوچھا گیا: کس کے لیے؟ فرمایا: اللہ، اس کے رسول، اس کی کتاب، مسلمانوں کے اماموں اور عام مسلمانوں کے لیے۔''[1] واللّٰه أعلم[2]

ان عورتوں کا ذکر جن سے نکاح کرنا حرام ہے

سوال کن کن عورتوں سے نکاح کرنا حرام ہے؟

جواب وہ عورتیں جن سے نسبی تعلق کی وجہ سے نکاح کرنا حرام ہوتا ہے اس کا یہ ضابطہ ہے کہ چچا زاد، ماموں زاد، پھوپھو زاد اور خالہ زاد کے سوا تمام نسبی اقارب سے نکاح کرنا حرام ہے۔ یہ چار اصناف اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کے لیے حلال قرار دی ہیں، ارشاد ہے:

﴿ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَحْلَلْنَا لَكَ اَزْوَاجَكَ الّٰتِيْٓ اٰتَيْتَ اُجُوْرَهُنَّ وَمَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ مِمَّآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلَيْكَ وَبَنٰتِ عَمِّكَ وَبَنٰتِ عَمّٰتِكَ وَبَنٰتِ خَالِكَ وَبَنٰتِ خٰلٰتِكَ الّٰتِيْ هَاجَرْنَ مَعَكَ ۡ وَامْرَاَةً

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۵۵)

[2] مجموع الفتاویٰ (۳۲/۵۲۔ ۵۳)

مُّؤْمِنَةً اِنْ وَّهَبَتْ نَفْسَهَا لِلنَّبِيِّ اِنْ اَرَادَ النَّبِيُّ اَنْ يَّسْتَنْكِحَهَا خَالِصَةً لَّكَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ [الأحزاب: ٥٠]

''اے نبی! بے شک ہم نے تیرے لیے تیری بیویاں حلال کر دیں جن کا تو نے مہر دیا ہے اور وہ عورتیں جن کا مالک تیرا دایاں ہاتھ بنا ہے، اس (غنیمت) میں سے جو اللہ تجھ پر لوٹا کر لایا ہے اور تیرے چچا کی بیٹیاں اور تیری پھوپھیوں کی بیٹیاں اور تیرے ماموں کی بیٹیاں اور تیری خالاؤں کی بیٹیاں جنھوں نے تیرے ساتھ ہجرت کی ہے اور کوئی بھی مومن عورت اگر وہ اپنا آپ نبی کو ہبہ کر دے، اگر نبی چاہے کہ اسے نکاح میں لے لے۔ یہ خاص تیرے لیے ہے، مومنوں کے لیے نہیں۔''

اس آیتِ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو ان چار اصناف کے ساتھ شادی کرنے کی اجازت دی ہے اور ان اصناف کو اپنے رسول کے لیے خاص نہیں کیا بلکہ عام مومنوں کو بھی اس کی اجازت دی ہے۔ صرف اس عورت کو آپ ﷺ کے لیے خاص کیا ہے جو نبی ﷺ کو اپنا آپ ہبہ کر دے۔ یہ آپ ﷺ کی خصوصیت ہے۔ آپ کو موہوبہ کے ساتھ بلامہر نکاح کی اجازت تھی جو آپ ﷺ کے لیے خاص تھی اور تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ آپ ﷺ کے علاوہ کسی دوسرے کو یہ اجازت نہیں دی گئی، بلکہ کسی بھی امتی کے لیے وجوبِ مہر اور مہر مقرر کیے بغیر کسی عورت سے استمتاع جائز نہیں۔ قرآن کریم میں ہے:

﴿ وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ ﴾ [النساء: ٢٤]

''اور تمھارے لیے حلال کی گئی ہیں جو ان کے سوا ہیں کہ اپنے مالوں کے بدلے طلب کرو، اس حال میں کہ نکاح میں لانے والے ہو، نہ کہ بدکاری کرنے والے۔''

علمائے کرام کا اتفاق ہے کہ کوئی شخص مہر مقرر کیے بغیر نکاح کرے تو نکاح صحیح ہوگا اور دخول کی صورت میں مہر فرض ہو جائے گا۔ اگر وہ دخول سے پہلے ہی طلاق دے دے تو پھر مہر عورت کا حق نہیں، بلکہ قرآن کی نص کی روشنی میں اس کو کچھ مالی فائدہ دے دیا جائے، جسے ''متعۂ طلاق'' کہا جاتا ہے۔ اگر دخول سے پہلے ہی خاوند فوت ہو جائے، اس کے مہر کے متعلق علما کے دو اقوال ہیں، اس مسئلے کی مثال حضرت بروع بنت واشق کا واقعہ ہے، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے اس طرح کے مسئلے کے متعلق فتویٰ پوچھا گیا تو انھوں نے جواب میں کہا: یہ میری ذاتی رائے ہے، اگر صحیح ہے تو اللہ کی طرف سے ہے اور اگر غلط ہے تو میری اور شیطان کی طرف سے ہے، اللہ اور اس کے رسول اس سے بَری ہیں، اس کو مہرِ مثل دیا جائے اور اس میں کوئی کمی بیشی نہ ہو، وہ عدت بھی گزارے اور وراثت کی حق دار بھی ہے تو اشجع قبیلے کے کچھ آدمیوں نے کہا: ہم گواہی دیتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے بروع بنت واشق کے معاملے میں بھی

یہی فیصلہ کیا تھا جو آپ نے اس معاملے میں کیا ہے۔ علقمہ کہتے ہیں کہ میں نے عبداللہ کو اس کی طرح کسی چیز پر خوش ہوتے نہیں دیکھا۔[1]

فقہائے کوفہ ابوحنیفہ وغیرہ، فقہائے حدیث احمد بن حنبل وغیرہ اور ایک قول میں امام شافعی کا مذہب بھی یہی ہے جو عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے جواب دیا تھا۔ امام مالک کے نزدیک اور شافعی کے دوسرے قول کے مطابق وہ مہر کا حق نہیں رکھتی، یہ حضرت علی اور حضرت زید وغیرہ اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے۔

اگر نکاح میں مہر نہ دینے کی شرط لگائی جائے تو کیا نکاح درست ہوگا؟ اس میں فقہا کا اختلاف ہے۔ ایک قول کے مطابق نکاح باطل ہوگا۔ یہ امام مالک اور ایک قول میں امام احمد کا مذہب ہے۔ دوسرے قول کے مطابق نکاح درست ہوگا اور مہرِ مثل فرض ہوگا۔ یہ امام ابوحنیفہ، شافعی اور دوسرے قول میں امام احمد کا مذہب ہے۔ پہلے کہتے ہیں کہ یہ نکاحِ شغار (بٹہ سٹہ کا نکاح) ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے باطل اور لغو قرار دیا ہے، کیوں کہ اس میں مہر کی نفی کی جاتی ہے اور شرم گاہ کو شرم گاہ کے مقابلے میں مہر قرار دیا جاتا ہے، یہ علت امام احمد اور ان کے اکثر قدیم اصحاب نے بیان کی ہے۔ دوسرے گروہ میں امام ابوحنیفہ نکاحِ شغار کو صحیح قرار دیتے ہیں، ان کی رائے اس اصل پر صحیح قیاس ہے، مگر نص اور آثارِ صحابہ کے مخالف ہے، کیوں کہ صحابہ نے نکاحِ شغار کو باطل کہا ہے۔ جو اسے باطل کہتے ہیں وہ ایک تو اس کی علت وہی بیان کرتے ہیں جو ابھی گزری ہے اور کچھ دوسری علتیں بھی بیان کی جاتی ہیں۔ تاہم پہلا قول نص اور صحیح قیاس سے زیادہ قربت اور مشابہت رکھتا ہے۔

اسی طرح اس مسئلے میں بھی فقہا کا اختلاف ہے کہ کیا لفظ "تملیک" اور "ہبہ" وغیرہ سے بھی نکاح ہو جاتا ہے یا نہیں؟ جمہور کے نزدیک ان الفاظ سے نکاح ہو جاتا ہے اور امام شافعی کے نزدیک نہیں ہوتا۔

یہاں یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے موہوبہ کے ساتھ نکاح کرنا صرف اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت بیان کی ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَامْرَاَةً مُّؤْمِنَةً اِنْ وَّهَبَتْ نَفْسَهَا لِلنَّبِيِّ اِنْ اَرَادَ النَّبِيُّ اَنْ يَّسْتَنْكِحَهَا خَالِصَةً لَّكَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ [الأحزاب: ٥٠]

"اور کوئی بھی مومن عورت اگر وہ اپنا آپ نبی کو ہبہ کر دے، اگر نبی چاہے کہ اسے نکاح میں لے لے۔ یہ خاص تیرے لیے ہے، مومنوں کے لیے نہیں۔"

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢١١٦) سنن الترمذي، رقم الحديث (١١٤٥) سنن النسائي، رقم الحديث (٣٣٥٤) شیخ البانی رحمہ اللہ نے إرواء الغلیل (٣٨٤/١) میں اسے صحیح کہا ہے۔

اس آیت کے مدلول سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے علاوہ وہ تمام عورتیں جو اللہ نے اپنے نبی کے لیے حلال کیں، ان سے نکاح کرنا آپ کی امت کے لیے بھی حلال اور جائز ہے۔ اسی طرح یہ آیت بھی اسی پر دلالت کرتی ہے

﴿ فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا لِكَيْ لَا يَكُوْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ حَرَجٌ فِيْٓ اَزْوَاجِ اَدْعِيَاۗىِٕهِمْ اِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا ۭ ﴾ [الأحزاب: ٣٧]

''پھر جب زید نے اس سے اپنی حاجت پوری کر لی تو ہم نے تجھ سے اس کا نکاح کر دیا، تاکہ مومنوں پر اپنے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں کے بارے میں کوئی تنگی نہ ہو، جب وہ ان سے حاجت پوری کر چکیں۔''

جب اللہ تعالیٰ نے منہ بولے بیٹے کی بیوی، بالخصوص رسول اللہ ﷺ کے لیے حلال کی، تاکہ اس کو مومنوں کے لیے بھی حلال کیا جائے تو معلوم ہوا جو آپ کے حلال کیا گیا وہ آپ ﷺ کی امت کے لیے بھی حلال کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کے لیے چچا زاد، پھوپھی زاد، ماموں زاد اور خالہ زاد رشتے دار عورت کو حلال کیا اور خصوصی طور پر ان کا ذکر کر کے بتایا کہ ان کے سوا سب حرام ہیں اور اس کے بعد بالخصوص فرما دیا:

﴿ لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَاۗءُ مِنْۢ بَعْدُ وَلَآ اَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ اَزْوَاجٍ ﴾ [الأحزاب: ٥٢]

''تیرے لیے اس کے بعد عورتیں حلال نہیں اور نہ یہ کہ تو ان کے بدلے کوئی اور بیویاں کر لے۔''

یعنی ان عورتوں کے بعد جو ہم نے آپ کے لیے حلال کی ہیں اور جن کا ذکر اس آیت میں ہوا ہے:

﴿ حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ وَبَنٰتُكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ وَعَمّٰتُكُمْ وَخٰلٰتُكُمْ وَبَنٰتُ الْاَخِ وَبَنٰتُ الْاُخْتِ ﴾ [النساء: ٢٣]

''حرام کی گئی تم پر تمھاری مائیں اور تمھاری بیٹیاں اور تمھاری بہنیں اور تمھاری پھوپھیاں اور تمھاری خالائیں اور بھتیجیاں اور بھانجیاں۔''

''امہات'' میں باپ کی ماں اوپر تک اور ماں کی ماں اوپر تک سب بلا اختلاف شامل ہیں۔ ''بنات'' میں بیٹے کی بیٹی اور بیٹی کی بیٹی نیچے تک سب بلا اختلاف داخل ہیں۔ ''اخوات'' میں ماں باپ کی طرف سے سگی بہن، باپ کی طرف سے بہن اور ماں کی طرف سے بہن سب شامل ہیں۔ ''عمات'' اور ''خالات'' میں ماں باپ کی پھوپھیاں اور ماں باپ کی خالائیں بھی شامل ہیں۔ ''بنات الاخ'' (بھتیجیاں، بھانجیاں) میں نیچے تک بھائیوں بہنوں کی اولاد شامل ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ آدمی پر اس کے اصول (ماں باپ کی طرف سے) فروع (اولاد کی طرف سے اور دور کے اصول کے فروع، چچا کی بیٹیوں، پھوپھی کی بیٹیوں، ماموں کی بیٹیوں اور خالہ کی بیٹیوں کے سوا سب حرام ہیں۔

وہ عورتیں جو سسرالی رشتے کی وجہ سے حرام ہوتی ہیں، اقارب کے خلاف اس میں چار اصناف کے سوا تمام

عورتیں حلال ہوتی ہیں۔ اقارب میں چار اصناف کے سوا سب حرام ہوتی ہیں، اور زوجین کی اقارب چار اصناف کے سوا سب حلال ہوتی ہیں، وہ چار اصناف یہ ہیں:

① باپوں کی بیویاں ② بیٹوں کی بیویاں

③ بیویوں کی مائیں ④ بیویوں کی بیٹیاں

زوجین میں سے ہر ایک پر اس کے اصول اور فروع حرام ہیں۔ آدمی پر اس کی بیوی کی ماں، اس کی ماں (نانی ساس، دادی ساس) اوپر تک حرام ہیں اور اس کی بیوی کی کسی دوسرے خاوند سے بیٹی، اس کی بیٹی نیچے تک حرام ہیں، اسی طرح بیوی کے پہلے خاوند سے بیٹے کی بیٹی بھی حرام ہوتی ہے، اس پر تمام مشہور ائمہ کا اتفاق ہے۔ آدمی کے باپ کی بیوی اوپر تک اور اس کے بیٹے کی بیوی نیچے تک اس پر حرام ہوتی ہیں۔ سسرالی رشتے (مصاہرت) کی وجہ سے حرام ہونے والی یہ چار اصناف ہیں جن کا تذکرہ قرآن میں ہوا ہے، میاں بیوی (زوجین) میں سے ہر ایک کے اقارب دوسرے کے اصہار (سسرالی عزیز) ہوتے ہیں، آدمی کے اقارب کو عورت کے احما (عورت کے سسرالی رشتے دار دیور جیٹھ وغیرہ) کہا جاتا ہے اور عورت کے اقارب کو مرد کے ''اختان'' (ساس، سالیاں وغیرہ) کہا جاتا ہے۔ یہ چار اصناف ربیبہ (پہلے خاوند کی بیٹی) کے سوا محض عقدِ نکاح سے حرام ہو جاتی ہے۔ ربیبہ اس وقت تک حرام نہیں ہوتی، جب تک آدمی اس کی ماں کے ساتھ نکاح کر کے اس کے ساتھ دخول نہ کرے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ شرط صرف ربیبہ میں رکھی ہے، باقی کی تحریم مطلق رکھی ہے، اس لیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کہا کرتے تھے: جس کو اللہ نے مبہم رکھا ہے تم بھی اسے مبہم ہی رکھو۔ ائمہ اربعہ اور جمہور علما کے نزدیک محرمات کی یہی تقسیم و تفصیل ہے۔

البتہ ان دونوں، یعنی باپ کی بیویوں اور بیٹوں کی بیویوں کی مائیں اور بیٹیاں حرام نہیں ہوتیں۔ علما کے اتفاق کے ساتھ آدمی اپنے باپ کی بیوی کی بیٹی اور بیٹے کی بیوی کی بیٹی (جو کسی دوسرے خاوند سے ہو اور ساتھ آئی ہو) سے شادی کر سکتا ہے، کیوں کہ یہ باپوں اور بیٹوں کی بیویاں نہیں، زوجہ کی بیٹی اور اس کی ماں زوجہ نہیں ہوتی، ربیبہ کے عکس کہ ربیب کا بیٹا بھی ربیب ہوتا ہے، جس طرح بیٹے کا بیٹا بیٹا اور بیوی کی نانی بیوی کی ماں ہوتی ہے اور زوجہ کی ماں کی بیٹی حرام نہیں ہوتی، کیوں کہ وہ ماں نہیں ہوتی، اس لیے فقہا کا کہنا ہے کہ پھوپھیوں، خالاؤں کی بیٹیوں، بیویوں کی ماؤں، باپوں اور بیٹوں کی یہ بیویوں کے سوا محرمات کی بیٹیاں بھی حرام ہوتی ہیں۔

ان فقہا نے ربیبہ کی بیٹی کو دوسری تینوں کی بیٹیوں کے سوا حرام قرار دیا ہے، اس میں مجھے کسی اختلاف کا علم نہیں۔

جو شخص کسی عورت کو اپنی منکوحہ سمجھ کر اس کے ساتھ ہم بستری کرتا ہے تو اس نکاح اور ہم بستری کی وجہ سے اس

کی اولاد کا نسب اس کے ساتھ ملحق ہو جاتا ہے، نیز اس کے ساتھ مصاہرت کی حرمت بھی ثابت ہو جاتی ہے اور اس میں بھی میرے علم کے مطابق علما کا اتفاق ہے، اگرچہ وہ نکاح اللہ اور اس کے رسول کے نزدیک باطل ہو، مثلاً جب کوئی کافر ایسا نکاح کرتا ہے جو دین اسلام میں حرام ہو تو اس کی وجہ سے نسب اس کے ساتھ ملحق ہو جاتا ہے اور رشتۂ مصاہرت بھی ثابت ہو جاتا ہے جس کی بنیاد پر ان دونوں میاں بیوی میں سے ہر ایک پر اس کے اصول و فروع حرام ہو جاتے ہیں، اس پر علما کا اتفاق ہے۔

اسی طرح ہر وہ مجامعت جسے آدمی حرام نہ سمجھتا ہو، مگر وہ حرام ہو، مثلاً: ایک شخص نے ایک عورت سے نکاحِ فاسد کیا اور اس کو طلاق دے دی۔ اس نے بعد میں غلطی سے یا کسی غلط فتوے کی وجہ سے سمجھا کہ طلاق واقع نہیں ہوئی۔ اس کے بعد اس نے اس سے مجامعت کی اور بچہ پیدا ہو گیا تو یہاں اس کا نسب اس کے ساتھ ملحق ہو گا۔ یہ عورت مدخولہ ہو گی اور اس لڑکے کے لیے حرام ہو جائے گی۔ اگر وہ ربیبہ ہو تو وہ بالاتفاق اس کی ماں کے ساتھ دخول نہیں کرے گا۔ کوئی کافر جب اپنے دین کے مطابق نکاح کرے، اس کے بعد اس کا بیٹا مسلمان ہو جائے، جس طرح اوائلِ اسلام میں لوگوں کی اولادیں مسلمان ہوئیں اور آج بھی اکثر ہوتا ہے تو یہ اپنے بیٹے کی بیوی سے نکاح نہیں کر سکتا، اگرچہ اس کا نکاح بالاتفاق فاسد ہو گا۔

لہٰذا نسب مجامعت کو حلال سمجھنے کے پیچھے چلتا ہے، یعنی اس کے تابع ہے اگرچہ حقیقت میں وہ اپنے اس خیال میں غلط ہو اور رشتۂ مصاہرت نسب کے تابع ہے۔ جب نسب ثابت ہو جائے تو مصاہرت بطریق اولیٰ ثابت ہوتی ہے۔ (اسی طرح بچے کی آزادی اس کے باپ کے خیال اور سوچ کے تابع ہوتی ہے۔ وہ نسب اور آزادی میں اپنے باپ کے تابع ہوتا ہے اور ماں کے تابع بھی۔ بیٹا نسب میں اپنے باپ کی پیروی کرتا ہے، آزادی میں اپنی ماں کی) اور دین میں ان دونوں میں سے بہتر کی، یہ ابو حنیفہ، شافعی، احمد اور ایک قول میں مالک کا مذہب ہے، لہٰذا جو شخص نکاح کی صورت میں یا زنا کرتے ہوئے کسی دوسرے کی لونڈی سے مجامعت کرے۔ اس سے ہونے والا بچہ اس لونڈی کے آقا کا ہو گا۔ اگر اس نے اس لونڈی کو ایسے شخص سے خریدا جس کو وہ اس کا مالک سمجھتا ہو یا اس نے اس کو آزاد سمجھتے ہوئے اس سے شادی کر لی اس کو ''مغرور'' کہا جاتا ہے، اس سے ہونے والا بچہ آزاد ہو گا، کیوں کہ وہ شخص اس عورت کو ایسی عورت سمجھتے ہوئے مجامعت کرتا ہے جس سے ہونے والا بچہ آزاد ہو گا۔ لہٰذا نسب اور آزادی مجامعت کرنے والے کے خیال اور سوچ کے تابع ہوتا ہے گو وہ غلطی پر ہو، اسی طرح تحریمِ مصاہرت کا مسئلہ ہے۔ یہاں ایک اختلافی مسئلہ ہے کہ کیا واضح زنا کی وجہ سے حرمتِ مصاہرت پیدا ہو جاتی ہے یا نہیں؟ امام ابو حنیفہ اور احمد کے نزدیک حرام ہے، امام شافعی کے نزدیک جواز نکلتا ہے اور امام مالک سے دونوں روایات ہیں۔

ایک ہی وقت میں دو بہنوں کو نکاح میں رکھنے کی حرمت قرآن کی نص سے ثابت ہے۔ اسی طرح ایک عورت اور اس کی پھوپھی، ایک عورت اور اس کی خالہ کو ایک ساتھ نکاح میں رکھنا بھی حرام ہے، اگر پہلے چھوٹی نکاح میں ہو تو اس پر بڑی کو نکاح کر کے نہ لائے اور اگر بڑی ہو تو چھوٹی کو نہ لائے۔ صحیح حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع کیا ہے۔[1] آپ ﷺ نے فرمایا: ''اگر تم نے ایسا کیا تو تم اپنے رحموں کو جدا جدا کر لو گے۔''[2] اگر ایک دوسری کو نکاح میں لانے پر راضی بھی ہو تب بھی جائز نہیں، کیوں کہ مزاج بدلتے رہتے ہیں۔

حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ ﷺ کو پیشکش کی کہ آپ ﷺ ان کی بہن سے شادی کر لیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''کیا تم یہ پسند کر لو گی؟'' انھوں نے کہا: میں آپ کو اکیلا چھوڑنے والی نہیں اور میں پسند کرتی ہوں کہ اس بھلائی میں جو میرے ساتھ شریک ہو، وہ میری بہن ہی ہو۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''وہ میرے لیے حلال نہیں۔'' آپ ﷺ سے کسی نے کہا: ہم نے سنا ہے کہ آپ ابوسلمہ کی بیٹی درّہ سے شادی کرنے والے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اگر وہ میری گود میں میری ربیبہ نہ بھی ہوتی تب بھی میرے لیے حلال نہیں، کیوں کہ وہ میرے رضاعی بھائی کی بیٹی ہے، مجھے اور اس کے باپ ابوسلمہ کو ابولہب کی لونڈی ثویبہ نے دودھ پلایا تھا، لہٰذا تم اپنی بیٹیاں اور بہنیں مجھ پر پیش نہ کیا کرو۔''[3] یہ متفق علیہ مسئلہ ہے اور اس کا ضابطہ یہ ہے کہ ہر وہ دو عورتیں جن کے درمیان نسبی قرابت (رحم محرم) ہو، ان دونوں کو ایک ساتھ منکوحہ بنانا حرام ہے۔ یعنی فرض کریں۔ اگر ان میں ایک مرد ہو اور دوسری عورت اور ان کا آپس میں نسبی تعلق کی بنا پر نکاح نہ ہو سکتا ہو تو ایسی دو عورتوں کو ایک ساتھ نکاح میں رکھنا اور ایک ساتھ نکاح کرنا حرام ہے۔ اس رحم محرم کے چار احکام ہیں۔ دو میں اتفاق ہے اور دو میں اختلاف۔ ان دونوں کو نہ نکاح کے ذریعے زوجیت میں لیا جا سکتا ہے اور ان سے مجامعت کرنا ہی جائز ہے۔ انسان اپنی رحم محرم عورت کے ساتھ نہ شادی کر سکتا ہے نہ اس کو لونڈی ہی بنا سکتا ہے۔ اس پر اتفاق ہے، بلکہ یہاں جو رشتہ نسب کی وجہ سے حرام ہوتا ہے رضاعت کی وجہ سے بھی حرام ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ایسی دو عورتوں کے ساتھ بیک وقت نکاح کرنا، عورت اور اس کی پھوپھی کے ساتھ بیک وقت نکاح کرنا اسی طرح عورت اور اس کی خالہ کے ساتھ نکاح کرنا ناجائز ہے۔

اسی طرح ایک ہی وقت میں چار عورتوں سے زائد کو نکاح میں رکھنا بھی حرام ہے، اس کی وجہ ان کے درمیان عدل قائم رکھنا ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٨١٩_ ٤٨٢١) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٠٨)

[2] حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری (٩/٦٦) میں اسے ابن حبان کی طرف منسوب کیا ہے۔

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٨١٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٤٩)

﴿ وَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تُقْسِطُوا فِي الْيَتَامَىٰ فَانكِحُوا مَا طَابَ لَكُم مِّنَ النِّسَاءِ مَثْنَىٰ وَثُلَاثَ وَرُبَاعَ ۖ فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ ۚ ذَٰلِكَ أَدْنَىٰ أَلَّا تَعُولُوا ﴾ [النساء: ۳]

''اور اگر تم ڈرو کہ یتیموں کے حق میں انصاف نہیں کرو گے تو (اور) عورتوں میں سے جو تمھیں پسند ہوں ان سے نکاح کرلو، دو دو سے اور تین تین سے اور چار چار سے، پھر اگر تم ڈرو کہ عدل نہیں کرو گے تو ایک بیوی سے، یا جن کے مالک تمھارے دائیں ہاتھ ہوں (یعنی لونڈیاں)۔ یہ زیادہ قریب ہے کہ تم انصاف سے نہ ہٹو۔''

آدمی چار تک کی تعداد میں عدل آسانی سے قائم کرسکتا ہے، اس لیے عام مسلمانوں کو چار تک کی اجازت ہے، رسول اللہ ﷺ اس سے زیادہ میں بھی عدل کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے، اسی طرح آپ مومنوں کے ہاں ان کی جانوں سے بھی زیادہ عزیز تھے، اس لیے اللہ نے آپ کو مہر کے بغیر شادی کی اجازت دی۔

دو بہنوں کو جمع کرنے کی حرمت کا سبب ان کے درمیان قطع تعلق کو ختم کرنے کے لیے ہے، یہ معنی چونکہ شریعت میں موثر ہے، اس لیے آدمی کو ایسی دو عورتوں کے ساتھ ایک ساتھ نکاح کرنے کی اجازت ہے جن کے درمیان نسب کے بغیر حرمت ہو یا نسب بلاحرمت ہو، پہلے کی مثال یہ ہے کہ آدمی عورت اور اس کے خاوند کی (کسی دوسری عورت سے) بیٹی کو جمع کرلے، جس طرح جب حضرت علی رضی اللہ عنہ فوت ہوئے تو عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیوی اور ان کی بیٹی کو بیک وقت نکاح میں رکھا، یہ اکثر ائمہ اربعہ کے ہاں حلال ہے۔ ان دونوں میں سے ایک دوسری پر حرام ہوتی ہے تو مصاہرت کی وجہ سے ہے، رحم اور نسب کی وجہ سے نہیں۔ یہ حکم قطع رحمی کی حرمت کی وجہ سے تھا، اس لیے یہ نہ لفظاً نہ معناً ہی آیتِ تحریم میں داخل ہے۔

جب ان دونوں کے درمیان غیر محرم نسبی تعلق ہو، اس کی مثال چچے اور ماموں کی بیٹی کو نکاح میں بہم لانا ہے تو ان کو جمع کرنا جائز ہے۔

جمع کی حرمت نکاح ختم ہونے کے ساتھ ہی ختم ہو جاتی ہے، جب چار میں سے ایک فوت ہو جائے یا ایک بہن فوت ہو جائے یا اس کو طلاق ہو جائے یا نکاح فسخ ہو جائے اور اس کی عدت ختم ہو جائے تو وہ چوتھی سے شادی کر سکتا ہے اور اپنی اس بیوی کی بہن سے بھی شادی کرسکتا ہے، اس میں کوئی اختلاف نہیں، البتہ رجعی طلاق دینے کی صورت میں عام علما اور ائمہ اربعہ کے نزدیک وہ اس کی بہن سے شادی نہیں کرسکتا۔ عبیدہ سلمانی کا قول ہے: ''صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اس بات پر اتفاق کی طرح کا کوئی اتفاق نہیں ہوا کہ چوتھی بیوی کی عدت میں پانچویں سے نکاح جائز نہیں اور ایک بہن کی عدت میں اس کی دوسری بہن سے نکاح کرنا بھی جائز نہیں، کیوں کہ رجعیہ (طلاق رجعی والی) بیوی کے قائم مقام ہی ہوتی ہے۔ ان دونوں میں سے ہر ایک خاوند کے فوت ہونے کی صورت میں، اس کی وارث

ہوتی ہے، لیکن وہ بائن ہونے والی ہوتی ہے اور یہ اس کے بیوی ہونے میں رکاوٹ نہیں، جس طرح کوئی شخص اپنی بیوی کو کسی مدت کے ساتھ معلق کر دے اور کہے کہ اگر تو نے مجھے سال کے شروع میں ایک ہزار نہ دیے تو تجھے طلاق ہو گی، یہاں وہ بیونتِ صغریٰ کی راہ پر چل نکلتی ہے، مگر وہ بالاتفاق اس کی بیوی ہی ہوتی ہے اور اگر وہ شرط جس پر اس نے طلاق کو معلق کیا ہے، پوری نہ ہو تو نکاح باقی رہتا ہے، اسی طرح رجعیہ اگر رجوع کرے تو نکاح باقی رہتا ہے، البتہ اس میں علما کا اختلاف ہے کہ کیا رجعیہ کے ساتھ مجامعت جائز ہے یا نہیں؟ جب طلاق بائن ہو تو کیا چوتھی کی عدت میں پانچویں اور بہن کی عدت میں اس کی دوسری بہن سے نکاح جائز ہے؟ اس میں بھی اسلاف و اخلاف کا اختلاف ہے، امام مالک اور شافعی کے نزدیک جائز ہے اور ابو حنیفہ اور احمد کے نزدیک ناجائز۔ واللہ أعلم[1]

وٹے سٹے کی شادی کی صورت میں معاشرت میں ایک دوسرے کی پیروی کرنا

سوال کچھ لوگ وٹے سٹے کی شادی کرتے ہیں، اگر ایک اپنی بیوی کو اچھا کھلائے پلائے اور پہنائے تو دوسرا بھی اپنی بیوی کو اچھا کھلاتا پلاتا اور پہناتا ہے۔ اگر ایک بیوی سے راضی ہو تو دوسرا راضی رہتا ہے۔ اگر ایک ناراض ہو تو دوسرا ناراض ہو جاتا ہے، یعنی ہر معاملے میں وہ ایک دوسرے کی پیروی کرتے ہیں، کیا یہ جائز ہے؟

جواب دونوں خاوندوں کو چاہیے کہ اپنی اپنی بیوی کو اچھے طریقے سے رکھیں، یا اچھے طریقے سے چھوڑ دیں، یہ نہیں کہ ہر ایک اس کو دوسرے کے فعل کے ساتھ معلق کر دے، عورت کا حق اپنے خاوند پر ہوتا ہے جو اس کے باپ یا بھائی کے ظلم سے ساقط نہیں ہوتا، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ أُخْرٰى ﴾ [الأنعام: ١٦٤]

''اور نہ کوئی بوجھ اٹھانے والی کسی دوسری کا بوجھ اٹھائے گی۔''

اگر ایک اپنی بیوی پر ظلم کرتا ہے تو اس پر حق نافذ کرنا ضروری ہے، لیکن یہ دوسرے کو اس وجہ سے اپنی بیوی پر ظلم کرنے کا اختیار نہیں دیتا کہ وہ پہلے کی بیٹی ہے، اگر دونوں ایک دوسرے کے ظلم کی وجہ سے اپنی اپنی بیوی پر ظلم کرتے ہیں تو دونوں ہی سزا کے حق دار ہیں، اور دونوں کی بیویاں اپنے اپنے خاوند سے اپنے حق کا مطالبہ کرنے کا اختیار رکھتی ہیں، اگر یہ رشتوں کا تبادلہ پہلا رشتہ طے کرتے وقت کوئی شرط تھی تو یہ باطل شرط ہے جو نکاح شغار (وٹے سٹے کی شادی) کی قبیل سے ہے، جس میں ایک شخص دوسرے کو اس شرط پر رشتہ دیتا ہے کہ وہ بھی بدلے میں اپنی بہن یا بیٹی کا رشتہ اس کو دے۔ اگر اس بنیاد پر شادی کی ہو کہ اگر ایک انصاف کرے گا تو دوسرا بھی انصاف کرے گا، اگر ایک ظلم کرے گا تو دوسرا بھی ظلم کرے گا تو یہ بالاجماع حرام ہے، جو ایسا کام کرتا ہے اس کو عبرت خیز سزا دینی چاہیے۔[2]

---

[1] مجموع الفتاویٰ (٣٢/٦٢۔٦٧)

[2] مجموع الفتاویٰ (٣٢/٧٤)

کسی کی خالہ اور بیٹی کو بیک وقت نکاح میں رکھنے کی ممانعت

سوال ایک شخص نے ایک انسان کی خالہ سے شادی کی۔ اس انسان کی ایک بیٹی بھی ہے۔ اس آدمی نے اس لڑکی سے بھی شادی کر لی اور اس انسان کی خالہ اور بیٹی کو ایک ساتھ نکاح میں لے لیا، کیا یہ جائز ہے؟

جواب کسی انسان کی خالہ اور اس کی بیٹی کو بیک وقت نکاح میں لینا ناجائز ہے، کیوں کہ رسول اللہ ﷺ نے عورت اور اس کی پھوپھی اور عورت اور اس کی خالہ کو بیک وقت نکاح میں لینے سے منع کیا ہے۔[1]

یہ ائمہ اربعہ کے ہاں اتفاقی مسئلہ یہ ہے اور اس پر ان کا اتفاق ہے کہ یہ حدیث باپ کی خالہ، ماں کی خالہ اور جدہ کی خالہ کو شامل ہے، اسی طرح ماں اور باپ کی پھوپھی کو بھی شامل ہے، اس لیے عورت اور اس کے باپ کی خالہ یا ماں کی خالہ کو بیک وقت نکاح میں لینا ائمہ اربعہ کے نزدیک ناجائز ہے۔[2]

کسی کی خالہ اور سگی بھتیجی کو بیک وقت نکاح میں رکھنے کی ممانعت

سوال ایک شخص نے بیک وقت ایک آدمی کی خالہ اور اس کی سگی بھتیجی سے نکاح کیا، کیا ان دونوں کو اکٹھا کرنا جائز ہے؟

جواب ان دونوں عورتوں کو بیک وقت نکاح میں رکھنا عورت اور اس کے باپ کی خالہ کو بیک وقت نکاح میں رکھنے کی طرح ہے، اگر اس لڑکی کا باپ اس دوسرے شخص کا ماں کی طرف سے بھائی ہے یا ماں باپ دونوں کی طرف سے تو اس کی خالہ دوسرے کی خالہ بھی ہوگی، لیکن اگر وہ صرف اس کے باپ کی طرف سے اس کا بھائی ہوتا تو ایسی صورت میں ایک کی خالہ دوسرے کی خالہ نہیں ہوگی، بلکہ اس کی پھوپھی ہوگی اور قاعدہ ہے کہ عورت کو اس کے باپ کی خالہ یا ماں کی خالہ باپ کی پھوپھی یا ماں کی پھوپھی کے ساتھ بیک وقت نکاح میں لینا، عورت اور اس کی پھوپھی یا خالہ کو بیک وقت نکاح میں لینے کی طرح ہی ہے جو ائمہ اسلام کے نزدیک بالاتفاق حرام ہے۔

اگر ایک کے بعد دوسری سے شادی کی ہے تو دوسرا نکاح باطل ہے جس کو ختم کرنے کے لیے طلاق کی ضرورت بھی نہیں، اس طرح نہ مہر ہوگا نہ وراثت، دخول بھی جائز نہیں ہوگا۔ اگر دخول کر چکا ہے تو اس طرح علاحدہ ہو جائے گا جس طرح اجنبی (پرائی عورت) سے علاحدگی اختیار کر لی جاتی ہے۔ اگر دوسری عورت سے نکاح کرنا چاہتا ہے تو پہلی کو چھوڑ دے، جب اس کی عدت پوری ہو جائے تو دوسری سے شادی کر لے۔ اگر اس نے طلاقِ رجعی کی عدت ہی میں دوسری سے شادی کر لی تو بالاتفاق دوسری سے عقدِ صحیح نہیں ہوگا۔ اگر طلاقِ بائن ہو تو ابو حنیفہ اور احمد کے مذہب میں

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۴۸۱۹۔۴۸۲۱) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۴۰۸)

[2] مجموع الفتاویٰ (۷۵/۳۲)

جائز نہیں، مالک اور شافعی کے مذہب میں جائز ہے۔ اگر اس نے بلاعوض ایک یا دو طلاقیں دیں تو طلاقِ رجعی ہی ہو گی اور دوسری سے نکاح اس وقت تک درست نہیں ہو گا جب تک پہلی کی عدت ختم نہیں ہو جاتی، اس پر سب کا اتفاق ہے۔ اگر شادی کر لی ہے تو دخول جائز نہیں۔ اگر فاسد نکاح میں دخول کر لیا ہو تو اس سے علاحدہ ہونا ضروری ہو جاتا ہے، کیوں کہ وہ پرائی ہے، اس وقت تک اس سے شادی نہیں ہو سکتی جب تک پہلی مطلقہ کی عدت ختم نہیں ہو جاتی۔

ایک یہ مسئلہ کہ کیا وہ شخص اس عورت کی عدت میں اس سے شادی کر سکتا ہے جس کے ساتھ فاسد نکاح کی وجہ سے مباشرت کر چکا ہے اور وہ اسی کی وجہ سے عدت گزار رہی تھی؟ اس میں علما کے دو اقوال ہیں: ابو حنیفہ اور شافعی کے مذہب میں جائز ہے، مالک اور دوسری روایت میں احمد کے نزدیک ناجائز ہے۔[1]

دخول سے قبل ہی طلاق یافتہ کی ماں سے نکاح کا حکم

سوال ایک شخص نے ایک عورت سے عرصہ ہوا شادی کی، مگر دخول نہیں کیا، مجامعت سے پہلے ہی اس نے اس کو طلاق دے دی، کیا وہ اس لڑکی کو طلاق دینے کے بعد اس کی ماں کے ساتھ دخول کر سکتا ہے؟

جواب ساس سے شادی کرنا جائز نہیں، خواہ اپنی بیوی کے ساتھ دخول نہ بھی کیا ہو۔ واللہ أعلم[2]

عدت مکمل ہونے سے پہلے شادی کرنے والی کا حکم

سوال ایک مطلقہ نے قسم کھا کر دعویٰ کیا کہ اس کی عدت پوری ہو چکی ہے، اس کے بعد دوسرے شخص نے اس کے ساتھ شادی کر لی، اس کے بعد ایک عورت آئی اور اس نے دعویٰ کیا کہ اس کو تو ابھی دو ماہواریاں ہی آئی تھیں، کیا خاوند اس کی بات مانے گا؟

جواب اگر واقعی میں اس کو دو ماہواریاں ہی آئی ہیں تو دوسرے سے نکاح بالاتفاق باطل ہے۔ اگر خاوند اس عورت کو سچا سمجھتا ہے تو دونوں میں علاحدگی کروا دی جائے۔ وہ مزید ایک ماہواری گزار کر پہلے کی عدت مکمل کرے، اس کے بعد دوسرے کی مجامعت کی وجہ سے پوری عدت گزارے، اس کے بعد اگر یہ دوسرا اس سے شادی کرنا چاہے تو کر سکتا ہے۔[3]

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۷۵/۳۲)

[2] مجموع الفتاویٰ (۷۷/۳۲)

[3] مجموع الفتاویٰ (۷۹/۳۲)

خفیہ نکاح کا حکم

سوال ایک شخص نے پانچ دینار حق مہر کے عوض کسی عورت سے خفیہ نکاح کیا اور اس سے ہم بستری بھی کرتا رہا، کیا یہ نکاح درست ہوگا یا نہیں؟ نیز اگر ان دونوں سے اولاد پیدا ہو جائے تو وہ وارث بنے گی یا نہیں؟ اس طرح کیا ان دونوں پر حد لگے گی یا نہیں؟

جواب جب کوئی ولی اور گواہوں کے بغیر نکاح کرے اور وہ دونوں اسے چھپا کر رکھیں تو یہ نکاح باتفاقِ ائمہ باطل ہے، بلکہ علما کا یہ موقف ہے کہ ''ولی کے بغیر نکاح نہیں۔''[1] جو عورت بھی اپنے ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کرے اس کا نکاح باطل، باطل اور باطل ہے۔ یہ دونوں رسول اللہ ﷺ سے منقول احادیث ہیں، کئی ایک سلف کا قول ہے کہ ''دو گواہوں کے بغیر نکاح نہیں ہوتا۔'' یہی ابو حنیفہ، شافعی اور احمد کا مذہب ہے، امام مالک نکاح کے اعلان کو لازمی قرار دیتے ہیں۔ ارشادِ باری عزوجل ہے:

﴿ مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ ۚ ﴾ [النساء: ٢٥]

''جب کہ وہ نکاح میں لائی گئی ہوں، بدکاری کرنے والی نہ ہوں اور نہ چھپے یار بنانے والی۔''

تو خفیہ نکاح خفیہ دوست رکھنے والیوں کی قبیل سے تعلق رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایک جگہ کہا:

﴿ وَاَنْكِحُوا الْاَيٰمٰى مِنْكُمْ ﴾ [النور: ٣٢]

''اور اپنے میں سے بے نکاح مردوں، عورتوں کا نکاح کر دو۔''

دوسری جگہ فرمایا:

﴿ وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا ۚ ﴾ [البقرة: ٢٢١]

''اور مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو، یہاں تک کہ وہ ایمان لے آئیں۔''

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے مردوں کو مخاطب کر کے عورتوں کی شادی کرنے کا حکم دیا ہے، اس بنا پر کچھ اسلاف کا کہنا ہے کہ عورت خود اپنا نکاح نہیں کر سکتی، یہ زانیہ ہوتی ہے جو اپنا نکاح خود کرتی ہے، لیکن اگر وہ شخص اس نکاح کو جائز سمجھتا ہو تو اس میں مجامعت شبہے پر مبنی مجامعت ہوگی۔ اس بچے کا نسب اس کے باپ کے ساتھ ملحق کیا جائے گا اور وہ اپنے باپ کا وارث بھی ہوگا۔

جہاں تک سزا کی بات ہے تو وہ اس جیسے عقد پر سزا کے سزاوار ٹھہرتے ہیں۔[2]

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٠٨٥) سنن الترمذي، رقم الحديث (١١٠١) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٨٨٠) صحيح الجامع، رقم الحديث (٧٥٥٥)

[2] مجموع الفتاویٰ (١٠٢/٣٢)

شادی کے دو ماہ بعد شب باشی کے بغیر بچہ پیدا ہونے کی صورت میں نکاح کا حکم

سوال ایک شخص نے ایک عورت سے شادی کی، لیکن اس کے ساتھ دخول کیا نہ مجامعت ہی کی، شادی کے دو ماہ بعد اس نے ایک بچے کو جنم دے دیا، اب کیا وہ نکاح صحیح ہوگا اور حق مہر لازم ہوگا یا نہیں؟

جواب الحمد للّٰہ. اہلِ اسلام کا اتفاق ہے کہ اس بچے کو اس شخص کے ساتھ ملحق نہیں کیا جائے گا، اسی طرح اس پر مہر بھی لازم نہیں ہوا، لیکن اس عقد کے متعلق علما کے دو اقوال ہیں:

① صحیح ترین قول کے مطابق عقد باطل ہو جاتا ہے، یہ امام مالک اور احمد کا مذہب ہے۔ اس مذہب کی بنا پر ان دونوں میں جدائی کروائی جائے، اور اس شخص پر پورا مہر لازم ہے نہ آدھا اور نہ متعہِ طلاق ہی، جیسا کہ تمام فاسد عقود میں جب دخول سے پہلے علاحدگی کروا دی جائے تو ان میں سے کوئی صورت بھی لازم نہیں ہوتی، لیکن ان دونوں کے درمیان وہ حاکم (قاضی) علاحدگی کروائے جو اس عقد کو فاسد سمجھتا ہے، تاکہ کوئی جھگڑا کھڑا نہ ہو۔

② دوسرا قول ہے کہ یہ عقد صحیح ہے، لیکن اس وقت تک مجامعت جائز نہیں جب تک وضعِ حمل نہیں ہو جاتا، یہ امام ابو حنیفہ کا قول ہے۔ امام شافعی کے مذہب کے مطابق وضعِ حمل سے پہلے مجامعت بھی جائز ہے۔ ان دو اقوال کی بنا پر اگر وہ دخول سے پہلے طلاق دے تو اس پر آدھا مہر لازم ہوگا، لیکن یہ نزاع اس وقت ہے جب وہ وطی شبہہ، یا وطی (مجامعت) خاوند، یا وطی آقا کے نتیجے میں حاملہ ہو، نکاح بالاتفاق باطل ہوگا، اگر وہ اس کو دخول سے پہلے ہی چھوڑ دے تو اس پر مہر لازم نہیں ہوگا۔ جو زنا کے نتیجے میں حاملہ ہو، اس کے نکاح کے صحیح ہونے میں کوئی کلام نہیں، نزاع اس صورت میں ہے جب وہ اپنی مرضی سے اس سے نکاح کرے۔ اگر اس کو مجبور کر کے نکاح کرے تو یہ نکاح امام شافعی اور احمد کے مذہب میں باطل ہوگا۔[1]

کسی شہر میں قیام کے دوران میں نکاح کرنے اور واپسی پر طلاق کا حکم

سوال ایک شخص بکثرت سفر کرتا ہے، ہر شہر میں مہینوں قیام کرتا ہے، اگر اس کو زنا اور نافرمانی کا شکار ہونے کا خدشہ ہو اور وہ اس شہر میں اقامت کی مدت میں کسی سے نکاح کر لے، واپسی پر اس کو اس کا حق دے کر طلاق دے دے تو کیا یہ نکاح کرنا جائز ہوگا؟

جواب وہ نکاح کر سکتا ہے، لیکن وقت کی تعیین و تحدید کی شرط لگائے بغیر مطلق شادی کرے، یعنی چاہے تو شادی برقرار رکھے اور چاہے تو طلاق دے دے، اگر وہ مدتِ قیام ختم ہونے پر طلاق کی حتمی نیت رکھتا ہو تو یہ ناپسندیدہ ہے

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۱۰۵/۳۲۔۱۰۸)

اور اس نکاح کے صحیح ہونے میں اختلاف ہے، اگر یہ نیت رکھے کہ اگر وہ اس کو پسند لگی تو واپسی پر اپنے ساتھ ہی لے جائے گا اور نکاح میں رکھے گا، اگر پسند نہ آئی تو طلاق دے دے گا تو یہ جائز ہے۔ اگر مدت مقرر کرنے کی شرط عائد کرے تو اس کو نکاحِ متعہ کہا جاتا ہے جس کے حرام ہونے پر ائمہ اربعہ اور دیگر اسلافِ امت کا اتفاق ہے، گو ایک گروہ اس کی مطلقاً یا مجبور کے لیے رخصت دیتا ہے، جس طرح صدرِ اسلام میں اس کی اجازت تھی، مگر صحیح یہ ہے کہ یہ حکم اب منسوخ ہے۔ صحیح بخاری میں ہے: رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے سال متعہ کی رخصت کے بعد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے قیامت تک کے لیے متعہ حرام کر دیا ہے۔''[1]

قرآن کریم نے بیوی یا مملوکہ (لونڈی) کے سوا ہر ایک عورت سے مجامعت حرام قرار دی ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۝ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعَادُوْنَ ۝ ﴾ [المؤمنون: ٥-٧]

''اور وہی جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ مگر اپنی بیویوں، یا ان (عورتوں) پر جن کے مالک ان کے دائیں ہاتھ بنے ہیں تو بلاشبہہ وہ ملامت کیے ہوئے نہیں ہیں۔ پھر جو اس کے سوا تلاش کرے تو وہی لوگ حد سے بڑھنے والے ہیں۔''

یہ عورت جس سے انسان متعہ کرتا ہے، وہ بیویوں میں شامل ہے نہ لونڈیوں میں، کیوں کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے نکاح کی صورت میں وراثت، خاوند کی وفات کی صورت میں چار ماہ دس دن کی عدت، طلاق کی عدت اور ان جیسے کئی ایسے احکام متعین کیے ہیں جو اس عورت کے حق میں ثابت نہیں ہوتے جس سے متعہ کیا جائے، کیوں کہ اگر وہ شریعت کی نگاہ میں انسان کی بیوی ہو تو اس کے حق میں بھی یہ سارے احکام ثابت ہونے چاہئیں جو نہیں۔ اس بنا پر کسی سلف کا قول ہے: ان احکام نے متعہ کو منسوخ کر دیا ہے۔ تاہم یہ تفصیل کا موقع نہیں۔ اگر انسان عقدِ نکاح سے پہلے مدت کی تعیین کی شرط لگائے تو وہ علما کے صحیح قول کے مطابق اسی شرط کی طرح ہے جو عقد کے وقت لگائی جاتی ہے۔ نکاح حلالہ کی صورت میں اگر خاوند مدت کی نیت رکھتا ہو اور عورت کے سامنے اس ارادے کا اظہار نہ کرے تو اس میں فقہا کا اختلاف ہے، امام ابو حنیفہ اور شافعی نے اس کی رخصت دی ہے اور امام مالک واحمد وغیرہ نے اسے مکروہ کہا ہے۔ اسی طرح اگر وہ حلالہ کرنے کی نیت رکھتا ہو تو اس کے ممنوع ہونے پر سب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اتفاق ہے، وہ اس کو نکاحِ حلالہ ہی کہتے ہیں، نکاحِ حلالہ نکاحِ متعہ سے بھی بدتر ہے، کیوں کہ یہ شریعت میں کبھی حلال نہیں ہوا، کیوں کہ حلالہ کرنے والے کا مقصد نکاح کرنا نہیں، بلکہ عورت کو پہلے طلاق دینے والے کی طرف لوٹانا ہوتا ہے، وہ تو عقد

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٨٢٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٠٦)

ثابت ہی زائل اور ختم کرنے کے لیے ہوتا ہے، جو کسی حالت میں جائز نہیں، متعہ کرنے والے کے عکس، اس کا مقصد صرف متعہ کرنا ہوتا ہے، لیکن مدت، نکاح کے مقصود؛ محبت، رحمت اور سکون میں آڑ بنتی ہے اور اسے تاراج کر دیتی ہے، وہ بیوی کو کرائے کی عورت کے قائم مقام کر دیتا ہے، اس لیے نکاحِ متعہ میں نیت، نکاحِ حلالہ میں نیت سے خفیف ہے، جو مکروہ تحریمی اور مکروہ تنزیہی کے بین بین ہے۔

رہا عزل کرنا تو علما کے ایک گروہ نے اس کو حرام کہا ہے، لیکن ائمہ اربعہ کے مذہب میں یہ عورت کی اجازت سے جائز ہے۔ واللّٰہ أعلم [1]

بدکار عورت سے شادی کا حکم

ل کیا زانیہ (بدکا ت) سے شادی کرنا جائز ہے؟

جواب ر سے اس تک شادی کرنا حرام ہے جب تک وہ سچے دل سے توبہ نہیں کر لیتی، خواہ شادی کا خواہش مند وہی شخص ہو جو اس سے زنا کرتا رہا یا کوئی اور یہ بلاشبہہ درست موقف ہے اور یہ سلف و خلف میں سے ایک گروہ کا مذہب ہے، اس میں امام احمد وغیرہ شامل ہیں، مگر سلف و خلف میں سے بہت سے لوگ اس کے جواز کے بھی قائل ہیں۔ امام احمد کے سوا باقی تین ائمہ کا مذہب بھی یہی ہے، امام مالک استبرائے رحم (ایک حیض تک انتظار کرنا، تاکہ اس کا حاملہ یا غیر حاملہ ہونا معلوم ہو جائے) کی شرط لگاتے ہیں، اگر وہ حاملہ ہو تو امام ابوحنیفہ استبرائے رحم سے پہلے عقدِ نکاح کے جواز کے قائل ہیں، لیکن جب تک وہ بچے کو جنم نہ دے لے، تب تک اس سے مجامعت کی اجازت نہیں دیتے۔

امام شافعی عقدِ نکاح اور مجامعت (استبرائے رحم سے پہلے) دونوں کے جواز کے قائل ہیں، کیوں کہ ان کے نزدیک زانی کا پانی (نطفہ) قابلِ احترام نہیں، اس لیے اس کے نتیجے میں اس ہونے والے بچے کا نسب اس کے ساتھ ملحق نہیں کیا جائے گا، یہ ان کا استدلال ہے۔ امام ابوحنیفہ حاملہ اور غیر حاملہ میں فرق کرتے ہیں، اگر وہ حالتِ حمل میں اس سے مجامعت کرے تو اس کے ساتھ اس بچے کو ملحق کر دیا جائے گا جو قطعی اس کا نہیں، غیر حاملہ کے عکس۔

امام مالک اور احمد نے استبرائے رحم کی شرط لگائی ہے اور یہی درست ہے، تاہم ایک روایت کے مطابق مالک اور احمد دونوں نے استبرائے رحم کے لیے ایک حیض کی شرط لگائی ہے اور امام احمد سے ایک دوسری روایت میں تین حیض کی شرط منقول ہے، ان کے اصحاب میں سے اکثر جیسے: قاضی ابو یعلیٰ اور اس کے ہم خیالوں نے یہی مذہب

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۳۲/۱۰۶۔۱۰۸)

اختیار کی ہے، لیکن صحیح یہی ہے کہ صرف استبراء کافی ہے، کیوں کہ یہ اس کی بیوی نہیں تھی کہ جس پر عدت فرض ہوتی، کیوں کہ یہ لونڈی اور خلع لینے والی سے بڑھ کر نہیں، ان کے لیے بھی جمہور کے نزدیک صرف استبراء ضروری ہے مطلقہ کی طرح عدت نہیں۔ یہ زانیہ اس عورت کی طرح نہیں جس کے ساتھ شبہہ کی بنیاد پر مجامعت کی جائے جہاں بچے کا نسب مجامعت کرنے والے سے ملحق کیا جاتا ہے۔

اسی طرح جو عورت مسلمان ہو جائے تو اس کی وجہ سے اس کی اپنے کافر خاوند سے علاحدگی ہو جاتی ہے، یہ علاحدگی طلاق کی وجہ سے نہیں ہوتی بلکہ اس کے مسلمان ہونے کی وجہ سے اپنے خاوند کو چھوڑ دینے کی وجہ سے ہوتی ہے۔ یہ جب دارِ کفر چھوڑ کر اسلام میں آئے اور کسی سے شادی کی خواہش مند ہو تو اس کے لیے بھی استبرائے رحم ہی ہے۔ اس کو بعض اوقات عدت بھی کہہ دیا جاتا ہے، حدیث شریف میں لفظ عدت استبراء کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے جس طرح حدیثِ بریرہ میں ہے۔

یہاں زانیہ سے نکاح کے مسئلے پر بات ہو رہی ہے تو اس میں دو اہم مسئلے ہیں:

1. ایک اس کے استبرائے رحم کے متعلق، یہی اس کی عدت ہوتی ہے، یہ قول پہلے نقل ہو چکا ہے کہ زانی کے پانی کی کوئی حرمت نہیں، اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ استبراء پہلے کے پانی کی حرمت کی وجہ سے نہیں، بلکہ دوسرے کے پانی کی وجہ سے ہے، کیوں کہ جو بچہ انسان کا نہ ہو اس کو اس کے ساتھ ملانا جائز نہیں، اگر وہ استبرائے رحم تک انتظار نہیں کرتا تو اس عورت کے رحم میں زانی کا نطفہ پروان چڑھے گا۔ نیز اگر عورت فراش (صاحبِ بستر) نہ ہو تو نسب زانی کے ساتھ ملانے میں علما کے دو اقوال ہیں، نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے:

«اَلْوَلَدُ لِلْفِرَاشِ وَلِلْعَاهِرِ الْحَجَرُ»[1]

''بچہ اس کا ہے جس کے بستر پر ہو اور زانی کے لیے پتھر (ذلت وسنگساری) ہے۔''

اس حدیث میں آپ ﷺ نے بچے کو صاحبِ بستر کے ساتھ ملحق کیا ہے زانی کے ساتھ نہیں، اگر عورت فراش نہ ہو تو تب وہ اس حدیث کا مصداق نہیں ٹھہرتی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جاہلیت میں پیدا ہونے والے بچوں کا نسب ان کے باپوں کے ساتھ ملحق کیا تھا۔ تاہم یہ اس مسئلے کی تفصیل کا مقام نہیں۔

2. دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ اس وقت تک اس سے نکاح کرنا حلال نہیں ہوتا جب تک وہ توبہ نہیں کر لیتی، کتاب وسنت اور قیاسِ عقلی اسی پر دلالت کرتے ہیں، سورت نور کی مشہور آیت میں ہے:

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۱۹۴۸) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۴۵۷)

﴿ اَلزَّانِیْ لَا یَنْكِحُ اِلَّا زَانِیَةً اَوْ مُشْرِكَةً٘ وَّالزَّانِیَةُ لَا یَنْكِحُهَاۤ اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِكٌ١ۚ وَحُرِّمَ ذٰلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ ﴾ [النور: ٣]

''زانی نکاح نہیں کرتا مگر کسی زانی عورت سے، یا کسی مشرک عورت سے، اور زانی عورت، اس سے نکاح نہیں کرتا مگر کوئی زانی یا مشرک۔ اور یہ کام ایمان والوں پر حرام کر دیا گیا ہے۔''

حدیث میں حضرت ابو مرثد غنوی کا اپنی جاہلیت کی محبوبہ عناق کے حوالے سے واقعہ مذکور ہے جو اسی پر دلالت کرتا ہے۔ جو لوگ اس آیت پر عمل نہیں کرتے وہ اسے منسوخ کہتے ہیں یا اس کی تاویل کرتے ہیں، تاویل یہ کرتے ہیں کہ یہاں نکاح کا مطلب عقدِ نکاح نہیں، بلکہ مجامعت ہے، لیکن اس تاویل کی خرابی ادنیٰ تامل سے واضح ہو جاتی ہے:

1 لفظِ نکاح قرآن میں جہاں جہاں آیا ہے اس سے عقدِ نکاح ہی مراد لیا جاتا ہے، اگرچہ مجامعت بھی اس میں داخل ہے۔ یہ کہ اس سے صرف مجامعت مراد ہو، عقد نہ ہو، ایسا کتاب اللہ میں کہیں وارد نہیں ہوا۔

2 آیت کا شانِ نزول یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے زانیہ سے شادی کے متعلق فتویٰ پوچھا گیا تو شانِ نزول لفظ سے کیسے خارج ہوگا؟!

3 اگر اس آیت ﴿ اَلزَّانِیْ لَا یَنْكِحُ اِلَّا زَانِیَةً ... الخ﴾ میں نکاح سے صرف مجامعت لی جائے تو اس کے الفاظ اس طرح ہوں گے: "الزاني لا يطأ إلا زانية أو الزانية لا يطؤها إلا زان" ''زانی زانیہ ہی سے مجامعت کرے گا۔'' یہ ایسے ہی ہے، جیسے کوئی کہے: "الآكل لا يأكل إلا ماكولًا، والمأكول لا ياكله إلا آكل" ''کھانے والا نہیں کھائے گا، مگر ماکول (کھائے گئے) کو۔'' وغیرہ۔ یہ ایسا کلام ہے، جس سے اللہ باری تعالیٰ کا کلام پاک اور منزا ہے۔

4 زنا بالجبر کی صورت میں زنا کرنے والا تو زانی ہوگا، مگر عورت زانیہ نہیں، کیوں کہ اس میں اس کی مرضی شامل نہیں ہوتی۔ اسی طرح اگر عورت کسی سوئے ہوئے شخص سے زنا کرے یا کسی کو مجبور کرے تو وہ مرد زانی شمار نہیں ہوتا۔

5 زنا کی حرمت کا حکم مکہ میں آ چکا تھا، مسلمانوں کو اس کا علم تھا اور اس کی حرمت اس سے اتنی مشہور تھی کہ اس آیت میں اس کی حرمت کا حکم نازل کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی۔

6 اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ لَا یَنْكِحُهَاۤ اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِكٌ١ۚ ﴾ [النور: ٣]

''اس سے نکاح نہیں کرتا مگر کوئی زانی یا مشرک۔''

اگر یہاں نکاح سے صرف مجامعت مراد ہوتی تو مشرک کا ذکر کرنے کی ضرورت ہی نہ رہتی، کیوں کہ وہ تو زانی ہے،

اسی طرح اگر کسی مشرک عورت سے کوئی شخص زنا کرے تو وہ مشرک عورت زانیہ ہے، پس اس تقسیم کی ضرورت ہی نہ ہوتی۔

7 اس آیت سے پہلے الفاظ یہ ہیں:

﴿ اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ ﴾ [النور: ۲]

''جو زنا کرنے والی عورت ہے اور جو زنا کرنے والا مرد ہے، سو دونوں میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو۔''

تو اس کے بعد حرمتِ زنا کا ذکر کرنے کا کیا فائدہ؟

جو علما اس آیت کو منسوخ سمجھتے ہیں، ان کے نزدیک یہ اس آیت:

﴿ وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ ﴾ [النور: ۳۲]

''اور اپنے میں سے بے نکاح مردوں، عورتوں کا نکاح کر دو۔''

کے ساتھ منسوخ ہے، یہ حضرت سعید بن مسیّب اور علما کے ایک گروہ کا قول ہے۔ جب انھیں معلوم ہوا کہ اس آیت کے ساتھ نسخ کا دعویٰ ناپائیدار ہے اور انھیں اس آیت کو منسوخ کرنے والی کوئی مضبوط دلیل نہیں ملی تو کہہ دیا کہ یہ اجماع کے ساتھ منسوخ ہے، یہ ابو علی جبائی وغیرہ کا زعم ہے، عیسیٰ بن ابان وغیرہ سے منقول ہے کہ اجماع نصوص کو منسوخ کر سکتا ہے، یہ دعویٰ بے کار اور فاسد ہے، کیوں کہ اس دعوے کا مضمون و مفہوم ہے امت اپنے نبی کے بعد اپنے دین کو بدل سکتی ہے، جس طرح عیسائیوں کے نزدیک ان کے علما مسیح علیہ السلام کی شریعت میں مناسب تبدیلی کرنے کا اختیار رکھتے ہیں۔ لہٰذا یہ مسلمانوں کا نظریہ نہیں۔ نص کی اجماع کے ساتھ مخالفت و معارضہ اور اس نص کی معارض و مخالف نص کے بغیر اس کے نسخ کا دعویٰ ہی غلط ہے، کیوں کہ کسی نص کو کوئی نص ہی منسوخ کر سکتی ہے، جو امت کے پاس باقی اور محفوظ ہو اور ناسخ کے بارے میں امت کے پاس علم، جس پر عمل ہو، اس منسوخ کے علم سے زیادہ اہم ہے، جس پر عمل کرنا جائز نہ ہو، اللہ تعالیٰ کا ناسخ نصوص کو محفوظ رکھنا منسوخ کی حفاظت سے زیادہ ضروری اور اولیٰ ہے۔

جنھوں نے کہا ہے کہ یہ ﴿ وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى ﴾ سے منسوخ ہے، ان کا استدلال انتہائی کمزور ہے، کیوں کہ زانیہ ہونا عارضی وصف ہے جو عارضی حرمت کو لازم کرتا ہے، جس طرح عدت گزارنے والی، غیر کی منکوحہ اور احرام والی کی حرمت وقتی ہوتی ہے، اگر اس کو ابدی محرمہ فرض کیا جائے تو وہ بت پرست عورت کی طرح ہوگی اور یہ معلوم ہے اس آیت میں ان صفات سے کوئی تعرض نہیں کیا گیا جن کے ساتھ عورت وقتی یا ابدی طور پر حرام ہو جاتی ہے، اس میں تو بالجملہ یتیم عورتوں کا نکاح کرنے کا حکم دیا گیا ہے، یعنی بیان کردہ شرائط کے مطابق ان کا نکاح کرنے کا حکم دیا گیا ہے، یعنی جس طرح عدت گزارنے والی عورت سے عدت کے دوران میں اور احرام والی عورت سے حالتِ احرام میں نکاح کرنے سے روکا گیا ہے، تاآنکہ عدت والی کی عدت گزر جائے اور احرام والی احرام کھول لے، بعینہٖ زانیہ سے

اس وقت تک نکاح نہیں کیا جا سکتا، جب تک وہ توبہ نہ کرے۔ ان علما نے اس حدیث سے بھی استدلال کیا ہے جس میں ہے کہ ایک شخص نے کہا:

"إِنَّ إِمْرَأَتِي لَا تَرُدُّ يَدَ لَامِسٍ ...." (رواه النسائي)[1]

"میری بیوی کسی چھونے والے کے ہاتھ کو نہیں روکتی آپ ﷺ نے فرمایا: اس کو طلاق دے دے، اس نے کہا: مجھے اس سے محبت ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: تو اس سے بہرہ مند ہو۔"

امام احمد وغیرہ نے اسے ضعیف کہا ہے، اس میں کتاب و سنت کا معارضہ کرنے کے لیے دلیل نہیں، اگر یہ حدیث صحیح بھی ہو تب بھی صریح نہیں، چھونے والے کا ایک معنی طالبِ مال کیا گیا ہے جو درست نہیں۔ ایک یہ معنی بیان کیا گیا ہے کہ اس میں بے پردگی تھی، اگر کوئی اس کو دیکھے یا چھوئے تو اس سے نفرت محسوس نہیں کرتی مگر کسی کو مباشرت کی اجازت نہیں دیتی، اس جیسی عورت سے شادی کرنا ناپسندیدہ ہے، اس لیے آپ ﷺ نے اس کو اس سے علاحدگی اختیار کرنے کا حکم دیا، مگر جب اس نے کہا کہ وہ اس سے محبت کرتا ہے تو آپ ﷺ نے علاحدگی پر زور نہ دیا۔ یہ عورت زانیہ نہیں تھی لیکن کچھ مقدمات اور اشارے بازیوں کی وجہ سے گناہ گار تھی، یہی وجہ ہے اس نے کہا: یہ چھونے والے کا ہاتھ نہیں روکتی، اس نے محض ہاتھ سے لمس کا ذکر کیا، لفظ لمس اور ملامسہ سے جب مجامعت مراد ہو تب اس میں ہاتھ کا ذکر نہیں کیا جاتا، بلکہ جب لفظ لمس لفظ "ید" (ہاتھ) کے ساتھ مل کر آئے تب اس کا معنی ہاتھ سے چھونا ہی ہوتا ہے۔ قرآن کریم میں ہے:

﴿ وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتٰبًا فِيْ قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوْهُ بِاَيْدِيْهِمْ ﴾ [الأنعام: ٧]

"اور اگر ہم ان پر کاغذ میں لکھی ہوئی کوئی چیز اتارتے، پھر وہ اسے اپنے ہاتھوں سے چھوتے۔"

نیز وہ عورت جو نکاح کے بعد زنا کرے اس کی طرح نہیں ہوتی جو پہلے ہی زانیہ ہو پھر نکاح کرے، کیوں کہ دوامِ نکاح ابتدا سے زیادہ قوی ہوتا ہے۔ احرام اور عدت ابتدا میں مانع ہیں دوام میں نہیں۔ اگر فرض کیا جائے کہ اس بات پر شرعی دلیل قائم ہے کہ نکاح کے بعد زانیہ سے فراق ضروری نہیں تو زنا عدت کی طرح ہوا جو ابتدا کو مانع ہوتی ہے دوام کو نہیں۔

اگر پوچھا جائے کہ اس آیت: ﴿ لَا يَنْكِحُهَآ اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِكٌ ﴾ کا مفہوم و معنی کیا ہے؟ تو جواب میں کہا جائے گا: زانیہ کے ساتھ شادی کرنے والا اگر مسلمان ہو تو وہ زانی ہو گا، اگر مسلمان نہ ہو تو کافر ہو گا، اگر وہ اس کی حرمت پر ایمان رکھتا ہو، پھر بھی اس کا ارتکاب کرے تو وہ زانی ہو گا، اگر رسول ﷺ کی پیش کردہ شریعت پر ایمان

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٠٤٩) سنن النسائي، رقم الحديث (٣٢٢٩) شیخ البانی رحمہ اللہ نے اسے صحیح کہا ہے۔

نہ رکھتا ہو تو مشرک ہو گا، جس طرح مشرک زمانۂ جاہلیت میں بدکار اور فاحشہ عورتوں سے نکاح کیا کرتے تھے۔ معلوم ہوا جو ایسی عورت سے شادی کرے اور اس کو حرام نہ سمجھے وہ مشرک ہوا۔ اگر اس کو حرام سمجھتا ہو، اس کے باوجود اس سے شادی کرے تو زانی ہو گا، کیوں کہ یہ عورت خاوند کے علاوہ غیر مرد کو بھی مجامعت کی اجازت دے گی اور خاوند بھی اس سے اسی طرح مجامعت کرنے والا رہ جائے گا جس طرح دوسرے اس سے مجامعت کریں گے۔ ہر وہ عورت جس سے مجامعت کرنے میں دو لوگ شریک ہوں وہ زانیہ ہوتی ہے، کیوں کہ شرم گاہیں اشتراک برداشت نہیں کرتیں، بلکہ زوجہ وہی ہو گی جو پاک دامن ہو۔

بنا بریں زانیہ سے نکاح کرنے والا زانی اور لوگوں کی نگاہ میں بھی قابلِ مذمت ہوتا ہے، بلکہ وہ اس شخص سے بھی زیادہ مذموم سمجھا جاتا ہے جو لوگوں کی عورتوں سے نکاح کرتا ہے۔ کسی مرد کو رنڈی کا مرد ہونے کی گالی دینا سب سے بڑی گالی اور عار سمجھا جاتا ہے، اس کی بے ہودگی اور قباحت مسلم معاشروں میں مسلم ہے، اس لیے یہ قطعاً جائز نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عورت پر قذف اور الزام لگانا خاوند میں طعن اور عیب ہوتا ہے، اگر زانیہ سے شادی کرنا جائز ہوتو پھر قذف خاوند کے لیے طعنہ مہنا نہ ہو۔ اسی بنا پر کسی بزرگ نے کہا ہے: ''کسی نبی کی بیوی نے کبھی زنا نہیں کیا۔'' اللہ نے انبیا کو کافر عورتوں سے تو شادی کرنے کی اجازت دی ہے، مگر زانیہ سے نہیں، کیوں کہ یہ نکاح کا مقصد خراب کر دیتی ہے، کافرہ کے عکس۔ یہ اتنا اہم اور حساس معاملہ ہے کہ اگر کسی کی بیوی زنا کرے تو مرد کو چار گواہ ڈھونڈنے کے بجائے لعان کرنے کی اجازت دی ہے اور اس کے لعان کی وجہ سے اس سے حد ساقط کر دی ہے، کیوں کہ اس میں اس کی عزت خطرے میں پڑ جاتی ہے اور کئی طرح کے اضرار و مفاسد سے دوچار ہونا پڑتا ہے، حدیثِ رسول مقبول ﷺ ہے:

((لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ دَيُّوثٌ)) [1]

''دیوث (بے غیرت، بھڑوا) جنت میں داخل نہیں ہو گا۔''

جو کسی فاحشہ سے شادی کرتا ہے وہ دیوث ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسی خسیس خصلت ہے جس کی مذمت کجا مسلمان، کجا کافر، ہر ایک انسان کی گھٹی اور فطرت میں داخل ہے، ہر کوئی اس کی مذمت ہی کرے گا کہ اس کی بیوی زانیہ ہو اور کوئی شخص اس کو فاحشہ کا خاوند ہونے کا طعنہ دے۔ اس لیے اس فعل کے جواز کی نسبت اسلام کی طرف کرنا کس طرح معقول ہے کہ اسلام تو ایک طرف رہا جو تمام شریعتوں سے افضل ہے، اللہ کا کوئی نبی بھی اس طرح کا حکم لے کر نہیں آ سکتا۔

شریعتِ اسلام کو اس طرح کے قول سے مبرا قرار دینا فرض ہے۔ جب کوئی مومن اس کی قباحت کا تصور کرے تو وہ کسی بھی شریعت کی طرف اس کی نسبت کو محال سمجھے گا، بلکہ اس قول کی نسبت سے شریعت کو بری قرار دینا،

[1] مسند أحمد (٢/١٣٤) المستدرك للحاكم (١/٧٢) مصنف عبد الرزاق (١١/٢٤٣) مسند الطيالسي (١/٨٩) صحيح الجامع (٣٠٥٨)

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے افک کی تنزیہ سے بھی زیادہ اہم ہے، اللہ نے مومنوں کو حکم دیا کہ وہ یہ کہیں: ﴿ سُبْحٰنَكَ هٰذَا بُهْتٰنٌ عَظِيْمٌ ﴾ [النور: ١٦] نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو چھوڑا نہیں تھا، کیوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے ان باتوں کی تصدیق نہیں کی تھی جو ان کے بارے میں اڑائی گئیں، جب کچھ شک پیدا ہوا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ سے مشورہ کیا اور لونڈی سے پوچھا، تاکہ دیکھیں اگر بات میں کچھ سچائی ہو تو ان کو چھوڑ دیں، مگر اللہ تعالیٰ نے آسمان سے ان کی براءت نازل کر دی، اس سے ان کا نکاح ثابت اور باقی رہا۔ یہ کسی مسلمان نے نہیں کہا کہ فاحشہ کو نکاح میں رکھنا اور طلاق نہ دینا جائز ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ طیبہ طاہرہ رضی اللہ عنہا کی ذات پر کیچڑ اچھالنے سے منافقوں کا مقصد رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت اچھالنا اور اس میں طعن کرنا تھا۔ اگر زانیہ سے نکاح جائز ہوتا تو آپ کہتے: اس معاملے میں مجھے کوئی مسئلہ نہیں۔ جس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عورتیں بعض اوقات آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف دیتیں، حتی کہ آپ ان سے تعلقات ترک بھی کر دیتے، عورت کے گناہ بندے کے لیے طعنہ مہنا نہیں ہوتے، مگر اس کی بدکاری تمام لوگوں کے نزدیک مرد کے لیے طعنہ ہوتی ہے، کوئی بھی ایسے کسی شخص کی مذمت کا دفاع نہیں کرتا جو کسی فاحشہ سے نکاح کرے اور اس کو علم ہو کہ وہ ابھی بھی زنا کاری پر قائم ہے۔ منافقوں نے اس تہمت اور جھوٹے الزام کو وسیلہ بنا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر طعن کرنا چاہا، تا آنکہ اللہ رب العزت نے آسمان سے سیدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی براءت نازل کر دی۔

جب رسولِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: ''کون مجھے ایسے شخص سے معذور سمجھے گا جس نے میرے اہل (بیوی) کو اذیت دے کر مجھے اذیت دی؟ خدا کی قسم! میں اپنے اہل (بیوی) میں خیر کے علاوہ اور کچھ نہیں جانتا، انھوں نے (اس معاملے میں) ایک ایسے آدمی کا ذکر کیا ہے کہ میں اس میں بھی خیر کے علاوہ اور کچھ نہیں جانتا۔'' سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ (جن کی وفات پر عرش کانپ اٹھا) کھڑے ہوئے اور کہنے لگے: میں آپ کو اس سے معذور سمجھتا ہوں، اگر وہ ہمارے قبیلے ''اوس'' سے تعلق رکھتا ہے تو میں اس کی گردن اڑا دوں گا، اگر ہمارے بھائیوں خزرج سے تعلق رکھتا ہے تو آپ اس کے متعلق جو حکم دیں گے، ہم اسے پورا کریں گے۔ سعد بن عبادہ قبائلی غیرت کھا گئے (حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں: یہ پہلے نیک آدمی تھے، لیکن ان کو حمیت نے آ لیا، کیوں کہ عبداللہ بن اُبی ان کے قبیلے کا بڑا تھا) اور کہنے لگے: اللہ کی قسم! تو نے جھوٹ کہا ہے تو اس کو قتل کرے گا نہ قتل کرنے پر قادر ہی ہو گا۔ اتنے میں اسید بن حضیر کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے: تو نے جھوٹ کہا: اللہ کی قسم! ہم ضرور اس کو قتل کر دیں گے، تو منافق ہے اور منافقوں کی طرف داری میں جھگڑ رہا ہے۔ دونوں قبیلے بھڑک اٹھے، یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اترے اور انھیں ٹھنڈا کرنے لگے۔[1]

اگر یہ تہمت جو صدیقہ کائنات پر لگائی گئی اور ان کے بارے میں طرح طرح کی باتیں کہی گئیں، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٥١٨)، صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٧٠)

کی ذات میں طعن اور زبان درازی نہ ہوتی تو مسلمان اس طرح اس شخص کو قتل کرنے کی باتیں نہ کرتے، جس نے آپ ﷺ کی زوجہ محترمہ پر قذف اور الزام لگایا۔

لہٰذا جو شخص رسول اللہ ﷺ کی والدہ محترمہ پر قذف لگائے اس کو قتل کیا جائے گا، کیوں کہ یہ آپ ﷺ کے نسب میں طعن ہوگا۔ اسی طرح جو آپ ﷺ کی ازواجِ مطہرات پر قذف لگاتا ہے اس کو بھی قتل کر دیا جائے گا، کیوں کہ یہ آپ ﷺ کے دین میں طعن ہے۔

انھوں نے اس وقت یہ باتیں کی تھیں۔ جب ابھی سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی براءت معلوم نہیں ہوئی تھی، اس لیے آپ ﷺ نے ان کو قتل نہیں کیا تھا۔ نیز وہ ان امہات المومنین میں شامل ہیں۔ جن کو آپ ﷺ نے علاحدہ نہیں کیا تھا، کیوں کہ اگر آپ ان کو طلاق دے دیتے تو وہ اس اعزاز سے محروم ہو جاتیں۔

مختصراً عرض ہے کہ یہ مسئلہ مسلمانوں کے دلوں میں اس قدر راسخ ہے کہ اس کے لیے بہت سے دلائل دینے کی ضرورت نہیں، ایمان اور قرآن اس جیسے معاملے کو حرام قرار دیتے ہیں، لیکن چونکہ بہت سے علمائے اسلام، نے جن میں تابعین بھی شامل ہیں اور متاخرین بھی، اور جن کے علم و دین میں کوئی کلام نہیں، تاویل کرتے ہوئے اس کو جائز کہا ہے، اس لیے اس پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے، اس کے نظائر بہت ہیں۔ کبھی کوئی قول بہت زیادہ ضعیف ہوتا ہے، مگر بہت سے اہلِ علم و ایمان پر اس کی حقیقت ملتبس اور مشتبہ ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے اختلاف کے موقع پر صرف کتاب و سنت سے رجوع کرنے ہی میں عصمت رکھی ہے، رسول اللہ ﷺ کے سوا، جو اپنی خواہش سے نہیں بولتے تھے، ہر ایک کی بات قبول بھی کی جا سکتی ہے اور رد بھی۔

اگر کوئی اعتراض کرے اور کہے کہ اللہ تعالیٰ نے تو یہ کہا ہے: ﴿ اَلزَّانِیْ لَا یَنْكِحُ اِلَّا زَانِیَةً اَوْ مُشْرِكَةً ﴾ [النور: ۳] جواب میں کہا جائے گا: اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جو زانی توبہ نہیں کرتا، اس کے لیے عفیفہ (پاک دامن) عورت سے نکاح کرنا جائز نہیں، امام احمد سے بھی ایک روایت یہی ہے۔ اگر وہ اس سے بھی زنا کرے، اس عورت سے بھی اور فلاں فلاں سے بھی تو اس کا اپنی بیوی سے جماع کرنا بھی ایسا ہی ہے۔ جیسا وہ اس کے علاوہ دیگر زنا کرنے والی عورتوں سے مجامعت کرتا ہے تو یہ بھی اس میں شامل ہے۔

امام شعبی کا قول ہے: ''جس شخص نے اپنی پاک دامن بیٹی کی شادی کسی بدکار سے کی، اس نے اس کا رحم کاٹ دیا، یعنی اس سے تعلق ختم کر لیا۔''

① اگر وہ لوگوں کی عورتوں سے زنا کرتا رہے تو اس سے تحریک لے کر اس کی بیوی بھی دوسرے مرد کو اپنی خلوت تک رسائی دے سکتی ہے اور اکثر ایسا ہی ہوتا ہے۔ میں نے کسی ایسے شخص کو نہیں دیکھا جو لوگوں کی عورتوں سے

زنا کرتا ہو یا لونڈے بازی کرتا ہو اور اس کی بیوی مقابلے میں اور اس کو طیش دلانے کے لیے کسی دوسرے مرد کی خلوت گرم کرنے پر تیار نہ ہو۔

② جو زنا کا عادی ہو، وہ بدکار عورتوں سے اپنی طلب پوری کر لیتا ہے اور وہ اپنی بیوی کو پاکدامن نہیں رکھ سکتا، اس لیے وہ بھی زنا کی راہ پر چل سکتی ہے۔

③ جو لوگوں کی عورتوں سے زنا کرتا ہے، لوگ اس کی عورتوں سے زنا کے طلب گار ہوتے ہیں۔ زمینی حقائق یہی ہیں۔ زانی کی بیوی بھی کئی وجوہ کی بنا پر زانیہ بن جاتی ہے۔ اگر وہ اللہ کے حرام کردہ حکم کو حلال سمجھے تو مشرک ہوگی۔ اگر وہ اپنی شرم گاہ سے زنا نہ کرے تو اپنی آنکھوں وغیرہ سے ضرور زنا کرے گی، لہٰذا وہ مرد جو زنا کے عادی مجرم ہوں اور توبہ نہ کریں، شاید ہی ان کی عورتوں میں سے کوئی عورت مکمل سلامت رہ سکتی ہو۔ اگر کوئی عورت اپنے خاوند کو پرائی عورتوں کے پاس جاتا دیکھے تو اس کی طبع اس کو مردوں کی طرف دعوت دیتی ہے۔

حدیث شریف میں آیا ہے:

«بِرُّوا آبَاءَكُمْ تَبَرَّكُمْ أَبْنَاؤُكُمْ، وَعِفُّوا تَعِفَّ نِسَاؤُكُمْ» [1]

''اپنے باپوں کے ساتھ حسنِ سلوک کرو، تمھارے بیٹے تمھارے فرماں بردار ہوں گے، پاک دامن رہو، تمھاری بیویاں پاک دامن رہیں گی۔''

لہٰذا اس آیت: ﴿ اَلزَّانِيْ لَا يَنْكِحُ اِلَّا زَانِيَةً ﴾ میں یا یہ مراد ہے کہ بذاتِ خود اس کا نکاح اور اس کے ساتھ مجامعت زنا ہے یا یہ زنا کا ذریعہ ہے۔ جہاں تک زانیہ کی بات ہے، زنا پر اصرار کے ساتھ اس کے ساتھ مجامعت زنا ہی ہے۔ اسی طرح ﴿ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ ﴾ [المائدة: ٥] کی تفسیر میں کئی اقوال ہیں، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کی تفسیر آزاد عورتوں اور پاک دامن عورتوں کے ساتھ کی ہے، پاک دامن عورتیں صحیح تفسیر ہے، قرآن کریم بھی اسی پر دلالت کرتا ہے، ارشاد ہے:

﴿يَسْـَٔلُوْنَكَ مَا ذَاۤ اُحِلَّ لَهُمْ ؕ قُلْ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ۙ وَمَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِيْنَ تُعَلِّمُوْنَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ ؗ فَكُلُوْا مِمَّاۤ اَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ وَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهِ ۪ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝ اَلْيَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ؕ وَطَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ ۪ وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ ؗ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ اِذَاۤ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ ﴾ [المائدة: ٤، ٥]

---

[1] المستدرك للحاكم (٤/١٥٤)، صحيح الجامع، رقم الحديث (٢٣٢٨)

”تجھ سے پوچھتے ہیں کہ ان کے لیے کیا حلال کیا گیا ہے؟ کہہ دے تمھارے لیے پاکیزہ چیزیں حلال کی گئی ہیں اور شکاری جانوروں میں سے جو تم نے سدھائے ہیں، (جنھیں تم) شکاری بنانے والے ہو، انھیں اس میں سے سکھاتے ہو جو اللہ نے تمھیں سکھایا ہے تو اس میں سے کھاؤ جو وہ تمھاری خاطر روک رکھیں اور اس پر اللہ کا نام ذکر کرو اور اللہ سے ڈرو، بے شک اللہ بہت جلد حساب لینے والا ہے۔ آج تمھارے لیے پاکیزہ چیزیں حلال کر دی گئیں اور ان لوگوں کا کھانا تمھارے لیے حلال ہے جنھیں کتاب دی گئی اور تمھارا کھانا ان کے لیے حلال ہے اور مومن عورتوں میں سے پاک دامن عورتیں اور ان لوگوں کی پاک دامن عورتیں جنھیں تم سے پہلے کتاب دی گئی، جب تم انھیں ان کے مہر دے دو، اس حال میں کہ تم قیدِ نکاح میں لانے والے ہو، بدکاری کرنے والے نہیں۔“

یہی تفسیر شعبی، حسن، نخعی، ضحاک اور سدی سے منقول ہے۔

اگر لفظ ﴿ الْمُحْصَنٰتُ ﴾ سے آزاد عورتیں مراد ہوں تو عفت اِحصان میں بطریق اولیٰ داخل ہے، کیوں کہ محصنہ اصل میں اس پاک دامن عورت کو کہتے ہیں جو اپنی شرم گاہ کی حفاظت کرتی ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرٰنَ الَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا ﴾ [التحریم: ۱۲]

”اور عمران کی بیٹی مریم کی (مثال دی ہے) جس نے اپنی شرم گاہ کی حفاظت کی۔“

دوسری جگہ فرمایا:

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ الْغٰفِلٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ ﴾ [النور: ۲۳]

”بے شک وہ لوگ جو پاک دامن، بے خبر مومن عورتوں پر تہمت لگاتے ہیں۔“

یہ پاک دامن عورتیں ہی ہیں۔ حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے متعلق کہا تھا:

حَصَانٌ رَزَانٌ مَا تُزَنُّ بِرِيْبَةٍ وَتُصْبِحُ غَرْثٰى مِنْ لُحُوْمِ الْغَوَافِلِ

”پاک دامن، سنجیدہ، شک سے مبرا، غافل اور بے خبر پاک دامنوں کی غیبت کرنے سے بے نیاز۔“

پھر عربوں میں یہ معروف تھا کہ ان کی آزاد عورت زنا میں نام اور شہرت نہیں رکھتی تھی۔ یہ لونڈیاں تھیں جو زنا میں نام رکھتی تھیں۔ جب رسول اللہ ﷺ نے ابوسفیان کی بیوی ہندہ سے زنا نہ کرنے پر بیعت کی تو اس نے تعجب سے پوچھا: کیا آزاد عورت زنا کر سکتی ہے؟ کیوں کہ یہ ان کے معاشرے میں معروف نہیں تھا۔ لہٰذا آزاد، لونڈی کے عکس عرفِ عامہ میں عفیفہ اور پاک دامن کے ہم معنی سمجھی جاتی تھی، لہٰذا لفظِ اِحصان پاک دامنی کے ساتھ آزادی کو شامل ہے، کیوں کہ لونڈیاں پاک دامن نہیں تھیں۔ اسی طرح اسلام فحاشی اور برائی سے روکتا ہے اور اسی طرح شادی شدہ

عورت کو اس کا خاوند محفوظ اور پاک دامن رکھتا ہے، کیوں کہ وہ اسی سے اپنی ضرورت پوری کرتی ہے اور اسی پر اکتفا کرتی ہے، نیز اس کا خاوند اس پر غیرت بھی کھاتا ہے۔ اسی طرح لفظِ احصان اسلام، آزادی اور نکاح سب کو شامل ہے اور اس کی اصل عفت ہے، کیوں کہ عفیفہ اس کو کہا جاتا ہے جو اپنی شرم گاہ کو اس سے محفوظ رکھتی ہے جو اس کا حق نہیں رکھتا، اس محصن کی طرح جو ہر اس عورت سے بچتا ہے جو اس کی بیوی نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں اور اہلِ کتاب سے محصنات سے نکاح کو جائز قرار دیا ہے تو ''بغایا'' زانی عورتیں محصنات نہیں ہوتیں، اس لیے ان سے نکاح بھی جائز نہیں کیا۔

اسی طرح وہ عورت جو مسافحہ (زنا کار) اور یار رکھتی ہو جو اس کے ساتھ زنا کرتا ہو اور وہ صرف اس کے ساتھ زنا کرتی ہو تو نکاح حلال ہونے کے لیے شرط ہے کہ آدمی زنا کار ہو نہ خفیہ دوست اور کوئی داشتہ رکھتا ہو۔ اگر عورت زانیہ ہو اور ہر ایک کے ساتھ بدکاری کرتی ہو تو اس کا خاوند اس کو دوسرے سے محفوظ رکھنے والا، یعنی محصن نہیں ہوتا، کیوں کہ اگر وہ اس کو محفوظ رکھتا تو وہ محفوظ رہتی، یعنی محصنہ ہوتی، اگر وہ مسافحہ ہے تو محصنہ نہیں۔ اللہ نے اس صورت میں نکاح جائز کیا ہے، جب مرد محصن ہوں، مسافح نہ ہوں۔ لفظ سفاح زیادہ بلیغ ہے، کیوں کہ اس میں داشتہ رکھنے کی ممانعت بھی ہے۔ اس کا لغوی مطلب ہے پانی انڈیلنا، زنا کو سفاح کہا جاتا ہے، کیوں کہ آدمی اپنا نطفہ اور پانی، عقد اور نکاح کے بغیر انڈیلتا ہے اور عورت اپنا پانی ڈالتی ہے۔ محصنین کا مطلب ہوا پاک دامن زنا نہ کرنے والے۔

سورت نساء میں فرمایا:

﴿ وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوٰلِكُمْ مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ ﴾ [النساء: ٢٤]

''اور تمھارے لیے حلال کی گئی ہیں جو ان کے سوا ہیں کہ اپنے مالوں کے بدلے طلب کرو، اس حال میں کہ نکاح میں لانے والے ہو، نہ کہ بدکاری کرنے والے۔''

ان دونوں آیات میں یہ شرط لگائی کہ مرد محصن ہوں، مسافح نہ ہوں، لہٰذا جو شخص کسی بدکار عورت سے نکاح کرتا ہے اور وہ بدکاری پر قائم ہو، وہ اس کو محفوظ نہ کر سکے، وہ جس طرح نکاح سے پہلے دوسرے مرد تلاش کرتی تھی، اب بھی کرتی رہے، تو وہ مرد اس عورت کے لیے مسافح ہے، اس کے لیے محصن نہیں اور یہ قرآن کی دلالت سے حرام ہے۔

اگر کہا جائے اس سے یہ مراد ہے کہ تو اپنا مال خرچ کر کے نکاح کرنا چاہتا ہے، سفاح (زنا) نہیں، اس لیے تو اس کو مہر دیتا ہے کہ وہ صرف تیری بیوی بن کر رہے، اس میں تیرے علاوہ کسی دوسرے کا حق نہ ہو، اس بات کے برخلاف کہ تو نے اس لیے حق مہر دیا کہ وہ جس کے ساتھ چاہے زنا کرے، تیری داشتہ بن کر رہے تو یہ حرام ہوگا؟

اس کے جواب میں کہا جائے گا: اگر نکاح کا مقصود یہ ہے کہ وہ صرف اس کی بن کر رہے جس کے ساتھ اس کی شادی ہوئی ہے، کسی دوسرے کی نہیں، اس نے زنا سے توبہ نہیں کی تو یہ عقدِ نکاح کے تقاضے کو پورا کرنے والی نہیں ہوگی۔

اگر کہا جائے کہ اس کا خاوند اس کو پاک دامن رہنے پر مجبور کرے اور اس کو اس جگہ رکھے جہاں اس کے لیے زنا کا امکان نہ ہو تو بات یہ ہے کہ ایسا ممکن نہیں ہوتا۔ تجربات اور معاشرتی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ عورت اگر اپنے خاوند کے علاوہ کسی دوسرے مرد کا ارادہ کر لے تو وہ اس کے لیے بے شمار طریقے اور بہانے اختیار کر سکتی ہے اور خاوند کو خبر بھی نہیں ہونے دیتی وہ اس کے لیے جادو کا سہارا لے سکتی ہے، خاوند کو کچھ کھلا سکتی ہے اور ایسے طریقے سے خاوند کی عقل پر قبضہ جما لیتی ہے کہ اس کو اپنی انگلیوں پر نچا سکتی ہے۔ ضروری نہیں کہ وہ یہ کام حرام کاری کے لیے کرے، بلکہ اس کے کئی مقاصد ہو سکتے ہیں، معاشرے میں اس طرح کی مثالیں اور کہانیاں زبان زدِ عام ہیں، اگر یہ کام ایک بیوی کر سکتی ہے جو بدکار نہیں ہوتی، تو جو بدکار ہو، اس سے کیا بعید ہے؟ لہٰذا اگر یہ بدکار توبہ کر لے اور توبہ پر کاربند رہے تو ایسی صورت میں اس سے نکاح کی اجازت ہے، توبہ کے بغیر یہ ناممکن یا انتہائی دشوار ہے۔ اس لیے کچھ علما نے اس کی توبہ کو جانچنے کی شرط لگائی ہے، تاکہ اس کی سچائی ثابت ہو سکے، کیوں کہ توبہ کی سچائی محض زبان سے ثابت نہیں ہوتی، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ إِذَا جَآءَكُمُ الْمُؤْمِنَٰتُ مُهَٰجِرَٰتٍ فَامْتَحِنُوهُنَّ ﴾ [الممتحنة: ١٠]

''جب تمھارے پاس مومن عورتیں ہجرت کر کے آئیں تو ان کی جانچ پڑتال کرو۔''

مہاجر تائب کو بھی کہا جاتا ہے، رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

''مہاجر وہ ہے جس نے اللہ کے منع کردہ کام چھوڑ دیے، مہاجر وہ ہے جس نے برائی چھوڑ دی۔''

یہ عورت اگر دعویٰ کرے کہ اس نے برائی چھوڑ دی ہے تو اس کی اس بات کی سچائی پرکھی جائے۔ تاہم اس کے دل پر توبہ کی سچائی کا غالب ہونا ضروری ہے۔

فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ وَلَا مُتَّخِذِىٓ أَخْدَانٍ ﴾ [المائدة: ٥]

''اور نہ چھپی آشنائیں بنانے والے۔''

اس آیت میں داشتہ رکھنے سے منع کیا ہے کہ جس کے ساتھ وہ اکیلا زنا کرے (جدید اصطلاح میں گرل فرینڈ)۔ اللہ تعالیٰ نے لونڈیوں والی آیت میں فرمایا:

﴿ وَمَن لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنكُمْ طَوْلًا أَن يَنكِحَ الْمُحْصَنَٰتِ الْمُؤْمِنَٰتِ فَمِن مَّا مَلَكَتْ أَيْمَٰنُكُم مِّن فَتَيَٰتِكُمُ الْمُؤْمِنَٰتِ ۚ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِإِيمَٰنِكُم ۚ بَعْضُكُم مِّن بَعْضٍ ۚ فَانكِحُوهُنَّ بِإِذْنِ أَهْلِهِنَّ وَءَاتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ مُحْصَنَٰتٍ غَيْرَ مُسَٰفِحَٰتٍ وَلَا مُتَّخِذَٰتِ أَخْدَانٍ ۚ فَإِذَآ أُحْصِنَّ فَإِنْ أَتَيْنَ بِفَٰحِشَةٍ

فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ ﴾ [النساء: ۲۵]

''اور تم میں سے جو مالی لحاظ سے طاقت نہ رکھے کہ آزاد مومن عورتوں سے نکاح کرے تو ان میں سے جن کے مالک تمھارے دائیں ہاتھ ہوں، تمھاری مومن لونڈیوں سے (نکاح کر لے) اور اللہ تمھارے ایمان کو زیادہ جاننے والا ہے، تمھارا بعض بعض سے ہے۔ تو ان سے ان کے مالکوں کی اجازت سے نکاح کرلو اور انھیں ان کے مہر اچھے طریقے سے دو، جب کہ وہ نکاح میں لائی گئی ہوں، بدکاری کرنے والی نہ ہوں اور نہ چھپے یار بنانے والی، پھر جب وہ نکاح میں لائی جا چکیں تو اگر کسی بے حیائی کا ارتکاب کریں تو ان پر اس سزا کا نصف ہے جو آزاد عورتوں پر ہے۔''

یہاں لونڈیوں سے نکاح کرنے کے لیے بھی محصنات (پاک دامن) زنا سے بچنے والیوں اور خفیہ دوست نہ رکھنے والیوں کا ذکر کیا۔ آزاد عورتوں میں یہ شرط رکھی کہ مرد محصن (پاک دامن) ہوں، زنا کرنے والے نہ ہوں اور سورت مائدہ میں ذکر کیا: ﴿ وَلَا مُتَّخِذِيْٓ اَخْدَانٍ ﴾ [المائدۃ: ۵] ''داشتائیں رکھنے والے نہ ہوں۔''

سورت نساء میں ذکر کیا: ﴿ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ ﴾ (زنا کار نہ ہوں)، کیوں کہ لونڈیاں زنا کی شہرت رکھتی تھیں، آزاد عورتیں نہیں، اس لیے ان سے نکاح کرنے کے لیے ان کے محصنات (پاک دامنیں) غیر مسافحات (زنا نہ کرنے والیاں) اور خفیہ دوست نہ رکھنے والیوں کی شرط لگائی، اس سے معلوم ہوا کہ زانیہ لونڈیوں سے نکاح کرنا بھی جائز نہیں، ضروری ہے کہ وہ محصنہ ہو، اس کا خاوند اس کو پاک دامن رکھے، وہ مردوں سے جنسی تعلق نہ رکھے اور کسی کو خفیہ دوست نہ بنائے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: ''محصنات'' سے مراد پاک دامنیں، زنا نہ کرنے والیاں ہیں اور ﴿ وَلَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ ﴾ سے مراد گہرے دوست نہ رکھتی ہوں۔ زمانۂ جاہلیت کے لوگ ظاہر ہونے والے زنا کو حرام کہتے تھے اور بوسیدہ زنا کو حلال سمجھتے تھے۔ انہی سے دوسری روایت ہے: ﴿ مُسٰفِحٰتٍ ﴾ سے مراد علانیہ زنا کرنے والیاں اور ﴿ مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ ﴾ سے مراد ایک دوست رکھنے والیاں ہیں۔ کچھ مفسرین کہتے ہیں: عورت کسی ایک شخص کو اپنا یار بنا لیتی اور صرف اس سے زنا کرتی، اس کے علاوہ کسی دوسرے سے نہ کرتی۔ سلف نے ذکر کیا ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں زنا کی دو اقسام تھیں، ایک مشترک اور دوسری مختص۔ مشترک وہ جو عرف میں ظاہر ہو جاتا اور مختص وہ جو عرف میں چھپا رہتا۔ اللہ نے جب مختص (ایک ہی مرد کے ساتھ خاص) زنا کو حرام قرار دیا جو نکاح کے اس اعتبار سے مشابہ ہے کہ اس میں بیوی صرف خاوند کے لیے خاص ہو جاتی ہے تو نکاح حلال اور خفیہ یار رکھنے والے حرام کام میں فرق ضروری تھا، کیوں کہ یہ عورت جس اکیلی کے ساتھ مرد زنا کرتا، اس میں اس بات کی کوئی گارنٹی نہیں

تھی کہ اس کے علاوہ کسی دوسرے مرد نے اس سے جنسی تعلق قائم نہ کیا ہو۔ اسی طرح یہ بھی کوئی معروف بات نہیں کہ وہ جس بچے کو جنم دے، وہ اسی مرد سے ہو، کیوں کہ اس کے لیے نکاح کی خصوصیات ثابت نہیں ہوتیں۔

یہی وجہ ہے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سری (خفیہ) نکاح پر کوڑوں کی سزا دیتے، کیوں کہ خفیہ نکاح خفیہ یار رکھنے کے مترادف اور مشابہ ہے، بالخصوص جب عورت ولی اور گواہوں کے بغیر اپنا نکاح خود کرے اور وہ دونوں اس کو چھپائیں۔ اس میں اور داشتہ رکھنے میں کوئی فرق نہیں، کیوں کہ ایسا شخص جس عورت سے چاہے زنا کرے اور بعد میں یہ کہہ دے: میں نے اس سے شادی کی ہوئی ہے، اسی طرح عورت بھی یہ کہہ سکتی ہے، لہٰذا حلال اور حرام کے درمیان واضح فرق ہونا ضروری ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِلَّ قَوْمًۢا بَعْدَ اِذْ هَدٰىهُمْ حَتّٰى يُبَيِّنَ لَهُمْ مَّا يَتَّقُوْنَ ﴾ [التوبة: ١١٥]

''اور اللہ کبھی ایسا نہیں کہ کسی قوم کو اس کے بعد گمراہ کر دے کہ انھیں ہدایت دے چکا ہو، یہاں تک کہ ان کے لیے وہ چیزیں واضح کر دے جن سے وہ بچیں۔''

نیز فرمایا:

﴿ وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ ﴾ [الأنعام: ١١٩]

''بلاشبہہ اس نے تمھارے لیے وہ چیزیں کھول کر بیان کر دی ہیں جو اس نے تم پر حرام کی ہیں۔''

جب لوگوں کے سامنے یہ بات ظاہر ہو جائے کہ فلاں عورت شادی شدہ ہے اور اس نے اپنے دامن کو پاک اور محفوظ کر لیا ہے تو وہ ہر جگہ منہ مارنے والیوں اور خفیہ یار رکھنے والیوں سے ممتاز اور علاحدہ ہو جاتی ہے۔ اگر اس کے لیے غیر مردوں کے پاس جانا ممکن ہو جائے تو پھر محصنات میں فرق کرنا ناممکن ہو جائے گا۔ اسی طرح اگر وہ اپنے نکاح کو چھپائے تو کوئی اس کے اور یار رکھنے والیوں کے درمیان فرق نہیں کر پائے گا، اس مسئلے میں علما کا اختلاف ہے کہ کس طرح ایک شادی شدہ کو بدکار سے ممتاز کیا جا سکتا ہے۔

ایک قول ہے، صرف نکاح کا اعلان اور اظہار ضروری ہے، خواہ کسی کو گواہ بنایا جائے یا نہ بنایا جائے، یہ امام مالک، بہت سے فقہائے حدیث اور اہلِ ظاہر اور ایک روایت میں امام احمد کا مذہب ہے۔

دوسرا قول ہے: گواہ بنانا ضروری ہے، اعلان کیا جائے یا نہ کیا جائے، یہ امام ابو حنیفہ، شافعی اور دوسری روایت میں امام احمد کا مذہب ہے۔

ایک تیسرا قول ہے: دونوں کام ہی ضروری ہیں، یہ امام احمد سے ایک روایت ہے۔

چوتھا قول ہے کہ دونوں میں سے ایک کام کرنا ضروری ہے، یہ امام احمد سے چوتھی روایت ہے۔

خالی گواہ بنانے کی شرط کمزور مذہب ہے، کتاب وسنت میں اس کی کوئی دلیل نہیں، اس مسئلے میں رسول اللہ ﷺ سے کوئی حدیث ثابت نہیں۔ یہ تو ناممکن بات ہے کہ ایک کام جس کو مسلمان متواتر کرتے آئے ہوں اور اس کی کچھ شرائط بھی ہوں جو رسول اللہ ﷺ نے بیان نہ کی ہوں! یہ مسئلہ تو عمومِ بلویٰ سے تعلق رکھتا ہے۔ سب مسلمانوں کو اس کو جاننے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر یہ شرط ہوتی تو اس کا ذکر مہر وغیرہ کے ذکر سے زیادہ مناسب تھا۔ اگر کتاب اللہ اور کسی صحیح حدیث میں اس کا ذکر نہیں تو اس کا مطلب ہوا کہ اللہ نے اس کو مسلمانوں کے نکاح میں لازمی اور واجب نہیں رکھا۔ امام احمد اور دیگر ائمہ حدیث کا کہنا ہے کہ نکاح میں گواہ بنانے کے متعلق رسول اللہ ﷺ سے کوئی چیز ثابت نہیں، اگر یہ واجب ہوتی تو رسول اللہ ﷺ کی طرف سے اس کو واجب قرار دینا معلوم اور معروف ہوتا، کیوں کہ یہ ان احکام سے تعلق ہوتی جن کا اظہار واعلان ضروری ہوتا ہے، تو مہر کی شرط لگانا اولیٰ ہے، کیوں کہ عقد میں مہر کی تقدیر وتعیین کتاب وسنت اور اجماع سے ثابت نہیں، اگر اس کو ظاہر کیا جاتا تو صحابہ سے منقول ہوتا، کیوں کہ انھوں نے ایسی کوئی چیز ضائع نہیں ہونے دی جس کو جاننا عام مسلمانوں کے لیے ضروری ہو۔ اس طرح کی بات نقل کرنے میں اسباب اور ہمتیں میسر ہوتی ہیں۔ انھوں نے نکاحِ شغار اور حرام نکاح وغیرہ جیسے کم واقع ہونے والے معاملات سے ممانعت کو یاد رکھا اور آگے پہنچایا، اگر اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے گواہ مقرر کیے بغیر نکاح کو باطل اور حرام قرار دیا ہے تو اس سلسلے میں رسول اللہ ﷺ سے کوئی نص کیوں یاد نہیں کی گئی، بلکہ اگر اس معاملے میں کوئی خبرِ واحد بھی منقول ہوتی تو ان علما کے نزدیک مردود ہوتی، جن کا یہ موقف ہے، کیوں کہ بہت سے عام واقع ہونے والے مسائل سے بھی زیادہ عام اور اہم ہے، اس لیے یہ ناممکن ہے کہ مسلمانوں کا ہر نکاح گواہ مقرر کیے بنا صحیح نہ ہو، حالانکہ مسلمانوں نے نکاحوں کے اتنے عقد کیے ہیں کہ ان کی صحیح تعداد اللہ کے سوا کسی کو معلوم نہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ کسی اور شرط کے سوا صرف گواہ بنانے کی شرط لگانا باطل ہے، یہی وجہ ہے کہ یہ شرط عائد کرنے والے غایت درجہ اضطراب کا شکار ہیں جو اس اصل کے فاسد ہونے کی دلیل ہے، ان کا کوئی ایسا قول نہیں جو شریعت کے معیار پر پورا اترتا ہو، کیوں کہ ان میں سے کچھ فاسقوں کی گواہی بھی جائز کہتے ہیں، جب کہ وہ گواہی جو ان کے نزدیک واجب نہیں، اس میں بھی اللہ تعالیٰ نے عادل گواہوں کو گواہ بنانے کا حکم دیا ہے تو واجب گواہی میں یہ شرط کیوں مفقود ہوگی؟ پھر تعجب کی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تو رجوع میں گواہ مقرر کرنے کا حکم دیا ہے، لیکن نکاح میں نہیں اور یہ فقہا نکاح میں گواہ مقرر کرنے کا حکم دیتے ہیں، لیکن رجوع میں اکثر گواہ مقرر کرنے کے قائل نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے رجوع کرتے وقت اس لیے گواہ مقرر کرنے کا حکم دیا ہے۔ تا کہ خاوند پر کوئی اعتراض نہ ہو، وہ اپنی بیوی کے ساتھ رہ رہا ہو، کیوں کہ اگر رجعی طلاق میں گواہ مقرر نہ کیے جائیں تو یہ اس کے ساتھ حرام اقامت کا سبب بن سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے غیر رجعی طلاق میں گواہ مقرر کرنے کا حکم نہیں دیا، کیوں کہ اس میں جب وہ عورت کے بعد اس کو اچھے طریقے سے چھوڑ دیتا ہے تو طلاق ظاہر ہو جاتی ہے۔ یزید بن ہارون نے اہلِ رائے پر یہی اعتراض کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے بیع، یعنی خرید وفروخت میں گواہ مقرر کرنے کا حکم دیا ہے، نکاح میں نہیں، لیکن انھوں نے نکاح میں گواہ مقرر کرنے کا حکم دیا ہے، بیع میں نہیں۔ بیع میں گواہ مقرر کرنا وجوب یا استحباب کا حکم رکھتا ہے، قرآن وسنت اس کے مستحب ہونے پر دلالت کرتے ہیں، لیکن نکاح کے معاملے میں شریعت نے گواہ بنانے کو واجب کہا ہے نہ مستحب، کیوں کہ نکاح میں اعلان کرنے کا حکم دیا ہے، اس کا اعلان اس کے دوام کے ساتھ گواہ مقرر کرنے سے بے پروا کر دیتا ہے، عورت مرد کے پاس ہوتی ہے اور لوگوں کو پتا ہوتا ہے کہ یہ اس کی بیوی ہے، گویا یہ دائمی اظہارِ نسب کی طرح گواہ مقرر کرنے سے مستغنی کر دیتا ہے۔ نسب میں بھی اس بات کی ضرورت نہیں ہوتی کہ آدمی اس پر گواہ مقرر کرے کہ اس کی بیوی نے کسی بچے کو جنم دیا ہے، بلکہ یہ ظاہر اور معلوم ہو جاتا ہے کہ فلاں کی بیوی نے بچہ جنم دیا ہے، اس لیے گواہ بنانے کی ضرورت نہیں رہتی، بیع کے عکس، اس میں انکار کا امکان رہتا ہے اور اس پر دلیل قائم کرنا بھی دشوار ہو جاتا ہے، اس لیے نکاح جب ایسی جگہ پر کیا جائے جہاں اعلان و اظہار نہ ہو سکتا ہو، وہاں گواہ مقرر کر کے اس کا اعلان کیا جاتا ہے لٰہذا بعض اوقات نکاح میں گواہ مقرر کرنا اس وجہ سے ضروری اور واجب ہوتا ہے کہ وہ اعلان و اظہار کا سبب ہوتا ہے، اس وجہ سے نہیں کہ نکاح دو گواہوں کے بغیر قائم اور منعقد نہیں ہوتا، بلکہ جب کوئی شخص اپنی زیرِ سرپرستی لڑکی کی شادی کسی سے کر دے، پھر وہ دونوں باہر نکلیں، اس پر بات کریں اور لوگ ان کی یہ بات سن لیں یا لوگ اور گواہ عقد کے بعد آئیں اور وہ ان کو بتا دیں کہ اس نے اپنی بیٹی وغیرہ کی شادی اس سے کر دی ہے تو یہ بھی کافی ہوتا۔ سلف کی یہی عادت تھی، وہ دو گواہوں کو بلانے اور حق مہر لکھوانے کے لیے ایسا کوئی اہتمام اور تکلف نہیں کرتے تھے۔

اسی طرح وجوبِ اِشہاد (گواہ مقرر کرنے کا وجوب) کے کچھ قائلین مستور الحال گواہوں کی گواہی کی بات بھی کرتے ہیں، اس سے بھی مقصود حاصل نہیں ہوتا۔ کچھ یہ شرط عائد کرتے ہیں کہ گواہ کی عدالت اور سچائی معلوم ہو، اس کا فساد بھی واضح ہے، مسلمان اپنے نکاحوں میں اس کا التزام نہیں کرتے تھے کہ تینوں اقوال امام احمد کے مذہب میں گواہی کی شرط عائد کرنے کے قول کی صورت میں ہیں۔ امام ابو حنیفہ کے نزدیک فاسقوں کی گواہی بھی قابلِ قبول ہے۔ ایک قول میں مستور الحال گواہوں کی گواہی بھی چل جاتی ہے۔ تاہم اس اختلافی تفصیل سے قطع نظر ان کا نقطہ نگاہ یہ ہے کہ گواہی کی ضرورت بچے کے نسب کی حفاظت کے لیے ہے، اگر کوئی انکار کر دے تو گواہی سے ثابت ہو جائے، لیکن یہ مقصود تو اعلانِ نکاح سے بھی حاصل ہو جاتا ہے اور کبھی گواہ مقرر کرنے سے بھی حاصل نہیں ہوتا، جب اس کو مکمل خفیہ رکھا جائے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ نکاح اعلان کے ساتھ صحیح ہوتا ہے، چاہے دو گواہ گواہی نہ بھی دیں،

گواہ بھی بنایا جائے اور خفیہ بھی رکھا جائے، تو یہ معاملہ محلِ نظر ہے۔ جب گواہی اور اعلان اکٹھے ہو جائیں تو ایسے نکاح کی صحت اور درستی میں کوئی اختلاف نہیں۔ وہ نکاح جو اِشہاد (گواہ مقرر کرنا) اور اعلان دونوں سے خالی ہو وہ عام علما کے نزدیک باطل ہے۔ کچھ علما دو گواہوں کی شرط محض نکاح کی تعظیم و تکریم کے لیے لگاتے ہیں۔ اس سے مقصود بھی اعلان ہی ہے۔ اگر کوئی ایسی صورت اور معاشرہ ہو جہاں لوگ ایک دوسرے کو نہ جانتے ہوں اور یہ پتا نہ چل سکے کہ آدمی کے ساتھ رہنے والی اس کی بیوی ہے یا داشتہ تو ایسی صورت میں گواہ مقرر کرنا واجب قرار دیا جا سکتا ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حق مہر لکھا نہیں کرتے تھے، کیوں کہ وہ مہر موجل پر نکاح نہیں کرتے تھے، بلکہ مہر نقد اور پہلے دیتے تھے، اگر موخر کرتے تو وہ معروف ہوتا، مگر بعد میں جب لوگوں نے مہرِ موجل (موخر) پر نکاح کرنے کی عادت اختیار کر لی اور مدت طویل بھی ہو سکتی ہے اور بھول کا امکان بھی رہتا ہے اس لیے انھوں نے اسے لکھنا شروع کر دیا، یہ اثباتِ مہر اور اثباتِ نکاح کی دلیل بن گئی، لیکن اس اِشہاد سے مقصود حاصل ہو جاتا ہے، چاہے گواہ عقد کے وقت آئیں یا اس کے بعد اور زوج، زوجہ اور ولی کے اقرار نامے کی گواہی دیں، کیوں کہ انھیں علم ہو چکا ہوتا ہے کہ اس نکاح کا اعلان ہو چکا ہے۔ اب پہلے سے اس کو چھپا کر رکھنے کے کسی مشورے کے بغیر ان کا اس کی گواہی دینا ہی اعلان ہوتا ہے۔

جہاں تک صحتِ نکاح کے لیے ولی کی شرط کا مسئلہ ہے تو یہ گواہی کی شرط کے عکس قرآن کریم اور سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی دلالت، نیز صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے رواج سے بھی ثابت ہے، عورتوں کی شادیاں مرد ہی کیا کرتے تھے، معاشرے میں ایسا کوئی چلن نہیں تھا کہ عورت خود اپنی شادی کرتی ہو، نکاح اور خفیہ یار رکھنے میں فرق اسی سے کیا جاتا ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا فرمان ہے: ''عورت اپنی شادی خود نہیں کرتی، یہ بدکار ہوتی ہے جو اپنی شادی خود کرتی ہے، لیکن صرف ولی بھی کافی نہیں، جب تک اعلان نہ کیا جائے۔'' ولیوں میں کچھ اپنی قرابت کی بنا پر مستحسن ہوتے ہیں، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَأَنكِحُوا الْأَيَامَىٰ مِنكُمْ وَالصَّالِحِينَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَإِمَائِكُمْ ﴾ [النور: ۳۲]

''اور اپنے میں سے بے نکاح مردوں، عورتوں کا نکاح کر دو اور اپنے غلاموں اور اپنی لونڈیوں سے جو نیک ہیں ان کا بھی۔''

فرمایا:

﴿ وَلَا تُنكِحُوا الْمُشْرِكِينَ حَتَّىٰ يُؤْمِنُوا ﴾ [البقرۃ: ۲۲۱]

''اور نہ (اپنی عورتیں) مشرک مردوں کے نکاح میں دو، یہاں تک کہ وہ ایمان لے آئیں۔''

پہلی آیت میں یتیم بچیوں کا نکاح کرنے کے لیے ولیوں کو مخاطب کیا، اسی طرح دوسری آیت میں غلام کی

شادی کرنے میں بھی انہی کو مخاطب کیا۔ ﴿وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ﴾ اور ﴿وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ﴾ میں واضح فرق ہے، اس فرق کو بعض ائمہ اہلِ بیت نے دلیل بنایا ہے۔

مزید برآں اللہ تعالیٰ نے کئی جگہوں پر حق مہر کی فرضیت کی بات کی ہے، مگر گواہ مقرر کرنے کو واجب نہیں کیا۔

جس کا قول ہے کہ نکاح مہر کی نفی کے ساتھ تو صحیح ہوتا ہے، مگر گواہوں کے بغیر صحیح نہیں ہوتا، اس نے اللہ کے فرض کردہ حکم کو ساقط اور اس کے واجب نہ کیے ہوئے حکم کو واجب کیا ہے۔

اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ ''نکاحِ شغار'' کی حرمت میں محدثین اور اہلِ مدینہ کا قول اہلِ کوفہ کے قول سے زیادہ صحیح ہے، کیوں کہ اس کی علت نفیِ مہر ہے، اگر اس میں مہر مقرر کیا جائے تو یہ نکاح صحیح ہوتا ہے۔

ان جیسے مسائل میں محدثین اور اہلِ حجاز وغیرہ کے اقوال ان اقوال پر راجح ہیں جو نصوص مخالف آرا پر مشتمل ہیں، لیکن وہ فقہا جنھوں نے اجتہاد اور اپنی تمام صلاحیتوں کو استعمال کرتے ہوئے کوئی ایسی رائے کہی جو نصوص کے مخالف ہوگئی تو انھوں نے اجتہاد اور طلبِ علم میں اپنی وسعت اور قدرت کے مطابق وہ کیا جو کر سکتے تھے، اللہ ان کو ثواب دے گا، انھوں نے اس معاملے میں اللہ کے حکم کی پیروی ہی کی ہے، اس لیے وہ ان کے اجتہاد پر ان کو آخرت میں اجر دے گا، گو جن کو نصوص کا علم ہو گیا، وہ ان سے افضل اور بہتر ہیں جن پر نصوص پوشیدہ رہیں، ان کو دوہرا اجر ملے گا اور ان کو ایک اجر۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَدَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ اِذْ يَحْكُمٰنِ فِي الْحَرْثِ اِذْ نَفَشَتْ فِيْهِ غَنَمُ الْقَوْمِ وَكُنَّا لِحُكْمِهِمْ شٰهِدِيْنَ ﴿78﴾ فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ وَكُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّعِلْمًا﴾ [الأنبياء: ۷۸، ۷۹]

''اور داوٗد اور سلیمان کو، جب وہ کھیتی کے بارے میں فیصلہ کر رہے تھے، جب اس میں لوگوں کی بکریاں رات چر گئیں اور ہم ان کے فیصلے کے وقت حاضر تھے۔ تو ہم نے وہ (فیصلہ) سلیمان کو سمجھا دیا اور ہم نے ہر ایک کو حکم اور علم عطا کیا۔''

جو شخص بھی کتاب و سنت کی نصوص پر تدبر کرے گا، نکاح کے معاملے میں ان کو مفسر پائے گا، وہ ایسی شرائط عائد نہیں کرتیں جو فقہا کی ایک جماعت نے عائد کی ہیں، مثلاً: کچھ فقہا شرط عائد کرتے ہیں کہ اس کے لیے اِنکاح یا تزویج کا لفظ بولنا ضروری ہے، کچھ کہتے ہیں: ایجاب قبول عربی میں ہونا شرط ہے، کچھ کہتے ہیں: دو گواہوں کی شرط ضروری ہے۔ مگر یہ فقہا یہ ساری شرطیں لگانے کے باوجود ایسے نکاح کو صحیح کہتے ہیں، جس میں مہر کی نفی ہو، اس لیے یہ نکاحِ شغار کو درست کہتے ہیں، کیوں کہ اس میں صرف نفیِ مہر کی خرابی ہے، جو ان کے نزدیک خرابی اور مفسدت نہیں، دوسرا گروہ فاسد علتیں بیان کرتے ہوئے اس کو ہر لحاظ سے باطل قرار دیتا ہے۔

اسی طرح یہ نکاح حلالہ کو بھی صحیح کہتے ہیں، جس کا مقصد صرف عورت کو پہلے خاوند کے لیے حلال اور جائز کرنا ہوتا ہے، اہلِ حدیث (محدثین) اور اہلِ مدینہ جنھوں نے نکاح کے لیے کسی مخصوص لفظ کی قید اور شرط لگائی ہے نہ اعلان کے باوجود دو گواہوں کی شرط ہی عائد کی ہے، نکاحِ حلالہ اور نکاحِ شغار سمیت ہر نفیِ مہر والے نکاح کو باطل قرار دیا ہے، ان کا مذہب کتاب و سنت اور آثارِ صحابہ سے زیادہ مشابہت رکھتا ہے۔

اسی طرح بہت سے عراقی اور حجازی اہلِ رائے نے طلاق کے باب میں بہت زیادہ وسعت پیدا کرتے ہوئے، نشے کی طلاق، محلوف بہ (قسم کے ساتھ معلق) کی طلاق، مجبور کی طلاق، مشکوک قسم کی طلاق کو واقع کر دیا، بائن جدائی کو تین طلاقیں شمار کیا اور خلع کو بھی بیک وقت دی جانے والی تین بائن طلاقوں میں شمار کرتے ہوئے طلاقِ بائنہ کہا۔ ان فقہا نے طلاق کے امور میں بڑی کشادہ ظرفی کا مظاہرہ کیا جو حلال کام کو حرام کر دیتی ہے اور حلال نکاح کے راستے تنگ کر دیے۔ پھر جب انھوں نے نکاح میں وسعت دکھائی تو عورت کو اس کے خاوند کی طرف لوٹانے کے لیے حیلے بازی میں بھی اتنی ہی وسعت دکھائی، مگر ان کے پاس اس کو اس کے خاوند کی طرف لوٹانے کے لیے کوئی راستہ نہ بچا، اس طرح پہلا گروہ بہت سے بوجھوں تلے دب گیا اور دوسرے گروہ نے حیلے اور دھوکے کی راہ اپنائی، حالانکہ کتاب و سنت اور آثارِ صحابہ میں تامل کرنے سے معلوم ہو جاتا ہے، اللہ تعالیٰ ان سب حیلوں سے بے پروا کر دیا ہے، اس نے حضرت محمد ﷺ کو ایسی آسان اور یک رخی شریعت دے کر مبعوث کیا، جس میں نیکی کا حکم، برائی کی ممانعت، پاکیزہ چیزیں حلال اور خبیث (گندی) چیزیں حرام کر دی ہیں۔

واللہ أعلم، وصلی اللہ علی محمد وآله وصحبه وسلم.[1]

بنتِ زنا سے شادی کا حکم

سوال کیا بنتِ زنا سے اس کا باپ شادی کر سکتا ہے؟

جواب الحمد للہ. جمہور علما کے مذہب میں وہ اس سے شادی نہیں کر سکتا اور یہی قطعی اور درست رائے ہے، بلکہ جمہور کا اس میں اختلاف ہے کہ اگر کسی نے ایسا کیا ہے تو اس کی سزا کیا ہے؟ امام احمد سے منقول قول کے مطابق اس کو قتل کیا جائے، یہ اس صورت میں ہے جب وہ کوئی تاویل نہیں کر رہا، ہاں اگر کوئی تاویل کر رہا ہے تو اس کو قتل نہیں کیا جائے گا، گو اس کی رائے غلط ہے۔ ایک قول کے مطابق اس کو مطلقاً قتل کیا جائے گا، جس طرح جمہور نے کہا ہے کہ اگر کوئی شخص مختلف فیہ نبیذ تاویل کی بنا پر نوشِ جاں کرتا ہے تو اس کو بھی کوڑے مارے

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۳۲/۱۰۹۔۱۳٤)

جائیں گے، گو وہ اس کے ساتھ شافعی کے نزدیک فاسق نہیں ہوتا، مگر مالک اور احمد کے نزدیک دوسری روایت میں فاسق ہو جاتا ہے۔ خیر صحیح یہ ہے کہ تاویل کرنے والا معذور ہے، فاسق کیا گناہ گار بھی نہیں ہوتا۔ احمد کو اس مسئلے میں سلف کا اختلاف نہیں پہنچا، کیوں کہ اس میں اختلاف سلف کے زمانے میں نہیں ہوا تھا، بلکہ ان کے اپنے زمانے میں ہوا تھا۔

جن کے نزدیک بنتِ زنا سے نکاح کرنا جائز ہے، ان کی دلیل ہے کہ یہ اس کی شرعی بیٹی نہیں، کیوں کہ وہ ایک دوسرے کے وارث نہیں بنتے، اس پر اس کا خرچہ بھی واجب نہیں اور وہ اس کا ولی بھی نہیں بن سکتا۔ اسی طرح اگر وہ لونڈی بن کر اس کی ملکیت میں چلی جائے تو آزاد نہیں ہو گی، یعنی نسب کے سارے احکام اس پر جاری نہیں ہوتے۔ جب وہ شرعی طور پر اس کی بیٹی ہی نہیں تو تحریم کی آیت میں بھی داخل نہیں اور ﴿ وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ ﴾ [النساء: ٢٤] کے حکم میں باقی ہے۔

جمہور کی دلیل یہ ہے کہ اللہ کا فرمان: ﴿ حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ وَبَنَاتُكُمْ ﴾ [النساء: ٢٣] ہر اس عورت کو شامل ہے جو اس لفظ کے تحت حقیقتاً یا مجازاً داخل ہے، خواہ اس کے حق میں توارث وغیرہ کے احکام ثابت ہوں یا خاص تحریم کے سوا اور کچھ ثابت نہ ہو، آیتِ تحریم کا عموم آیتِ فرائض: ﴿ يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ ۗ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ۚ ﴾ [النساء: ١١] وغیرہ جیسی آیات کے عموم جیسا نہیں، اس کی تفصیل تین صورتوں میں ہے:

1. آیتِ تحریم بنت (بیٹی) بنت لابن (پوتی) بنت البنت (نواسی) تینوں کو شامل ہے، اسی طرح لفظ ''عمہ'' (پھوپھی) باپ، ماں اور جد کی پھوپھی کو شامل ہے، اسی طرح بنت الاخت (بھتیجی) بھتیجے کی بیٹی، بھانجی کی بیٹی کو شامل ہے، اس جیسا عموم آیتِ فرائض میں ثابت ہے نہ اس جیسی دیگر آیات ونصوص میں ہے جن میں احکام کو نسبوں کے ساتھ معلق کیا گیا ہے۔
2. نکاح کی تحریم تو محض رضاعت سے ثابت ہو جاتی ہے، رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«يَحْرُمُ مِنَ الرَّضَاعَةِ مَا يَحْرُمُ مِنَ النَّسَبِ »[1]

''جو رشتے نسب کی وجہ سے حرام ہوتے ہیں، رضاعت کی وجہ سے بھی حرام ہو جاتے ہیں۔''

اس حدیث کی صحت پر اتفاق ہے۔ ائمہ کا عمل بھی اسی پر ہے، اللہ نے اس عورت پر اس بچے یا اس کی اولاد سے شادی کرنا حرام کر دیا ہے جس نے اس کے دودھ سے غذا حاصل کی ہو، اسی پر نہیں، بلکہ اس عورت کی ماؤں، پھوپھیوں اور خالاؤں پر بھی حرام ہے، بلکہ وہ بچی اپنی رضاعی ماں کے اس خاوند پر بھی حرام ہو جاتی ہے جس کی

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٥٠٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٤٧)

مجامعت کی وجہ سے اس کی چھاتیوں میں دودھ اترا ہو۔ اگر آدمی اپنی رضاعی بیٹی سے شادی نہیں کر سکتا جس کے حق میں نسب کے احکام میں تحریم اور اس کے توابع کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا، تو اس لڑکی سے نکاح کرنا کس طرح جائز ہو سکتا ہے جو اس کے نطفے سے پیدا ہوئی ہو؟ کہاں وہ جو اس کے نطفے سے پیدا ہوئی اور کہاں وہ جس نے اس دودھ سے پرورش پائی جو اس کی مجامعت کی وجہ سے اترا؟ لہٰذا تحریم عمومِ خطاب اور دلیل سے بھی ثابت ہوتی ہے، تنبیہ اور فحوائے کلام سے بھی اور قیاسِ اولیٰ سے بھی۔

(3) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَحَلَآئِلُ اَبْنَآئِكُمُ الَّذِیْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْ ﴾ [النساء: ٢٣]

''اور (حرام کی گئی ہیں تم پر) تمھارے ان بیٹوں کی بیویاں جو تمھاری پشتوں سے ہیں۔''

علما کا کہنا ہے کہ یہاں اللہ تعالیٰ نے ''تمھارے صلبی بیٹوں کی بیویاں'' کہہ کر لے پالک بیٹوں سے احتراز کیا ہے، جس طرح دوسری جگہ فرمایا:

﴿ لِكَیْ لَا یَكُوْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ حَرَجٌ فِیْٓ اَزْوَاجِ اَدْعِیَآئِهِمْ اِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا ﴾ [الأحزاب: ٣٧]

''تاکہ مومنوں پر اپنے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں کے بارے میں کوئی تنگی نہ ہو، جب وہ ان سے حاجت پوری کر چکیں۔''

زمانہ جاہلیت کے لوگ ولدِ زنا کا نسب آسانی سے اپنے ساتھ ملا لیتے تھے، مگر لے پالک بیٹے کو اتنی جلدی اپنے نسب میں شریک نہیں کرتے تھے۔ اگر یہاں اللہ نے ابن کے لیے ﴿ مِنْ اَصْلَابِكُمْ ﴾ کی قید لگائی ہے تو لفظ بنات وغیرہ بھی ہر اس فرد پر صادق آتا ہے جو عربی زبان میں اس لفظ کے تحت داخل ہو۔ اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ وہ وراثت وغیرہ کی حق دار نہیں تو یاد رہے کہ نسب کے احکام ہر وقت ایک سے نہیں رہتے، بلکہ کبھی کچھ ثابت ہوتے ہیں اور کچھ نہیں، مثلاً لعان کی اولاد سے متعلق اکثر اختلاف کرنے والے اس پر اتفاق کرتے ہیں کہ وہ لعان کرنے والے پر حرام ہے، لیکن اس کی وارث نہیں بنتی۔ ولد الزنا کے نسب کو ملانے میں بھی اختلاف ہے، اگر وہ فراش، یعنی شادی شدہ کے بستر پر نہ ہوا ہو، ایک قول کے مطابق اس کا نسب اس کے ساتھ ملایا جائے گا جس طرح رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے، آپ نے زمعہ بن اسود کی ام الولد کے بیٹے کا نسب زمعہ بن اسود کے ساتھ ملایا، جس کو عتبہ بن ابی وقاص نے حاملہ کیا تھا۔ اس سے متعلق سعد اور عبد بن زمعہ نے اختلاف کیا۔ سعد نے کہا: وہ میرے بھائی کا بیٹا ہے، اس نے مجھے بتایا تھا کہ زمعہ کی ولیدہ، یعنی ام الولد لونڈی کا یہ بیٹا میرا بیٹا ہے۔ عبد نے کہا: یہ میرا بھائی اور میرے باپ کی ولیدہ کا بیٹا ہے۔ میرے باپ کے بستر پر پیدا ہوا ہے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اے عبد بن زمعہ! وہ تیرا

ہے، لڑکا اس کا ہے جس کے بستر پر پیدا ہو اور زانی کے حصے میں سنگساری ہے۔ اے سودہ! اس سے پردہ کر، یہ بات آپ ﷺ نے اس لیے کہی تھی کہ اس میں عتبہ کی واضح مشابہت دیکھی تھی۔[1] آپ ﷺ نے اس کو وراثت میں اس کا بھائی بنایا، مگر حرمت میں نہیں بنایا۔ اسی طرح ولد الزنا سے متعلق یہ بھی اختلاف ہے کہ کیا وہ مملوک اور غلام بننے کی صورت میں از خود آزاد ہو جائے گا یا نہیں؟ اس میں بھی ابو حنیفہ اور احمد کے مذہب میں دو اقوال ہیں۔

یہاں اس مسئلے کی تفصیل کا موقع نہیں، تاہم اس جیسے کمزور مسائل ائمۂ اسلام سے نہ تنقید کرنے کے لیے اور نہ تقلید کرنے کے لیے بیان کرنے چاہئیں، کیوں کہ اس جیسے اقوال ائمہ پر طعن اور ضعیف اقوال کی پیروی کا دروازہ کھولتے ہیں، ایسے ہی مسائل لے کر تا تاری وزیر اہلِ سنت کے مذاہب پر اعتراض کیا کرتا تھا، لوگوں کو اہلِ سنت والجماعت سے برگشتہ کرتا تھا اور رفض والحاد کی دعوت دے کر فتنے کی آگ بھڑکاتا تھا۔ واللہ أعلم[2]

دخترِ زنا سے شادی کا حکم

سوال ایک شخص نے کسی عورت سے زنا کیا، جس کے نتیجے میں لڑکی پیدا ہوگئی، کیا وہ شخص اس لڑکی سے شادی کر سکتا ہے؟

جواب الحمد للہ. یہ جمہور علما کے نزدیک ناجائز ہے، کسی صحابی اور تابعی نے اس کو حلال اور جائز نہیں کہا، یہی وجہ ہے کہ امام احمد بن حنبل جیسے جلیل القدر اور وسیع المطالعہ عالم نے اس میں سلف کے کسی اختلاف سے واقفیت کا ذکر نہیں کیا، اس لیے انھوں نے ایسے شخص کو قتل کرنے کا فتویٰ دیا تھا۔ کسی نے ان سے کہا کہ اس مسئلے میں امام مالک سے اختلاف منقول ہے تو انھوں نے کہا: یہ کہنے والا جھوٹ کہتا ہے، ان سے ایسی کوئی بات منقول نہیں۔ انھوں نے یہ بھی ذکر کیا کہ زانی کے لڑکے کو اس کے ساتھ ملحق کیا جائے گا جب وہ الحاقِ نسب کا تقاضا کرے، حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے جاہلیت کی اولادوں کو ان کے باپوں کے ساتھ ہی ملحق کیا تھا اور نبی اکرم ﷺ کا ارشاد بھی ہے:

«اَلْوَلَدُ لِلْفِرَاشِ وَلِلْعَاهِرِ الْحَجَرُ»[3]

''بچہ اسی کا ہے جس کے بستر پر پیدا ہوا اور زانی کے لیے سنگساری کی سزا (ذلت) ہے۔''

یہ اس صورت میں ہے جب عورت کا خاوند ہو، لیکن وہ زانیہ اور بدکار جس کا خاوند نہ ہو، وہاں بچے کو زانی کے ساتھ ملحق کرنے میں اختلاف ہے۔

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۱۹۴۸)، صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۴۵۷)

[2] مجموع الفتاویٰ (۳۲/۱۳۴_۱۳۷)

[3] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۱۹۴۸)، صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۴۵۷)

وہ عورت جس سے لعان کے ذریعے جدائی ہو جاتی ہے، اس کی بیٹی بھی عام علما کے نزدیک لعان کرنے والے مرد کے لیے جائز نہیں ہوتی، حالانکہ اس کا نسب اس کے باپ سے منقطع ہو جاتا ہے، لیکن اگر وہ اس کے ساتھ اپنے نسب کو ملحق کرنے کا تقاضا کرے تو اس کو اس کے ساتھ ملحق کر دیا جائے گا، لیکن یہ دونوں باتفاقِ علما ایک دوسرے کے وارث نہیں بنتے۔ دراصل نسب کے احکام متفرق ہیں، کبھی بعض احکام میں آدمی بیٹا ہوتا ہے، بعض میں نہیں۔

وہ عورت جس سے لعان کے ذریعے جدائی ہو جائے اس کا بیٹا اس شخص کا بیٹا نہیں ہوتا، اس لیے وہ ایک دوسرے کے وارث بھی نہیں بنتے، لیکن نکاح کے باب میں وہ بیٹا ہے اور لعان شدہ عورت کی بیٹی باپ پر حرام ہوتی ہے۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے جو نسبی رشتے حرام کیے ہیں رضاعت کی وجہ سے بھی حرام کیے ہیں، لہٰذا آدمی اپنی رضاعی بہن سے شادی کر سکتا ہے نہ رضاعی بیٹی ہی سے، حالانکہ اس کے حق میں وراثت، دیت، ولایت اور نفقہ جیسے نسب کے احکام ثابت نہیں ہوتے، صرف اس کے حق میں حرمتِ نکاح اور محرم ہونا ثابت ہوتا ہے اور امہات المومنین (ازواجِ رسول ﷺ) صرف حرمت میں مائیں ہیں، محرم ہونے میں نہیں۔ اگر وہ لڑکی جس کو اس کی بیوی نے وہ دودھ پلایا جو اس کی مجامعت کی وجہ سے اس کی بیوی کو اترا، حالانکہ وہ وراثت وغیرہ میں اس کی طرف منسوب نہیں اور اس کے ساتھ اس کی شادی حرام ہو جاتی ہے تو اس کے ساتھ کیوں نہیں جو اس کے نطفے سے پیدا ہوئی؟ اس کے ساتھ اس کا تعلق اس سے کہیں گہرا ہے۔

قرآن کریم کی یہ آیت: ﴿ حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهَاتُكُمْ وَبَنَاتُكُمْ ﴾ [النساء: ٢٣] ہر اس کو شامل ہے جس کو بیٹی کہا جاتا ہے، حتی کہ اس پر اس کی بیٹی کی بیٹی (نواسی) اور بیٹے کی بیٹی (پوتی) بھی حرام ہے، لیکن فرائض اور وراثت کی اس آیت: ﴿ يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ ﴾ [النساء: ١١] میں لفظ ﴿ أَوْلَادِ ﴾ آدمی کی اولاد اور اس کے بیٹے کی اولاد کو شامل ہے، بیٹی کی اولاد کو شامل نہیں، تو چونکہ لفظ ابن (بیٹا) اور بنت (بیٹی) ان کے مسمیٰ کو مطلقاً شامل ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَحَلَائِلُ أَبْنَائِكُمُ الَّذِينَ مِنْ أَصْلَابِكُمْ ﴾ [النساء: ٢٣]

''اور تمھارے ان بیٹوں کی بیویاں جو تمھاری پشتوں سے ہیں۔''

تاکہ متبنی (منہ بولے) بیٹے سے احتراز کیا جائے، جیسے حضرت زید کو زید بن محمد کہا جاتا تھا، اس کو بھی بیٹا ہی کہتے تھے، اگر یہاں لفظ مطلق ہوتا تو اس کے اس میں داخل ہونے کا گمان ہو سکتا تھا، اس لیے اللہ نے فرمایا: ﴿ مِنْ أَصْلَابِكُمْ ﴾ تاکہ منہ بولا بیٹا اس سے خارج ہو جائے اور مسلمانوں کے لیے اپنے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں سے شادی کرنا جائز کر دیا، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَلَمَّا قَضَىٰ زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنَاكَهَا لِكَيْ لَا يَكُونَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ حَرَجٌ فِي أَزْوَاجِ أَدْعِيَائِهِمْ إِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا ﴾ [الأحزاب: ۳۷]

''پھر جب زید نے اس سے اپنی حاجت پوری کر لی تو ہم نے تجھ سے اس کا نکاح کر دیا، تاکہ مومنوں پر اپنے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں کے بارے میں کوئی تنگی نہ ہو، جب وہ ان سے حاجت پوری کر چکیں۔''

بنا بریں اگر لفظ ابن اور بنت ہر اس پر بولا جاتا ہے جو آدمی کی طرف منسوب ہو، حتی کہ اس نسبت کی وجہ سے اللہ نے رضاعی بیٹی کو بھی آدمی پر حرام کر دیا ہے تو اس کی وہ بیٹی جو زنا کا نتیجہ ہو اس کو بھی اس کی بیٹی ہی کہا جائے گا، لہٰذا وہ شرعی لحاظ حرمت کے زیادہ مناسب اور آیتِ تحریم میں داخل ہونے کی زیادہ حق دار ہے، یہ امام ابو حنیفہ، احمد، مالک اور جمہور فقہا کا مذہب ہے، البتہ صحابہ، تابعین اور بعد کے لوگوں میں اس بات میں اختلاف ہے کہ کیا زنا میں مصاہرت کی حرمت پھیل جاتی ہے، مثلاً: اگر کوئی شخص اس عورت کی ماں سے جس سے اس نے زنا کیا تھا یا اس کی اس بیٹی سے جو کسی دوسرے سے پیدا ہوئی، نکاح کرنا چاہے تو کر سکتا ہے یا نہیں؟ اس میں قدیم اختلاف ہے۔ امام شافعی اور ایک روایت میں امام مالک اس کو جائز کہتے ہیں۔ ابو حنیفہ، احمد اور دوسری روایت میں امام مالک اس کو حرام کہتے ہیں۔ یہ اس صورت میں ہے جب آدمی مقلد ہو تو جس کی تقلید چاہے کرے۔ واللہ أعلم[1]

زانی کے بیٹے کا زانیہ سے نکاح کا حکم

سوال ایک شخص نے ایک عورت سے زنا کیا اور زانی مر گیا، کیا اس کا بیٹا اس عورت سے شادی کر سکتا ہے یا نہیں؟

جواب ابو حنیفہ، احمد اور ایک قول میں مالک کے مذہب میں حرام ہے اور دوسرے قول میں جائز ہے، شافعی کا مذہب بھی یہی ہے۔[2]

حدیث: ''میری بیوی کسی چھونے والے کے ہاتھ کو جھٹکاتی نہیں'' کی وضاحت

سوال حدیث میں آیا ہے کہ ایک شخص نے کہا: ''اے اللہ کے رسول! میری بیوی کسی چھونے والے کے ہاتھ کو جھٹکاتی نہیں۔''[3] کیا اس سے یہ مراد ہے کہ وہ اپنے آپ سے کسی کو روکتی نہیں یا یہ مراد ہے کہ وہ مانگنے والے کا ہاتھ خالی نہیں لوٹاتی؟ اس کا صحیح مفہوم کیا ہے؟

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۱۳۸۔۱۴۰)

[2] مجموع الفتاویٰ (۱۴۲/۳۲)

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (۲۰۴۹) امام البانی رحمہ اللہ نے اسے صحیح کہا ہے۔

جواب الحمد لله رب العالمین. اس حدیث کو امام احمد وغیرہ نے ضعیف کہا ہے۔ کچھ نے اس کی یہ تاویل و تشریح کی ہے کہ وہ مال مانگنے والے کو لوٹاتی نہیں، لیکن حدیث کا ظاہری مفہوم اور سیاق اس سے میل نہیں کھاتا۔ کچھ علما کے نزدیک یہ حدیث ثابت ہے۔ ان کے نزدیک رسول اللہ ﷺ نے اس شخص کو، باوجود یکہ وہ مردوں کو منع نہیں کرتی، اس کو اپنے پاس رکھنے اور نہ چھوڑنے کا حکم دیا، لیکن دیگر کئی ائمہ نے اس مفہوم کی تردید کی ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ اَلزَّانِیْ لَا یَنْكِحُ اِلَّا زَانِیَةً اَوْ مُشْرِكَةً ؗ وَّالزَّانِیَةُ لَا یَنْكِحُهَاۤ اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِكٌ ۚ وَحُرِّمَ ذٰلِكَ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ ﴾ [النور: ٣]

''زانی نکاح نہیں کرتا مگر کسی زانی عورت سے، یا کسی مشرک عورت سے، اور زانی عورت، اس سے نکاح نہیں کرتا مگر کوئی زانی یا مشرک۔ اور یہ کام ایمان والوں پر حرام کر دیا گیا ہے۔''

سنن ابوداود وغیرہ میں ہے: زمانۂ جاہلیت میں ایک شخص کی عناق نامی طوائف داشتہ تھی، اس نے اس سے شادی کرنے سے متعلق سوال کیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرما دی۔[1] اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے یہ بھی فرمایا ہے:

﴿ وَمَنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ یَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَیْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَیٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِیْمَانِكُمْ ؕ بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ ۚ فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ وَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ مُحْصَنٰتٍ غَیْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ ۚ ﴾ [النساء: ٢٥]

''اور تم میں سے جو مالی لحاظ سے طاقت نہ رکھے کہ آزاد مومن عورتوں سے نکاح کرے تو ان میں سے جن کے مالک تمھارے دائیں ہاتھ ہوں، تمھاری مومن لونڈیوں سے (نکاح کر لے) اور اللہ تمھارے ایمان کو زیادہ جاننے والا ہے، تمھارا بعض بعض سے ہے۔ تو ان سے ان کے مالکوں کی اجازت سے نکاح کر لو اور انھیں ان کے مہر اچھے طریقے سے دو، جب کہ وہ نکاح میں لائی گئی ہوں، بدکاری کرنے والی نہ ہوں اور نہ چھپے یار بنانے والی۔''

اللہ تعالیٰ نے لونڈیوں سے نکاح کرنے کے لیے بھی یہ شرط عائد کی ہے کہ وہ زنا کار اور خفیہ دوست رکھنے والیاں نہ ہوں۔ مسافحہ اس کو کہا جاتا ہے جو ہر کسی کے ساتھ بدکاری کرے اور ''متخذات اخدان'' وہ ہوتی ہیں جن کا ایک ہی یار ہو، اگر کوئی اس طرح کی عورت ہو تو اس کے ساتھ نکاح کرنے کی اجازت نہیں تو اس کو روکے رکھنے کا کیا جواز ہے، جو کسی بھی چھونے والے کو لوٹاتی نہیں، بلکہ جس کے ساتھ متفق ہو جائے اس کے ساتھ زنا کر لیتی ہے؟ اگر

[1] سنن أبي داود، رقم الحدیث (٢٠٥١) امام البانی رحمہ اللہ نے اسے صحیح کہا ہے۔

لونڈیوں سے متعلق یہ کڑی شرط ہے تو آزاد میں کہاں اجازت ہوگی، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ اِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ وَلَا مُتَّخِذِيْٓ اَخْدَانٍ ﴾ [المائدة: ٥]

''اور مومن عورتوں میں سے پاک دامن عورتیں اور ان لوگوں کی پاک دامن عورتیں جنھیں تم سے پہلے کتاب دی گئی، جب تم انھیں ان کے مہر دے دو، اس حال میں کہ تم قیدِ نکاح میں لانے والے ہو، بدکاری کرنے والے نہیں اور نہ چھپی آشنائیں بنانے والے۔''

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مردوں کے لیے بھی یہی شرطیں لگائی ہیں جو پہلی آیت میں عورتوں کے لیے لگائی ہیں اور یہ سورت نور کے اس حکم کے مطابق ہے:

﴿ اَلزَّانِيْ لَا يَنْكِحُ اِلَّا زَانِيَةً اَوْ مُشْرِكَةً وَّالزَّانِيَةُ لَا يَنْكِحُهَآ اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِكٌ وَحُرِّمَ ذٰلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ [النور: ٣]

''زانی نکاح نہیں کرتا مگر کسی زانی عورت سے، یا کسی مشرک عورت سے، اور زانی عورت، اس سے نکاح نہیں کرتا مگر کوئی زانی یا مشرک۔ اور یہ کام ایمان والوں پر حرام کر دیا گیا ہے۔''

کیوں کہ جو شخص زانیہ سے شادی کرتا ہے جو دوسرے لوگوں کے ساتھ بھی زنا کرتی رہتی ہے، اس شخص کا نطفہ محفوظ و مامون نہیں رہتا، بلکہ دوسروں کے نطفے کے ساتھ مخلوط ہو جاتا ہے اور جس شرم گاہ میں جماع کرتا ہے وہ مشترک چیز بن جاتی ہے، یہی زنا ہے۔ اگر اس عورت کا خاوند کسی دوسری عورت کے ساتھ بھی زنا کرتا ہے اور حلال و حرام کے درمیان تمیز نہیں کرتا تو اس کا اس عورت سے مجامعت کرنا زانی کے زانیہ سے مباشرت کی طرح ہے، خواہ اس کے علاوہ کوئی دوسرا اس سے مباشرت نہ بھی کرتا ہو۔ زنا کی ایک صورت داشتائیں رکھنا اور خفیہ یار رکھنا ہے۔

کیا زانیہ سے توبہ سے پہلے نکاح کرنا جائز ہے؟ اس مسئلے میں دو مشہور اقوال ہیں، لیکن کتاب و سنت اور اعتبار، یعنی صحیح قیاس کے مطابق ناجائز ہے۔ کسی عالم نے آیتِ نور کی عقدِ نکاح کے ساتھ تاویل کر کے اس کو منسوخ کہا ہے، اس کی یہ رائے کئی وجوہ سے باطل ہے۔ مزید یہ کہ دیوثیت، یعنی دیوث اور بھڑوا ہونا بالاتفاق مذموم ہے، جو کسی بھی بدکار عورت سے شادی کرتا ہے وہ دیوث اور بھڑوا ہی تو ہے۔ حدیث میں آیا ہے:

«لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ بَخِيْلٌ، وَلَا كَذَّابٌ وَلَا دَيُّوْثٌ» [1]

---

[1] ''دیوث'' کے الفاظ مسند أحمد (١٣٤/٢) المستدرك للحاكم (٧٢/١) مصنف عبدالرزاق (٢٤٣/١١) مسند الطيالسي (٨٩/١) صحيح الجامع، رقم الحديث (٣٠٥٨) "بخيل" کے الفاظ مسند أحمد (٤/١) وغیرہ میں ہے: السلسلة الضعيفة (١٢٨٤) البتہ کذاب کے لفظ نہیں مل سکے۔

''بخیل، کذاب اور دیوث جنت میں داخل نہیں ہوں گے۔''

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ وَالْخَبِيْثُوْنَ لِلْخَبِيْثٰتِ ۚ وَالطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيْنَ وَالطَّيِّبُوْنَ لِلطَّيِّبٰتِ ۚ ﴾ [النور: ٢٦]

''گندی عورتیں گندے مردوں کے لیے ہیں اور گندے مرد گندی عورتوں کے لیے ہیں اور پاک عورتیں پاک مردوں کے لیے ہیں اور پاک مرد پاک عورتوں کے لیے ہیں۔''

یعنی پاکیزہ مرد پاکیزہ عورتوں کے لیے اور خبیث مرد خبیث عورتوں کے لیے، اسی طرح عورتوں سے متعلق ہے کہ اگر عورت خبیث ہے تو اس کا قرین و ساتھی بھی خبیث ہی ہے۔ اگر اس کا قرین خبیث ہے تو وہ بھی خبیثہ ہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جن لوگوں نے ام المومنین سیدہ عائشہ صدیقہ طاہرہ مطہرہ رضی اللہ عنہا پر الزام لگایا تھا، اللہ نے ان کی شدید مذمت کی ہے۔ اگر اس میں خاوند کے لیے کوئی عیب نہ ہوتا تو اتنی شدت کے ساتھ مذمت نہ کی جاتی۔ چنانچہ سلف کا کہنا ہے: کسی نبی کی بیوی نے کبھی زنا نہیں کیا، اگر زانیہ سے نکاح جائز بھی ہوتا تب بھی انبیا کو اس مباح سے منزا رکھنا ضروری تھا، حالانکہ کچھ نبیوں کی بیویاں کافر بھی تھیں، جس طرح بعض مومن عورتوں کے خاوند کافر تھے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوا امْرَاَتَ نُوْحٍ وَّامْرَاَتَ لُوْطٍ ۭ كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَيْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَيْنِ فَخَانَتٰهُمَا فَلَمْ يُغْنِيَا عَنْهُمَا مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا وَّقِيْلَ ادْخُلَا النَّارَ مَعَ الدّٰخِلِيْنَ ۝ وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا امْرَاَتَ فِرْعَوْنَ ۘ اِذْ قَالَتْ رَبِّ ابْنِ لِيْ عِنْدَكَ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ وَنَجِّنِيْ مِنْ فِرْعَوْنَ وَعَمَلِهٖ وَنَجِّنِيْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴾ [التحریم: ١٠، ١١]

''اللہ نے ان لوگوں کے لیے جنھوں نے کفر کیا نوح کی بیوی اور لوط کی بیوی کی مثال بیان کی، وہ ہمارے بندوں میں سے دو نیک بندوں کے نکاح میں تھیں، پھر انھوں نے ان دونوں کی خیانت کی تو وہ اللہ سے (بچانے میں) ان کے کچھ کام نہ آئے اور کہہ دیا گیا کہ داخل ہونے والوں کے ساتھ تم دونوں آگ میں داخل ہو جاؤ۔ اور اللہ نے ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے فرعون کی بیوی کی مثال بیان کی، جب اس نے کہا اے میرے رب! میرے لیے اپنے پاس جنت میں ایک گھر بنا اور مجھے فرعون اور اس کے عمل سے بچا لے اور مجھے ظالم لوگوں سے نجات دے دے۔''

---

(1) مجموع الفتاویٰ (٣٢/١٤٣۔١٥١)

نکاحِ حلالہ کی شرعی حیثیت

سوال نکاحِ حلالہ کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

جواب وہ نکاحِ حلالہ جس میں لوگ زبان سے بول کر یا عرف میں خاوند کے ساتھ اس بات پر اتفاق کر لیں کہ وہ عورت کو طلاق دے دے گا یا طلاق دینے کی نیت رکھے، شرعاً حرام ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے متعدد احادیث میں یہ کام کرنے والے پر لعنت بھیجی ہے اور اس کو ''کرائے کا سانڈ'' کہا ہے، فرمانِ رسول ﷺ ہے:

«لَعَنَ اللّٰهُ الْمُحَلِّلَ وَالْمُحَلَّلَ لَهُ»[1]

''اللہ نے حلالہ کرنے والے اور کروانے والے پر لعنت کی ہے۔''

حضرت عمر، عثمان، علی، عبداللہ بن عمر اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ایسے صریح آثار مروی ہیں جن میں یہ ذکر ہے کہ اگر عقد میں اس کی شرط نہ بھی ہو، محض دل میں ارادہ اور نیت ہو تو بھی یہ حلالہ ہی ہے، انھوں نے اس کو ''سفاح'' (زنا) کہا ہے۔

اس لیے اس جیسے عقد کی بنا پر عورت پہلے طلاق دینے والے شوہر کے لیے حلال نہیں ہوتی اور حلالہ کروانے والے خاوند کے لیے بھی اس حلالے کے ذریعے اس کو روکے رکھنا جائز نہیں۔ لیکن جب کسی شخص نے اجتہاد یا تقلید کی وجہ سے اس کو جائز سمجھا تو وہ عورت حلال ہو جاتی ہے اور وہ بعد میں اس سے شادی کر سکتا ہے، پھر بعد میں اس کو اس کی حرمت کا علم ہوا تو ایسی صورت میں قوی رائے یہی ہے، اس کو چھوڑنا واجب نہیں، لیکن مستقبل میں اس سے بچ کر رہے، ماضی کی غلطیاں اللہ معاف کر دیتا ہے۔[2]

نابالغ سے حلالہ کروانے کا حکم

سوال اگر کسی نابالغ لڑکے سے حلالہ کروا لیا جائے جو مجامعت سے ناواقف ہو تو کیا عورت حلال ہو جائے گی اور وہ اس کا خاوند ہو گا؟

جواب حدیث سے ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ''سود کھانے والے، کھلانے والے، اس کی گواہی دینے والے، اسے لکھنے والے اور حلالہ کرنے والے اور کروانے والے پر لعنت کی ہے۔''[3] ترمذی کہتے ہیں: یہ حدیث صحیح

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٠٧٦) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٩٣٦) صحيح الجامع، رقم الحديث (٥١٠١)

[2] مجموع الفتاویٰ (٣٢/١٥١_١٥٢)

[3] یہ دو حدیثیں ہیں، پہلی سود کی حرمت والی جسے امام مسلم رحمہ اللہ نے اپنی صحیح (١٥٩٧) میں نقل کیا ہے اور دوسری روایت حلالے کی حرمت والی حدیث کی تخریج یہ ہے: سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٠٧٦) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٩٣٦) صحيح الجامع، رقم الحديث (٥١٠١)

ہے، اس مسئلے پر حضرت عمر، عثمان، علی، عبداللہ بن مسعود وغیرہم رحمہ اللہ جیسے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اجماع ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہے: ''میرے پاس اگر حلالہ کرنے اور کروانے والے کو لایا گیا تو میں ان دونوں کو رجم کر دوں گا۔''

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا قول ہے: ''نکاح رغبت کا ہے، دھوکے کا نہیں۔''

کسی نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے پوچھا: ایک شخص نے اپنی بیوی کو سو طلاقیں دی ہیں تو انھوں نے کہا: ''تین کے ساتھ وہ اس سے جدا ہو گئی ہے، باقی اللہ کی آیات کے ساتھ مذاق کیا گیا ہے۔'' سائل نے کہا: اگر میں اس کے علم میں لائے بغیر اس سے نکاح کر لوں، پھر اس کے لیے حلالہ کرتے ہوئے اس کو طلاق دے دوں؟ تو عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ''جو اللہ کو دھوکا دیتا ہے، بدلے میں دھوکا کھاتا ہے۔'' انھوں نے کہا: ''حلالے سے حلال ہونے والی عورت اور وہ مرد دونوں مسلسل زنا کرتے ہیں، خواہ بیس سال بھی ساتھ رہیں، کیوں کہ اللہ کو حلالہ کرنے والے کے دل کا حال معلوم ہوتا ہے کہ وہ صرف حلالہ کرنا چاہتا ہے۔''

ہم نے اس مسئلے کی تفصیل اپنی کتاب ''بیان الدلیل علی بطلان التحلیل'' میں ذکر کی ہے۔ یہ ساری مذمت اور شناعت اس صورت میں ہے جب حلالہ کرنے والا بڑا ہو، عورت سے مجامعت کرے اور اس سے لذت افروز ہو۔ مگر وہ جو مجامعت کا اہل ہی نہ ہو، اس کے حلال نہ کرنے میں علما کا کوئی اختلاف نہیں، نکاحِ حلالہ ایسا خبیث کام ہے جو مسلمانوں کے لیے عار بنا ہوا ہے، عیسائی بھی طعنے دیتے ہیں اور کہتے ہیں: مسلمانوں کے نبی نے ان سے کہا ہے: جب کوئی اپنی بیوی کو طلاق دے لے تو وہ اس وقت تک حلال نہیں ہوتی، جب تک زنا نہ کرے! حالانکہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، تابعین عظام اور جمہور ائمہ اسلام رحمہ اللہ اس سے بَری ہیں۔ واللہ أعلم [1]

نکاح کے وقت عورت کی طرف سے عائد کردہ شرطوں کی پاسداری

سوال ایک شخص نے ایک عورت سے شادی کی تو نکاح کے وقت اس نے شرط رکھی کہ وہ اس کے ہوتے ہوئے دوسری شادی نہیں کرے گا، اس کو اس کے گھر سے بھی منتقل نہیں کرے گا، اس عورت کی پہلے سے ایک بیٹی بھی ہے اور اس نے اس کو بھی اپنے پاس رکھنے کی شرط لگائی ہے، اس نے یہ ساری شرطیں مان لیں، اب کیا ان شرطوں کو پورا کرنا بھی ضروری ہے؟ اگر وہ کوئی شرط توڑتا ہے تو کیا بیوی نکاح فسخ کرنے کا حق رکھتی ہے؟

جواب الحمد لله. ہاں یہ اور اس مفہوم کی شرطیں امام احمد کے مذہب میں اور صحابہ و تابعین میں سے حضرت عمر بن خطاب

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۳۲/۱۵۵۔۱۵۶)

اور عمرو بن عاص رضی اللہ عنہم، قاضی شریح، اوزاعی اور اسحاق کے نزدیک صحیح ہیں۔ اس لیے آج بھی اہلِ مغرب کے قدیم مہروں میں یہ شرطیں رکھی جاتی ہیں، کیوں کہ وہاں امام اوزاعی کا مذہب چلتا ہے۔ امام مالک کے مذہب میں ہے کہ اگر یہ شرط لگائی جائے کہ اگر اس نے اس کے ہوتے ہوئے کسی دوسری عورت سے شادی کی یا کوئی باندی رکھی تو وہ اپنے معاملے کی مختار ہوگی، یہ شرط صحیح ہے اور اس کے ساتھ وہ جدائی کا اختیار حاصل کر لیتی ہے۔ امام احمد کے مذہب کا مفہوم بھی کچھ اسی طرح کا ہے، کیوں کہ صحیحین میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«إِنَّ أَحَقَّ الشُّرُوطِ أَنْ تُوفُوا بِهِ مَا اسْتَحْلَلْتُمْ بِهِ الْفُرُوجَ »[1]

''جو شرطیں پوری کی جانے کا سب سے زیادہ حق رکھتی ہیں وہ یہی ہیں جن کے ذریعے شرم گاہیں حلال کی جاتی ہیں۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہے:

''مقاطع الحقوق عند الشروط'' ''حقوق ثابت کرنے کے لیے شرائط عائد کی جائیں۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان شرطوں کو سب سے اہم قرار دیا ہے جو شادی کے وقت لگائی جاتی ہیں اور یہ بات ان شرطوں سے متعلق نص کی حیثیت رکھتی ہے اور شادی کے وقت جو شرطیں لگائی جاتی ہیں وہ یا تو حق مہر سے متعلق ہوتی ہیں یا اس طرح کی بات سے متعلق۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ اس سے یہی شرطیں مراد ہیں۔ جہاں تک یہ شرط ہے کہ اس کی بیٹی بھی اس کے پاس ہی رہے گی اور اس کا خرچہ بھی وہی اٹھائے گا تو یہ حق مہر میں اضافے کی طرح ہے۔ حق مہر میں جہالت اور لاعلمی کا ایسا احتمال ہوتا ہے جو قیمت اور اجرت میں نہیں ہوتا اور ہر وہ جہالت (لاعلمی) جو مہرِ مثل کی جہالت سے کم ہو، جواز کی حق دار ہے۔ بالخصوص جب امام احمد کے مذہب میں اجارہ وغیرہ میں جائز ہے، مثلاً اگر کوئی کسی مزدور کو اس کے کھانے اور پہناوے سمیت اجرت پر رکھتا ہے تو اس میں عرف دیکھا جائے گا۔ اسی طرح اگر اس نے اپنی بیٹی کے لیے خرچے کی شرط لگائی ہے تو اس میں بھی عرف دیکھا جائے گا۔

اگر وہ مرد ان شرطوں کو پورا نہیں کرتا اور کسی عورت سے شادی کر لیتا ہے، یا باندی رکھ لیتا ہے تو اس عورت کو فسخ کا اختیار حاصل ہے، لیکن اس کو قاضی کے پاس لے جانے اور اس پر موقوف رکھنے میں اختلاف ہے، کیوں کہ یہ نامردی اور دیگر عیوب کے اختیار کی طرح کا مجتہدانہ اختیار ہے، جس میں اختلاف ہے۔ یا کہا جا سکتا ہے کہ اس کے ثبوت میں اجتہاد کی ضرورت نہیں۔ اگر فسخ میں اختلاف پیدا ہو جائے جس طرح معتقہ کے اختیار کا مسئلہ ہے تو قائلین کے نزدیک اختلافی مواقع پر یہ حاکم کے حکم کے بغیر ہی ثابت ہو جاتا ہے، مثلاً اس کو تراضی کی بنیاد پر فسخ کیا جائے۔

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٥٧٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤١٨)

اختلاف کی اصل وجہ یہ ہے کہ آیا فسخِ نکاح کو حاکم کے حکم پر موقوف کرنا کیا ثبوتِ حکم میں بھی اجتہاد ہے یا علاحدگی میں احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے؟ قوی تر رائے یہ ہے کہ نامردی کی طرح کے اختلافی فسخ کے لیے حاکم کے حکم کی ضرورت نہیں ہوتی، لیکن اگر مقدمہ قاضی کے پاس لے جایا جائے اور وہ اس کو جاری رکھنا بہتر سمجھے تو جاری رکھے گا، اگر ختم کرنا بہتر سمجھے تو ختم کر دے گا۔ واللہ أعلم [1]

نکاح کے وقت دوسری شادی کرنے کی شرط لگانا

سوال اگر نکاح کرتے وقت عورت شرط عائد کرے کہ وہ اس کے ہوتے ہوئے کسی دوسری عورت سے شادی نہیں کرے گا، لیکن وہ شادی کر لیتا ہے۔ یا کوئی مرد یہ کہتا ہے کہ اگر میں نے فلاں عورت سے شادی کی تو اس کو طلاق ہو، پھر وہ اس سے نکاح کر لیتا ہے تو کیا ایسا کرنا جائز ہے اور پہلی صورت میں عورت کو اختیار کا حق حاصل ہے یا نہیں؟

جواب الحمد للہ. مرد اس عورت سے شادی کر سکتا ہے اور جمہور سلف کے نزدیک طلاق واقع نہیں ہوگی، اگر وہ اس سے شادی کر لے، یہ شافعی اور احمد وغیرہما کا مذہب ہے۔

اسی طرح اگر عقد کرتے وقت یہ شرط رکھی جائے کہ مرد اس عورت کی زندگی میں کسی دوسری سے شادی نہیں کرے گا، اگر کرے گا تو اس کا معاملہ اس کے اپنے ہاتھ میں چلا جائے گا، تو یہ شرط صحیح ہے اور مالک اور احمد وغیرہ کے مذہب میں لازم ہے، لہٰذا جب وہ اس کی زندگی میں کسی دوسری عورت سے شادی کرے تو اس کا معاملہ اس کے ہاتھ میں چلا جائے گا، وہ چاہے تو اس کے ساتھ رہے، چاہے تو علاحدہ ہو جائے۔ واللہ أعلم [2]

کسی عیب کی وجہ سے فسخ کا اختیار

سوال ایک آدمی نے کنواری سے شادی کی، مگر وہ مستحاضہ نکلی، جس دن سے ماں کے گھر سے آئی اس کا خون بند ہی نہیں ہو رہا تھا، انھوں نے اس کو دھوکا دیا تو کیا وہ نکاح فسخ کر سکتا ہے، جس نے دھوکا دیا اس سے مہر واپس لے سکتا ہے؟ نیز کیا وہ اس سے مجامعت کر سکتا ہے یا نہیں؟

جواب یہ عیب ہے جس سے نکاح فسخ ہو سکتا ہے، اس کی دو وجوہ ہیں:

1. اس سے مجامعت کرنا ضرر اور اذیت سے خالی نہیں۔
2. مستحاضہ سے مجامعت امام احمد کے مذہب میں ضرورت کے بغیر جائز نہیں۔ وہ عیب جو محسوس انداز میں یا مزاجاً

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۳۲/۱۶۴۔۱۶۵)

[2] مجموع الفتاویٰ (۳۲/۱۷۰)

مجامعت میں رکاوٹ ہو، جیسے شرم گاہ کا بند ہونا یا پاگل پن اور کوڑھ کا مرض۔ اس سے مالک، شافعی اور احمد کے نزدیک فسخ ثابت ہو جاتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بھی یہی منقول ہے۔ وہ عیب جو کمال مجامعت میں رکاوٹ ہو، جیسے شرمگاہ میں گندگی، اس میں اختلاف ہے اور مستحاضہ میں یہ عیب شدت سے پایا جاتا ہے۔

اگر دخول سے پہلے فسخ کر دے تو اس پر مہر فرض نہیں ہوتا۔ اگر بعد میں فسخ کرے تو ایک قول کے مطابق اس جیسی خلوت کی وجہ سے مہر ثابت ہو جاتا ہے۔ اگر اس نے مجامعت کر لی ہو تو مہر کا تقاضا دھوکا دینے والے سے کرے گا۔ دوسرا قول ہے: اس جیسی خلوت سے مہر ثابت نہیں ہوتا، لہٰذا اس پر کچھ بھی لازم نہیں۔ مستحاضہ سے مجامعت میں اختلاف ہے؛ امام شافعی کے نزدیک جائز ہے اور امام احمد کے نزدیک ضرورت کے بغیر جائز نہیں۔ اگر آدمی نے قولاً یا فعلاً رضا مندی کا اظہار نہ کیا ہو تو اس کے پاس فسخ کرنے کا اختیار رہتا ہے۔ اگر اس کے بعد مجامعت کرے تو پھر اختیار نہیں رکھتا، سوائے اس کے کہ وہ لاعلمی کا دعویٰ کرے تو کیا اس صورت میں اختیار رکھتا ہے کہ نہیں۔ اس میں فقہا کا اختلاف ہے اور زیادہ ظاہر ثبوتِ فسخ ہی ہے۔ واللہ أعلم [1]

رافضیوں سے رشتۂ ازدواج کا حکم

سوال کیا رافضی سے بیٹی کی شادی کرنا جائز ہے؟

جواب خالص رافضی بدعتی، گمراہ اور نفس پرست ہوتے ہیں، کسی مسلمان کو اپنی بیٹی اور زیر سرپرستی عورت کی شادی رافضی سے کرنا زیب نہیں دیتا۔ اگر کوئی مسلمان کسی رافضیہ (عورت) سے نکاح کرے تو نکاح درست ہوگا، اگر وہ اس کی توبہ کی امید رکھے تو نکاح میں رکھے، ورنہ چھوڑ دے، کیوں کہ وہ اس کی اولاد کو خراب کر دے گی۔ [2]

کیا اہلِ کتاب مشرکوں میں داخل ہیں کہ جن سے نکاح جائز نہیں؟

سوال اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ ﴾ دوسری طرف علما نے یہودی یا عیسائی عورت سے شادی کرنا جائز کہا ہے، کیا یہ دونوں مشرک ہیں یا نہیں؟

جواب سورت مائدہ میں ہے:

﴿ وَطَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ ﴾ [المائدة: ٥]

---

1. مجموع الفتاویٰ (۳۲/۱۷۲)
2. مجموع الفتاویٰ (۳۲/۶۱)

''اور ان لوگوں کا کھانا تمھارے لیے حلال ہے، جنھیں کتاب دی گئی اور تمھارا کھانا ان کے لیے حلال ہے اور مومن عورتوں میں سے پاک دامن عورتیں اور ان لوگوں کی پاک دامن عورتیں جنھیں تم سے پہلے کتاب دی گئی۔''

اس آیتِ مبارکہ کی روشنی میں اہلِ کتاب کی عورتوں سے شادی کرنا جائز ہے۔ یہ جمہور سلف و خلف اور ائمہ اربعہ وغیرہ کا مذہب ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے عیسائی عورت سے شادی کی کراہت منقول ہے، ان کا کہنا ہے: ''ان کا رب عیسیٰ ہے، میں اس سے بڑا کوئی شرک نہیں مانتا۔'' آج ایک بدعت پسند گروہ کا مذہب بھی یہی ہے، ان کی دلیل سورت بقرہ کی ایک یہی آیت ہے جو سوال میں مذکور ہے اور دوسری سورت ممتحنہ کی یہ آیت ہے:

﴿ وَلَا تُمْسِكُوا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ ﴾ [الممتحنة: ١٠]

''اور کافر عورتوں کی عصمتیں روک کر نہ رکھو۔''

سورت بقرہ کی آیت کے جواب کی تین صورتیں ہیں:

1 اہلِ کتاب مشرکوں میں داخل نہیں، دلیل یہ آیت ہے:

﴿ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالصَّابِئِينَ وَالنَّصَارَىٰ وَالْمَجُوسَ وَالَّذِينَ أَشْرَكُوا ﴾ [الحج: ١٧]

''بے شک وہ لوگ جو ایمان لائے اور جو یہودی بنے اور صابی اور نصاریٰ اور مجوس اور وہ لوگ جنھوں نے شرک کیا۔''

اگر اعتراض کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ان کو شرک سے متصف کیا ہے:

﴿ اتَّخَذُوا أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَابًا مِّن دُونِ اللَّهِ وَالْمَسِيحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا إِلَٰهًا وَاحِدًا ۖ لَّا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ۚ سُبْحَانَهُ عَمَّا يُشْرِكُونَ ﴾ [التوبة: ٣١]

''انھوں نے اپنے عالموں اور اپنے درویشوں کو اللہ کے سوا رب بنا لیا اور مسیح ابن مریم کو بھی، حالانکہ انھیں اس کے سوا حکم نہیں دیا گیا تھا کہ ایک معبود کی عبادت کریں، کوئی معبود نہیں مگر وہی، وہ اس سے پاک ہے جو وہ شریک بناتے ہیں۔''

اس کا جواب یہ ہے کہ اہلِ کتاب کے اصل دین میں شرک نہیں، اللہ نے رسولوں کو توحید کا پیغام دے کر ہی مبعوث کیا ہے، لہٰذا جو رسولوں اور کتابوں پر ایمان رکھتا ہو، اس کے اصل دین میں شرک نہیں ہوتا، عیسائیوں نے اپنے دین میں شرک کو خود پیدا کیا، جیسے اللہ نے کہا: ﴿ سُبْحَانَهُ وَتَعَالَىٰ عَمَّا يُشْرِكُونَ ﴾ یہاں انھیں شرک سے متصف کیا تو

اس شرک کی وجہ سے جو انھوں نے خود ایجاد کیا، اللہ نے اس کا حکم نہیں دیا، اس لیے مشرکوں سے ان کی تمیز کرنا ضروری ہے، کیوں کہ ان کا اصل دین آسمانی کتابوں کی پیروی پر مبنی ہے، جو توحید کا پیغام لے کر آئیں، شرک کا نہیں، لہٰذا اہلِ کتاب اس جہت سے مشرک نہیں، کیوں کہ وہ کتاب جس کی طرف وہ نسبت رکھتے ہیں اس میں شرک کا حکم نہیں، جس طرح امتِ محمد ﷺ اور مسلمانوں میں اس جہت سے وحدت الوجود، رافضیت، تقدیر کی نفی اور اس طرح کی دیگر بدعتیں داخل نہیں، گو مسلمانوں میں ایسے لوگ ضرور داخل ہیں جنھوں نے یہ بدعات دین میں داخل کیں، لیکن امتِ محمد ﷺ گمراہی پر اکٹھی نہیں ہو سکتی، اس میں آج بھی بڑی کثرت سے شریعتِ توحید کی پیروی کرنے والے موجود ہیں، لیکن اہلِ کتاب کے عکس۔ مزید برآں اللہ تعالیٰ نے اہلِ کتاب کے بارے میں بتاتے ہوئے ان کے لیے لفظ ''مشرک'' استعمال نہیں کیا جو ''اسم'' ہے، بلکہ ﴿عَمَّا يُشْرِكُوْنَ﴾ کہہ کر بتایا جو ''فعل'' ہے، جب کہ سورت بقرہ کی آیت میں ﴿الْمُشْرِكِيْنَ﴾ اور ﴿الْمُشْرِكٰتِ﴾ کا لفظ بولا ہے، جو اسم ہے اور اسم میں فعل سے زیادہ تاکید ہوتی ہے۔

2 گو ان کو شرک کے ساتھ متصف کرنے کی وجہ سے سورت بقرہ کا لفظ ﴿الْمُشْرِكِيْنَ﴾ شامل ہے، مگر مفرد اور مقرون ہونے کی صورت میں لفظ کی دلالت میں فرق کیا جائے گا، یعنی جب اکیلے مشرکوں کا ذکر کیا جائے تو اس وقت اہلِ کتاب ان میں داخل ہوں گے اور جب اہلِ کتاب کے ساتھ ان کا ذکر ہو تو اس وقت ان میں داخل نہیں ہوں گے، جس طرح لفظ فقیر اور ''مسکین'' کے متعلق کہا جاتا ہے، اس بنا پر کہا جائے گا: سورت بقرہ کی آیت عام ہے اور سورت مائدہ کی آیت خاص اور خاص عام پر مقدم ہوتا ہے۔

3 ایک قول ہے کہ سورت مائدہ کی آیت نے سورت بقرہ کی آیت کو منسوخ کر دیا ہے، کیوں کہ اس پر سب کا اتفاق ہے کہ مائدہ، بقرہ کے بعد نازل ہوئی۔ حدیث میں آیا ہے: ''سورت مائدہ قرآن کی آخر میں نازل ہونے والی سورتوں میں سے ہے، لہٰذا اس کے حلال کو حلال اور حرام کو حرام جانو۔'' جب دو آیات میں تعارض ہو تو دوسری پہلی کو منسوخ کر دیتی ہے۔

جہاں تک یہ آیت ہے: ﴿وَلَا تُمْسِكُوْا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ﴾ [الممتحنۃ: ۱۰] یہ صلح حدیبیہ کے بعد نازل ہوئی، جب آپ مکہ سے مدینہ ہجرت کر چکے تھے، اللہ نے سورت ممتحنہ نازل کی اور مہاجروں کو پرکھنے کا حکم دیا، یہ اس کو خطاب ہے جس کے عقد میں کافر عورت تھی، ﴿الْكَوَافِرِ﴾ میں الف لام عہد کا ہے اور یہ کافر عورتیں جن کی طرف اشارہ ہے، مشرک تھیں، حالانکہ بعض جگہوں پر کفار کو بھی اہلِ کتاب سے ممتاز کیا گیا ہے، مثلاً:

﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ وَيَقُوْلُوْنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا هٰۤؤُلَآءِ اَهْدٰى مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَبِيْلًا﴾ [النساء: ۵۱]

''کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنھیں کتاب کا ایک حصہ دیا گیا، وہ بتوں اور باطل معبود پر ایمان لاتے ہیں اور جن لوگوں نے کفر کیا ان کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ ان سے زیادہ سیدھے راستے پر ہیں جو ایمان لائے ہیں۔''

کیوں کہ ان کا اصل دین ایمان ہے، لیکن وہ بدعتی کافر ہیں، یعنی انھوں نے اپنے دین میں کفر کو خود داخل کیا ہے، جیسے اللہ نے فرمایا:

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ وَ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّفَرِّقُوْا بَیْنَ اللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ وَ یَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّ نَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَّ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَّخِذُوْا بَیْنَ ذٰلِكَ سَبِیْلًا ۝ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا ۚ وَ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِیْنَ عَذَابًا مُّهِیْنًا﴾ [النساء: ١٥٠، ١٥١]

''بے شک وہ لوگ جو اللہ اور اس کے رسولوں کے ساتھ کفر کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان تفریق کریں اور کہتے ہیں ہم بعض کو مانتے ہیں اور بعض کو نہیں مانتے اور چاہتے ہیں کہ اس کے درمیان کوئی راستہ اختیار کریں۔ یہی لوگ کافر ہیں اور ہم نے کافروں کے لیے رسوا کن عذاب تیار کر رکھا ہے۔''[1]

حق مہر کے متعلق شریعت کے احکام

سوال حق مہر کے متعلق شریعت کا کیا حکم ہے؟

جواب سنت یہی ہے کہ حق مہر میں تخفیف اور آسانی کو مدِ نظر رکھا جائے اور رسول اللہ ﷺ کی بیویوں اور بیٹیوں کے حق مہر سے زیادہ نہ ہو۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ ﷺ سے بیان کیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

« إِنَّ أَعْظَمَ النِّسَاءِ بَرَكَةً أَيْسَرُهُنَّ مَئُونَةً »[2]

''سب سے زیادہ بابرکت عورتیں وہ ہیں جن کا بوجھ اور خرچہ کم تر ہو۔''

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث میں ہے:

« خَيْرُهُنَّ أَيْسَرُهُنَّ صَدَاقًا »[3]

''بہترین عورت وہ ہے جس کا حق مہر آسان اور کم ہو۔''

---

[1] مجموع الفتاویٰ (٣٢/١٧٨۔١٨١)

[2] مسند أحمد (٦/٨٢، ١٤٥) سنن النسائي الکبریٰ (٥/٤٠٢) السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (١١١٧)

[3] المستدرك للحاكم (٢/١٧٨) سنن البيهقي الكبرىٰ (٧/٢٣٥) السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (١١١٧)

حضرت حسن بصری سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''حق مہر کو نہ بڑھاؤ۔'' حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے خطبہ دیا اور کہا:

''عورتوں کے مہروں کو نہ بڑھاؤ، اگر یہ دنیا میں کوئی قابلِ عزت چیز ہوتی یا اللہ کے نزدیک تقویٰ ہوتا تو رسول اللہ ﷺ اس کام میں تم سب سے آگے ہوتے۔ آپ ﷺ نے اپنی کسی بیوی کو بارہ اوقیہ سے زیادہ مہر نہیں دیا اور آپ ﷺ کی کسی بیٹی کو بھی اس سے زیادہ نہیں ملا۔'' (امام ترمذی کہتے ہیں: یہ حدیث صحیح ہے)[1]

آدمی کو اتنی مقدار میں حق مہر مقرر نہیں کرنا چاہیے جسے نقد ادا کرنے کی صورت میں نقصان سے دوچار ہو اور ادھار مقرر کرنے کی شکل میں ادا کرنے سے قاصر ہو۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ایک آدمی رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور کہنے لگا: میں نے ایک انصاری عورت سے شادی کی ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: ''کتنے حق مہر پر؟'' اس نے کہا: چار اوقیہ پر۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''چار اوقیہ پر! گویا تم اس پہاڑ کی چوڑائی سے چاندی کھودتے ہو! ہمارے پاس تجھے دینے کے لیے کچھ نہیں، لیکن ہو سکتا ہے ہم تمھیں کسی دستے میں بھیجیں اور اس سے تجھ کو مل جائے۔'' حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: آپ ﷺ نے بنو عبس کی طرف ایک دستہ بھیجا اور اس کو بھی ان کے ساتھ بھیج دیا۔'' (رواہ مسلم)[2]

ایک اوقیہ ان کے ہاں چالیس درہم کا ہوتا تھا اور یہ مجموعی مہر تھا جس میں مقدم و موخر نہیں۔ ابوعمرو اسلمی سے مروی ہے، انھوں نے شادی کی اور رسول اللہ ﷺ سے حق مہر کے لیے معاونت طلب کی، آپ ﷺ نے پوچھا: ''کتنا حق مہر مقرر کیا ہے؟'' اس نے کہا: دو سو درہم۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اگر تم اپنی وادیوں سے درہموں کے چلو بھرتے تو زیادہ نہ کرتے۔'' (مسند احمد)[3]

اگر کوئی شخص بہت بھاری مقدار میں حق مہر ادھار مقرر کرے اور دینے کی نیت نہ رکھتا ہو تو یہ حرام ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو کسی عورت سے حق مہر کے عوض شادی کرتا ہے اور دینے کا ارادہ نہیں رکھتا، وہ زانی ہے اور جو ادھار مقرر کرے مگر ادا کرنے کی نیت نہ رکھتا ہو، وہ چور ہے۔''[4]

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢١٠٦) سنن الترمذي، رقم الحديث (١١١٤) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٨٨٧) شیخ البانی رحمہ اللہ إرواء الغليل (٣٤٧/٦) میں اسے صحیح کہا ہے۔

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٢٤)

[3] مسند أحمد (٤٤٨/٣) المستدرك للحاكم (١٧٨/٢) السلسلة الصحيحة (٢١٧٣)

[4] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٤١٠) المعجم الكبير (٣٤/٨) تذكرة الموضوعات (٩٧٢/١)

آج بہت سے تکبر پسند، ریا کار اور اہلِ جفا محض فخر اور دکھلاوے کے لیے مہر کے لیے بڑی بڑی رقمیں مقرر کرتے ہیں، دینے کا ارادہ نہیں رکھتے۔ یہ بہت بڑی برائی، سنت کی مخالفت اور شریعت کی خلاف ورزی ہے۔ اگر خاوند دینے کا ارادہ رکھے، مگر عموماً دینے کی سکت نہ رکھتا ہو تو وہ اپنے آپ کو طرح طرح کی مشقتوں اور پریشانیوں کا مرہون بنا لیتا ہے اور قرض میں جکڑ جاتا ہے اور بیوی کے گھر والے بھی اس کو تنگ کرتے ہیں۔ لہٰذا مہر میں ادا کرنے کی قدرت اور آسانی کے ساتھ مستحب یہی ہے کہ وہ سارا نقد ہو کہ ادھار، رسول اللہ ﷺ کی ازواج اور بیٹیوں کے مہر سے زیادہ نہ ہو، وہ چار سو سے لے کر پانچ سو خالص درہموں کے درمیان درمیان ہے، تقریباً انیس دینار۔ یہ سنتِ رسول ہے، جس نے اس پر عمل کیا اس نے حق مہر کے معاملے میں رسول اللہ ﷺ کی سنت پر عمل کیا۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''جب رسول اللہ ﷺ ہمارے پاس تھے، اس وقت ہمارا مہر چار سو درہم ہوتا تھا۔'' (مسند احمد)[1] ابو سلمہ کہتے ہیں: میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا: رسول اللہ ﷺ نے کتنا مہر دیا تھا؟ انھوں نے کہا: ''بارہ اوقیہ اور ایک نش، یعنی نصف اوقیہ جو پانچ سو درہم بنتے ہیں۔'' (مسلم)[2] پہلے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول بھی نقل ہو چکا ہے لہٰذا جو اپنی بیوی کا حق مہر رسول اللہ ﷺ کی بیٹیوں سے، جو ہر فضیلت اور صفت میں تمام عورتوں سے افضل تھیں، زیادہ اور ازواجِ مطہرات کے مہر سے بڑھ کر طلب کرنا چاہتا ہے، وہ احمق اور جاہل ہے۔ یہ اس صورت میں ہے جب ادا کرنے کی قدرت اور ادھار کی صورت میں آسانی سے ادا کرنا ممکن ہو، مگر نادار اور غریب آدمی کو اتنا ہی مقرر کرنا چاہیے جتنا مشکل میں پڑے بغیر ادا کر سکتا ہو۔

بہتر یہی ہے کہ اگر ممکن ہو تو دخول سے پہلے ہی مہر دے دیا جائے، اگر کچھ معجّل اور کچھ موجل کرنا چاہے تو جائز ہے۔ سلف صالحین مہر میں تخفیف کرتے تھے، حضرت عبدالرحمان بن عوف رضی اللہ عنہ نے ایک گٹھلی کے وزن کے برابر سونا مہر مقرر کیا، جس کا وزن تین درہموں کے برابر تھا۔ سعید بن مسیّب رحمہ اللہ نے دو درہموں پر اپنی بیٹی کی شادی کر دی جو قریش کی اعلیٰ خاتون تھی اور خلیفہ نے بھی اپنے بیٹے کے لیے اس کا ہاتھ مانگا تھا۔

بعض سلف سے بھاری حق مہر مقرر کرنا بھی منقول ہے، اس کی وجہ مال کی فراوانی تھی اور وہ سارا مہر دخول سے پہلے ادا کرتے تھے، کچھ بھی موخر نہیں کرتے تھے۔ جو صاحبِ ثروت ہو اور اپنی بیوی کو زیادہ مہر دینا چاہتا ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْـًٔا ﴾ [النساء: ٢٠]

---

[1] مسند أحمد (٢/٣٦٧) اس کی سند شرط مسلم پر صحیح ہے۔

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٢٦)

''اور تم ان میں سے کسی کو ایک خزانہ دے چکے ہو تو اس میں سے کچھ بھی واپس نہ لو۔''

مگر جس کے ذمے مہر قرض ہو اور وہ ادا نہ کرنا چاہتا ہو یا ادا کرنے سے قاصر ہو تو یہ کام مکروہ ہے، جیسے پہلے ذکر ہوا، اسی طرح بھاری مہر مقرر کر لینا مگر ادا نہ کرنا غیر مسنون عمل ہے۔ واللہ أعلم[1]

شادی، ولادت، ختنے اور تعزیت کے کھانے کا حکم

سوال شادی کے کھانے، تعزیت کے کھانے، بچے کی ولادت کے کھانے اور ختنہ کے کھانے کا کیا حکم ہے؟

جواب شادی کا کھانا یعنی ولیمہ سنت ہے، بلکہ کچھ علما کے نزدیک واجب ہے، کیوں کہ یہ نکاح کے اعلان و اظہار کی علامت ہے اور خفیہ دوست رکھنے، زنا کرنے اور نکاحِ شرعی میں فرق کرتا ہے، اس لیے اس کی دعوت قبول کرنا علما کے نزدیک واجب ہے، جب کوئی مانع نہ ہو۔ مرنے کا کھانا بدعت ہے، اس کا اہتمام کرنا بھی مکروہ ہے اور اس میں شرکت کرنا بھی۔

ختنے کا کھانا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا طریقہ نہیں تھا، مگر یہ مباح اور جائز ہے، جو چاہے کرے اور جو چاہے نہ کرے۔ اسی طرح ولادت کا کھانا بھی یہی حکم رکھتا ہے، لیکن اگر عقیقہ ہو تو اس کی اور بات ہے، کیوں کہ وہ سنت ہے۔ واللہ أعلم.[1]

عورت کے لیے ماں باپ کی فرمانبرداری اہم ہے یا خاوند کی

سوال عورت کے لیے اپنے والدین کی فرماں برداری زیادہ بہتر ہے یا اپنے خاوند کی؟

جواب الحمد لله رب العالمين. عورت کی جب شادی ہو جاتی ہے، اس وقت اس کا خاوند اس کے والدین کی نسبت اس کا زیادہ مالک بن جاتا ہے اور اس پر اس کے خاوند کی فرماں برداری زیادہ فرض اور لازمی ہو جاتی ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ﴾ [النساء: ٣٤]

''پس نیک عورتیں فرماں بردار ہیں، غیر حاضری میں حفاظت کرنے والی ہیں، اس لیے کہ اللہ نے (انھیں) محفوظ رکھا۔''

❁ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''دنیا متاعِ زیست ہے اور اس کا بہترین سامان اور متاع نیک بیوی ہے۔ جب تو

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۱۹۲-۱۹۵)

[2] مجموع الفتاویٰ (۲۰۶/۳۲)

اس کو دیکھے تو تجھ کو خوش کر دے، جب تو اس کو حکم دے تو فرماں برداری کرے اور جب تو اس کے پاس موجود نہ ہو تو اپنے نفس اور تیرے مال کی حفاظت کرے۔‘‘[1]

- صحیح ابن ابی حاتم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ’’جب عورت پانچ نمازیں پڑھے، مہینے کے روزے رکھے، اپنی شرم گاہ کی حفاظت کرے اور اپنے خاوند کی فرماں برداری کرے تو جنت کے جس دروازے سے چاہے گی، داخل ہو جائے گی۔‘‘[2]
- ترمذی میں حضرت امِ سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ’’جو عورت اس حالت میں فوت ہو کہ اس کا خاوند اس سے راضی تھا، وہ جنت میں داخل ہو جائے گی۔‘‘[3]
- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ’’اگر میں کسی انسان کو، کسی کو سجدہ کرنے کا حکم دیتا تو عورت کو اپنے خاوند کو سجدہ کرنے کا حکم دیتا۔‘‘[4]
- ابو داود میں ہے: ’’میں عورتوں کو اپنے خاوندوں کو سجدہ کرنے کا حکم دیتا، کیوں کہ اللہ نے ان کے حقوق ان پر رکھے ہیں۔‘‘[5]
- مسند احمد میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ’’کسی بشر کو زیب نہیں دیتا کہ وہ کسی بشر کو سجدہ کرے، اگر کسی بشر کا کسی بشر کو سجدہ کرنا زیب دیتا تو میں عورت کو اپنے خاوند کو سجدہ کرنے کا حکم دیتا، کیوں اس پر اس کا حق بہت زیادہ ہے، خدا کی قسم! اگر اس کا خاوند سر سے لے کر پاؤں تک پیپ اور خون رستا ہوا پھوڑا ہوتا، پھر وہ اس کا استقبال کرتی اور اس کو چاٹتی، تب بھی اس کا حق ادا نہ کر پاتی۔‘‘[6]
- مسند احمد اور ابن ماجہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے: ’’اگر خاوند اپنی عورت کو کوہِ سرخ سے کوہِ سیاہ اور کوہِ سیاہ سے کوہِ احمر منتقل ہونے کا حکم دے تو اس پر عمل کرنا اس پر فرض ہے۔‘‘[7]
- حضرت معاذ کی حدیث میں ہے: ’’اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جان ہے! عورت اپنے رب

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٦٧) سنن أبي داود، رقم الحديث (١٦٤٨)

[2] مسند أحمد (١/١١٩) صحيح ابن حبان (٩/٤٧١) صحيح الجامع، رقم الحديث (٦٦٠، ٦٦١)

[3] سنن الترمذي، رقم الحديث (١١٦١) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٨٥٤) السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (١٤٢٦)

[4] سنن الترمذي، رقم الحديث (١١٥٩) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٨٥٢) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٣٤٩٠)

[5] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢١٢٦) ضعيف الجامع، رقم الحديث (٤٨٤٢)

[6] مسند أحمد (٣/١٥٨) صحيح الجامع، رقم الحديث (٧٧٢٥)

[7] مسند أحمد (٦/٧٦) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٨٥٢) صحيح الجامع، رقم الحديث (٤٧٩٩)

کا حق ادا نہیں کرتی، تا آنکہ اپنے خاوند کا حق ادا نہ کرے، اگر وہ اس کو (مجامعت کے لیے) بلائے اور وہ بچہ جننے کے قریب ہو، تب بھی اس کو منع نہ کرے۔"[1]

- طلق بن علی سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جو آدمی اپنی حاجت کے لیے اپنی بیوی کو بلائے تو وہ اس کے پاس ضرور آئے، خواہ تنور ہی پر ہو۔"[2]
- صحیح میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جب آدمی اپنی بیوی کو بستر پر بلائے اور وہ آنے سے انکار کر دے، خاوند ساری رات اس پر ناراض رہے تو صبح تک فرشتے اس پر لعنت برساتے رہتے ہیں۔"[3]

اس موضوع سے تعلق رکھنے والی احادیث بے شمار ہیں۔

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کا قول ہے: "زوج (خاوند) اللہ کی کتاب میں سید ہے، پھر انھوں نے یہ آیت پڑھی:

﴿ وَأَلْفَيَا سَيِّدَهَا لَدَا الْبَابِ ﴾ [يوسف: ٢٥]

"اور دونوں نے اس کے خاوند کو دروازے کے پاس پایا۔"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہے: "نکاح غلامی ہے، اس لیے دیکھ لو کہ کس کی غلامی میں اپنی بیٹی دے رہے ہو۔"

ترمذی میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "عورتوں کے ساتھ اچھا سلوک کرو، وہ تمھارے پاس قیدی ہیں۔"[4]

معلوم ہوا بیوی اپنے خاوند کے پاس ایک قیدی اور غلام سے مشابہت رکھتی ہے، اس لیے وہ اس کی اجازت کے بغیر اس کے گھر سے نہیں نکل سکتی، خواہ اس کا باپ اس کی ماں یا کوئی اور رشتے دار اس کو بلائے، اس پر سب ائمہ کا اتفاق ہے۔

اگر خاوند بیوی کے حقوق کی پاسداری کرتا ہو اور وہ اس کو کسی دوسری جگہ منتقل کرنا چاہتا ہو، مگر اس کا باپ اس خاوند کی بات ماننے سے منع کرے تو وہ اپنے خاوند کی فرماں برداری کرے، والدین کی نہیں، کیوں کہ ایسی صورت میں والدین ظالم ہیں، ان کو اس طرح کے خاوند کی فرماں برداری سے روکنے کا حق نہیں پہنچتا۔ اگر اس کی ماں اس کو اس سے خلع لینے یا اتنا تنگ کرنے پر اکسائے کہ وہ اس کو طلاق دینے پر آمادہ ہو جائے تو بیوی کو چاہیے کہ اگر خاوند پرہیزگار آدمی ہو تو اپنے والدین کی یہ بات نہ مانے۔ سنن اربعہ اور صحیح ابن حاتم میں حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے

---

[1] مسند أحمد (٣٨١/٤) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٨٥٣) صحيح الجامع، رقم الحديث (٥٢٩٥)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (١١٦٠) صحيح الجامع، رقم الحديث (٥٣٥)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٠٦٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٣٦)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣١٥٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٦٨) سنن الترمذي، رقم الحديث (١١٦٣) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٨٥١)

کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو عورت کسی تکلیف کے بغیر اپنے خاوند سے طلاق کا مطالبہ کرتی ہے، اس پر جنت کی خوش بو حرام ہے۔''[1]

ایک دوسری حدیث میں ہے: ''خلع لینے والیاں اور عقدِ نکاح سے نکلنے والیاں منافق ہیں۔''[2] اگر عورت کے والدین اس کو نیکی، حسنِ سلوک، سچ گوئی اور امانت داری کا کہیں اور فضول خرچی اور دیگر شرعی طور پر ممنوع کاموں سے روکیں تو ان باتوں میں وہ والدین کی فرماں برداری کرے، والدین تو ایک طرف رہے، اگر کوئی غیر بھی ایسی باتوں کی تلقین کرے تو ان پر عمل کرنا چاہیے۔

اگر عورت کا خاوند اللہ کی بغاوت کرے اور اس کے حرام کردہ کاموں کو کرنے کا حکم دے تو ان باتوں میں وہ خاوند کی فرماں برداری کی بھی مکلّف نہیں، نبی اکرم ﷺ کا فرمان ہے: ''خالق کی نافرمانی میں مخلوق کی فرماں برداری جائز نہیں۔''[3] بلکہ اگر کوئی آقا اور مالک اپنے زرخرید غلام کو بھی اللہ کی نافرمانی کا حکم دے تو اس کی فرماں برداری بھی جائز نہیں ہوتی تو عورت کے لیے کس طرح اللہ کی نافرمانی مین والدین یا خاوند کی فرماں برداری کرنا فرض ہے؟! اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت خیر ہی خیر ہے اور خدا و رسول کی نافرمانی شر ہی شر ہے۔[4]

عورت کی دبر میں مجامعت کا حکم

سوال کیا عورت کی دُبر میں مجامعت کرنا حلال ہے یا حرام؟ نیز کیا کسی عالم سے اس کی رخصت منقول ہے؟

جواب عورتوں کی دُبر میں جماع کرنا جمہور سلف و خلف کے نزدیک حرام ہے اور کتاب و سنت اس کے حرام ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔ یہی امام مالک کا مشہور مذہب ہے، کچھ لوگ ان سے رخصت کا قول بھی نقل کرتے ہیں، کچھ اس کا انکار کرتے ہیں۔

نافع نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے، جب اس نے یہ آیت: ﴿نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ﴾ [البقرة: ۲۲۳] ''تمھاری عورتیں تمھارے لیے کھیتی ہیں۔'' پڑھی تو عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے اس سے کہا: ''یہ آیت عورتوں کے پاس ان کی دبر میں آنے کے متعلق نازل ہوئی۔'' کچھ علما کہتے ہیں: نافع نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی بات کا غلط مطلب لیا اور

---

(1) سنن أبي داود، رقم الحديث (۲۲۰۹) سنن الترمذي، رقم الحديث (۱۱۸۷) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (۲۰۵۵) صحيح الجامع (۲۷۰۶)

(2) سنن الترمذي، رقم الحديث (۱۱۸٦) سنن النسائي، رقم الحديث (۳٤٦۱) السلسلة الصحيحة (٦۳۲)

(3) مسند أحمد (۱۳۱/۱) صحيح الجامع (۷۵۲۰)

(4) مجموع الفتاویٰ (۲٦۱/۳۲۔۲٦٤)

ان کی مراد سمجھ نہیں پائے۔ ان کی مراد یہ تھی کہ یہ آیت عورتوں کے پاس جہتِ دبر سے شرم گاہ میں آنے کے متعلق نازل ہوئی ہے اور علما کا اتفاق ہے کہ یہ اسی بات کا جواز بتانے کے لیے نازل ہوئی، کیوں کہ یہودی اس سے منع کرتے اور کہتے تھے۔ جب مرد عورت کی دبر کی طرف سے شرم گاہ میں جماع کرے تو بچہ بھینگا پیدا ہوتا ہے، تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی[1] اور ﴿ حَرۡثٌ ﴾ کھیتی بچہ پیدا ہونے کی جگہ ہے، جو قبل یعنی شرم گاہ ہے، دُبر نہیں۔ اس آیت میں اللہ نے مرد کو رخصت دی ہے کہ وہ جس جہت سے چاہے، شرم گاہ میں جماع کرے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے بیٹے سالم کہا کرتے تھے: "كذب العبد علی أبي" "اس غلام، یعنی نافع نے میرے باپ پر جھوٹ باندھا ہے۔" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نافع کو غلطی لگی تھی۔ لفظ کذب خطا کے مقابلے میں بھی بولا جاتا تھا، مثلاً: حضرت عبادہ کا قول ہے: "كذب أبو محمد" "ابو محمد کو غلطی لگی ہے کہ وتر واجب ہے۔" حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے: "كذب نوف" "نوف کو غلطی لگی۔ جب اس نے کہا: خضر سے ملاقات کرنے والے بنی اسرائیل کے نبی حضرت موسیٰ علیہ السلام نہیں تھے۔"

کچھ علما یہ بھی کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو یہ آیت سمجھنے میں غلطی لگی، اللہ ہی بہتر جانتا ہے، لیکن حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا یہ قول بھی منقول ہے، جس میں انھوں نے تعجب کا اظہار کرتے ہوئے کہا: "کیا کوئی مسلمان ایسا بھی کر سکتا ہے؟!" تاہم آیت کا معنی وہی ہے جو صحابہ اور تابعین نے بیان کیا ہے اور اس کا سببِ نزول بھی اسی مفہوم پر دلالت کرتا ہے۔ اس حوالے سے شریعت کی تعلیمات بڑی واضح ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: "اللہ تعالیٰ حق بتانے سے نہیں شرماتا، عورتوں کی دُبر میں جماع نہ کرو۔"[2] کیوں کہ یہ گندی جگہ ہے، اللہ نے حالتِ حیض میں بھی عورت سے مجامعت کرنا حرام کیا ہے، حالانکہ شرم گاہ میں عارضی نجاست ہوتی ہے تو وہ جگہ جہاں نجاستِ مغلظہ ہو، اس میں مجامعت کیوں کر جائز ہو سکتی ہے؟!

نیز یہ قومِ لوط کی قبیل کے ساتھ تعلق رکھتا ہے، کئی آثار میں آیا ہے: "دبر میں مجامعت کرنا چھوٹی لواطت ہے۔" امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب، امام شافعی اور ان کے اصحاب اسی طرح امام احمد اور ان کے اصحاب کے مذہب میں یہ کام حرام ہے۔ اس میں ان کا کوئی اختلاف نہیں۔ امام مالک اور ان کے اصحاب کا ظاہر مذہب بھی یہی ہے، لیکن کچھ لوگوں نے جواز کی روایت بھی نقل کی ہے اور کچھ نے اس کی تردید کی ہے اور اس غلط فہمی کی وجہ وہی ہے جو پیچھے مذکور ہوئی ہے، اگر کچھ لوگوں کو کوئی حکم سمجھنے میں غلطی لگے اور وہ کتاب و سنت کے خلاف بات کہہ دیں تو یہ

---

(1) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٩٢٤) السلسلة الصحيحة (٣٣٧٧)

(2) صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٢٥٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٣٥)

کتاب وسنت کی مخالفت کی وجہ جواز نہیں، اس کی کئی مثالیں ہیں، جہاں شریعت کا حکم واضح ہے، مگر سمجھنے والوں کو غلطی لگی ہے، اس لیے ان ثابت سنتوں کی پیروی ہی کرنی چاہیے۔

جو شخص اپنی بیوی کی دبر میں مجامعت کرتا ہے، ان دونوں میاں بیوی (اگر بیوی بھی راضی ہو) سخت سے سخت سزا دینی چاہیے، تاکہ وہ اس کام کو چھوڑ دیں، اگر وہ پھر بھی باز نہ آئیں تو ان کے درمیان علاحدگی کرنا ضروری ہو جائے گا۔ واللہ أعلم[1]

دو بیویوں میں انصاف کا حکم

سوال ایک آدمی کی دو بیویاں ہیں، ایک کے ساتھ زیادہ محبت کرتا ہے، اس کو خرچہ بھی زیادہ دیتا ہے اور اس کے پاس بھی رہتا ہے، کیا ایسا کرنا جائز ہے؟

جواب الحمد للّٰہ. سب علما کا اس بات پر اتفاق ہے کہ دو بیویوں کے درمیان عدل کرنا فرض ہے، سنن اربعہ میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''جس کی دو بیویاں ہوں اور وہ ایک کی طرف زیادہ مائل ہو تو قیامت کے دن اس حالت میں آئے گا کہ اس کی ایک جانب جھکی ہوئی ہوگی۔''[2]

اس لیے دن تقسیم کرتے وقت عدل کرنا چاہیے، جتنی راتیں ایک کے پاس گزارے، اتنی ہی دوسری کے پاس بھی گزارے اور دنوں کی تقسیم میں کسی کو دوسری پر ترجیح نہ دے، لیکن اگر ایک سے محبت اور قلبی تعلق زیادہ ہے اور اس سے ہم بستری بھی زیادہ کرتا ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں، اسی معاملے میں اللہ نے یہ آیت نازل کی:

﴿ وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْٓا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَاۗءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ ﴾ [النساء: ۱۲۹]

''اور تم ہرگز نہ کر سکو گے کہ عورتوں کے درمیان برابری کرو، خواہ تم حرص بھی کرو۔''

یعنی محبت اور جماع میں تم عدل قائم نہیں رکھ سکتے۔ سنن اربعہ میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ عدل سے دن تقسیم کرتے اور کہتے: ''اے اللہ! یہ میری تقسیم ہے، جس کا میں مالک ہوں، لیکن جس کا تو مالک ہے، میں نہیں، اس میں مجھے ملامت نہ کرنا۔''[3] یعنی دل کے معاملے میں جو میرے ہاتھ میں نہیں، تیرے ہاتھ

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۳۲/۲۶۵۔۲۶۸)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (۲۱۱۹) سنن الترمذي، رقم الحديث (۱۱۴۱) سنن النسائي، رقم الحديث (۳۹۴۲) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (۱۹۶۹) صحيح الجامع (۶۳۹۱)

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (۲۱۱۹) سنن الترمذي، رقم الحديث (۱۱۴۱) سنن النسائي، رقم الحديث (۳۹۴۲) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (۱۹۶۹) صحيح الجامع (۶۳۹۱)

میں ہے۔ خرچ اور لباس میں عدل کرنا سنت ہے، رسول اللہ ﷺ کا یہی طریقہ تھا، آپ ﷺ جس طرح تقسیمِ ایام میں عدل سے کام لیتے، اسی طرح خرچ وغیرہ میں بھی اپنی ازواجِ مطہرات کے درمیان عدل کرتے۔ اگرچہ تقسیمِ ایام اور خرچ میں عدل کے وجوب یا استحباب میں علما کا اختلاف ہے، مگر وجوب زیادہ قوی اور کتاب و سنت سے زیادہ قریب ہے۔

جب تک وہ اس کی بیوی رہے، تب تک خاوند اس عدل کا پابند ہے، اگر کسی ایک کو طلاق دینا چاہے تو یہ اس کی مرضی پر منحصر ہے۔ اگر جس کو طلاق دینا چاہے، وہ بلا تقسیم ہی اس کے پاس رہنے پر راضی ہو تو یہ جائز ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَاِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ مِنْۢ بَعْلِهَا نُشُوْزًا اَوْ اِعْرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يُّصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا ۭ وَالصُّلْحُ خَيْرٌ ﴾ [النساء: ١٢٨]

''اور کوئی عورت اپنے خاوند سے کسی قسم کی زیادتی یا بے رخی سے ڈرے تو دونوں پر کوئی گناہ نہیں کہ آپس میں کسی طرح کی صلح کر لیں اور صلح بہتر ہے۔''

صحیح بخاری میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ یہ آیت اس عورت کے متعلق نازل ہوئی جو آدمی کے پاس طویل عرصے تک رہتی ہے، وہ اس کو طلاق دینے کا ارادہ کر لیتا ہے تو وہ کہتی ہے: مجھے طلاق نہ دے، تو میرے لیے آزاد ہے۔[1] رسول اللہ ﷺ نے بھی حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کو طلاق دینے کا ارادہ کیا تو انھوں نے اپنا دن حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو ہبہ کر دیا اور آپ نے ان کو تقسیم کے بغیر ہی اپنے عقد میں رکھا، اسی طرح حضرت رافع بن خدیج کے ساتھ بھی ہوا اور کہا جاتا ہے کہ یہ آیت انہی کے بارے میں اتری۔[2]

مجامعت میں مدت کا تعین

سوال اگر کوئی شخص ایک دو مہینا اپنی بیوی کے ساتھ ہم بستری نہیں کرتا تو کیا وہ گناہ گار ہوگا؟

جواب معروف کے مطابق بیوی سے مجامعت کرنا ضروری ہے۔ یہ خاوند پر عورت کا موکد حق ہے جو اس کو کھلانے سے بھی اہم ہے۔

ایک قول کے مطابق ہر چار ماہ بعد ایک مرتبہ مجامعت کرنا فرض ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ عورت کی حاجت اور مرد کی قوت پر منحصر ہے، جس طرح وہ اس کی ضرورت اور اپنی طاقت کے مطابق اس کو کھلاتا ہے۔ یہی زیادہ صحیح قول ہے۔ واللہ أعلم[3]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٩١٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٠٢١)

[2] مجموع الفتاویٰ (٣٢/٢٦٩_٢٧٠)

[3] مجموع الفتاویٰ (٣٢/٢٧١)

مانع حمل دوا کے استعمال کا حکم

سوال کیا عورت کا مانع حمل دوا استعمال کرنا جائز ہے؟ اور اگر دوا مجامعت کے بعد بھی فرج میں باقی رہے تو کیا غسل کے بعد عورت کے لیے نماز روزہ جائز ہے؟

جواب اگر دوا اس کے اندر ہی ہو تو اس سے اس کی نماز اور روزہ تو صحیح ہے، لیکن یہ دوا رکھنے کے جواز میں اختلاف ہے، احتیاط کا تقاضا ہے کہ وہ ایسا کام نہ کرے۔ واللہ أعلم [1]

مرد کا بیوی کا جسم دیکھنا

سوال کیا مرد اپنی بیوی کا سارا جسم دیکھ سکتا ہے؟

جواب مرد کے لیے اپنی بیوی کے جسم کو دیکھنا اور چھونا حرام نہیں، لیکن شرم گاہ کو دیکھنا مکروہ ہے۔ ایک قول ہے: مکروہ نہیں اور ایک قول ہے: مجامعت کے وقت مکروہ ہے۔ [2]

بے نماز بیوی سے معاملت کا طریقہ

سوال ایک شخص کی بیوی نماز نہیں پڑھتی، کیا اس کو نماز کا حکم دینا ضروری ہے؟ اگر پھر بھی نہ پڑھے تو کیا اس کو چھوڑ دینا ضروری ہے؟

جواب ہاں بیوی کو بھی اور ان سب کو بھی نماز کا حکم دینا فرض ہے، انسان جن کو حکم دینے کی طاقت رکھتا ہو اور کوئی دوسرا ان کو حکم نہ دیتا ہو۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَأْمُرْ أَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا ﴾ [طٰہٰ: ١٣٢]

''اور اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم دے اور اس پر خوب پابند رہ۔''

نیز فرمایا:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا وَّقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ﴾ [التحریم: ٦]

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو اس آگ سے بچاؤ، جس کا ایندھن لوگ اور پتھر ہیں۔''

---

[1] مجموع الفتاویٰ (٢٧١/٣٢)

[2] مجموع الفتاویٰ (٢٧٣/٣٢)

حدیث میں ہے: ''ان کو سکھاؤ اور ان کی تادیب کرو۔''[1]

تاہم حکم کے ساتھ ساتھ اس کو اس کی ترغیب بھی دے، جس طرح اس کو ایسے سارے کاموں کی ترغیب دیتا ہے جن کی اس کو ضرورت ہوتی ہے۔ اگر پھر بھی وہ نماز نہ پڑھے اور چھوڑنے پر مصر رہے تو وہ اس کو طلاق دے سکتا ہے، بلکہ صحیح قول کے مطابق اس کو ایسا ہی کرنا چاہیے، نماز کا تارک سزا کا مستحق ہے، تاآنکہ نماز پڑھنا شروع کر دے، یہ اتفاقی مسئلہ ہے، بلکہ دو مشہور اقوال کے مطابق اگر وہ نماز نہیں پڑھتا تو قتل کر دیا جائے، اس کو کافر اور مرتد سمجھ کر قتل کیا جائے گا۔ واللہ أعلم[2]

نشوز کی تفسیر

سوال درج ذیل آیات میں نشوز کا مطلب کیا ہے:

① ﴿ وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ ﴾ [النساء: ٣٤]

''اور وہ عورتیں جن کی نافرمانی سے تم ڈرتے ہو، سو انھیں نصیحت کرو اور بستروں میں ان سے الگ ہو جاؤ اور انھیں مارو۔''

② ﴿ وَاِذَا قِیْلَ انْشُزُوْا فَانْشُزُوْا یَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ ﴾ [المجادلة: ١١]

''اور جب کہا جائے اٹھ کھڑے ہو تو اٹھ کھڑے ہو جاؤ، اللہ ان لوگوں کو درجوں میں بلند کرے گا جو تم میں سے ایمان لائے اور جنھیں علم دیا گیا اور اللہ اس سے جو تم کرتے ہو، پوری طرح باخبر ہے۔''

جواب الحمد للہ رب العالمین. اس آیت ﴿ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ ... ﴾ میں نشوز سے مراد یہ ہے کہ عورت اپنے خاوند سے نفرین ہو، جب وہ اس کو بستر پر بلائے تو جانے سے انکار کر دے، یا اس کی اجازت کے بغیر گھر سے نکلے، یا اس طرح کے دیگر کام جو خاوند کی فرمانبرداری کے خلاف ہوں۔ اس آیت: ﴿ وَاِذَا قِیْلَ انْشُزُوْا فَانْشُزُوْا ... ﴾ میں نشوز سے مراد اٹھنا، بلند ہونا اور قیام ہے۔ اس مادے کی اصل ارتفاع اور سختی ہے، بلند اور سخت زمین کو بھی نشز کہا جاتا ہے، جس طرح اس آیت میں ہے:

﴿ وَانْظُرْ اِلَی الْعِظَامِ كَیْفَ نُنْشِزُهَا ﴾ [البقرة: ٢٥٩]

---

① یہ الفاظ تو نہیں ملے، البتہ اس مفہوم کی روایت صحیح بخاری میں ہے: (٩٧)

② مجموع الفتاویٰ (٢٧٦/٣٢)

’’اور ہڈیوں کو دیکھ ہم انھیں کیسے اٹھا کر جوڑتے ہیں۔‘‘

یعنی ہم اس کی ہڈیوں کو ایک دوسری کے اوپر چڑھاتے ہیں، بنابریں نافرمان عورت کو ناشزہ کہا جاتا ہے، کیوں کہ اس میں بھی ایک طرح کی درشتی ہوتی ہے اور وہ خاوند کی فرمانبرداری سے اٹھ جاتی ہے، یعنی انکار کر دیتی ہے۔ واللہ أعلم [1]

ناشز عورت کا نان نفقہ

سوال کیا ناشز عورت کا نان ونفقہ خاوند کے ذمے نہیں رہتا؟

جواب اگر عورت مرد کو اپنے قریب نہیں آنے دیتی تو مرد سے اس کا نان ونفقہ ساقط ہو جاتا ہے۔ اگر وہ نشوز پر اصرار کرے تو وہ اس کو مار بھی سکتا ہے۔ اگر مرد اس کو بستر پر بلائے تو وہ منع نہیں کر سکتی۔ ایسا کرنے کی وجہ سے وہ اللہ اور رسول دونوں کی نافرمان ہو گی۔

صحیح میں ہے: ’’جب مرد عورت کو بلائے اور وہ آنے سے انکار کر دے تو جو آسمان میں ہے وہ صبح تک اس سے ناراض رہتا ہے۔‘‘ [2]

بیوی کا نفلی نماز کو خاوند کی فرمانبرداری پر ترجیح دینا

سوال ایک شخص کی بیوی دن کو روزہ رکھتی ہے اور رات کو قیام کرتی ہے، جب اس کا خاوند اس کو بستر پر بلاتا ہے تو انکار کر دیتی ہے، روزے اور قیام اللیل کو خاوند کی فرمانبرداری پر ترجیح دیتی ہے، کیا یہ جائز ہے؟

جواب اس کے لیے ایسا کرنا بالاتفاق ناجائز ہے، بلکہ جب اس کا خاوند اس کو بستر پر بلائے، اس کی بات ماننا اس پر فرض ہے، کیوں کہ یہ اس پر فرض ہے۔ قیام اللیل اور نفلی روزہ تو نفل ہے اور ایک مومن عورت نفل کو فرض پر کیسے ترجیح دے سکتی ہے؟

بخاری و مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ’’عورت کا خاوند اس کے پاس حاضر ہو تو اس کی اجازت کے بغیر اس کے لیے روزہ رکھنا حلال نہیں اور وہ اس کے گھر میں اس کی اجازت کے بغیر کسی کو اجازت نہ دے۔‘‘ [3]

---

[1] مجموع الفتاویٰ (٢٧٧/٣٢)

[2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٣٠٦٥) صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٤٣٦)

[3] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٤٨٩٩) صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٠٢٦)

ابوداود اور ابن ماجہ میں ہے: ''رمضان کے علاوہ کسی دن عورت کا خاوند موجود ہو تو وہ اس کی اجازت کے بغیر روزہ نہ رکھے۔''[1]

اگر رسول اللہ ﷺ نے خاوند کی موجودگی میں اس کی اجازت کے بغیر عورت کے لیے نفلی روزہ رکھنا حرام قرار دیا ہے، کیوں کہ یہ روزہ اس کے فرض و واجب میں رکاوٹ بن سکتا ہے، تو جو عورت روزے رکھی جاتی اور قیام اللیل کرتی ہے مگر خاوند کو انکار کرتی ہے، اس سے متعلق کیا وعید ہو گی؟

صحیحین میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب آدمی اپنی بیوی کو بستر پر بلائے، وہ انکار کر دے تو صبح تک فرشتے اس پر لعنت بھیجتے رہتے ہیں۔''[2]

ایک روایت میں ہے: ''جو آسمان میں ہے وہ صبح تک اس عورت پر ناراض رہتا ہے۔''

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ﴾ [النساء: ٣٤]

''پس نیک عورتیں فرماں بردار ہیں، غیر حاضری میں حفاظت کرنے والی ہیں، اس لیے کہ اللہ نے (انھیں) محفوظ رکھا۔''

نیک عورت ہی قانتہ، یعنی فرمانبردار ہوتی ہے جو اپنے خاوند کی ہمیشہ اطاعت گزار رہتی ہے، جب وہ اس کے بلاوے پر آنے سے انکار کر دے، تب وہ نافرمان اور ناشزہ ہوتی ہے جس کو مارنا بھی جائز ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَالّٰتِيْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا﴾ [النساء: ٣٤]

''اور وہ عورتیں جن کی نافرمانی سے تم ڈرتے ہو، سو انھیں نصیحت کرو اور بستروں میں ان سے الگ ہو جاؤ اور انھیں مارو، پھر اگر وہ تمھاری فرماں برداری کریں تو ان پر (زیادتی) کا کوئی راستہ تلاش نہ کرو۔''

عورت پر اللہ اور رسول کے حق کے بعد خاوند کے حقوق سے بڑا کسی کا حق نہیں، بلکہ رسول اللہ ﷺ نے یہاں تک فرمایا ہے: ''اگر میں کسی کو حکم دیتا کہ وہ کسی کو سجدہ کرے تو عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے خاوند کو سجدہ کرے، کیوں کہ اس کا حق اتنا عظیم اور بڑا ہے۔''[3]

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٤٤١) سنن الترمذي، رقم الحديث (٧٨٢) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٧٦١) صحيح الجامع، رقم الحديث (٧٢٢٩)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٠٦٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٣٦)

[3] مسند أحمد (١٥٨/٣) صحيح الجامع، رقم الحديث (٧٧٢٥)

عورتوں نے رسول اللہ ﷺ سے کہا: مرد جہاد کرتے ہیں، صدقہ کرتے ہیں اور کام کرتے ہیں، ہم سب یہ کام نہیں کرتیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اس کے بعد تم میں سے کسی کا اچھا فعل کیا رہ جاتا ہے، یعنی جب عورت اپنے خاوند کے ساتھ حسنِ معاشرت سے پیش آئے تو وہ سارے کام کیے بغیر ہی جو مردوں کے ساتھ خاص ہیں، اللہ کی رضا اور اکرام پا لیتی ہے۔ واللہ أعلم[1]

خلع کی وضاحت

سوال کتاب وسنت میں مذکور خلع سے کیا مراد ہے؟

جواب کتاب وسنت میں مذکور خلع سے یہ مراد ہے کہ عورت خاوند کو ناپسند کرتی ہو اور اس سے جدا ہونا چاہتی ہو تو حق مہر یا اس کا کچھ حصہ اس کو بطور فدیہ دے کر اپنے آپ کو اس سے آزاد کر لے جس طرح ایک قیدی فدیہ دے کر آزادی حاصل کرتا ہے، اگر دونوں میں سے ہر ایک دوسرے کے لیے یہی چاہتا ہو تو یہ خلع اسلام میں نیا ہے۔

مزید یہ کہ اگر عورت خاوند سے نفرت کرتی ہو، اس سے جدا ہونا پسند کرتی ہو تو فدیہ دے کر اپنے آپ کو اس سے آزاد کر لے جو حق مہر لیا ہوا تھا، وہ واپس کر دے۔ مزید جو کچھ اس کے ذمے تھا، اس سب کو دے کر بری الذمہ ہو جائے اور وہ اس کو خلع دے دے، جس طرح کتاب وسنت میں ہے اور ائمہ کا اتفاق بھی اسی پر ہے۔ واللہ أعلم[2]

مجبوری کے خلع کا حکم

سوال ایک عورت اپنے خاوند سے نفرت کرتی ہے۔ اس نے اس سے خلع کا مطالبہ کیا اور کہا: اگر تو نے مجھے خلع نہ دیا تو میں خودکشی کر لوں گی۔ اس آدمی کے ولی نے اس کو جدائی پر مجبور کیا اور اس عورت نے کسی دوسرے سے شادی کر لی، مگر یہ پہلا اس کا طلبگار تھا، اور اس نے کہا: مجھے اسے چھوڑنے پر مجبور کیا گیا ہے، مگر وہ عورت دوسرے ہی کو چاہتی ہے، اس خلع کا کیا حکم ہے؟

جواب اگر پہلے خاوند کو فرائض میں کوتاہی کرنے یا اپنے قول وفعل سے یا کسی بھی طریقے سے عورت کو اذیت دینے اور نقصان پہنچانے کی وجہ سے خلع پر مجبور کیا گیا ہے تو خلع اور علاحدگی صحیح ہے اور دوسرے سے نکاح بھی صحیح ہے، وہ اب دوسرے ہی کی بیوی ہے۔ لیکن اگر وہ بیوی کے حقوق ادا کرتا ہے اور اس کے ساتھ حسنِ معاشرت سے

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۲۷۴/۳۲۔۲۷۵)

[2] مجموع الفتاویٰ (۲۸۲/۳۲)

پیش آتا ہے۔ اس کے باوجود اس کو مار کر یا قید کر کے خلع دینے پر مجبور کیا گیا ہے تو یہ علاحدگی نہیں ہوئی، بلکہ اگر خاوند حسنِ معاشرت سے پیش آتا ہو مگر عورت ویسے ہی اس کو ناپسند کرتی ہو تو ایسی صورت میں خاوند سے اچھے طریقے سے خلع کا مطالبہ کیا جا سکتا ہے، مگر اس کو اس پر لازم نہیں کیا جا سکتا، اگر خلع دے دے تو صحیح ورنہ عورت کو صبر کی تلقین کی جائے، جب تک کوئی ایسا معاملہ نہ ہو جائے جو فسخ کو جائز کر دے۔[1]

کیا خلع طلاق ہے؟

سوال کیا خلع تین طلاقوں میں شمار ہوتا ہے، نیز کیا یہ لفظِ طلاق اور نیتِ طلاق کی شرط کے بغیر بھی نکاح فسخ کر دیتا ہے؟

سوال اس مسئلے میں سلف و خلف میں مشہور اختلاف ہے۔ امام احمد اور ان کے اصحاب کے ظاہر مذہب کے مطابق یہ فسخ نکاح اور بائن علاحدگی ہے۔ تین طلاقوں میں شمار نہیں ہوتا۔ اگر کوئی دس مرتبہ بھی خلع دے تو وہ اس عورت سے، اس سے پہلے کے کہ کسی دوسرے شخص سے شادی کرے، نئے عقد کے ساتھ شادی کر سکتا ہے۔ امام شافعی کا ایک قول بھی یہی ہے، ان کے اصحاب کی ایک جماعت نے اسے ہی اختیار کیا ہے اور اس کی تائید بھی کی ہے، ان کے اصحاب کے دوسرے گروہ نے اس کی تائید تو کی ہے مگر اسے اختیار نہیں کیا۔ اسی طرح اسحاق بن راہویہ، ابو ثور، داود، ابن منذر اور ابن خزیمہ جیسے جمہور فقہائے حدیث کا مذہب بھی یہی ہے اور یہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور ان کے شاگردوں طاؤس اور عکرمہ سے بھی ثابت ہے۔

دوسرا قول: یہ طلاق بائن ہے جو تین طلاقوں میں شمار ہوتی ہے۔ یہ بہت سے سلف کا قول ہے اور ابو حنیفہ، مالک، جدید قولِ شافعی اور دوسرے قول میں احمد کا مذہب ہے۔ یہی حضرت عمر، عثمان، علی اور عبداللہ بن مسعود سے منقول ہے۔ امام احمد، ابن منذر، ابن خزیمہ اور بیہقی جیسے محدثین نے ان صحابہ سے اس نقل کو ضعیف قرار دیا ہے۔ ان کے نزدیک صرف عبداللہ بن عباس کا قول صحیح ثابت ہے کہ یہ فسخ ہے، طلاق نہیں۔ شافعی وغیرہ نے کہا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے نقل کرنے والے راوی کا حال ہمیں معلوم نہیں کہ وہ ثقہ ہے یا غیر ثقہ، انھوں نے صحابہ سے نقل کی تصحیح نہیں کی، بلکہ اس کی صحت کے عدمِ علم کا اعتراف کیا ہے۔

میرے علم کے مطابق کسی صاحبِ علم نے صحابہ سے اس نقل کو صحیح نہیں کہا کہ خلع طلاقِ بائن ہے جو تین میں شمار ہوتی ہے، بلکہ اس سلسلے میں سب سے زیادہ ثابت شدہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا قول ہے جو صحیح سند سے منقول ہے کہ انھوں نے خلع لینے والی عورت کو ایک حیض کے ساتھ استبرائے رحم کا حکم دیا اور کہا: تجھ پر عدت نہیں۔ اس لیے قطعی طور

[1] مجموع الفتاویٰ (۲۸۲/۳۲)

پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ ان کے نزدیک ایک بائن علاحدگی ہے، طلاق نہیں۔ کیوں کہ دخول کے بعد طلاق دینے کے بعد تین قروء (حیض) عدت گزارنا نصِ قرآنی سے واجب ہے اور اس پر سب کا اتفاق ہے، مگر خلع میں ایسا نہیں۔ سنت اور آثارِ صحابہ سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کے لیے عدت ایک حیض کے ساتھ استبرائے رحم ہے، یہ اسحاق بن راہویہ اور ابن منذر کا مذہب اور احمد سے بھی ایک روایت ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے ایک ایسی عورت کو کسی دوسرے شخص سے شادی کرنے سے پہلے اس کے پہلے خاوند کی طرف لوٹایا تھا جس نے اس کو دو طلاقیں دیں اور ایک خلع دیا تھا۔

جب زبیر نے ابراہیم بن سعد بن ابی وقاص کو یمن کا والی بنایا تو اس وقت اس نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ مسئلہ پوچھا اور کہا: اہلِ یمن کی عام طلاق فداء، یعنی خلع ہے۔ انھوں نے جواب دیا: فداء طلاق نہیں، لوگوں نے اس کا نام غلط رکھا ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۪ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ ؕ وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّاۤ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْـًٔا اِلَّاۤ اَنْ يَّخَافَاۤ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ ؕ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا ۚ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ؕ ﴾ [البقرة: ۲۲۹، ۲۳۰]

''یہ طلاق (رجعی) دو بار ہے، پھر یا تو اچھے طریقے سے رکھ لینا ہے، یا نیکی کے ساتھ چھوڑ دینا ہے اور تمھارے لیے حلال نہیں کہ اس میں سے جو تم نے انھیں دیا ہے کچھ بھی لو، مگر یہ کہ وہ دونوں ڈریں کہ وہ اللہ کی حدیں قائم نہیں رکھیں گے۔ پھر اگر تم ڈرو کہ وہ دونوں اللہ کی حدیں قائم نہیں رکھیں گے تو ان دونوں پر اس میں کوئی گناہ نہیں جو عورت اپنی جان چھڑانے کے بدلے میں دے دے۔ یہ اللہ کی حدیں ہیں، سو ان سے آگے مت بڑھو اور جو اللہ کی حدوں سے آگے بڑھے گا تو یہی لوگ ظالم ہیں۔ پھر اگر وہ اسے (تیسری) طلاق دے دے تو اس کے بعد وہ اس کے لیے حلال نہیں ہوگی، یہاں تک کہ اس کے علاوہ کسی اور خاوند سے نکاح کرے۔''

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اللہ نے دو طلاقوں کے بعد فدیہ کا ذکر کیا ہے، پھر کہا ہے: ﴿ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ﴾ [البقرة: ۲۳۰] یہ فدیہ میں خصوصاً اور غیر فدیہ میں عموماً داخل ہے، اگر فدیہ بھی طلاق ہوتی تو طلاقیں چار ہوتیں۔ اس مسئلے میں امام احمد نے مشہور روایت کے مطابق اور دیگر متقدمین نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی پیروی کی ہے۔ خلع لینے والی عورت سے متعلق اختلاف ہے کہ یا تو اس کی عدت تین حیض

ہے یا ایک حیض کے ساتھ استبرائے رحم ہے۔ یہ دونوں اقوال مروی ہیں اور امام احمد سے دونوں روایات ہیں۔

ایک یہ ہے کہ اس کی عدت ایک حیض کے ساتھ استبرائے رحم ہے۔ یہ قول حضرت عثمان، عبداللہ بن عباس، آخری روایت میں عبداللہ بن عمر، کئی دیگر صحابہ اور اسحاق و ابن منذر وغیرہ سے منقول ہے۔ یہ رسول اللہ ﷺ سے بھی حسن اسناد کے ساتھ سنن میں مروی ہے، میں نے اس کی اسناد اور طرق کسی دوسری جگہ بیان کیے ہیں۔

جن کے نزدیک خلع تین طلاقوں میں شمار نہیں ہوتا، ان کے دلائل یہ ہیں: وہ کہتے ہیں: اگر یہ طلاق ہوتی تو نصِ قرآن کا تقاضا ہے کہ وہ تین قروء (حیض) تک عدت گزارے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے جو یہ مروی ہے کہ انھوں نے اس کو طلاقِ بائن قرار دیا ضعیف ہے، حالانکہ ان سے صحیح سند کے ساتھ مروی ہے کہ انھوں نے ایک حیض کے ساتھ استبرائے رحم کا حکم دیا۔ اگر وہ مطلقہ ہوتی تو تین قروء تک انتظار واجب تھا۔ اگر کوئی کہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس کو مطلقہ ہی ٹھہرایا تھا مگر ایک حیض کے ساتھ استبرائے رحم کا حکم دیا تھا تو یہ بات کسی عالم نے نہیں کہی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بھی جو اس کو ایک حیض کے ساتھ استبرائے رحم کا حکم دیا تھا تو ان کا یہ فرمان عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی رائے کے ہم آہنگ ہے۔ کتاب وسنت بھی اسی پر دلالت کرتے ہیں۔ ان کا یہ قول صحیح اسناد سے مروی ہے تو اس کو چھوڑ کر اس قول کو اختیار کرنا جس کا راوی جہمان اسلمی ایک مجہول شخص ہے، زیادہ معقول نہیں۔ جن لوگوں نے اس کے طلاقِ بائن ہونے سے متعلق صحابہ سے نقل کیا ہے، ان کے نزدیک سب سے عمدہ یہی قول ہے جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور یہ قول ایک تو ضعیف ہے، دوسرے اس قول کے مخالف ہے جو ان سے صحیح سند کے ساتھ مروی ہے۔ اسی طرح ان دونوں اقوال کو جمع کرنا ممکن نہیں، کیوں کہ اس سے نص اور اجماع کی مخالفت لازم آتی ہے۔

حضرت علی اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما سے منقول قول انتہائی ضعیف ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے منقول قول مجمل ہے جس کی دلالت واضح نہیں، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے واضح الفاظ میں منقول ہے کہ یہ علاحدگی ہے، طلاق نہیں۔ یہ قول محدثین کے نزدیک سب سے زیادہ صحیح ہے اور فسخ کے قائلین اس سے تائید حاصل کرتے ہیں۔

جن فقہاء نے صحابہ سے منقول اس قول کی پیروی کی ہے کہ یہ طلاقِ بائن ہے، انھوں نے صحابہ کے ان آثار کو صحیح سمجھا ہے، لیکن آثار پر نقد و جرح اور صحیح وضعیف کی تمیز کا جو ملکہ اور علم امام احمد جیسے محدثین اور فنِ حدیث کے ماہرین کو حاصل تھا، وہ ان کو حاصل نہ ہو سکا، اس لیے ان کی رائے میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی مخالفت کرنے والے ایک تو ان سے زیادہ جلیل القدر ہیں اور دوسرے تعداد میں بھی زیادہ ہیں، لیکن ان فقہاء کو یہ علم نہیں ہو سکا کہ اصل میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے خلاف کوئی صحیح بات ثابت ہی نہیں، عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو رسول اللہ ﷺ نے یہ دعا دی تھی:

«اَللّٰھُمَّ فَقِّھْهُ فِي الدِّيْنِ وَعَلِّمْهُ التَّأْوِيْلَ »[1]

''اے اللہ! انھیں دین کی سمجھ اور تفسیر کا علم عطا کر۔''

انھوں نے قرآن سے اس مسئلے کا استنباط کیا، دین میں ان کی کمال فقاہت اور علمِ تفسیر میں ان کی مہارت پر استدلال حدیث سے کیا جاتا ہے، اور وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے سب سے زیادہ فتوے دیا کرتے تھے۔ امام احمد سے پوچھا گیا: کون سا صحابی سب سے زیادہ فتوے دیا کرتا تھا؟ انھوں نے کہا: عبداللہ بن عباس۔ وہ صحابہ کے اس طبقے سے تعلق رکھتے تھے جو علم وفقہ میں سب سے آگے تھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ مجلسِ شوریٰ میں ان کو عثمان، علی اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم جیسے اکابر صحابہ کے ساتھ بٹھاتے تھے۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول ہے:

"لو أدرك ابن عباس أسناننا لما عشره منا أحد"

''اگر عبداللہ بن عباس ہماری عمروں کو پالیں تو ہم میں سے کوئی ایک بھی ان کے علم کے عشرِ عشیر بھی نہ ہو۔''

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ مسئلہ نقل کرنے والے طاؤس وعکرمہ جیسے ان کے جلیل القدر شاگرد ہیں جو سب سے زیادہ ان کے اقوال کا علم رکھتے ہیں۔ عطا اور عمرو بن دینار کے عکس یہ دونوں ان کے خواص میں شمار ہوتے تھے۔ اور خواص کے پاس ان کا جو علم تھا وہ عوام کے پاس نہیں تھا، جس طرح خلفائے اربعہ، ابن مسعود، عائشہ، ابی بن کعب اور معاذ بن جبل رضی اللہ عنہم جیسے خواص صحابہ کے پاس جو علم تھا وہ عام کے پاس نہیں تھا، کیوں کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خصوصی مقرب تھے۔

یہاں یہ بیان کرنا مقصد ہے کہ کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ اس مسئلے میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے بہت سے صحابہ کی مخالفت کی ہے، حالانکہ انھیں اس بات کا علم ہی نہیں کہ صحابہ سے ایسا کوئی قول صحیح ثابت ہی نہیں جو ان کے قول کے مخالف ہو، بلکہ جو ثابت ہے وہ ان کے مطابق ہی ہے۔ اگر فرض کیا جائے کہ کسی صحابی نے ان کی مخالفت کی ہے تو اختلاف کا حل کتاب وسنت سے رجوع ہے۔

ان کا کہنا ہے کہ وہ طلاق جسے اللہ نے تین بنایا ہے وہ طلاق رجعی ہی ہے۔ تیسری طلاق کے علاوہ قرآن میں مدخولہ سے متعلق جو طلاق ذکر ہوئی ہے وہ رجعی ہی ہے، اسی لیے امام احمد نے کہا: میں نے قرآن پر تدبر کیا تو اس میں جو طلاق بھی پائی رجعی ہی پائی۔

ان کا اعتراض ہے کہ تین سے شمار ہونے والی طلاق کو رجعی اور بائن میں تقسیم کرنا کتاب وسنت کے خلاف ہے، بلکہ جس معاملے میں بینونہ (علاحدگی) ہے، وہ تین طلاق سے تعلق نہیں رکھتا۔ اگر طلاقِ بائن نام رکھ دیا جائے اور

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٤٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤٧٧)

اس کو تین میں شمار نہ کیا جائے تو یہ بلا اختلاف صحیح مفہوم ہے۔

اسی طرح ان کا یہ اعتراض بھی ہے کہ اگر خلع طلاق ہوتی تو یہ حیض میں جائز نہ ہوتا، کیوں کہ حیض میں طلاق دینا حرام ہے، جب کہ اس مسئلے میں مخالف بھی تسلیم کرتے ہیں کہ حیض میں خلع جائز ہے، کیوں کہ حیض میں بھی اس کی ضرورت پیدا ہوسکتی ہے اور اللہ تعالیٰ نے تین طلاقیں دے دینے کے بعد عورت کو مرد پر جو حرام کر دیا ہے، تو وہ مرد کو سزا دینے کے لیے ہے، تاکہ وہ ضرورت کے بغیر طلاق نہ دے، کیوں کہ طلاق میں اصل ممانعت ہے اور یہ اسی قدر مباح ہے جس قدر اس کی ضرورت ہو اور ضرورت تین کے ساتھ پوری ہو جاتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ہجرت تین دن جائز رکھی گئی، خاوند کے علاوہ کسی بھی دوسری میت کا سوگ تین دن ہے، مہاجر حج کے مناسک ادا کرنے کے بعد مکہ میں صرف تین دن تک رک سکتا ہے، کیوں کہ ہجرت اور مہاجر کے مکہ میں قیام میں اصل تحریم ہے۔

اب اس میں بھی اختلاف ہے کہ کیا خلع طلاق کا لفظ بولے اور نیت کیے بغیر نکاح فسخ کر دیتا ہے یا نہیں؟ اس میں تین اقوال ہیں:

1 یہ لفظِ طلاق بولنے اور طلاق کی نیت کرنے کے بغیر ہو، کیوں کہ جو لفظ طلاق بول کر یا طلاق کی نیت رکھ کر خلع دیتا ہے تو وہ تین طلاقوں میں سے ایک طلاق ہو جاتی ہے۔ یہ اکثر متاخر اصحابِ شافعی و احمد کا قول ہے۔ یہ علما یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ اگر یہ (خلع) صریح طلاق اور اس کی نیت سے خالی ہو تو فسخ ہوگا اور یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ جب تک لفظ خلع کے ساتھ نہ ہو تب تک فسخ نہیں ہوتا۔ لفظِ فسخ اور مفاداۃ، لفظِ فراق، سراح (آزاد کرنا) اور ابانہ (جدا کرنا) ایسے تمام الفاظ سے کم درجے کے ہیں، جن کو بول کر مرد عورت سے جدا ہوتا ہے، حالانکہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کو فسخ کا نام نہیں دیا، کتاب و سنت میں بھی اس کو فدیہ، فراق اور خلع ہی کا نام دیا ہے۔ ان کا قول ہے: ''الخلع فراق ولیس بطلاق'' ''خلع فراق ہے طلاق نہیں۔'' عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اسے فسخ کے نام سے تعبیر نہیں کیا گیا، اس لیے لفظِ فراق کی نسبت لفظ فسخ کیسے صریح ہوسکتا ہے؟! ایسے ہی احمد بن حنبل نے بھی اس کو اکثر لفظ ''فرقۃ'' ہی سے تعبیر کیا ہے، طلاق سے نہیں۔ البتہ بعض اوقات اس کو فسخ کے نام سے بھی ذکر کیا جاتا ہے، کیوں کہ متاخرین کے ہاں یہ اس اسم کے ساتھ سامنے آیا ہے۔

2 اگر یہ لفظِ طلاق کے علاوہ کسی دوسرے لفظ، مثلاً: خلع، مفاداۃ اور فسخ کے ساتھ دیا جائے تو فسخ ہی ہوگا، چاہے اس نے طلاق کی نیت کی ہو یا نہ کی ہو، یہ توجیہ کئی ایک اصحابِ شافعی و احمد کی ہے۔

اس قول کی بنیاد پر سوال کھڑا ہوتا ہے کہ جب وہ صریح لفظِ طلاق سے خالی ہو تو اس کے علاوہ جس لفظ اور

کنائے کے ساتھ بھی ہو فسخ ہو گا یا اس کے لیے لفظ خلع، فسخ یا مفاداۃ کا استعمال ضروری ہے؟ اس میں بھی پہلے قول کی طرح دو توجیہات ہیں۔ یہ قول نسبتاً ان دونوں کے اصول سے پہلے کی نسبت زیادہ مشابہت رکھتا ہے۔ جب لفظ ایک باب میں صریح ہو اور اس میں دوہرایا ہوا پایا جائے تو وہ دوسرے میں کنایہ نہیں ہوتا، اس لیے اگر کوئی ظہار کا لفظ بول کر طلاق مراد لے تو عام علما کے نزدیک اس سے طلاق نہیں ہوتی، کتاب وسنت اسی پر دلالت کرتے ہیں۔ اسی طرح احمد کے نزدیک اگر کوئی لفظ حرام بول کر طلاق مراد لے تو اس سے طلاق نہیں ہوتی، کیوں کہ یہ لفظ ظہار میں صریح ہے، بالخصوص امام احمد کے اصول کے مطابق۔

بنابریں خلع، فسخ اور فدیہ مع العوض جیسے الفاظ خلع میں صریح ہیں، طلاق میں کنائے کے طور پر استعمال نہیں ہوتے، اس لیے ان کے ساتھ کسی طور پر طلاق نہیں ہوتی، کیوں کہ لفظ خلع، مفادات، فسخ اور عوض یا تو خلع میں صریح ہیں یا طلاق میں، یا دونوں میں کنایہ ہیں، اگر پہلی بات مانی جائے جو صحیح ہے تو ان الفاظ کے ساتھ طلاق نہیں ہوتی، خواہ بولنے والے کی نیت طلاق دینا ہی ہو، اگر دوسری بات تسلیم کی جائے تو لازم آئے گا کہ لفظ خلع، مفاداۃ اور فسخ صریح طلاق سے ہوں، اس لیے ان کو بولنے سے طلاق ہو جائے گی جس طرح خالی لفظ طلاق بولنے سے طلاق ہو جاتی ہے، مگر اس بات کا کوئی بھی قائل نہیں اور نہ کسی نے ان الفاظ کو صریح طلاق میں شمار کیا ہے۔

اگر کہا جائے: یہ الفاظ عوض کے ساتھ طلاق میں صریح ہو جاتے ہیں تو جواب ہے کہ یہ بات شافعی کے اصول کے مطابق باطل ہے، کیوں کہ ان کے نزدیک جو لفظ صریح نہ ہو، وہ لفظ عوض کو داخل کرنے سے صریح نہیں بن جاتا۔ اس لیے شافعی اور اس مسئلے میں ان کے ہم رائے حنبلی علما کہتے ہیں: نکاح لفظ ''انکاح'' اور لفظ ''تزویج'' کے بغیر منعقد نہیں ہوتا، کیوں کہ ان دونوں کے سوا جتنے الفاظ ہیں سب کنایہ ہیں، کنایے میں نیت کی ضرورت ہوتی ہے، نیت گواہ بنائے بغیر ممکن نہیں ہوتی، نکاح میں بھی گواہی کا ہونا ضروری ہے اگر کوئی کہے: میں ایک ہزار کے عوض تجھے اس عورت کا مالک بنا دیتا ہوں، یا کہے: میں نے وہ تجھے ایک ہزار کی دے دی، یا کہے: میں نے وہ تجھے ہبہ کر دی، تو یہاں عوض کو داخل اور ذکر کرنا نکاح میں قرینہ نہیں، کیوں کہ مالک بنانے سے گردن کا مالک، یعنی لونڈی کا مالک بنانا بھی احتمال رکھتا ہے۔ اسی طرح لفظ مفاداۃ، کیوں کہ مفاداۃ (یعنی فدیہ کے عوض) یہ لفظ فدیہ کے عوض قیدی چھڑانے کے معنی کا احتمال بھی رکھتا ہے۔ لفظِ فسخ عوض کے ذکر کے ساتھ اگر طلاق ہے تو وہ عوض کے بغیر بھی طلاق ہے؟ اصحابِ شافعی میں سے کسی نے یہ نہیں کہا کہ وہ عوض کے بغیر طلاق میں صریح ہے، بلکہ یہ زیادہ سے زیادہ کنایہ ہو سکتا ہے۔ یہ قول بھی پہلے کے زیادہ قریب ہونے کے باوجود کمزور ہے۔

3 یہ فسخ ہے خواہ اس کے لیے کوئی لفظ بھی استعمال کیا جائے، لیکن یہ تین طلاقوں میں سے ایک طلاق نہیں۔ اس قول کے قائلین نے کسی خاص لفظ کی شرط لگائی ہے اور نہ عدمِ نیتِ طلاق ہی کی، یہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور ان کے اصحاب سے منقول ہے، احمد اور ان کے قدیم اصحاب سے بھی یہی منقول ہے، انھوں نے صریح الفاظ میں کہا ہے کہ یہ فسخ ہی ہے، خواہ جس لفظ کے ساتھ بھی دیا جائے، چاہے وہ لفظ طلاق سے بھی، اس کے خالص معنی میں، زیادہ صریح ہو۔ شافعی نے کسی سلف سے یہ نقل نہیں کیا کہ اس نے لفظِ طلاق یا غیرِ طلاق میں فرق کیا ہو، بلکہ انھوں نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل کرتے وقت عکرمہ رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا کہ جس کو مال جائز کر دے وہ طلاق نہیں۔ انھوں نے کہا: میرا خیال ہے جس نے اس کو طلاق نہیں بنایا وہ یہ بات اس وقت کہتا ہے جب یہ لفظِ طلاق کے ساتھ نہ ہو۔

یہاں محمد بن نصیر اور طحاوی وغیرہما نے ذکر کیا ہے کہ وہ لفظِ طلاق کے ساتھ خلع دینے میں علما کا کوئی اختلاف نہیں جانتے۔ یہ معلوم ہے کہ اس جیسے ظن کے ساتھ سلف کے مذاہب نقل نہیں کیے جاتے اور نہ اس کے ذریعے ان کے الفاظ وعلم، اور ان تمام الفاظ کے برابر ہونے کے متعلق ان کی واضح دلیلوں سے انحراف ہی کیا جاتا ہے۔ احمد کا کلام بالکل واضح ہے کہ وہ اس معاملے میں لفظ کا اعتبار نہیں کرتے اور مختلف الفاظ میں فرق بھی نہیں کرتے، وہ اس مسئلے میں عبداللہ بن عباس کے پیروکار ہیں۔ ان کا قول ہے: ''جس مسئلے میں تمھارا کوئی امام نہیں اس میں بات کرنے سے اجتناب برت۔'' اس مسئلے میں ان کے امام حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما ہیں، اور انھوں نے اور دیگر علما نے یہ مسئلہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور ان کے اصحاب سے نقل کیا ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک اس بات کا اعتبار ہے کہ عورت عوض دے کر علاحدگی کی طلب گار ہو۔ اس مسئلے میں ان کے الفاظ تفصیل کے ساتھ کتب میں درج ہیں۔

مزید یہ کہ بخاری نے اپنی صحیح میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے: ثابت بن قیس بن شماس وہ پہلا شخص تھا جس نے عہدِ رسالت میں خلع دیا، اس کی بیوی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی اور کہنے لگی: میں اس پر کوئی دینی یا اخلاقی قدغن نہیں لگاتی، بس میں اسلام میں، اس کے بعد کفر کو ناپسند کرتی ہوں، اس نے کہا کہ وہ اس کو پسند نہیں کرتی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے پوچھا: کیا تم اس کا باغ واپس کر دو گی؟ اس نے کہا: ہاں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قیس سے کہا: باغ قبول کر لے اور اس کو ایک طلاق دے دے۔[1]

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ الفاظ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بھی روایت

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٩٧١)

کیا ہے کہ آپ ﷺ نے اس عورت کو ایک حیض انتظار کرنے کا حکم دیا،[1] تاکہ استبرائے رحم ہو جائے اور کہا: تجھ پر کوئی عدت نہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فتویٰ دیا کہ اہلِ یمن کی طلاق جسے وہ ''فداء'' کا نام دیتے ہیں، تین طلاقوں میں شمار نہیں ہوتی، حالانکہ ابراہیم بن سعد نے ان سے کہا تھا کہ اہلِ یمن کی عام طلاق ''فداء'' ہے، انھوں نے اس سے کہا: فداء طلاق نہیں، وہ فراق (علاحدگی) ہے۔ لوگوں نے اس کا نام غلط رکھ دیا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے سائل کو بتایا کہ ان کی طلاق ''فداء'' ہے۔

یہ اس بات کی ظاہر دلیل ہے کہ وہ فدا (خلع) کے لیے طلاق کا لفظ استعمال کیا کرتے تھے۔ اس لفظ کا کم سے کم اطلاق یہ ہے کہ یہ طلاق اور غیر طلاق میں عام ہو۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے جواب میں بھی مطلق اور عام صیغہ ہی استعمال کیا، نہ تو لفظِ طلاق کے ساتھ ''فداء'' کا استثناء کیا نہ اس کے لیے کوئی لفظ ہی متعین اور خاص کیا، حالانکہ انھیں علم تھا کہ لوگ اس کے لیے لفظ طلاق زیادہ استعمال کرتے ہیں، بلکہ عام لوگ تو خلع اور فسخ وغیرہما کے الفاظ سے واقف ہی نہیں ہوتے، جب تک انھیں کوئی استاد ان کا مفہوم نہ سکھائے۔ لوگ الفاظ کے باہمی فرقوں سے بھی واقف نہیں ہوتے، اس لیے ایک کی جگہ دوسرا لفظ بول دیتے ہیں، بلکہ بہت سے ایسے بھی ہوتے ہیں کہ اگر کسی سے کہا جائے: اپنی بیوی کو خلع دے تو وہ بلاعوض ہی طلاق دے دیتا ہے اور کہتا ہے: میں نے اس کو خلع دے دیا ہے۔ اگر لوگوں کو دو مختلف الفاظ کے باہمی فرق کے بارے میں نہ بتایا جائے تو وہ ان میں فرق نہیں کرتے اور ایک کو دوسرے کی جگہ استعمال کر لیتے ہیں۔ اہلِ یمن میں آج تک یہ رواج ہے کہ بیوی خاوند سے کہتی ہے: مجھے طلاق دے (یہ نہیں کہتی: مجھے خلع دے) وہ کہتا ہے: میرے لیے کچھ خرچ کر، وہ اس کو حق مہر وغیرہ واپس کرتی ہے تو وہ اس کو طلاق (یعنی خلع) دیتا ہے، یہ ان کی عام طلاق ہے۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے ان کو فتویٰ دیا کہ یہ فدیہ اور فراق ہے، طلاق نہیں۔ اس لیے انھوں نے اس شخص کی بیوی کو اس کے پاس لوٹا دیا جس نے اس کو دو طلاقیں اور ایک مرتبہ فداء دیا تھا۔ یہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے، ان کا فتویٰ قرآن سے استدلال پر مبنی ہے اور اسی قول کی حمایت کرتا ہے۔

یہ قول جس طرح امام احمد کے اصول و نصوص کا نتیجہ ہے اسی طرح اصولِ شریعت اور نصوصِ شارع کا تقاضا بھی یہی ہے، کیوں کہ عقود و معاہدات میں مقاصد و معانی کا اعتبار ہوتا ہے، الفاظ کا نہیں، اگر دو لفظوں کا مقصود ایک ہی ہو تو ان دونوں کے حکم میں اختلاف جائز نہیں ہوتا۔ اگر ایک ہی معنی ہو تو بندہ چاہتا تو اس کو طلاق قرار دیتا، چاہتا تو

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٢٢٩) سنن الترمذي، رقم الحديث (١١٨٥) سنن النسائي، رقم الحديث (٣٤٩٨) شیخ البانی رحمہ اللہ نے اسے صحیح کہا ہے۔

طلاق قرار نہ دیتا، یہ معانی کے ساتھ کھلواڑ ہے جو باطل ہے۔

دوسرے فریق نے اس پر اعتراض کیا ہے کہ کسی شخص کے زیرِ نکاح لونڈی کو آزاد کر دیا جائے اور اس کو اپنے خاوند کو رکھنے اور نہ رکھنے کا اختیار دیا جائے تو وہ اپنے آپ کو طلاق بھی دے سکتی ہے اور آزادی کی وجہ سے نکاح فسخ کرنے کا اختیار بھی رکھتی ہے تو جس طرح اس کو دونوں امور کا اختیار ہے اسی طرح خاوند بھی عوض لینے کے بعد نکاح فسخ کرنے کا اختیار بھی رکھتا ہے اور طلاق دینے کا بھی۔

یہ قیاس ضعیف ہے، کیوں کہ جب یہ آزاد کردہ اپنے آپ کو طلاق دے گی تو طلاق رجعی ہی ہوگی۔ اس طرح اس کو بائن علاحدگی قبول کرے یا طلاق رجعی دینے کا اختیار ہی ہوگا اور خاوند کو بھی اسی طرح انہی دونوں کاموں کا اختیار ہے یا خلع دے کر بائن علاحدگی اختیار کرے یا بلاعوض طلاق رجعی دے دے۔ اصول کی خلاف ورزی اس طرح ہے کہ وہ بائن علاحدگی کا مالک بنے، چاہے اس کو بائن علاحدگی بنا دے اور چاہے تو طلاق بنا دے، مقصود دونوں جگہ ایک ہی، یعنی بائن علاحدگی ہی ہو۔ اس کو طلاق بنانے اور نہ بنانے کا اختیار اس کے پاس ہو، یہی وہ برائی ہے جس کے نتیجے میں بندہ ایک ہی عقد کو چاہے تو طلاق بنائے اور چاہے تو طلاق نہ بنائے، حالانکہ دونوں جگہ مقصود ایک ہی ہے۔

مزید یہ کہ بندے میں افعال کا مقصد و ارادہ اور غرض و غایت دیکھی جاتی ہے جبکہ احکام شارع کی طرف سے جاری ہوتے ہیں، شارع دو افعال کے مقصود کے مختلف ہونے کی وجہ سے ایک فعل کے حکم کو دوسرے فعل کے حکم سے علاحدہ کرتا ہے، اگر ان سے بندے کا مقصود ایک ہی ہو تو وہ حکم کے اثبات ونفی میں مختار نہ ہو۔ یہ تو معلوم ہے کہ زیرِ بحث مسئلے میں علاحدگی کا مقصود ایک ہی ہے، اس میں اختلاف نہیں۔ اسی طرح اگر عورت مرد سے عوض کے بدلے علاحدگی کا مطالبہ کرے تو اس میں افتدا؛ فدیہ دینے کا معنی ثابت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے خلع کے حکم کو لفظِ فدیہ کے ساتھ معلق کیا ہے، لٰہذا جہاں یہ معنی پایا جائے گا، وہاں اس سے مراد وہی خلع ہوگا جو کتاب اللہ میں مذکور ہے۔

پھر دیکھیے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں رجوع کو طلاق کے لوازم سے قرار دیا ہے، جہاں اللہ نے مدخولہ کی طلاق کا ذکر کیا ہے، وہاں رجوع بھی رکھا ہے۔ اگر افتدا طلاق ہوتی تو اس میں بھی رجوع رکھا جاتا۔ اگر ایسا ہوتا تو اس سے افتدا کا معنی ہی ختم ہو جاتا، یہ بات خلافِ اجماع بھی ہے۔ ہمارے علم کے مطابق کسی بھی عالم کا یہ قول نہیں کہ خلع مطلق میں عوض لینے کے ساتھ رجوع کا حق بھی ہوتا ہے، تاہم کچھ علما نے یہ کہا ہے: عوض لینا لازمی نہیں، آدمی چاہے تو عوض واپس کر کے رجوع کر سکتا ہے، اس مسئلے میں علما نے اختلاف کیا ہے کہ اگر عوض میں رجوع کی شرط بھی رکھی جائے تو کیا یہ شرط صحیح ہوگی یا نہیں؟ اس میں دو اقوال ہیں اور دونوں امام مالک سے دو روایات ہیں، ابو حنیفہ اور شافعی کے مذہب میں دونوں کو اکٹھا کرنا باطل ہے، متاخرین حنابلہ کا مذہب بھی یہی ہے۔ پھر ان علما میں سے کچھ تو

عوض قبول کرنا لازم اور رجوع رد کرنا ضروری کہتے ہیں اور کچھ رجوع ثابت کرتے اور عوض کو ختم اور باطل کرتے ہیں۔ مذہبِ احمد اور شافعی میں یہ دونوں توجیہات ملتی ہیں، اس مسئلے میں امام احمد سے کوئی نص اور ان کا کوئی قول منقول نہیں۔

امام احمد کے مذہب کے اصول کے مطابق قیاس اس شرط کے صحیح ہونے کا تقاضا کرتا ہے، مثلاً اگر عورت مال دے کر طلاق کا اختیار حاصل کر لے تو امام احمد کے قول اور نص کے مطابق یہ جائز ہے، کیوں کہ ان کے نزدیک عقود میں شرط لگانا جائز ہے، جب تک اس شرط کے فاسد ہونے کی کوئی شرعی دلیل نہ ہو، ان کے نزدیک شرط فاسد وہ نہیں جو اطلاق کے وقت تقاضائے عقد کے خلاف ہو، بلکہ جو مقصودِ شارع کے خلاف اور حکمِ شارع کے متضاد ہو، مثلاً: غیر معتق کے لیے ولاء کی شرط لگانا، لونڈی بیچنے والے کا بیچتے وقت مجامعت کی شرط لگانا، حالانکہ وہ مشتری کی ملکیت بن جاتی ہے، وغیرہ وغیرہ۔

مزید برآں خلع دیتے وقت استعمال ہونے والے مختلف الفاظ میں فرق کرنا ایک نیا قول ہے جو صحابہ، تابعین اور تبع تابعین میں سے کسی سے منقول نہیں۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے بھی یہ فرق کسی سے نقل نہیں کیا، البتہ یہ کہا ہے کہ میرا گمان ہے صحابہ فرق کیا کرتے تھے، لیکن یہ بات احکام القرآن میں کہی ہے اور اس میں خلع کے طلاق ہونے اور فسخِ نکاح نہ ہونے کو ترجیح دی ہے۔ تاہم بعد میں انھوں نے اس ترجیح سے رجوع کر لیا تھا۔

اسی طرح سنن میں ہے کہ فیروز دیلمی مسلمان ہوا تو اس وقت اس کے نکاح میں دو حقیقی بہنیں تھیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے کہا: ''ان میں سے جس کو چاہے طلاق دے دے۔'' وہ کہتے ہیں: میں نے اس کو چھوڑ دیا جس کے ساتھ رفاقت پرانی تھی۔[1] یہ حدیث حسن ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ایک طلاق دینے کا حکم دیا تھا، یہ علاحدگی شافعی اور احمد کے نزدیک بائن علاحدگی ہے، تین طلاقوں میں سے نہیں۔ اس سے بھی معلوم ہوا کہ لفظِ طلاق ایسے فسخ پر بھی بولا جاتا ہے جو تین طلاقوں سے تعلق نہیں رکھتا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جو مسلمان ہو اور اس کے نکاح میں چار سے زیادہ بیویاں ہوں اور وہ ایک سے کہے: میں نے اس کو طلاق دے دی تو اس کا مطلب ہوگا وہ اس کو علاحدہ کر رہا ہے اور دوسری کو اختیار کر رہا ہے، بعض اصحابِ شافعی اور احمد کے اس قول کے عکس کہ جب وہ دو میں سے ایک کو طلاق دے تو اس میں اس کے لیے اختیار ہے، کیوں کہ طلاق بیوی ہی کو ہوتی ہے۔

یہ قول عقل کے بھی خلاف ہے اور سنت کے بھی، کیوں کہ جو جس عورت کو طلاق دیتا ہے اس میں اس کی کوئی دلچسپی نہیں ہوتی، وہ اس کو اختیار کرنے والا اور باقی رکھنے والا کیسے ہوسکتا ہے؟

اس کی اس غلط فہمی کی بنیاد یہ ہے کہ لفظِ طلاق اس طلاق ہی کے معنی میں ہوتا ہے جو تین میں سے ایک ہوتی

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٢٤٣) سنن الترمذي، رقم الحديث (١١٣٠)

ہے، یہ غلط گمانی شریعت، لغت اور اجماعِ علما کے خلاف ہے۔

❁ طلاق کے لیے شارع نے کوئی ایک لفظ مخصوص نہیں کیا، بلکہ جب کسی بھی ایسے لفظ کے ساتھ طلاق دی جائے جو اس کے معنی کا احتمال رکھتا ہو تو صحابہ، سلف اور عام علما کے نزدیک طلاق ہو جاتی ہے، اس میں صرف کچھ متاخرین شیعہ اور ظاہریہ کا اختلاف ہے، سلف سے کوئی اختلاف منقول نہیں۔ اگر کوئی شخص کہے: ”فارقتك“ (میں نے تجھے علاحدہ کر دیا ہے)، ”سرحتك“ (میں نے تجھے آزاد کر دیا ہے)، ”سیبتك“ (تجھے چھوڑ دیا ہے) اور ان الفاظ کے پیچھے طلاق کی نیت رکھے تو طلاق ہو جائے گی۔ سارے کنائے یہی حکم رکھتے ہیں، اگر ان کنایوں کے ساتھ عوض کا تذکرہ بھی کیا جائے، مثلاً: عورت ایک ہزار کے بدلے مجھے چھوڑ دے، یا آزاد کر دے، یا علاحدہ کر دے، یا میری راہ چھوڑ دے، تو ان الفاظ اور ان الفاظ میں کیا فرق ہے کہ عورت کہے: ایک ہزار کے فدیے کے عوض مجھے آزاد کر دے، یا مجھے جدا کر دے، یا خلع دے دے، یا میرا نکاح فسخ کر دے؟ یا اس طرح دیگر تمام کنایات، بلکہ اگر لفظ خلع اور فسخ عوض کے بغیر ہوں اور بولنے والے کی نیت طلاق دینے کی ہو تو رجعی طلاق ہو جائے گی، یہ دونوں الفاظ طلاق کے باب میں کنایہ ہیں۔ لہٰذا کنایہ میں استعمال ہونے والے مختلف الفاظ میں کیا فرق ہے، جب مقصود ایک ہو؟!

اگر خلع عوض کے بغیر ہو تو اس کے صحیح ہونے میں علما کا اختلاف ہے، اس میں دو اقوال ہیں جو دونوں امام احمد سے دو روایات ہیں:

ایک قول ہے: خلع صحیح نہیں ہوتا، ابو حنیفہ اور شافعی کا قول بھی یہی ہے اور اکثر اصحابِ احمد نے اسے ہی اختیار کیا ہے۔

دوسرا قول ہے: خلع صحیح ہے، اس قول کی بنیاد پر لفظ خلع بول کر طلاق دینے والے کے لیے طلاق کی نیت کرنا ضروری ہے، دونوں روایات کے مطابق اس کے ذریعے طلاق بائن ہوگی، فسخ نہیں۔ یہ امام احمد سے منصوص ہے۔

اگر اس کو بلا عوض فسخ قرار دیا جائے تو آدمی ابتدا ہی سے فسخِ نکاح کا مختار ہوگا اور یہ اس کے پاس تین طلاقوں میں سے ایک طلاق شمار نہیں ہوگی۔ اس کا کوئی بھی قائل نہیں، بلکہ اگر ایسا ہو تو طلاق میں تعداد کی کوئی حیثیت نہیں رہ جائے گی جس طرح زمانہ جاہلیت اور ابتدائے اسلام میں طلاق کی کوئی تعداد نہیں تھی۔ اگر لفظِ فسخ یا اس طرح کا کوئی لفظ واقع ہو جائے اور وہ تین میں شمار نہ ہو تو اس کو لفظِ طلاق کے بدلے استعمال کیا جائے گا، جس کا مطلب ہوگا: بلا عدد طلاق، اور یہ بلاشبہہ باطل ہے۔

اگر کہا جائے: یہ طلاق بائن ہے تو جواب میں کہا جائے گا: اس کا بطلان اس سے بھی زیادہ ہے، کیوں کہ اگر یہ کہا جائے کہ وہ صرف طلاق رجعی کا مالک ہے، طلاق بائن کا نہیں تو یہ بھی باطل ہے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ وہ

طلاق بائن واقع کرنے کا اختیار رکھتا ہے، اگر اس کے لیے لفظِ فسخ کے ذریعے واقع کرنا جائز کہا جائے اور وہ تین میں شمار بھی نہ ہوتو یہ ممنوع لازم آئے گا کہ وہ عورت کو جب چاہے طلاق دے دے اور وہ تین میں شمار بھی نہ ہو۔ اسی لیے اس بات میں علما کا کوئی اختلاف نہیں کہ عوض اور مطالبے کے بغیر لفظِ خلع فسخ نکاح نہیں ہوتا، اختلاف اس وقت ہے جب عورت بلاعوض طلاقِ بائن کا مطالبہ کرے، کیا وہ اس کا اختیار رکھتی ہے یا نہیں؟ اس میں دو اقوال ہیں۔

طلاق بائن سے متعلق تین اقوال ہیں:

1. خاوند چاہے تو طلاقِ بائن دے دے، چاہے تو طلاق رجعی دے، کیوں کہ رجوع اس کا حق ہے، چاہے اپنے اس حق کو ثابت کر دے اور چاہے تو نفی کر دے، یہ ابو حنیفہ کا مذہب اور ایک روایت احمد سے اور میرے خیال کے مطابق مالک سے بھی ایک روایت یہی ہے۔
2. انسان ابتداءً طلاق بائن کا اختیار نہیں رکھتا، بلکہ جب عورت اس سے ابانہ کا مطالبہ کرے اس وقت وہ اس کا اختیار رکھتا ہے۔ یہ امام مالک کا مشہور مذہب ہے اور امام احمد سے ایک روایت ہے، خرقی نے اسے اختیار کیا ہے۔
3. وہ بلاعوض عورت کو بائن کرنے کا اختیار نہیں رکھتا، چاہے عورت اس سے اس کا مطالبہ کرے یا نہ کرے، وہ عوض کے بغیر اس کو بائن کرنے کا اختیار نہیں رکھتا۔ یہ اکثر فقہائے حدیث کا مذہب، شافعی کا قول اور ظاہر مذہب میں احمد کا مذہب اور ان کے جمہور اصحاب کا قول ہے۔ اسی طرح یہ اسحاق، ابو ثور، ابن المنذر، ابن خزیمہ اور داود وغیرہ کا مذہب ہے۔ اکثر صحابہ سے ثابت اقوال بھی اسی پر دلالت کرتے ہیں۔ کتاب وسنت بھی اسی قول پر دلالت کرتے ہیں، کیوں کہ اللہ نے طلاق کو بھی رجعی ہی رکھا ہے۔ کتاب اللہ میں کوئی ایسی طلاق نہیں جو بائن ہو اور تین میں بھی شمار ہو، سوائے اس کے جو عوض کے ساتھ ہو، عوض کے بغیر نہیں، بلکہ ہر وہ علاحدگی جو بائن ہو وہ تین طلاقوں میں سے ایک نہیں ہوتی۔

- خلع اور طلاق عربی زبان کے علاوہ کسی دوسری زبان کے الفاظ سے بھی واقع ہو جاتے ہیں اور اس پر سب ائمہ کا اتفاق ہے، عجمی زبان میں کوئی ایسا لفظ نہیں جو مع العوض کے ساتھ خلع اور ایسی طلاق میں فرق کرے جو خلع نہیں، ان دونوں کے درمیان ایسے الفاظ کے ساتھ ہی فرق کیا جائے گا جہاں خلع کے ساتھ عوض کا ذکر ہو اور عورت کی طرف سے مطالبہ شامل ہو۔

لفظِ طلاق کی نسبت غیرِ عورت کی طرف بھی کی جاتی ہے، مثلاً کہا جاتا ہے: "طلقت الدنیا" (میں نے دنیا کو طلاق دے دی، چھوڑ دیا)، "طلقت ودك" (میں نے تیری محبت کو طلاق دے دی)، جب یہ لفظ عورت کی طرف منسوب ہوتو کبھی خاوند سے طلاق (آزادی) کے علاوہ کسی اور چیز سے (طلاق) آزادی بھی مراد ہوتی ہے، مثلاً

کہا جائے: ''أنت طالق من وثاق'' (تم بیڑیوں سے آزاد ہو)، ''طالق من الھموم والأحزان'' (تم دکھوں اور رنجیدگیوں سے آزاد ہو) اگر لفظِ طلاق ان الفاظ کے ساتھ متصل ہو تو بلاشبہہ طلاق نہیں ہوتی۔ اگر مرد کی نیت طلاق کی بھی ہو اور وہ اس کے ساتھ لفظِ دین کا اضافہ نہ کرے تو اس کے قبول میں اختلاف ہے۔

اگر مرد لفظِ طلاق کو عوض کے ساتھ ملا کر کہے: ''أنت طالق بألف'' (تجھے ایک ہزار کے عوض طلاق ہو) وہ کہے: میں قبول کرتی ہوں۔ یا عورت کہے: مجھے ایک ہزار کے عوض طلاق دے دے۔ مرد کہے: میں نے تجھے طلاق دی، تو یہ طلاق عوض کے ساتھ مقید ہے، وہ مطلق طلاق نہیں جو کتاب اللہ میں مذکور ہے، کیوں کہ اللہ نے اس کو رجعی ہی رکھا ہے اور اس میں تین قروء (حیض) تک انتظار کرنا فرض قرار دیا ہے۔ پھر اس کی تعداد تین مقرر کی ہے اور اس کے تین احکام ثابت کیے ہیں، مگر یہ طلاق (مع العوض) کتاب اللہ کی نص اور اجماع کی روشنی میں رجعی نہیں، اس میں عورت تین قروء تک انتظار بھی نہیں کرتی، بلکہ سنت کے مطابق ایک ہی حیض انتظار کرنا ہوتا ہے، اس لیے ضروری ہے کہ اس کو طلاقِ ثلاثہ میں سے ایک طلاق نہ قرار دیا جائے، کیوں کہ جب مطلقاً طلاق بولا جائے اس وقت یہ اس کے مفہوم میں داخل نہیں ہوتا، بلکہ اس کے لیے طلاق کے ساتھ اضافی عوض کی قید کا ذکر کرنا ضروری ہوتا ہے جس طرح حلف بالنذور کو: ''نذرا للجاج والغضب'' بھی کہا جاتا ہے، اس کو نذرِ مقید کہا جاتا ہے، کیوں کہ یہاں لفظِ نذر استعمال ہوا ہے، لیکن صحابہ جمہور سلف اور شافعی و احمد کے نزدیک حقیقت میں اس کا حلف سے تعلق ہے، نذر سے نہیں۔

اسی طرح لفظ ''ماء'' سے عند الاطلاق آبِ منی مراد نہیں ہوتا، گو اسے تقیید کے ساتھ ''ماء'' کہا جاتا ہے، جیسا کہ قرآن میں ہے:

﴿ خُلِقَ مِنْ مَّآءٍ دَافِقٍ ۝ يَّخْرُجُ مِنْۢ بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَآئِبِ ﴾ [الطارق: ٦، ٧]

''وہ اچھلنے والے پانی سے پیدا کیا گیا ہے۔ جو پیٹھ اور پسلیوں کے درمیان سے نکلتا ہے۔''

ایسے ہی لفظِ خف (موزہ) عند الاطلاق کٹے ہوئے موزے کو نہیں کہا جاتا، جب کٹا ہوا مراد ہو تو ساتھ مقطوع کی قید لگائی جاتی ہے، لہٰذا موزوں پر مسح کرنے کے لفظ میں ''خفِ مقطوع'' داخل نہیں اور اسی طرح احرام کی حالت میں موزہ پہننا منع ہے تو اس میں بھی ''مقطوع'' داخل نہیں، اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے احرام باندھنے والے کو پہلے انھیں کاٹنے کا حکم دیا، کیوں کہ جو مقطوع ہو وہ خف نہیں رہتا۔ اس کے بعد آپ نے عرفات میں شلواریں پہننے اور موزے پہننے کی رخصت دی، اور شلواریں پھاڑنے اور موزے کاٹنے کا حکم نہیں دیا تھا تو پھٹی ہوئی شلواریں اور کاٹے ہوئے موزے عند الاطلاق لفظ ''خف'' اور لفظ ''سراویل'' میں داخل نہیں۔

لفظ ''بیع'' جب مطلق بولا جائے تو وہ شراب، مردار اور خنزیر کی بیع کو شامل نہیں، قید لگا کر اس کو بیع کہا جائے

گا، لفظ ’’ایمان‘‘ عند الاطلاق اللہ اور رسول پر ایمان پر بولا جاتا ہے، لیکن تقیید کے ساتھ نہیں، جیسے قرآن میں ہے:

﴿ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ ﴾ [النساء: ۵۱]

’’کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنھیں کتاب کا ایک حصہ دیا گیا، وہ بتوں اور باطل معبود پر ایمان لاتے ہیں۔‘‘

لفظ ’’البشارۃ‘‘ عند الاطلاق خوش خبری پر بولا جاتا ہے، لیکن قید کے ساتھ نہیں، جیسے قرآن میں ہے:

﴿ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴾ [آل عمران: ۲۱] ’’سو انھیں ایک دردناک عذاب کی خوش خبری سنا دے۔‘‘

اس کی مثالیں بے شمار ہیں۔

کتاب اللہ میں طلاقِ مطلق سے مراد وہ طلاق ہے جو خاوند کسی عوض کے بغیر دیتا ہے اور اس میں اس کے پاس رجوع کا حق محفوظ ہوتا ہے جو عوض کے ساتھ ہے، اس میں اس کے پاس رجوع کا حق محفوظ نہیں ہوتا، لہٰذا وہ طلاقِ مطلق نہیں، بلکہ فدیہ ہے جو عورت دے کر اپنے آپ کو خاوند کی زوجیت سے آزاد کرتی ہے جس طرح قیدی فدیہ دے کر اپنے آپ کو قید سے آزاد کرتا ہے، یہ فدیہ دینا طلاقِ ثلاثہ میں سے نہیں، چاہے اس کے لیے خلع کا لفظ استعمال کیا جائے یا فسخ کا یا فداء کا، یا سراح کا یا فراق کا، یا طلاق کا، یا ابانہ کا یا کوئی دوسرا لفظ۔

یہی وجہ ہے کہ ائمہ اربعہ اور جمہور کے نزدیک کوئی اجنبی اور غیر بھی عوض دے کر عورت کو خلع دلا سکتا ہے، جس طرح کوئی غیر فدیہ دے کر قیدی کو آزاد کروا سکتا ہے، غلام کو آزاد کروا سکتا ہے، اسی طرح وہ عورت کی مصلحت اور مفاد کے پیشِ نظر اس کو خاوند کی غلامی اور زوجیت سے بھی آزاد کروا سکتا ہے۔

امام شافعی اور احمد کے مذہب میں ایک توجیہ یہ بھی ہے کہ اگر اس کو فسخ کہا جائے تو یہ اجنبی یعنی غیر کی طرف سے صحیح نہیں ہوسکتا، کیوں کہ یہ اس صورت میں ’’اِقالہ‘‘ (تجارتی معاہدہ ختم کرنا) ہوگا جو اجنبی کے ساتھ صحیح نہیں ہوتا۔ یہ ابو المعالی وغیرہ جیسے خراسانی علما کی رائے ہے۔ دونوں مذہبوں میں صحیح یہی ہے کہ وہ فسخ کے قول کے مطابق فسخ ہی ہے، چاہے اجنبی کی طرف سے ہی ہو، دونوں مذاہب کے فقہا نے اس کی تصریح کی ہے، اگر چہ صاحب ’’شرح الوجیز‘‘ نے اس کا تذکرہ نہیں کیا، لیکن ابو اسحاق شیرازی جیسے عراقی امام نے اپنی کتاب ’’خلاف‘‘ وغیرہ میں اس کا ذکر کیا ہے، ان کے نزدیک یہ قیدی کو چھڑانے اور غلام کو آزاد کروانے کے لیے مال خرچ کرنے کی طرح ہے۔ ’’اِقالہ‘‘ کے باب سے نہیں، کیوں کہ خلع کا مقصد عورت سے خاوند کی ملکیت ختم کرنا ہے، ملکیت کو عورت کی طرف منتقل کرنا نہیں، اس لیے اس میں قیدی کو چھڑانے اور غلام کو آزاد کرانے کے ساتھ مماثلت پائی جاتی ہے۔ بیع میں اقالہ کے ساتھ اس کی

کوئی مماثلت نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ بالاتفاق مقرر و متعین حق مہر کے بغیر بھی جائز ہے۔ اکثر کے نزدیک زیادہ مہر کے ساتھ بھی جائز ہے اور کسی دوسری جنس کے ساتھ بھی، لیکن اقالہ اس طرح نہیں ہوتا، بلکہ اقالہ سے مقصود عوض واپس حاصل کرنا ہوتا ہے۔ اگر ہم اس کے حق مہر سے زیادہ لینے کو مکروہ یا حرام کہتے ہیں تو وجہ یہ ہے کہ اس عورت کا خاوند کی ملکیت سے نکلنے کا مطلق عوض نکاح میں متعین ہے اور بضع (شرم گاہ) ایسی چیز ہے جس کو فروخت کیا جا سکتا ہے، نہ ہبہ کیا جا سکتا ہے اور نہ وراثت میں تقسیم ہی کیا جا سکتا ہے، جس طرح مال بیچا جاتا ہے، ہبہ کیا جاتا ہے اور وراثت میں تقسیم بھی ہوتا ہے اور جس طرح مختلف قسم کی خدمات اور فوائد کو اجرت پر دیا جاتا ہے، عاریتاً دیا جاتا ہے، تجارت کی جاتی ہے اور اجارہ کیا جاتا ہے، یہ سب امور نص اور اجماع کی روشنی میں صرف اموال میں جائز ہیں۔ رہی منافع اور فوائد سے تعلق رکھنے والی تجارتِ محضہ مثلاً: کوئی شخص کوئی گھر کرائے پر لیتا ہے، پھر اس میں کسی بھی طرح کا اضافہ یا کام کیے بغیر اس کو آگے زیادہ کرائے پر دے دیتا ہے تو اس کے جواز اور عدمِ جواز سے متعلق علما کے دو اقوال ہیں جو دونوں امام احمد سے دو روایات ہیں۔ مشہور تر قول کے مطابق ایسا کرنا جائز ہے اور مالک اور شافعی کا قول بھی یہی ہے۔ دوسرے قول کے مطابق ایسا کرنا ناجائز ہے۔ یہ امام ابو حنیفہ کا قول ہے۔ ان کے مطابق یہ غیر مضمون نفع میں داخل ہے۔ پہلا قول صحیح تر ہے، کیوں کہ ان منافع اور فوائد کا ضامن کرائے پر لینے والا ہوتا ہے، یعنی جب وہ اس کو کرائے پر دی گئی چیز سپرد کرتا ہے اور اس نے اس چیز سے فائدہ نہیں اٹھایا وہ اس کی ملکیت میں ضائع ہوگئی تو یہ پھل پکنے سے پہلے ضائع اور تلف ہونے جیسا معاملہ ہے۔

یہاں یہ بیان کرنا مقصود تھا، وہ منافع اور فوائد جو وراثت میں منتقل ہوتے ہیں، ان میں تجارت کے جواز میں بھی اختلاف ہے تو ابضاع (شرم گاہ) کو وراثت میں منتقل کرنا کیسے جائز ہوسکتا ہے، جن کو بطور ہبہ دیا جا سکتا ہے، نہ وراثت ہی میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ابضاع کی وراثت میں تقسیم زمانۂ جاہلیت کے لوگوں کا طریقہ تھا، اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اس کو کالعدم کر دیا، بلکہ اگر خاوند عورت کو چھوڑنا چاہتا ہو اور اس کا حق مہر ہتھیانے کی غرض سے کسی دوسرے سے اس کی شادی کرانا چاہے تو وہ اس کا اختیار بھی نہیں رکھتا۔

اگر اس عورت سے شبہہ والی مجامعت ہو جائے تو مہر اسی کا ہوگا اس مرد کا نہیں۔ اسی لیے زیادہ سے منع کیا گیا ہے۔ اگر خلع کو اِقالہ کے مشابہ کہا جائے تو اقالہ ہر عقد میں اس کے حسبِ حال ہوتا ہے۔ ان مسائل کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ یہ قول جو ہم نے ذکر کیا ہے کہ خلع فسخ ہے اور اس کے ساتھ عورت بائن ہو جاتی ہے، خواہ کسی لفظ کے ساتھ بھی ہو، یہی صحیح ہے اور اس پر نصوص و اصول دلالت کرتے ہیں۔

اس بنا پر جب عورت کو عوض لے کر کئی مرتبہ فارغ اور علاحدہ کیا جائے تو وہ اس کے ساتھ شادی کر سکتا ہے، خواہ اس کے لیے طلاق کا لفظ استعمال کیا ہو یا کوئی اور۔ اگر اعتراض کیا جائے کہ لفظِ طلاق صریح ہے اور تین طلاقوں میں ایک طلاق شمار ہو جائے گی، اس لیے یہ لفظ خلع میں کنایہ نہیں ہو سکتا؟

جواب یہ ہے کہ صریح تو مطلق لفظ ہے، جب یہ لفظ عوض کے ساتھ مقید ہو جائے، تب اس سے خارج ہو جاتا ہے اور مقید میں صریح بن جاتا ہے، مثلاً اگر خاوند کہے: تو بیڑیوں سے، غموں سے، یا دکھوں سے آزاد ہے تو اس وقت یہ لفظ انہی معانی میں صریح ہے، نکاح سے طلاق لینے اور آزاد ہونے میں نہیں۔

اگر کہے: تو ایک ہزار کے عوض طلاق پانے والی ہے، وہ کہے: مجھے قبول ہے، تو یہ عوض کے ساتھ مقید ہے، جو خلع میں صریح ہے اور طلاقِ ثلاثہ میں سے ایک طلاق ہونے کا احتمال نہیں رکھتا۔ اگر وہ اس کو تین طلاقوں میں سے ایک طلاق بنانے کی نیت رکھے تو وہ ایسے لفظ کے ساتھ یہ نیت کرتا ہے جو اس معنی کا احتمال نہیں رکھتا، جس طرح لفظ خلع بول کر وہ یہ مراد نہیں لے سکتا کہ اب یہ عورت اس پر مکمل حرام ہو چکی ہے اور اس وقت تک حلال نہیں ہو سکتی جب تک کسی دوسرے سے شادی نہیں کر لیتی اور اس سے طلاق نہیں لے لیتی۔ تو جس طرح اس لفظ کے ساتھ اس کی یہ نیت لغو ہے، اسی طرح خلع بول کر ایک طلاق مراد لینے کی اس کی نیت بھی لغو ہے۔ اس طرح اگر انسان ظہار کے ساتھ طلاق کی نیت رکھے، یا اِیلا کے ساتھ طلاقِ موجل کی نیت، حالانکہ اہلِ جاہلیت ظہار کو طلاق اور ایلاء کو بھی طلاق ہی سمجھتے تھے۔ مگر اللہ اور اس کے رسول نے اس کو باطل اور کالعدم قرار دیا اور ایلاء میں حکم دیا کہ یا عورت کو معروف کے مطابق روک لے یا پھر احسان کرتے ہوئے آزاد کر دے، اور ساتھ اگر وہ اعادہ کرے تو چار ماہ تک انتظار کرنے کی مہلت دی۔ ''ظہار'' سے متعلق فرمایا: اس کو چھونے سے پہلے کفارہ ادا کرے، اس سے طلاق نہیں ہوتی۔

بنابریں ایلاء کو طلاقِ موجل یا ظہار کے معنی میں تحریم کو طلاق قرار دینا مرجوح قول ہے، کیوں کہ ایسی صورت اس کی مشابہت ہے جس پر وہ جاہلیت میں کاربند تھے۔

اس لیے ظہار کی حقیقت، ایلاء کی حقیقت اور طلاق کی حقیقت میں فرق ہے، یہ اللہ کی حدود کا علم ہے جو اس نے اپنے رسول پر اتاری جو حدود میں داخل نہیں، اس کو داخل نہیں کیا جائے گا اور جو ان میں ہے اس کو ان سے خارج نہیں کیا جا سکتا۔

اسی طرح ''افتداء'' (فدیہ دینا) کی بھی حقیقت ہے جس کے ساتھ یہ طلاقِ ثلاثہ کے معنی سے الگ ہو جاتا ہے، اس لیے حقیقتِ طلاق کو حقیقتِ افتدا میں داخل کرنا جائز ہے نہ حقیقتِ افتداء کو حقیقتِ طلاق میں ہی، اگر ان میں سے ایک کو دوسرے کے لفظ کے ساتھ بیان کیا جائے یا ایک کے ذریعے دوسرے کے حکم کی نیت کی جائے تو یہ بالکل

ایسے ہی ہے جیسے کوئی ایک طلاق یا خلع کے ذریعے یہ نیت کرے کہ یہ عورت اب اس پر پکی حرام ہوگئی ہے اور اس وقت تک حلال نہیں ہوسکتی جب تک کسی دوسرے مرد سے شادی کر کے اس سے طلاق نہیں لے لیتی۔ جس طرح اس حکم کی نیت لغو ہے، اسی طرح خلع کو تین طلاق میں سے ایک طلاق قرار دینے کی نیت لغو ہے، کیوں کہ یہ حکم اللہ تعالیٰ نے تین طلاقوں کے بعد رکھا ہے کہ اب یہ اس وقت حلال نہیں ہوگی، جب تک کسی دوسرے سے شادی کر کے طلاق یافتہ نہیں ہو جاتی تو جو انسان اس حکم کی نیت اس طلاق کے بغیر کرتا ہے اس کی نیت و ارادہ اللہ اور اس کے رسول کے حکم کی مخالفت ہے۔

اسی طرح جو بائن علاحدگی سے یہ نیت کرتا ہے کہ علاحدگی تین میں سے کچھ کم ہے تو اس کی نیت بھی اللہ اور اس کے رسول کے حکم کے مناقض و مخالف ہے، اس کو یہ اختیار حاصل نہیں۔ اگر کوئی انسان ایسا اللہ اور اس کے رسول کے حکم سے ناواقفیت کی بنا پر کرتا ہے تو وہ سنت سے ناواقف ہے، اس کو سنت کی طرف لوٹایا جائے، جس طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے: "رُدّوا الجهالات إلى السنة" (جہالتوں کو سنت کی طرف لوٹاؤ) اس طرح جو شخص ایک کلمے میں تین طلاقیں دیتا ہے تو سلف میں سے کچھ لوگ کہا کرتے تھے، یہ شخص سنت سے ناواقف ہے، اس کو سنت کی طرف لوٹاؤ۔

خلع دینے والے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ کہنا: «وَطَلِّقْهَا تَطْلِيقَةً» [1] (اس کو ایک طلاق دے دے) اس کو عوض کے بدلے ایک طلاق دینے کی اجازت اور زیادہ سے منع کرنا تھا۔

کتاب و سنت کی دلالت سے بھی معلوم ہوتا ہے: ''سنت طلاق'' یہی ہے کہ آدمی ایک طلاق دے، پھر اس سے رجوع کر لے، یا اس کو چھوڑ دے اور اپنی عدت پوری کرنے دے، اور یہ کہ جب انسان رجوع یا نئے نکاح سے پہلے اس کو دو یا تین طلاقیں دے گا تو وہ بدعت طلاق ہوگی جو جمہور سلف و خلف کے نزدیک حرام ہے، یہی مالک و ابو حنیفہ اور ان دونوں کے اصحاب، اور آخری قول میں احمد کا مذہب ہے۔ ان کے اکثر اصحاب نے بھی اسے ہی اختیار کیا ہے۔

کیا حرام طلاق واقع ہو جاتی ہے؟ اس میں سلف و خلف کے درمیان اختلاف ہے جس کی تفصیل اپنی جگہ گزر چکی ہے۔ صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے ابتدائی زمانے میں طلاقِ ثلاث ایک ہی ہوتی تھی۔ جب لوگوں نے اسے معمول بنا لیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: لوگوں نے اس معاملے میں جلدی کر لی ہے جس میں ان کے لیے مہلت تھی، ہم اس کو

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٩٧١) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٧١)

اُن پر نافذ ہی کر دیتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے اس کو ان پر نافذ کر دیا۔[1] اس حدیث پر تفصیلی بحث اپنی جگہ گزر چکی ہے۔ ہم نے ایک اور حدیث بھی ذکر کی ہے جو امام احمد کی ”محمد بن إسحاق عن داود بن الحصين عن عكرمة عن ابن عباس“ کی سند سے مروی حدیث کے ساتھ موافقت رکھتی ہے، اس میں ہے: رکانہ نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دیں۔ جب وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا تو آپ ﷺ نے اس سے پوچھا: «فِيْ مَجْلِسٍ أَمْ مَجَالِسَ؟» (ایک مجلس میں یا متعدد مجالس میں؟) اس نے کہا: ”بَلْ فِيْ مَجْلِسٍ وَّاحِدٍ“ (بلکہ ایک مجلس میں)، تو آپ ﷺ نے اس کی بیوی کو اس کے پاس لوٹا دیا۔[2] امام احمد نے یہ حدیث ثابت کی ہے اور بیان کیا ہے کہ یہ حدیث اس روایت سے زیادہ صحیح ہے جس میں راوی نے یہ ذکر کیا ہے کہ رکانہ نے اپنی بیوی کو طلاقِ بتہ دی اور رسول اللہ ﷺ نے اس سے حلف اٹھوایا جس پر اس نے کہا: ”میں نے ایک ہی کا ارادہ کیا تھا۔“ آپ ﷺ نے فرمایا: تو نے ایک ہی کا ارادہ کیا تھا تو آپ ﷺ نے اس کو اس کے پاس لوٹا دیا۔[3]

اس روایت کے راوی مجہول الصفات ہیں، ان کی عدالت اور حفظ معروف نہیں، اس لیے احمد، ابو عبید اور ابن حزم وغیرہ جیسے ائمہ حدیث نے اس کو ضعیف کہا ہے، لیکن ”حدیث ثلاث“ کے عکس اس کی سند جید ہے جو ابن عباس کی روایت سے ہے اور ان کی اس روایت کے موافق ہے جو صحیح بخاری میں مروی ہے جسے علما و فقہا نے روایت کیا اور اس پر عمل کیا۔ طاؤس، عکرمہ اور ابن اسحاق نے یہ فتویٰ دیا ہے کہ ”تین ایک ہی ہیں“ اور ان میں سے کسی کا قول ہے کہ جس نے یہ کام کیا وہ سنت سے ناواقف ہے، لہٰذا اس کو سنت کی طرف لوٹایا جائے۔

ابو داود نے سنن ابو داود میں حدیث البتہ کو جو ترجیح دی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے ”عن عکرمہ عن ابن عباس سے داود بن حصین“ کی یہ حدیث ذکر نہیں کی، بلکہ عکرمہ سے ایک اور طریق اور سند سے حدیث ذکر کی ہے جس میں یہ عکرمہ سے آگے بیان کرنے والا راوی مجہول ہے۔ اس طرح انھوں نے ایک مجہول کی روایت کو دوسرے مجہول کی روایت پر ترجیح دے دی، مگر داود بن حصین کی یہ روایت حدیث کی جانکاری رکھنے والے تمام علما کے اتفاق کے ساتھ ان تمام روایات پر مقدم ہے، لیکن یہ سند اکثر علما تک پہنچ نہیں سکی، جس طرح حدیثِ طاؤس کو بہت سے، بلکہ اکثر فقہا نہیں جانتے۔ اس کی تفصیل دوسری جگہ گزر چکی ہے جہاں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ تین طلاقوں کو لازم

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٧٢)

[2] مسند أحمد (٢٦٥/١) شیخ البانی رحمہ اللہ نے إرواء الغليل (٢٠٦٣) میں اسے صحیح کہا ہے۔

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٢٠٦) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٠٥١) شیخ البانی رحمہ اللہ نے إرواء الغليل (٢٠٦٣) میں اسے ضعیف کہا ہے۔

کرنے سے متعلق حضرت عمر و ابن عباس رضی اللہ عنہم اور دیگر صحابہ کا فتویٰ درحقیقت اس وجہ سے تھا کہ جب لوگوں نے اس حرام کا ارتکاب کثرت سے اور علانیہ کرنا شروع کر دیا تو اس کو بطور سزا لازم کیا گیا۔

تین طلاقوں کو نافذ اور لازم کرنے سے متعلق یہ بحث بھی ہے کہ جس صحابی نے اس کو نافذ کیا تھا کیا اس بنا پر نافذ کیا تھا کہ یہ لازمی شرعی حکم ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے صادر ہوا ہے یا انھوں نے اسے اس برائی کی کثرت اور ظہور کی سزا کے طور پر نافذ کیا تھا؟

اگر کہا جائے: بطور سزا نافذ کیا تھا تو کیا اس کا سبب دائمی ہے جو رفع اور ختم نہیں ہوتا یا حالات کی نوعیت کے اعتبار سے مختلف ہو جاتا ہے؟ وہاں تفصیل سے بیان کر دیا گیا ہے کہ یہ لازمی شرعی حکم نہیں اور لازمی اجتہادی سزا بھی نہیں، بلکہ زیادہ سے زیادہ جائز مرجوح اجتہاد ہوسکتا ہے یا عارضی شرعی سزا۔

سزا اس انسان کے لیے ہوتی ہے جو تحریم کا علم رکھتے ہوئے بھی اس کا ارتکاب کرے۔ جس کو تحریم کا علم ہی نہ ہو، جب بتایا جائے اور وہ توبہ کر لے تو وہ سزا کا مستحق نہیں ہوتا۔ اس لیے ان تینوں کو اکٹھا نافذ کر دینا جائز ہی نہیں، بلکہ ایک ہی کو نافذ کیا جائے گا، یہ اس صورت میں ہے جب طلاق عوض کے بغیر ہو۔ جب طلاق عوض کے ساتھ ہو تو وہ فدیہ ہے جس طرح پہلے ذکر ہو چکا ہے، لہٰذا عوض کے ساتھ بھی تین طلاقیں واقع کر دینا جائز اور حلال نہیں، جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عوض کے ساتھ ایک سے زیادہ طلاق دینے سے منع کیا، عوض کے بغیر بھی ایک ہی طلاق دی جاتی ہے، زیادہ نہیں، لیکن عوض کے ساتھ طلاق مقید ہے جو فدیہ ہے اور بائن علاحدگی۔ اس سے مراد وہ مطلق طلاق نہیں جو کتاب اللہ میں مذکور ہے، کیوں کہ وہ رجعی طلاق ہے۔

اگر عوض کے بدلے تین طلاقیں اکٹھی دے، یہ بھی کہا گیا ہے کہ عوض کے بغیر تین دینا ایک ہی ہوتی ہے، اور عوض کے ساتھ فدیہ ہوتا ہے جو تین میں شمار نہیں ہوتا، تو فدیہ کے ساتھ یہ علاحدگی بھی تین میں شمار نہیں ہوگی۔ اس لیے یہ علاحدہ ہونے والا شخص اسی عورت سے نئے عقدِ نکاح کے ساتھ شادی کر سکتا ہے اور یہ عوض کے بدلے فراق اور علاحدگی تین طلاقوں میں شمار نہیں ہوگی، اس لیے حرام ہونے کی وجہ سے طلاق لازم نہیں ہوگی۔ دو بھی حرام ہیں، ایک مباح ہے، لیکن عوض کے ساتھ بھی ایک ہی مستحب ہے، کیوں کہ یہ فدیہ ہے، وہ طلاق نہیں جس کو اللہ نے تین بنایا ہے، لہٰذا تین خلع دینے کے باوجود اس عورت سے شادی کر سکتا ہے۔

مختصراً یہ ہے کہ بینونت (علاحدگی) کی دو انواع ہیں:

1. بینونتِ کبریٰ: تین طلاقیں واقع ہو جانے کے نتیجے میں ہونے والی علاحدگی جس کے بعد وہ عورت اس مرد پر حرام ہو جاتی ہے اور اس وقت تک حلال نہیں ہوتی جب تک وہ کسی دوسرے مرد سے شادی نہیں کر لیتی۔

2 بینونتِ صغریٰ: یہ وہ علاحدگی ہے جس کے ساتھ عورت مرد سے علاحدہ ہو جاتی ہے مگر وہ مرد اسی عورت کے ساتھ عدت میں یا عدت کے بعد عقدِ جدید کے ساتھ شادی کر سکتا ہے۔

خلع کے نتیجے میں بینونتِ صغریٰ حاصل ہوتی ہے، بینونتِ کبریٰ نہیں، بینونتِ کبریٰ اس وقت ہوتی ہے جب شرعی طریقے سے تین طلاقیں دے دی جائیں جس کا طریقہ یہ ہے کہ آدمی اس طہر میں عورت کو ایک طلاق دے جس میں ہم بستری نہ کی ہو، یا حمل واضح ہونے کے بعد ایک طلاق دے اور اس کو چھوڑ دے، تا آنکہ اس کی عدت گزر جائے، پھر نئے عقد کے ساتھ شادی کرے۔ وہ عدت میں رجوع کرنے کا اختیار بھی رکھتا ہے، جب وہ رجوع کر لے یا نیا عقد کرے تو دوسری طلاق پھر اسی جائز طریقے کے مطابق دے۔

اگر رجوع یا نئے عقد سے پہلے ایک ہی جملے میں یا متفرق کلمات میں تین طلاقیں دے دے تو یہ جمہور کے نزدیک حرام ہے، مالک اور ابو حنیفہ کا مشہور مذہب بھی یہی ہے، بلکہ اسی طرح اگر طہروں میں رجوع یا عقد سے پہلے تین طلاقیں دے تو مالک اور احمد کے مشہور مذہب میں یہ بھی جائز نہیں۔

اگر تین طلاقیں حرام طریقے سے دے تو کیا تین ہوں گی یا ایک؟ اس میں سلف و خلف کے دو مشہور اقوال ہیں جس کی تفصیل گزر چکی ہے۔

اگر کہا جائے: نہیں ہوتی تو وہ ایک کلمے کے ساتھ بینونتِ کبریٰ کا مالک نہیں، اگر اس کا مالک نہیں تو اس کو اس کا عوض دینا جائز نہیں جس کا وہ مالک ہی نہیں، اگر حرام طریقے سے تین طلاقیں لینے کے لیے خاوند کو عوض دیا جائے تو عوض ایسے کام میں صرف کیا جائے گا جسے کرنا حرام ہے اور جس کا وہ اختیار ہی نہیں رکھتا، اگر وہ واقع کرے گا تو وہی واقع ہوگا جو مباح ہے اور عوض کے بدلے مباح بینونتِ صغریٰ ہے، بینونت کبریٰ نہیں، بلکہ اگر اس نے بیوی کو دو طلاقیں دی اور عورت سے علاحدگی کے لیے لفظ طلاق یا کسی اور لفظ کے ساتھ عوض دیا تو تیسری طلاق نہیں ہوگی، کیوں کہ عوض کے ساتھ علاحدگی فسخ ہے جس سے بینونتِ صغریٰ حاصل ہوتی ہے، اس لیے اس صورت میں اگر وہ لفظِ طلاق یا کسی اور لفظ کے ساتھ علاحدہ ہوتا ہے تو بینونت صغریٰ ہوگی جو فسخ ہے، کبریٰ نہیں، وہ اسی عورت کے ساتھ عقدِ جدید کے ساتھ شادی کر سکتا ہے، لیکن اگر عورت تیسری حرام طلاق کے لیے عوض دے کر صراحت کرتی ہے کہ اس کا مقصد یہ ہے کہ وہ اس پر حرام ہو جائے، تا آنکہ کسی دوسرے مرد سے شادی کرے تو اس نے اس سے بینونتِ صغریٰ کے لیے عوض صرف نہیں کیا۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے خلع میں رجوع کی شرط کے ساتھ عوض دیا جائے۔ خلع میں مرد کا رجوع کی شرط لگانا ایسے ہی ہے جیسے وہ اس میں اپنے لیے طلاقِ حرام کی شرط رکھتی ہے، مرد اس حالت میں تیسری طلاق کا مالک ہے جو اس عورت کے لیے حرام ہے جس طرح وہ اس سے پہلے رجعی طلاق کا اختیار رکھتا تھا۔ واللہ سبحانہ و تعالیٰ أعلم [1]

---

1. مجموع الفتاویٰ (۳۲/۲۸۹-۳۱۵)

طلاق یا خلع میں حق مہر سے زیادہ مالکانہ حقوق سمیت دیے گئے مال کا مطالبہ

سوال ایک شخص نے اپنی بیوی کو قیمتی کپڑے اور زیورات پہنائے، اس عورت نے اس سے خلع کا مطالبہ کیا، اس شخص نے اس عورت سے اپنی یا اس کی کسی ضرورت کے لیے اس سے زیور مانگا، مگر اس نے انکار کر دیا۔ اس کو معلوم ہے وہ حلف اٹھا کر اس زیور کو اپنے پاس رکھ لے گی اور قیمت اس کو چکانی پڑے گی۔ مگر اس کے پاس کوئی دلیل بھی نہیں؟

جواب اگر اس شخص نے اس کو واجب اور حق مہر سے زائد جو کچھ بھی مالکانہ حقوق سمیت دیا ہے تو اس کی وہ مالک بن چکی ہے، اگر مرد اپنی طرف سے طلاق دے تو وہ ان چیزوں کا مطالبہ نہیں کر سکتا، لیکن اگر وہ عورت اس کے ساتھ رہنا ناپسند کرتی ہے، اور اس سے خلع چاہتی ہے تو پھر اس کو حق مہر بھی واپس کرے اور وہ سب کچھ بھی جو اس نے اس کو مالکانہ حقوق سمیت دیا تھا۔ باقی مرد کے ذمے ہوگا، تاکہ وہ اس کو خلع دے۔ ثابت بن قیس بن شماس کی بیوی کے کیس میں یہی رسول اللہ ﷺ کی سنت ہے۔ آپ ﷺ نے اس عورت کو وہ سب کچھ واپس کرنے کا حکم دیا تھا جو اس نے اس کو دیا تھا۔

اگر مرد نے یہ قیمتی کپڑے اور زیورات عورت کو محض زیبایش اور آرایش کے لیے دیے تھے جس طرح کوئی اپنی سواری کی زیبایش کرتا ہے یا غلام کو جوتے پہناتا ہے، مالکانہ حقوق سمیت نہیں دیے تھے تو وہ مرد کی ملکیت میں باقی ہیں، جب چاہے لے سکتا ہے، چاہے طلاق دے یا نہ دے۔ اگر دونوں میں اس بات میں جھگڑا ہو جائے کہ کیا اس نے اس کو یہ ساری چیزیں بطور تملیک دی تھیں یا بطور اباحت اور وہاں کوئی فیصلہ کن عرف یا روایت بھی نہ ہو تو خاوند کی بات معتبر ہو گی۔ وہ قسم کھا کر کہے گا: میں نے اس کو مالک نہیں بنایا تھا۔ اگر اس میں جھگڑا ہو جائے کہ کچھ دیا بھی تھا کہ نہیں اور کوئی گواہی اور اقرار نامہ جیسی دلیل بھی نہ ہو تو ایسی صورت میں عورت کی بات معتبر ہو گی، وہ قسم کھا کر کہے گی: اس نے مجھ کو کچھ بھی نہیں دیا تھا۔[1]

مطلقہ کا حقوق سے بری کرنے کے بعد حمل کا علم ہونے پر خرچ کا مطالبہ

سوال ایک عورت کو اس کے خاوند نے تین طلاقیں دیں، اس نے حمل کا علم ہونے سے پہلے ہی خاوند کو حقوقِ زوجیت سے بری کر دیا۔ جب حمل ظاہر ہوا تو اس نے خاوند سے حمل کا خرچہ مانگا، کیا یہ جائز ہے؟

جواب اگر مسئلہ ایسے ہی ہے جیسے سوال میں ذکر ہوا ہے تو حمل کا خرچہ ابراء (بری کرنا) میں داخل نہیں کیا، وہ حمل کا خرچہ طلب کر سکتی تھی۔ اگر اس کو حمل کا علم بھی ہوتا اور خاوند کو صرف حقوقِ زوجیت سے بری کر دیا تو اس میں

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۳۲/۳۵۳۔۳۵۶)

حمل کا خرچہ داخل نہیں، کیوں کہ وہ زوالِ نکاح کے بعد بھی اس کے ذمے ہوتا ہے۔ یہ ظاہر تر قول کے مطابق حمل کی وجہ سے واجب ہے، جس طرح رضاعت کی اجرت ہوتی ہے اور دوسرے قول کے مطابق یہ حمل کی وجہ سے عورت کے لیے ہے۔ اس طرح یہ بیویوں کے خرچے کی قسم سے ہوگا۔ صحیح یہ ہے کہ یہ اجرت رضاعت کی طرح اقارب کے خرچے کی قسم سے ہے، البتہ اگر ابراء کے تقاضے میں یہ شامل ہو کہ نکاح کے بعد ان کے درمیان کبھی کوئی مطالبہ باقی نہیں رہے گا۔ اگر ایسا ہے اور دونوں کا مقصود ایک دوسرے کو اس طرح بری کرنا ہے کہ کسی کے ذمے کوئی مطالبہ نہ رہے تو اس میں حمل کے خرچے سے بری کرنا بھی شامل ہے۔

---

(1) مجموع الفتاویٰ (۳۲/ ۳۶۱-۳۶۲)

طلاق

طلاق کی جائز اور ناجائز صورتیں، نیز ناجائز طلاق کی حیثیت

سوال طلاق کی کون سی صورتیں جائز ہیں اور کون سی ناجائز، نیز کیا ناجائز اور حرام طلاق ہو جاتی ہے؟

جواب الحمد للہ. ایک طلاق وہ ہے جو کتاب وسنت اور اجماع کی روشنی میں حرام ہے، اور دوسری بالاتفاق جائز۔

جائز طلاق:

جب بیوی حیض سے پاک ہو کر غسل کرے تو خاوند مجامعت سے پہلے اس کو ایک طلاق دے، پھر اس کو چھوڑ دے اور اس کی عدت پوری ہونے تک طلاق نہ دے، اسے طلاقِ سنت کہا جاتا ہے۔ اگر وہ عدت میں اس سے رجوع کرنا چاہے تو اس کی رضامندی اور اس کے ولی کی رضامندی کے بغیر رجوع کر سکتا ہے، نیا مہر مقرر کرنے کی ضرورت نہیں۔ اگر عدت پوری ہونے تک چھوڑے رکھے تو پھر خوش اسلوبی سے اس کو آزاد کر دے، کیوں کہ وہ اس سے جدا اور بائن ہو چکی ہوتی ہے۔

اگر عدت گزرنے کے بعد اس سے شادی کرنا چاہے تو جائز ہے، لیکن نئے عقدِ نکاح کے ساتھ، جس طرح آدمی ابتداءً اس سے شادی کرتا ہے، یا اس سے کوئی دوسرا شادی کرے، پھر عدت میں رجوع کرے یا عدت کے بعد اس سے شادی کرے اور اس کو طلاق دینا چاہے تو وہ اسی طریقے سے طلاق دے گا جو پہلے ذکر ہوا ہے۔ پھر دو صورتیں ہیں: یا وہ اس سے عدت کے اندر رجوع کرے یا عدت گزرنے کے بعد دوسری مرتبہ اس سے شادی کرے۔ اگر وہ پھر اس کو طلاق دینا چاہے تو اسی طریقے سے دے گا جس کا ذکر ہوا ہے۔ اگر تیسری طلاق دے دے تو وہ عورت اس مرد پر حرام ہو جائے گی، تا آنکہ کسی دوسرے شخص سے معروف طریقے کے مطابق نکاح کرے اور وہ دوسرا خاوند اگر اپنی مرضی سے اس سے نکاح کرے اور اپنی مرضی سے اس کو چھوڑ دے، پہلے سے حلالہ کا کوئی پروگرام نہ ہو تو وہ عورت پہلے خاوند کے لیے حلال ہو جائے گی۔ اگر دوسرا شخص اس عورت کو پہلے خاوند کے لیے حلال کرنے کے لیے نکاح کرے، جسے نکاحِ حلالہ کہا جاتا ہے تو یہ اکثر علما کے نزدیک حرام ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین عظام رحمہم اللہ سے بھی اس کی حرمت منقول ہے۔ احادیثِ رسول اور شرعی دلائل بھی اس کی حرمت ہی پر دلالت کرتے ہیں۔ گو کچھ علما نے

اس کی رخصت دی ہے، جس کی تفصیل کسی دوسری جگہ گزر چکی ہے۔

اگر بیوی کو کم سنی کی وجہ سے ابھی حیض آنا شروع نہ ہوا ہو یا بڑھاپے کی وجہ سے منقطع ہو چکا ہو تو خاوند اس کو جب چاہے طلاق دے سکتا ہے، خواہ اس سے مجامعت کرتا ہو یا مجامعت کرنا چھوڑ چکا ہو، ان دونوں عورتوں کی عدت تین مہینے ہے۔ وہ جس وقت بھی اس کو اس کی عدت میں طلاق دے گا، وہ اپنی عدت حیض یا حمل سے شمار نہیں کرے گی۔ کچھ علما اس کو طلاقِ سنت کہتے ہیں اور کچھ اس کو طلاقِ سنت یا طلاقِ بدعت ایسا کوئی نام بھی نہیں دیتے۔

ناجائز اور حرام طلاق:

اگر خاوند حالتِ حیض میں یا حالتِ طہر میں مجامعت کے بعد اور حمل ظاہر ہونے سے پہلے بیوی کو طلاق دے تو یہ حرام طلاق ہے، اس کو طلاقِ بدعت کہا جاتا ہے۔ یہ کتاب وسنت اور اجماع کی روشنی میں حرام ہے۔ اگر اس کا حمل ظاہر ہو چکا ہو اور وہ اس کو طلاق دینا چاہتا ہو تو دے سکتا ہے، لیکن کیا اس کو طلاقِ سنت کہا جائے گا یا طلاقِ بدعت یا کچھ اور؟ یہ لفظی نزاع ہے۔ حالتِ حیض میں دی گئی طلاق اور حالتِ طہر میں مجامعت کے بعد حمل واضح ہونے سے پہلے دی گئی طلاق موثر ہے یا نہیں، چاہے ایک ہو یا تین؟ اس میں سلف وخلف کے دو اقوال ہیں۔

اگر خاوند ایک ہی طہر میں ایک لفظ میں یا زیادہ الفاظ میں طلاق دیتا ہے، مثلاً کہے: تجھے تین طلاقیں ہیں یا کہے: تجھے طلاق ہے، تجھے طلاق ہے، تجھے طلاق ہے۔ یا کہے: تجھے تین طلاقیں ہیں، یا دس یا سو یا ہزار تو اس مسئلے میں سلف وخلف کے تین اقوال ہیں، خواہ وہ مدخول بہا (جس کے ساتھ دخول ہو چکا ہو) ہو یا غیر مدخول بہا۔ سلف میں کچھ مدخول بہا اور غیر مدخول بہا میں فرق کرتے ہیں، یہاں ایک چوتھا قول بھی ہے جو بالکل بدعت ہے۔

1 امام شافعی کے مذہب میں اور امام احمد کی قدیم روایت میں یہ طلاق جائز اور موثر ہے۔

2 امام مالک، ابو حنیفہ اور امام احمد کی جدید روایت کے مطابق یہ طلاق حرام ہے، مگر موثر ہے۔ امام احمد کے اکثر اصحاب نے اسے اختیار کیا ہے اور یہ بہت سے صحابہ وتابعین سے بھی منقول ہے۔

3 یہ حرام ہے اور اس سے صرف ایک طلاق ہوتی ہے۔ یہ حضرت زبیر بن عوام، عبدالرحمان بن عوف، علی، عبداللہ بن مسعود اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم جیسے صحابہ کرام سے منقول ہے۔ اس بارے میں حضرت علی، عبداللہ بن مسعود اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم سے دو اقوال منقول ہیں۔ ان کے بعد بہت سے تابعین نے بھی یہی موقف اختیار کیا ہے، جن میں طاؤس، خلاس بن عمرو اور محمد بن اسحاق کا نام آتا ہے۔ داود اور اس کے اکثر ساتھی بھی اسی کی طرف مائل ہیں۔ ابو جعفر محمد بن علی بن حسین اور ان کے بیٹے جعفر بن محمد سے بھی یہی مذہب منقول ہے۔ اس

لیے کچھ شیعہ کا مذہب بھی یہی ہے اور ابو حنیفہ، مالک اور احمد بن حنبل کے کئی اصحاب بھی اسی کی طرف جھکاؤ رکھتے ہیں۔

4 کچھ شیعہ اور معتزلہ کا قول ہے کہ اس سے کچھ بھی لازم نہیں آتا، یعنی یہ قطعاً غیر موثر ہے، تاہم سلف میں سے کسی سے یہ قول منقول نہیں۔

کتاب وسنت تیسرے قول پر دلالت کرتے ہیں، قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے مدخول بہا کے لیے جو طلاق مقرر کی ہے وہ صرف رجعی طلاق ہے اور کسی کو ساری تین طلاقیں دینے کا حق نہیں دیا، اس لیے مدخول بہا کو طلاقِ بائن دینا مرد کے لیے جائز نہیں، لیکن اگر دخول سے پہلے طلاق دے تو وہ بائن ہو جائے گی، اور دوسری صورت میں جب اس کی عدت پوری ہو جائے تب وہ بائن ہو جائے گی۔

اس طرح طلاق کی بالاتفاق تین انواع ہیں، رجعی طلاق میں مرد کو عورت کی مرضی اور اختیار کے بغیر رجوع کرنے کا حق حاصل ہوتا ہے، اگر عدت میں میاں بیوی میں سے کوئی ایک فرد فوت ہو جائے تو دوسرا فرد اس کا وارث بنے گا، ''طلاق بائن'' میں مرد کی حیثیت ازسرنو نکاح کا پیغام دینے والے کی ہوتی ہے اور نئے نکاح کے بغیر ان کا ملاپ جائز نہیں ہوتا۔ وہ طلاق جس میں عورت مرد کے لیے حرام ہو جاتی ہے اور اس وقت تک حلال نہیں ہوتی جب تک کسی دوسرے مرد سے شادی نہیں کر لیتی۔ اس کی صورت یہ ہے کہ جب مرد اللہ اور اس کے رسول کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق تین طلاقیں دے دے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ مرد نے طلاق دی، پھر عدت میں رجوع کیا یا عدت گزرنے کے بعد ازسرنو نکاح کیا، پھر طلاق دی اور عدت میں رجوع کیا یا عدت گزرنے کے بعد نکاح کیا، پھر طلاق دی تو یہ تیسری طلاق ہوئی جس کی وجہ سے وہ عورت اس پر حرام ہو جائے گی اور اس وقت تک حلال نہیں ہوگی جب تک کسی دوسرے مرد سے شادی نہیں کر لیتی۔ اس پر علما کا اتفاق ہے۔ لہٰذا کتاب وسنت میں مدخول بہا کے لیے ایسی کوئی بائن طلاق نہیں جو تین شمار کی جائیں، یہی وجہ ہے کہ فقہائے حدیث میں سے امام احمد کے ظاہر مذہب میں، امام شافعی کے ایک قول میں اسحاق بن راہویہ، ابو ثور، ابن منذر، داود اور ابن خزیمہ وغیرہ کے نزدیک ''خلع'' نکاح کو فسخ یعنی ختم کر دیتا ہے اور میاں بیوی کے درمیان جدائی ڈال دیتا ہے، یعنی بائن ہے مگر تین طلاقیں شمار نہیں کیا جاتا، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت عثمان وغیرہما رضی اللہ عنہم کا یہی مذہب ہے کہ خلع لینے والی عورت کی عدت تین حیض نہیں، بلکہ ایک حیض ہے، اسحاق بن راہویہ اور ابن منذر وغیرہ کا مذہب بھی یہی ہے۔ سنن میں اس موضوع پر کئی روایات مروی ہیں جو ایک دوسری کی تصدیق وتائید کرتی ہیں۔ کچھ صحابہ سے یہ بھی مروی ہے کہ خلع طلاق ہے، لیکن امام احمد بن حنبل، ابن خزیمہ، ابن منذر اور بیہقی جیسے محدثین نے اس کو ضعیف قرار دیا ہے۔ خلع

میں عورت مرد سے علاحدہ ہونے کے لیے عوض خرچ کرتی ہے، یعنی مہر واپس کرتی ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ۚ وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْٓ اَرْحَامِهِنَّ اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۚ وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا ۚ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ۗ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿228﴾ اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۖ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ ۗ وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْـًٔا اِلَّآ اَنْ يَّخَافَآ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۖ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ ۗ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا ۚ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿229﴾ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ۗ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يَّتَرَاجَعَآ اِنْ ظَنَّآ اَنْ يُّقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۗ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿230﴾ وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ ۚ وَلَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ۚ وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا ۚ وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمَآ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهٖ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿231﴾﴾ [البقرة: ۲۲۸۔ ۲۳۱]

''اور وہ عورتیں جنھیں طلاق دی گئی ہے اپنے آپ کو تین حیض تک انتظار میں رکھیں اور ان کے حلال نہیں کہ وہ چیز چھپائیں جو اللہ نے ان کے رحموں میں پیدا کی ہے، اگر وہ اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتی ہیں۔ اور ان کے خاوند اس مدت میں انھیں واپس لینے کے زیادہ حق دار ہیں، اگر وہ (معاملہ) درست کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں۔ اور معروف کے مطابق ان (عورتوں) کے لیے اسی طرح حق ہے جیسے ان کے اوپر حق ہے اور مردوں کو ان پر ایک درجہ حاصل ہے اور اللہ سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے۔ یہ طلاق (رجعی) دو بار ہے، پھر یا تو اچھے طریقے سے رکھ لینا ہے، یا نیکی کے ساتھ چھوڑ دینا ہے اور تمھارے لیے حلال نہیں کہ اس میں سے جو تم نے انھیں دیا ہے کچھ بھی لو، مگر یہ کہ وہ دونوں ڈریں کہ وہ اللہ کی حدیں قائم نہیں رکھیں گے۔ پھر اگر تم ڈرو کہ وہ دونوں اللہ کی حدیں قائم نہیں رکھیں گے تو ان دونوں پر اس میں کوئی گناہ نہیں جو عورت اپنی جان چھڑانے کے بدلے میں دے دے۔ یہ اللہ کی حدیں ہیں، سو ان سے آگے مت بڑھو اور جو اللہ کی حدوں سے آگے بڑھے گا تو یہی لوگ ظالم ہیں۔ پھر اگر وہ اسے (تیسری) طلاق دے دے تو اس کے بعد وہ اس کے لیے حلال نہیں ہوگی، یہاں تک کہ اس کے علاوہ کسی اور خاوند سے نکاح کرے، پھر اگر وہ اسے طلاق دے دے تو (پہلے) دونوں پر کوئی گناہ نہیں کہ

دونوں آپس میں رجوع کر لیں، اگر سمجھیں کہ اللہ کی حدیں قائم رکھیں گے، اور یہ اللہ کی حدیں ہیں، وہ انھیں ان لوگوں کے لیے کھول کر بیان کرتا ہے جو جانتے ہیں۔ اور جب تم عورتوں کو طلاق دو، پس وہ اپنی عدت کو پہنچ جائیں تو انھیں اچھے طریقے سے رکھ لو، یا انھیں اچھے طریقے سے چھوڑ دو اور انھیں تکلیف دینے کے لیے نہ رکھے رکھو، تاکہ ان پر زیادتی کرو اور جو ایسا کرے سو بلاشبہہ اس نے اپنی جان پر ظلم کیا۔ اور اللہ کی آیات کو مذاق نہ بناؤ اور اپنے آپ پر اللہ کی نعمت یاد کرو اور اس کو بھی جو اس نے کتاب وحکمت میں سے تم پر نازل کیا ہے، وہ تمھیں اس کے ساتھ نصیحت کرتا ہے اور اللہ سے ڈرو اور جان لو کہ بے شک اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے۔''

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بیان کیا ہے کہ مدخول بہا طلاق یافتہ عورتیں تین قروء انتظار کریں اور قروء اکثر صحابہ کے نزدیک حیض ہے۔ لہٰذا جب تک تیسرا حیض ختم نہیں ہو جاتا عورت عدت میں رہتی ہے۔ یہ امام ابوحنیفہ اور امام احمد کا مشہور مذہب ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر، عائشہ رضی اللہ عنہم اور فقہا میں سے امام مالک اور شافعی کا مذہب ہے۔ عدت عورت کے تیسرے حیض میں داخل ہوتے ہی منقطع ہو جاتی ہے۔

وہ عورت جس کو دخول سے پہلے ہی طلاق ہو جائے، اس کے متعلق ارشادِ خداوندی ہے:

﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّوْنَهَا ۚ فَمَتِّعُوْهُنَّ وَسَرِّحُوْهُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا ﴾ [الأحزاب: ٤٩]

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! جب تم مومن عورتوں سے نکاح کرو، پھر انھیں طلاق دے دو، اس سے پہلے کہ تم انھیں ہاتھ لگاؤ تو تمھارے لیے ان پر کوئی عدت نہیں، جسے تم شمار کرو، سو انھیں سامان دو اور انھیں اچھے طریقے سے چھوڑ دو، اچھے طریقے سے چھوڑنا۔''

پھر فرمایا:

﴿ وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ ﴾ [البقرة: ٢٢٨]

''اور ان کے خاوند اس مدت میں انھیں واپس لینے کے زیادہ حق دار ہیں۔''

یعنی اس انتظار کے دورانیے میں ان کے خاوند رجوع کا حق زیادہ رکھتے ہیں۔ اس کے بعد کہا: ﴿ اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ﴾ یہاں بیان کیا کہ وہ طلاق جس کا ذکر ہوا وہ رجعی طلاق ہے جس میں خاوند کو رجوع کا حق زیادہ ہوتا ہے اور وہ ﴿ مَرَّتٰنِ ﴾ باری باری دو مرتبہ ہے۔ جس طرح کسی سے کہا جائے، دو مرتبہ یا سات مرتبہ یا سو مرتبہ سبحان اللہ کہہ تو ضروری ہے کہ وہ اس عدد کے مطابق سبحان اللہ، سبحان اللہ کہے، تاکہ وہ تعداد پوری کرے، جس کا اس سے

مطالبہ کیا گیا ہے۔ اگر وہ شخص اختصار کرتے ہوئے اس طرح کہے: تین مرتبہ سبحان اللہ، یا سات مرتبہ سبحان اللہ یا سو مرتبہ سبحان اللہ، تو اس نے حقیقت میں ایک مرتبہ ہی سبحان اللہ کہا ہے۔ یہاں اللہ نے "الطلاق طلقتان" (دو طلاقیں) نہیں کہا، بلکہ ﴿ اَلطَّلٰقُ مَرَّتٰنِ ﴾ کہا ہے، لہٰذا اگر کوئی مرد اپنی بیوی سے کہے: تجھے دو طلاقیں ہوں یا تین طلاقیں ہوں یا سات طلاقیں تو وہ دو، تین یا سات نہیں ہوں گی، بلکہ ایک ہی ہوگی۔

رسول اللہ ﷺ نے اپنی زوجہ محترمہ حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا سے (جو صبح کی نماز سے لے کر چاشت کے وقت تک مصلے پر بیٹھی رہی اور ذکر میں مشغول رہی) یہ کہا تھا: میں نے تیرے بعد چار کلمات کہے ہیں، اگر ان کا وزن ان کلمات سے کیا جائے جو تو صبح سے بیٹھی ذکر کر رہی ہے تو ان کا وزن ان سے بڑھ جائے گا، وہ کلمات یہ ہیں:

« سُبْحَانَ اللّٰهِ عَدَدَ خَلْقِهِ، سُبْحَانَ اللّٰهِ زِنَةَ عَرْشِهِ، سُبْحَانَ اللّٰهِ رِضَا نَفْسِهِ، سُبْحَانَ اللّٰهِ مِدَادَ كَلِمَاتِهِ » (رواه مسلم)[1]

''اللہ کی مخلوق کی تعداد کے مطابق اس کی تسبیح ہے، اس کے عرش کے وزن کے برابر اس کی تسبیح ہے، اس کے نفس کی رضا مندی کے مطابق اس کی تسبیح ہے، اس کے کلمات کی سیاہی کے برابر اس کی تسبیح ہے۔''

اس کا مطلب ہے اللہ سبحانہ وتعالیٰ اس عدد کے بقدر تسبیح کا مستحق ہے، جس طرح آپ ﷺ کے ان الفاظ میں منقول ہے:

« رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ مِلْءَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمِلْءَ مَا بَيْنَهُمَا وَمِلْءَ مَا شِئْتَ مِنْ شَيْءٍ بَعْدُ »[2]

''اے ہمارے رب! زمین وآسمان کی بھرائی ۔۔۔ کے برابر تیری تعریف ہے۔''

یہاں یہ مراد نہیں کہ آپ نے اتنی مقدار کے ساتھ اللہ کی حمد اور تسبیح کی ہے۔ مقدار کبھی بندے کے فعل کی صفت ہوتی ہے اور بندے کا فعل محصور ومحدود ہے اور کبھی اس کے مطابق جس کا رب تعالیٰ مستحق ہے۔ اس سے اس کی قدر اور شان بلند ہوتی ہے، ورنہ اگر نمازی نماز میں سجدہ کرتے وقت پڑھے "سبحان الله عدد خلقه"، تو اس نے اتنی تعداد کے ساتھ اللہ کی تسبیح نہیں کی، بلکہ ایک مرتبہ ہی سبحان اللہ کہا ہے۔ اسی طرح نماز کے بعد ۳۳ مرتبہ سبحان الله، ۳۳ مرتبہ الحمد لله اور ۳۳ مرتبہ الله أكبر کہنے کا حکم ہے، اگر بندہ کہے: سبحان الله، والحمد لله، والله أكبر عدد خلقه تو اس نے محض ایک مرتبہ ہی یہ تسبیح کی ہے، اللہ کی مخلوق کی تعداد کے برابر نہیں۔ ۳۳ مرتبہ

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٢٦)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٤٧١)

جب ہی ہو گی جب ۳۳ مرتبہ ان الفاظ کو دہرائے گا۔

ہم کسی کو نہیں جانتے جس نے عہدِ رسالت میں اپنی بیوی کو ایک ہی لفظ میں تین طلاقیں دی ہوں اور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو تین قرار دیتے ہوئے نافذ کیا ہو، اس سے متعلق کوئی صحیح یا حسن حدیث مروی نہیں، اسی طرح معتبر کتابوں میں بھی اس سے متعلق کوئی صحیح حدیث مروی نہیں، اس کے متعلق جتنی روایات نقل کی جاتی ہیں، وہ سب محدثین کے اتفاق کے ساتھ ضعیف ہیں، بلکہ موضوع ہیں۔ صحیح مسلم اور سنن و مسانید وغیرہ میں جو حدیث مروی ہے وہ اس طرح ہے: طاؤس عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے بیان کرتے ہیں کہ عہدِ رسالت، عہدِ صدیقی اور عہدِ فاروقی کے پہلے دو برسوں میں تین طلاقیں ایک ہی تھی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: لوگوں نے اس معاملے میں جلد بازی سے کام لیا ہے جس میں انھیں تحمل سے کام لینا چاہیے تھا، کیا ہی بہتر ہو گا اگر ہم اس کو ان پر جاری کر دیں، تو انھوں نے اس کو ان (لوگوں) پر جاری کر دیا۔[1]

مسلم وغیرہ کی روایت میں ہے: ابو صہبا نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے کہا: کیا آپ کو علم ہے کہ عہدِ رسالت اور عہدِ صدیقی میں تین طلاقیں ایک اور عہدِ فاروقی میں تین تھیں؟ انھوں نے کہا: ہاں۔[2] ایک روایت میں ہے: ابو صہباء نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے کہا: اپنی عجیب باتوں میں سے کوئی بات پیش کرو، کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہد میں تین طلاقیں ایک ہی نہیں تھی؟ انھوں نے کہا: ایسا ہی تھا، جب عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں لوگوں نے طلاق تسلسل سے دینا شروع کر دی تو انھوں نے اس کو ان پر جاری کر دیا۔

مسند احمد میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: بنی مطلب کے ایک فرد رکانہ بن یزید نے اپنی بیوی کو ایک ہی مجلس میں تین طلاقیں دے دیں، پھر اس پر بہت زیادہ آزردہ ہوا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے پوچھا: تو نے کس طرح طلاق دی ہے؟ اس نے کہا: تین طلاقیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: کیا ایک ہی مجلس میں؟ اس نے کہا: ہاں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ ایک ہے، اگر تو اس سے رجوع کرنا چاہے تو کر سکتا ہے۔ راوی کہتا ہے کہ اس نے رجوع کر لیا۔[3]

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی رائے تھی کہ ہر طہر میں طلاق دی جائے۔ یہ روایت ابو عبداللہ مقدسی کی کتاب ''المختارۃ'' میں ہے جو حاکم کی صحیح سے زیادہ صحیح ہے۔ ابو داود وغیرہ نے بھی یہ حدیث اسی طرح روایت کی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے «في مجلس واحد» کہنے کا مفہومِ مخالف یہ ہے کہ اگر ایک مجلس میں نہ ہوتیں تو

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۴۷۲)

[2] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۴۷۲)

[3] مسند أحمد (۲۶۵/۱) شیخ البانی رحمہ اللہ نے إرواء الغلیل (۲۰۶۳) میں اسے صحیح کہا ہے۔

معاملہ اس طرح نہ ہوتا، کیوں کہ اگر وہ متعدد مجالس میں ہوتی تو عرف میں رجوع کا امکان رہتا، چونکہ وہ اس کے پاس ہی تھی، اس لیے ممکن تھا، اس نے رجوع کر لیا، پھر کسی دوسری مجلس میں طلاق دی ہو، تو جہاں سکوت اور خاموشی ہو، وہاں مفہومِ مخالف کا عموم نہیں ہوتا، بلکہ اس میں تفصیل ہو سکتی ہے، مثلاً: رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«إِذَا بَلَغَ الْمَاءُ قُلَّتَيْنِ لَمْ يَحْمِلِ الْخَبَثَ »[1] أو «لَمْ يُنَجِّسْهُ شَيْءٌ »[2]

''جب پانی دو قلے (مٹکے) ہو تو وہ گندگی نہیں اٹھاتا۔'' یا ''اس کو کوئی چیز نجس نہیں کرتی۔''

حالانکہ جب پانی دو مٹکے کی مقدار میں ہو تو گندگی اٹھانے اور نہ اٹھانے دونوں کا امکان رکھتا ہے۔ اسی طرح آپ ﷺ کا فرمان ہے: ''چرنے والے اونٹوں پر زکات ہے۔''[3] اگر چرنے والے نہ ہوں تو بھی ان پر زکات ہونے (مالِ تجارت کی صورت میں) اور نہ ہونے کا امکان ہوتا ہے۔ اسی طرح آپ ﷺ کا فرمان ہے: ''جس نے ایمان اور ثواب کی امید سے لیلۃ القدر کو قیام کیا، اس کے اگلے پچھلے گناہ معاف ہو جائیں گے۔''[4] اگر کوئی قیام نہ کرے تو اللہ کسی اور سبب سے اس کو بخش دے گا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ يَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ ﴾ [البقرة: ٢١٨]

''بے شک جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے ہجرت کی اور اللہ کے راستے میں جہاد کیا وہی اللہ کی رحمت کی امید رکھتے ہیں۔''

جس نے یہ عمل نہ کیا ہو، وہ حالتِ ایمان میں کوئی دوسرا عمل کر کے بھی اللہ کی رحمت کی امید رکھ سکتا ہے اور کبھی ایسا نہیں بھی ہوتا۔ یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ اگر وہ طلاق متعدد مجالس میں ہوتی تو رجوع کرنے اور نہ کرنے دونوں کا امکان ہوتا ہے، لیکن اگر ایک ہی مجلس میں تین طلاقیں دے دی جائیں تو عموماً ایسا کرنے والے نے رجوع نہیں کیا ہوتا، اس لیے اس میں اس کے لیے رجوع ہے۔ اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے اس سے کہا تھا: «اِرْجِعْهَا إِنْ شِئْتَ»[5] ''اگر تو چاہے تو اس سے رجوع کر سکتا ہے۔'' یہ نہیں کہا تھا جو حدیثِ ابن عمر میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا تھا کہ «مُرْهُ فَلْيُرَاجِعْهَا»[6] ''اس کو اس سے مراجعت کا حکم دے'' بلکہ یہاں رجوع کا حکم دیا، کیوں کہ رجوع کرنے

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٦٣) سنن الترمذي، رقم الحديث (٦٧) صحيح الجامع، رقم الحديث (٤١٦)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٦٥) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٥١٧، ٥١٨) صحيح الجامع، رقم الحديث (٤١٧)

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٥٧٥) سنن النسائي، رقم الحديث (٢٤٤٤) صحيح الجامع، رقم الحديث (٤٢٦٥)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٨٠٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٧٦٠)

[5] مسند أحمد (٤٩٥٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٧١)

[6] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٤٧١)

میں خاوند خود مختار ہوتا ہے مراجعت کے عکس۔

ابو داود وغیرہ نے روایت کیا ہے کہ رکانہ نے اپنی بیوی کو طلاقِ بتہ دی تو نبی اکرم ﷺ نے اس سے کہا: کیا تو نے صرف ایک کا ارادہ کیا ہے؟ اس نے کہا: میں نے صرف ایک کا ارادہ کیا تھا۔ لہٰذا رسول اللہ ﷺ نے اس کی بیوی کو اس کے پاس لوٹا دیا۔[1] ابو داود نے اپنی سنن میں وہ حدیث روایت نہیں کی جو امام احمد نے اپنی مسند میں روایت کی تو کہا: حدیثِ بتہ ابن جریج کی حدیث سے زیادہ صحیح ہے، جس میں ہے: ''رکانہ نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیں۔'' کیوں کہ اس کے گھر والے زیادہ جانتے تھے، لیکن امام احمد اور امام بخاری وغیرہما جیسے اکابر محدثین اور ماہرینِ عللِ حدیث اور ان کے علاوہ ابو عبید اور ابو محمد بن حزم وغیرہ نے ''حدیثِ بتہ'' کو ضعیف قرار دیا ہے اور انھوں نے بیان کیا ہے کہ اس کے راوی مجہول ہیں جن کی عدالت اور ضبط معروف نہیں۔ امام احمد نے تین والی حدیث کو ثابت کیا ہے اور اسی کا درست ہونا بیان کیا ہے، ان کا قول ہے: رکانہ کی وہ حدیث جس میں ہے: اس نے اپنی بیوی کو طلاقِ بتہ دی، ثابت نہیں۔ دوسری جگہ کہا: رکانہ کی البتہ والی حدیث کچھ حیثیت نہیں رکھتی، کیوں کہ ابن اسحاق اس کو داود بن حصین عن عکرمہ عن ابن عباس کی سند سے روایت کرتے ہیں کہ رکانہ نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیں۔ اہلِ مدینہ تین طلاقوں کو ''طلاقِ البتہ'' کہتے ہیں، امام احمد چونکہ امام شافعی کی موافقت میں تین طلاقوں کو جائز سمجھتے تھے، اس لیے انھوں نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث سے اعراض کیا۔ اس لیے یہ کہنا ممکن ہے کہ حدیثِ رکانہ منسوخ ہو، پھر جب ان کے سامنے یہ بات واضح ہوئی کہ قرآن وسنت میں تو صرف طلاقِ رجعی مباح ہے تو انھوں نے اس موقف سے رجوع کر لیا اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث سے استدلال نہ کیا، کیوں کہ انھوں نے اس کے خلاف فتویٰ دیا تھا۔ ان سے مروی ایک روایت میں ان کے نزدیک یہ علت بیان ہوئی ہے، لیکن دوسری روایت جس پر ان کے اصحاب کا عمل ہے وہ علت نہیں تو اس سے یہ لازم آئے گا کہ ان کا مذہب عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث پر عمل ہی ہو۔

وہ ائمہ مجتہدین جو بیک وقت کی تین طلاقوں کو موثر قرار دیتے ہیں، ان کے عذروں کی وضاحت ہو چکی ہے، مثلاً حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے جب دیکھا کہ لوگ کثرت سے ایک ہی وقت میں تین طلاقیں دینے کا حرام کام کر رہے ہیں اور سزا کے بغیر باز آنے والے نہیں تو انھوں نے اس کو بطور سزا موثر قرار دے دیا، تاکہ لوگ یہ کام نہ کریں، یا یہ عارضی نوعیت کی تعزیری سزا تھی جو وقت کی ضرورت کے پیشِ نظر نافذ کی گئی، جس طرح شراب نوش کو اسی کوڑے مارے جاتے، اس کا سر مونڈھ دیا جاتا اور اس کو جلا وطن کر دیا جاتا اور دوسری مثال یہ ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے غزوہ تبوک سے پیچھے رہنے والے تین صحابہ کو کچھ دنوں تک بیویوں سے علاحدہ ہونے کا حکم دیا۔ یا پھر یہ ان کا گمان تھا

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحدیث (۲۲۰۶) سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (۲۰۵۱) شیخ البانی رحمہ اللہ نے اسے ضعیف کہا ہے۔

کہ اس کو ایک قرار دینا کسی شرط کے ساتھ مشروط تھا جو زائل ہو چکی ہے، جس طرح حجِ تمتع کے متعلق ان کا مذہب تھا۔

اب کسی حکم کو موثر قرار دینا یا تو شارع کی طرف سے ہوتا ہے یا امام اور حاکمِ وقت کی طرف سے، شارع کا موثر قرار دینا حتمی ہوتا ہے اور امام کا موثر قرار دینا اجتہادی مسئلہ ہے۔ اگر بیک وقت کی تین طلاقیں موثر قرار نہ دی جائیں تو لوگ بیک وقت تین دینے کا حرام کام کریں گے، اس لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کو موثر قرار دینا سمجھا، کیوں کہ لوگوں نے نکاح کے بقا کے ساتھ اللہ اور اس کے رسول کی فرماں برداری کا خیال نہ کیا۔ مگر بہت سے صحابہ اور تابعین نے اس سے اختلاف کیا، یا وہ اس جیسی سزا کو تعزیر کے لیے مناسب نہیں سمجھتے تھے، یا اس لیے کہ شارع علیہ السلام نے اس جیسی سزا دی نہیں، یہ تو اس کے لیے ہے جو سزا کا مستحق ہو۔ مگر وہ جو لاعلمی یا تاویل کی وجہ سے تین طلاقیں دے دے تو وہ سزا کا مستحق نہیں، اس کے لیے تینوں کو موثر قرار دینا معقول نہیں، اور یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم جاری کیا تھا جو خاص حکم نہیں تھا، بلکہ عام تھا، جس طرح حجِ تمتع کی اجازت مطلق حکم تھا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ﴾ [النساء: ٥٩]

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ کا حکم مانو اور رسول کا حکم مانو اور ان کا بھی جو تم میں سے حکم دینے والے ہیں، پھر اگر تم کسی چیز میں جھگڑ پڑو تو اسے اللہ اور رسول کی طرف لوٹاؤ، اگر تم اللہ اور یومِ آخر پر ایمان رکھتے ہو، یہ بہتر ہے اور انجام کے لحاظ سے زیادہ اچھا ہے۔''

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اختلافی امور میں کتاب وسنت سے رجوع کرنے کا حکم دیا ہے۔ جس مسئلے میں سلف وخلف کا اختلاف ہو اسے کتاب وسنت کی طرف لوٹانا ضروری ہوتا ہے۔ کتاب وسنت میں ایسی کوئی دلیل نہیں جو ایک ہی لفظ میں یا مختلف الفاظ میں بیک وقت تین طلاقیں دینے والے کے لیے رجوع کے بغیر یا عقدِ جدید کے بغیر تین کو موثر قرار دے، بلکہ کتاب وسنت اسی طلاق کو موثر قرار دیتے ہیں جو شریعت میں جائز اور حلال ہے، شریعت کے سارے اصول کا اعتبار اور واضح قیاس اسی بات پر دلالت کرتا ہے، ہر وہ عقد (وہ عقدِ بیع ہو کہ عقدِ نکاح) جو کبھی مباح ہوتا ہے اور کبھی حرام، اگر حرام طریقے سے کیا جائے تو لازم اور نافذ نہیں ہوتا اور اگر حلال طریقے کے مطابق کیا جائے تو لازم اور نافذ ہوتا ہے۔

اس لیے مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ محارم سے نکاح اور عدت میں نکاح جو شریعت میں حرام ہیں، باطل اور غیر لازم ہوتے ہیں، اسی طرح شراب، خنزیر اور مردار جیسی حرام اشیا کی بیع اور خرید وفروخت بھی باطل اور غیر لازم ہوتی

ہے، مگر وہ کام جس کی جنس حرام ہو، جیسے ظہار، قذف، جھوٹ اور جھوٹی قسم وغیرہ یہ قابلِ سزا کام ہیں اور شریعت نے ان کی سزا مقرر کی ہے، یہ کام کبھی حلال اور کبھی حرام نہیں ہوتے کہ کبھی صحیح ہوں اور کبھی فاسد۔ جو کام ایک جانب سے حرام ہو اور دوسری جانب سے حلال ہو، مثلاً قیدی کو چھڑانا، ظالم کا ظلم روکنے یا واجب حق کی ادائی کے لیے رشوت دینا، وغیرہ اس میں مظلوم کے لیے وہ کام مباح ہوتا ہے، ظالم کے لیے نہیں۔

اگر طلاق کو اس نگاہ سے دیکھا جائے تو طلاق کسی صورت میں مباح ہوتی ہے اور کسی صورت میں حرام۔ اگر انسان اس کو اس طریقے سے دے جو حرام طریقہ ہو تو یہ لازم اور نافذ نہیں ہوگی، اگر صحیح طریقے کے مطابق دے تو لازم اور نافذ ہوگی، صحیحین میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«مَنْ عَمِلَ عَمَلًا لَيْسَ عَلَيْهِ أَمْرُنَا فَهُوَ رَدٌّ» [1]

''جس نے کوئی ایسا کام کیا جو ہمارے حکم کے مطابق نہیں تو وہ مردود ہے۔''

اور طلاق کے بارے میں یہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ ﴾ [البقرة: ٢٢٩]

''یہ طلاق (رجعی) دو بار ہے، پھر یا تو اچھے طریقے سے رکھ لینا ہے، یا نیکی کے ساتھ چھوڑ دینا ہے۔''

اس آیت میں بتایا کہ وہ طلاق جو اللہ نے مدخول بہا عورت کے لیے مشروع اور جائز قرار دی ہے وہ رجعی ہے، وہ دو مرتبہ ہے اور دو مرتبہ کے بعد یا تو ﴿ اِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ ﴾ معروف طریقے کے مطابق روکے رکھنا ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ اس سے رجوع کرے اور اس کو اپنی بیوی بنا کر رکھے، وہ ایک طلاق کے ساتھ اس کے ساتھ باقی رہے گی، یا پھر ﴿ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ ﴾ ہے، یعنی عدت پوری ہونے کے بعد اس کو چھوڑ دے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّوْنَهَا ۚ فَمَتِّعُوْهُنَّ وَسَرِّحُوْهُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا ۝ ﴾ [الأحزاب: ٤٩]

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! جب تم مومن عورتوں سے نکاح کرو، پھر انھیں طلاق دے دو، اس سے پہلے کہ تم انھیں ہاتھ لگاؤ تو تمھارے لیے ان پر کوئی عدت نہیں، جسے تم شمار کرو، سو انھیں سامان دو اور انھیں اچھے طریقے سے چھوڑ دو، اچھے طریقے سے چھوڑنا۔''

پھر اس کے بعد فرمایا:

[1] صحيح البخاري (٢/٧٥٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧١٨)

﴿وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْـًٔا اِلَّآ اَنْ يَّخَافَآ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۭ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۙ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ ۭ﴾ [البقرة: ۲۲۹]

''اور تمھارے لیے حلال نہیں کہ اس میں سے جو تم نے انھیں دیا ہے کچھ بھی لو، مگر یہ کہ وہ دونوں ڈریں کہ وہ اللہ کی حدیں قائم نہیں رکھیں گے۔ پھر اگر تم ڈرو کہ وہ دونوں اللہ کی حدیں قائم نہیں رکھیں گے تو ان دونوں پر اس میں کوئی گناہ نہیں جو عورت اپنی جان چھڑانے کے بدلے میں دے دے۔''

افتداء سے مراد خلع ہے، اللہ نے اس کو افتداء کہا ہے، جس کا مطلب ہے فدیہ دینا، جس طرح قیدی فدیہ دے کر اور غلام اپنے آقا کو فدیہ دے کر آزادی حاصل کرتا ہے اسی طرح عورت اپنے خاوند کو فدیہ دے کر اس سے آزادی حاصل کرتی ہے۔ ﴿فَاِنْ طَلَّقَهَا﴾ یعنی تیسری طلاق دے دے ﴿فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰي تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ۭ﴾، ﴿فَاِنْ طَلَّقَهَا﴾ اگر یہ دوسرا خاوند بھی طلاق دے دے ﴿فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ﴾ پھر اس عورت اور اس پہلے خاوند پر اکٹھا ہونے میں کوئی گناہ نہیں۔ ﴿اَنْ يَّتَرَاجَعَآ اِنْ ظَنَّآ اَنْ يُّقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۭ﴾ ایسے ہی اللہ نے دوسری جگہ فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاۗءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ وَاَحْصُوا الْعِدَّةَ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ رَبَّكُمْ ۚ لَا تُخْرِجُوْهُنَّ مِنْۢ بُيُوْتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ۭ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ۭ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ۭ لَا تَدْرِيْ لَعَلَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا ① فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ فَارِقُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ وَّاَشْهِدُوْا ذَوَيْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ وَاَقِيْمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ ۭ ذٰلِكُمْ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ڛ وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ② وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ۭ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَي اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ ۭ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا ③﴾ [الطلاق: ۱۔۳]

''اے نبی! جب تم عورتوں کو طلاق دو تو انھیں ان کی عدت کے وقت طلاق دو اور عدت کو گنو اور اللہ سے ڈرو جو تمھارا رب ہے، نہ تم انھیں ان کے گھروں سے نہ نکالو اور نہ وہ نکلیں مگر یہ کہ وہ کوئی کھلی بے حیائی (عمل میں) لائیں۔ اور یہ اللہ کی حدیں ہیں اور جو اللہ کی حدوں سے آگے بڑھے تو یقیناً اس نے اپنے آپ پر ظلم کیا۔ تو نہیں جانتا شاید اللہ اس کے بعد کوئی نئی بات پیدا کر دے۔ پھر جب وہ اپنی میعاد کو پہنچنے لگیں تو انھیں اچھے طریقے سے روک لو، یا اچھے طریقے سے ان سے جدا ہو جاؤ اور اپنوں میں سے دو صاحبِ عدل آدمی گواہ بنا لو اور شہادت اللہ کے لیے قائم کرو۔ یہ وہ (حکم) ہے جس سے اس شخص کو نصیحت کی جاتی ہے جو اللہ اور یومِ آخر پر ایمان رکھتا ہے اور جو اللہ سے ڈرے گا وہ اس کے لیے نکلنے کا

کوئی راستہ بنا دے گا۔ اور اسے رزق دے گا جہاں سے وہ گمان نہیں کرتا اور جو کوئی اللہ پر بھروسا کرے تو وہ اسے کافی ہے، بے شک اللہ اپنے کام کو پورا کرنے والا ہے، یقیناً اللہ نے ہر چیز کے لیے ایک اندازہ مقرر کیا ہے۔''

صحیح وسنن اور مسانید میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ انھوں نے حالتِ حیض میں اپنی بیوی کو طلاق دی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا تذکرہ کیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم طیش میں آ گئے اور ان سے کہا: اس کو اس سے مراجعت کا حکم دے، تاکہ وہ حیض سے فارغ ہو اور غسل کرے، اس کے بعد چاہے تو اس کو روک کے رکھے اور چاہے تو مجامعت سے پہلے طلاق دے دے۔ یہ وہ عدت ہے جس کے لیے اللہ نے عورتوں کو طلاق دینے کا حکم دیا ہے۔[1]

صحیح کی ایک روایت میں ہے: ''آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اپنی بیوی کو پاک یا حاملہ ہونے کی صورت میں طلاق دینے کا حکم دیا۔''[2] صحیح میں ایک روایت اس طرح ہے: ''نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی: ﴿ إِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ ﴾ [الطلاق: ۱].[3]

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور دیگر صحابہ سے مروی ہے: طلاق کی چار صورتیں ہیں جن میں دو صورتیں حلال ہیں اور دو حرام۔ دو حلال صورتیں یہ ہیں کہ آدمی جس طہر میں بیوی سے جماع نہ کرے اس میں طلاق دے، یا حاملہ ہو جائے اور اس کا حمل بالکل واضح ہو چکا ہو تو اس حالت میں طلاق دے۔ حرام دو صورتیں یہ ہیں کہ حالتِ حیض میں طلاق دے یا حالتِ طہر میں جماع کے بعد طلاق دے اور یہ معلوم نہ ہو کہ حمل ٹھہر چکا ہے یا نہیں۔ (رواه الدارقطني)

گذشتہ حدیثِ مبارک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان کیا ہے کہ اسی وقت طلاق دینا حلال اور جائز ہے جب بیوی حیض سے پاک ہو جائے اور خاوند نے مجامعت نہ کی ہو، یہی عدت کے لیے (یعنی استقبالِ عدت کے لیے) طلاق ہے، یا وہ طہر ہو گا یا عدت ہو گی۔ اگر عدت سے پہلے طلاق دے دی تو گویا اس وقت سے قبل طلاق دے دی جس میں اللہ تعالیٰ نے طلاق کی اجازت دی ہے اور عورت کو زیادہ انتظار کرنا پڑے گا، نیز عموماً حالتِ حیض میں دی گئی طلاق بلاضرورت ہی ہوتی ہے۔ طلاق اصل میں اللہ کو ناپسند ہے، مگر حلال ہے، اس لیے یہ ضرورت کے وقت ہی مباح ہے، جس طرح دیگر حرام اشیا ضرورت کے وقت مباح ہو جاتی ہیں، اس لیے یہ تیسری طلاق کے بعد عورت کو مرد پر حرام کر دیتی ہے، تا آنکہ وہ کسی دوسرے شخص سے شادی کرے، یہ درحقیقت سزا کے طور پر ہے، تاکہ انسان کثرتِ طلاق سے

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٩٥٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٧١)
[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٧١)
[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٧١)

باز آ جائے، چنانچہ جب آدمی اپنی بیوی کو طلاق دیتا ہے تو وہ تین حیض تک عدت میں رہتی ہے اور انتظار کرتی ہے، وہ اس کا مالک ہوتا ہے اور اس حالت میں اگر ایک فریق فوت ہو جائے تو دوسرا اس کا وارث بھی بنتا ہے، اس لیے طلاق کا جو وقت ہے اس وقت سے جلدی کرنے میں مرد کو کوئی فائدہ نہیں ہوتا، جس طرح امام سے پہلے رکوع و سجود کرنے والے کو کوئی فائدہ نہیں ہوتا، بلکہ اس کا یہ فعل شمار ہی نہیں ہوتا اور اگر جان بوجھ کر ایسا کرے تو اس کی نماز ضائع اور باطل ہو جاتی ہے، لیکن اس کے باوجود وہ امام کے سلام پھیرنے تک نماز ہی میں رہتا ہے، اس سے باہر نہیں نکل سکتا۔

بنا بریں اکثر علما نے حالتِ حیض میں خلع لینے کو جائز کہا ہے، کیوں کہ خلع فقہائے حدیث کے مذہب کے مطابق طلاق نہیں، بلکہ فرقہ بائنہ (حتمی جدائی) ہے، جس میں عورت ایک قول کے مطابق ایک ہی حیض کے ساتھ استبرائے رحم کر لیتی ہے اور اس پر عدت نہیں، نیز وہ خلع لے کر اپنی مالک خود بن جاتی ہے اور حتمی جدائی میں وقت سے پہلے جلدی کر کے اس شر کے خاتمے کا فائدہ حاصل کر سکتی ہے جو ان دونوں کے درمیان موجود تھا، لیکن رجعی طلاق میں اس کے وقت سے پہلے حتمی جدائی حاصل کرنے میں جلدی کرنے میں کوئی فائدہ نہیں، بلکہ وہ بھلائی سے خالی شر ہی شر ہے، بلکہ کہا جاتا ہے کہ حالتِ حیض میں دی گئی طلاق ایسے وقت میں طلاق ہے جب مرد کو عورت میں دلچسپی نہیں ہوتی، یہ ضرورت نہیں ہوتی، لیکن جس وقت مرد کو عورت کی ضرورت ہو اور وہ اس میں دلچسپی رکھتا ہو اس وقت کی طلاق بلاضرورت نہیں ہوتی۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جو عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے لیے کہا تھا: «مُرْهُ فَلْيُرَاجِعْهَا» ''اس کو اس سے مراجعت کرنے کا حکم دے'' فقہا نے اس سے رسول اللہ ﷺ کی مراد کو سمجھنے میں اختلاف کیا ہے۔

کچھ علما یہ سمجھے ہیں کہ طلاق موثر ہو گئی تھی اور آپ ﷺ نے ان کو رجوع کا حکم دیا، پھر طہر میں ان کو طلاق دینے یا نہ دینے کا اختیار دیا، اس قول کے قائلین کے ہاں یہ اختلاف ہوا ہے کہ کیا رجوع کرنا واجب ہے یا مستحب؟ نیز کیا وہ پہلے طہر میں طلاق دے گا یا دوسرے میں؟ مزید اس نہی اور ممانعت کی حکمت کیا ہے؟

دوسرا گروہ یہ سمجھا ہے کہ طلاق واقع نہیں ہوئی تھی، لیکن عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بدنی طور پر اپنی عورت سے علاحدہ ہو گئے اور چونکہ جب بندہ اپنی بیوی کو طلاق دیتا ہے تو عموماً اور عرفاً بدنی طور پر اس سے علاحدہ ہو جاتا ہے اور عورت بھی بدنی طور پر اس سے جدا ہو جاتی ہے، اس لیے آپ ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا: «مُرْهُ فَلْيُرَاجِعْهَا» اس کو حکم دے وہ ایک دوسرے سے رجوع کر لیں۔ یہاں آپ ﷺ نے ''فلیر تجعها'' کا لفظ نہیں بولا جس سے یک طرفی رجوع ہوتا ہے، بلکہ ''مراجعه'' بولا جس میں دونوں اطراف سے رجوع ہوتا ہے، یعنی وہ اپنے بدن کے ساتھ ان کی طرف لوٹے اور وہ بھی اس سے بدنی رجوع کریں اور جس طرح پہلے اکٹھے تھے اسی طرح اکٹھے ہو جائیں، کیوں کہ طلاق موثر نہیں ہوئی تھی، جب وہ وقت آ جائے گا، جس میں اللہ تعالیٰ نے طلاق دینا مباح اور جائز رکھا ہے

اس وقت اگر چاہے تو طلاق دے لے اور چاہے تو نہ دے۔

ان علما کا کہنا ہے کہ اگر طلاق موثر ہو چکی ہوتی تو رجوع کرنے کا حکم دے کر دوبارہ دوسری طلاق دینے میں کوئی فائدہ نہیں تھا، بلکہ دونوں کا نقصان تھا، وہ نص اور اجماع کی روشنی میں رجوع کے بعد طلاق دیتے اور پہلی طلاق کے ساتھ دوسری طلاق دے کر ایک تو طلاق میں تکثیر کا باعث بنتے اور دوسرے عدت دراز ہو جاتی اور تیسرے نمبر پر میاں بیوی دونوں کو اذیت برداشت کرنا پڑتی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لیے طلاق سے پہلے مباشرت لازم قرار نہیں دی تھی، بلکہ اگر وہ مباشرت کر لیتے تو ان کو طلاق دینے کے لیے حمل کے واضح ہونے یا دوسرے طہر کا انتظار کرنا پڑتا، اس لیے ائمہ اربعہ اور کسی بھی معتبر مجتہد نے مباشرت لازمی قرار نہیں دی، لیکن طلاق کو دوسرے طہر تک موخر رکھنا پڑتا۔ اگر انھوں نے اس کو پہلے طلاق نہ دی ہوتی تو وہ اس کو پہلے طہر میں طلاق دیتے، کیوں کہ اگر پہلے طہر میں ان کے لیے طلاق مباح تھی تو اس کو روکے رکھنے میں کوئی ایسا فائدہ نہیں تھا جو نکاح سے مقصود ہوتا ہے، بلکہ وہ اس کو صرف طلاق دینے کے لیے روکے رکھتے، کیوں کہ اگر پہلے طہر میں آپ نے طلاق دینے کا ارادہ کر لیا تھا تو اس سے ان دونوں کو نقصان ہی زیادہ ہونا تھا فائدہ نہیں اور شارع ایسا حکم نہیں دیتا۔ اگر وہ پہلے طہر میں طلاق دینے کا اردہ نہیں رکھتا تھا تو مجامعت پر قادر ہو، تاکہ جس کے بعد طلاق نہیں دی جاتی، اگر اس نے مجامعت نہیں کی، یا مجامعت کی اور اس کے بعد اس کو حیض آ گیا تو اب وہ اس کو طلاق دے سکتا ہے، کیوں کہ اگر اس نے پہلے طہر میں مجامعت نہیں کی، پھر دوسرے طہر میں طلاق دے دی تو معلوم ہوا کہ وہ اس کو طلاق دینے کی ضرورت رکھتا تھا، کیوں کہ اس کو اس میں رغبت نہیں، اگر رغبت ہوتی تو پہلے طہر میں جماع کر لیتا۔

ان کا کہنا ہے: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو رجوع کرنے پر گواہ مقرر کرنے کا حکم نہیں دیا تھا جو شریعت کا حکم ہے، اگر طلاق ہو چکی ہوتی اور عبداللہ بن عمر رجوع کرتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو گواہ مقرر کرنے کا حکم دیتے، نیز اللہ نے جہاں طلاق کا ذکر کیا ہے وہاں کسی کو بھی طلاق کے فوراً بعد رجوع کرنے کا حکم نہیں دیا، بلکہ فرمایا:

﴿ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ ﴾ [البقرۃ: ۲۳۱]

''پس وہ اپنی عدت کو پہنچ جائیں تو انھیں اچھے طریقے سے رکھ لو، یا انھیں اچھے طریقے سے چھوڑ دو۔''

یہاں خاوند کو اختیار دیا کہ جب عدت ختم ہونے کے قریب آ جائے تو وہ یا معروف طریقے سے اس کو روک لے رجوع کی صورت میں یا عدت ختم ہونے پر اس کو چھوڑ دے اور عدت ختم ہونے کے بعد محبوس نہ رکھے جس طرح وہ عدت ختم ہونے سے پہلے محبوس تھی، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ لَا تُخْرِجُوْهُنَّ مِنْ بُيُوْتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ﴾ [الطلاق:١]

''نہ تم انھیں ان کے گھروں سے نکالو اور نہ وہ نکلیں مگر یہ کہ وہ کوئی کھلی بے حیائی (عمل میں) لائیں۔''

نیز اگر حرام طلاق موثر ہو چکی ہوتی تو وہ فساد رونما اور وجود پذیر ہوتا جو اللہ اور اس کے رسول کو ناپسند ہے، وہ فساد اس رجوع سے زائل نہیں ہوسکتا، جس کے بعد طلاق مباح ہو اور بے فائدہ رجوع کا حکم اللہ اور اس کے رسول سے بعید ہے، اگر مرد عورت میں رغبت رکھتا ہو تو وہ اس سے رجوع کرے گا، اگر رغبت نہ رکھتا ہو تو ان کو رجوع کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ جب اس نے لازماً طلاق دینی ہو، پھر اس کو رجوع کا حکم دینا شرعی مصلحت کا تقاضا نہیں، بلکہ باعثِ مفسدت ہے اور رسول اللہ ﷺ کو ایسا حکم دینے سے منزّہ اقرار دینا ضروری ہے، جو زیادہ فساد کا باعث ہو۔ اللہ اور رسول نے فساد روکنے کے لیے غیر شرعی طلاق سے منع کیا ہے، لہٰذا یہ کس طرح ہوسکتا ہے کہ آپ ﷺ ایسا حکم دیں جو زیادہ فساد کا باعث اور مستلزم ہو؟

اس دوسرے گروہ کا قول اصول اور نصوص سے زیادہ قریب ہے، کیوں کہ سلف صالحین اور فقہا کے ہاں اصل اور قاعدہ ہے کہ جب عبادات اور حرام معاملات (عقود) کو حرام طریقے کے مطابق ادا کیا جائے تو وہ موثر اور صحیح نہیں ہوتے، گو یہاں کچھ متکلمین نے اختلاف کیا ہے، مگر صحیح موقف ائمہ فقہا اور سلف ہی کا ہے، کیوں کہ صحابہ اور تابعین ایسی عبادات اور سزا کو فاسد قرار دیتے تھے، جن کو شارع نے حرام کیا ہے اور یہ ان سے متواتر منقول ہے۔

نیز اگر شارع کا کسی کام کو حرام قرار دینا اس کے فاسد ہونے کی دلیل نہ ہوتا تو شارع علیہ السلام فاسد سے الگ کر کے صحیح کو بیان نہ کرتے۔ جو علمائے اصول کہتے ہیں: ''نہی فاسد ہونے کا تقاضا نہیں کرتی۔'' وہ کہتے ہیں کہ ہم عبادات اور عقود (معاملات) کی صحت اور فساد کا علم شارع کا کسی چیز کو اس کے لیے شرط قرار دینے یا مانع مقرر کرنے سے معلوم کرتے ہیں۔ یاد رہے کہ کسی معاملے کے بارے میں یہ کہنا کہ یہ صحیح ہے یا یہ صحیح نہیں، وضعی اور اخباری خطاب ہے، اللہ اور اس کے رسول کے کلام میں اس طرح کے الفاظ نہیں، مثلاً کہنا: ''طہارت نماز کے لیے شرط ہے''، ''کفر نماز کی صحت میں مانع ہے''، ''یہ عقد یا یہ عبادت صحیح نہیں'' وغیرہ وغیرہ۔ رسول اللہ ﷺ کے کلام میں آپ کو امر و نہی اور تحلیل و تحریم ملیں گے، اگر کوئی عمل اللہ تعالیٰ کو قبول نہیں یا وہ مناسب اور صالح نہیں تو اس کے متعلق یہ الفاظ ملیں گے:

«لَا يَقْبَلُ اللّٰهُ صَلَاةً بِغَيْرِ طُهُوْرٍ وَلَا صَدَقَةً مِنْ غُلُوْلٍ» [1]

''اللہ بے طہارت نماز اور خیانت کے مال سے صدقہ کرنا قبول نہیں کرتا۔''

کسی معاملے کے متعلق آپ نے یہ الفاظ استعمال کیے ہیں:

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٢٤)

«هَذَا لَا يَصْلُحُ »[1] ''یہ غیر صالح یا غیر مناسب ہے۔''

اور کسی کے متعلق اس طرح کے الفاظ:

«إِنَّ اللّٰهَ يَكْرَهُ كَذَا »[2] ''اللہ تعالیٰ فلاں معاملہ ناپسند کرتے ہیں۔''

اسی طرح آپ ﷺ کے کلام میں «وعد» بھی ملے گا تو اس طرح کی عبارتوں سے ہم صرف اس کی صحت و فساد اخذ کر سکتے ہیں جس کا ذکر ہوا ہو، لیکن اس سے لازم نہیں آتا کہ شارع نے اس کو بیان کیا ہو۔

مزید برآں شارع کسی چیز کو اس وقت حرام کرتا ہے جب اس میں خالص مفسدت ہو یا راجح ہو اور تحریم سے مقصود اس فساد سے روکنا اور اس کا خاتمہ کرنا ہوتا ہے۔ اگر تحریم کے ساتھ بھی اس پر ایسے احکام مرتب ہوتے ہوں جو حلال پر مرتب ہوتے ہیں اور اس کو حلال کی طرح نافذ اور موثر قرار دے دیا جائے تو اس سے اسی فساد کو لازم کرنا لازم آئے گا جس کا خاتمہ کرنا مقصود تھا اور یہ بھی لازم آئے گا کہ شارع نے جس فساد کو ختم کرنا چاہا لوگوں کو اسی کا پابند بھی بنا دیا ہے۔ یہ تناقض ہے اور شارع علیہ السلام اس سے پاک ہیں۔

تین طلاقوں کو ایک شمار کرنے والے کچھ علما یہ کہتے ہیں کہ بیک وقت تین طلاقیں دینا اس لیے حرام ہے، تاکہ طلاق دینے والا نادم نہ ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر اس نے یہ کام کیا تو لازماً نادم ہوگا اور یہی اس کے صحیح ہونے کا تقاضا کرتا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ پھر تو ہر وہ کام جو اللہ نے منع کیا ہے، صحیح ہوگا، مثلاً ایک ساتھ پھوپھی اور بھتیجی کو نکاح میں رکھنا، تاکہ قطع رحمی کا سبب نہ بنے، کیوں اگر یہ بات (نہی فساد کا تقاضا نہیں کرتی) صحیح ہے تو یہ عقد (یعنی ایک وقت میں پھوپھی اور بھتیجی کے ساتھ نکاح کرنا) صحیح ہوگا، کیوں کہ اگر فاسد ہوتا تو قطع رحمی حاصل نہ ہوتی، مگر یہ بات جہالت پر مبنی ہے، کیوں کہ شارع علیہ السلام نے اس سے ممانعت کی حکمت بیان کی ہے، اگر یہ جائز ہوتا تو وہ فساد لازم آتا، جس کی طرف اشارہ کیا ہے تو اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانا:

﴿لَا تَدْرِىْ لَعَلَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا﴾ [الطلاق: ١]

''تو نہیں جانتا شاید اللہ اس کے بعد کوئی نئی بات پیدا کر دے۔''

اور رسول اللہ ﷺ کا فرمان:

«لَا تُنْكَحُ الْمَرْأَةُ عَلىٰ عَمَّتِهَا وَلَا خَالَتِهَا فَإِنَّكُمْ إِذَا فَعَلْتُمْ قَطَعْتُمْ أَرْحَامَكُمْ »[3]

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٢٤)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٤٠٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٩٣)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٨١٩۔ ٤٨٢١) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٠٨) مگر "فانكم إذا فعلتم ... الخ" کے الفاظ المعجم الكبير (٣٣٧/١١) میں ہیں۔

''بیوی کی پھوپھی یا خالہ سے نکاح نہ کیا جائے، اگر تم نے ایسا کیا تو تم نے اپنے ارحام (اقارب) سے لاتعلقی کر لی۔''

وغیرہ بیان کرتے ہیں کہ اگر یہ کام جائز ہوتا تو وہ فساد وجود میں آتا جس کی طرف اشارہ ہوا ہے، اس لیے اس فساد اور خرابی سے روکنے کے لیے اس کام کو حرام کر دیا گیا۔ مزید برآں جب حرام اور منع کو کوئی شخص مباح سمجھتے ہوئے یا صحیح خیال کرتے ہوئے کرتا ہے تو اس کی اباحت اور ارتکاب سے فساد جنم لیتا ہے۔ اگر فاعل اس کے حرام اور باطل ہونے کا عقیدہ رکھتا ہو اور اللہ اور اس کے رسول کے حکم کی پابندی کرتا ہو تو پھر وہ مفسدت اور خرابی پیدا نہیں ہوتی، بلکہ خرابی اور مفسدت اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی سے پیدا ہوتی ہے اور ان مفاسد کی کئی شکلیں ہیں جو فتنے، ابتلا اور عذاب کی صورت میں رونما ہوتی ہیں، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَلْيَحْذَرِ الَّذِينَ يُخَالِفُونَ عَنْ أَمْرِهِ أَن تُصِيبَهُمْ فِتْنَةٌ أَوْ يُصِيبَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴾ [النور: ٦٣]

''سو لازم ہے کہ وہ لوگ ڈریں جو اس کا حکم ماننے سے پیچھے رہتے ہیں کہ انھیں کوئی فتنہ نہ آ پہنچے، یا انھیں دردناک عذاب آ پہنچے۔''

اگر کوئی کہے کہ اگر طلاق غیر موثر ہو تو فساد اور خرابی لازم نہیں آئے گی، تو بات یہ ہے کہ یہی شارع علیہ السلام کا مقصود ہے، اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع کر دیا اور اس کو باطل قرار دیا، تا کہ اس کا فساد زائل ہو جائے، اگر ایسا نہ ہوتا تو لوگ یہ کرتے اور اس کو صحیح سمجھتے جس سے فساد لازم آتا۔

معلوم ہوا ان علما کے پاس کوئی حجت اور دلیل نہیں، درست موقف سلف صالحین اور ائمہ فقہا ہی کا ہے۔ جن مشہور علما نے بعض جگہوں پر اس قاعدے کی مخالفت کی ہے، اگر ان کے پاس اس کا صحیح جواب نہیں تو وہ تناقض کا شکار ہوئے ہیں۔ وہ اصول جن میں تناقض نہیں ہوتا، وہ ہوتے ہیں جو نص سے ثابت ہوں یا اجماع سے، ان کے علاوہ اصول کا جو مصدر بھی ہو، اس میں تناقض کا امکان موجود رہتا ہے اور وہ کسی کے خلاف دلیل نہیں ہوتا۔ صحیح قیاس جو تناقض سے خالی ہو، وہی ہوتا ہے جو نص اور اجماع کے مطابق ہو، بلکہ ضروری ہے کہ نص نے حکم پر دلالت کی ہو۔

عصمت کا یہی معنی ہے، معصوم کے کلام میں تناقض نہیں ہوتا اور مسلمانوں میں اس بات پر کوئی اختلاف نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب کا جو حکم بھی بندوں تک پہنچایا ہے اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم معصوم ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو جو شرعی احکام دیے ہیں ان سب میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہر طرح کی خطا سے معصوم ہیں۔ اسی طرح امت بھی گمراہی پر اکٹھی نہیں ہو سکتی۔ اس بنا پر ائمہ دین کا مذہب رہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا ہر ایک کی بات قبول بھی کی جا سکتی ہے اور رد بھی کی جا سکتی ہے، اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے تمام لوگوں پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا، آپ کی فرماں برداری کرنا،

آپ کے حلال کیے کو حلال سمجھنا اور حرام کردہ کو حرام سمجھنا فرض کیا ہے، اسی طرح آپ ہی کے ذریعے مومن و کافر، جنتی و جہنمی اور گمراہ و ہدایت یافتہ کے مابین فرق کیا ہے۔ مومن اہلِ جنت اور اہلِ رشد و ہدایت ہیں اور وہ آپ ﷺ کے پیروکار ہیں، کافر اہلِ جہنم، اہلِ گمراہی و کج روی ہیں اور وہ آپ ﷺ کے پیروکار نہیں۔ جو ظاہر اور باطن میں آپ ﷺ پر ایمان رکھتا ہے اور آپ ﷺ کی پیروی کی پوری کوشش کرتا ہے وہ مومن اور نیک بخت ہے، چاہے وہ بعض احکام میں ناسمجھی یا لاعلمی کی وجہ سے غلطی کرے۔ اللہ تعالیٰ نے مومنوں کے متعلق فرمایا ہے:

﴿ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ﴾ [البقرة: ٢٨٦]

''اے ہمارے رب! ہم سے مؤاخذہ نہ کر اگر ہم بھول جائیں یا خطا کر جائیں۔''

صحیح بخاری میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اس آیت کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے کہا: ((قَدْ فَعَلْتُ))

''میں اس پر ان کا مواخذہ نہیں کروں گا۔''[1]

سنن میں حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''علما، انبیا کے وارث ہیں، انبیا نے درہم و دینار کی وراثت نہیں چھوڑی، بلکہ علم کی میراث چھوڑی ہے، جس نے اس میراث سے کچھ لے لیا، اس نے اس سے وافر حصہ لے لیا۔''[2]

ارشادِ باری عزوجل ہے:

﴿ وَدَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ اِذْ يَحْكُمٰنِ فِي الْحَرْثِ اِذْ نَفَشَتْ فِيْهِ غَنَمُ الْقَوْمِ وَكُنَّا لِحُكْمِهِمْ شٰهِدِيْنَ ۝ فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ وَكُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّعِلْمًا ﴾ [الأنبياء: ٧٨، ٧٩]

''اور داؤد اور سلیمان کو، جب وہ کھیتی کے بارے میں فیصلہ کر رہے تھے، جب اس میں لوگوں کی بکریاں رات چر گئیں اور ہم ان کے فیصلے کے وقت حاضر تھے۔ تو ہم نے وہ (فیصلہ) سلیمان کو سمجھا دیا اور ہم نے ہر ایک کو حکم اور علم عطا کیا۔''

اس آیت میں اللہ نے تعریف دونوں نبیوں کی کی ہے، مگر تفہیم کے لیے ایک کو خاص کیا، اس لیے اگر اللہ تعالیٰ کسی ایک بندے کو کسی چیز کے علم کے لیے خاص کر لے تو اس سے اس عالم کی مذمت نہیں نکلتی جس کو اس کا علم نہ ہو، بلکہ ہر کوئی اپنی اپنی استطاعت کے مطابق اللہ سے ڈرتا اور پرہیز گاری اختیار کرتا ہے اور وہ اللہ کے پرہیز گار اولیا میں شامل ہے، گو اس پر دین کے کسی معاملے کا فہم مخفی رہے اور دوسرے کو اس کا علم ہو جائے۔ حضرت واثلہ بن اسقع کا قول ہے (کچھ اس کو مرفوع بھی کہتے ہیں) جس نے علم طلب کیا اور اسے پا لیا، اس کو دو اجر ملیں گے، مگر جس نے علم تو

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٢٦)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٦٤١) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٦٨٢) صحيح الجامع، رقم الحديث (٦١٧٣)

طلب کیا، لیکن پا نہ سکا اس کو ایک اجر ملے گا۔ یہ قول صحیح بخاری میں حضرت عمرو بن عاص اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما کی اس حدیث کے ہم آہنگ ہے، جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب حاکم (فیصلہ کرنے والا) اجتہاد (پوری محنت) کرے اور درست فیصلہ کرے تو اس کو دو اجر ملیں گے اور جب حاکم اجتہاد کرے مگر غلطی کرے تو اس کو ایک اجر ملے گا۔''[1]

ان اصول کی تفصیل کسی دوسری جگہ گزر چکی ہے، یہاں صرف تنبیہ کرنا مقصود تھا، کیوں کہ اکثر لوگ کہتے ہیں حرام طلاق موثر ہوتی ہے اور سلف صالحین، ائمہ فقہا اور جمہور علما تسلیم کرتے ہیں کہ نہی فساد کا تقاضا کرتی ہے، مگر اس صورت میں عذر پیش کرنے میں کوئی صحیح فرق ذکر نہیں کرتے، جن علما نے نہی کے تقاضائے فساد کرنے میں ان سے اختلاف کیا ہے، انھوں نے ان کے خلاف یہی صورت پیش کی ہے، تاہم یہ ایک جدلیاتی حجت ہے جو اس قول کی صحت کی دلیل نہیں بنتی، بلکہ اس سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ اس صورت میں فریقِ اول سے غلطی ہوئی ہے، کیوں کہ یہ وہ عظیم الشان قاعدہ ہے جس پر بہت سے شرعی احکام کا دار و مدار ہے، اس کو کسی ایسے عالم کے قول سے نہیں توڑا جا سکتا جس کے پاس نص یا اجماع کی کوئی دلیل نہ ہو۔

کتاب و سنت میں تدبر کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حرام طلاق یک لخت جائز ہی نہیں کی، طلاقِ بائن دخول سے پہلے ہے یا عدت ختم ہونے کے بعد۔

یہاں کچھ علما تین طلاقوں کو ایک شمار کرنے والے علما پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ ایسا کرنا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مخالفت ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں اسی پر عمل ہوتا رہا، بلکہ کچھ تو اس کو اجماع بھی کہتے ہیں، ایسے علما سے کہا جائے گا کہ تم لوگ جو اس مسئلے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اتباع کا دعویٰ کرتے ہو، حلالہ کے مسئلے میں ان سے اختلاف کرتے ہو جس کی حرمت پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اتفاق بھی تھا اور کتاب و سنت بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ثابت ہے کہ انھوں نے اعلان کیا تھا۔ میرے پاس حلالہ کرنے اور کروانے والے کو لایا گیا تو میں ان دونوں کو رجم کر دوں گا۔ حضرت عثمان، علی، عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن عباس اور عبداللہ بن عمر وغیرہم کا یہی مسلک تھا، بلکہ کسی صحابی سے ثابت نہیں کہ اس نے کسی عورت کو نکاحِ حلالہ کے ذریعے اس کے خاوند کے پاس لوٹایا ہو۔ یہاں کتاب وسنت اور سارے صحابہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہیں، مگر کچھ علما نے اجتہاد کرتے ہوئے ان کی مخالفت کی ہے، اللہ سب علمائے اسلام پر راضی ہے۔ نیز حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ایسے بہت سے مسائل منقول ہیں جن کی دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے مخالفت کی ہے، مثلاً حلیہ و بریہ کو رجعی طلاق قرار دینا، گم شدہ شخص واپس آنے پر دیکھے کہ اس کی بیوی نے کسی سے شادی کر لی ہے تو

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٩١٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧١٦)

اس کو بیوی واپس لینے یا مہر واپس لینے میں اختیار دینا، زبردستی فتح کی گئی سرزمین کی تقسیم کا معاملہ وغیرہ وغیرہ مگر وہ اصل اور قاعدہ جس پر علما کا اتفاق ہے وہ یہ ہے کہ اختلافی مسائل کو کتاب و سنت پر پیش کیا جائے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ١ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ١ؕ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِيْلًا۠ ﴾ [النساء: ٥٩]

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ کا حکم مانو اور رسول کا حکم مانو اور ان کا بھی جو تم میں سے حکم دینے والے ہیں، پھر اگر تم کسی چیز میں جھگڑ پڑو تو اسے اللہ اور رسول کی طرف لوٹاؤ، اگر تم اللہ اور یومِ آخر پر ایمان رکھتے ہو، یہ بہتر ہے اور انجام کے لحاظ سے زیادہ اچھا ہے۔''

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں یہ گمان کرنا کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کے بعد آپ ﷺ کی شریعت کے خلاف اتفاق کر لیا تھا، بالکل ناروا ہے، بلکہ یہ ملحدوں کی بات ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے جس کو شریعت کا حکم قرار دے دیا ہو، آپ ﷺ کے بعد کسی کے اجماع کے ذریعے اسے منسوخ کرنے کا دعویٰ غلط اور ناجائز ہے جس طرح کچھ مغالطہ کھانے والے گروہوں کا کہنا ہے، بلکہ جس مسئلے پر امت اجماع کر لے، اس کا رسول اللہ ﷺ کی پیش کردہ شریعت کے مطابق ہونا ضروری ہے، وہ اس کے مخالف نہیں ہوسکتا، بلکہ ہر وہ نص جو امت کے اجماع کے ساتھ منسوخ ہو، امت کے پاس اس کی ناسخ نص کا ہونا ضروری ہے۔ امت نے جس طرح منسوخ نص محفوظ کی ہے، اسی طرح ناسخ نص بھی محفوظ کی ہے۔ مزید برآں امت کے ہاں ناسخ کی حفاظت کرنا منسوخ کی حفاظت سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے، اس لیے یہ ناممکن ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے رسول اللہ ﷺ کی نص کے خلاف پر اجماع کر لیا ہو، لیکن اجتہاد کی گنجایش موجود ہے۔ چنانچہ اگر ایک اجتہاد کرتا ہے تو کوئی دوسرا اس کی مخالفت کرنے والا بھی ہوسکتا ہے، یہ بہت سے مسائل میں موجود ہے اور زیرِ بحث مسئلہ بھی انہی میں شامل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ رائے دی کہ جس عورت کو طلاقِ بتہ ہو جائے وہ رہایش اور نان ونفقہ کا حق رکھتی ہے، ان کے گمان کے مطابق قرآن سے یہی ثابت ہوتا تھا، مگر اکثر صحابہ نے ان سے اختلاف کیا، ان میں سے کچھ کے نزدیک اس کے لیے صرف رہایش ہے اور کچھ کے نزدیک نہ نفقہ نہ رہایش، کچھ بھی نہیں۔ ان صحابہ میں عبداللہ بن عباس، جابر اور فاطمہ بنت قیس شامل ہیں۔ فاطمہ بنت قیس ہی نے رسول اللہ ﷺ سے یہ نقل کیا کہ آپ ﷺ نے اس سے کہا تھا: ''تیرے لیے نفقہ ہے نہ رہایش۔''[1] جب اوروں نے اس کے خلاف حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی یہ دلیل دی کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٨٠)

﴿ لَا تُخْرِجُوْهُنَّ مِنْۢ بُيُوْتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ﴾ [الطلاق:۱]

''نہ تم انھیں ان کے گھروں سے نکالو اور نہ وہ نکلیں مگر یہ کہ وہ کوئی کھلی بے حیائی (عمل میں) لائیں۔''

تو حضرت فاطمہ، عبداللہ بن عباس اور جابر وغیرہما رضی اللہ عنہم نے اس کا جواب دیا کہ یہ آیت رجعی کے متعلق ہے، کیوں کہ اللہ نے فرمایا ہے:

﴿ لَا تَدْرِيْ لَعَلَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا ﴾ [الطلاق:۱]

''تو نہیں جانتا شاید اللہ اس کے بعد کوئی نئی بات پیدا کر دے۔''

جب تین طلاقیں ہو جائیں تو اس کے بعد کون سا نیا امر آئے گا؟ امام احمد جیسے فقہائے حدیث اس مسئلے میں فاطمہ بنت قیس کے ساتھ ہیں۔

نیز اس آیت: ﴿ لَعَلَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا ﴾ کی تفسیر میں بہت سے صحابہ، تابعین اور علما سے منقول ہے کہ یہ آیت اس کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں جس طلاق کا ذکر کیا ہے وہ طلاقِ رجعی ہے۔ اگر تین طلاقیں لازم اور موثر کر دی جائیں تو طلاق دینے والا یہ کام کر کے نادم ہوتا اور اس کے پاس رجوع کی گنجایش نہ ہوتی، جس سے اس کو ضرر لاحق ہوتا، اللہ تعالیٰ تو بندوں کو اس کام کا حکم دیتے ہیں جو ان کے لیے نفع مند ہو اور اس سے منع کرتے ہیں جس میں ان کے لیے نقصان اور ضرر ہو، اس لیے اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ فَارِقُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ ﴾ [الطلاق:۲]

''پھر جب وہ اپنی میعاد کو پہنچنے لگیں تو انھیں اچھے طریقے سے روک لو، یا اچھے طریقے سے ان سے جدا ہو جاؤ۔''

اور یہ رجعی طلاق ہی میں ہوتا ہے، تین طلاقوں اور بائن میں نہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَّاَشْهِدُوْا ذَوَيْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ وَاَقِيْمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ ﴾ [الطلاق:۲]

''اور اپنوں میں سے دو صاحبِ عدل آدمی گواہ بنا لو اور شہادت اللہ کے لیے قائم کرو۔''

یہاں رجوع کرنے پر گواہ مقرر کرنے کا حکم دیا اور اس پر گواہ مقرر کرنا بالاتفاق مامور بہ ہے، کچھ اسے واجب کہتے ہیں اور کچھ مستحب۔

کچھ لوگوں نے اس سے سمجھ لیا ہے کہ گواہ طلاق دینے پر مقرر کرنا ہے، وہ طلاق جس پر گواہ مقرر نہ کیے جائیں، واقع نہیں ہوتی، یہ اجماع اور کتاب و سنت کے خلاف بات ہے، کسی مشہور عالم نے یہ نہیں کہا۔ اللہ تعالیٰ نے پہلے طلاق کی اجازت دی، لیکن اس میں گواہ مقرر کرنے کا حکم نہیں دیا، گواہ مقرر کرنے کا حکم اس وقت دیا جب یہ کہا:

﴿ فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ فَارِقُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ ﴾ [الطلاق:۲]

"پھر جب وہ اپنی میعاد کو پہنچنے لگیں تو انھیں اچھے طریقے سے روک لو، یا اچھے طریقے سے ان سے جدا ہو جاؤ۔"

یہاں مفارقت سے مراد عدت ختم ہونے کے بعد عورت کا راستہ چھوڑ دینا اور اس کو علاحدہ کر دینا ہے، یہ طلاق ہے، نہ رجعت اور نہ نکاح۔ یہاں گواہ مقرر کرنا بالاتفاق مشروع ہے۔ لہٰذا معلوم ہوا یہ گواہ مقرر کرنا رجوع کرنے پر ہے، اس کی حکمت یہ ہے کہ انسان ممکن ہے طلاق دے کر رجوع کر لے، شیطان کے وسوسے پر اس کو چھپائے رکھے، پھر اس کے بعد طلاق دے دے، جو حرام طلاق ہوگی اور کسی کو پتا نہ چلے، ایسی حالت میں عورت کا اس کے ساتھ رہنا حرام ہوگا، اس لیے اللہ نے رجوع پر گواہ مقرر کرنے کا حکم دیا ہے، تاکہ سب کو علم ہو جائے کہ ایک طلاق ہو چکی ہے، جس طرح رسول اللہ ﷺ نے گم شدہ چیز اٹھانے والے کو اس پر گواہ مقرر کرنے کا حکم دیا ہے، تاکہ شیطان اس کے دل میں اس کو چھپانے کا خیال پیدا نہ کر دے۔ طلاق میں جب آدمی طلاق دے کر رجوع نہیں کرتا، بلکہ عورت کو چھوڑ دیتا ہے تو سب کو علم ہو جاتا ہے کہ یہ اس کی بیوی نہیں رہی، بلکہ مطلقہ ہو چکی ہے، لیکن اگر وہ اس کے پاس بیوی ہی کی حیثیت سے باقی رہے تو لوگوں کو علم نہیں ہوگا کہ اس نے اس کو طلاق دی ہے یا نہیں۔

نکاح میں نکاح اور زنا اور آشنا یا داشتہ رکھنے میں فرق کرنے کے لیے اعلانِ نکاح کرنا ضروری ہے، وہ سفاح، یعنی زنا کی طرح خفیہ نہیں رہنا چاہیے، لیکن کیا صرف اعلان ضروری ہے یا گواہ مقرر کرنا، یہ ایک اختلافی مسئلہ ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ۝ وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ۚ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ۚ اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ ۚ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا ۝ ﴾ [الطلاق: ۲، ۳]

"اور جو اللہ سے ڈرے گا وہ اس کے لیے نکلنے کا کوئی راستہ بنا دے گا۔ اور اسے رزق دے گا جہاں سے وہ گمان نہیں کرتا اور جو کوئی اللہ پر بھروسا کرے تو وہ اسے کافی ہے، بے شک اللہ اپنے کام کو پورا کرنے والا ہے، یقیناً اللہ نے ہر چیز کے لیے ایک اندازہ مقرر کیا ہے۔"

یہ آیت عام ہے اور ہر معاملے میں تقویٰ اختیار کرنے والے کو شامل ہے۔ مگر سیاق سے معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص طلاق کے معاملے میں اللہ سے ڈرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے حکم اور طریقے کے مطابق طلاق دیتا ہے، اللہ تعالیٰ اس معاملے میں اس کے لیے راستہ نکال دیتا ہے جو ایسا نہ کرنے والے کے لیے تنگ ہوتا ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کی حدود سے تجاوز کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے حرام کردہ کام کا ارتکاب کر لیتا ہے وہ اپنی جان پر ظلم کرتا ہے، جو بدعت طلاق کے حرام ہونے سے ناواقف اور لاعلم ہو، یعنی اس کو علم نہ ہو کہ حالتِ حیض میں طلاق دینا حرام ہے یا اکٹھی تین طلاقیں دینا حرام ہے، اس شخص کو جب اس کے حرام ہونے کا علم ہو جائے اور وہ توبہ کر کے اللہ سے ڈرنے والا بن جائے تو اللہ

اس کے لیے راہ نکال ہی دیتا ہے۔ جس کو اس کے حرام ہونے کا علم ہو اور وہ سمجھتا ہو کہ وہ عورت اس پر حرام ہو چکی ہے، اس کو فتویٰ دینے والا بھی یہی فتویٰ دے تو اس کو اس کے ظلم کے مطابق سزا ملنی چاہیے، جس طرح اہلِ سبت کو ہفتے کے دن مچھلیاں پکڑنے کے لیے حیلہ سازی کرنے پر سزا ملی تھی۔ جو اللہ سے ڈرتا نہیں، اس کو تنگی کی سزا ملتی ہے۔ اگر اللہ اس کو ہدایت دے دے اور توبہ کی توفیق دے دے تو توبہ کرنے والا گناہ سے پاک ہو جاتا ہے، اس وقت وہ کشادگی اور اس مشکل سے نکلنے کے لیے راستے کا مستحق بن جاتا ہے۔ ہمارے نبی محمد ﷺ نبیِ رحمت اور نبیِ ملحمہ ہیں، جو توبہ کرے ہماری شریعت میں اس کے لیے گنجایش اور کشادگی نکل آتی ہے، پہلی امتوں میں تو توبہ کرنے والا بھی سزا سے نہیں بچتا تھا، جس طرح اللہ نے بنی اسرائیل کے توبہ کرنے والوں کے لیے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرنے کی شرط رکھی تھی، چنانچہ جب حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے کسی تین طلاقیں دینے والے شخص کے متعلق پوچھا جاتا تو وہ اس سے کہتے: اگر تو اللہ سے ڈرا ہوتا تو وہ تیرے لیے کوئی راستہ بنا دیتا۔ وہ کبھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے کے مطابق اس کے حرام ہونے کا علم رکھنے کے باوجود ایسا کرنے والوں کے لیے تین ہی موثر قرار دے دیتے اور کبھی صرف ایک موثر قرار دیتے، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اس بدعت کا ارتکاب کرنے والوں پر غضب ناک ہوتے اور فرماتے: لوگو! جو صحیح طریقے کے مطابق یہ کام کرے اس کے لیے تو یہ واضح ہے، ورنہ جو تم نئے کام کر رہے ہو، ہم اس کی طاقت نہیں پاتے۔

عہدِ رسالت اور ادوارِ خلفائے راشدین میں نکاحِ حلالہ کی کوئی مثال نہیں ملتی اور ایسا کوئی واقعہ تحریر میں نہیں جس میں رسول اللہ ﷺ نے یا آپ کے خلفائے راشدین نے کسی عورت کو نکاحِ حلالہ کے ذریعے پہلے خاوند کی طرف لوٹایا ہو، اس وقت غالب لوگ سنت کے مطابق ہی طلاق دیتے تھے۔

اسی طرح اس وقت لوگ بات بات پر طلاق کی قسم نہیں کھاتے تھے، اس لیے حلف اور قسم کے متعلق کسی صحابی سے کوئی خاص نقل نہیں ملتی۔ طلاق واقع کرنے کے متعلق تو ان سے کچھ باتیں ملتی ہیں، مگر طلاق کی قسم کھانے کے متعلق کچھ منقول نہیں اور طلاق دینے اور طلاق کی قسم کھانے میں فرق واضح ہے۔ اس طرح کی چیزوں کی قسم کھانے کی بدعت حجاج بن یوسف نے نکالی تھی۔ یہاں یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ عہدِ رسالت اور ادوارِ خلفا میں عورت کو حلالے کے ذریعے اس کے خاوند کی طرف نہیں لوٹایا جاتا تھا، ایسا پوشیدہ طور پر ہوتا، اس لیے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''اللہ سود کھانے والے، کھلانے والے، لکھنے والے، گواہی دینے والے نیز حلالہ کرنے والے اور کروانے والے پر لعنت کرے۔''[1]

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۵۹۷) حلالہ کرنے اور کروانے پر لعنت کے الفاظ اس حدیث میں نہیں، بلکہ وہ مندرجہ ذیل کتبِ احادیث میں ہیں: سنن أبي داود، رقم الحدیث (۲۰۸۶) سنن الترمذي، رقم الحدیث (۱۱۱۹، ۱۱۲۰) سنن النسائي، رقم الحدیث (۳۴۱۶) سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (۱۹۳۴) صحیح الترغیب والترهیب (۱/۱۸۵)

رسول اللہ ﷺ نے سود کے معاملے میں لینے والے، دینے والے، اس کے دونوں گواہوں اور لکھنے والے پر لعنت کی، کیوں کہ وہ قرض ہوتا ہے جس کا تقاضا ہوتا ہے اور جس پر گواہ مقرر کیے جاتے ہیں، لیکن حلالے کے مسئلے میں آپ ﷺ نے حلالہ کرنے اور کروانے والے پر لعنت کی، اس کے گواہوں اور کاتب پر نہیں کی، کیوں کہ آپ ﷺ کے عہد میں حق مہر لکھے نہیں جاتے تھے، لوگ عموماً دخول سے پہلے ہی حق مہر دے دیتے اور وہ خاوند کے ذمے ادھار نہیں رہتا تھا، اس لیے کاتب اور گواہوں کی ضرورت پیش نہیں آتی تھی۔ حلالہ کرنے اور کروانے والا دونوں اس کو چھپا کر رکھتے، عورت کو اس کی خبر ہوتی نہ اس کے ولیوں کو اور نہ گواہوں ہی کو۔ اس لیے آپ ﷺ نے حلالہ کرنے اور کروانے والوں پر لعنت کی، کیوں کہ حرام کے مرتکب وہ ہوتے ہیں، نیز انھیں غالباً حلالے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی تھی، کیوں کہ آدمی جب رجوع یا عقد کے بعد تین طلاقیں دے لیتا ہے تو اس وقت وہ اپنے فعل پر نادم نہیں ہوتا، کیوں کہ اس نے خوب سمجھ سوچ کر فیصلہ کیا ہوتا ہے، ایسا بہت شاذ و نادر ہی ہوتا ہے کہ اس طرح تین طلاقیں دینے کے بعد بھی کوئی نادم ہو۔ اگر کوئی شخص اللہ کی حدود سے تجاوز اور اس کی نافرمانی کر کے پھر واپسی کی سوچتا ہے تو وہ سزا کا حق دار ہے، اس لیے جو قصداً حلالہ کرتا اور کرواتا ہے، لعنت کا حق دار ہے، کیوں کہ ان دونوں نے گناہ اور زیادتی میں ایک دوسرے سے تعاون کیا ہے۔

جب طلاق کی قسم کھانے کا رواج پیدا ہوا تو بہت سے فقہا نے مسلک اختیار کیا کہ طلاق کی قسم کھانے والا جب اسے توڑ دے تو وہ جو حکم اپنے اوپر لازم کر لیتا ہے وہ اس پر لازم ہو جائے گا اور اس کو قسم کا کفارہ فائدہ نہیں دے گا۔ اکثر نے یہ مذہب بھی اختیار کیا کہ حرام طلاق موثر ہو جاتی ہے، نیز بہت سے فقہا یہ سمجھتے ہیں کہ اکٹھی تین طلاقیں دینا حرام نہیں۔ کچھ فقہا کا یہ مسلک ہے کہ نشے کی حالت میں دی گئی طلاق موثر ہو جاتی ہے اور بہت سے فقہا کی یہ رائے ہے کہ طلاق بالجبر بھی واقع اور موثر ہوتی ہے۔ ان اقوال اور آرا میں سے کچھ تو ایسے ہیں جو صحابہ کے ہاں بھی اختلافی رہے ہیں اور کچھ وہ ہیں جو ان کے بعد کہے گئے۔ اسی طرح علما کی اکثریت طلاق واقع ہونے کی رائے رکھتی ہے، حالانکہ طلاق کی صورت میں جو مرد عورت کا دینی و دنیاوی نقصان ہوتا ہے وہ بہت زیادہ ہے، ان کے درمیان دائمی علاحدگی ہو جاتی ہے۔

ان اختلافی مقامات میں طلاق کو موثر قرار دینے کے حوالے سے علما کے دو گروہ ہیں، ایک گروہ رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اقوال اور طرزِ عمل کی روشنی میں حلالے کی حرمت کا قائل ہے، انھوں نے اس کو تو حرام کہا، مگر اس کے ساتھ ان صورتوں کو بھی حرام قرار دیا جن کو رسول اللہ ﷺ نے حرام نہیں کہا، لہٰذا ان کا قول اور

موقف بہت سے ناروا بوجھوں اور دین و دنیا میں بہت سے مفاسد کا باعث بننے والے بہت بڑے حرج پر مبنی ہے۔ جب ان علما نے یہ فتویٰ دیا کہ جو آدمی اپنے اوپر جو لازم کرے وہ اس پر لازم ہو جاتا ہے، یعنی اگر طلاق کی قسم کھائے تو قسم توڑنے کی صورت میں طلاق ہو جائے گی، کیوں کہ یہ اس نے خود اپنے اوپر لازم کیا ہے، اس فتوے کے نتیجے میں کئی لوگ مرتد ہو گئے، ناحق خون بہایا گیا، لوگوں کے درمیان عداوت پیدا ہوئی، شریعتِ اسلام میں کیڑے نکالے گئے اور اس طرح کے بہت سنگین امور سامنے آئے۔

دوسرے گروہ نے مختلف حیلے اختیار کر کے اس بہت بڑے حرج کو دور کرنے کی کوشش کی، تاکہ عورت اپنے خاوند کی طرف لوٹ سکے۔ اس کے نتیجے میں پہلے نکاحِ حلالہ کا حیلہ نکالا گیا، بلکہ کچھ علما کے نزدیک ایسا کرنے والا ثواب کا مستحق ہے، کیوں کہ اس کی وجہ سے عورت خاوند کی طرف لوٹ آتی ہے اور وہ بہت سے مفاسد زائل ہو جاتے ہیں جو طلاق کی صورت میں متوقع ہوتے ہیں۔ یہ ان تمام صورتوں میں وقوعِ طلاق کو زائل اور ختم کرنے کے لیے حیلہ تھا، اس کے بعد "أیمان" (قسموں) میں اور کئی حیلے نکالے گئے۔ تاہم جمہور سلف علما اور ائمہ نے ان جیسے تمام حیلوں کی مذمت کی ہے، وہ ان حیلوں کو شریعت کی حکمت کی نفی اور قرآنی آیات میں سموئے ہوئے ایمانی حقائق کی تردید خیال کرتے تھے، بلکہ وہ ان کو اللہ کی آیات کے ساتھ استہزا اور دھوکا دہی کی قبیل سے تصور کرتے تھے۔ انھی جیسوں کے متعلق حضرت ابو ایوب سختیانی نے کہا تھا: ''یہ اللہ کو ایسے دھوکا دینے کی کوشش کرتے ہیں جیسے بچوں کو دھوکا دیتے ہیں، اگر یہ اس معاملے میں سیدھی طرف سے آتے تو مجھ پر اتنا گراں نہ ہوتا۔'' کافروں اور منافقوں نے انھی باتوں کو بنیاد بنا کر رسول اللہ ﷺ کی ذات پر اعتراضات کیے، اسے مسلمانوں کے خلاف دلیل بنا کر لوگوں کو اسلام و ایمان سے دور کرنے کے لیے بطور ہتھیار استعمال کیا۔ ایک شخص نے خود بیان کیا ہے کہ اس کے سامنے اسلام کی خوبیاں واضح ہوتی تھیں، مگر حلالے کے مسئلے پر اس کو اطمینان نہ ہوا، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے تو یہ فرمایا ہے:

﴿ وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ۭ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ ۡ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰۗىِٕثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۭ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ ﴾ [الأعراف: ١٥٦، ١٥٧]

''اور میری رحمت نے ہر چیز کو گھیر رکھا ہے، سو میں اسے ان لوگوں کے لیے ضرور لکھ دوں گا جو ڈرتے ہیں اور زکات دیتے ہیں اور (ان کے لیے) جو ہماری آیات پر ایمان لاتے ہیں۔ وہ جو اس رسول کی پیروی کرتے ہیں جو امی نبی ہے، جسے وہ اپنے پاس تورات اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں، جو انھیں نیکی کا حکم

دیتا ہے اور انھیں برائی سے روکتا ہے اور ان کے لیے پاکیزہ چیزیں حلال کرتا ہے اور ان پر ناپاک چیزیں حرام کرتا ہے اور ان سے ان کا بوجھ اور طوق اتارتا ہے جو ان پر پڑے ہوئے تھے۔ سو وہ لوگ جو اس پر ایمان لائے اور اسے قوت دی اور اس کی مدد کی اور اس نور کی پیروی کی جو اس کے ساتھ اتارا گیا وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔''

اس نے اپنے رسول کی یہ صفت بیان کی ہے کہ وہ ہر نیکی کا حکم دیتے ہیں، ہر برائی سے منع کرتے ہیں، ہر طیب کو حلال اور ہر خبیث کو حرام کرتے ہیں اور ان تمام بوجھوں کو اتارتے ہیں جو پہلے لوگوں کے گلوں کے طوق تھے!

وہ تمام مرجوح اقوال جو کتاب و حکمت کے مخالف ہیں، وہ خود ساختہ اقوال ہیں، جن کے بارے میں سب سے احسن توجیہ یہ ہوسکتی ہے کہ ان کو منسوخ شریعتوں میں سے قرار دیا جائے جو محمد ﷺ کی شریعت کے ساتھ منسوخ اور زائل ہو چکی ہیں، خواہ ان کا قائل امت کا سب سے بہتر اور جلیل القدر فرد ہی کیوں نہ ہو۔ وہ اس قول اور رائے میں مجتہد ہے، اس نے اپنی استطاعت کے مطابق تقویٰ اختیار کیا، لہٰذا وہ اپنے اس اجتہاد اور تقوے کی بنا پر ثواب حاصل کرتا ہے اور اس کی غلطی معاف و مغفور ہے، اس لیے رسول کے علاوہ کسی دوسرے کا قول جو اجتہاد کی بنا پر اختیار کیا گیا ہو، اس کو لازم اور نافذ نہیں کیا جا سکتا۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''جب حاکم اجتہاد کرے اور غلطی کرے تو اس کے لیے ایک اجر ہے۔''[1] صحیح ہی میں یہ حدیث بھی ہے کہ جب آپ ﷺ کسی کو امیرِ لشکر بنا کر بھیجتے تو کہتے: ''جب تو کسی قلعہ بند گروہ کا محاصرہ کرے اور وہ تجھ سے کہیں کہ تو انھیں اللہ کے حکم اور فیصلے پر اتار، تو تو انھیں اللہ کے حکم اور فیصلے پر نہ اتارنا، کیوں کہ تجھے معلوم نہیں ان کے متعلق اللہ کا حکم کیا ہے، لیکن تو انھیں اپنے اور ساتھیوں کے فیصلے پر اتار۔''[2] اس حدیث کی تائید حضرت سعد بن معاذ کے اس واقعہ سے بھی ہوتی ہے جو صحیح میں مذکور ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے بنی قریظہ کے معاملے میں انھیں فیصل مقرر کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کا محاصرہ کیا تو انھوں نے رسول اللہ ﷺ کے فیصلے کو قبول کیا۔ آپ ﷺ نے حضرت معاذ کو فیصلہ کرنے کا اختیار دیا، اس سے ان کو یہ امید پیدا ہوئی کہ شاید کہ وہ ان کے ساتھ کچھ اچھا سلوک کریں گے، مگر حضرت سعد نے اپنی قوم کی امنگوں کے خلاف اللہ اور اس کے رسول کی رضا کو فوقیت دی، اس لیے جب وہ فوت ہوئے تو رحمان کا عرش ان کی روح کے استقبال کی خوشی میں جھوم اٹھا۔ انھوں نے یہ فیصلہ سنایا کہ ان کے لڑنے والوں کو قتل کر دیا جائے، ان کی عورتوں کو لونڈیاں بنا لیا جائے اور اس کے مال تقسیم کر لیے جائیں۔ یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم نے ان کے معاملے میں بادشاہ جیسا فیصلہ

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٩١٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧١٦)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧٣١)

کیا ہے۔''[1] ایک روایت میں ہے: ''تم نے ان کے متعلق اللہ کا فیصلہ کیا ہے جو اس نے سات آسمانوں سے اوپر کیا ہے۔'' علما انبیا کے وارث ہیں، اللہ تعالیٰ نے حضرت داود و سلمان کے متعلق قرآن میں ذکر کیا ہے:

﴿ وَدَاوُدَ وَسُلَيْمٰنَ اِذْ يَحْكُمٰنِ فِي الْحَرْثِ اِذْ نَفَشَتْ فِيْهِ غَنَمُ الْقَوْمِ وَكُنَّا لِحُكْمِهِمْ شٰهِدِيْنَ ۝ فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ وَكُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّعِلْمًا ﴾ [الأنبياء: ۷۸، ۷۹]

''اور داوٗد اور سلیمان کو، جب وہ کھیتی کے بارے میں فیصلہ کر رہے تھے، جب اس میں لوگوں کی بکریاں رات چر گئیں اور ہم ان کے فیصلے کے وقت حاضر تھے۔ تو ہم نے وہ (فیصلہ) سلیمان کو سمجھا دیا اور ہم نے ہر ایک کو حکم اور علم عطا کیا۔''

اللہ تعالیٰ کے ان دونوں کریم نبیوں نے ایک ہی حکومت میں فیصلہ کیا، اللہ نے ایک کو فہم کے لیے خاص کیا اور تعریف دونوں کی کی۔ اسی طرح علما مجتہدین کی صورت ہے، ان میں جس کا اجتہاد درست ہو اس کو دو اجر ملتے ہیں اور دوسرے کو ایک اجر ملتا ہے، لیکن ان میں ہر کوئی اپنی استطاعت کے مطابق اللہ کی فرماں برداری کرتا ہے اور اللہ انسان کو اس کا مکلّف اور پابند نہیں بناتا جس کے علم سے وہ عاجز ہو۔

اس کے باوجود رسول اللہ ﷺ نے اپنے علاوہ کسی دوسرے کے قول کو قبول کرنا امت پر فرض اور لازم نہیں کیا، اسی طرح ہر وہ قول جو شریعت میں نیا ہو اور بالخصوص شنیع بھی ہو وہ لازم نہیں ہوتا۔

یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جب کوئی بات اپنے اجتہاد سے کہتے ہیں تو شریعت کو اپنی اور دوسروں کی غلطی سے مبرا قرار دیتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ''مفوضہ'' کے متعلق کہا تھا: میں اس میں اپنی رائے دیتا ہوں، اگر وہ درست ہوئی تو اللہ کی طرف سے ہو گی اور اگر غلط ہوئی تو میری اور شیطان کی طرف سے ہو گی، اللہ اور اس کا رسول دونوں اس سے بری ہیں۔ اسی طرح صدیق رضی اللہ عنہ سے کلالہ کے متعلق اور عمر رضی اللہ عنہ سے بھی اس طرح کے اقوال منقول ہیں، حالانکہ وہ جو اس انداز میں بات کرتے، اس میں درست ہوتے، بلکہ ان کے اجتہاد کے مطابق کوئی نص بھی مل جاتی، جس طرح عبداللہ بن مسعود وغیرہ کے اجتہاد نص کے مطابق ہوئے۔ وہ لوگ اللہ اور اس کے رسول کے متعلق ہم سے زیادہ علم رکھتے تھے، اسی طرح انھیں شریعت کی تعظیم کا پورا ادراک تھا، اس لیے وہ اس میں ایسی کسی چیز کا اضافہ کرنا پسند نہیں کرتے تھے جو ان کے علم میں نہ ہوتی یا وہ ان کے اجتہاد کی صورت میں غلط ہوتی، اس لیے کہتے: اللہ اور اس کا رسول دونوں اس سے بری ہیں، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴾ [النور: ٥٤]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٨٧٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧٦٨)

''اور رسول کے ذمے تو صاف پہنچا دینے کے سوا کچھ نہیں۔''

نیز فرمایا:

﴿ عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَيْكُم مَّا حُمِّلْتُمْ ﴾ [النور: ٥٤]

''اس کے ذمے صرف وہ ہے جو اس پر بوجھ ڈالا گیا ہے اور تمھارے ذمے وہ جو تم پر بوجھ ڈالا گیا۔''

فرمایا:

﴿ فَلَنَسْـَٔلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَلَنَسْـَٔلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ ﴾ [الأعراف: ٦]

''تو یقیناً ہم ان لوگوں سے ضرور پوچھیں گے جن کی طرف رسول بھیجے گئے اور یقیناً ہم رسولوں سے (بھی) ضرور پوچھیں گے۔''

اس لیے آپ دیکھتے ہیں کہ بہت سے اجتہادی اختلافی مسائل میں امت کے کئی اقوال ہیں، وہ قول جو اللہ نے اپنے رسول کو دے کر بھیجا ہے، ان میں سے ایک ہوتا ہے، باقی اقوال اگر اہلِ علم اور اہلِ دین مجتہدین کے ہیں تو وہ اجتہاد کے معاملے میں شریعت کے فرماں بردار ہیں، اس لیے اجر کے مستحق ہیں، گناہ گار نہیں، مثلاً کچھ لوگ سفر میں ہوں اور ان کو قبلے کی صحیح سمت کا علم نہ ہو، اب ہر کوئی اجتہاد کرتے ہوئے چار جہات میں سے کسی بھی جہت کی طرف رخ کر لے، کعبہ تو ایک ہی سمت ہے، مگر باقی سارے نمازیوں کو اپنی نماز کا اجر ملے گا، کیوں کہ انھوں نے اپنی استطاعت کے مطابق تقویٰ اختیار کیا اور اللہ کا حکم جاننے کی کوشش کی۔

یہ شریعت کا زندہ معجزہ ہے۔ جب دیگر اقوال کے ساتھ اس کا واضح انداز میں موازنہ کیا جائے تو نبوی نور و ہدایت واضح ہو جاتے ہیں اور معلوم ہو جاتا ہے۔ دوسرا قول اس سے کم تر ہے، کیوں کہ بہترین کلام اللہ کا ہے اور بہترین سیرت محمد ﷺ کی سیرت ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰۤى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا ﴾ [بني إسرائيل: ٨٨]

''کہہ دے اگر سب انسان اور جن جمع ہو جائیں کہ اس قرآن جیسا بنا لائیں تو اس جیسا نہیں لائیں گے، اگرچہ ان کا بعض بعض کا مددگار ہو۔''

یہ چیلنج اور عاجز قرار دینا قرآن کے الفاظ، معانی اور نظم تینوں میں ہے۔ مثال کے طور پر طلاق کے مسائل میں علمائے اسلام کا اختلاف ہوا ہے، اس میں تین اقوال ملتے ہیں: ایک قول ناروا بوجھوں پر مشتمل ہے، جس میں ایک گونہ ظلم اور اضطراب پایا جاتا ہے، دوسرا قول حیلے سازی دھوکا دہی اور ایک طرح کے ظلم، فحاشی اور عار کا آئینہ ہے اور تیسرا

قول علم و اعتدال کی تصویر اور مہاجرین و انصار کی راہ ہے۔ اسی طرح نذر کی قسم، طلاق اور غلام آزاد کرنے کے مسائل میں تین اقوال ہیں: ایک قول مسلمانوں کی قسموں کو بھی ساقط کرتا ہے اور ان کو مشرکوں کی قسموں کی قبیل سے قرار دیتا ہے، دوسرا قول قسموں کو اتنا لازم اور موثر قرار دیتا ہے کہ ان میں کفارے اور خلاصی کی راہ ہی مسدود کر دیتا ہے، جس طرح غیر اہل قبلہ (یہود و نصاریٰ) کی شریعت میں تھا اور تیسرا قول اہلِ توحید کی قسموں کی حرمت برقرار رکھتا ہے، مسلمانوں اور مشرکوں کی قسموں کے درمیان فرق کرتا ہے، نصِ قرآن کی رو سے کفارہ اور تحلیل (خلاصی قسم) ثابت کرتا ہے، اہلِ تورات و انجیل کو چھوڑ کر اس کو صرف اہلِ قرآن کے ساتھ خاص کرتا ہے۔ یہ وہ شریعت ہے جو خاتم الرسل، امام المتقین اور افضل البشر رسول نے پیش کی ہے۔

صلى الله عليه وعلى آله وصحبه الطيبين الطاهرين وعلى التابعين لهم بإحسان إلى يوم الدين.[1]

طلاق سنت اور طلاق بدعت نیز بیک وقت تین طلاقوں کا حکم

سوال طلاقِ سنت اور طلاقِ بدعت کیا ہوتی ہے؟ طلاقِ بدعت حلال ہے یا حرام؟ کیا ایک ساتھ تین طلاقیں دینا سنت ہے یا بدعت اور حلال ہے یا حرام؟ یہ مسئلہ بیان فرمایئے۔

جواب الحمد لله. سنت طلاق جو اللہ اور رسول نے جائز قرار دی ہے، اس کا طریقہ یہ ہے کہ آدمی اس طہر یعنی پاکیزگی کے ان ایام میں، جن میں اس نے بیوی سے جماع نہ کیا ہو، بیوی کو ایک طلاق دے، پھر اس سے علاحدگی اختیار کرے، تا آنکہ وہ اپنی عدت پوری کر لے، اگر خاوند بیوی میں کوئی رغبت رکھے تو عدت میں اس سے رجوع کر لے یا عدت گزر جانے کے بعد نئے نکاح کے ساتھ اس سے رجوع کرے، اگر اس کو اس میں کوئی غرض اور رغبت نہ ہو تو چھوڑ دے۔ اگر یہ طریقہ اختیار کرے تو یہ طلاق دینے کا سنت طریقہ ہے اور یہی طلاق کتاب و سنت اور اجماعِ امت کی دلیل سے جائز ہے۔

اگر وہ حیض اور ماہواری کی حالت میں بیوی کو طلاق دے تو وہ باتفاقِ ائمہ اللہ کا نافرمان اور بدعتی ہوگا۔ اسی طرح اگر وہ بیوی کو جماع کے بعد اور حمل واضح ہونے سے پہلے طلاق دے تو یہ بھی طلاقِ بدعت ہوگی، بعینہٖ اگر وہ ایک ہی طہر میں ایک جملے میں تین طلاقیں دے اور کہے میں تجھے تین طلاقیں دیتا ہوں یا تین جملے بولے اور کہے: میں تجھے طلاق دیتا ہوں، میں تجھے طلاق دیتا ہوں، میں تجھے طلاق دیتا ہوں تو یہ شخص بھی جمہور سلف و خلف کے نزدیک

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۳۳/۵۔ ۴۳)

اللہ کا نافرمان اور بدعتی ہے۔ یہی امام مالک، امام ابو حنیفہ اور مشہور تر روایت میں امام احمد کا مذہب ہے، بلکہ اگر وہ ایک ہی طلاق دے، پھر اس کے بعد عدت پوری ہونے سے پہلے پہلے مزید دو طلاقیں دے دے تو یہ بھی امام مالک کے مذہب اور امام احمد کے مذہب میں ظاہر روایت کے مطابق بدعتی ہی ہے۔ قرآن و سنت سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدمی کے لیے ایک طلاق دینا ہی جائز رکھا ہے، جب وہ رجوع کر لے اور اس کے بعد طلاق دینا چاہے، تب دوسری طلاق دے، اسی طرح تیسری دوسری سے رجوع کے بعد دے گا۔ اگر اس طریقے سے تین طلاقیں دے تب بدعتی نہیں ہوگا، پھر جب تیسری طلاق ہو جائے تو وہ عورت اس پر حرام ہو جائے گی، تا آنکہ وہ اس کے علاوہ کسی دوسرے شخص سے شادی کرے، انسان جب شرعی طریقے سے طلاق دیتا ہے تو نادم اور پشیمان نہیں ہوتا۔ اس مسئلے کی تفصیل ان آیات میں ہے:

﴿ يَاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ وَاَحْصُوا الْعِدَّةَ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ رَبَّكُمْ ۚ لَا تُخْرِجُوْهُنَّ مِنْ بُيُوْتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ۚ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ۚ لَا تَدْرِيْ لَعَلَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا ۝ فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ فَارِقُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ وَّاَشْهِدُوْا ذَوَيْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ وَاَقِيْمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ ۚ ذٰلِكُمْ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۚ وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ۝ وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ۚ ﴾ [الطلاق: ۱۔۳]

''اے نبی! جب تم عورتوں کو طلاق دو تو انھیں ان کی عدت کے وقت طلاق دو اور عدت کو گنو اور اللہ سے ڈرو جو تمھارا رب ہے، نہ تم انھیں ان کے گھروں سے نکالو اور نہ وہ نکلیں مگر یہ کہ وہ کوئی کھلی بے حیائی (عمل میں) لائیں۔ اور یہ اللہ کی حدیں ہیں اور جو اللہ کی حدوں سے آگے بڑھے تو یقیناً اس نے اپنے آپ پر ظلم کیا۔ تو نہیں جانتا شاید اللہ اس کے بعد کوئی نئی بات پیدا کر دے۔ پھر جب وہ اپنی میعاد کو پہنچنے لگیں تو انھیں اچھے طریقے سے روک لو، یا اچھے طریقے سے ان سے جدا ہو جاؤ اور اپنوں میں سے دو صاحبِ عدل آدمی گواہ بنا لو اور شہادت اللہ کے لیے قائم کرو۔ یہ وہ (حکم) ہے جس سے اس شخص کو نصیحت کی جاتی ہے جو اللہ اور یومِ آخر پر ایمان رکھتا ہے اور جو اللہ سے ڈرے گا وہ اس کے لیے نکلنے کا کوئی راستہ بنا دے گا۔ اور اسے رزق دے گا جہاں سے وہ گمان نہیں کرتا۔''

یہ اس کے لیے جس نے تین سے کم طلاقیں دی ہوں وہ یا تو معروف کے مطابق بیوی سے رجوع کرے اور اس کو اپنے پاس رکھ لے یا پھر معروف اور اچھے طریقے سے چھوڑ دے۔ اس طرح کے شخص سے متعلق کہا جاتا ہے کہ شاید اللہ اس کے بعد کوئی راہ نکال دے، جس کی صورت یہی ہے کہ وہ اس سے رجوع کرنا بہتر دیکھے تو رجوع کر لے،

لیکن جب تین طلاقیں ہو جائیں تو اس کے بعد کیا راہ نکلے گی؟ اور کیا امید باقی رہ جائے گی؟ اس لیے جمہور سلف و خلف نے کہا ہے: یکبارگی تین طلاقیں دینا بدعت ہے اور اس سے روکا گیا ہے، جو ایک ہی جملے میں تین طلاقیں دے دیتا ہے وہ بدعتی اور نافرمان ہے۔

یہ ثابت نہیں ہوتا کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں کسی نے ایک ہی جملے میں تین طلاقیں واقع کی ہوں، بلکہ فاطمہ بنت قیس کے خاوند نے جو اس کو طلاق دی تھی وہ آخری تیسری طلاق تھی، جس شخص نے اپنی بیوی سے لعان کیا تھا اس کی بیوی سے علاحدگی اور جدائی لعان کی وجہ سے ہوئی تو اس نے تین طلاقیں دیں، اگر وہ طلاق نہ بھی دیتا پھر بھی وہ اس پر حرام ہی ہو چکی تھی، اس لیے طلاق بے فائدہ تھی۔

رہی یہ بات کہ مسلمان رسول اللہ ﷺ کے عہدِ مبارک میں بھی ایک ساتھ ایک جملے میں تین طلاقیں دیتے تھے جس طرح ہمارے زمانے میں ہوتا ہے تو اس کی بابت کوئی ایک بھی صحیح حدیث ثابت نہیں، اس لیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ایک ساتھ تین طلاقیں دینے والے کی مذمت کرتے تھے اور کہتے تھے: یہ اللہ کا نافرمان ہے۔

طلاق جب ہو جائے تو بالاجماع کفارے سے ختم نہیں ہوتی، کفارہ صرف قسموں میں ہوتا ہے، طلاق دینے میں نہیں۔ واللہ أعلم[1]

حیض و نفاس میں دی گئی طلاق کا حکم

سوال حیض اور نفاس میں دی گئی طلاق موثر ہے یا غیر موثر؟

جواب مرد بیوی سے حالتِ حیض میں کہے: ''تجھے تین طلاقیں ہیں'' اس مسئلے میں دو بنیادی باتیں ہیں:

① پہلی بات: حالتِ حیض میں طلاق دینا کتاب و سنت اور اجماع کی روشنی میں حرام ہے، اس کے حرام ہونے میں کوئی اختلاف نہیں اور یہ بدعت طلاق ہے۔

طلاقِ سنت یہ ہے کہ مرد بیوی کو اس طہر میں طلاق دے جس میں اس نے اس سے ہم بستری نہ کی ہو، یا اس کو حمل کی حالت میں طلاق دے اور حمل واضح ہو چکا ہو۔ اگر انسان حالتِ حیض میں طلاق دیتا ہے یا ہم بستری کرنے کے بعد طلاق دیتا ہے لیکن حمل ابھی واضح نہیں ہوا تو یہ طلاقِ بدعت ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ وَاَحْصُوا الْعِدَّةَ ﴾ [الطلاق:١]

''اے نبی! جب تم عورتوں کو طلاق دو تو انھیں ان کی عدت کے وقت طلاق دو اور عدت کو گنو۔''

---

[1] جامع المسائل (١/ ٢٦٩۔ ٢٧١)

صحاح، سنن اور مسانید میں یہ روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے اپنی بیوی کو حالتِ حیض میں طلاق دے دی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کا تذکرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«مُرْهُ فَلْيُرَاجِعْهَا، حَتَّى تَحِيضَ ثُمَّ تَطْهُرَ، ثُمَّ تَحِيضَ، ثُمَّ تَطْهُرَ، ثُمَّ إِنْ شَاءَ أَمْسَكَهَا وَإِنْ شَاءَ طَلَّقَهَا، قَبْلَ أَنْ يَمَسَّهَا، فَتِلْكَ الْعِدَّةُ الَّتِي أَمَرَ اللّٰهُ أَنْ يُطَلَّقَ فِيهَا النِّسَاءُ» [1]

''اس کو رجوع کرنے کا حکم دے، تاآنکہ اس کو ماہواری آئے پھر وہ پاک ہو، پھر اس کو ماہواری آئے پھر پاک ہو، پھر چاہے تو روک لے اور چاہے تو ہم بستری کرنے سے پہلے طلاق دے۔ یہ وہ عدت ہے جس میں اللہ نے عورتوں کو طلاق دینے کا حکم دیا ہے۔''

(۲) دوسری بات: تین طلاقیں اکٹھی دینا، اس سے متعلق دو اقوال ہیں:

پہلا قول: تین طلاقیں اکٹھی دینا حرام ہے۔ یہ اکثر صحابہ، تابعین اور بعد کے علما کا مذہب ہے۔ امام مالک، امام ابو حنیفہ اور ایک روایت میں امام احمد کا مذہب بھی یہی ہے، ان کے اکثر اصحاب نے اسے ہی اختیار کیا ہے۔ امام احمد کا کہنا ہے: میں نے قرآن میں تدبر کیا اور دیکھا اس میں جس طلاق کا ذکر بھی ہے وہ رجعی ہی ہے (یعنی مدخول بہا کی طلاق) سوائے اس فرمان کے:

﴿فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتَّىٰ تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ﴾ [البقرة: ۲۳۰]

''پھر اگر وہ اسے (تیسری) طلاق دے دے تو اس کے بعد وہ اس کے لیے حلال نہیں ہو گی، یہاں تک کہ اس کے علاوہ کسی اور خاوند سے نکاح کرے۔''

اس قول کی بنیاد پر کیا مرد بیوی کو رجوع سے پہلے دوسری اور تیسری طلاق دے سکتا ہے، یعنی طلاق کو تین طہروں میں تقسیم کرے اور ہر طہر میں ایک طلاق دے؟ اس مسئلے میں دو اقوال ہیں جو دونوں امام احمد سے دو روایات ہیں۔ ایک قول ہے: وہ ایسا کر سکتا ہے، یہ سلف کے ایک گروہ اور امام ابوحنیفہ کا مذہب ہے۔ دوسرا قول ہے: وہ ایسا نہیں کر سکتا، یہ اکثر سلف کا قول ہے، امام مالک کا مذہب بھی یہی ہے اور امام احمد سے صحیح تر روایت بھی ہے اور حنابلہ میں سے ابوبکر عبدالعزیز، قاضی ابویعلیٰ اور اس کے اصحاب اور اکثر اصحابِ احمد نے اسے ہی اختیار کیا ہے۔

دوسرا قول: تین طلاقیں اکٹھی دینا حرام نہیں، بلکہ ترک افضل ہے۔ یہ امام شافعی کا مذہب ہے اور امام احمد سے دوسری روایت۔ خرقی نے اسے ہی اختیار کیا ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ فاطمہ بنت قیس کو اس کے خاوند ابوحفص بن مغیرہ نے تین طلاقیں دیں، رفاعہ نے بھی اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیں اور لعان کرنے والے نے بھی اپنی

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٩٥٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٧١)

بیوی کو تین طلاقیں دیں، مگر رسول اللہ ﷺ نے اس کا انکار اور اس پر ناپسندیدگی کا اظہار نہیں کیا۔

اکثر نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ فاطمہ اور رفاعہ کی بیوی کو تین متفرق طلاقیں دی گئیں، صحیح میں اسی طرح ثابت ہے کہ تیسری آخری طلاق تھی، نہ فاطمہ کے شوہر نے اس کو تین اکٹھی طلاقیں دی تھیں اور نہ رفاعہ ہی نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں اکٹھی دی تھیں۔

صحابی کا یہ کہنا: "طلق ثلاثاً" (اس نے تین طلاقیں دیں) تین متفرق طلاقوں کو بھی شامل ہے کہ اس نے طلاق دی، پھر رجوع کیا پھر طلاق دی، پھر رجوع کیا پھر طلاق دی، پھر رجوع کیا پھر طلاق دی۔ یہ سنت طلاق ہے جو باتفاقِ ائمہ واقع ہے۔ اور رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں طلاقِ ثلاثہ کا یہی مشہور معنی تھا۔ مگر ایک ہی جملے میں تین کو اکٹھا کرنا صحابہ کے نزدیک منکر اور برا کام تھا اور ایسا بہت کم ہوتا تھا، اس لیے مطلق لفظ کو کثیر اور حق مفہوم پر محمول کرنے کے بجائے قلیل اور منکر مفہوم پر محمول کرنا ناروا ہے۔

دوسرا وہ جس نے لعان کیا تھا اس کی طلاق بینونت یعنی علاحدگی کے بعد واقع ہوئی، یا اس (بینونت) علاحدگی کے لازم ہونے کے بعد واقع ہوئی، جس کے ساتھ عورت طلاقِ ثلاثہ سے بھی زیادہ شدت کے ساتھ مرد پر حرام ہو جاتی ہے، تو یہ طلاق لعان کے موجب کی تاکید کے لیے تھی۔ اختلاف اس طلاق میں ہے جس میں عورت کو روکنا ممکن ہوتا ہے، بالخصوص جب رسول اللہ ﷺ نے ان دونوں کو علاحدہ بھی کر دیا تھا۔ اگر یہ لعان تین طلاقوں سے پہلے ہوا تو اس کے تین طلاقیں دینے سے نہ ایک طلاق ہوئی نہ تین ہی اور اگر لعان طلاقِ ثلاثہ کے بعد ہوا تھا تو یہ نکاح کے باقی رہنے پر دلالت کرتا ہے اور یہ معروف ہے کہ آپ ﷺ نے تین طلاقیں دینے کے بعد ان دونوں کو علاحدہ کیا تھا، اس سے معلوم ہوا کہ اس کے تین کہنے سے تین طلاقیں نہیں ہوئیں، کیوں کہ اگر تین ہو جاتیں تو وہ عورت اس پر حرام ہو جاتی اور جب تک کسی دوسرے سے شادی نہ کرتی اس کے لیے حلال نہ ہوتی اور یہ معقول نہیں کہ اس وقت رسول اللہ ﷺ ان کو ایک دوسرے سے علاحدہ کرتے، کیوں کہ وہ ایک دوسرے کے لیے اجنبی اور غیر ہو چکے تھے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ آپ ﷺ نے اس عورت کو اس پر دائمی حرام کر دیا، مگر اس صورت میں آپ ﷺ کو اس کو اس پر حرام کرنا چاہیے تھا، علاحدہ نہیں کرنا چاہیے تھا، جب دونوں کو علاحدہ کر دیا تو ثابت ہوا کہ نکاح باقی اور اکٹھی تین طلاقیں واقع نہیں ہوئیں، لیکن اگر کہا جائے کہ اس کے ساتھ ایک رجعی طلاق واقع ہوئی ہے تو اس صورت میں ان دونوں میں علاحدگی کرنا ممکن ہے۔

سہل بن سعد کا یہ کہنا: "طلقها ثلاثاً" اس نے اس کو تین طلاقیں دیں اور رسول اللہ ﷺ نے اس کو اس پر نافذ کر دیا، اس بات کی دلیل ہے کہ اس کا یہ کہنا رسول اللہ ﷺ کے نافذ کرنے کا محتاج تھا اور یہ ملاعن، یعنی لعان

کرنے والے کے ساتھ خاص ہے۔ اگر یہ رسول اللہ ﷺ کی شریعت میں تھا کہ وہ تین کے ساتھ حرام ہو جاتی ہے تو اس میں ملاعن کا کوئی اختصاص نہ رہتا اور آپ ﷺ کے نافذ کرنے کی ضرورت بھی نہ رہتی، تو معلوم ہوا کہ جب ملاعن نے تین طلاقیں دے کر اس کو اپنے اوپر حرام کرنا چاہا تو رسول اللہ ﷺ نے اس کے مقصود کو نافذ کر دیا، بلکہ اس میں اضافہ کر دیا، کیوں کہ لعان کی تحریم طلاق کی تحریم سے کہیں شدید ہے، کیوں کہ لعان کی تحریم کسی دوسرے مرد سے شادی کر کے بھی زائل نہیں ہوتی۔ یہ علما کے ایک قول کے مطابق ابدی تحریم ہے جو توبہ سے بھی زائل نہیں ہوتی۔ اکثریت کا قرآن کریم سے استدلال ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ قرآن کریم کی دلالت کے مطابق اللہ تعالیٰ نے صرف طلاق رجعی اور عدت کے لیے طلاق جائز کی ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿يَاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ وَاَحْصُوا الْعِدَّةَ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ رَبَّكُمْ ۚ لَا تُخْرِجُوْهُنَّ مِنْۢ بُيُوْتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ۚ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ۚ لَا تَدْرِيْ لَعَلَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا ۝ فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ فَارِقُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ﴾ [الطلاق:۱۔۳]

''اے نبی! جب تم عورتوں کو طلاق دو تو انھیں ان کی عدت کے وقت طلاق دو اور عدت کو گنو اور اللہ سے ڈرو جو تمھارا رب ہے، نہ تم انھیں ان کے گھروں سے نہ نکالو اور نہ وہ نکلیں مگر یہ کہ وہ کوئی کھلی بے حیائی (عمل میں) لائیں۔ اور یہ اللہ کی حدیں ہیں اور جو اللہ کی حدوں سے آگے بڑھے تو یقیناً اس نے اپنے آپ پر ظلم کیا۔ تو نہیں جانتا شاید اللہ اس کے بعد کوئی نئی بات پیدا کر دے۔ پھر جب وہ اپنی میعاد کو پہنچنے لگیں تو انھیں اچھے طریقے سے روک لو، یا اچھے طریقے سے ان سے جدا ہو جاؤ۔''

اور یہ صرف طلاقِ رجعی میں ہوتا ہے۔ اس فرمان: ﴿فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ﴾ سے ثابت ہوتا ہے کہ عدت گزرنے سے پہلے یا رجوع کرنے سے پہلے طلاق کے اوپر طلاق دینا جائز نہیں، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے طلاق صرف عدت کے لیے یعنی استقبالِ عدت کے لیے جائز کی ہے، جب آدمی رجوع سے پہلے دوسری یا تیسری طلاق دے وہ اسی عدت پر ہی بنیاد رکھے گی اور از سرِ نو عدت کا شمار نہیں کرے گی، اس پر جمہور اہلِ علم کا اتفاق ہے۔ اگرچہ اس مسئلے میں فلاس اور ابن حزم سے شاذ اختلاف منقول ہے، اور ہم نے کسی دوسری جگہ اس قول کا فاسد ہونا بیان کیا ہے۔ یہ ضعیف قول ہے، کیوں کہ اسلام کے شروع میں جب کوئی شخص اپنی بیوی کو تنگ کرنا چاہتا تو طلاق دے دیتا، جب اس کی عدت ختم ہونے کے قریب ہوتی تو رجوع کر لیتا، پھر طلاق دے دیتا، تاکہ اس کو لمبے عرصے تک محبوس رکھ سکے۔ اگر ایسا ہوتا کہ وہ رجوع نہ کرتا تو بھی وہ نئے سرے سے عدت شروع کرتی تو اس کو رجوع کی ضرورت ہی نہ ہوتی،

اللہ تعالیٰ نے اسی ضرر اور اذیت رسانی کو بند کرنے کے لیے طلاق کو تین پر محدود کر دیا، جس طرح آثار میں ذکر ہوا ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے ہاں یہی طے تھا کہ عدت کا از سرِ نو آغاز رجوع کے بغیر نہ ہو، خواہ وجہ یہ ہو کہ طلاق رجوع سے پہلے واقع نہیں ہوتی یا واقع ہوتی ہے، لیکن اس کے لیے عدت کا آغاز نہ ہو؟ ابن حزم نے استیناف عدت (از سرِ نو عدت کا شمار) اس خیال کی بنا پر لازم قرار دیا ہے کہ طلاق استقبالِ عدت کے لیے ہو، لیکن جو طلاق دخول کے بعد ہو عدت اس کے بعد ہی ہوتی ہے۔ قرآن سے یہی ثابت ہوتا ہے، اس بنا پر ابن حزم کا قول فاسد ہے۔

جنھوں نے قرآن کے مدلول اور آثار کے مفہوم سے استدلال کیا ہے ان کے نزدیک جو طلاق اللہ تعالیٰ نے شریعت میں جاری کی ہے وہ یہ ہے کہ جس کے بعد عدت شروع ہوتی ہے اور جس میں طلاق دینے والے کو بیوی کو معروف کے مطابق رکھنے اور احسان کے ساتھ چھوڑنے، دونوں کا اختیار ہوتا ہے مگر یہ اختیار عدت میں اور رجوع سے پہلے تین طلاقیں واقع کر دینے میں باقی نہیں رہتا، اس لیے ایسا کرنا جائز نہیں اور یہ عدت کے لیے طلاق بھی نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ فَإِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ فَارِقُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ ﴾ [الطلاق: ۲]

''پھر جب وہ اپنی میعاد کو پہنچنے لگیں تو انھیں اچھے طریقے سے روک لو، یا اچھے طریقے سے ان سے جدا ہو جاؤ۔''

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بندے کو یہ اختیار دیا ہے کہ یا رجوع کرے یا اس کو اپنی عدت پوری کرنے دے اور بعد میں احسان کے ساتھ آزاد کر دے، لیکن اگر وہ عدت پوری ہونے سے پہلے ہی دوسری طلاق دے دے تو اس نے بیوی کو نہ تو معروف کے مطابق روک لیا اور نہ احسان کے ساتھ آزاد ہی کیا۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ۭ وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْٓ اَرْحَامِهِنَّ اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ﴾

[البقرة: ۲۲۸]

''اور وہ عورتیں جنھیں طلاق دی گئی ہے اپنے آپ کو تین حیض تک انتظار میں رکھیں اور ان کے لیے حلال نہیں کہ وہ چیز چھپائیں جو اللہ نے ان کے رحموں میں پیدا کی ہے، اگر وہ اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتی ہیں۔ اور ان کے خاوند اس مدت میں انھیں واپس لینے کے زیادہ حق دار ہیں۔''

اس آیت کا تقاضا ہے کہ ہر مطلقہ کی یہی حالت ہے اور اس طلاق کے سوا اور کوئی طلاق مشروع نہیں۔ پھر فرمایا: ﴿ اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۠ ﴾ [البقرة: ۲۲۹] یعنی یہ مذکور طلاق دو مرتبہ ہے۔ اگر کوئی کسی سے کہے: دو مرتبہ یا تین مرتبہ

سبحان اللہ کہہ، تو سبحان اللہ دو مرتبہ یا سبحان اللہ تین مرتبہ کہنا مراد نہیں، بلکہ با قاعدہ گن کر دو مرتبہ یا تین مرتبہ سبحان اللہ بول کر کہنا مراد ہوتا ہے، اسی طرح اگر کوئی کہے اس نے بیوی کو دو مرتبہ طلاق دی تو یہی مراد ہوگا کہ اس نے باری باری دو مرتبہ طلاق دی۔ اگر مرد ایک ہی جملے میں کہے: تجھے تین طلاقیں ہیں یا دو طلاقیں ہیں تو یہ کہنا نادرست ہوگا کہ اس نے اپنی بیوی کو تین مرتبہ یا دو مرتبہ طلاق دی۔ گو یہ کہنا درست ہے کہ اس نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں یا دو طلاقیں دیں۔ پھر اس کے بعد فرمایا:

﴿ فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتَّى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ ﴾ [البقرة: ۲۳۰]

''پھر اگر وہ اسے (تیسری) طلاق دے دے تو اس کے بعد وہ اس کے لیے حلال نہیں ہوگی، یہاں تک کہ اس کے علاوہ کسی اور خاوند سے نکاح کرے۔''

یہ تیسری طلاق ہے جو اللہ نے دو مرتبہ طلاقِ رجعی کے بعد مشروع کی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرمایا ہے:

﴿ وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوهُنَّ أَنْ يَنْكِحْنَ أَزْوَاجَهُنَّ ﴾ [البقرة: ۲۳۲]

''اور جب تم عورتوں کو طلاق دو، پس وہ اپنی عدت کو پہنچ جائیں تو انھیں اس سے نہ روکو کہ وہ اپنے خاوندوں سے نکاح کر لیں۔''

یہ حکم تب ہے جب طلاقیں تین سے کم ہوئی ہوں اور یہ ہر طلاق کو عام ہے جس سے معلوم ہوا کہ اکٹھی تین دینا غیر مشروع اور ناجائز ہے۔

تین طلاقیں اکٹھی دینے کے حرام ہونے کے دلائل کتاب وسنت، آثار اور اعتبار یعنی قیاسِ صحیح کی روشنی میں بہت زیادہ اور مضبوط تر ہیں، جن کی تفصیل اپنی جگہ گزر چکی ہے۔

اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ ''طلاق میں اصل ممانعت ہے'' اور یہ اسی قدر مباح اور جائز ہے جس قدر اس کی ضرورت ہو۔ صحیح بخاری میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''شیطان پانی پر اپنا تخت لگاتا ہے اور اپنے لشکر بھیجتا ہے، اس کا سب سے مقرب کارندہ وہ ہوتا ہے جو سب سے بڑا فتنہ جگا کر آتا ہے۔ اس کے پاس ایک شیطان آتا ہے اور کہتا ہے: میں مسلسل اس کے ساتھ رہا، یہاں تک کہ اس نے یہ کام کر دیا۔ حتی کہ ایک اور شیطان آتا ہے اور کہتا ہے: میں مسلسل اس کے ساتھ رہا، یہاں تک کہ اس کے اور اس کی بیوی کے درمیان جدائی ڈال دی۔ شیطان اس کو اپنے قریب کرتا ہے اور یہ کہتا ہوا اس کو اپنے ساتھ چمٹا لیتا ہے کہ تو، تو ہی ہے۔''[1]

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (۲۸۱۳)

اللہ تعالیٰ نے جادو کی مذمت میں فرمایا ہے:

﴿ فَيَتَعَلَّمُونَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُونَ بِهِ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهِ ﴾ [البقرۃ: ۱۰۲]

''پھر وہ ان دونوں سے وہ چیز سیکھتے جس کے ساتھ وہ مرد اور اس کی بیوی کے درمیان جدائی ڈال دیتے۔''

سنن میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''خلع لینے والیاں اور علاحدگی کی طلب گار منافقات ہیں۔''[1]

سنن ہی میں یہ حدیث بھی ہے کہ ''جو عورت کسی تنگی کے بغیر اپنے خاوند سے طلاق کا مطالبہ کرتی ہے اس پر جنت کی خوش بو حرام ہے۔''[2] اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کو تین مرتبہ سے زیادہ حلال اور مباح نہیں کیا۔ تیسری کے بعد عورت مرد پر اس طرح حرام ہو جاتی ہے کہ جب تک کسی دوسرے مرد سے شادی نہ کر لے، پہلے کے لیے حلال نہیں ہوتی۔ اگر یہ طلاق صرف ضرورت کے لیے مباح اور جائز رکھی گئی ہو تو ضرورت ایک کے ساتھ بھی پوری ہو جاتی ہے جو اس سے زیادہ ہے، وہ ممانعت پر باقی ہے۔

دوسری اصل اور قاعدہ یہ ہے کہ طلاقِ محرّم جس کو طلاقِ بدعت بھی کہا جاتا ہے، جب کوئی انسان اس کو واقع کر دیتا ہے یعنی دے دیتا ہے تو کیا یہ واقع اور موثر ہو جاتی ہے یا نہیں؟ اس مسئلے میں سلف و خلف میں اختلاف ہے، اکثر اس کو حرام کہنے کے باوجود اس کے واقع ہونے کے قائل ہیں۔

فقہا کا دوسرا گروہ کہتا ہے: یہ طلاق واقع ہی نہیں ہوتی، اس گروہ میں طاؤس، عکرمہ، خلاس، عمر، محمد بن اسحاق، حجاج بن ارطاۃ جیسے تابعین، اہلِ ظاہر میں سے داود اور اس کے اصحاب اور ابوحنیفہ مالک اور احمد کے اصحاب کا ایک گروہ بھی شامل ہے۔ اہلِ بیت میں سے ابوجعفر باقر اور جعفر بن محمد صادق کا مذہب بھی یہی ہے۔ داود اور اس کے اصحاب جیسے اہلِ ظاہر کا موقف بھی یہی ہے، مگر ان میں سے کچھ تین کے حرام ہونے کے قائل نہیں۔

ابوحنیفہ، مالک اور احمد کے کچھ اصحاب کے نزدیک جب کوئی شخص تین طلاقیں اکٹھی دے دے تو تینوں واقع نہیں ہوتیں، بلکہ ان میں سے ایک ہوتی ہے، مگر حائضہ کو طلاق دینے سے متعلق ان علما کا کوئی قول معروف نہیں۔ اہلِ کلام اور شیعہ کے کئی گروہوں کا یہ قول ہے کہ ساری طلاقیں ہو جاتی ہیں، اہلِ کلام اور شیعہ میں سے کچھ کا یہ بھی کہنا ہے کہ جب کوئی اکٹھی تین طلاقیں دے تو کوئی بھی طلاق نہیں ہوتی، یہ دین میں نیا قول ہے جس کا صحابہ اور تابعین میں سے کوئی بھی قائل نہیں۔ ظاہریہ میں سے ابن حزم اکٹھی تین طلاقیں دینے کو حرام نہیں کہتے، اس لیے یہ ان کے نزدیک ہو جاتی ہیں، مگر جمہور ظاہریہ کا مذہب ان کے حرام ہونے ہی کا ہے اور ان کے نزدیک صرف ایک ہوتی ہے۔

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (١١٨٦) سنن النسائي، رقم الحديث (٣٤٦١) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٦٣٢)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٢٠٩) سنن الترمذي، رقم الحديث (١١٨٧) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٠٥٥) صحيح الجامع، رقم الحديث (٢٧٠٦)

ظاہر یہ میں سے کچھ کا طلاقِ ثلاثہ میں قول معروف ہے، لیکن طلاقِ حائض میں کوئی قول معروف نہیں۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے دو وجوہ سے مروی ہے کہ یہ طلاق نہیں ہوتی، مگر کئی دوسری مشہور اور ثقہ وجوہ اور طرق سے مروی ہے کہ یہ طلاق ہو جاتی ہے۔ زید سے بھی یہی مروی ہے۔ تیسری بات کہ ایک ساتھ تین طلاقیں دینے کا حکم کیا ہے؟ تو اس سے متعلق صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اقوال بہت زیادہ اور مشہور ہیں۔ حضرت عمر، عثمان، علی، عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن عمر، ابو ہریرہ اور عمران بن حصین رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ یہ طلاق ہو جاتی ہے۔ حضرت ابوبکر، حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے ابتدائی عہدِ خلافت میں اور حضرت علی، ابن مسعود، ابن عباس، زبیر اور عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہم سے اس کا نہ ہونا مروی ہے۔

ابو جعفر احمد بن مغیث نے اپنی کتاب "المقنع في أصول الوثائق وبيان ما في ذلك من الدقائق" میں کہا ہے:

''طلاقِ بدعت یہ ہے کہ آدمی بیوی کو ایک ہی جملے میں تین طلاقیں دے، اگر وہ ایسا کرے تو طلاق موثر ہو جائے گی۔ اس کے بعد علما کا اختلاف ہے کہ اس سے کتنی طلاقیں واقع ہوں گی؟ علی بن ابو طالب اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما کا قول ہے: ایک طلاق لازم ہوگی، عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول بھی یہی ہے۔ چونکہ اس نے تین مرتبہ طلاق نہیں دی اس لیے اس کا تین کہنا لغو ہے۔ اگر اس نے پہلے طلاق دی ہوتی اور اس کے بارے میں بتاتا تو اس طرح کہتا: ''میں نے اس کو تین مرتبہ طلاق دی ہے'' جس سے پتا چلتا اس نے جو تین طلاقیں دی ہیں تو یہ فعل اس سے تین مرتبہ صادر ہوا ہے، یہ تو درست تھا، اگر اس نے ایک مرتبہ ہی طلاق دی مگر کہا: میں نے اس کو تین مرتبہ طلاق دی ہے تو وہ جھوٹا ہے، اسی طرح اگر کوئی شخص تین مرتبہ تکرار کے ساتھ اللہ کی قسم کھائے تو یہ تین قسمیں ہوں گی، اور اگر کہے: ''میں تین مرتبہ اللہ کی قسم کھاتا ہوں'' تو یہ ایک ہی قسم ہوگی، طلاق بھی اسی طرح ہے۔ زبیر بن عوام اور عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہما سے اسی طرح منقول ہے۔ ہم نے یہ ساری باتیں ابن وضاح یعنی امام احمد بن وضاح سے روایت کی ہیں جو احمد بن حنبل، ابن ابی شیبہ، یحییٰ بن معین اور سحنون بن سعید جیسے لوگوں کے طبقات سے روایت لیتا تھا۔ قرطبہ کے شیوخ میں سے ابن زنباع شیخ ھدی، فقیہ زمانہ محمد بن عبدالسلام حسینی، بقی بن مخلد کے بیٹے، اصبغ بن حباب اور کئی دیگر فقہائے قرطبہ نے بھی یہی قول اختیار کیا ہے۔ طلیطلہ کے دس کے قریب مالکی فقہا سے بھی یہی منقول ہے۔

میں کہتا ہوں: تلمسانی نے امام مالک سے یہی قول روایت کیا ہے، حنفی ائمہ میں سے محمد بن مقاتل رازی کا قول بھی یہی ہے۔ اس نے اس کو مازنی وغیرہ سے نقل کیا ہے، یہ امام مالک سے ایک روایت منقول ہے۔ شیخ ابو البرکات ابن تیمیہ بھی بعض اوقات اس کے مطابق فتویٰ دیتے تھے۔ یہ علما صحیح مسلم اور ابو داود وغیرہما میں عن طاؤس عن ابن عباس کی سند سے مروی اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت ابوبکر صدیق کے عہد اور

حضرت عمر رضی اللہ عنہما کی خلافت کے پہلے دو سالوں میں تین طلاقیں ایک ہی ہوتی تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: لوگوں نے اس معاملے میں جلد بازی سے کام لیا ہے جس میں ان کے لیے تحمل وصبر تھا، اگر ہم اس کو ان پر نافذ کر دیں تو؟ انھوں نے اس کو ان پر جاری اور نافذ کر دیا۔

ایک روایت میں ہے: ابو الصہباء نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے کہا: اپنے تفردات میں سے پیش کرو، کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں طلاقِ ثلاث ایک ہی نہیں تھی؟ انھوں نے کہا: ایسا ہی تھا۔ عہدِ فاروقی میں لوگوں نے تسلسل سے طلاق دینا شروع کر دی تو انھوں نے اس کو ان پر نافذ اور جاری کر دیا۔

جن علما نے اس حدیث کو رد کیا ہے، انھوں نے اس کی کمزور تاویلات کی ہیں۔ اسی طرح ہر وہ حدیث جس میں ذکر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تین طلاقوں کو قسم لے کر لازم کیا ہے جو طلاق دینے والے نے بالجملہ دی تھیں، یا کسی نے آپ کے زمانے میں بالجملہ طلاقیں دیں تو آپ نے ان کو لازم کر دیا۔ پہلی حدیث حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، دوسری عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے اور ایک عن حسن عن ابن عمر رضی اللہ عنہما سے۔ یہ اور اس طرح کی تمام احادیث حدیث کا علم رکھنے والے محدثین کے نزدیک بالاتفاق ضعیف ہیں، بلکہ موضوع ہیں۔ نقدِ حدیث کا علم رکھنے والے جانتے ہیں کہ یہ موضوع روایات ہیں اور اس کی تفصیل اپنی جگہ گزر چکی ہے۔

ان کی سب سے قوی دلیل، جس کے ساتھ انھوں نے اس کی تردید کی ہے، یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے کسی ایک وجہ سے تین کو لازم کرنے کا فتویٰ ثابت ہے۔ استدلال کرنے والوں کا جواب ہے کہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے عکرمہ کی سند سے بھی ثابت ہے کہ وہ تین کو ایک ہی قرار دیتے تھے اور عکرمہ کی سند سے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما جو بات ثابت ہے وہ طاؤس کی مرفوع حدیث اور ابن عباس رضی اللہ عنہما کی موقوف حدیث کے بالکل مطابق ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے خلاف کچھ بھی ثابت نہیں۔ مرفوع حدیث میں ہے: ''رکانہ نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اس کے پاس لوٹا دیا۔'' امام احمد بن حنبل مسند میں لکھتے ہیں:

''حدثنا سعيد بن إبراهيم، حدثنا أبي، عن ابن إسحاق، حدثني داوٗد بن الحصين، عن عكرمة مولى ابن عباس، قال: طَلَّقَ رُكَانَةُ بْنُ عَبْدِ يَزِيْدَ أَخُوْ بَنِيْ الْمُطَّلِبِ امْرَأَتَهُ ثَلَاثاً فِيْ مَجْلِسٍ وَّاحِدٍ، فَحَزِنَ عَلَيْهَا حَزْناً شَدِيْداً، قَالَ: فَسَأَلَهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ كَيْفَ طَلَّقْتَهَا؟ قَالَ: فَقَالَ: طَلَّقْتُهَا ثَلَاثاً، قَالَ: فِيْ مَجْلِسٍ وَّاحِدٍ؟ قَالَ: نَعَمْ، قَالَ: فَإِنَّهَا تِلْكَ وَاحِدَةٌ فَارْجِعْهَا إِنْ شِئْتَ، قَالَ: فَرَاجَعَهَا، وَكَانَ ابْنُ عَبَّاسٍ يَقُوْلُ: إِنَّمَا الطَّلَاقُ عِنْدَ كُلِّ طُهْرٍ'' [1]

[1] مسند أحمد (١/٢٦٥) شیخ البانی رحمہ اللہ نے إرواء الغليل (٢٠٦٣) میں اسے صحیح کہا ہے۔

''عکرمہ مولی عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کرتے ہیں کہ بنی المطلب کے خاندان سے تعلق رکھنے والے رکانہ بن عبد یزید نے ایک مجلس میں اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دیں، پھر اس پر سخت رنجیدہ ہوا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے پوچھا: تو نے کیسے طلاق دی ہے؟ اس نے کہا: میں نے اس کو تین طلاقیں دی ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: کیا ایک ہی مجلس میں؟ اس نے کہا: ہاں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ ایک ہی ہے، تو اگر چاہے تو رجوع کرسکتا ہے۔'' راوی کہتا ہے: پھر اس نے رجوع کر لیا۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہا کرتے تھے: طلاق ہر طہر میں ہے۔''

میں کہتا ہوں: اس حدیث سے متعلق ابن اسحاق نے کہا ہے: ''حدثنی داوٗد'' (مجھے داود نے یہ حدیث سنائی) داود امام مالک کے شیخ اور بخاری کے رجال سے ہیں۔ ابن اسحاق جب کہیں: ''حدثني'' اس وقت وہ محدثین کے نزدیک ثقہ ہوتے ہیں۔ یہ سند جید ہے۔ ایک اور طریق سے اس کا شاہد بھی ہے جس کو ابو داود نے سنن میں روایت کیا ہے۔ ابو داود نے یہ جید سند ذکر نہیں کی، اس لیے ان کو یہ گمان ہوا ہے کہ ایک بائن طلاق ہی زیادہ صحیح ہے، حالانکہ ایسے نہیں جیسے انھوں نے کہا ہے، بلکہ امام احمد نے اس روایت کو ابو داود کی روایت پر ترجیح دی ہے اور حقیقت وہی ہے جو امام مالک نے کہی ہے۔ ہم نے کسی دوسری جگہ اس پر تفصیلی بحث کی ہے۔

یہ حدیثِ رکانہ عبداللہ بن عباس سے دو اسناد سے مروی ہے: ایک ''عکرمہ عن ابن عباس''، یہ عبداللہ بن علی بن یزید بن رکانہ اور نافع بن عجیر کی روایت سے زیادہ ثابت و ثقہ ہے، جس میں ہے: اس نے اپنی بیوی کو طلاقِ بتہ دی اور یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے حلف طلب کیا، اس نے کہا: میں نے ایک ہی کا ارادہ کیا تھا۔ یہ مجہول راوی ہیں جن کے احوال غیر معروف ہیں۔ یہ فقہا بھی نہیں تھے۔ امام احمد، ابو عبید اور ابن حزم وغیرہ نے ان کی حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے۔ امام احمد کا قول ہے: حدیثِ رکانہ جس میں البتہ ہے: ''لیس بشیئ'' مزید کہتے ہیں: رکانہ کی یہ حدیث ثابت نہیں جس میں ہے کہ اس نے اپنی بیوی کو طلاقِ بتہ دی، کیوں کہ ابن اسحاق اس کو ''عن داود بن الحصین، عن عکرمہ عن ابن عباس'' کی سند سے اس طرح روایت کرتا ہے: ''رکانہ نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیں۔''

اہلِ مدینہ ثلاثہ (تین) کو ''البتہ'' کہتے ہیں۔ امام احمد نے حدیثِ البتہ کے باطل ہونے پر اس دوسری حدیث سے استدلال کیا ہے جس میں ہے: ''اس نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیں۔'' اور بیان کیا کہ اہلِ مدینہ جو تین طلاقیں دے، اس کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں کہ اس نے اپنی بیوی کو طلاقِ بتہ دی۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ حدیث ان کے نزدیک ثابت ہے، دیگر حفاظِ حدیث نے بھی اس کو بیان کیا ہے۔ ابن اسحاق کی یہ سند جس میں ہے:

"حدثني داود بن الحصين عن عكرمة عن ابن عباس" یہ امام احمد و دیگر محدثین سے ثابت ہے۔ اسی سند سے یہ بھی مروی ہے کہ "رسول اللہ ﷺ نے اپنی بیٹی زینب کو پہلے نکاح کے ساتھ اس کے خاوند کے پاس لوٹایا۔"[1] اس حدیث کو بھی امام احمد و دیگر محدثین نے صحیح کہا ہے۔ ابن اسحاق جب "حدثني" کہے تب اس کی حدیث محدثین کے نزدیک صحیح ہوتی ہے۔ تدلیس کا خدشہ اس وقت ہوتا ہے جب وہ "عن" سے بیان کرے۔

ابو داود نے اپنی سنن میں یہ حدیث عبداللہ بن عباس سے ایک اور سند سے بھی روایت کی ہے اور یہ دونوں عبداللہ بن عباس سے طاؤس کی حدیث کے مطابق ہیں۔ امام احمد حدیثِ طاؤس کو فاطمہ بنت قیس کی اس حدیث کے معارض خیال کرتے تھے جس میں ہے: "اس کے خاوند نے اس کو تین طلاقیں دیں" کیوں کہ امام احمد پہلے ایک ساتھ تین طلاقیں دینا جائز سمجھتے تھے، پھر انھوں نے اپنی اس رائے سے رجوع کر لیا اور کہا: "تدبرت القرآن فوجدت الطلاق الذي فيه هو الرجعي" "میں نے قرآن پر تدبر کیا تو پایا اس میں جس طلاق کا ذکر ہے وہ رجعی ہی ہے۔" پھر یہی ان کا مذہب بن گیا۔ ان کے جمہور اصحاب کا مذہب یہی ہے۔

فاطمہ کی حدیث سے واضح ہوتا ہے کہ اس کو تین متفرق طلاقیں ہوئی تھیں، اکٹھی نہیں ہوئی تھیں۔ ان کے ہاں رسول اللہ ﷺ کی یہ دو احادیث ثابت ہیں جس نے ایک ساتھ تین طلاقیں دیں، اس کو ایک ہی لازم ہو گی۔ رسول اللہ ﷺ سے اس کے علاوہ کوئی اور بات ثابت نہیں جو اس کے خلاف ہو، بلکہ قرآن بھی اسی کی تائید و موافقت کرتا ہے اور ان کے نزدیک نہی فساد کا تقاضا کرتی ہے۔ ان نصوص اور امام صاحب کے ثابت اصول سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے مذہب میں ایک ساتھ دی گئی تین طلاقیں ایک ہی شمار ہوتی ہے۔ وہ پہلے حدیثِ رکانہ سے اس بنا پر اعراض کرتے تھے کہ یہ ان کے نزدیک تین اکٹھی دینے کے جواز کے معارض تھی، یہ نسخ پر دلالت کرتا تھا، اس کے بعد انھوں نے معارضت سے رجوع کر لیا، کیوں کہ ان کے ہاں معارض کا فاسد ہونا واضح ہو گیا تھا اور یہ کہ ایک ساتھ تین طلاقیں دینا جائز نہیں، اس لیے ان کے اصول کے مطابق ان نصوص پر عمل کرنا ضروری ہے جو معارض سے محفوظ ہیں۔

حدیثِ طاؤس کو عبداللہ بن عباس کے اس کے خلاف فتویٰ دینے سے معلول نہیں کیا جائے گا، یہ ان سے دو روایات میں سے ایک روایت میں ان کا علم ہے، لیکن ان کا ظاہر مذہب جس پر ان کے اصحاب کاربند تھے، یہی ہے کہ یہ حدیث پر عمل کرنے میں معارض و قادح نہیں، بالخصوص جب عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے تین کو موثر اور نافذ کرنے کا عذر اور وجہ بیان کر دی ہے۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے وہی عذر ذکر کیا ہے جو خود سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٢٤٠) سنن الترمذي، رقم الحديث (١١٤٣) شیخ البانی رحمہ اللہ نے إرواء الغليل (٦/٣٣٩) میں اسے صحیح کہا ہے۔

بیان کیا ہے کہ لوگوں نے جب تسلسل سے وہ کام کرنا شروع کر دیا جو اللہ نے حرام کیا تھا تو اس وجہ سے وہ سزا کے مستحق بن گئے، لہٰذا انھوں نے اس کو ان پر نافذ کر کے ان کو سزا دی، لیکن اس سے پہلے ان کی یہ روش نہیں تھی، اس وقت وہ اس حرام کام کا ارتکاب اتنی کثرت سے نہیں کرتے تھے۔

اس کی مثال ایسے ہی ہے جیسے جب لوگوں نے کثرت سے شراب پینا شروع کر دی اور اس کی حد کو ہلکا سمجھنے لگے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایسے لوگوں کو اسّی کوڑے مارتے، جلاوطن کرتے اور سر مونڈ دیتے، لیکن یہ سزا عہدِ رسالت میں نہیں تھی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بعض اہلِ قبلہ سے لڑائی لڑی جو عہدِ رسالت میں نہیں ہوئی تھی، اسی طرح وہ بعض اوقات میاں بیوی کو نکاح باقی رکھ کر یا نکاح ختم کر کے بطورِ سزا علاحدہ کر دیتے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو، جو غزوۂ تبوک میں پیچھے رہ گئے تھے، ان کی بیویوں سے علاحدہ کر دیا تھا مگر طلاق نہیں دلوائی تھی، تا آنکہ اللہ تعالیٰ نے ان پر مہربانی کی اور ان کی توبہ قبول کی۔ جو انسان اپنی بیوی کو تینوں طلاقیں دے دیتا ہے اس کی بیوی اس پر حرام ہو جاتی ہے اور اس وقت تک حلال نہیں ہوتی جب تک وہ کسی دوسرے مرد سے شادی نہ کر لے، یہ حکم مرد کے لیے سزا کا درجہ رکھتا ہے، تا کہ وہ طلاق سے باز آ جائے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور ان کی رائے سے موافقت رکھنے والے فقہا امام مالک اور ایک روایت میں امام احمد ء میں نکاح کی گئی عورت کو نکاح کرنے والے پر ہمیشہ کے لیے حرام قرار دیتے ہیں، کیوں کہ اس شخص نے اس کام کو طلب کرنے میں جلد بازی سے کام لیا ہے جو اللہ نے حلال کیا تھا تو اس شخص کو اس کے نقیض ارادہ یعنی ارادے کے خلاف کے ساتھ سزا دی گئی اور بطورِ سزا حرام کر دیا گیا۔

اکثر سلف کے نزدیک جب فیصلہ کرنے والے سمجھیں کہ خاوند ظالم ہے اور زیادتی کر رہا ہے تو وہ بلاعوض دونوں کو علاحدہ کر دیں، تا کہ خاوند کو ظلم سے روکا جا سکے اور بیوی سے ضرر اور اذیت دور کی جا سکے۔ کتاب و سنت اور آثارِ سلف اسی پر دلالت کرتے ہیں۔ یہی امام مالک کا مذہب اور شافعی و حنبلی مذہب میں ایک قول ہے۔

جب لوگوں نے کثرت سے ایک ساتھ تین طلاقیں دینا شروع کر دیں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو موثر اور نافذ کر دیا تو یہ یا اس وجہ سے تھا کہ انھوں نے اس کو وقتی ضرورت کے لیے استعمال کی جانے والی سزا خیال کیا یا وہ اس کو شرع لازم سمجھتے تھے، کیوں کہ ان کی رائے میں رخصت اس وقت کے لیے تھی جب مسلمان ایسا کثرت کے ساتھ نہ کریں۔ اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حجِ تمتع سے منع کرنے میں بھی علما نے کئی مختلف باتیں کہی ہیں کہ آیا یہ نہی اختیاری تھی، کیوں کہ حج کے لیے علاحدہ سفر اور عمرے کے لیے علاحدہ سفر تمتع یعنی ایک ہی سفر میں دونوں کاموں سے

افضل تھا۔ یا انھوں نے اس کو پھیلانے اور اس میں وسعت پیدا کرنے سے منع کیا تھا، کیوں کہ وہ اس کو صحابہ کے ساتھ مخصوص سمجھتے تھے؟ خواہ یہ بات ہو یا وہ، صحابہ نے اس مسئلے میں ان سے اختلاف کیا اور بہت سے ائمہ صحابہ اور اہلِ شوریٰ نے حجِ تمتع اور تین طلاقیں موثر اور نافذ کرنے میں ان کی مخالفت کی۔ جب وہ کسی چیز میں اختلاف کریں تو اس کو اللہ اور اس کے رسول کی طرف لوٹانا ضروری ہے، جس طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے تھی کہ مبتوتہ (جس عورت کو طلاقِ بتہ ہو چکی ہو، یعنی تین طلاقیں ہو چکی ہوں) اس کا خرچہ اور رہایش ہے۔ اس مسئلے میں بہت سے صحابہ نے ان سے اختلاف کیا، اکثر علما ان کے قول پر قائم ہیں۔ ان کا اور عبداللہ بن مسعود کا خیال تھا کہ جنبی تیمّم نہیں کر سکتا۔ حضرت عمار، ابو موسیٰ اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم وغیرہم صحابہ نے ان کی مخالفت کی، علما نے ان کے قول پر اجماع کیا، کیوں کہ ان کے ساتھ کتاب و سنت تھی۔ اس جیسے مسائل بے شمار ہیں جن کی تفصیل اپنی جگہ گزر چکی ہے۔ یہاں صرف لوگوں کے اختیار کردہ مواقف پر تنبیہ مقصود تھی۔

جن علما کے نزدیک حرام طلاق موثر اور لازم نہیں ہوتی وہ کہتے ہیں: یہی امام مالک، شافعی اور احمد وغیرہ جیسے فقہا ائمہ کے ہاں اصل اور قاعدہ ہے کہ حرام بیع، حرام نکاح اور حرام کتابت جیسے حرام عقود و معاہدات واقع کرنے سے لازم اور موثر نہیں ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے نزدیک نکاحِ شغار (وٹے سٹے کا نکاح) اور نکاحِ حلالہ، باطل اور لغو ہیں۔ امام مالک اور احمد نے جمعہ کے دن اذان کے وقت بیع اور خرید و فروخت کو باطل اور لغو قرار دیا ہے، یہ حرام ظہار کے خلاف ہے، کیوں کہ یہ فی نفسہٖ حرام ہے جس طرح قذف، جھوٹی قسم اور جھوٹی گواہی وغیرہ جیسے فی نفسہا حرام اقوال ہیں۔ ان کو صحیح اور غیر صحیح میں تقسیم کرنا ممکن نہیں، بلکہ ان کا فاعل ہر حالت میں سزا کا مستحق ہے۔ لہٰذا ظہار کرنے والے کو کفارے کی شکل میں سزا دی جاتی ہے، لیکن اس سے طلاق نہیں ہوتی۔ اہلِ جاہلیت ظہار سے طلاق مراد لیتے تھے، لیکن شارع علیہ السلام نے اس کا یہ مفہوم ختم کر دیا، کیوں کہ یہ کہنا ہی حرام بات ہے۔ اس لیے اس میں کفارہ ضروری کر دیا۔ مگر طلاق فی نفسہٖ نکاح اور بیع وغیرہ کی طرح جائز ہے، یہ کبھی حلال ہوتی ہے کبھی حرام۔ اس لیے جس طرح بیع اور نکاح کو صحیح اور فاسد میں تقسیم کیا جاتا ہے، اس کو بھی صحیح اور فاسد میں تقسیم کرنا درست ہے۔ اس جنس میں نہی منہی عنہ کے فساد اور عدمِ وقوع کا تقاضا کرتی ہے۔ اہلِ جاہلیت ظہار سے طلاق مراد لیتے تھے۔ شارع نے یہ مفہوم کالعدم قرار دے دیا، کیوں کہ یہ حرام قول ہے تو اس کا تقاضا ہوگا کہ ہر حرام قول سے طلاق واقع نہیں ہوتی، ورنہ وہ لفظِ حرام کی طرح لفظِ ظہار سے طلاق مراد لیتے تھے، یہ امام مالک، شافعی اور احمد کے اصول کے مطابق قیاس ہے۔

مگر جو علما طلاق کے باب میں ان ائمہ کے اصول کے مطابق قیاس کے مخالف ہیں وہ آثار ملنے پر بھی اس کے مخالف ہیں۔

جب ان کے ہاں یہ ثابت ہو گیا کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے جو طلاق حیض کی حالت میں دی تھی اس کو طلاق شمار کیا تھا تو کہتے ہیں: وہ اپنے واقعے سے زیادہ باخبر ہیں، اس لیے ان فقہا نے اس مسئلے میں ان کی پیروی کی، ان سے اختلاف رکھنے والے کہتے ہیں: عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اور دیگر صحابہ احادیث روایت کرتے ہیں، لیکن علما ان سے ان کے اخذ کردہ فہم کو نہیں لیتے، کیوں کہ ان کی روایت کا اعتبار ہے فہم کا نہیں۔ جمہور علما نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی "فاقدروا له"[1] کی تفسیر قبول نہیں کی۔ ابو حنیفہ اور مالک وغیرہما نے حدیث: «اَلْبَيِّعَيْنِ بِالْخِيَارِ»[2] کی تفسیر جو ان سے منقول ہے قبول نہیں کی، حالانکہ ان کا قول ظاہر حدیث کے مطابق ہے۔ جمہور علما نے ﴿فَأْتُوا حَرْثَكُمْ أَنَّىٰ شِئْتُمْ﴾ [البقرة: ۲۲۳] کی تفسیر اور شانِ نزول جو ان سے منقول ہے، قبول نہیں کیا، اسی طرح جب راوی اپنی روایت کی مخالفت کرے تو وہ بھی قبول نہیں ہوتی، ائمہ اربعہ وغیرہم نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا یہ قول: "بيع الأمة طلاقها" (لونڈی کو فروخت کرنا ہی اس کی طلاق ہے) قبول نہیں کیا، کیوں کہ انھوں نے خود حدیثِ بریرہ روایت کی ہے، جس میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو فروخت ہونے اور آزاد ہونے کے بعد خاوند کو رکھنے اور چھوڑنے کا اختیار دیا تھا تو معلوم ہوا صحابہ کی روایت کا اعتبار ہوتا ہے، ان کی رائے اور فہم کا نہیں۔

جب ان کے ہاں ائمہ صحابہ سے ثابت ہوا کہ انھوں نے اکٹھی تین طلاقوں کو نافذ اور لازم کیا تو کہا: انھوں نے اس کو اسی وجہ سے لازم کیا ہے کہ شریعت کا تقاضا یہی ہے۔ ایک گروہ کے نزدیک اس طلاق کو موثر اور لازم کرنے پر اجماع ہے، کیوں کہ انھیں اس میں کسی ثابت و منقول اختلاف کا علم نہیں، بالخصوص یہ قول شیعہ کے ہاں معروف ہو چکا ہے جو حق میں اہلِ سنت سے منفرد نہیں۔

استدلال کرنے والے کہتے ہیں: یہ بعض شیعہ اور کچھ متکلمین کی رائے ہے کہ ایک ساتھ تین طلاقیں دینے سے کوئی طلاق نہیں ہوتی۔ یہ قول سلف میں سے کسی سے منقول نہیں، بلکہ واقع ہو جانے پر اجماع ذکر ہو چکا ہے، اختلاف صرف یہ ہے کہ ایک ہو گی یا تین؟ اس مسئلے میں سلف کا اختلاف ثابت ہے جس کو مٹانا ممکن نہیں، جن ائمہ نے تین کے لازم کرنے کو شرع لازم قرار دیا ہے ان کے پاس کتاب و سنت اور اجماع کی کوئی ایسی دلیل نہیں جس کی اتباع ضروری ہو، گو بعض نے قرآن سے استدلال کیا ہے، بعض نے سنت سے اور بعض نے اجماع سے۔ کچھ نے دو یا زیادہ دلیلوں سے بھی استدلال کیا ہے، لیکن اختلاف کرنے والے ان سب دلائل کا کمزور ہونا ثابت کرتے ہیں۔ کتاب و سنت اور اعتبار، یعنی قیاسِ صحیح نفی لزوم، یعنی تینوں کے لازم ہونے کی نفی اور تردید کرتے ہیں اور اس مسئلے میں عدمِ اجماع بیان

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٨٠)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٠٠١) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٥٣١)

کرتے ہیں، بلکہ جو صحابہ ایک ساتھ تین طلاقوں کو لازم کرتے ہیں ان سے منقول آثار سے ثابت ہوتا ہے، وہ اس کو رسول اللہ ﷺ کا اپنی امت کے لیے مقرر کردہ لازمی شرعی حکم قرار نہیں دیتے تھے، جس طرح تیسری طلاق کے بعد عورت کا پہلے خاوند پر حرام ہونا شرعی لازمی حکم ہے، بلکہ اس کو انھوں نے اپنے اجتہاد سے بطور سزا لازم قرار دیا تھا، کیوں کہ لوگ بکثرت ایسا کر رہے تھے اور باز نہیں آ رہے تھے۔

میں نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے نقل شدہ الفاظ ذکر کیے ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ انھوں نے اسی کے لیے تین طلاقوں کو موثر قرار دیا جو اللہ کی نافرمانی کرتے ہوئے بالجملہ تین طلاقیں دے دیتا، مگر جو اللہ سے ڈرتا ہے، اس کے متعلق اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَمَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لَهُ مَخْرَجًا ۝ وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ﴾ [الطلاق: ۲،۳]

''اور جو اللہ سے ڈرے گا وہ اس کے لیے نکلنے کا کوئی راستہ بنا دے گا۔ اور اسے رزق دے گا جہاں سے وہ گمان نہیں کرتا۔''

جس کو ایک ساتھ تین طلاقیں حرام ہونے کا علم طلاق دے دینے کے بعد معلوم ہوا، اس کے بعد توبہ کرے اور آیندہ حرام کام نہ کرنے کا عہد کرے، اس کے لیے سزا نہیں ہوتی، کتاب و سنت اور اجماع و قیاس جیسے دلائلِ شرعیہ میں کوئی ایسی دلیل نہیں جو ایسے انسان کے لیے تینوں طلاقوں کو موثر قرار دینا ثابت کرتی ہو، جب کہ اس کا نکاح یقین کے ساتھ ثابت ہے اور اس کی بیوی کا دوسرے پر حرام ہونا بھی یقین سے ثابت ہے، لیکن اگر ایک ساتھ دی گئی تین طلاقیں موثر قرار دے دی جائیں تو عورت اس مرد پر حرام ہو جائے گی، دوسرے کے لیے حلال ہو جائے گی اور یہ نکاح حلالہ کا ذریعہ بنے گا جس کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نے حرام قرار دیا ہے۔

نکاحِ تحلیل رسول اللہ ﷺ کے زمانے اور آپ ﷺ کے خلفا کے عہد میں ظاہر نہیں ہوا تھا، کوئی ایک ایسا واقعہ بھی نہیں ملتا جس سے ثابت ہوتا ہو کہ ان کے زمانے میں کسی عورت کو تیسری طلاق کے بعد نکاح تحلیل، یعنی حلالہ کے ذریعے پہلے خاوند کی طرف لوٹایا گیا ہو، بلکہ رسول اللہ ﷺ نے حلالہ کرنے اور کروانے والے، سود کھانے اور کھلانے، لکھنے اور گواہ بننے والوں پر لعنت کی ہے۔[1] تحلیل میں گواہ ذکر کیے جاتے ہیں نہ بیوی ہوتی ہے اور نہ ولی، کیونکہ نکاح حلالہ میں حلالہ کرنے والے کا قصد پسِ پردہ رکھا جاتا ہے یا وہ اور طلاق دے کر حلالہ کروانے والا آپس میں اتفاق کر لیتے ہیں اور بیوی اور اس کا ولی اس کے ارادے سے آگاہ نہیں ہوتے۔ اگر انھیں علم ہو جائے تو وہ اس شخص سے نکاح

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٥٩٧) سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٠٧٦) سنن الترمذي، رقم الحديث (١١١٩، ١١٢٠) سنن النسائي، رقم الحديث (٣٤١٦)

کرنے پر کبھی راضی نہ ہوں، کیوں کہ یہ لوگوں کے ہاں بہت بڑی بدنامی اور برائی ہے، بلکہ پہلے نکاح نامے لکھنے کا رواج نہیں ہوتا تھا، لوگ شادی کرتے اور اس کا اعلان کرتے اور وقتِ عقد گواہوں کا التزام بھی نہیں کرتے تھے۔ مالک اور ایک روایت میں احمد کا مذہب بھی یہی ہے، اور نکاح کے موقع پر گواہ بنانے کی کوئی صحیح حدیث بھی رسول اللہ ﷺ سے مروی نہیں۔ احمد وغیرہ کا یہی کہنا ہے۔ چونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ظاہر میں حلالہ نہیں ہوتا تھا، اس لیے انھوں نے اپنے اجتہاد کی روشنی میں تین طلاقوں کو نافذ کر دیا، تا کہ حرام کام سے لوگوں کو روکا جائے۔ اگر فاعل سزا کا مستحق نہ ہو اور تین کو نافذ کرنا حلالے کا باعث بنے جو نص اجماع اور قیاس کی روشنی میں حرام ہے، تو ایسی صورت میں حقیقی مفسدت کو، جب اس کے نتیجے میں اس سے بھی زیادہ شدید و غلیظ مفاسد ہوں، زائل اور ختم کرنا جائز نہیں ہوتا، بلکہ اس جیسی صورت میں تین کو ایک ہی قرار دیا جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ابو البرکات ابن تیمیہ جیسے کئی علما اکٹھی تین طلاقوں کو ہر حالت میں لازم نہیں کرتے تھے، بلکہ فتویٰ طلب کرنے والے کے حالات کے مطابق اس کا اعتبار کرتے تھے، جس طرح صحابہ سے منقول ہے۔ اس کی دو وجوہ ہو سکتی ہیں یا وہ اس کو تعزیر کے باب سے خیال کرتے تھے جس میں ضرورت کے مطابق کمی بیشی ہو سکتی ہے؟ جس طرح شراب نوش کی سزا میں مزید چالیس کوڑوں، سر مونڈھنے اور جلاوطن کرنے کا اضافہ کیا گیا، یا ان کے اجتہاد میں اختلاف کے باعث تھا، کبھی انھوں نے اس کو شرع لازم سمجھا اور کبھی غیر لازم سمجھا۔

بالجملہ جس حکم کو رسول اللہ ﷺ نے اپنی امت کے لیے شریعت لازم قرار دیا ہو اس کو تبدیل کرنا ممکن نہیں ہوتا، کیوں کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد نسخ محال ہے، کسی عالم کے بارے میں ایسا گمان کرنا بھی ناجائز ہے کہ اس نے ایسی جرأت کرنے کی کوشش کی ہو، بالخصوص صحابہ کرام و بالاخص خلفائے راشدین، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں ایسا گمان روافض و خوارج جیسے جاہل و گمراہ لوگ ہی کر سکتے ہیں جو بعض خلفا کو کافر یا فاسق تک قرار دیتے ہیں۔ اگر فرض محال کسی نے ایسا سوچا بھی تو مسلمانوں نے اس کی تائید و تصویب نہیں کی، کیوں کہ ایسا کرنا سب سے بڑی اور شدید برائی کا اقرار ہے امت اپنی اجتماعیت میں معصوم ہے اور اس جیسی گمراہی پر اکٹھی نہیں ہو سکتی۔ عیسیٰ بن ابان اور کئی متکلمین، معتزلہ اور اصحابِ ابو حنیفہ و مالک سے منقول ہے کہ اجماع کے ساتھ کتاب و سنت کی نصوص منسوخ ہو جاتی ہیں، ہم ان کے اس قول کی یہ تاویل کرتے تھے کہ اس سے ان کی مراد یہ ہے کہ اجماع ناسخ نص پر دلالت کرتا ہے مگر ہم نے ان سے کچھ ایسے الفاظ بھی پائے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نفسِ اجماع کو ناسخ قرار دیتے ہیں، اگر اس سے یہی ان کی مراد ہے تو پھر اس قول کی روشنی میں رسول اللہ ﷺ کے بعد مسلمانوں کا اپنے دین کو تبدیل کرنا جائز ہے، جس طرح عیسائی کہتے ہیں کہ مسیح نے اپنے علما کو مصلحت کی بنا پر حلال و حرام کرنے کا اختیار دیا ہے، مگر یہ مسلمانوں کا

دین نہیں اور نہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ایسا اپنے لیے جائز ہی سمجھتے تھے۔ جو انسان صحابہ سے متعلق ایسا عقیدہ رکھتا ہے اس سے توبہ کروائی جائے، لیکن کسی مفتی اور قاضی کا اجتہاد کرنا جائز ہے، اجتہاد میں صحیح رائے تک پہنچنے اور نہ پہنچنے دونوں کا احتمال ہوتا ہے۔ صحیح فیصلے تک پہنچنے والے کو دو اجر ملتے ہیں اور غلطی کھانے والے کے لیے ایک اجر ہوتا ہے۔ وہ شرعی حکم جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی سبب کے ساتھ معلق قرار دیا ہو وہ سبب کے وجود کے وقت مشروع ہو جاتا ہے، مثلاً: تالیفِ قلب کے لیے زکات دینا، یہ حکم کتاب وسنت سے ثابت ہے۔ کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی اس قول کے ساتھ منسوخ ہے کہ انھوں نے ذکر کیا: ''اللہ تعالیٰ نے اب تالیف سے بے پروا کر دیا ہے، جو چاہے ایمان قبول کرے جو چاہے کافر ہی رہے۔'' یہ غلط گمان ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اپنے زمانے میں ان کو دینے کی ضرورت نہیں رہی تھی، انھوں نے منسوخ ہونے کی وجہ سے نہیں، بلکہ ضرورت نہ ہونے کی وجہ سے اسے ترک کر دیا تھا، جس طرح بعض اوقات مسافر اور چٹی بھرنے والے وغیرہ معدوم ہوں تو ان کا حصہ نکالنے کی ضرورت نہیں رہتی۔

''حجِ تمتع'' سے متعلق حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ وہ اسے روکتے تھے اور ان کے بیٹے حضرت عبداللہ اور دیگر صحابہ کہتے تھے: انھوں نے اس کو حرام قرار نہیں دیا تھا، بلکہ لوگوں کو افضل کام کرنے کا حکم دینے کا ارادہ کیا تھا کہ کوئی شخص حج کے مہینوں کے علاوہ کسی مہینے میں اپنے گھر سے عمرے کی نیت لے کر حاضر ہو تو یہ عمرہ ائمہ کے اتفاق کے ساتھ تمتع اور قرآن کرنے والے کے عمرے سے افضل ہے، بلکہ ابو حنیفہ اور احمد کا منصوص مذہب یہ ہے: ''اگر کوئی حج کے مہینوں کے علاوہ عمرہ کرے اور حج کے مہینوں میں اکیلا حج کرے، تو یہ محض تمتع اور قرآن سے افضل ہے۔'' اس کے ساتھ ان دونوں ائمہ کا یہ قول بھی ہے کہ وہ محض افراد سے افضل ہے۔ کچھ کا کہنا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حج کو فسخ کر کے اس کو عمرے میں تبدیل کرنے کا ارادہ کیا۔ انھوں نے کہا: یہ حرام ہے، جائز نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کو جو حج فسخ کر کے عمرہ کرنے کا حکم دیا تھا وہ ان کے ساتھ خاص تھا۔ یہ امام ابو حنیفہ، مالک اور شافعی اور دیگر بہت سے فقہا کا قول ہے، اس کے مقابلے میں کچھ سلف وخلف نے یہ کہا ہے کہ فسخ کرنا واجب ہے اور کسی کے لیے بھی حجِ تمتع کے سوا اور کوئی حج کرنا جائز نہیں، خواہ وہ ابتدا سے اس کی نیت کرے یا بعد میں فسخ کرنے، کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر اپنے صحابہ کو اسی کا حکم دیا تھا۔ یہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما ان کے اصحاب اور ظاہریہ و شیعہ میں سے ان کی رائے کو قبول کرنے والوں کا قول ہے۔

تیسرا قول ہے کہ فسخ جائز ہے اور یہ افضل ہے، فسخ نہ کرنا بھی جائز ہے، یہ بہت سے سلف وخلف اور فقہائے حدیث میں سے احمد بن حنبل وغیرہ کا قول ہے۔ انسان کے لیے مجمع علیہ حج ادا کرنا ممکن نہیں، سوائے اس کے وہ ابتدا سے اور فسخ کیے بغیر حجِ تمتع کرے۔

حجِ افراد اور قران میں بھی سلف و خلف کا اختلاف مشہور ہے، جس طرح سفر میں روزے کے جواز، عدمِ جواز اور نماز مکمل پڑھنے کے جواز و عدم میں اختلاف ہے، لیکن بالجملہ روزے اور قصر کے جواز میں اختلاف نہیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب حجِ تمتع سے منع کیا تو عمران بن حصین، علی بن ابی طالب، عبداللہ بن عباس اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم نے ان کی مخالفت کی، لیکن جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عورتوں سے متعہ کرنے سے منع کیا تو اس مسئلے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ اور تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ان سے اتفاق کیا، بلکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے متعہ کے جواز کی مذمت کی اور کہا:

"إنك امرؤ تائهٌ، إن رسول الله حرم متعة النساء، وحرم لحوم الحمر الأهلية عام خيبر"

''تو سرگرداں آدمی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کے سال عورتوں سے متعہ کرنا اور گھریلو گدھوں کا گوشت کھانا حرام کر دیا تھا۔''

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے جوازِ متعہ اور گھریلو گدھوں کے گوشت کی اباحت کی تردید کی، کیوں کہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما ان دونوں کو جائز کہتے تھے۔ اور ان کو حدیث سنائی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں کو حرام کر دیا تھا۔ خیبر کے سال گھریلو گدھوں کو حرام کیا گیا اور فتح مکہ کے موقع پر متعہ حرام کر دیا گیا جس طرح صحیح بخاری سے ثابت ہوتا ہے۔[1] کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ متعہ کو پہلے حرام کیا گیا، پھر حلال کیا گیا، پھر حرام کیا گیا۔ کچھ نے سمجھا یہ تین مرتبہ ہوا، لیکن ایسا نہیں ہوا تھا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ فرمانا کہ ''لوگوں نے اس کام کو جلدی طلب کر لیا ہے جس میں ان کے لیے صبر اور تحمل رکھا گیا تھا، اگر ہم نے اس کو ان پر نافذ کر دیں؟ پھر انھوں نے اس کو نافذ کر دیا۔'' اس بات کی وضاحت ہے کہ لوگوں نے ایسا کام شروع کر دیا تھا، جس کی وجہ سے وہ ان کے نزدیک تینوں کو موثر کر دینے کے مستحق ہو گئے تھے۔ یہ حکم یا تو حجِ تمتع سے منع کرنے کی قبیل سے ہے، کیوں کہ وہ اس کو صحابہ کے ساتھ خاص سمجھتے تھے، جو باطل ہے، کیوں کہ یہ کام ابوبکر کے زمانے میں بھی ہوتا تھا، نیز انھوں نے کوئی ایسی بات پیش نہیں کی جس سے اس کا صحابہ کے ساتھ خاص ہونا ثابت ہوتا ہو، اس بات کے ساتھ ایسے لوگوں کا دعویٰ بے بنیاد ہو جاتا ہے جو اس کو متعہ کے منسوخ ہونے کی طرح منسوخ سمجھتا ہے۔ اگر فرض کیا جائے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسے شریعت کا لازمی حکم سمجھتے تھے تو یہ ان کا اسی طرح کا اجتہاد تھا، جس طرح کا اجتہاد حج فسخ کرنے سے متعلق تھا، کیوں کہ وہ اس کو خاص سمجھتے تھے، یہ مرجوح قول ہے کئی ایک صحابہ نے اس قول کی تردید کی ہے، دوسری دلیل بھی اس کی تردید کرنے والے کے ساتھ ہے، اسی طرح تین طلاقوں کو لازم اور نافذ کرنے کا حکم ہے۔ جن علما نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس فیصلے کو شرع لازم کہا ہے، ان سے کہا جائے گا: یہ ان کا

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٨٢٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٠٧)

اجتہاد تھا جس میں دیگر صحابہ نے ان کی مخالفت کی تھی اور جب کسی چیز میں ان کا اختلاف ہو جائے تو اس کو اللہ اور رسول کی طرف لوٹانا ضروری ہو جاتا ہے، دلیل اس کے ساتھ ہے جس نے ان کے اس مرجوح قول کی تردید کی ہے۔

یا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ فیصلہ بطور سزا کیا تھا جس کو ضرورت کے وقت نافذ کیا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مزاج کے مطابق یہی بات ان سے زیادہ لگاؤ کھاتی ہے۔ پھر یہ سزا دو وجوہ سے اجتہاد میں داخل ہو جاتی ہے، ایک تو یہ کہ کیا یہ سزا دینا مشروع ہے یا نہیں۔ بعض اوقات امام وقت اس نوع کی سزا دینا جائز خیال کرتا ہے جو دوسروں کی نگاہ میں جائز نہیں ہوتی، مثلاً حضرت علی رضی اللہ عنہ نے زنادقہ کو آگ میں جلا دیا تو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما ان کی مخالفت کی اور جمہور فقہا ان کے ساتھ ہیں اور دوسرے یہ کہ سزا اس کے لیے ہوتی ہے جو اس کا مستحق ہو، جو متقین سے ہو وہ تو اس کا مستحق ہے کہ اللہ اس کے لیے کوئی راہ اور آسانی نکالے، وہ سزا کا مستحق نہیں۔ جس انسان کو علم ہی نہیں کہ ایک ساتھ تین طلاقیں دینا حرام ہے، جب اس کو اس کا حرام ہونا معلوم ہو جائے، پھر اسی دن سے توبہ کر لے اور ارادہ کرے کہ طلاق سنت ہی دے گا، وہ شخص طلاق کے باب میں ''متقین'' میں شمار ہوتا ہے، اس جیسے انسان کی تین طلاقیں نافذ کرنا شریعت کا مطلوب نہیں، بلکہ ایک ہی طلاق لازم اور موثر ہو گی۔ یہ عظیم مسائل ہیں، ہم نے ایک دوسری جگہ دو جلدوں میں اس پر تفصیلی بحث کی ہے، یہاں ہم نے لطیف سی تنبیہ کی ہے۔

اس مسئلے میں صحابہ کے اقوال دو امور میں سے ایک پر محمول کیے جا سکتے ہیں یا وہ اس کو تعزیر کے باب سے سمجھتے تھے جس پر بوقت ضرورت عمل کیا جاتا ہے، جس طرح شراب کی حد میں چالیس کوڑوں میں اضافہ کرنا یا اس میں ان کا اجتہاد بدلتا رہا، کبھی وہ اس کو لازم سمجھتے تھے اور کبھی غیر لازم۔

یہ کہنا کہ تینوں کو لازم کرنا دیگر لازمی شرعی احکام کی طرح کا لازمی حکم ہے، اس بات پر کوئی شرعی دلیل دلالت نہیں کرتی، اس لیے یہاں راجح قول یہی ہے کہ اس سے ایک طلاق ہی ہوتی ہے، ایسا شخص اپنی بیوی سے رجوع کر سکتا ہے، بیوی کے حیض سے ہونے کی وجہ سے اس پر کوئی چیز لازم نہیں آتی، اگر وہ اللہ سے ڈرنے اور بدعت سے توبہ کرنے والا ہے۔

حیض میں طلاق:

حیض میں طلاق کے وقوع پذیر و عدمِ وقوع پذیر ہونے میں اختلاف کی بنیاد یہ ہے کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا کہ ان کے بیٹے عبداللہ نے حالتِ حیض میں اپنی بیوی کو طلاق دے دی ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا:

« مُرْهُ فَلْيُرَاجِعْهَا، حَتَّى تَحِيضَ، ثُمَّ تَطْهُرَ، ثُمَّ تَحِيضَ، ثُمَّ تَطْهُرَ »[1]

''اس سے کہہ! اس سے مراجعت کرے، یہاں تک کہ اس کو حیض آئے پھر پاک ہو، پھر حیض آئے پھر پاک ہو۔''

اب کچھ علما آپ ﷺ کے اس فرمان: « فَلْيُرَاجِعْهَا » سے مطلقہ کا رجوع سمجھے ہیں اور انھوں نے اس بنیاد پر کہا ہے کہ جس عورت کو حالتِ حیض میں طلاق دی جائے، اس کے خاوند کو اس سے رجوع کرنے کا حکم دیا جائے اور طلاق واقع ہو چکی ہے، کیا یہ حکم استحباب کا درجہ رکھتا ہے یا وجوب کا اس میں دو اقوال ہیں جو دونوں امام احمد سے دو روایات ہیں، امام ابو حنیفہ اور شافعی کے مذہب میں یہ حکم استحباب کا درجہ رکھتا ہے اور امام مالک کے مذہب میں وجوب کا۔

پھر کیا اس پہلے طہر میں طلاق دے گا جو طلاق والے حیض کے متصل بعد ہے، یا دوسرے طہر میں جو دوسرے حیض کے بعد ہے؟ اس میں بھی دو اقوال ہیں جو دونوں امام احمد سے دو روایات ہیں اور ابو حنیفہ کے قول میں دو توجیہات۔ پھر کیا وہ دوسری طلاق سے پہلے مجامعت کر سکتا ہے؟ جمہور اس کو واجب نہیں کہتے، کچھ واجب بھی کہتے ہیں۔ یہ امام احمد کے مذہب میں ایک توجیہ ہے جو طلاق واقع کرنے والے کے قول کے قیاس کے مطابق قوی ہے، مگر دلیل کے لحاظ سے کمزور ہے۔

حیض میں طلاق دینے کی ممانعت کی علت میں بھی فقہا کا اختلاف ہے۔ اصحابِ مالک و شافعی اور اکثر اصحابِ احمد کے نزدیک اس کی علت عدت کا طویل ہو جانا ہے، اصحابِ ابو حنیفہ اور حنابلہ میں سے ابو الخطاب کے نزدیک چونکہ اس نے اس وقت طلاق دی ہے جب خاوند کو بیوی میں رغبت نہیں ہوتی، طلاق اسی حالت میں دینی چاہیے جس میں مجامعت کی رغبت ہو، کیوں کہ طلاق اصل میں ممنوع ہے جو صرف حاجت کے لیے مباح ہے۔

بعض مالکیہ کے نزدیک یہ تعبدی حکم ہے اور عقل اس کی توجیہ سے قاصر ہے۔ کچھ علما نے کہا ہے کہ آپ ﷺ کے یہ فرمانے سے کہ « مُرْهُ فَلْيُرَاجِعْهَا » طلاق کا واقع ہونا لازم نہیں آتا، بلکہ جب انھوں نے حرام طلاق دی تو بیوی سے بے رخی اختیار کر لی، کیونکہ ان کے خیال میں طلاق ہو چکی تھی، لہٰذا رسول اللہ ﷺ نے ان کو حکم دیا کہ بیوی کو سابقہ حیثیت میں لوٹائے، جس طرح ایک صحیح حدیث میں آتا ہے: ایک شخص نے دو صاع کے بدلے ایک صاع بیچا تو آپ ﷺ نے اس سے کہا: یہی سود ہے تو اس نے واپس کر دیا۔[2]

صحیح میں عمران بن حصین رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: ''ایک شخص نے چھے مملوک آزاد کیے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کو

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٩٥٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٧١)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢١٨٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٥٩٤)

تین اجزا میں تقسیم کیا، دو کو آزاد کر دیا اور چار کو غلامی کی طرف واپس لوٹا دیا۔"[1] سنن میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ "رسول اللہ ﷺ نے اپنی بیٹی زینب کو پہلے نکاح کے ساتھ ہی اس کے خاوند ابو العاص کی طرف لوٹا دیا۔"[2] آپ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو وہ غلام واپس کرنے کا حکم دیا جو انھوں نے اس کے بھائی کو چھوڑ کر بیچا تھا۔ آپ ﷺ نے بشیر کو وہ غلام واپس لینے کا حکم دیا جو اس نے اپنے بیٹے کو ہبہ کیا تھا، اس کے نظائر بہت زیادہ ہیں۔

لفظ "مراجعت" پہلی حالت کی طرف لوٹ کر آنے کا نام ہے، یہ عقدِ جدید کے ساتھ بھی ہوسکتا ہے، جیسے اس آیت میں ہے:

﴿ فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ أَنْ يَّتَرَاجَعَآ ﴾ [البقرة: ۲۳۰]

"پھر اگر وہ اسے طلاق دے دے تو (پہلے) دونوں پر کوئی گناہ نہیں کہ دونوں آپس میں رجوع کر لیں۔"

اور ایک دوسرے کی طرف ہر ایک کے بدن کے رجوع کے ساتھ بھی، چاہے طلاق نہ بھی ہوئی ہو، مثلاً اگر خاوند اپنی بیوی یا لونڈی کو گھر سے نکال دے تو اس سے کہا جاتا ہے: "راجعها" اس سے مراجعت کر، تو وہ اس کو لوٹا لے۔ جیسے حدیثِ علی میں ہے:

"حين راجع الأمر بالمعروف" "جب انھوں نے امر بالمعروف کی طرف رجوع کیا۔"

ابو موسیٰ کے نام حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے خط میں ہے:

"أن تراجع الحق، فإن الحق قديم" "یہ کہ تو حق سے رجوع کر، یقیناً حق قدیم ہے۔"

لفظ مراجعت مفاعلت (یعنی دونوں طرف سے حرکت و عمل) کا تقاضا کرتا ہے جب کہ طلاق سے رجوع کی صورت میں اکیلا خاوند ہی محض اپنی زبان کے ذریعے رجوع کرنے کا اختیار رکھتا ہے، اس میں لفظ مراجعت شاذ و نادر ہی استعمال ہوتا ہے، لیکن جب عورت کے بدن کو خاوند کی طرف لوٹایا جائے اور عورت اپنی مرضی سے رجوع کرے تو ایسی صورت میں وہ ایک دوسرے سے رجوع کرتے ہیں، جس طرح تیسری طلاق کے بعد عورت کے کسی دوسرے مرد سے نکاح کرنے کے بعد وہ دونوں اپنی مرضی سے عقد کے ذریعے ایک دوسرے سے رجوع کرتے ہیں۔ طلاق سے رجوع کے لیے رد اور امساک کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں، لفظ امساک نکاح دائم رکھنے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے، جیسے اس آیت میں ہے:

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٦٨)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٢٤٠) سنن الترمذي، رقم الحديث (١١٤٣) شیخ البانی رحمہ اللہ نے إرواء الغليل (٣٣٩/٦) میں اسے صحیح کہا ہے۔

﴿ وَإِذْ تَقُولُ لِلَّذِيٓ أَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَأَنْعَمْتَ عَلَيْهِ أَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ ﴾ [الأحزاب: ٣٧]

''اور جب تو نے اس شخص سے جس پر اللہ نے انعام کیا اور جس پر تو نے انعام کیا کہہ رہا تھا کہ اپنی بیوی اپنے پاس روکے رکھ۔''

وہاں طلاق نہیں تھی، ارشاد ہے:

﴿ اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَإِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ أَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِإِحْسٰنٍ ﴾ [البقرة: ٢٢٩]

''یہ طلاق (رجعی) دو بار ہے، پھر یا تو اچھے طریقے سے رکھ لینا ہے، یا نیکی کے ساتھ چھوڑ دینا ہے۔''

یہاں طلاق کے بعد رجوع مراد ہے، یہ رجوع اکیلے مرد کا اختیار ہے اور اس میں گواہ بنانے کا حکم دیا گیا ہے، مگر رسول اللہ ﷺ نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو گواہ بنانے کا حکم نہیں دیا تھا، بلکہ فرمایا تھا: « مُرْهُ فَلْيُرَاجِعْهَا » یہ نہیں کہا: ''لیر تجعھا'' (کہ اس سے رجوع کرے)۔

مزید یہ کہ اگر طلاق واقع ہو چکی تھی تو ایسی صورت میں رجوع کا حکم دینا، تاکہ پھر سے پہلے یا دوسرے طہر میں طلاق دے، اضافی طلاق ہو گی جس میں عورت کے لیے ضرر ہے اور مکروہ طلاق میں اضافہ، اس میں مرد کا کوئی فائدہ ہے نہ عورت کی کوئی مصلحت۔ آپ ﷺ نے ان کو طلاق سے منع نہیں کیا تھا، بلکہ استقبالِ طہر کے لیے اس کو ان کے لیے جائز رکھا، جب کہ ان کا طلاق دینے کا ارادہ بھی تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کو اس کو روکے رکھنے اور طلاق کو اس کے مباح اور جائز وقت تک کے لیے موخر کرنے کا حکم دیا، جس طرح کوئی شخص کوئی کام وقت سے پہلے کر لیتا ہے تو اس کو اس کیے گئے کام کو واپس کرنے اور اس کے وقت پر، اگر مرضی ہو تو کرنے کا حکم دیا جاتا ہے، اس کی دلیل رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان ہے:

« مَنْ عَمِلَ عَمَلًا لَيْسَ عَلَيْهِ أَمْرُنَا فَهُوَ رَدٌّ »[1]

طلاق حرام اللہ اور اس کے حکم پر نہیں، اس لیے مردود ہے۔ آپ ﷺ نے طلاق کو دوسرے طہر تک موخر کرنے کا حکم اس لیے دیا تھا، تاکہ پہلے طہر میں جماع پر متمکن و قادر ہو سکیں، کیوں کہ اگر وہ اس کو اس میں طلاق دیتے تو مجامعت سے پہلے طلاق دینا جائز نہ ہوتا۔ اگر وہ پہلے طہر میں طلاق دے دیتے تو اس کو روک کر رکھنے کا حکم دینے میں عورت کے لیے مزید ضرر کے سوا اور کچھ نہ ہوتا، نیز اس میں سزا کا پہلو بھی ہے، تاکہ وہ وہی کام کریں جو اللہ نے حلال کیا ہے تو ان کے قصد و ارادے کے نقیض اور الٹ کے ساتھ سزا دی گئی۔ ہم اس مسئلے کی مزید تفصیل اور دونوں گروہوں کے تفصیلی دلائل کا جائزہ کسی دوسرے موقع کے لیے اٹھائے رکھتے ہیں۔ یہاں اقوال اور ان کے ماخذ

[1] صحيح البخاري (٢/٧٥٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧١٨)

پر تنبیہ مقصود تھی، بلاشبہہ اصل نکاح کا باقی رہنا ہے اور کوئی ایسی شرعی دلیل نہیں، جس سے اس کا حرام طلاق کے ساتھ زائل اور ختم ہو جانا ثابت ہوتا ہو، بلکہ نصوص و اصول کا تقاضا اس کے عکس ہے۔ واللہ أعلم [1]

نشے اور غیب دماغی میں دی گئی طلاق کا حکم

سوال اگر کوئی شخص نشے اور غیر حاضر دماغی کی حالت میں طلاق دینے کی قسم کھا لے تو کیا وہ واقع ہو جائے گی؟

جواب الحمد للہ. اس مسئلے میں علما کے دو اقوال ہیں، صحیح تر قول کے مطابق اس کی طلاق اور قسم واقع نہیں ہوتی، یہ امیر المومنین حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے ثابت ہے اور میرے علم کے مطابق کسی صحابی سے اس کے خلاف کوئی بات منقول نہیں، حضرت عمر بن عبدالعزیز اور اکثر سلف و خلف کا قول بھی یہی ہے، امام احمد سے بھی ایک روایت یہی ہے اور امام شافعی کا قدیم قول بھی یہی ہے، امام ابو حنیفہ کے پیروکاروں میں سے طحاوی کا مذہب بھی یہی ہے، ان کے علاوہ دیگر بہت سے فقہا کا مذہب بھی یہی ہے اور یہی درست ہے۔ صحیح مسلم میں ہے کہ ماعز بن اسلم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور اس نے زنا کا اعتراف کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا منہ سونگھنے کا حکم دیا، تاکہ معلوم ہو سکے کہ وہ نشے کی حالت میں تو نہیں؟ [2] اگر نشے کی حالت میں ہوا تو اس کا اعتراف صحیح نہیں ہوگا اور جب اس کا اعتراف صحیح نہیں ہوگا تو معلوم ہوا کہ اس کے اقوال بھی پاگل اور مجنون کے اقوال کی طرح، باطل اور لغو ہوں گے۔ نیز نشے میں مدہوش گو شراب نوشی کی وجہ سے گناہ گار ہوتا ہے، مگر اس کو علم نہیں ہوتا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ جب اس کو پتا ہی نہیں کہ وہ کیا کہہ رہا ہے تو اس کا قصد و ارادہ بھی صحیح نہیں ہوتا، کیوں کہ اعمال کا دار و مدار نیتوں پر ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی شخص کوئی ایسی چیز کھا لے جس کو کھا کر پاگل ہو جائے تو اس کا پاگل پن گو گناہ اور نافرمانی کے نتیجے میں پیدا ہوا، لیکن اس کی طلاق اور دیگر الفاظ و اقوال معتبر نہیں ہوتے۔

اصول و مقاصدِ شریعت پر غور کرنے سے بھی اس قول کا درست ہونا ہی معلوم ہوگا۔ جو لوگ نشے میں مدہوش انسان کی طلاق کو موثر قرار دیتے ہیں ان کے پاس کوئی قابلِ اعتماد اور صحیح دلیل نہیں، اس لیے ابو الولید باجی اور ابو المعالی جوینی جیسے مالکی اور شافعی محققین اس شخص پر شرعی احکام کا اطلاق کرتے ہیں جو ابھی نشے کی ابتدائی حالت میں ہو، مگر وہ جس کے بارے میں یقین ہو جائے کہ وہ اتنا دھت ہے کہ اس کو کچھ پتا نہیں کیا کہہ رہا ہے، اس کی دی گئی طلاق بلاشبہہ واقع نہیں ہوتی، اسی کی طلاق موثر ہوتی ہے جو ہوش میں ہو اور اپنے کہے گئے الفاظ سے واقف ہو۔ نیز اس

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۳۳/۷۵۔۱۰۱)

[2] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۶۹۵)

حالت میں نماز بھی صحیح نہیں ہوتی تو جس کی نماز صحیح نہیں ہوتی اس کی طلاق بھی صحیح نہیں ہوتی، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى﴾ [النساء: ٤٣]

''نماز کے قریب نہ جاؤ، اس حال میں کہ تم نشے میں ہو۔'' واللہ أعلم.[1]

مجبور کیے گئے شخص کی طلاق کا حکم

سوال اگر کسی کو طلاق دینے پر مجبور کیا جائے تو اس کی طلاق واقع ہوگی یا نہیں؟

جواب اگر کسی شخص کو ناحق طلاق دینے پر مجبور کیا جائے تو امام مالک، شافعی اور احمد وغیرہ جیسے جمہور فقہا کے ہاں ایسی طلاق موثر نہیں ہوگی، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے بھی یہی منقول ہے۔ اگر طلاق دینے والا یہ دعویٰ کرے کہ اس کو طلاق دینے پر مجبور کیا گیا ہے تو اس کا دعویٰ قبول کیا جائے گا۔[2]

طلاق کا وعدہ یا نیت کرنے سے طلاق کا حکم

سوال ایک آدمی نے اپنی بیوی سے کہا: میں تجھے نہیں چاہتا، اٹھ اپنے ماں باپ کے گھر چلی جا، میں تجھے طلاق دے دوں گا۔ وہ یہ لفظ بول کر طلاق کی نیت کرتا ہے، کیا وہ اس سے رجوع اور نئے مہر پر شادی کر سکتا ہے؟

جواب طلاق کا وعدہ کرنے سے طلاق واقع نہیں ہوتی چاہے اس کے لیے بہت سے الفاظ کہے جائیں اور اس وعدے کو پورا کرنا بھی فرض یا مستحب نہیں۔ ہاں اگر وہ یہ الفاظ: ''اپنی ماں کے گھر چلی جا'' کہنے سے پہلے طلاق واقع کر دے اور اس کو یاد دہانی کروائے کہ اس نے طلاق دے دی ہے، یہ نہیں کہ وہ اس کو طلاق دے دے گا تو اس سے ایک طلاق واقع ہو جائے گی، اگر اس نے زیادہ کی نیت نہیں کی، وہ عدت میں اس کی رضا مندی، ولی اور مہر کے بغیر رجوع کر سکتا ہے۔ واللہ اعلم[3]

دل ہی دل میں دی گئی طلاق کا حکم

سوال ایک شخص نے اپنے دل میں اپنی بیوی کو طلاق دینے کی نیت کی اور پھر دل ہی دل میں طلاق دے دی، مگر زبان سے اظہار نہ کیا تو کیا طلاق ہو جائے گی؟ نیز اگر وہ کسی کو بتائے کہ میں نے دل میں طلاق دے دی ہے تو کیا اس بتانے سے بھی ہو جائے گی یا نہیں؟

---

[1] مجموع الفتاویٰ (١٠٢/٣٣)

[2] مجموع الفتاویٰ (١١٠/٣٣)

[3] مجموع الفتاویٰ (١١١/٣٣)

جواب الحمد للّٰه. ابو حنیفہ، شافعی، احمد، جمہور علما اور ایک قول میں امام مالک کے مذہب میں اس طرح طلاق واقع نہیں ہوتی، البتہ امام مالک کے مشہور قول کے مطابق اس طرح دل میں دی گئی طلاق موثر ہو جاتی ہے۔ اسی طرح انسان نے جو دل میں کہا، اس کے اقرار سے بھی طلاق نہیں ہوتی۔ یعنی کہے: ''میں نے اپنی بیوی کو دل میں طلاق دی ہے'' مگر اپنی زبان سے طلاق نہیں دی۔ یہ اس کے دلی فعل کا اقرار ہے، لہٰذا جب دلی فعل کا اقرار موثر نہیں ہوتا تو اس کا یہ اقرار بھی غیر موثر ہے۔ واللّٰه أعلم[1]

ماں کے کہنے پر طلاق دینے یا لینے کا حکم

سوال اگر ماں اپنے بیٹے کو اپنی بیوی کو طلاق دینے یا اپنی بیٹی کو خاوند سے طلاق لینے کا حکم دے تو کیا اس کا یہ حکم ماننا فرض ہے؟

جواب محض ماں کے کہنے کی وجہ سے بیٹے کے لیے اپنی بیوی کو طلاق دینا جائز نہیں، وہ اپنی ماں کے ساتھ اچھا سلوک کرے، مگر اس کے حکم پر بیوی کو طلاق دینا اس حسنِ سلوک کا تقاضا نہیں۔

اسی طرح جب عورت کی شادی ہو جاتی ہے، اس وقت اس پر اپنے خاوند کی فرماں برداری کرنا فرض ہو جاتا ہے، اگر ماں باپ بلاوجہ ہی خاوند کو چھوڑنے کا حکم دیں، جب کہ وہ اپنے خاوند کے ساتھ خوش ہو تو ان کا یہ حکم ماننا عورت پر فرض نہیں ہوتا، بلکہ عورت اپنے خاوند کی اجازت کے بغیر اپنے والدین سے ملنے کے لیے نہیں جا سکتی، اگر خاوند اللہ کی نافرمانی پر مشتمل حکم نہیں دیتا تو اس کی فرماں برداری والدین کی فرماں برداری سے زیادہ حق رکھتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''جو عورت اس حال میں فوت ہو کہ اس کا خاوند اس پر راضی ہو، وہ جنت میں داخل ہو گی۔''[2] اگر ماں بیٹی کو اپنے خاوند کو چھوڑنے کا حکم دیتی ہے تو وہ ہاروت و ماروت کی قبیل سے تعلق رکھتی ہے، اس معاملے میں اس کی فرماں برداری جائز نہیں، خواہ وہ اس کو بد دعا ہی دے، البتہ اگر میاں بیوی دونوں اللہ کی نافرمانی کرتے ہوں، یا خاوند بیوی کو اللہ کی نافرمانی کا حکم دیتا ہو اور ماں اللہ کی فرماں برداری کا کہتی ہو تب ہر مسلمان پر اللہ اور اس کی رسول کی فرماں برداری کرنا فرض ہے۔[3]

---

[1] جامع المسائل (٧/٤٨٨۔٤٨٩)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (١١٦١) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٨٥٤) صحيح الجامع (٢٢٣٢٦)

[3] مجموع الفتاویٰ (٣٣/١١٢)

طلاق کی قسم کھانے کی شرعی حیثیت

سوال جب کوئی شخص طلاق کی قسم کھاتے ہوئے کہے: خدا کی قسم! اگر میں نے فلاں کام کیا یا نہ کیا تو میری بیوی کو طلاق ہو۔ یا اس طرح کے الفاظ بولے جن میں انسان اپنی قسم میں طلاق کو اپنے اوپر حرام کر لے، پھر توڑ دے تو کیا اس کے نتیجے میں طلاق ہو جائے گی یا نہیں؟

جواب اس مسئلے میں مذاہبِ اربعہ میں علما کے دو اقوال ہیں:

1. اس سے طلاق واقع نہیں ہوتی، یہ امام ابو حنیفہ سے منصوص ہے اور امام شافعی کے اصحاب میں سے قفال اور ''تتمہ'' کے مصنف ابو سعید متولی کا مذہب ہے۔ اس دورِ واپسیں میں بلادِ مشرق، جزیرۂ عربیہ، عراق، خراسان، حجاز اور یمن وغیرہ کے خطوں میں اہلِ سنت میں سے حنفی اور شافعی علما اور شیعہ مذہب کے کچھ گروہ اسی کے مطابق فتویٰ دیتے اور فیصلہ سناتے ہیں۔ یہ داود ظاہری اور ابن حزم وغیرہ کا مسلک بھی ہے۔ وہ بلادِ فارس، عراق، شام، مصر اور بلادِ مغرب میں آج بھی اسی کے مطابق فتویٰ دیتے اور فیصلہ سناتے ہیں۔ ان کی تعداد بے شمار ہے اور ان میں قاضیوں اور مفتیوں کی تعداد بھی بہت زیادہ ہے۔

سلف میں سے طاؤس وغیرہ کا یہی مسلک ہے، آج مغرب میں مالکی علما بھی اسی کے مطابق فتویٰ دیتے ہیں، بعض مصری علما بھی یہی فتویٰ دیتے تھے، امام احمد بن حنبل کے منصوص الفاظ اور ان کے مذہب کے اصول بھی اسی پر دلالت کرتے ہیں۔

2. اگر کوئی یہ قسم کھائے کہ خدا کی قسم! اگر میں نے ایسا کیا تو میری بیوی کو تین طلاقیں ہوں۔ اس کے متعلق اصحابِ مالک، احمد بن حنبل اور داود وغیرہ میں سے سلف و خلف تین کے موثر ہونے کا فتویٰ نہیں دیتے تھے، کچھ ایک کو موثر قرار دیتے تھے، یہ صحابہ و تابعین وغیرہ میں سے ایک گروہ سے الفاظِ تنجیز کے متعلق منقول ہے، تعلیق اور قسم کے الفاظ کی بات نہیں۔

طلاق، نذر، حرام اور ظہار جیسے مسائل میں لوگ جو الفاظ اور صیغے استعمال کرتے ہیں، ان کی تین انواع ہیں:

① ایسے الفاظ جو بولتے ہی موثر اور نتیجہ خیز ثابت ہوں اور کسی شرط یا مستقبل کے معاملے کے ساتھ مشروط نہ ہوں، فقہی اصطلاح میں انھیں ''الفاظِ تنجیز'' کہا جاتا ہے، مثلاً کوئی شخص کہے: میری بیوی کو طلاق ہے یا کہے: ''تجھے طلاق ہے'' یا کہے: ''فلاں کو طلاق ہے'' یا ''وہ مطلقہ ہے'' اس طرح کے دیگر الفاظ جب انسان بولتا ہے تو ان کے ساتھ طلاق واقع ہو جاتی ہے اور ان میں بالاجماع کفارہ فائدہ نہیں دیتا۔ اسی طرح اگر کوئی شخص کہے: میرا غلام آزاد ہے، یا مجھ پر ایک مہینے کے روزے لازم ہیں یا کہے: حلال مجھ پر حرام ہے یا بیوی سے کہے: تو مجھ پر

میری ماں کی پشت کی طرح ہے۔

② دوسری قسم: ایسے الفاظ جو قسم کے اسلوب پر مشتمل ہوں، مثلاً کہے: اگر میں نے ایسا کیا یا ایسا نہ کیا تو مجھ کو طلاق کی قسم ہے، اگر میں نے کوئی ایسا کام کیا تو مجھ پر حج لازم ہو، اگر میں نے فلاں کام کیا تو حلال مجھ پر حرام ہو، اس طرح کے یہ الفاظ تمام لوگوں کے اتفاق کے ساتھ قسمیہ الفاظ ہیں، ان قسموں کے متعلق علما کے تین اقوال ہیں:

① جب بندہ اس قسم کو توڑ دے تو اس نے جو حلف اٹھایا تھا، وہ اس کو لازم ہو گیا۔

② اس پر کچھ لازم نہیں ہو گا۔

③ اس کو قسم کا کفارہ دینا پڑے گا۔

یہ تیسرا قول ہی زیادہ ظاہر ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ قَدْ فَرَضَ اللّٰهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ اَيْمَانِكُمْ ﴾ [التحريم: ٢]

''بے شک اللہ نے تمھارے لیے تمھاری قسموں کا کفارہ مقرر کر دیا ہے۔''

نیز فرمایا:

﴿ ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَيْمَانِكُمْ اِذَا حَلَفْتُمْ ﴾ [المائدة: ٨٩]

''یہ تمھاری قسموں کا کفارہ ہے، جب تم قسم کھا لو۔''

رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''جو کوئی قسم کھائے اور دوسرے کام کو اس سے بہتر دیکھے تو وہ کام کرے جو بہتر ہو اور اپنی قسم کا کفارہ دے۔''[1] یہی مفہوم صحیح میں حضرت ابو ہریرہ، ابو موسیٰ اور عبدالرحمان بن سمرہ رضی اللہ عنہم کی احادیث میں بھی ذکر ہوا ہے اور یہ تمام قسموں کو شامل ہے۔[2] جو شخص مسلمانوں کی قسموں میں سے کوئی قسم بھی کھاتا ہے، جب اس کو توڑ دے تو کفارہ کفایت کر جاتا ہے، لیکن جو شرکیہ اور کفریہ قسم کھائے ایسی قسم منعقد نہیں ہوتی اور اس کو توڑنے میں بالاتفاق کفارہ بھی نہیں۔

③ وہ الفاظ جن میں طلاق عتاق (آزاد کرنا) یا نذر کو کسی شرط کے ساتھ معلق کیا جائے، مثلاً کہے: اگر ایسا ہوا تو مجھ پر طلاق لازم ہو جائے گی یا حج لازم ہو جائے گا یا غلام آزاد ہو جائے گا، یہ الفاظ بولنے والے سے اس کا مقصود پوچھا جائے گا، اگر ان الفاظ سے اس کا مقصود حلف اٹھانا ہو ان امور کو واقع کرنا نہ ہو، مثلاً شرط واقع ہونے کی صورت میں طلاق کا واقع ہونا اس کا مقصد نہ ہو، محض دھمکانا مقصود ہو تو یہ الفاظ قسم کا حکم رکھیں گے، اگر اس کا

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٣٣٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٥٠)

[2] أيضاً.

مقصود شرط پوری ہونے کی صورت میں ان امور کو واقع کرنا ہو تو پھر یہ واقع ہو جائیں گے، مثلاً: کوئی شخص اپنی بیوی سے کہے: ''اگر تم نے فلاں کام کیا تو تجھے طلاق ہو جائے گی۔'' اگر اس کا مقصود اس شرط کے پورا ہونے کی صورت میں اس کو طلاق دینا ہے تو پھر طلاق ہو جائے گی۔ اگر ان الفاظ سے اس کا مقصد صرف اس کو اس کام سے روکنے کے لیے طلاق کی قسم دینا ہے تو ایسی صورت میں اگر وہ عورت وہ ممنوعہ کام کرے تو اس کو طلاق نہیں ہوگی، کیوں کہ اصل میں اس کا مقصد اس شرط کے پورا ہونے کی صورت میں اس کو طلاق دینا نہیں تھا۔

قسم اور تعلیق میں یہ فرق ہے کہ قسم کسی کام کی ترغیب دینے یا اس سے روکنے یا اس کی تکذیب کرنے یا تصدیق کرنے کے لیے کھائی جاتی ہے، قسم کھانے والا، اس شرط کے وقوع کو پسند نہیں کرتا جس کا ذکر اپنی قسم میں کرتا ہے، مگر جو کسی چیز کے وجود کو کسی شرط کے ساتھ معلق کرتا ہے، وہ اس شرط کے واقع ہونے کے وقت اس جزا اور جواب کو لازم کرنے میں کراہت محسوس نہیں کرتا، دوسرے الفاظ میں جو شرط کے متحقق ہونے کی صورت میں اس کے جواب اور نتیجے کو نافذ کرنے میں کراہت محسوس کرتا ہے، وہ حلف اٹھانے والا ہوتا ہے اور جو جزا کو واقع کرنے کا ارادہ رکھتا ہے، وہ حلف اٹھانے والا نہیں ہوتا، لہٰذا وہ قسم جس کا مقصد ترغیب دینا، روکنا یا تصدیق و تکذیب کرنا ہو، خواہ وہ قسم کے اسلوب میں ہو یا شرط کے اسلوب میں وہ سب کے نزدیک قسم ہے، جس طرح ہر زبان میں جملہ امر، نہی اور خبر مشتمل ہوتا ہے، اسی طرح قسم پر بھی مشتمل ہے، زبانیں الفاظ میں مختلف ہوتی ہیں، معانی میں نہیں، کسی عجمی زبان میں جس لفظ کا مفہوم امر، نہی، خبر یا قسم پر مشتمل ہو، عربی زبان میں اس کا ترجمہ کرتے وقت بھی وہ امر، نہی، خبر یا قسم کے مفہوم ہی پر مشتمل ہوگا۔

اگر ان الفاظ سے قسم مراد ہو تو کتاب و سنت میں قسم کے دو ہی حکم ہیں، یا قسم نافذ اور منعقد ہوگی اور اس کا احترام کیا جائے گا، اس کو توڑنے کی صورت میں کفارہ ہے، یا وہ قسم قابلِ احترام اور منعقد نہیں ہوگی، اس کو توڑنے کی صورت میں بالاتفاق کوئی کفارہ لازم نہیں آتا، لیکن کوئی ایسی قسم جو قابلِ احترام بھی ہو اور منعقد بھی ہو، مگر اس کو توڑنے کی صورت میں اس میں کفارہ نہ ہو، یہ کتاب و سنت میں نہیں۔ اگر یہ قسم مسلمانوں کی قسموں سے تعلق رکھتی ہو تو وہ اس فرمان میں داخل ہے:

﴿ قَدْ فَرَضَ اللّٰهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ اَيْمٰنِكُمْ ﴾ [التحریم: ۲]

''بے شک اللہ نے تمھارے لیے تمھاری قسموں کا کفاہ مقرر کر دیا ہے۔''

اگر مسلمانوں کی قسموں سے نہیں تو وہ توڑنے کی صورت میں ضائع ہوگی اور اس میں کفارہ وغیرہ لازم نہیں آئے گا۔

اسی طرح کتاب وسنت اور صحیح قیاس کی دلالت سے ثابت ہوتا ہے کہ طلاق کی قسم کھانے والے کی طلاق کو لازم اور واقع قرار دینا کتاب وسنت کے مخالف ہے اور دوسرے قول کے مطابق یہ ایک اجتہادی مسئلہ ہے، اگر اس جیسے مسئلے میں کوئی یہ کہے کہ سب مسلمانوں پر اس قول پر عمل کرنا فرض نہیں، بلکہ حرام ہے تو یہ بات کوئی مسلمان عالم نہیں کہہ سکتا، جس کو اختلاف اور دلائل کا علم ہو، جو عالم کسی مرجوح قول کو صحیح اور جائز سمجھتا ہو اور راجح قول اس پر پوشیدہ رہے تو وہ اس کے مطابق فیصلہ اور فتویٰ دے سکتا ہے، لیکن اس مرجوح قول کو سب مسلمانوں پر لازم کرنا اور اس قول سے روکنا جس پر کتاب وسنت دلالت کرتے ہوں، اللہ، اس کے رسول کے حکم اور مومن بندوں کی روش کے خلاف ہے۔ کوئی صاحبِ علم اس طرح نہیں کہہ سکتا، اگر کوئی اس طرح کا فتویٰ دے تو اس کو معذور تو سمجھا جا سکتا ہے، مگر اس کی پیروی فرض نہیں، جو خواہش پرست اور عناد رکھنے والا ہو، وہ حق واضح ہونے پر بھی قبول نہیں کرتا، بلکہ اللہ کی ہدایت کے بغیر اپنی خواہش کی پیروی کرتا ہے، ایسے لوگوں کے متعلق ہی اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ ﴾ [القصص: ٥٠]

''اور اس سے بڑھ کر گمراہ کون ہے جو اللہ کی طرف سے کسی ہدایت کے بغیر اپنی خواہش کی پیروی کرے۔''

ایسے فتوے دینے والا یا مقلد ہو گا یا مجتہد، مقلد اپنے متبوع اور امام کے قول کے مخالف قول کا اس شخص کی طرح انکار نہیں کر سکتا جو اسے باطل کہتا ہو، کیوں کہ اس کو اس کے باطل ہونے کا علم ہی نہیں ہوتا، اس کو حرام قرار دینا تو ایک طرف رہا، وہ تو بس اپنے بزرگ کے قول کو لازم اور واجب کہتا ہے، مگر مجتہد غور کرتا ہے، بحث کرتا ہے، وہ اپنے قول کے ظاہر ہونے کے باوجود اجتہادی مسئلے میں مخالف کے قول کو اس وقت تک باطل نہیں کہتا جب تک اس کا نص یا اجماع کے خلاف ہونا ظاہر نہ ہو جائے، تو جو انسان جائز تقلید اور اجتہاد کی حد سے نکل جائے، وہ ان لوگوں کے مشابہ ہے جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ﴾ [البقرة: ١٧٠]

''اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس کی پیروی کرو جو اللہ نے نازل کیا ہے تو کہتے ہیں بلکہ ہم تو اس کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔''

اور وہ بے ہدایت خواہش کی پوجا کرنے والوں میں شامل ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی کہے کہ اس فتوے پر عمل کرنے کے بعد جو اولاد ہو وہ زنا کی اولاد ہو گی تو یہ بات کہنے والا انتہائی درجے کا جاہل، گمراہ اور اللہ اور اس کے رسول کا مخالف ہے۔

قصہ مختصر اگر وہ کام جس پر قسم کھائی ہو، اس کا تعلق کسی عبادت سے ہو تو اسے کرنا لازم ہے، یا کفارہ دے، اگر وہ کام عبادت سے تعلق نہ رکھتا ہو، مثلاً طلاق دینے، بیع کرنے یا اجارہ وغیرہ جیسا کوئی معاملہ ہو تو وہ لازم نہیں ہوگا، بلکہ صحابہ اور جمہور اہلِ اسلام کے نزدیک وہ صرف قسم کا کفارہ دے گا۔ امام شافعی اور احمد کا قول بھی یہی ہے اور ایک روایت میں امام ابو حنیفہ کا قول بھی یہی ہے۔ اسی طرح محققین مالکیہ کا رجحان بھی اسی طرف ہے، کیوں کہ طلاق کی قسم کھانے کی صورت میں اگر شرط واقع ہو جائے تو طلاق دینے والا اس کے واقع ہونے کو ناپسند کرتا ہے، جس طرح کوئی کہے کہ اگر میں نے فلاں کام کیا تو کافر یا یہودی ہو جاؤں گا اور اگر وہ شرط وجود پذیر ہو جائے تو وہ یہودی یا کافر ہونا پسند نہیں کرتا، اور وہ کافر نہیں ہوتا، اس پر صرف کفارہ ہے۔ واللہ أعلم.[1]

معلق طلاق پر بھول کر عمل کرنے کا حکم

سوال ایک شخص نے اپنی بیوی سے کہا: اگر تو گھر داخل ہوئی تو تجھے طلاق، وہ بھول کر داخل ہوگئی، کیا اس کو طلاق ہوگئی؟

جواب الحمد للہ. جب خاوند نے کہا: اگر تو گھر میں داخل ہوئی تو تجھے طلاق ہو جائے گی، وہ بھول کر داخل ہوگئی تو علما کے ظاہر تر قول کے مطابق طلاق نہیں ہوگی، یہ عمرو بن دینار اور ابن جریج وغیرہما جیسے فقہائے مکہ کا مذہب ہے اور امام احمد سے بھی ایک روایت یہی ہے۔ واللہ أعلم[2]

معلق طلاق پر غلط فہمی کی بنا پر عمل کا حکم

سوال ایک شخص نے بیوی سے کہا: اگر تو میری اجازت کے بغیر گھر سے اتری تو بخدا تجھے تین طلاقیں ہو جائیں گی۔ پھر بیوی نے کہا: آج میں اور تیری ماں دوپہر کا کھانا کھائیں گے۔ خاوند سمجھا کہ اس کی ماں اس کی طرف آئے گی۔ بیوی نے سمجھا کہ اس نے اس کو جانے کی اجازت دے دی ہے تو وہ اس کی ماں کی طرف چلی گئی۔ ایسی صورت میں طلاق ہوگئی یا نہیں؟

جواب اگر یہی صورت حال ہے تو علما کے صحیح تر قول کے مطابق طلاق نہیں ہوئی۔ یہ امام شافعی کا ایک قول اور امام احمد سے ایک روایت ہے۔ لاعلمی اور بھول کر کام کرنے کی حالت کی غلطی ہے۔ اس میں اختلاف مشہور ہے کہ آیا مرد کی قسم ٹوٹ گئی یا نہیں ٹوٹی؟ یا کفارہ والی قسم اور غیر کفارے والی قسم میں فرق کیا جائے گا یا نہیں؟

درست رائے یہ ہے کہ وہ مطلقاً حانث نہیں ہوتا، یعنی اس کی قسم نہیں ٹوٹتی، کیوں کہ اچھائی اور قسم کا ٹوٹنا حکم

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۳۳/۱۳۱-۱۴۴)

[2] مجموع الفتاویٰ (۳۳/۱۶۹)

میں فرماں برداری اور نافرمانی کے قائم مقام ہے، جب محلوف علیہ جملہ طلبیہ، یعنی امر و نہی پر مشتمل ہو، محلوف علیہ (جس پر قسم کھائی جائے) یا جملہ خبریہ ہوتا ہے، جہاں قسم کھانے والے کا مقصود تصدیق یا تکذیب ہوتا ہے یا جملہ طلبیہ اس وقت حلف اٹھانے والے کا مقصود ترغیب دینا یا منع کرنا ہوتا ہے، وہ اپنے آپ کو یا جس پر قسم کھا رہا ہوتا ہے، ترغیب دیتا ہے یا منع کرتا ہے۔ یہ امر یا نہی کا لفظ ہوتا ہے جس کی جملہ قسمیہ کے ساتھ تاکید کی جاتی ہے، اس کو توڑنا محض امر کی نافرمانی کی طرح ہے۔ شریعت میں یہ طے اور ثابت شدہ قاعدہ ہے کہ جو انسان ممنوع کام بھول کر یا غلطی سے اور منع نہ سمجھتے ہوئے کرتا ہے، جس طرح تاویل سائغ کرنے والے ہوتے ہیں۔ یہ شخص گناہ گار یا نافرمان نہیں ہوتا، اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کی یہ دعا قبول فرمائی ہے:

﴿ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ إِن نَّسِينَآ أَوْ أَخْطَأْنَا ۚ ﴾ [البقرة: ٢٨٦]

''اے ہمارے رب! ہم سے مؤاخذہ نہ کر اگر ہم بھول جائیں یا خطا کر جائیں۔''

اسی طرح جو انسان قسم کھا کر بھول جاتا ہے یا تاویل اور سننے وغیرہ میں بھی غلطی سے یہ سمجھتا ہے کہ اس نے جو کام کیا ہے قسم اس کے لیے نہیں کھائی گئی۔ وہ قسم کی مخالفت کرنے والے شمار نہیں ہوتا، لہٰذا وہ حالف بھی نہیں ہوتا۔ یہاں اللہ کی قسم اور دیگر تمام قسموں میں کوئی فرق نہیں، کیوں کہ قسموں کا حکم محلوف بہ (جن الفاظ کے ساتھ قسم کھائی گئی ہو) کے لحاظ سے علاحدہ علاحدہ ہوتا ہے، محلوف علیہ (جس شخص کو قسم دی گئی ہو) کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہوتا، یہاں محلوف علیہ پر بات ہو رہی ہے، محلوف بہ پر نہیں۔

یہ عام سی بات ہے کہ جو انسان طلاق دینے یا آزاد کرنے کی قسم کھاتا ہے وہ اس کو محض تعلیق کی حیثیت نہیں دیتا، مثلاً طلوعِ شمس کے ساتھ معلق کرنا، شرط اور جزا کا وقوع پذیر ہونا بھی اس کا مقصود نہیں ہوتا، جس طرح نذر تبرر اور خلع وغیرہ میں عوض پر معلق کیا جاتا ہے، بلکہ اس کا مقصد اپنے آپ کو ترغیب دینا یا منع کرنا یا محلوف علیہ کو ترغیب دینا یا منع کرنا ہوتا ہے، جس طرح یہ نذر ماننے والے نذر لجاج یا غضب مانتا ہے۔

اس لیے اس کو یمین کا نام دینے پر علما کا اتفاق ہے، امام احمد وغیرہ کے مذہب میں اس میں استثنا (ان شاء اللہ کہنا) جائز ہے، تعلیق محض کے عکس، کیوں کہ اس کو وقت کے ساتھ منعقد کیا جاتا ہے۔ وہ صحیح مذہب کے مطابق یمین نہیں اور اس میں ان کے نزدیک استثنا جائز نہیں، جو منعقد کرنے میں استثنا کے جواز کے قائل نہیں، یعنی امام مالک اور احمد وغیرہما۔ واللہ أعلم [1]

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۲۳۱/۳۳)

کسی سبب کی وجہ سے معلق طلاق کا حکم

سوال ایک شخص کی بیوی حاملہ تھی۔ اس نے خاوند کو مجامعت سے روک دیا، جس کی وجہ سے خاوند رنجیدہ خاطر ہو گیا اور اس نے کہا: اگر بچے کی پیدایش کے بعد میں نے مجامعت کی تو تجھے طلاق ہو گی۔ اگر وہ ولادت کے بعد جماع کرے تو کیا طلاق ہو جائے گی یا نہیں؟ یا اس قسم پر اکسانے والے سبب کو دیکھا جائے گا؟

جواب اگر خاوند ولادت کے بعد جماع کرے تو قسم کھانے کی نیت اور قسم کے سبب کو دیکھا جائے گا۔ اگر قسم کسی سبب کی وجہ سے تھی اور سبب ختم ہو گیا تو حنبلی مذہب میں ظاہر تر رائے کے مطابق اس پر کوئی کفارہ نہیں۔

جو انسان کسی خاص سبب کی وجہ سے قسم کھاتا ہے، مثلاً: اس نے کسی شہر میں ظلم دیکھا تو قسم کھا کر کہا کہ وہ کبھی اس شہر میں داخل نہیں ہو گا، پھر ظلم ختم ہو گیا، کیا وہ حانث ہو گا یا نہیں، ظاہر تر قول کے مطابق وہ قسم توڑنے پر گناہ گار نہیں ہو گا، کیوں کہ قسم میں ترغیب یا منع، امر و نہی کی طرح ہے۔ ایسا شخص اپنے آپ کو یا محلوف علیہ کو منع کرتا یا ترغیب دیتا ہے۔ جو شخص کسی خاص وجہ سے کسی سے بات کرنے یا کسی شہر میں داخل ہونے سے روکتا ہے، جب وہ سبب ختم ہو جائے تو منہی عنہ بھی ختم ہو جاتا ہے، مثلاً کوئی شخص کسی کافر سے سلام نہیں کرتا، یا کسی علاقے میں دار الحرب ہونے کی وجہ سے داخل نہیں ہوتا، بعد میں وہ شخص مسلمان ہو جاتا ہے یا دار الحرب، دار السلام بن جاتا ہے تو جو حکم کسی علت کی وجہ سے تھا وہ علت کے زائل ہونے سے ختم ہو جاتا ہے۔

بنابریں اگر آدمی اپنی بیوی کو سزا دینے کے لیے اس سے جماع نہ کرنے کی قسم کھا لیتا ہے، کیوں کہ وہ اس کی طلب کے وقت ٹال مٹول کرتی ہے۔ اگر وہ اپنی اس حرکت سے توبہ کرے اور خاوند کی فرمانبردار بن جائے تو چھوڑے رکھنے کا سبب ختم ہو گیا، جس پر اس نے اپنے عمل کو معلق کیا تھا۔ اگر خاوند کا مقصد اس پہلے ہوئے گناہ کی وجہ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مجامعت چھوڑ دینا ہے، خواہ بیوی توبہ کرے یا نہ کرے، یعنی اگر خاوند کو علم ہو جائے کہ بیوی نے صحیح توبہ کی ہے مگر اس کا مقصد اس کے گزرے ہوئے گناہ کی سزا دینا تھا جس طرح انسان کسی کو اس کے سابقہ گناہ کی سزا دیتا ہے، وہ توبہ کرے یا نہ کرے۔ وہ اس کو مستقبل میں روکنے کی وجہ سے سزا نہیں دیتا، بلکہ محض اپنے سینے کو ٹھنڈا اور اپنے غصے کی پیاس بجھانے کے لیے ایسا کرتا ہے، تو یہ ایک دوسری نوع ہے۔ واللہ أعلم [1]

مسئلہ سریجیہ کا حکم

سوال مسئلہ سریجیہ کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟ اس کی صورت یہ ہے کہ آدمی بیوی سے کہے: ''اگر میں نے

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۲۳۴/۳۳)

تجھے طلاق دی تو تجھے اس سے پہلے تین طلاقیں ہو جائیں گی۔'' یہ مسئلہ ابن سریج کے نام سے معروف ہے۔

جواب صحابہ، تابعین، تبع تابعین، ائمہ اربعہ اور ان کو پانے والے ان کے اصحاب ابو یوسف، محمد، مزنی، بویطی، ابن القاسم، ابن وہب، ابراہیم حربی، ابوبکر الاثرم اور ابو داود وغیرہ میں سے کسی ایک نے بھی اس مسئلے کا فتویٰ نہیں دیا۔ ان کے بعد فقہا کے ایک گروہ نے اس کا فتویٰ دیا، مگر امت کے جمہور حنفی، مالکی، حنبلی اور اکثر شافعی فقہا نے ان کی تردید کی۔ امام غزالی پہلے اس کے قائل تھے، بعد میں انھوں نے اس سے رجوع کر لیا اور اس کی خرابی بیان کی۔

مسلمانوں کے دین میں یہ معروف اور عام بات ہے کہ ان کے نکاح عیسائیوں کے نکاح کی طرح نہیں ہوتے۔ ان فقہا کو اس میں جس ''دَور'' کا وہم ہوا ہے وہ باطل ہے۔ انھوں نے سمجھا کہ اگر منجز یعنی حالیہ طلاق ہو گئی تو معلق بھی ہو جائے گی، مگر معلق تب ہوتی ہے جب تعلیق صحیح ہو، یہاں تو تعلیق ہی باطل ہے، کیوں کہ یہ شریعت میں محال پر مشتمل ہے، یعنی ایک طلاق سے پہلے تین کا واقع ہو جانا شریعت میں محال ہے۔ تسریج یعنی اس فتوے پر عمل کرنا اس شرعی محال پر مشتمل ہے، اس لیے یہ باطل ہے، اگر اس شخص نے یہ سمجھتے ہوئے طلاق کی قسم کھائی کہ وہ حانث نہیں ہو گا، یعنی قسم نہیں توڑے گا، بعد میں اس کو اس کا ناجائز ہونا معلوم ہوا تو وہ اپنی بیوی کو روک کر رکھے۔ ماضی کی کوئی طلاق نہیں، مستقبل میں توبہ کرے۔

حاصلِ کلام یہ ہے کہ اگر آدمی اپنی بیوی سے کہے: اگر میں نے تجھے طلاق دی تو تجھے اس سے پہلے تین طلاقیں ہو جائیں گی، پھر وہ اس کو طلاق دیتا ہے تو راجح قول کے مطابق حالیہ طلاق ہو جائے گی اور معلق نہیں ہو گی، کیوں کہ اگر معلق بھی ہو جائے، جو تین طلاقیں ہیں تو حالیہ نہیں ہو گی، کیوں کہ وہ طلاق کی متعین تعداد سے زیادہ ہے، اگر حالیہ نہیں ہوئی تو معلق بھی نہیں ہوئی۔ ایک قول ہے اس سے کوئی طلاق نہیں ہوتی، کیوں کہ حالیہ کا واقع ہونا معلق کے واقع ہونے کا تقاضا کرتا ہے اور معلق کا واقع ہونا حالیہ کے عدمِ وقوع کا تقاضا کرتا ہے، لہٰذا طلاق ہو ہی نہیں سکتی (اس چکر کو منطق کی اصطلاح میں دَور کہتے ہیں) اس قول کی تقلید جائز نہیں۔ شیخ عز الدین نے اس کو قاضی سریج کی طرف منسوب کیا ہے، مگر وہ اس سے بری ہے۔[1]

[1] مجموع الفتاویٰ (۳۳/۲٤۲_۲٤٤)

ظہار، نسب، عدت، رضاعت

ظہار کا حکم

سوال اگر کوئی شخص اپنی بیوی کے متعلق کہے: وہ مجھ پر میری ماں یا بہن کی طرح ہے تو کیا یہ الفاظ کہنے سے وہ اس پر حرام ہو جائے گی اور طلاق ہو جائے گی یا نہیں؟

جواب الحمد للہ رب العالمین. اگر قائل کا مقصود یہ ہے کہ وہ میری ماں کی طرح عزت و احترام کی حامل ہے، اس کی طرح میرے راز چھپا کر رکھتی ہے اور مجھے رسوا اور ملامت نہیں کرتی، جس طرح ماں کا بیٹے کے ساتھ رویہ ہوتا ہے۔ اس کا رویہ بھی اسی طرح کا ہے تو پھر اس کی بیوی اس پر حرام نہیں ہو گی، مگر یہ بات کہنے کی وجہ سے اس کی تادیب اور سرزنش کی جانی چاہیے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ایک آدمی کو اپنی بیوی کو ''اے میری بہن'' کہہ کر مخاطب کرتے ہوئے سنا تو اس کو سرزنش کی اور ڈانٹتے ہوئے کہا: کیا وہ تیری بہن لگتی ہے؟! اس لیے انسان کو اپنی بیوی کو اپنی ماں کی طرح قرار نہیں دینا چاہیے۔

اگر اس بات سے اس کا مقصود یہ ہے کہ جس طرح ماں سے جنسی تعلق قائم کرنا حرام ہے اس سے جنسی تعلق بھی اسی طرح حرام ہے اور جس طرح ماں لذت اندوزی کا مقام نہیں، اسی طرح یہ بھی نہیں تو بلاشبہہ یہ شخص ظہار کر رہا ہے اور جو ظہار کا حکم ہے اس پر بھی وہی لاگو ہوتا ہے۔ یہ جب تک ظہار کا کفارہ ادا نہیں کر لیتا جو بالترتیب غلام آزاد کرنا، عدمِ دستیابی کی صورت میں دو ماہ کے مسلسل روزے رکھنا، اور عدمِ استطاعت کی حالت میں ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے، اس وقت تک بیوی سے مجامعت نہیں کر سکتا۔ جب وہ کفارہ ادا کر لے تو تمام مسلمانوں کے اتفاق کے ساتھ وہ اس کے حلال ہو جائے گی۔ امام ابو حنیفہ، شافعی اور احمد کے نزدیک اپنی بیوی کو اپنی ماں کے مانند قرار دینے والا ظہار کرتا ہے، اس سے طلاق واقع نہیں ہوتی، البتہ مالکی مذہب میں اختلاف ہے، لیکن قطعی درست مذہب یہی ہے کہ اس سے طلاق واقع نہیں ہوتی، مگر آدمی اس وقت تک بیوی سے مجامعت نہیں کر سکتا جب تک کفارہ ادا نہ کر لے، اس مسئلے کی وضاحت ان آیات میں مذکور ہے:

﴿ اَلَّذِيْنَ يُظٰهِرُوْنَ مِنْكُمْ مِّنْ نِّسَآىِٕهِمْ مَّا هُنَّ اُمَّهٰتِهِمْ ؕ اِنْ اُمَّهٰتُهُمْ اِلَّا الّٰٓـِٔيْ وَلَدْنَهُمْ ؕ

وَاِنَّهُمْ لَيَقُوْلُوْنَ مُنْكَرًا مِّنَ الْقَوْلِ وَزُوْرًا ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ ۝ وَالَّذِيْنَ يُظٰهِرُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا قَالُوْا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَآسَّا ؕ ذٰلِكُمْ تُوْعَظُوْنَ بِهٖ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَآسَّا ۚ فَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَاِطْعَامُ سِتِّيْنَ مِسْكِيْنًا ؕ ﴾ [المجادلة: ٢۔ ٤]

''وہ لوگ جو تم میں سے اپنی بیویوں سے ظہار کرتے ہیں وہ ان کی مائیں نہیں ہیں، ان کی مائیں ان کے سوا کوئی نہیں جنھوں نے انھیں جنم دیا اور بلاشبہہ اللہ یقیناً بے حد معاف کرنے والا، نہایت بخشنے والا ہے۔ اور وہ لوگ جو اپنی بیویوں سے ظہار کرتے ہیں، پھر اس سے رجوع کر لیتے ہیں جو انھوں نے کہا، تو ایک گردن آزاد کرنا ہے، اس سے پہلے کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو ہاتھ لگائیں، یہ ہے وہ (کفارہ) جس کے ساتھ تم نصیحت کیے جاؤ گے، اور اللہ اس سے جو تم کرتے ہو، پوری طرح باخبر ہے۔ پھر جو شخص نہ پائے تو دو پے در پے مہینوں کا روزہ رکھنا ہے، اس سے پہلے کہ دونوں ایک دوسرے کو ہاتھ لگائیں، پھر جو اس کی (بھی) طاقت نہ رکھے تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے۔'' واللہ أعلم.[1]

شادی کے چھے ماہ بعد پیدا ہونے والے بچے کا نسب

سوال ایک شخص نے کنواری اور بالغ لڑکی سے شادی کی اور دخول کے بعد اس کو کنواری ہی پایا، مگر دخول کے ٹھیک چھے ماہ بعد اس نے بچے کو جنم دیا، کیا یہ بچہ اس کی طرف منسوب اور ملحق ہوگا یا نہیں؟ اسی طرح اس شخص نے طلاق کی قسم کھا کر کہا کہ یہ بچہ اسی کی صلب سے ہے۔

جواب اگر عورت دخول کے ٹھیک چھے ماہ بعد بچے کو جنم دے تو یہ بچہ بالاتفاق اس کے خاوند کے ساتھ ملحق ہوگا۔ اسی طرح کا ایک واقعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں بھی رونما ہوا تھا اور صحابہ نے چھے ماہ کے حمل کے امکان پر اس آیت سے استدلال کیا:

﴿ وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا ﴾ [الأحقاف: ١٥]

''اور اس کے دودھ چھڑانے کی مدت تیس مہینے ہے۔''

اور اس کے ساتھ اس آیت سے بھی:

﴿ وَالْوٰلِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ ﴾ [البقرة: ٢٣٣]

[1] مجموع الفتاویٰ (٧/٣٤)

''اور مائیں اپنے بچوں کو پورے دو سال دودھ پلائیں۔''

اگر تیس ماہ سے مدتِ رضاعت دو سال، یعنی چوبیس ماہ نکال لیے جائیں تو باقی مدتِ حمل چھے ماہ بنے گی۔ اسی طرح اس آیت میں بیک وقت رضاعت کی تکمیل کے ساتھ کم از کم مدتِ حمل چھے ماہ ذکر ہوئی ہے۔ یہ شخص اس بچے کے نسب کا اقرار بھی کر رہا ہے، بلکہ اگر وہ کسی مجهول النسب کو بھی اپنے ساتھ ملائے اور کہے کہ وہ میرا بیٹا ہے اور اس کا امکان بھی ہو تو بالاتفاق اس کو اس کے ساتھ ملحق کیا جائے گا، یہ شخص جو اس بیٹے کے اپنا ہونے کی قسم کھا رہا ہے، قسم میں سچا ہے اور اس کی قسم ٹوٹی نہیں۔ واللہ أعلم [1]

شادی کے دو ماہ بعد پیدا ہونے والے بچے کے نسب کا حکم

سوال ایک شخص نے ایک عورت سے شادی کی، لیکن نہ دخول کیا، نہ مجامعت ہی، دو ماہ بعد اس نے بچے کو جنم دیا، کیا یہ نکاح درست ہے اور حق مہر ادا کرنا لازمی ہے یا نہیں؟

جواب الحمد للہ. اس پر سب علما کا اتفاق ہے کہ یہ بچہ اس شخص کی طرف منسوب نہیں کیا جائے گا، اسی طرح وہ عورت مہر کی حق دار بھی نہیں، لیکن اس عقدِ نکاح کی صحت کے حوالے سے علما کے دو اقوال ہیں:

امام مالک اور احمد وغیرہ کے نزدیک عقد باطل ہے اور یہی زیادہ صحیح مذہب ہے، اس لیے دونوں میں علاحدگی کرانا ضروری ہے۔ مرد کے ذمے پورا مہر ہے نہ آدھا اور نہ متعۂ طلاق ہی، جس طرح تمام فاسد عقود کا حکم ہے۔ یہ تب ہے جب دخول سے پہلے علاحدگی ہو جائے، لیکن یہ کام وہ حاکم اور قاضی ہی کرے گا جو اس جیسے نکاح کو باطل سمجھتا ہو، تاکہ کوئی اختلاف اور جھگڑا پیدا نہ ہو۔

دوسرا امام ابو حنیفہ کا قول ہے، جس کے مطابق عقد صحیح ہے، لیکن مرد کے لیے اس وقت تک جماع کرنا جائز نہیں جب تک وہ بچے کو جنم دے کر فارغ نہ ہو جائے۔ امام شافعی کے نزدیک وضعِ حمل سے پہلے مجامعت کرنا جائز ہے۔ ان دونوں اقوال کی روشنی میں دخول سے پہلے طلاق دینے کی صورت میں مرد پر آدھا مہر ادا کرنا لازم آئے گا۔ یاد رہے کہ یہ اختلاف جماعِ شبہہ کے نتیجے میں ہونے والے حمل کی صورت میں ہے۔ اگر وہ عورت زنا کے نتیجے میں حاملہ ہوئی ہو تو اس وقت صحتِ نکاح میں کوئی کلام نہیں۔ نزاع اس صورت میں ہے جب اس نے اس کی مرضی سے اس سے نکاح کیا ہو، اگر اس کی مرضی کے بغیر اس کو مجبور کر کے نکاح کیا ہو تب شافعی اور حنبلی مذہب میں نکاح باطل ہے۔ واللہ أعلم [2]

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۱۰/۳۴)

[2] مجموع الفتاویٰ (۳۴/۱۷۔۱۸)

تین طلاقیں دے کر رجوع کرنے والے کی اولاد کا حکم

سوال ایک شخص نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دیں، کسی مفتی نے اس کو فتوی دیا کہ طلاق نہیں ہوئی، خاوند نے اس مفتی کے فتوے پر عمل کیا اور بیوی سے جنسی تعلقات استوار کر لیے، جس کے نتیجے میں اس عورت نے بچے کو جنم دیا، لوگوں نے کہنا شروع کر دیا کہ یہ ولد الزنا ہے۔ کیا وہ واقعی ولد الزنا یعنی زنا کی اولاد ہے؟

جواب جس نے یہ بات کہی ہے، انتہائی جہالت اور گمراہی کی بات کہی ہے اور اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کی ہے۔ اس بات پر سب مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ ہر وہ نکاح جس کو خاوند جائز نکاح سمجھتا ہو اور مجامعت کرے تو اس کی اولاد اس کی طرف منسوب ہو گی اور وہ ایک دوسرے کے وارث بھی بنیں گے، چاہے نفسِ امر میں وہ نکاح بالاتفاق باطل ہو، خواہ نکاح کرنے والا کافر ہو یا مسلمان۔ اگر کوئی یہودی اپنی بھتیجی سے نکاح کرتا ہے تو اس سے ہونے والی اس کی اولاد اس کی طرف منسوب ہو گی اور وہ ایک دوسرے کے وارث بھی بنیں گے، اس پر سب مسلمانوں کا اتفاق ہے، گو وہ نکاح تمام مسلمانوں کے نزدیک باطل ہے اور اس کو حلال سمجھنے والا دائرۂ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے اور اس سے توبہ کروانا ضروری ہوتا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی جاہل مسلمان عدت کے دوران میں کسی عورت سے شادی کرے اور اس کو اپنی بیوی سمجھتے ہوئے جنسی تعلقات بنا لے تو اس سے ہونے والی اولاد اسی کی طرف منسوب ہو گی اور وہ بالاتفاق اس کا وارث بھی بنے گا۔

دراصل نسب کا ثبوت نفسِ امر میں صحتِ نکاح کا محتاج نہیں، بلکہ بچہ اسی کا ہے جس کے بستر پر جنم لے، جس طرح رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

«اَلْوَلَدُ لِلْفِرَاشِ، وَلِلْعَاهِرِ الْحَجَرُ»[1]

”بچہ اسی کا ہے جس کے بستر پر جنم لے اور زنا کرنے والے کی سزا سنگساری ہے (اس کے لیے رسوائی ہے)۔“

لہٰذا جو شخص اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے کر اپنی لاعلمی یا کسی عالم کے فتوے وغیرہ کی وجہ سے سمجھتا ہے کہ طلاق نہیں ہوئی اور بیوی سے ہم بستری کر لیتا ہے تو اس کے بچے کا نسب اس کی طرف منسوب ہو گا اور وہ دونوں ایک دوسرے کے وارث بھی بنیں گے، یہ اتفاقی مسئلہ ہے، بلکہ عدت کا شمار اس وقت سے ہو گا، جب سے اس نے مجامعت چھوڑ رکھی ہو، وہ اس کو اپنی بیوی سمجھتے ہوئے اس سے مجامعت کرتا تھا، اس لیے وہ اس کا فراش (بستر کی ساتھی) ہے اور وہ اس وقت تک اس سے عدت شمار نہیں کرے گی جب تک وہ فراش (کنایہ از جماع) کو چھوڑ نہیں دیتا۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٩٤٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٥٧)

جو انسان کسی عورت سے ایسا ''نکاحِ فاسد'' کرتا ہے، جس کے فاسد ہونے پر اتفاق ہے یا اختلاف یا کسی عورت کو اپنی بیوی سمجھتے ہوئے اس سے مباشرت کرتا ہے تو اس عورت سے پیدا ہونے والا بچہ اس شخص کی طرف منسوب ہوگا اور وہ دونوں بالاتفاق ایک دوسرے کے وارث بنیں گے۔

یہ سب جنھوں نے مجامعت کی اور اس کے نتیجے میں اولاد پیدا ہوئی۔ اگر انھوں نے متفق علیہ نکاحِ فاسد کی صورت میں مجامعت کی، طلاق ہو چکی تھی، مگر وہ کسی فتوے وغیرہ کی وجہ سے سمجھتے رہے کہ نکاح باقی ہے تو ان کی اولاد کا نسب انہی کے ساتھ ملحق کیا جائے گا، وہ زنا کی اولاد نہیں ہوگی اور بالاتفاق وہ ایک دوسرے کے وارث ہوں گے۔ یہ اس نکاحِ فاسد کی بات ہے، جس کے فاسد ہونے پر اتفاق ہو، اگر اس کا فاسد ہونا ہی اختلافی ہو تو اس میں یہ کس طرح کہا جا سکتا ہے کہ اولاد زنا کی ہے؟ کتاب وسنت اور قیاس اسی قول کے صحیح ہونے پر دلالت کرتے ہیں، اس کے مناقض قول ضعیف ہے اور کوئی شرعی حجت اس کی تائید نہیں کرتی۔

جس نے یہ فتویٰ دیا ہے کہ اس جیسے نکاح کی صورت میں پیدا ہونے والی اولاد زنا کی اولاد ہوتی ہے، اس لیے وہ ایک دوسرے کے وارث نہیں ہوتے۔ اس کا یہ فتویٰ اجماع کے خلاف اور رتبہ دین سے خارج ہے۔ اگر یہ بات کہنے والا لاعلم ہے تو اس کو بتایا جائے کہ رسول اللہ ﷺ، خلفائے راشدین اور تمام ائمہ دین نے اہلِ جاہلیت کی اولاد کو ان کے باپوں کے ساتھ ملحق کیا ہے، گو ان کے بعض نکاح بالاجماع حرام تھے، مگر انھوں نے الحاقِ نسب کے لیے شریعتِ اسلام کے مطابق ان کے نکاح کا جائز ہونا شرط نہیں رکھا، اس لیے یہ فتویٰ کتاب وسنت اور اجماع کے خلاف ہے اور اس پر عمل کرنا صحیح نہیں، اگر کوئی شخص صحیح بات اور راہِ ہدایت واضح ہونے کے باوجود رسول اللہ ﷺ کی مخالفت اور مومنوں کی راہ سے انحراف پر تلا ہوا ہے تو اس سے توبہ کروائی جائے اور اس کی فہمائش کی جائے۔ واللہ أعلم[1]

ماہواری ختم ہونے کی صورت میں عدت

سوال ایک عورت کو شادی کے بعد چھے بچوں کی پیدائش کے بعد حیض آنا بند ہو گیا، جب خاوند نے طلاق دی اور اس سے علاحدہ ہوئی، اس وقت وہ بچے کو دودھ پلا رہی تھی، اب وہ عدت کس طرح پوری کرے گی؟

جواب ماہواری ختم ہونے کی تین صورتیں ہوتی ہیں:

1. سنِ یاس کو پہنچنے کی وجہ سے ماہواری کا مستقل ختم ہو جانا۔
2. کسی عارضی صورتِ حال جیسے، بیماری یا دودھ پلانے کی وجہ سے ماہواری ختم ہونا۔

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۳۴/۱۳-۱۶)

3 ماہواری ختم ہونے کا سبب معلوم نہ ہونا۔

جو سنِ یاس کو پہنچ جائے، اس کی عدت تین مہینے ہے۔ جس کی ماہواری عارضی سبب کی وجہ سے بند ہو، وہ اس عارضی سبب کے ختم ہونے کا انتظار کرے گی اور جب حیض شروع ہو جائے گا تو اس کے مطابق عدت پوری کرے گی۔ جس کو سبب معلوم نہیں وہ علما کے صحیح قول کے مطابق حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے فیصلے کے مطابق ایک سال انتظار کرے گی، پھر حیض سے ناامید ہو چکی عورت کی عدت تین ماہ گزار کر شادی کے خواستگار کے ساتھ شادی کرے گی۔ واللہ أعلم[1]

بیوہ کی عدت اور عدت کی پابندیاں

سوال جس عورت کا خاوند فوت ہو جائے اس کی عدت کتنی ہے اور اس دوران میں اس پر کیا پابندیاں عائد ہوتی ہیں؟

جواب جس عورت کا خاوند فوت ہو جائے، وہ چار ماہ دس دن تک انتظار کرے اور اس دوران میں اپنے بدن اور کپڑوں میں خوش بو اور زیب و زینت سے اجتناب کرے، اپنے گھر پر رہے، دن کے وقت اور رات کے پہر کسی اشد ضرورت کے بغیر اپنے گھر سے نہ نکلے۔ کھانے پینے کے سلسلے میں کوئی پابندی نہیں، تمام حلال مشروبات و ماکولات استعمال کر سکتی ہے۔ اسی طرح ہر طرح کا حلال لباس پہن سکتی ہے، مگر زیب و زینت سے احتراز ضروری ہے۔ عورت کے لیے سفید یا کسی دوسرے رنگ کے کپڑے خاص کرنا کتاب و سنت سے ثابت نہیں۔ اسی طرح زیورات پہننا اور مہندی لگانا بھی قابلِ اعتراض ہے۔ مگر کپڑے سینے، کڑھائی کرنے اور سوت کاتنے جیسے جائز کام جو عورتیں عموماً کرتی ہیں، اس دوران میں بھی کیے جا سکتے ہیں، اسی طرح ضرورت کے وقت باپردہ رہ کر کسی مرد سے بات کرنا وغیرہ بھی جائز ہے۔ یہ وہ کام ہیں جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی بیویاں اس صورتِ حال میں کیا کرتی تھیں۔ تاہم غیر محرم کو ان کے ساتھ خلوت نشینی کی اجازت نہیں۔ اس عرصے میں اگر کوئی نکاح کا پیغام دے تو اس کو صریح انداز میں جواب نہ دے۔ واللہ أعلم[2]

عدت میں باہر نکلنے والی کا حکم

سوال اگر کوئی عورت جس کا خاوند فوت ہو جائے، گھر بیٹھ کر عدت نہیں گزارتی، بلکہ شرعی ضروریات کی وجہ سے باہر نکلتی ہے، کیا وہ عدت دہرائے گی اور گھر نہ بیٹھنے پر گناہ گار ہوگی؟

جواب عدت خاوند کے فوت ہونے کے چار ماہ دس دن بعد ختم ہو جاتی ہے اور اس کی قضا نہیں۔ اگر عورت کسی ایسے

---

1 مجموع الفتاویٰ (٢٢/٣٤)

2 مجموع الفتاویٰ (٣٤/٢٧)

ضروری کام کی وجہ سے گھر سے نکلتی ہے جس کے بنا چارہ نہیں، مگر رات گھر ہی پر گزارتی ہے تو اس پر کچھ عائد نہیں ہوتا۔ اگر بلاضرورت گھر سے نکلتی ہے اور بغیر ضرورت کسی دوسرے گھر میں رات ٹھہرتی ہے یا سوگ چھوڑ دیتی ہے تو وہ اللہ سے معافی مانگے اور توبہ کرے۔ اس پر عدت دہرانا لازم نہیں آتا۔ واللہ أعلم[1]

عدت میں حج پر جانے کا حکم

سوال ایک عورت نے اپنے خاوند کے ساتھ حج پر جانے کا ارادہ کیا تھا، مگر شعبان میں اس کا خاوند فوت ہو گیا، کیا وہ حج پر جا سکتی ہے؟

جواب ائمہ اربعہ کے مذاہب میں خاوند کی وفات کی عدت میں حج کے لیے جانا جائز نہیں۔[2]

رضاعی ضابطہ اور حرمت

سوال رضاعت کے لیے کیا ضابطہ ہے، نیز رضاعت کی وجہ سے کون سے رشتے حرام ہوتے ہیں اور کون سے حرام نہیں ہوتے، اسی طرح بڑے بالغ یا نابالغ بچے کو دودھ پلانے اور اس کی رضاعت کا حکم کیا ہے؟

جواب جب کوئی شیر خوار بچہ دودھ چھڑانے کی عمر سے پہلے، یعنی دو سال کی عمر تک کسی عورت سے پانچ رضعات (پانچ مرتبہ پستان چوسنا) دودھ پی لے تو وہ بالاتفاق اس کی رضاعی ماں بن جاتی ہے اور اس عورت کا وہ خاوند جو جماع کی وجہ سے اس کا دودھ اترنے کا سبب بنے، اس بچے کا رضاعی والد بن جاتا ہے، اس پر مشہور ائمہ کا اتفاق ہے اور اس کو "لبن الفحل" کہا جاتا ہے۔ یہ رسول اللہ ﷺ کی سنت سے ثابت ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو ایک عورت نے دودھ پلایا تھا، اس کے خاوند کا نام ابو القعیس تھا، اس کا بھائی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ملنے کے لیے آیا تو انھوں نے اس سے ملنے سے قبل رسول اللہ ﷺ سے اجازت چاہی تو آپ ﷺ نے فرمایا: اس کو اجازت دے دے، وہ تیرا رضاعی چچا ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا: مجھے عورت نے دودھ پلایا ہے، آدمی نے تو نہیں؟! آپ ﷺ نے فرمایا: وہ تیرا چچا ہے اور تیرے پاس آ سکتا ہے، پھر فرمایا:

«يَحْرُمُ مِنَ الرَّضَاعَةِ مَا يَحْرُمُ مِنَ النَّسَبِ»[3]

"جو رشتے نسب کی وجہ سے حرام ہوتے ہیں، وہ رضاعت کی وجہ سے بھی حرام ہو جاتے ہیں۔"

---

[1] مجموع الفتاویٰ (٢٨/٣٤)

[2] مجموع الفتاویٰ (٢٩/٣٤)

[3] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٥٨٠٤) صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٤٤٥)

کتنا دودھ پینے سے رضاعت ثابت ہوتی ہے، اس مسئلے میں فقہا کا اختلاف ہے اور تین اقوال و مذاہب ہیں:

1 پانچ رضعات یا پانچ مرتبہ بچے کا دودھ پینے کے لیے پستان منہ میں ڈالنا رضاعت اور حرمت ثابت کر دیتا ہے۔

یہ امام شافعی اور امام احمد کا ظاہر اور مشہور مذہب ہے۔ اس کی ایک دلیل حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی یہ حدیث ہے:

''قرآن میں دس معلوم رضعات نازل ہوئیں جو حرام کرتی ہیں وہ پانچ معلوم رضعات کے ساتھ منسوخ ہو گئیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب فوت ہوئے اس وقت قرآن میں ان کی تلاوت کی جاتی تھی۔''[1]

دوسری دلیل سالم مولی ابی حذیفہ کی حدیث ہے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی بیوی کو سالم کو پانچ رضعات دودھ پلانے کا حکم دیا، یہ حدیث بھی صحیح ہے جس سے معلوم ہوا کہ پانچ رضعات سے کم میں حرمت ثابت نہیں ہوتی۔ اس کے لیے پانچ رضعات کی ضرورت ہوتی ہے۔

2 تین یا تین سے زائد رضعات سے حرمت اور رضاعت ثابت ہوتی ہے، یہ فقہا کے ایک گروہ کا قول ہے، جن میں ابو ثور وغیرہ کا شمار ہوتا ہے اور یہ امام احمد سے بھی روایت ہے۔ ان کی دلیل صحیح میں مروی یہ حدیث ہے:

«لَا تُحَرِّمُ الْمَصَّةُ وَلَا الْمَصَّتَانِ وَلَا الْإِمْلَاجَةُ وَلَا الْإِمْلَاجَتَانِ»[2]

''ایک یا دو مرتبہ چوسنا یا ایک یا دو مرتبہ پستان بچے کے منہ میں دینا حرمت ثابت نہیں کرتا۔''

جس سے معلوم ہوا تین مرتبہ چوسنا حرمت ثابت کر دیتا ہے۔ انھوں نے یہ کہہ کر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث سے استدلال نہیں کیا کہ قرآن وہی ثابت ہے جو تواتر سے ہو اور جو بات حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بیان کی ہے، اس کا قرآن ہونا متواتر نہیں۔

3 تھوڑا دودھ پینا یا زیادہ دودھ پینا، یعنی ایک مرتبہ چوسنا بھی رضاعت اور حرمت ثابت کرنے کے لیے کافی ہے۔

یہ امام مالک اور ابو حنیفہ کا مذہب ہے اور امام احمد سے بھی ایک کمزور سی روایت منقول ہے۔ انھوں نے ظاہر قرآن سے استدلال کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ وَأُمَّهَٰتُكُمُ ٱلَّٰتِيٓ أَرۡضَعۡنَكُمۡ وَأَخَوَٰتُكُم مِّنَ ٱلرَّضَٰعَةِ ﴾ [النساء: ٢٣]

''اور تمھاری وہ مائیں جنھوں نے تمھیں دودھ پلایا ہو اور تمھاری دودھ شریک بہنیں۔''

امام صاحب فرماتے ہیں: قرآن میں لفظ ''رضاعت'' مطلق ہے۔ جہاں تک احادیث کی بات ہے تو کچھ ان تک پہنچی نہیں اور کچھ ان کے خیال میں ضعیف ہیں، بلکہ کچھ فقہا ان احادیث کو ظاہر قرآن کے خلاف سمجھتے ہیں اور ان

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٤٥٢)

[2] صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٤٥٠، ١٤٥١)

کا عقیدہ ہے کہ قرآن کے عموم کی تخصیص اور مطلق کی تقیید اخبارِ احاد سے کرنا جائز نہیں۔

پہلا گروہ اس کا جواب یہ دیتا ہے کہ یہ احادیث صحیح ہیں اور محدثین کے ہاں ثابت ہیں۔ اگر بعض فقہائے سلف تک یہ نہیں پہنچ سکیں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ جن کے نزدیک یہ صحیح ہیں وہ بھی ان پر عمل نہ کریں۔ جہاں تک قرآن کریم کے مطلق کی بات ہے تو جس طرح ایک دوسری دلیل سے رضاعت کا مخصوص عمر کے ساتھ مقید ہونا معلوم ہوا ہے اسی طرح ایک مخصوص مقدار کے ساتھ اس کا مقید ہونا بھی معلوم ہوسکتا ہے۔ قرآن کریم میں آیا ہے:

﴿ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ ﴾ [البقرة: ١٩٦]

''تو روزے یا صدقے یا قربانی میں سے کوئی ایک فدیہ ہے۔''

یہاں فدیے کی مقدار سنت سے معلوم ہوئی ہے، گو یہ خبرِ واحد ہے، بلکہ جس طرح سنت سے یہ بھی ثابت ہے کہ ''ایک عورت پر اس کی خالہ اور اس کی پھوپھی سے نکاح نہ کیا جائے۔'' یہ ظاہر قرآن کے ساتھ خبرِ واحد ہے اور امت نے اس پر عمل کرنے میں مکمل اتفاق کیا ہے۔ اسی طرح اس آیت میں:

﴿ خُذْ مِنْ اَمْوٰلِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا ﴾ [التوبة: ١٠٣]

''ان کے مالوں سے صدقہ لے، اس کے ساتھ تو انھیں پاک کرے گا اور انھیں صاف کرے گا۔''

کا معنی متعین کرنے میں متواتر اور غیر متواتر سنت سے استفادہ کیا گیا ہے۔ اسی طرح قرآن میں عبادات، کفارات اور حدود کے متعلق بہت سے مطلق احکام کی تقیید متواتر سنت سے کی گئی ہے، سنت قرآن کی تفسیر، تعبیر، بیان اور دلالت ہے۔

پانچ کے ساتھ مقید کرنے کے بھی شریعت میں بہت سے اصول ہیں، اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے، فرض نمازیں پانچ ہیں، پانچ اونٹوں سے کم میں زکات نہیں، برّ اور نیکی کی انواع پانچ ہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ﴾ البقرة: ١٧٧]

''اور لیکن اصل نیکی اس کی ہے جو اللہ، یومِ آخرت اور فرشتوں اور کتاب اور نبیوں پر ایمان لائے۔''

کفر کے متعلق فرمایا:

﴿ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ﴾ [النساء: ١٣٦]

''اور جو شخص اللہ کے ساتھ اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں اور یومِ آخرت (کے ساتھ) کفر کرے۔''

اولو العزم انبیا پانچ ہیں۔ اگر رضاعت ثابت کرنے کے لیے پانچ رضعات متعین کی گئی ہیں تو یہ اصولِ شریعت

میں انوکھی بات نہیں۔ رضاعت اگر اس وجہ سے حرمت ثابت کرتی ہے کہ اس کے نتیجے میں گوشت اُگتا اور ہڈیاں جڑتی ہیں اور پرورش پاتی ہیں تو اس کی یہ پرورش ماں باپ سے پرورش کی طرح ہوئی، لہٰذا رضاعت سے وہی رشتے حرام ہوں گے جو ولادت سے ہوتے ہیں۔ بنا بریں بڑے کی رضاعت حرام نہیں کرتی، کیوں کہ وہ کھانے پینے کے قائم مقام ہے اور ایک دو مرتبہ چوسنے کی کوئی تاثیر نہیں، جس طرح چوری کا ایک نصاب ہے اور اس سے کم پر یا معمولی سی چیز پر ہاتھ نہیں کاٹا جاتا، زکات میں بھی نصاب متعین ہے اور اس سے کم پر زکات فرض نہیں ہوتی، اس لیے ایک حدِ فاصل کا ہونا ضروری ہے، تاہم یہ ایک اختلافی مسئلہ ہے جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دور سے اختلافی چلا آ رہا ہے۔

دوسری بات اگر شک ہو کہ دودھ بچے کے پیٹ میں گیا ہے یا منہ میں ہی رہ گیا ہے تو پھر تحریم کا حکم نہیں لگایا جا سکتا، اگر یقین ہو کہ دودھ منہ ہی میں رہ گیا ہے تو اس سے بالاتفاق حرمت نہیں پھیلتی۔

اسی طرح امام شافعی اور احمد کے مذہب میں ایک رضعت (ایک مرتبہ چوسنا) سے مراد سیر ہونا نہیں کہ بچہ پستان منہ میں ڈالے، پھر اس کو چھوڑ دے، پھر منہ میں ڈالے، پھر چھوڑ دے، تاآنکہ سیر ہو جائے، بلکہ جب پستان پکڑے، پھر اپنی مرضی سے اس کو چھوڑے تو یہ ایک رضعت ہے، چاہے اس کے ساتھ سیر ہو جائے یا متعدد رضعات کے ساتھ سیر ہو، جب اس کے بعد وہ دوبارہ منہ میں ڈالے اور دودھ پیے، پھر چھوڑ دے تو یہ دوسری رضعت ہے، یعنی وہ منہ لگائے، دودھ پیے، پھر چھوڑ دے، پھر پکڑے، منہ لگائے اور چھوڑ دے، چاہے ایک وقت میں ہو۔ اگر بچے سے اس کو اس کے اختیار کے بغیر چھڑوایا جائے، پھر تھوڑی دیر بعد وہ دوبارہ منہ لگائے تو اس میں اختلاف ہے۔

رضاعت کی وجہ سے حرام ہونے والے رشتے:

رضاعت کی بنیاد پر کون سے رشتے حرام ہو جاتے ہیں، اس سے متعلق حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی صحیح حدیث ہے جسے قبولِ عام کا درجہ حاصل ہے اور ائمہ اس پر عمل کرنے پر بھی متفق ہیں، اس کے الفاظ یہ ہیں:

«يَحْرُمُ مِنَ الرَّضَاعِ مَا يَحْرُمُ مِنَ النَّسَبِ»[1]

''جو رشتہ نسب کی وجہ سے حرام ہوتا ہے، وہ رضاعت کی وجہ سے بھی حرام ہو جاتا ہے۔''

اور دوسری حدیث کے یہ الفاظ ہیں:

«يَحْرُمُ مِنَ الرَّضَاعِ مَا يَحْرُمُ مِنَ الْوِلَادَةِ»[2]

''جو رشتہ ولادت کی وجہ سے حرام ہو جاتا ہے، وہ رضاعت کی وجہ سے بھی حرام ہو جاتا ہے۔''

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٠٤٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٤٥)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٩٤١) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٤٤)

کچھ متاخر فقہا نے اس عموم سے دو صورتوں اور کچھ نے زیادہ صورتوں کو مستثنیٰ قرار دیا ہے، مگر یہ ان کی غلطی ہے، اس حدیث میں کوئی چیز محتاجِ استثنا نہیں۔ اس کی تفصیل اس طرح ہے کہ جب دو سال کے دوران میں دودھ پیتا بچہ کسی عورت سے پانچ رضعات دودھ پی لے تو وہ عورت اس کی ماں اور اس کا وہ خاوند جو اس دودھ کا باعث بنا، اس کا باپ بن جاتا ہے اور وہ ان دونوں کا رضاعی بیٹا بن جاتا ہے۔ اس وقت اس عورت کی اس آدمی سے اور کسی دوسرے سے ساری اولاد اور اس کے شوہر کی اس عورت سے اور اس کے علاوہ کسی دوسری عورت سے ساری اولاد اس بچے کے بہن بھائی بن جاتی ہے، خواہ وہ اس کو دودھ پلانے سے پہلے پیدا ہوئی ہو یا بعد میں، اس پر ائمہ کا اتفاق ہے۔ اس طرح عورت کے تمام رشتے دار اس بچے کے رضاعی رشتے دار بن جاتے ہیں۔ لہٰذا ان دونوں میاں بیوی کی اولاد اس کے بہن بھائی بن جاتی ہے تو ان دونوں کی اولاد کی اولاد اس کے بہن بھائیوں کی اولاد ہو گی، اس لیے جس عورت نے اس بچے کو دودھ پلایا ہے، وہ اپنی اور اپنے شوہر کی اولاد اور ان دونوں کی اولاد میں سے کسی کے ساتھ اس کی شادی نہیں کر سکتی، کیوں کہ وہ یا اس کے بھائی بہن ہوں گے، اس کے بہن بھائیوں کی اولاد اور یہی رشتے ولادت کی وجہ سے بھی حرام ہوتے ہیں۔ اس عورت کے بہن بھائی اس بچے کے رضاعی ماموں اور خالائیں ہیں اور اس کے ماں باپ اس بچے کے رضاعی نانا نانی ہیں، اسی طرح اس عورت کے شوہر کے بھائی اور بہنیں اس کے رضاعی چچا اور رضاعی پھوپھیاں ہیں، اس کا باپ اور ماں اس کی رضاعی دادا دادی ہیں، لہٰذا وہ اپنے رضاعی، نانا نانی، ماموں خالہ اور رضاعی دادا دادی اور پھوپھی سے شادی نہیں کر سکتا، لیکن چچاؤں اور پھوپھیوں کے بیٹے بیٹیوں سے شادی ممکن ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے بیان کیا ہے:

﴿ يَاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَحْلَلْنَا لَكَ اَزْوٰجَكَ الّٰتِيْٓ اٰتَيْتَ اُجُوْرَهُنَّ وَمَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ مِمَّآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلَيْكَ وَبَنٰتِ عَمِّكَ وَبَنٰتِ عَمّٰتِكَ وَبَنٰتِ خَالِكَ وَبَنٰتِ خٰلٰتِكَ الّٰتِيْ هَاجَرْنَ مَعَكَ ﴾

[الأحزاب: ۵۰]

''اے نبی! بے شک ہم نے تیرے لیے تیری بیویاں حلال کر دی جن کا تو نے مہر دیا ہے اور وہ عورتیں جن کا مالک تیرا دایاں ہاتھ بنا ہے، اس (غنیمت) میں سے جو اللہ تجھ پر لوٹا کر لایا ہے اور تیرے چچا کی بیٹیاں اور تیری پھوپھیوں کی بیٹیاں اور تیرے ماموں کی بیٹیاں اور تیری خالاؤں کی بیٹیاں جنھوں نے تیرے ساتھ ہجرت کی ہے۔''

انسان کے اقارب میں سے یہ چار اصناف مباح ہیں اور رضاعت میں بھی یہ چاروں مباح ہیں۔ اگر دودھ پینے والا بچہ اس عورت اور اس کے خاوند کا بیٹا بن جاتا ہے تو پھر اس بچے کی اولاد ان دونوں کی اولاد ہے اور اس کی

اولاد کی حرمت بھی وہی حیثیت اختیار کر جاتی ہے جو صلبی اور نسبی اولاد کی حیثیت ہوتی ہے۔ اس طرح حرمتِ رضاعت ان تین جہات میں پھیل جاتی ہے، مگر اس دودھ پینے والے بچے کے نسبی ماں باپ اور نسبی بہن بھائی اس کے رضاعی ماں باپ اور رضاعی بہن بھائیوں کے لیے اجنبی اور غیر محرم ہی رہتے ہیں، ان کے درمیان کوئی نسبی تعلق قائم ہوتا ہے نہ رضاعی ہی۔ کبھی ایسا ہو جاتا ہے کہ آدمی کا ایک بھائی باپ کی طرف سے ہو اور دوسرا ماں کی طرف سے اور ان دونوں کے درمیان کوئی نسبی تعلق نہیں ہوتا، بلکہ جو اس کا باپ کی طرف سے بھائی ہو، وہ ماں کی طرف سے بھائی کو بھی مجازاً بھائی کہے گا۔ اسی طرح دودھ پینے والے بچے کے نسبی بھائی اور اس کی رضاعی بہن کے درمیان مناکحت جائز ہے۔ اس وضاحت سے وہ شبہہ زائل ہو جاتا ہے جو کچھ لوگوں کے سامنے پیش آتا ہے۔ لہٰذا دودھ پینے والے کا رضاعی بھائی اس کی نسبی ماں سے شادی کر سکتا ہے اور نسبی بہن سے بھی۔ اسی طرح اس کا نسبی بھائی اس کی رضاعی بہن سے بھی شادی کر سکتا ہے، لیکن سب میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ آدمی کا نسبی بھائی اس کی نسبی ماں سے شادی نہیں کر سکتا۔ اسی طرح اس کی رضاعی بہن اس کے باپ کی نسبی بیٹی یا ربیبہ نہیں ہوتی، اس لیے وہ اس سے شادی کر سکتا ہے۔

اسی طرح بڑی عمر کا آدمی یا بڑی عمر کی عورت قرابت کی رضاعت سے ایک دوسرے پر حرام نہیں ہوتے، مثلاً: کسی شخص کی بیوی اس کے نسبی بھائی کو دودھ پلائے تو وہ یعنی اس کی بیوی اس پر حرام نہیں ہوتی، کیوں کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ اس کا نسبی بھائی اس کی رضاعی بہن سے شادی کر سکتا ہے، ان کے درمیان نسب یا رضاعت کا کوئی تعلق نہیں ہوتا، وہ صرف اس کے بھائی پر اس کی رضاعی ماں ہونے کی وجہ سے حرام ہوتی ہے، کیوں کہ اس نے صرف اس کو دودھ پلایا ہوتا ہے، دوسرے بھائیوں کو نہیں۔ البتہ اگر کسی عورت کی ایک سے زیادہ بیویاں ہوں جن سے اس کا ازدواجی تعلق قائم ہو اور ان میں سے ہر ایک نے ایک بچے کو دودھ پلایا ہو تو ان کے لیے ایک دوسرے سے شادی کرنا جائز نہیں، جب حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اس مسئلے سے متعلق پوچھا گیا تو انھوں نے کہا: ''ان سب کے دودھ اترنے کا سبب ایک ہی شخص ہے۔'' یہ ائمہ اربعہ کا مذہب ہے اور اس کی دلیل وہی ابو القعیس، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے رضاعی چچا والی مشہور حدیث ہے۔

آدمی پر اس کے نسبی بھائی کی ماں حرام ہوتی ہے، کیوں کہ وہ یا اس کی ماں ہوتی ہے یا اس کے باپ کی بیوی اور یہ دونوں اس پر حرام ہیں، مگر رضاعی بھائی کی ماں اس کی ماں ہوتی ہے، نہ اس کے والد کی بیوی، کیوں کہ اس عورت کا خاوند جس کی وجہ سے اس کو دودھ اترا، وہ اس کا نسبی باپ ہوتا ہے نہ رضاعی۔

اگر یہاں کوئی اعتراض کرے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو رشتہ نسب کی وجہ سے حرام ہوتا ہے، وہ رضاعت کی وجہ سے بھی حرام ہوتا ہے۔'' اس بنا پر نسبی بھائی کی ماں حرام ہوتی ہے تو رضاعی بھائی کی ماں بھی حرام ہونی چاہیے؟

اس کے جواب میں کہا جائے گا: یہ خلطِ مبحث اور ابہام کی کوشش ہے، اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے یہ نہیں کہا: ''حرمت علیکم أمهات إخوانكم'' ''تم پر تمھارے بھائیوں کی مائیں حرام کی گئی ہیں۔'' بلکہ فرمایا:

﴿ حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهَٰتُكُمْ ﴾ [النساء: ۲۳]

''حرام کی گئی تم پر تمھاری مائیں۔''

اور فرمایا:

﴿ وَلَا تَنكِحُوا مَا نَكَحَ آبَاؤُكُم مِّنَ النِّسَاءِ ﴾ [النساء: ۲۲]

''اور ان عورتوں سے نکاح مت کرو جن سے تمھارے باپ نکاح کر چکے ہوں۔''

اس طرح آدمی پر اس کی ماں کو حرام کیا اور اس کے باپ کی منکوحہ کو، گو وہ اس کی ماں نہیں ہوتی اور یہی رضاعت کی وجہ سے بھی حرام ہے، لہٰذا آدمی اپنی رضاعی ماں سے شادی نہیں کر سکتا، جہاں تک اس کے رضاعی باپ کی منکوحہ کی حرمت کی بات ہے تو ائمہ کا مشہور مذہب یہی ہے کہ وہ بھی اس رضاعی بیٹے پر حرام ہوتی ہے، لیکن اس میں مصاہرت کی بنا پر نہ کہ نسب و ولادت کی بنا پر محرمات میں داخل ہونے کی وجہ سے اختلاف ہے اور یہاں اس کی تحریم میں کلام نہیں ہو رہا۔ اگر رضاعی باپ کی منکوحہ کو حرام قرار دیا گیا ہے تو یہ عمومِ حدیث سے ماخوذ ہے، لیکن اس کے بھائی کی ماں جو ماں بھی نہ ہو اور باپ کی منکوحہ بھی نہ ہو، نسبی رشتوں میں اس کی نظیر نہیں، اس لیے یہ کہنا جائز ہی نہیں کہ وہ نسب کی وجہ سے تو حرام ہے، لیکن رضاعت میں اس کی نظیر حرام نہیں۔ وہ یا تو رضاعی بھائی کی نسبی ماں ہو گی، یا نسبی بھائی کی رضاعی ماں، ولادت میں اس کی نظیر نہیں، اس لیے وہ اس پر حرام نہیں ہوتی اور اس پر سب اہلِ اسلام کا اتفاق ہے۔

بڑی عمر کے آدمی کو دودھ پلانے کی تاثیر:

وہ رضاعت جس سے حرمت ثابت ہوتی ہے وہ ہے جو دو سال کے درمیان ہو، کیوں کہ رضاعت کی مکمل مدت دو سال ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ ۖ لِمَنْ أَرَادَ أَن يُتِمَّ الرَّضَاعَةَ ﴾ [البقرۃ: ۲۳۳]

''اور مائیں اپنی بچوں کو پورے دو سال دودھ پلائیں، اس کے لیے جو چاہے کہ دودھ کی مدت پوری کرے۔''

لہٰذا جو دودھ اس مدت کے پورا ہونے کے بعد پلایا جائے وہ رضاعت میں داخل نہیں، اس بنا پر جمہور علما و فقہا اور ائمہ اربعہ وغیرہ کا مذہب ہے کہ بڑی عمر کے آدمی کو دودھ پلانے کی کوئی تاثیر نہیں۔ ان کی دلیل یہ حدیث ہے کہ بخاری و مسلم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، وہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ میرے پاس تشریف لائے اور

میرے پاس ایک آدمی تھا، آپ ﷺ نے پوچھا: عائشہ! یہ کون ہے؟ انھوں نے کہا: یہ میرا رضاعی بھائی ہے، اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: اے عائشہ! اپنے بھائیوں کو دھیان سے دیکھنا، رضاعت بھوک سے ثابت ہوتی ہے۔[1]

ترمذی میں حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''وہی رضاعت حرمت ثابت کرتی ہے، جو پستان میں ہو، جس کی وجہ سے انتڑیاں پُر ہو جائیں اور وہ دودھ چھڑانے کی عمر سے پہلے ہو۔''[2]

پستان میں ہونے کا مطلب ہے کہ اس کے وقت میں ہو جو دو سال ہیں۔ اس کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جس میں آپ ﷺ نے فرمایا: ''میرا بیٹا پستان میں فوت ہوا۔''[3] یعنی وہ دودھ پینے کی عمر میں تھا۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ دو سال کے بعد اور دودھ چھڑانے کے بعد رضاعت ثابت نہیں ہوتی، چاہے دو سال پورے کرنے سے پہلے ہی چھڑوا دیا جائے۔

سلف و خلف کے ایک گروہ کا مذہب ہے کہ بڑی عمر کے شخص کو دودھ پلانے سے حرمت ثابت ہو جاتی ہے۔ انھوں نے صحیح مسلم وغیرہ میں زینب بنت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی اس حدیث سے استدلال کیا ہے جس میں مذکور ہے کہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے عائشہ رضی اللہ عنہا سے کہا: تیرے پاس یہ نوعمر لڑکا آتا ہے، میں اپنے پاس اس کا آنا پسند نہیں کرتی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا: تیرے لیے رسول اللہ ﷺ میں بہترین نمونہ نہیں؟ ابو حذیفہ کی بیوی نے رسول اللہ ﷺ سے کہا: اے اللہ کے رسول! سالم میرے پاس آتا ہے اور وہ آدمی ہے، ابو حذیفہ اس کو اچھا نہیں سمجھتا؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اس کو دودھ پلا دے، تاکہ وہ تیرے پاس آ سکے۔''[4] موطا امام مالک کی روایت میں ہے: آپ ﷺ نے کہا: ''اس کو پانچ رضعات دودھ پلا دے۔''[5] اس طرح وہ اس کے لیے رضاعی بیٹے کی طرح ہو گیا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے، جب کہ دیگر ازواجِ مطہرات نے اس سے استدلال کرنے سے انکار کیا، حالانکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی نے رسول اللہ ﷺ سے یہ حدیث بھی نقل کی ہے: «الرضاعة من المجاعة»[6] ''دودھ پلانا وہ ہے جو بھوک مٹائے۔'' یعنی جب صرف دودھ سے بھوک مٹتی ہے اور یہ دو سال کا دورانیہ ہے۔ تاہم انھوں نے رضاعت کا قصد کرنے اور محض غذا دینے کا قصد کرنے میں فرق کیا ہے۔ اگر دوسری چیز

---

(1) صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٥٠٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٥٥)

(2) سنن الترمذي، رقم الحديث (١١٥٢) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٩٤٦) صحيح الجامع (٧٦٣٣)

(3) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣١٦)

(4) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٥٣)

(5) الموطأ (٢/٦٠٥) شیخ البانی رحمہ اللہ نے إرواء الغليل (٦/٢٥٣) میں اسے صحیح کہا ہے۔

(6) صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٥٠٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٥٥)

مقصود ہو تو حرمت صرف اس وقت ثابت ہو گی جب یہ دودھ چھڑانے سے پہلے ہو، رضاعت سے عام لوگوں کا مقصود یہی ہوتا ہے۔ جہاں تک پہلی چیز کا تعلق ہے تو اگر صرف محرم بنانے کے لیے اس سے استدلال کیا جائے تو ایسا ممکن ہے، کیوں کہ کبھی حاجت اور ضرورت کی وجہ سے وہ کام جائز ہو جاتا ہے جو حاجت نہ ہونے کی صورت میں جائز نہیں ہوتا، لہٰذا یہ قول قابلِ التفات ہے۔ انسانوں کا دودھ جمہور علما کے نزدیک پاک ہے، کچھ متاخرین کو شک ہے کہ یہ نجس ہے، علاحدہ طور پر اس کی بیع میں اختلاف ہے۔ امام شافعی کے مذہب میں جائز ہے، امام ابو حنیفہ کے مذہب میں ناجائز ہے اور تیسرے قول کے مطابق لونڈی کا جائز ہے، آزاد کا نہیں۔ واللہ أعلم [1]

دو بہنوں کے ایک دوسرے کی بیٹیوں کو دودھ پلانے کی صورت میں ایک دوسرے کے بیٹے کے ساتھ شادی کا مسئلہ

سوال دو بہنوں کے بیٹے اور بیٹیاں ہیں، اگر ایک بہن دوسری کی بیٹی اور دوسری پہلی کی بیٹی کو دودھ پلا دے تو کیا یہ ایک دوسری کے بیٹوں پر حرام ہو جائیں گی؟

جواب اگر کوئی عورت کسی بچی کو دو سال کی عمر کے دوران میں پانچ گھونٹ دودھ پلا دے تو وہ اس کی رضاعی بیٹی بن جاتی ہے جس کی وجہ سے دودھ پلانے والی کی رضاعت سے پہلے اور رضاعت کے بعد پیدا ہونے والی ساری اولاد بشمول لڑکے اور لڑکیاں اس بچی کے بھائی بہن بن جاتی ہے، اس لیے دودھ پلانے والی کی ساری اولاد میں سے کسی کے لیے بھی دودھ پینے والی سے شادی کرنا جائز نہیں ہوتا، البتہ دودھ پینے والی کے وہ بھائی بہن دودھ پلانے والی کی اولاد سے شادی کر سکتے ہیں جنھوں نے ان کی ماں کا دودھ نہیں پیا ہوتا۔ تحریم دودھ پینے والی تک محدود ہوتی ہے، اس کے ان بھائیوں تک جاری نہیں ہوتی جنھوں نے اس عورت کا دودھ نہیں پیا ہوتا۔

بنا بریں وہ لڑکا اس لڑکی کی بہن سے شادی کر سکتا ہے، اگر اس لڑکے نے اس کی ماں کا دودھ نہیں پیا اور اس لڑکی نے اس لڑکے کی ماں کا دودھ نہیں پیا، البتہ یہ دودھ پینے والی اپنی رضاعی ماں کی کسی اولاد سے شادی نہیں کر سکتی، اس پر ائمہ کا اتفاق ہے۔

قانون یہ ہے کہ دودھ پلانے والی دودھ پینے والی کی ماں بن جاتی ہے، اس لیے اس کی اولاد اس پر حرام ہو جاتی ہے۔ اس عورت کے بھائی بہن اس دودھ پینے والے بچے کے ماموں اور خالائیں بن جاتے ہیں، رضاعی ماں کا خاوند جو اس کے دودھ اترنے کا سبب ہوتا ہے، اس بچے کا باپ بن جاتا ہے، اس عورت اور کسی دوسری عورت سے

[1] مجموع الفتاویٰ (٣٤/٣١۔٣٦)

اس شخص (رضاعی باپ) کی اولاد اس بچے کے بھائی بہن بن جاتی ہے، اس رضاعی باپ کے بھائی بہن اس بچے کے چچا اور پھوپھیاں بن جاتے ہیں۔ یہ دودھ پینے والا اس کی اولاد اور اولاد کی اولاد، دودھ پلانے والی عورت اور اس کے اس خاوند کی اولاد بن جاتی ہے جو اس کے دودھ اترنے کا سبب بنتا ہے۔ دودھ پینے والے بچے کے نسبی بھائی بہن اور ماں باپ اجنبی ہی یعنی غیر ہی رہتے ہیں، اس رضاعت کی وجہ سے اس پر کوئی چیز حرام نہیں ہوتی، ان ساری باتوں پر ائمہ اربعہ کا اتفاق ہے، گو اس کے علاوہ کئی مسائل میں ان کا اختلاف ہے۔[1]

رضاعی بھتیجی سے شادی کا حکم

سوال ایک شخص نے کسی دوسرے آدمی کے ساتھ ایک ہی ماں کا دودھ پیا، ایک کی بیٹی ہوئی، کیا یہ دودھ پینے والا اس سے شادی کر سکتا ہے؟

جواب جب بچہ دو سال کے دوران میں کسی عورت سے پانچ رضعات دودھ پی لے تو وہ اس کا بیٹا بن جاتا ہے اور اس کی ساری اولاد جو رضاعت کے پہلے ہوئی ہو یا بعد میں، اس کے بھائی بہن بن جاتی ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی سنت اور ائمہ کے اتفاق کی روشنی میں رضاعت کی وجہ سے بھی وہ رشتے حرام ہو جاتے ہیں جو نسب و ولادت کی وجہ سے حرام ہوتے ہیں، جس طرح کوئی اپنی نسبی بھتیجی سے شادی نہیں کر سکتا، اسی طرح رضاعی بھتیجی سے بھی نہیں کر سکتا۔[2]

رضاعی بیٹی سے رضاعی ماں کے نواسے کی شادی کا حکم

سوال ایک عورت خاوند والی ہے جس کو حمل اور بچے کے بغیر دودھ اترا، اس نے ایک بچی کو پانچ متفرق رضعات کی صورت میں دودھ پلایا اور وہ بچی دو سال سے چھوٹی تھی، یہ دودھ پلانے والی اس بچی کی حقیقی پھوپھی تھی، اس کے بعد اس دودھ پلانے والی کے نواسے نے اس دودھ پینے والی بچی سے شادی کرنا چاہی، کیا یہ اس پر حرام ہو گی؟

جواب اگر تو خاوند کی مجامعت کے بعد دودھ اترا تو یہ دودھ حرمت پھیلا دیتا ہے، اگر کوئی بچی پانچ گھونٹ دودھ پی لے تو وہ اس عورت کی بیٹی بن جاتی ہے، اس عورت کا نواسا اس بچی کی بہن کا بیٹا ہوا اور وہ اس کی خالہ ہوئی۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ دودھ پلانا بچے کے ساتھ تھا یا ساتھ نہیں تھا، البتہ اس بچی کی نسبی بہن کے ساتھ، جس نے اس عورت کا دودھ نہیں پیا، اس لڑکے کی شادی جائز ہے۔ اگر فرض کیا جائے کہ یہ دودھ ایسی عورت کو

---

[1] مجموع الفتاویٰ (٣٤/٤٥۔٤٦)

[2] مجموع الفتاویٰ (٣٤/٤٦)

اترا جس کی کبھی شادی نہیں ہوئی تو یہ ابوحنیفہ، مالک، شافعی اور ایک روایت میں احمد کے مذہب میں حرمت پھیلا دیتا ہے، البتہ احمد کے ظاہر مذہب کے مطابق یہ دودھ حرمت کو آگے نہیں پھیلاتا۔ واللہ أعلم[1]

سہ طلاق یافتہ اور رضاعت کا خرچہ

سوال ایک شخص نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دیں، اس کی ایک بیٹی بھی ہے جو دودھ پیتی ہے، لوگوں نے عدت کا خرچہ اس کے ذمے لگا دیا، اس عدت کی مدت کیا ہوگی جس میں دودھ پلانے کی وجہ سے اس کو حیض نہیں آتا؟

جواب امام شافعی، مالک اور احمد جیسے جمہور فقہا کے نزدیک وہ عورت جس کو تین طلاقیں ہو جائیں اور وہ بائن، یعنی علاحدہ ہو جائے اس کا خرچہ نہیں، البتہ امام ابوحنیفہ عدت تک اس کا خرچہ واجب کہتے ہیں۔ اگر اس عورت کو روٹین کے مطابق حیض آتا ہو تو اس کی عدت تین حیض ہے۔ جو عورت دودھ پلاتی ہے عموماً اس کی ماہواری میں تاخیر ہو جاتی ہے۔ جہاں تک دودھ پلانے کا خرچہ اور اجرت ہے وہ بالاتفاق خاوند پر عائد ہوتی ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَاِنْ اَرْضَعْنَ لَكُمْ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ ﴾ [الطلاق: ٦]

''پھر اگر وہ تمھارے لیے دودھ پلائیں تو انھیں ان کی اجرتیں دو۔''

خرچہ خوش حالی ہی پر واجب ہے، تنگدست پر نہیں۔[2]

---

[1] مجموع الفتاویٰ (٣٤/ ٥١)

[2] مجموع الفتاویٰ (٣٤/ ٧٥)

نان ونفقہ

عورتوں کے خرچے کے احکام

سوال شریعت میں عورتوں کے نفقے (خرچ) کے احکام کیا ہیں؟

جواب شریعت نے عورتوں کو طلاق دینے، رجوع کرنے، معاملات میں باہمی رضامندی، معاشرت، ان کے حقوق و فرائض اور اخراجات جیسے امور میں معروف کا لحاظ رکھنے کا حکم دیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

- ﴿ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِىْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ﴾ [البقرة: ۲۲۸]

"اور معروف کے مطابق ان (عورتوں) کے لیے اسی طرح حق ہے جیسے ان کے اوپر حق ہے۔"

- ﴿ اَلطَّلٰقُ مَرَّتٰنِ فَاِمْسَاكٌ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌ بِاِحْسٰنٍ ﴾ [البقرة: ۲۲۸]

"یہ طلاق (رجعی) دو بار ہے، پھر یا تو اچھے طریقے سے رکھ لینا ہے، یا نیکی کے ساتھ چھوڑ دینا ہے۔"

- ﴿ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ﴾ [البقرة: ۲۳۲]

"تو انھیں اس سے نہ روکو کہ وہ اپنے خاوندوں سے نکاح کر لیں، جب وہ آپس میں اچھے طریقے سے راضی ہو جائیں۔"

- ﴿ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ﴾ [البقرة: ۲۳۳]

"اس کے ذمے معروف طریقے کے مطابق ان (عورتوں) کا کھانا اور ان کا کپڑا ہے۔"

نکاح اور حقوقِ زوجین سے متعلقہ تمام امور میں اس عدل کا لحاظ رکھنا واجب ہے جو قرآن میں ذکر ہوا ہے۔ اسی طرح عورت کا خرچہ اور لباس بھی معروف، یعنی عرفِ عام کے مطابق بندے پر فرض ہے۔ عرف وہی ہے جو نوع، مقدار اور وصف ان تینوں میں میاں بیوی کی حالت کے مطابق لوگوں کے ہاں معروف ہو، گو یہ خوش حالی اور تنگدستی، سردی، گرمی، دن رات اور جگہ کے اعتبار سے ان دونوں کے احوال کے تنوع سے متنوع ہو۔ وہ جہاں رہتے ہوں اس علاقے کا جو عرف ہو اس کے مطابق ہی خاوند بیوی کے کھانے کا انتظام کرے گا۔ بیوی کا دوسرا حق حسنِ معاشرت، حقِ وظیفہ، زن وشوئی یہ بھی دونوں کے احوال پر منحصر ہے اور معروف کے مطابق ہے، شریعت نے اس کی کوئی حد بندی متعین نہیں کی۔

عورت کا خرچہ بھی عرف کے ساتھ ہی متعین ہے اور جمہور کے نزدیک میاں بیوی کے احوال کے متنوع ہونے سے متنوع ہوتا ہے۔ کچھ علما کہتے ہیں: یہ نوع اور مقدار کے لحاظ سے شریعت میں متعین ہے جو گندم کے ایک مد سے لے کر دو تک ہے، کفارے کے کھانے پر قیاس کرتے ہوئے۔ تاہم قطعی درست موقف پہلا ہی ہے اور علم و عمل کے لحاظ سے ہر زمانے کے علما کا موقف یہی رہا ہے، قرآن بھی اسی پر دلالت کرتا ہے۔ صحیح بخاری و مسلم میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ابوسفیان کی بیوی سے کہا تھا:

«خُذِيْ مَا يَكْفِيْكِ وَوَلَدِكِ بِالْمَعْرُوْفِ»[1]

''اتنا لے لے جو معروف کے مطابق تیرے اور تیرے بچے کے لیے کافی ہو۔''

اس فرمان میں آپ ﷺ نے اس کو معروف کے مطابق قدرِ کفایت لینے کا حکم دیا اور اس کے لیے نوع یا مقدار متعین نہیں کی۔ اگر شریعت یا کسی اور ذریعے سے اسے مقرر کیا گیا ہوتا تو آپ ﷺ اس کے لیے اس کی نوع یا مقدار بیان کر دیتے جس طرح آپ ﷺ نے زکات اور دیتوں کا نصاب بیان کیا ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے حجۃ الوداع کے خطبے میں فرمایا:

«لَهُنَّ عَلَيْكُمْ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ»[2]

''ان کا کھانا اور لباس تم پر معروف کے مطابق فرض ہے۔''

اگر اتنا لینا لازم ہے جو معروف کے مطابق قابلِ کفایت ہو تو یہ عام سی بات ہے کہ عرف کے مطابق کفایت کرنا بیوی کی ضرورت، زمان و مکان اور خاوند کی خوش حالی و بدحالی کے تنوع اور مختلف ہونے سے مختلف ہوتا ہے۔ چھوٹی اور کمزور عورت کا لباس لمبی اور صحت مند عورت کے لباس سے مختلف ہوتا ہے، گرمیوں کا لباس اور، اور سردیوں کا لباس اور ہوتا ہے، ٹھنڈے علاقوں کی غذا اور ہوتی ہے اور گرم علاقوں کی اور، اسی طرح عرف اور تقاضے کے مطابق غذا اور لباس مہیا کرے گا۔

مسند احمد، سنن ابن ماجہ اور سنن ابو داود میں حکیم بن معاویہ نمیری اپنے باپ سے روایت کرتا ہے کہ اس نے پوچھا: اے اللہ کے رسول! ہم میں سے کسی ایک پر اس کی بیوی کا حق کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''جب تو کھائے تو اس کو بھی کھلائے، جب پہنے اس کو بھی پہنائے، چہرے پر نہ مار، بدگوئی نہ کر اور اس سے ناراض ہو کر علاحدہ نہ ہو، مگر گھر میں۔''[3]

یہ تین احادیث ہیں جن میں رسول اللہ ﷺ نے کسی متعین مقدار کا حکم نہیں دیا، لیکن کہیں اسے عرف کے

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٠٤٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧١٤)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٢١٨)

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢١٤٢) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٨٥٠) السلسلة الصحيحة (٦٨٧)

ساتھ مقید کیا ہے اور کہیں بیوی کے ساتھ ہمدردی کے ساتھ۔ لہٰذا واجب اور ضروری یہی ہے کہ نوع، مقدار اور خرچ کرنے کی کیفیت ان تینوں میں معروف کو مدِنظر رکھتے ہوئے لباس اور غذا کا اہتمام کیا جائے۔

نوع کی تفصیل اس طرح ہے کہ ماپ کر گندم یا گن کر روٹیاں یا پیسوں کی شکل میں ان کی قیمت میں سے کوئی ایک چیز بھی متعین نہیں، بلکہ اس میں عرف کو دیکھا جائے گا۔ اگر ان کا عرف کھجور کھانا یا جَو کھانا ہو تو وہ اس کو اتنی کھجوریں یا جَو دے دے جو اس کے لیے کافی ہو۔ یا وہ روٹی سالن کھاتے ہوں تو وہ اس کو روٹی سالن مہیا کرے۔ اگر وہ دانے دیتے ہوں اور بیوی اس کو چکی پر پیس لیتی ہو تو دانے دے دے، علی ہذا القیاس، اسی طرح مقدار کا پیمانہ بھی متعین نہیں، وہ مختلف اوقات کی ضرورت کے مطابق ہوتا ہے۔

جہاں تک خرچ کرنے کی کیفیت ہے تو اس کے متعلق ایک قول تو یہ ہے کہ مرد عورت کو خرچہ دے دے اور وہ جیسے چاہے صرف کرے۔ دوسرا قول ہے کہ یہ کوئی ضروری نہیں، بلکہ یہ عرف بھی نہیں، کیوں کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے ہی سے یہ چلا آ رہا ہے کہ مرد گھر میں کھانا لاتا ہے اور گھر کے سارے افراد کھاتے ہیں، اسی طرح وہ گھر کی ضروریات کی اشیا لاتا ہے اور سب استعمال کرتے ہیں۔ عورت کو ہر روز اس کا خرچہ دینا یہ کوئی عرف نہیں۔ اسی طرح اگر خرچے کے متعلق میاں بیوی کا جھگڑا ہو جائے تو اس میں بھی حاکم وہی فیصلہ کرے گا جو معروف کے مطابق ہو۔[1]

خاوند کے لاپتہ ہونے کی صورت میں کسی دوسرے سے شادی کا حکم

سوال ایک شخص نے شادی کی اور سال کے لیے سفر پر نکل گیا، اس نے اس کو کوئی خرچہ نہ دیا اور خرچ کرنے کے لیے اس کے پاس بھی کچھ نہیں تھا، وہ بھوک سے مرنے لگی، اس حالت میں کسی دوسرے شخص سے اس نے شادی کر لی اور وہ اس سے حاملہ ہو گئی۔ حاکم کو معلوم ہوا کہ پہلا خاوند موجود ہے تو اس نے ان کے درمیان علاحدگی کرا دی۔ اس نے دوسرے خاوند سے حمل کو جنا، دوسرا خاوند اس کو خرچہ دیتا رہا، تا آنکہ بچہ چار سال کا ہو گیا مگر پہلا واپس نہ آیا اور نہ اس کی جگہ ہی معلوم ہو سکی، کیا اس صورت میں وہ دوسرے خاوند سے رجوع کر سکتی ہے، یا پہلے کا انتظار کرے؟

جواب اگر خاوند کی طرف سے خرچہ ملنا بند اور اس کا حصول ناممکن ہو چکا ہے تو عورت نکاح فسخ کر سکتی ہے، جب اس کی عدت ختم ہو جائے تو وہ کسی دوسرے سے شادی بھی کر سکتی ہے۔ فسخ حاکم کرے گا، اگر حاکم وغیرہ کے فسخ کرنے کا امکان نہ ہو اور وہ خود ہی فسخ کر لے تو اس میں اختلاف ہے۔ اگر حاکم نے نکاح فسخ نہ کیا ہو، بلکہ وہ

---

[1] مجموع الفتاویٰ (٣٤/٨٤_٨٩)

دوسرا شخص اس عورت کے حق میں یہ گواہی دے کہ پہلا خاوند فوت ہو گیا ہے، اس وجہ سے وہ شادی کر رہی ہو، لیکن حقیقت میں خاوند فوت نہ ہوا ہو تو یہ نکاح باطل ہو گا۔ تاہم اگر دوسرا خاوند یہ سمجھتا ہو کہ وہ پہلے کی موت کے گمان کے بارے میں صحیح ہے، اس لیے نکاح فسخ ہو گیا ہے تو اس صورت میں بچے کا نسب اس کے ساتھ ملایا جائے گا، اس پر حق مہر واجب ہو گا، لیکن اس پر حد نہیں۔ لیکن وہ عورت اس کے لیے عدت گزارے گی، تا آنکہ پہلے سے اس کی عدت پوری ہو جائے، اس کے بعد اگر ممکن ہو تو پہلے کا نکاح فسخ ہو جائے گا اور وہ جس کے ساتھ چاہے شادی کر سکتی ہے۔ ①

اسقاطِ حمل کی وجہ سے عدت اور نفقہ

سوال ایک شخص نے اپنی بیوی کو حالتِ حمل میں ایک طلاق دی، اس کا اسقاطِ حمل ہو گیا کیا اس کی وجہ سے عدت پوری اور نفقہ ساقط ہو جائے گا؟

جواب جب عورت کا حمل ضائع ہو جائے تو اس کی عدت پوری ہو جاتی ہے اور خرچہ ساقط ہو جاتا ہے، خواہ اس میں روح پھونکی جا چکی ہو یا نہ، جب اس میں انسان کی تخلیق واضح ہو جائے، اگر تخلیق واضح نہ ہو تو اس میں اختلاف ہے۔ ②

ولد الزنا کے خرچے اور تربیت کی ذمے داری

سوال ایک شخص نے کسی پرائی عورت سے مباشرت کی جس کے نتیجے میں وہ حاملہ ہو گئی، بعد میں اس نے اس سے شادی کر لی، کیا اس بچے کی تربیت اس کے سپرد کی جائے گی یا نہیں؟

جواب یہ لڑکا زنا کا نتیجہ ہے، ائمہ اربعہ کے نزدیک اس کا نسب اس کے ساتھ ملحق نہیں ہو گا، لیکن مسلمان ضرور اس پر خرچ کریں، کیوں کہ وہ دیگر یتیموں کی طرح کا یتیم ہے اور مسلمانوں کو یتیموں کا خرچ اٹھانے کی بڑی تاکید کی گئی ہے۔ واللہ أعلم ③

خوش حال بیٹے کا تنگ دست باپ کو خرچہ دینا

سوال کیا کمانے سے عاجز انسان کا خوشحال بیٹا اس کی ذمے داری اٹھائے گا؟

جواب ہاں، خوشحال بیٹا اپنے باپ، اس کی بیوی، چھوٹے بھائیوں کا خرچہ اٹھائے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو باپ کا

---

① مجموع الفتاویٰ (٣٤/٩١۔٩٢)

② مجموع الفتاویٰ (٣٤/٩٨)

③ مجموع الفتاویٰ (٣٤/١٠٠)

نافرمان، قطع رحمی کرنے والا اور دنیا و آخرت میں اللہ کی سزا کا مستحق ہو گا۔ باپ بیٹے کی اجازت کے بغیر اس کے مال سے لینے کا مجاز ہے اور وہ اس کو روک نہیں سکتا۔ واللہ أعلم [1]

ضرورت مند رشتے داروں پر خرچ کرنے کا حکم

سوال اقارب میں سے ضرورت مندوں پر خرچ کرنے کا کیا حکم ہے؟

جواب اگر انسان کے پاس دور اور نزدیک کے رشتے داروں پر خرچ کرنے کی گنجایش نہ ہو تو قریبی پر خرچ کرنا واجب ہوتا ہے، وہ دور کے رشتے دار کو اس طرح نہ دے جس سے قریب کا حق متاثر ہوتا ہو، زکات اور کفارے کی مد میں ایسے قریبی رشتے داروں پر خرچ کرنا جائز ہوتا ہے جو انسان کی زیرِ کفالت نہیں ہوتے، جب محتاجی میں قریب اور دور کے برابر ہوں تو قریبی زیادہ حق رکھتا ہے۔ [2]

بچے کی ماں کا دوسری جگہ شادی کرنے کی صورت میں دادا سے خرچ طلب کرنے کا حکم

سوال ایک شخص نے اپنے پیچھے آٹھ سال کا بچہ چھوڑا، بیوی نے دادا سے خرچے کا مطالبہ کیا، اس کے بعد عورت نے شادی کی اور طلاق لے لی اور بچے کو ساتھ لے گئی، دادا کو اس کی کوئی خبر اور علم نہیں، کیا دادا پر اس کا خرچہ عائد کیا جائے گا؟

جواب اگر بچے کی ماں شادی کر لے تو حضانت، یعنی پرورش کے اخراجات کی حق دار نہیں رہتی، اگر عورت کسی دوسری جگہ منتقل ہو جائے تو اس وقت حضانت دادا کے ذمے ہو جاتی ہے جو کسی ایسے بچے کی حضانت و پرورش کرے جس کی ذمے دار نہیں، پھر اس کا خرچ طلب کرے تو وہ اس کا حق نہیں رکھتی، کیوں کہ وہ حضانت میں ظالم ہے، اس لیے خرچے کا مطالبہ کرنے کا حق نہیں رکھتی، اگر دادا پوتے کے خرچے سے قاصر ہو تو اس پر اس کا خرچہ واجب نہیں رہتا۔ [3]

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۳٤/۱۰۱)

[2] مجموع الفتاویٰ (۳٤/۱۰۷)

[3] مجموع الفتاویٰ (۳٤/۱۰۷)

حدود وتعزیرات

اسلام میں قصاص کا حکم

سوال اسلام میں قصاص کا حکم کیا ہے؟

جواب قصاص امت کے اتفاق کے ساتھ ثابت ہے، خون، مال اور عزت وغیرہ جیسے امور میں حبشی مسلمان کا ہاشمی مسلمان سے اور ہاشمی مسلمان کا حبشی مسلمان سے قصاص لیا جائے گا۔ اگر کوئی کسی کو لعنتی یا کتا کہے تو وہ بھی جواب میں کہہ سکتا ہے، قرآن کریم میں ہے:

﴿وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰٓئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْلٍ ﴿٤١﴾ اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَيَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۭ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿٤٢﴾ وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ﴿٤٣﴾﴾ [الشوریٰ: ٤١۔٤٣]

''اور بے شک جو شخص اپنے اوپر ظلم ہونے کے بعد بدلہ لے لے تو یہ وہ لوگ ہیں جن پر کوئی راستہ نہیں۔ راستہ تو انہی پر ہے جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں اور زمین میں حق کے بغیر سرکشی کرتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن کے لیے دردناک عذاب ہے۔ اور بلاشبہہ جو شخص صبر کرے اور معاف کر دے تو بے شک یہ یقیناً بڑی ہمت کے کاموں سے ہے۔''

لیکن اگر وہ اس کے سر کوئی جھوٹ تھوپے تو بدلے میں اس پر جھوٹ نہیں تھوپا جائے گا، اسی طرح اگر کوئی کسی کے باپ کو گالی دے تو وہ جواب میں اس کے باپ کو گالی نہ دے، خواہ وہ کوئی ہاشمی ہو یا غیر ہاشمی، کیوں کہ اس کے باپ نے تو ظلم نہیں کیا ہوتا، ظلم اس نے خود کیا ہوتا ہے اور قرآن کہتا ہے:

﴿وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى﴾ [الأنعام: ١٦٤]

''اور نہ کوئی بوجھ اٹھانے والی کسی دوسری کا بوجھ اٹھائے گی۔''

لیکن اگر کوئی مسلمان کسی مسلمان کے باپ کو گالی دے تو اس کو تعزیری سزا دی جائے، اسی طرح جو کسی ہاشمی کے باپ کو گالی دے تو اس کو بھی تعزیری سزا ملنی چاہیے، لیکن اس کو رسول اللہ ﷺ کو گالی دینا قرار نہیں دیا جائے گا، کیوں کہ لفظ ظاہر نہیں۔ رسول اللہ ﷺ کو گالی دینا کفر ہے جس کا مرتکب واجب القتل ہو جاتا ہے، اس لیے

محض شک کی بنا پر کسی کا ایمان زائل اور معصوم کا خون بہانا روانہیں ہوتا۔ بالخصوص مسلمانوں کے متعلق غالب گمان یہی ہوتا ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کو نشانہ نہیں بنا سکتے، اس لیے اگر کوئی کہے کہ اس شخص نے ہاشمیوں کو گالی دی اور مراد رسول اللہ ﷺ کو لیا تو دلیل کے بغیر اس کی بات قبول کرنا جائز نہیں۔ واللہ أعلم[1]

قتلِ عمد کی تعریف اور حکم

سوال قتلِ عمد کیا ہے اور اس کا حکم کیا ہے؟

جواب اگر کوئی کسی مسلمان کو مسلمان ہونے کی وجہ سے قتل کرے، جس طرح عیسائی مسلمانوں کو دین کی وجہ سے قتل کرتے ہیں تو ایسا انسان کافر اور ذمی کافر سے بھی بدتر ہے، یہ شخص حربی کافر اور ان کافروں کی طرح ہے جو رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے لڑتے تھے اور وہ دیگر کافروں کی طرح ہمیشہ ہمیشہ جہنم میں رہیں گے، اگر کوئی کسی کو عداوت، مال یا جھگڑے وغیرہ کی وجہ سے قتل کرے جو حرام ہے تو یہ کبیرہ گناہ ہے اور اہلِ سنت کے نزدیک ایسا شخص محض اس وجہ سے کافر نہیں ہوتا۔ خوارج ایسے شخص کو کافر قرار دیتے ہیں، معتزلہ کے عکس جو ملت کے فاسقوں کے دائمی جہنمی ہونے کا عقیدہ رکھتے ہیں، اہلِ سنت کے نزدیک کوئی توحید پرست جہنم میں ہمیشہ ہمیشہ نہیں رہے گا۔ جان بوجھ کر قتل کرنے والے کو دائمی جہنمی قرار دینے کے لیے یہ لوگ اس آیت سے دلیل لیتے ہیں:

﴿ وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا ﴾ [النساء: ٩٣]

''اور جو کسی مومن کو جان بوجھ کر قتل کرے تو اس کی جزا جہنم ہے، اس میں ہمیشہ رہنے والا ہے اور اللہ اس پر غصے ہو گیا اور اس نے اس پر لعنت کی اور اس کے لیے بہت بڑا عذاب تیار کیا ہے۔''

ان کا جواب یہ ہے کہ یہ آیت اس قاتلِ متعمد پر محمول ہے جو مسلمان کو اس کے ایمان کی وجہ سے قتل کرے۔ اکثر علما اس کو اس معنی پر محمول نہیں کرتے، بلکہ یہ کہتے ہیں کہ یہ مطلق وعید ہے جس کی تفسیر اس آیت میں ہے:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ﴾ [النساء: ٤٨]

''بے شک اللہ اس بات کو نہیں بخشے گا کہ اس کا شریک بنایا جائے اور وہ بخش دے گا جو اس کے علاوہ ہے، جسے چاہے گا۔''

---

[1] مجموع الفتاویٰ (٣٤/١٣٥۔١٣٦)

اس کے متعلق ایک اہلِ سنت نے یہ واقعہ بیان کیا ہے کہ وہ ایک مجلس میں تھا، جس میں معتزلہ کا شیخ عمرو بن عبید بھی تھا، وہ کہنے لگا: قیامت کے دن مجھے لایا جائے گا اور مجھ سے کہا جائے گا: اے عمرو! تو نے یہ بات کہاں سے نکالی کہ میں قاتل کو نہیں بخشوں گا؟ میں کہوں گا: باری تعالیٰ! تو نے خود ہی فرمایا ہے:

﴿ وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا ﴾ [النساء: ۹۳]

وہ آدمی کہتا ہے: میں نے عمرو سے کہا: اگر اللہ نے تجھ سے یہ کہہ دیا کہ میں نے تو یہ بھی کہا ہوا ہے:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ﴾ [النساء: ٤٨]

تو تجھے کیسے علم ہوا کہ میں اس کو بخشنا نہیں چاہتا؟ یہ سن کر عمرو بن عبید خاموش ہو گیا۔[1]

قتلِ عمد یا خطا میں دیت ہے کہ کفارہ؟

سوال قتلِ عمد یا خطا میں وہ کفارہ دیا جائے گا جو قرآن میں ان الفاظ کے ساتھ مذکور ہے:

﴿ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ ﴾ [النساء: ۹۲] ''تو پے در پے دو ماہ کے روزے رکھنا ہے۔''

یا قاتل سے دیت کا مطالبہ کیا جائے گا؟

جواب قتلِ خطا میں دیت اور کفارہ واجب ہوتا ہے اور اس میں گناہ نہیں ہوتا، لیکن قتلِ عمد کا گناہ ہے۔ اگر مقتول کے وارثان اس کو معاف کر دیں یا اس سے دیت لے لیں تو اس کے ساتھ آخرت میں مقتول کا حق اس قاتل سے ساقط نہیں ہو جاتا۔ جب اس کو قصاص میں قتل کر دیا جائے تو اس میں بھی اختلاف ہے، لیکن زیادہ ظاہر یہی ہے کہ اس سے بھی ساقط نہیں ہوتا، لیکن اگر قاتل کی نیکیاں زیادہ ہوئیں تو اس سے کچھ لے کر مقتول کو خوش کر دیا جائے گا یا اللہ اپنی طرف سے اس کو اس کا کوئی عوض اور بدلہ دے دیں گے، اگر قاتل نے سچی توبہ کی۔

غلطی سے قتل کرنے والے پر نصِ قرآن اور اجماعِ امت کی دلیل سے دیت واجب ہے، دیت مسلم کے لیے بھی واجب ہے اور ذمی کے لیے بھی جیسا کہ قرآن سے بھی ثابت ہے اور ائمہ اور سلف کا مذہب بھی یہی ہے۔ متقدمین سے اس مسئلے میں اختلاف منقول نہیں، لیکن بعض متاخر ظاہریہ کا خیال اور رائے ہے کہ اس کی دیت نہیں۔

جو عمداً اور جان بوجھ کر قتل کرتا ہے اس سے قصاص لینا مقرر ہے، اگر وارثان دیت لینے پر صلح کر لیں تو یہ نص اور اجماع سے جائز ہے، دیت قاتل کے مال سے ہوگی، قتلِ خطا کے عکس کہ اس میں قاتل کے عصبہ پر اس کی دیت ہوتی ہے۔ جہاں تک کفارے کی بات ہے تو جمہور علما کا کہنا ہے: قتلِ عمد اتنا بڑا جرم ہے کہ کفارے سے اس کی تلافی

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۱۳٦/۳٤-۱۳۷)

نہیں ہوسکتی۔ یمینِ غموس کے متعلق بھی ان کا یہی قول ہے۔ یہ امام مالک، ابو حنیفہ اور مشہور روایت کے مطابق احمد کا مذہب ہے، اسی طرح زنا کے متعلق بھی ان کا اتفاق ہے کہ یہ اتنا بڑا جرم ہے جس کی کفارے سے تلافی نہیں ہوسکتی۔ کفارہ اسی صورت میں واجب ہوتا ہے جب کوئی شخص ظہار کر کے بیوی سے مجامعت کرے، یا کوئی رمضان کے مہینے میں دن کے وقت جماع کرے۔ شافعی اور احمد سے دوسری روایت ہے کہ قتلِ عمد اور یمینِ غموس دونوں میں کفارہ واجب ہے۔ اس پر بھی ان کا اتفاق ہے کہ گناہ محض کفارے سے ساقط اور زائل نہیں ہوتا۔ [1]

شریکانِ قتل سے قصاص کا حکم

سوال کچھ لوگوں نے ایک مسلمان کو قتل کرنے پر گٹھ جوڑ کیا اور اس پر ایک دوسرے سے حلف بھی لیا، انھوں نے اپنے ساتھ ایسے لوگوں کو بھی لیا جو اس حلف برداری میں شریک نہیں تھے، وہ ایک شخص کے پاس آئے اور اس کو تلوار وغیرہ سے مار کر سمندر میں پھینک دیا، کیا ان سب سے قصاص لیا جائے گا یا نہیں؟

جواب اگر وہ سارے اس طرح کسی معصوم اور بری الذمہ شخص کے قتل میں شریک ہوئے کہ سب نے اس کے قتل میں حصہ لیا تو سب سے قصاص لیا جائے گا۔ اگر کچھ قتل کرنے میں لگے رہے اور کچھ ان کی نگرانی اور مدد کرتے رہے تو اس صورت میں دو اقوال ہیں۔ ابو حنیفہ، شافعی اور احمد کے مذہب میں قصاص براہِ راست قاتل سے لیا جائے گا، کیوں کہ ہر ایک کے فعل کے لیے اس کی جان نکالنے کے قابل ہونا ضروری ہے۔ امام مالک کے مذہب میں سب سے قصاص لینا ضروری ہے، گو اس کا قتل آپس کی عداوت، دشمنی یا ناجائز قتل پر مجبور کرنے جیسی کسی خاص غرض کی وجہ سے ہی سے ہو۔ یہاں اس کے وارث قصاص لیں گے۔ چاہیں تو قتل کر دیں، چاہیں تو معاف کر دیں اور اگر چاہیں تو دیت لے لیں۔ اگر وارث چھوٹا اور نابالغ ہو تو اس کا والی اور سرپرست یہ حق رکھتا ہے، اگر اس کا کوئی ولی نہ ہو تو پھر سلطان اس کا ولی ہوگا۔ ابو حنیفہ، مالک اور ایک روایت میں احمد کے مذہب میں حاکم اس کا نائب ہوگا، دوسرے قول کے مطابق جب تک وہ بالغ نہ ہو جائے تب تک یہ کسی کا حق نہیں، یہ امام شافعی کا مذہب اور احمد سے دوسری روایت ہے۔ [2]

کسی مسلمان کو ناحق قتل کرنے والے کی توبہ

سوال ایک مسلمان نے دوسرے مسلمان کو جان بوجھ کر ناحق قتل کیا، اس کے بعد اس نے توبہ کر لی، کیا اس کی توبہ

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۳۴/۱۳۸۔۱۳۹)

[2] مجموع الفتاویٰ (۳۴/۱۴۲)

قبول ہو جائے گی اور وہ جہنم سے بچ جائے گا یا نہیں، نیز کیا اس پر دیت واجب ہے یا نہیں؟

جواب جو کسی کو ناحق قتل کرتا ہے اس پر دو حق عائد ہوتے ہیں:

1 ایک اللہ کا حق کہ اس نے اللہ کی حد سے تجاوز کیا اور اس کی حرمت پامال کی، یہ گناہ ہے، اللہ تعالیٰ اس کو صحیح توبہ کرنے کی صورت میں معاف کر دیتے ہیں، ارشاد ہے:

﴿يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا﴾ [الزمر: ۵۳]

''اے میرے بندو جنھوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی! اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو جاؤ بے شک اللہ سب کے سب گناہ بخش دیتا ہے۔''

فرمایا:

﴿وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰـهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا ﴿68﴾ يُّضٰعَفْ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَيَخْلُدْ فِيْهٖ مُهَانًا ﴿69﴾ اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰۗىِٕكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَـيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا﴾ [الفرقان: ٦٨۔٧٠]

''اور وہ جو اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو نہیں پکارتے اور نہ اس جان کو قتل کرتے ہیں جسے اللہ نے حرام کیا ہے مگر حق کے ساتھ اور نہ وہ زنا کرتے ہیں اور جو یہ کرے گا وہ سخت گناہ کو ملے گا۔ اس کے لیے قیامت کے دن عذاب دگنا کیا جائے گا اور وہ ہمیشہ اس میں ذلیل کیا ہوا رہے گا۔ مگر جس نے توبہ کی اور ایمان لے آیا اور عمل کیا نیک عمل تو یہ لوگ ہیں جن کی برائیاں اللہ نیکیوں میں بدل دے گا اور اللہ ہمیشہ بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے۔''

صحیحین وغیرہ میں حضرت ابوسعید سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ایک آدمی نے ننانوے قتل کیے ....اللہ نے اس کو معاف کر دیا۔''[1]

2 دوسرا حق آدمیوں کا ہوتا ہے، لہٰذا قاتل مقتول کے وارثوں کو ان کا حق دے، اپنے آپ کو قصاص کے لیے پیش کرے یا مال پر صلح کرے یا ان سے معافی مانگے، جب وہ یہ کام کر لے تو ان کا حق ادا کر دے گا جو اس پر واجب ہے اور یہ توبہ کی تکمیل کے لیے ضروری ہے۔ اب کیا قیامت کے دن مقتول کا حق اس پر باقی رہے گا اور

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٢٨٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٦٦)

وہ مطالبہ کرنے کا مجاز ہو گا یا نہیں؟ اس میں فقہا کا اختلاف ہے، جو کہتے ہیں: باقی رہے گا، وہ کہتے ہیں: قیامت کے دن قاتل کی نیکیاں مقتول کو اس کے حق کے برابر دے دی جائیں گی، اس لیے اگر قاتل بہت زیادہ نیکیاں کرتا رہے تو اس کے لیے رحمتِ الٰہی کی امید کی جا سکتی ہے اور وہ آگ سے بچ جائے گا۔

﴿لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ﴾ [الزمر: ٥٣][1]

مسلمان سے کافر کا قصاص لینے کا حکم

سوال اگر کوئی مسلمان کسی یہودی کو قتل کر دے تو کیا مسلمان کو اس کے قصاص میں قتل کیا جائے گا یا کچھ اور کیا جائے گا؟

جواب الحمد للّٰه. ائمہ اسلام کے نزدیک اس پر قصاص نہیں، تاہم کسی ذمی کو ناحق قتل کرنا بھی جائز نہیں۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«لَا يُقْتَلُ مُسْلِمٌ بِكَافِرٍ»[2] ''کافر کے بدلے میں مسلمان کو قتل نہیں کیا جائے گا۔''

لیکن اس پر دیت واجب ہے، وہ دیت کتنی ہو گی، اس میں کچھ اقوال ہیں۔ ایک قول کے مطابق مسلمان کی دیت کا نصف، دوسرے قول کے مطابق مسلمان کی دیت کا ایک تہائی حصہ اور ایک قول میں قتلِ خطا اور عمد میں فرق کیا جائے گا۔ قتلِ عمد کی صورت میں مسلمان کی دیت کے برابر دیت دی جائے گی اور قتلِ خطا کی صورت میں نصف دیت۔ یہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، کسی مسلمان نے کسی ذمی کو قتل کر دیا، انھوں نے اس پر سختی کی اور پوری دیت لازم کی۔ سنن میں رسول اللہ ﷺ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے ذمی کی دیت مسلمان کی دیت کا نصف مقرر کی۔[3] بہر حال قتل کا کفارہ بھی واجب ہے جو ایک مسلمان غلام آزاد کرنا ہے، اگر نہ ملے تو دو ماہ مسلسل روزے رکھنے ہیں۔[4]

ملزم کو اقرار کروانے کے لیے مارنا

سوال جس پر قتل کا الزام ہو، کیا اقرار کروانے کے لیے اس کو مارا جا سکتا ہے یا نہیں؟

جواب اگر لوث، یعنی شبہہ اور غالب گمان ہو کہ قتل اسی نے کیا ہے، مگر تعین نہ ہو تو مقتول کے وارثان پچاس قسمیں دے دیں، وہ اس کے خون کے مستحق بن جائیں گے، لیکن اقرار کروانے کے لیے مارنا اسی صورت میں جائز

---

[1] مجموع الفتاویٰ (٣٤/١٧١۔١٧٢)

[2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (١١١)

[3] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٤٥٨٣) سنن النسائي، رقم الحدیث (٤٨٠٦) سنن الترمذي، رقم الحدیث (١٤١٣) صحیح الجامع، رقم الحدیث (٣٣٩٥)

[4] مجموع الفتاویٰ (٣٤/١٤٦)

ہے، جب شواہد اور قرائن اس کے قاتل ہونے پر دلالت کریں، بعض علما اس صورتِ حال میں اقرار کروانے کے لیے اس کو مارنا جائز کہتے ہیں اور بعض مطلقاً ناجائز کہتے ہیں۔[1]

عمداً اسقاطِ حمل کا حکم

سوال ایک حاملہ عورت نے جان بوجھ کر اسقاطِ حمل کروایا، اس پر کیا لازم آتا ہے؟

جواب رسول اللہ ﷺ کی سنت اور ائمہ کے اتفاق کے ساتھ اس پر لونڈی یا غلام آزاد کرنا واجب ہے، یہ لونڈی یا غلام پیٹ کے بچے کے ورثا کے لیے ہوگا، اس کی ماں کے لیے نہیں، اگر اس کا باپ ہو تو وہ اس کے لیے ہوگا، اگر وہ اس کو بیوی سے ساقط کرنا چاہے تو کر سکتا ہے اور قیمت دیت کا دسواں حصہ ہوگی یا پچاس دینار۔ اکثر علما کے نزدیک اس کے ذمے ایک غلام آزاد کروانا ہے، اگر نہ پائے تو مسلسل دو ماہ کے روزے رکھے، اگر اس کی طاقت بھی نہ رکھے تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے۔[2]

بیمار بچے کو زندہ درگور کرنے کا حکم

سوال ایک عورت بیمار ہے اور اس کا بچہ بھی بیمار وہ اس سے تنگ آ گئی اور اس نے اس کو زندہ ہی دفنا کر موت کے گھاٹ اتار دیا، اس پر کیا لاگو ہوتا ہے؟

جواب الحمد لله. یہی وہ زندہ درگور کرنا ہے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا ہے:

﴿ وَإِذَا الْمَوْءُدَةُ سُئِلَتْ ۞ بِأَيِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ ﴾ [التكوير: ٨، ٩]

''اور جب زندہ دفن کی گئی (لڑکی) سے پوچھا جائے گا۔ کہ وہ کس گناہ کے بدلے قتل کی گئی؟''

نیز فرمایا:

﴿ وَلَا تَقْتُلُوٓا أَوْلَٰدَكُم مِّنْ إِمْلَٰقٍ ﴾ [الأنعام: ١٥١]

''اور اپنی اولاد کو مفلسی کی وجہ سے قتل نہ کرو۔''

صحیحین میں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا: کون سا گناہ سب سے بڑا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''تو کسی کو اللہ کا ہمسر قرار دے، حالانکہ اس نے تجھے پیدا کیا ہے۔'' پوچھا گیا: پھر کون سا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''تو اس ڈر سے اپنے بچے کو قتل کرے کہ وہ تیرے ساتھ کھائے گا۔''[3]

---

[1] مجموع الفتاویٰ (١٦٤/٣٤)

[2] مجموع الفتاویٰ (١٦١/٣٤)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٤٨٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٨٦)

اگر اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے تنگدستی اور غربت کے ڈر سے بچوں کو قتل کرنے سے منع کیا ہے تو اس کے علاوہ کسی اور سبب اور وجہ سے قتل کرنا کیسے جائز ہو گا؟ لہٰذا یہ حرام ہے۔ جمہور کے قول کے مطابق اس عورت پر دیت واجب ہے جو اس بچے کے وارث لیں گے اور اس عورت کو اس سے کچھ نہیں ملے گا، اس پر سب کا اتفاق ہے اور اس پر کفارے کے واجب ہونے میں دو اقوال ہیں۔ واللہ أعلم [1]

دست درازی اور بدسلوکی کے جواب کا حکم

سوال اگر کوئی کسی کو تھپڑ مارے یا غلط بات کہے یا گالی دے تو اس کے ساتھ اسی طرح کرنا جائز ہے یا ناجائز؟

جواب تھپڑ یا ضرب وغیرہ کے قصاص سے متعلق خلفائے راشدین، صحابہ کرام اور تابعین کا مذہب ہے کہ ان امور میں قصاص لینا ثابت ہے۔ ایک روایت میں امام احمد سے بھی یہی منقول ہے، لیکن بہت سے فقہا ان میں قصاص کی مشروعیت کے قائل نہیں، کیوں کہ ان امور میں قصاص لیتے وقت عموماً مساوات قائم رکھنا انتہائی دشوار ہوتا ہے، یہ ابوحنیفہ، مالک، شافعی اور احمد کے بہت سے اصحاب کا قول ہے، لیکن پہلا قول زیادہ درست ہے، کیوں کہ ان امور میں رسول اللہ ﷺ کی سنت اور خلفائے راشدین کی سنت قصاص لینے ہی کی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ جَزَآءُ سَيِّئَةٍۭ بِمِثْلِهَا ﴾ [یونس: ۲۷] ”کسی بھی برائی کا بدلہ اس جیسا ہوگا۔“

نیز فرمایا:

﴿ فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ ﴾ [البقرة: ۱۹۴]

”پس جو تم پر زیادتی کرے سو تم اس پر زیادتی کرو، اس کی مثل جو اس نے تم پر زیادتی کی ہے۔“

یہ جو اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس طرح کے جرم میں مماثلت انتہائی دشوار ہوتی ہے، اس کے جواب میں کہا جائے گا: اس جرم کی سزا تو ضرور ملنی چاہیے، خواہ وہ قصاص کی صورت میں ہو یا تعزیر کی شکل میں، اگر ایسے معاملے میں تعزیر نافذ کرنا جائز ہے جس کی جنس اور مقدار غیر مضبوط ہو، یعنی اس کی درست تعیین ممکن نہ ہو تو جو ضبط اور متعین کرنے کے زیادہ قریب ہو اس میں تعزیر نافذ کرنا زیادہ مناسب ہے اور قصاص میں عدل حسبِ امکان ہی معتبر ہوتا ہے۔ عام سی بات ہے کہ اگر مارنے والے کو اس طرح یا اس کے قریب قریب ضرب لگائی جائے جو اس نے لگائی ہے تو یہ اس کو کوڑے مار کر سزا دینے کی نسبت عدل کے زیادہ قریب ہے۔ جن علما نے اس طرح کے امور میں ظلم کے خوف سے قصاص لینا ناجائز کہا ہے، وہ جس ظلم سے بھاگ رہے ہیں اس سے بڑے ظلم کو جائز کر رہے ہیں۔ معلوم

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۱۶۱/۳۴)

ہوا کہ سنت نے جو فیصلہ دیا ہے، وہی عدل کے زیادہ قریب اور زیادہ مثالی ہے۔

اسی طرح آدمی اس طرح کی گالی بھی دے سکتا ہے، مثلاً وہ کہے: تجھ پر لعنت ہو تو جواب میں کہہ دے تجھ پر بھی لعنت ہو، یا کہے: اللہ تجھے ذلیل کرے، اللہ تیرا برا کرے، او کتے! او خنزیر! وغیرہ، تو وہ بھی جواب میں یہ الفاظ کہہ سکتا ہے۔ مگر ایسی بات جو کہنا حرام ہو، مثلاً وہ اس کو کافر یا اس کی طرف کوئی جھوٹ منسوب کرے تو جواب میں یہ بات نہ کہی جائے، اگر وہ اس کے باپ کو گالی دے یا لعنتی کہے تو وہ جواب میں اس کے باپ کو گالی نہ دے، کیوں کہ اس کے باپ نے اس پر ظلم نہیں کیا۔ [1]

بہن سے زنا کرنے والے کا حکم

سوال اگر کوئی اپنی بہن سے زنا کرے تو شریعت اس کے بارے میں کیا کہتی ہے؟

جواب جس انسان کو علم ہو کہ بہن کے ساتھ بدکاری کرنا حرام ہے، اس کے باوجود اس گندے کام کا ارتکاب کرے تو وہ واجب القتل ہو جاتا ہے۔

اس کی دلیل حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث ہے، وہ کہتے ہیں: میرے پاس سے میرے ماموں ابو بردہ گزرے جن کے ہاتھ میں جھنڈا تھا، میں نے پوچھا: ماموں جان کہاں جا رہے ہو؟ انھوں نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے ایک آدمی کی گردن اڑانے اور اس کے مال کا پانچواں حصہ لانے کا حکم دے کر بھیجا ہے جس نے اپنے باپ کی بیوی سے شادی کر رکھی ہے۔ [2] واللہ أعلم [3]

ناجائز تعلقات رکھنے والی شادی شدہ عورت پر اس کی اولاد کا حق اور اس کو خفیہ قتل کرنے کا حکم

سوال ایک شادی شدہ اور صاحبِ اولاد عورت نے کسی آدمی کے ساتھ ناجائز تعلقات استوار کر لیے، جب اس کا راز کھل گیا تو اس نے خاوند سے علاحدہ ہونے کے لیے چارہ جوئی کر دی، کیا اس فعلِ بد کے بعد اپنی اولاد پر اس کا حق باقی رہتا ہے؟ اگر اولاد اس سے لاتعلق ہو جائے تو گناہ گار ہو گی؟ نیز کیا جس کو اس کی حقیقت معلوم ہو جائے وہ اس کو خفیہ طور پر قتل کر سکتا ہے اور ایسا کرنے کی صورت میں گناہ گار ہو گا؟

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۳۴/۱۶۲-۱۶۳)

[2] سنن أبي داود، رقم الحدیث (٤٤٥٧) سنن النسائي، رقم الحدیث (٣٣٣٢) سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (٢٦٠٧، ٢٦٠٨) شیخ البانی رحمہ اللہ نے إرواء الغلیل (٢٣٥١) میں اسے صحیح کہا ہے۔

[3] مجموع الفتاویٰ (٣٤/١٧٧)

جواب اس عورت کی اولاد اور نسبی رشتے داروں پر فرض ہے کہ اس کو حرام کاری سے روکیں، اگر باز نہ آئے تو محبوس بھی کیا جا سکتا ہے، لیکن بیٹے کو ماں کو مارنے کی اجازت نہیں، اسی طرح اس کے ساتھ بدسلوکی اور قطع تعلقی بھی جائز نہیں کہ وہ آزاد ہو جائے اور جو چاہے کرتی پھرے، بلکہ اپنی استطاعت کے مطابق اس کو روکیں، اگر اس کو خرچے اور لباس کی ضرورت ہو تو اس کا خیال بھی رکھیں اور ان کے لیے اس پر قتل یا کسی اور صورت میں حد نافذ کرنا بھی جائز نہیں، اگر وہ ایسا کریں گے تو گناہ گار ہوں گے۔[1]

لونڈے بازی کی سزا اور طہارت

سوال فاعل اور مفعول (لونڈے باز) کی طہارت اور سزا کیا ہے؟

جواب فاعل اور مفعول دونوں کو سنگسار کرنا ضروری ہے، خواہ وہ شادی شدہ ہوں یا غیر شادی شدہ۔ سنن میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس کو تم قومِ لوط والی بدفعلی کرتے دیکھو تو کرنے والے اور کروانے والے، دونوں کو قتل کر دو۔''[2] ان کو قتل کرنے پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اتفاق بھی ہے۔ وہ دونوں غسلِ جنابت کریں۔ جنابت تو غسل سے زائل ہو جائے گی، لیکن گناہ کی نجاست توبہ کے بغیر صاف نہیں ہو گی۔[3]

مشت زنی کا حکم

سوال مشت زنی کا کیا حکم ہو؟

جواب مشت زنی جمہور علما کے نزدیک اصلاً حرام ہے، یہ کام کرنے والے کو تعزیری سزا دی جا سکتی ہے، مگر یہ زنا کی طرح نہیں۔ کچھ علما سے ضرورت کے تحت اس کی رخصت منقول ہے، مثلاً کسی کو زنا کا خوف ہو اور اس کے بغیر اس سے بچ نہ سکتا ہو، یا کسی مرض کے لاحق ہونے کا خدشہ ہو، لیکن ضرورت کے بغیر میرے علم کے مطابق کسی عالم نے اس کی رخصت نہیں دی۔ واللہ أعلم[4]

---

[1] مجموع الفتاویٰ (٣٤/١٧٧۔١٧٨)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٤٦٢) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٤٥٦) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٥٦١) صحيح الجامع، رقم الحديث (٦٥٨٩)

[3] مجموع الفتاویٰ (٣٤/١٨١)

[4] مجموع الفتاویٰ (٣٤/٢٢٩)

حد لگنے سے پہلے توبہ کی صورت میں سقوطِ حد کا حکم

سوال جس پر زنا کی حد واجب ہو چکی ہو، اگر وہ حد لگنے سے پہلے پہلے توبہ کر لے تو کیا توبہ کی وجہ سے حد ساقط ہو جائے گی؟

جواب اگر کیس عدالت میں جانے سے پہلے کوئی انسان زنا، شراب نوشی اور چوری وغیرہ سے سچی توبہ کر لے، صحیح قول کے مطابق اس سے حد ساقط ہو جاتی ہے، جس طرح محارب پکڑے جانے سے پہلے توبہ کر لیں تو ان سے ساقط ہو جاتی ہے۔ حدیث میں ہے: ''جو ان گندگیوں میں سے کسی ایک گندگی میں مبتلا ہو جائے تو اللہ کی پردہ پوشی کے نیچے چھپا رہے، جو ہمارے سامنے اپنا پہلو ظاہر کرے گا، ہم اس پر کتاب اللہ کو نافذ کریں گے۔''[1] ایک اثر میں ہے: ''جو خفیہ گناہ کرے، وہ خفیہ توبہ کرے اور جو علانیہ گناہ کرے وہ علانیہ توبہ کرے۔'' ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ ﴾ [آل عمران: ١٣٥]

''اور وہ لوگ کہ جب کوئی بے حیائی کرتے ہیں، یا اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں تو اللہ کو یاد کرتے ہیں، پس اپنے گناہوں کی بخشش مانگتے ہیں۔''[1]

بابرکت ایام میں نافرمانی کی سنگینی

سوال کیا بابرکت ایام میں نافرمانی کا گناہ اور زنا کی حد سنگین اور زیادہ ہو جاتی ہے؟

جواب بابرکت ایام اور مقدس مقامات پر گناہوں کی سزا زمان و مکان کی فضیلت کے اعتبار سے شدید ہو جاتی ہے۔[3]

لونڈے بازی کی سزا اور طہارت

سوال فاعل اور مفعول (لونڈے باز) کی طہارت اور سزا کیا ہے؟

جواب فاعل اور مفعول دونوں کو سنگسار کرنا ضروری ہے، خواہ وہ شادی شدہ ہوں یا غیر شادی شدہ۔ سنن میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس کو تم قوم لوط والی بدفعلی کرتے دیکھو تو کرنے والے اور کروانے والے، دونوں کو قتل کر دو۔''[4] ان کو قتل کرنے پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اتفاق بھی ہے، وہ دونوں غسلِ جنابت کریں، جنابت تو غسل سے زائل ہو جائے گی، لیکن گناہ کی نجاست توبہ کے بغیر صاف نہیں ہو گی۔[5]

---

[1] الموطأ (٨٢٥/٢) صحيح الجامع (١٤٩)

[2] مجموع الفتاویٰ (١٧٩/٣٤-١٨٠)

[3] مجموع الفتاویٰ (١٨٠/٣٤)

[4] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٤٦٢) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٤٥٦) سنن ابن ماجه (٢٥٦١) صحيح الجامع (٦٥٨٩)

[5] مجموع الفتاویٰ (١٨١/٣٤)

نشہ آور مشروبات کا حکم

سوال نشہ آور مشروبات کا کیا حکم ہے؟

جواب نشہ آور مشروبات سے متعلق صحابہ کرام، تابعینِ عظام اور جمہور علمائے اسلام کا مذہب ہے کہ ہر نشہ آور چیز خمر (عقل پر پردہ ڈالنے والی اور شراب) ہے اور ہر خمر حرام ہے، جس کی زیادہ مقدار پینے سے نشہ ہوتا ہو اس کی تھوڑی مقدار بھی حرام ہے، یہی امام مالک اور ان کے اصحاب، امام شافعی اور ان کے متبعین، امام احمد اور ان کے ماننے والوں اور امام ابوحنیفہ کے شاگرد محمد بن حسین شیبانی کا مختار مذہب ہے، اسی طرح ابولیث سمرقندی، اوزاعی، لیث بن سعد، اسحاق بن راہویہ، داود بن علی، ابن جریر طبری وغیرہ اور ان کے ماننے والوں کا موقف بھی یہی ہے۔

کوفہ کے علما، نخعی، ابوحنیفہ اور شریک وغیرہ کی رائے یہ ہے کہ کھجور اور انگور کے درخت کے سوا، مثلاً: گندم، جو، مکئی، شہد اور گھوڑی کے دودھ وغیرہ کی نبیذ میں سے جو چیز نشہ پیدا کرے اس کی اتنی مقدار پینا حرام ہے جو نشے کا باعث بنے، تھوڑی سی مقدار جو نشہ پیدا نہ کرتی ہو، حرام نہیں، البتہ انگور کا جوس جب جوش مارے، ابلنے لگے اور اس پر جھاگ اٹھنے لگے تو وہ بلاشبہہ خمر ہے جس کی تھوڑی مقدار بھی حرام ہے اور زیادہ بھی، اس پر سب اہلِ اسلام کا اجماع ہے۔

دوسری رائے کے قائلین کا کہنا ہے "خمر" صرف اس شراب کو کہا جاتا ہے جو انگور سے بنائی جاتی ہے۔ یہ بھی ان کا کہنا ہے کہ کھجور اور منقے کی نبیذ جب کچی اور نشہ آور ہو تب اس کی تھوڑی مقدار بھی حرام ہوتی ہے اور زیادہ بھی، مگر اس کو خمر نہیں کہا جاتا، اگر اس کو تھوڑا سا پکایا جائے تو حلال ہو جاتی ہے۔ انگور کا جوس جب پکایا جائے تو وہ نشہ آور اور حرام ہو جاتا ہے، لیکن جب اتنا پکا لیا جائے کہ ایک تہائی رہ جائے، تب نہیں، مگر جب خمر اور نشہ آور بن جائے، چاہے پکایا بھی جائے، تب بلا اختلاف حرام ہے۔

پہلا قول ہی، جو جمہور علما کا ہے، کتاب وسنت اور صحیح قیاس کی رو سے صحیح ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّمَا الْخَمْرُ وَ الْمَيْسِرُ وَ الْاَنْصَابُ وَ الْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَ الْبَغْضَآءَ فِي الْخَمْرِ وَ الْمَيْسِرِ وَ يَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَ عَنِ الصَّلٰوةِ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ۝﴾ [المائدۃ: ۹۰، ۹۱]

"بات یہی ہے کہ شراب اور جوا اور شرک کے لیے نصب کردہ چیزیں اور فال کے تیر سراسر گندے ہیں، شیطان کے کام سے ہیں، سو اس سے بچو، تاکہ تم فلاح پاؤ۔ شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعے تمھارے درمیان دشمنی اور بغض ڈال دے اور تمھیں اللہ کے ذکر سے اور نماز سے روک دے، تو کیا تم باز آنے والا ہو۔"

لفظ خمر جو قرآن میں بولا گیا ہے، عربی زبان میں ہر اس نشہ آور چیز پر بولا جاتا ہے جو کھجور سے بنی ہو یا کسی اور چیز سے، صرف انگور سے بنائے گئے نشہ آور مشروبات کے لیے خاص نہیں۔ صحیح روایات سے ثابت ہے کہ جب غزوۂ احد کے بعد تین ہجری میں مدینہ طیبہ میں خمر (شراب) حرام کی گئی، اس وقت انگور کے رس نام کی کوئی چیز نہیں تھی، مدینہ طیبہ میں انگور کی بیل ہی نہیں، اہلِ مدینہ کی خمر (شراب) کھجور سے بنائی جاتی تھی۔ جب اللہ تعالیٰ نے اس کو حرام کیا تو انھوں نے رسول اللہ ﷺ کے حکم سے اسے بہا دیا، بلکہ وہ سارے برتن مٹکے اور جام بھی توڑ دیے جن میں اسے محفوظ اور پیش کیا جاتا تھا وہ اسی کو خمر کہتے تھے، لہٰذا معلوم ہوا کہ لفظ خمر کتاب اللہ میں عام ہے اور انگور کی شراب کے ساتھ خاص نہیں۔

صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جب شراب کی حرمت کا حکم آیا اس وقت اہلِ مدینہ کے پاس پانچ انواع کی شراب تھی جن میں ایک بھی انگور سے نہیں تھی۔

صحیحین میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: ''اس دن کھجور کے ڈوکے اور پکی کھجور سے بنائی خمر حرام کی گئی۔''

صحیح مسلم کے الفاظ ہیں: ''اللہ نے شراب کی حرمت پر مشتمل آیت نازل کی اور مدینہ میں صرف کھجور اور ڈوکے کی شراب تھی۔''

بخاری میں ہے: ''جب یہ ہم پر حرام ہوئی اس وقت ہم انگوروں کی شراب بہت کم پاتے تھے، ہماری عام شراب کھجور اور ڈوکے کی ہوتی تھی۔''

صحیحین میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں ابوعبیدہ اور ابی بن کعب کو پکے ڈوکے اور کھجور کی مخلوط شراب پلا رہا تھا کہ ایک آنے والا آیا اور اس نے کہا: شراب حرام ہوگئی ہے۔ ابوطلحہ نے کہا: اے انس! اٹھ اور اس مٹکے کو بہا دے، میں نے اسے بہا دیا۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے یہ بھی ثابت ہے کہ خمر جس طرح انگور کی ہوتی ہے، اسی طرح گندم اور جو کی بھی ہوتی ہے۔ صحیحین میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے منبرِ رسول ﷺ پر کہا: ''اما بعد: لوگو! شراب کی حرمت نازل ہو چکی ہے، یہ ان پانچ چیزوں سے بنائی جاتی ہے: انگور، کھجور، شہد، گندم اور جو۔ خمر وہ ہے جو عقل میں اختلاط پیدا کر دے۔''

ابوداود، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ میں نعمان بن بشیر سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''یقیناً گندم سے شراب ہوتی ہے، جو سے شراب ہوتی ہے، منقے سے شراب ہوتی ہے، کھجور سے شراب ہوتی ہے اور شہد سے بھی

شراب ہوتی ہے۔''[1] ابو داود میں یہ اضافہ ہے: ''میں ہر نشہ آور سے منع کرتا ہوں۔''[2]

وہ احادیث شہرت کا درجہ رکھتی ہیں جن میں ہے کہ « كُلُّ مُسْكِرٍ خَمْرٌ » ''ہر نشہ آور خمر (شراب) ہے۔'' اور وہ حرام ہے۔

صحیحین میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ''بتع'' سے متعلق سوال ہوا، جو شہد کی نبیذ ہے اور اہلِ یمن اس کو پیتے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« كُلُّ شَرَابٍ أَسْكَرَ فَهُوَ حَرَامٌ »[3] ''ہر وہ مشروب جو نشہ پیدا کرے، حرام ہے۔''

صحیحین میں حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں نے کہا: اے اللہ کے رسول! ہمیں دو شرابوں کے بارے میں فتویٰ دیجیے جو ہم یمن میں بناتے تھے، ایک بتع ہے جو شہد سے بنتی ہے، پہلے شہد کی نبیذ بنائی جاتی ہے، پھر اسے پکنے تک رکھ دیا جاتا ہے، وہ کہتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جامع کلمات کی خوبی عطا ہوئی تھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « كُلُّ مُسْكِرٍ حَرَامٌ »[4] ''ہر نشہ آور حرام ہے۔''

صحیح مسلم میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ یمن کے علاقے سے حبشان کے آدمی نے اپنے علاقے میں مکئی سے بنائی جانے والی شراب سے متعلق پوچھا، جسے ''مزر'' کہا جاتا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: کیا وہ نشہ آور ہے؟ اس نے کہا: ہاں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا: « كُلُّ مُسْكِرٍ حَرَامٌ » ''ہر نشہ آور حرام ہے۔'' اللہ کا شراب نوش سے وعدہ ہے، وہ اس کو ''طينة الخبال'' پلائے گا، پوچھا گیا: اے اللہ کے رسول! طينة الخبال کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا: اہلِ جہنم کا پسینہ یا ان کا نچوڑ۔[5]

صحیح مسلم وغیرہ میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « كُلُّ مُسْكِرٍ خَمْرٌ، وَكُلُّ مُسْكِرٍ حَرَامٌ »[6] ''ہر نشہ آور خمر ہے اور ہر نشہ آور حرام ہے۔'' ایک روایت میں ہے: « كُلُّ مُسْكِرٍ خَمْرٌ، وَكُلُّ خَمْرٍ حَرَامٌ »[7] ''ہر نشہ آور خمر ہے اور ہر خمر حرام ہے۔''

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٦٧٦) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٨٧٢) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٣٧٩) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٥٩٣)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٦٧٧) صحيح الجامع (٢٢١٧)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٤٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٠٠١)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٠٨٧، ٤٠٨٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٠٠١)

[5] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٠٠٢)

[6] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٠٠٣)

[7] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٠٠٣)

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے بیان کیا جاتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « مَا أَسْكَرَ كَثِيْرُهُ فَقَلِيْلُهُ حَرَامٌ » ''جس کی زیادہ مقدار نشہ لاتی ہے، اس کی تھوڑی مقدار بھی حرام ہے۔'' (رواه ابن ماجه والدارقطني وصححه)[1]

سنن میں یہی روایت حضرت جابر اور عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کی سند سے مروی ہے۔ اس باب کی احادیث بہت زیادہ اور صحیح ہیں، لیکن وہ علما جنھوں نے ان کے مخالف رائے اپنائی۔ ان کا یہ عذر ہے کہ یہ ان تک نہیں پہنچی، کیوں کہ انھوں نے نبیذ پینے کے متعلق کچھ صحابہ سے سنا اور اس سے متعلق انھیں کچھ آثار بھی ملے، جس سے وہ سمجھ بیٹھے کہ کچھ صحابہ نے جو نبیذ پی، وہ مسکر (نشہ آور) تھی، صحابہ کا اختلاف اس نبیذ میں تھا جو پکے برتنوں میں بنائی جاتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے پیٹھے کدو،[5] مٹکے، لکڑی اور تارکول ملے ہوئے برتن میں نبیذ بنانے سے منع فرمایا اور چمڑے کے بنے ہوئے ظروف میں نبیذ بنانے کا حکم دیا[6] جس کو اوپر سے باندھ دیا جاتا ہے۔ نبیذ بنانے کا طریقہ یہ ہے کہ رات کے وقت کھجور یا منقے کو پانی میں بھگو کر رکھ دیا جائے، تا آنکہ وہ میٹھا ہو جائے، جب وہ میٹھا ہو جائے تو اس کو پکنے سے پہلے پہلے پی لیا جائے۔ یہ تمام مسلمانوں کے اتفاق کے ساتھ حلال ہے۔ آپ ﷺ نے یہ حلال نبیذ ان برتنوں میں بنانے سے منع کیا ہے، کیوں کہ شراب آہستہ آہستہ پکتی ہے، اس لیے مسلمان کو معلوم نہیں ہو سکے گا کہ یہ پک چکی ہے اور وہ اس کو پی لے گا اس صورت میں وہ حرام پیے گا، اس لیے آپ ﷺ نے اس ظرف میں نبیذ بنانے کا حکم دیا جس کا منہ باندھ دیا جاتا ہے، کیوں کہ جب شراب پکے گی تو وہ برتن پھٹ جائے گا، اس طرح انسان حرام نوشی سے بچ جائے گا۔

پختہ اور مضبوط برتنوں میں نبیذ بنانے کی ممانعت سے متعلق احادیث کافی تعداد میں ہیں اور مشہور ہیں، پھر اس کی اباحت اور جواز کا حکم آ گیا۔ صحیح مسلم میں حضرت بریدہ بن خصیب سے منقول ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میں نے تم کو چمڑے کے ظروف کے سوا باقی برتنوں میں مشروبات سے منع کیا تھا، اب ہر برتن میں پی لو، لیکن نشہ آور نہ پیو۔''[4] ایک روایت میں ہے: ''میں نے تم کو ظروف سے منع کیا تھا، ظرف (برتن) کسی چیز کو حلال یا حرام نہیں کرتا، ہر نشہ آور حرام ہے۔''[5] کچھ صحابہ اور تابعین کے ہاں نسخ ثابت نہیں، اس لیے انھوں نے ہر برتن میں نبیذ بنانا جائز کہا،

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٦٨١) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٨٦٥) سنن النسائي، رقم الحديث (٥٦٠٧) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٣٩٣) صحيح الجامع (٥٥٣٠)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤١١٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٩٩٥)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٨)

[4] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٩٩٩)

[5] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٩٩٩)

یہ امام ابو حنیفہ اور شافعی کا مذہب ہے، بعض برتنوں سے ممانعت امام مالک کا قول اور امام احمد سے ایک روایت ہے۔

جب کچھ علمائے کوفہ نے سنا کہ بعض سلف یعنی صحابہ اور تابعین نبیذ پیتے تھے تو انھوں نے سمجھا وہ نشہ آور پیتے تھے۔ بنا بریں امام شافعی، ابراہیم نخعی، ابو حنیفہ، شریک اور ابن ابی لیلیٰ وغیرہ جیسے اصحابِ علم نے اس کو یعنی نشہ آور نبیذ کو حلال کہا، جیسے پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ یہ سب مجتہد ہیں اور ان کا ارادہ حق کی تلاش کا تھا، رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''جب حاکم اجتہاد کرے اور غلط نتیجے تک پہنچے تو اس کا ایک اجر ہے۔''[1] باقی سارے علما ان صحیح احادیث کے قائل ہیں، یہی صحابہ سے ثابت ہے اور قیاس جلی بھی اسی پر دلالت کرتا ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنَّمَا يُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَنْ يُوقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ وَعَنِ الصَّلَاةِ ۖ فَهَلْ أَنْتُمْ مُنْتَهُونَ ۝٩١﴾ [المائدة: ٩١]

''شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعے تمھارے درمیان دشمنی اور بغض ڈال دے اور تمھیں اللہ کے ذکر سے اور نماز سے روک دے، تو کیا تم باز آنے والے ہو۔''

شراب اس مفسدت اور خرابی سے بچنے کے لیے حرام کی گئی کہ یہ اللہ کے ذکر اور نماز سے روکتی ہے، اور بغض و عداوت پیدا کرتی ہے۔ یہ برائی تمام نشہ آور اشیا میں مشترک ہے، اس میں کوئی ایک نشہ آور چیز دوسری سے امتیاز نہیں رکھتی، یعنی انگور، کھجور، منقے، شہد، گندم اور جَو کی شراب میں حسی اور عقلی طور پر کوئی فرق نہیں، سب میں حرمت کی علت مشترک ہے۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے عدل و امتیاز کا حکم دیا ہے، اسی کو شرعی قیاس کہا جاتا ہے، یعنی دو متماثل اور ایک طرح کی اشیا کے درمیان برابری کرنا۔ اللہ اور اس کے رسول نے ان شرابوں میں کوئی فرق نہیں کیا کہ ایک کو حلال اور دوسری کو حرام کہا جائے، یا ایک کی قلیل مقدار حلال ہو، دوسرے کی حرام، بلکہ قلیل کثیر سب حرام ہے اور قلیل ہی کثیر کا پہلا زینہ ہوتا ہے۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے خمر سے اجتناب کرنے کا حکم دیا ہے، اس لیے اس کو بہانے کا حکم دیا گیا، اس کو رکھنا حرام ہے، یہ نجس اور پلید ہے، شراب نوش کو کوڑے لگانے کا حکم ہے۔ یہ سب احکام فساد کی جڑ کاٹنے اور اس کا مادہ ختم کرنے کے لیے ہیں، لہٰذا نشہ آور اشیا کی قلیل مقدار کس طرح جائز ہو سکتی ہے۔ واللہ أعلم[2]

حشیش کا شرعی حکم

سوال کیا حشیش کھانا جائز ہے یا ناجائز؟

جواب حشیش دیگر نشہ آور اشیا کی طرح ہی ہے، جو بالاتفاق حرام ہیں، بلکہ ہر وہ چیز جو عقل زائل کر دے اسے کھانا

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٦٩١٩) صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٧١٦)

[2] مجموع الفتاویٰ (٣٤/١٨٦-١٩٢)

حرام ہے، خواہ وہ نشہ آور نہ ہی ہو، جس طرح بھنگ ہے۔ نشہ آور اشیا کے استعمال پر حد جاری ہوتی ہے اور غیر نشہ آور کے استعمال پر تعزیر۔

نشہ آور حشیش تھوڑی مقدار میں بھی حرام ہے، جس طرح دیگر نشہ آور اشیا تھوڑی مقدار میں بھی حرام ہوتی ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان: «كُلُّ مُسْكِرٍ خَمْرٌ، وَكُلُّ خَمْرٍ حَرَامٌ» [1] ہر نشہ آور چیز پر صادق آتا ہے، اس میں کوئی فرق نہیں کہ وہ کھائی جانے والی چیز ہو یا پی جانے والی یا مائع یا جامد، بلکہ اگر وہ شراب کی طرح رنگ پکڑ لے تو حرام ہو جائے گا، اسی طرح حشیش کو مائع بنا کر پینا بھی حرام ہے۔ ہمارے نبی مکرم ﷺ کو جامع کلمات دے کر مبعوث کیا گیا، جب آپ ﷺ کوئی جامع بات کہتے تو وہ لفظی اور معنوی عموم رکھتی تھی، یعنی اس میں ہر وہ چیز داخل ہوتی ہے جو اس کے لفظ یا معنی کے تحت آتی، یہ کوئی ضروری نہیں کہ اعیان اور ان کے مصداق آپ کے زمانے میں یا آپ کے علاقے میں موجود ہوں یا نہ ہوں، لہٰذا جب آپ ﷺ نے فرمایا: «كُلُّ مُسْكِرٍ حَرَامٌ» تو یہ مدینہ میں موجود کھجور وغیرہ کی شراب پر بھی صادق آیا، یمن میں گندم، جَو اور شہد وغیرہ سے بنائی جانے والی شراب کو بھی شامل ہوا اور اس میں گھوڑی کے دودھ سے بنائی جانے والی وہ شراب بھی شامل ہے جو آپ ﷺ کے زمانے کے بعد ترکوں وغیرہ نے بنائی۔ کسی عالم نے گھوڑے کے دودھ کے نشہ آور مشروب، گندم کے نشہ آور مشروب اور جَو کے نشہ آور مشروب میں کوئی فرق نہیں کیا، گو ان میں ایک مشروب آپ ﷺ کے زمانے میں موجود تھا اور آپ ﷺ اس کو جانتے تھے اور دوسرے کو نہیں جانتے تھے، کیوں کہ عرب میں کوئی بھی گھوڑی کے دودھ سے شراب نہیں بناتا تھا۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہوا مسلمانوں میں حشیش کا استعمال چھٹی صدی ہجری کے اواخر اور ساتویں کے اوائل میں ظاہر ہوا، جب تاتاری حکومت وجود میں آئی، جس کی بنیاد چنگیز خان نے تلوار کے زور پر رکھی۔ جب لوگوں نے علانیہ خدا اور رسول کی مخالفت اور گناہوں کا ارتکاب کرنا شروع کر دیا تو اللہ نے ان پر دشمن مسلط کر دیا، یہ لعنتی حشیش سب سے زیادہ بری اور سب سے بڑی برائی شمار ہوتی تھی، بلکہ یہ بعض پہلوؤں سے نشہ آور مشروب سے زیادہ بری ہے اور بعض پہلوؤں سے نشہ آور مشروب اس سے زیادہ برا ہے۔ یہ نشہ پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ انسان کو بے غیرت، خبیث، دیوث، بدمزاج، دوسروں کے ہاتھ میں کھلونا اور پاگل بنا دیتی ہے۔

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ یہ عقل کو متغیر کرتی ہے، لیکن بھنگ کی طرح نشہ پیدا نہیں کرتی، لیکن ایسا کچھ نہیں، اس کے کھانے سے بھی شراب کی طرح نشہ، مدہوشی اور طرب ولذت طاری ہوتی ہے، یہی اس کو کھانے پر آمادہ کرتا ہے، اس کو تھوڑی مقدار میں کھانا زیادہ کھانے کی طلب پیدا کر دیتا ہے، جو اس کا عادی ہو جائے اس کے لیے اسے چھوڑنا

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٠٠٣)

شراب چھوڑنے سے بھی زیادہ مشکل ہو جاتا ہے، اس لیے بعض پہلوؤں سے اس کا ضرر اور نقصان شراب سے بھی زیادہ ہے، اس لیے فقہا کہتے ہیں، جس طرح شراب نوش پر حد لگانا ضروری ہے، اس پر بھی حد لگانا ضروری ہے۔

اس کے نجس اور پلید ہونے میں تین اقوال ہیں: ایک قول کے مطابق یہ نجس دوسرے قول کے مطابق نجس نہیں اور تیسرے قول میں تر نجس ہے شراب کی طرح، مگر خشک نجس نہیں۔ صحیح یہ ہے کہ ہر دو حالتوں میں نجس ہے، جس طرح جامد اور مائع شراب نجس ہوتی ہے۔

جو انسان شراب یا حشیش کے نشے میں دھت ہو اس کے لیے اس وقت تک مسجد کے نزدیک جانا بھی جائز نہیں جب تک ہوش میں نہ آ جائے اور اس کی نماز اس وقت تک صحیح نہیں ہوگی جب تک اس کو پوری ہوش نہ آ جائے اور جو کہہ رہا ہو اس کو جانتا بھی ہو۔ وہ ان گندگیوں کی وجہ سے اپنے ہاتھ کپڑے اور منہ کو اچھی طرح دھوئے، نماز فرضِ عین ہے، لیکن چالیس دن تک قبول نہیں ہوگی، حتی کہ توبہ کر لے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«مَنْ شَرِبَ الْخَمْرَ لَمْ تُقْبَلْ لَهُ صَلَاةُ أَرْبَعِينَ يَوْماً فَإِنْ تَابَ، تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِ، فَإِنْ عَادَ فَشَرِبَهَا لَمْ تُقْبَلْ لَهُ صَلَاةُ أَرْبَعِينَ يَوْماً فَإِنْ تَابَ، تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِ، فَإِنْ عَادَ فَشَرِبَهَا، كَانَ حَقًّا عَلَى اللّٰهِ أَنْ يَّسْقِيَهُ مِنْ طِينَةِ الْخَبَالِ. قِيلَ: وَمَا طِينَةُ الْخَبَالِ؟ قَالَ: عُصَارَةُ أَهْلِ النَّارِ أَوْ عِرْقُ أَهْلِ النَّارِ» [1]

"جس نے شراب پی، چالیس دن تک اس کی نماز قبول نہیں ہوگی، اگر توبہ کر لی تو اللہ اس پر مہربانی کرے گا، اگر دوبارہ پی تو چالیس دن تک اس کی نماز قبول نہیں ہوگی، اگر اس نے توبہ کی تو اللہ بھی اس پر مہربانی کرے گا، اگر دوبارہ پی تو اللہ پر لازم ہے کہ اس کو طینۃ الخبال پلائے۔ پوچھا گیا: طینۃ الخبال کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اہلِ جہنم کا نچوڑ یا اہلِ جہنم کا پسینہ۔"

اگر کوئی اعتراض کرے کہ کسی آیت یا حدیث میں اس کا ذکر موجود نہیں تو یہ اعتراض کرنے والا لاعلم ہے، قرآن وحدیث میں جامع کلمات ہیں، جو عام قواعد اور قضایا کلیہ کی حیثیت رکھتے ہیں، وہ ہر اس چیز پر صادق آتے ہیں جو ان میں داخل ہو اور وہ اپنے عمومی نام کے ساتھ قرآن وحدیث میں مذکور ہے، ورنہ اپنے خاص نام کے ساتھ ہر چیز کا ذکر ہونا ممکن نہیں۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے حضرت محمد ﷺ کو ساری کائنات کی طرف مبعوث کیا ہے، ارشاد ہے:

﴿قُلْ يَاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا﴾ [الأعراف: ١٥٨]

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٠٠٢، ٢٢٣٠) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٨٦٢) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٣٧٧) صحيح الجامع، رقم الحديث (٦٣١٢)

''کہہ دے اے لوگو! بے شک میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں۔''

فرمایا:

﴿ وَمَآ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ ﴾ [السبأ: ٢٨]

''اور ہم نے تجھے نہیں بھیجا مگر تمام لوگوں کے لیے خوشخبری دینے والا۔''

فرمایا:

﴿ اَلَّذِىۡ نَزَّلَ الۡفُرۡقَانَ عَلٰى عَبۡدِهٖ لِيَكُوۡنَ لِلۡعٰلَمِيۡنَ نَذِيۡرَا ۙ ﴾ [الفرقان: ١]

''وہ جس نے اپنے بندے پر فیصلہ کرنے والی (کتاب) اتاری، تاکہ وہ جہانوں کے لیے ڈرانے والا ہو۔''

فرمایا:

﴿ وَمَآ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا رَحۡمَةً لِّلۡعٰلَمِيۡنَ ﴾ [الأنبياء: ١٠٧]

''اور ہم نے تجھے نہیں بھیجا مگر جہانوں پر رحم کرتے ہوئے۔''

لفظ ''ناس'' (تمام لوگ) اور لفظ ''عالمین'' (تمام جہان) میں عرب وعجم، رومی ایرانی، ہندوستانی اور بربر وغیرہ سب شامل ہیں۔ اگر کوئی کہے: محمد ﷺ ترکوں، ہندوؤں اور بربروں کی طرف مبعوث نہیں ہوئے، کیوں کہ قرآن میں ان کا نام ذکر نہیں ہوا تو اس کو جاہل ہی کہا جائے گا، اسی طرح اگر کہے کہ آپ ﷺ بنو غطفان، بنو تمیم، بنو اسد اور دیگر عرب قبائل کے نبی نہیں، کیوں کہ اللہ نے ان خاص قبائل کے نام ذکر نہیں کیے یا کہے: اللہ نے آپ ﷺ کو ابوجہل اور عتبہ وشیبہ وغیرہ جیسے قریش کی طرف نبی بنا کر مبعوث نہیں کیا، کیوں کہ قرآن میں ان کے خاص نام کے ساتھ ان کا ذکر نہیں کیا۔

جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ اِنَّمَا الۡخَمۡرُ وَالۡمَيۡسِرُ وَالۡاَنۡصَابُ وَالۡاَزۡلَامُ رِجۡسٌ مِّنۡ عَمَلِ الشَّيۡطٰنِ ﴾ [المائدة: ٩٠]

''بات یہی ہے کہ شراب اور جوا اور شرک کے لیے نصب کردہ چیزیں اور فال کے تیر سراسر گندے ہیں، شیطان کے کام سے ہیں۔''

اس میں وہ مَیسر (جوا) بھی شامل ہے جو اس وقت عربوں کے ہاں معروف نہیں تھا اور رسول اکرم ﷺ اس سے آشنا نہیں تھے، کیوں کہ ہر مَیسر حرام ہے اور اس پر سب مسلمانوں کا اتفاق ہے، چاہے رسول اللہ ﷺ اس سے آشنا نہ ہی ہوں، لہٰذا شطرنج اور کوئی دوسرا کھیل عوض مقرر کر کے اور شرط بد کر کھیلنا حرام ہے اور اس پر سب مسلمانوں کا اتفاق ہے، یہی وہ مَیسر ہے جو اللہ نے حرام کیا ہے اور یہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں معروف نہیں تھا۔ اس طرح

نرد کھیلنا بھی مَیسر میں داخل ہے جو حرام ہے، لیکن قرآن میں نرد یا شطرنج کا نام ذکر نہیں ہوا، بلکہ مَیسر کا لفظ آیا ہے جو عام ہے اور ان سب پر صادق آتا ہے۔ جمہور علما کے نزدیک یہ دونوں کھیل حرام ہیں یا عوض مقرر کر کے کھیلے جائیں یا ایسے ہی۔

قرآن کریم میں اس کی مثالیں بے شمار ہیں۔ قرآن کریم کے عموم میں وہ سب شامل ہے جو اس کے لفظ یا معانی کا تقاضا ہو، چاہے اس کا خاص نام ذکر نہ ہی ہو۔ اگر فرض کیا جائے کہ لفظ اس کو شامل نہیں تو وہ قیاس اور اعتبار کی راہ سے قرآن کریم اور سنتِ مطہرہ کے معنیٰ حق میں داخل ہوگا، جس طرح یہود و نصاریٰ اور ایرانی اس آیت:

﴿قٰتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ﴾ [التوبة: ٢٩]

''لڑو ان لوگوں سے جو نہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور نہ یومِ آخر پر اور نہ ان چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں جو اللہ اور اس کے رسول نے حرام کی ہیں اور نہ دینِ حق کو اختیار کرتے ہیں، ان لوگوں میں سے جنھیں کتاب دی گئی ہے، یہاں تک کہ وہ ہاتھ سے جزیہ دیں اور وہ حقیر ہوں۔''

کے عموم میں داخل ہیں، اسی طرح تمام مسکرات، یعنی نشہ آور اشیا انگور کی شراب کے معنیٰ میں داخل ہیں۔

محمد ﷺ کو کتاب اللہ اور میزان دے کر مبعوث کیا گیا، تاکہ عدل قائم ہو۔ کتاب سے مراد قرآن ہے اور میزان سے عدل۔ قیاسِ صحیح عدل ہی سے تعلق رکھتا ہے، کیوں کہ دو متماثل اور ایک طرح کی اشیا کے درمیان فرق نہیں، بلکہ برابری کی جاتی ہے تو تحریم کو لازم کرنے والے معنیٰ میں سب سیئات (برائیاں) برابر ہوتی ہیں، ایک کو چھوڑ کر دوسری کو تحریم کے ساتھ خاص نہیں کیا، بلکہ دونوں میں برابری کرنا عدل کا تقاضا ہے۔ اگر برابری نہ ہو تو تناقض ہوگا اور اللہ اور اس کے رسول کا حکم تناقض سے مبرا ہے۔ اگر ڈاکٹر مریض کو کسی ایسی چیز سے پرہیز کرنے کا کہے جو اس کے لیے نقصان دہ ہو، پھر اس کی اجازت دے دے تو وہ قانونِ طب کی خلاف ورزی کرنے والا متصور ہوگا۔ شریعت دلوں کی طبابت ہے اور انبیا دلوں اور شریعتوں کے طبیب، اس لیے ضروری ہے کہ جب شریعت کسی چیز کو حلال کرے تو اس کو خاص کرے، تاکہ ان دونوں یعنی حلال و حرام صورت کے درمیان فرق واضح ہو سکے۔ واللہ أعلم[1]

شراب نوشی اور ترکِ نماز پر ہمیشگی کی سزا

سوال شراب نوشی اور ترکِ نماز پر ہمیشگی اور اصرار کا کیا حکم ہے؟

جواب الحمد للہ. شراب نوش پر اگر یہ الزام ثابت ہو جائے تو ائمہ کے اتفاق کے ساتھ اس پر کوڑوں کی صورت

---

[1] مجموع الفتاویٰ (٣٤/٢٠٤ـ٢١٠)

میں حد لگائی جائے گی، حد چالیس کوڑے ہیں یا اسّی، اگر اسّی کوڑے لگائے جائیں تو بالاتفاق جائز ہے، اگر چالیس پر اکتفا کیا جائے تو اس کے جائز ہونے میں مشہور اختلاف ہے۔

ابو حنیفہ، مالک اور ایک روایت میں احمد کے مذہب میں اسّی کوڑے مارنا ضروری ہیں۔ شافعی اور دوسری روایت میں احمد کے مذہب میں دوسرے چالیس تعزیر کا حکم رکھتے ہیں جو امام کے اجتہاد اور صواب دید پر ہے۔ اگر شراب نوشی کی کثرت یا شراب نوش کے اصرار کی وجہ سے امام اس کی ضرورت محسوس کرے تو ایسا کر سکتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ تو اس سے زیادہ تعزیری سزا دیتے تھے، ان سے منقول ہے: وہ شراب نوش کو جلا وطن بھی کرتے اور اس کا سر بھی مونڈ دیتے۔

کئی وجوہ اور اسناد سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے: ''جو شراب پیے اس کو کوڑے مارو، اگر پھر پیے تو کوڑے مارو، اگر پھر پیے تو کوڑے مارو، پھر اگر تیسری یا چوتھی مرتبہ پیے تو اس کو قتل کر دو۔''[1]

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تیسری یا چوتھی مرتبہ شراب پینے والے کو قتل کرنے کا حکم دیا۔ اکثر علما قتل کو ضروری نہیں کرتے، بلکہ اس حدیث کو منسوخ کہتے ہیں، ائمہ کے مذاہب میں یہی مشہور ہے۔ ایک گروہ کا کہنا ہے: ''اگر قتل کے بغیر وہ باز نہ آئیں تو قتل کرنا جائز ہوگا۔''

سنن میں ایک دوسری حدیث میں ہے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف انواع کے مشروبات سے منع کیا تو فرمایا: ''اگر وہ ان کو نہ چھوڑیں تو ان کو قتل کر دو۔'' تاہم گذشتہ قول ہی راجح ہے۔ صحیح میں ہے کہ ایک آدمی حمار کے نام سے مشہور تھا۔ وہ شراب پیتا تھا۔ وہ جب شراب پیتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو کوڑے مارتے۔ ایک شخص نے اس پر پھٹکار بھیجی اور کہا: اللہ اس پر لعنت کرے! کس کثرت سے اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لایا جاتا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اس پر لعنت نہ بھیج، یہ اللہ اور رسول سے محبت کرتا ہے۔'' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو کثرتِ شراب نوشی کے باوجود کوڑے ہی مارے ہیں۔

جہاں تک تارکِ نماز کا مسئلہ ہے تو وہ ائمہ کے اتفاق کے ساتھ سزا کا مستحق ہے، مالک، شافعی اور احمد کے نزدیک اس سے توبہ کروائی جائے، اگر توبہ کر لے تو صحیح ورنہ قتل کر دیا جائے، لیکن کیا اس کو کافر، مرتد سمجھ کر قتل کیا جائے گا، یا دیگر کبیرہ گناہ کرنے والوں کی طرح کا فاسق؟ اس میں دو اقوال ہیں۔ اگر اس جیسے شخص پر حد نافذ کرنے کا امکان نہ ہو تو جو ممکن ہو وہ ضرور کیا جائے، مثلاً: اس سے قطع تعلق کر لی جائے، اس کو سرزنش کی جائے، تاآنکہ وہ فرائض پر عمل کرنا اور ممنوع کو چھوڑنا شروع کر دے اور ان لوگوں سے نہ ہو جن سے متعلق فرمایا:

﴿ فَخَلَفَ مِنۢ بَعۡدِهِمۡ خَلۡفٌ أَضَاعُواْ ٱلصَّلَوٰةَ وَٱتَّبَعُواْ ٱلشَّهَوَٰتِۖ فَسَوۡفَ يَلۡقَوۡنَ غَيًّا ﴾ [مریم: ٥٩]

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٤٨٢۔ ٤٤٨٥) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٤٤٤) صحيح الجامع (٦٣٠٩)

''پھر ان کے بعد ایسے نالائق جانشین ان کی جگہ آئے جنھوں نے نماز کو ضائع کر دیا اور خواہشات کے پیچھے لگ گئے تو وہ عنقریب گمراہی کو ملیں گے۔''

حالانکہ نماز کو ضائع کرنے کا وقت تاخیر سے پڑھنا ہے تو جو بالکل ہی تارک ہو، اس کا کیا بنے گا؟![1]

نشہ نہ پیدا ہونے کی صورت میں مکئی کے آش کا حکم

سوال ایک شخص بھٹے (مکئی) توڑ کر انھیں ہنڈیا میں جوش دلاتا ہے، پھر صاف کرتا ہے، اس دن اس میں نشہ پیدا نہیں ہوتا، دو تین دن تک چھوڑ دینے کی صورت میں اس میں نشہ بن جاتا ہے، کیا اس کو پہلے دن پینا جائز ہے؟

جواب تین دن تک اس میں نشہ پیدا نہ ہو اس کو پینا جائز ہے، اگر وہ نشہ پیدا کرے تو رسول اللہ ﷺ کی حدیث اور الفاظ کی روشنی میں حرام ہے، چاہے تین دن کے بعد نشہ پیدا کرے یا پہلے، جب نشہ پیدا کرے تو حرام ہو جائے گا۔ آپ ﷺ کا فرمان ہے:

«كُلُّ مُسْكِرٍ خَمْرٌ، وَكُلُّ مُسْكِرٍ حَرَامٌ»[2]

''ہر مسکر (نشہ آور) خمر (شراب) ہے اور ہر مسکر حرام۔''[3]

اپنے والدین کو گالی دینے والے کی سزا

سوال اگر کوئی اپنے والدین کو گالی دے تو وہ کیا کرے؟

جواب جو انسان اپنے باپ کو گالی دے اور اس پر زیادتی کرے تو اس کو عبرت ناک اور شدید ترین سزا دینی چاہیے جو ایسے لوگوں کو اس کام سے روک دے، بلکہ اس سے بھی بلیغ تر صحیح بخاری و مسلم میں رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان ہے: ''آدمی کا اپنے والدین کو گالی دینا کبیرہ گناہوں میں سے ہے، پوچھا گیا: کوئی کیسے اپنے والدین کو گالی دے سکتا ہے؟ فرمایا: وہ کسی کے باپ کو گالی دیتا ہے تو جواب میں وہ اس کے باپ کو گالی دیتا ہے، وہ اس کی ماں کو گالی دیتا ہے تو وہ جواب میں اس کی ماں کو گالی دیتا ہے۔''[4]

اگر رسول اللہ ﷺ نے کسی کے باپ کو گالی دینا کبیرہ گناہ کہا ہے، تاکہ اس کے باپ کو گالی نہ پڑے تو جو خود

---

1. مجموع الفتاویٰ (٣٤/٢١٦-٢١٧)
2. صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٠٠٣)
3. مجموع الفتاویٰ (٣٤/٢١٩)
4. صحیح البخاري، رقم الحدیث (٥٦٢٨) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٩٠)

اپنے باپ کو گالی دے یہ ایسی سزا کا مستحق ہے جو اس کو والدین سے بدسلوکی سے روک دے، کیوں کہ اللہ نے ان کے حق کو اپنے حق کے ساتھ ملا کر ذکر کیا ہے، ارشاد ہے:

﴿ أَنِ اشْكُرْ لِي وَلِوَالِدَيْكَ ﴾ [لقمان: ١٤] ''کہ میرا شکر کر اور اپنے ماں باپ کا۔''

فرمایا:

﴿ وَقَضَىٰ رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا ۚ إِمَّا يَبْلُغَنَّ عِندَكَ الْكِبَرَ أَحَدُهُمَا أَوْ كِلَاهُمَا فَلَا تَقُل لَّهُمَا أُفٍّ وَلَا تَنْهَرْهُمَا ﴾ [بني إسرائيل: ٢٣]

''اور تیرے رب نے فیصلہ کر دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور ماں باپ سے اچھا سلوک کرو۔ اگر کبھی تیرے پاس دونوں میں سے ایک یا دونوں بڑھاپے کو پہنچ ہی جائیں تو ان دونوں کو ''اف'' مت کہہ اور نہ انھیں جھڑک۔''

اگر ﴿ أُفٍّ ﴾ کہنا بھی جائز نہیں تو گالی تو بہت دور کی بات ہے۔[1]

گالی دینے والے سے بدلہ لینے کی صورت

سوال جو کسی انسان کو گالی دیتا ہے، اس کا کیا حکم ہے؟

جواب اگر کوئی کسی کو گالی دے کر زیادتی کرتا ہے تو وہ بھی اس زیادتی کے برابر اس پر زیادتی کر سکتا ہے، گالی دے سکتا ہے اگر وہ الفاظ جھوٹ وغیرہ کی طرح کے محرم لذاتہ نہ ہوں، اگر وہ الفاظ ذاتی طور پر حرام پر مشتمل ہوں، جیسے کسی پر بدکاری کا جھوٹا الزام لگانا، ایسے انسان کو عبرت ناک سزا دینی چاہیے جو دوسروں کو ایسی بدزبانی سے روک دے۔ پہلی قسم کی گالی پر تعزیری سزا دینا بھی جائز ہے، اگر کوئی شخص ایسی بدزبانی اور بیوقوفی کسی اپنے سے بہتر انسان کے خلاف بار بار کرے تو اس کو تعزیری سزا دی جا سکتی ہے۔ واللہ أعلم[2]

مزاحمت پر قتل کرنے والے لٹیروں سے لڑنے کا حکم

سوال ایسے رہزنوں اور ڈاکوؤں کے خلاف لڑنے کا کیا حکم ہے جو مسلمانوں کو لوٹتے مزاحمت کرنے والے کو قتل کرتے، عورتوں کی عصمت دری کرتے اور مال نکلوانے کے لیے مرد و عورت اور چھوٹے بڑے کی تخصیص کیے بغیر ہر ایک کو تشدد کا نشانہ بناتے ہیں؟

جواب ہاں، ایسے لوگوں سے لڑنا جائز ہے، بلکہ واجب ہے۔ اگر حاکم ان ڈاکوؤں سے اس مال کے مقابلے میں مال

[1] مجموع الفتاویٰ (٣٤/٢٢٦)

[2] مجموع الفتاویٰ (٣٤/٢٢٨)

چھین لے جو انھوں نے مسلمانوں سے چھینا ہے اور اس کے مستحق کا علم نہیں تو وہ اس سے خریدنا جائز ہے۔ اور اگر انھوں نے مسلمانوں کا مال چھینا ہے تو ان کا مال لینے میں فقہاء کا اختلاف ہے۔ تاہم اگر حاکم دونوں اقوال میں سے کسی ایک کو مناسب طریقے سے اختیار کر لے تو اس کے لیے یہ جائز ہوگا۔[1]

رہزنوں کو مال دے کر جان بچانے کا حکم

سوال چوروں، ڈاکوؤں کی طرح کے فسادیوں کو، جو لوگوں کا مال لوٹتے اور ان کا خون بہا دیتے ہیں، کچھ مال وغیرہ دے کر اپنی جان یا مال بچانا جائز ہے یا لڑنا ضروری ہے؟

جواب رہزنوں سے لڑائی کے جواز پر مسلمانوں کا اجماع ہے، رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«مَنْ قُتِلَ دُوْنَ مَالِهِ فَهُوَ شَهِيْدٌ»[2]

''جو اپنے مال کو بچاتے ہوئے مارا گیا وہ شہید ہے۔''

رہزن جب کسی معصوم اور بری الذمہ انسان سے مال مانگیں تو ائمہ کا اتفاق ہے، اس کے لیے ان کو دینا ضروری نہیں ہوتا، بلکہ مرحلہ وار آسان تر کے ساتھ ان کو روکے، اگر وہ لڑائی کے بغیر نہ رکیں تو وہ ان سے لڑ سکتا ہے، اگر قتل ہو گیا تو شہید ہوگا، اگر ان میں سے کوئی اس بنا پر مارا گیا تو اس کا خون رائیگاں ہوگا۔ اسی طرح جب وہ اس سے اس کی جان کا مطالبہ کریں تو وہ ان کو روکے، چاہے لڑائی ہی کرے، لیکن مال کا دفاع ضروری نہیں، بلکہ وہ ان کو کچھ دے دلا کر لڑائی سے احتراز کر سکتا ہے، البتہ جان کے دفاع کے واجب اور ضروری ہونے میں دو اقوال ہیں جو امام احمد سے دو روایات ہیں۔[3]

اہلِ برّ کی باہمی لڑائیوں کا حکم

سوال اہلِ برّ وغیرہ کی طرف سے اٹھائے جانے والے فتنوں سے متعلق شریعت کا حکم کیا ہے، جن کے نتیجے میں وہ ایک دوسرے کو قتل کرتے اور ایک دوسرے کی حرمت پائمال کرتے ہیں؟

جواب الحمد للہ. یہ اور اس طرح کے فتنے شدید ترین حرام کاموں اور برائیوں میں شمار ہوتے ہیں، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ۠ وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ

---

[1] مجموع الفتاویٰ (٢٤١/٣٤)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٣٤٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤١)

[3] مجموع الفتاویٰ (٢٤٢/٣٤)

فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ۗ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿١٠٣﴾ وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۗ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿١٠٤﴾ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ۗ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿١٠٥﴾ يَّوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ ۚ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْوَدَّتْ وُجُوْهُهُمْ ۣ اَكَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ﴾ [آل عمران: ١٠٢۔ ١٠٦]

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ سے ڈرو، جیسا اس سے ڈرنے کا حق ہے اور تم ہرگز نہ مرو، مگر اس حال میں کہ تم مسلمان ہو۔ اور سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لو اور جدا جدا نہ ہو جاؤ اور اپنے اوپر اللہ کی نعمت یاد کرو، جب تم دشمن تھے تو اس نے تمھارے دلوں کے درمیان الفت ڈال دی تو تم اس کی نعمت سے بھائی بھائی بن گئے اور تم آگ کے ایک گڑھے کے کنارے پر تھے تو اس نے تمھیں اس سے بچا لیا۔ اسی طرح اللہ تمھارے لیے اپنی آیات کھول کر بیان کرتا ہے، تاکہ تم ہدایت پاؤ۔ اور لازم ہے کہ تم میں ایک ایسی جماعت ہو جو نیکی کی طرف دعوت دیں اور اچھے کام کا حکم دیں اور برائی سے منع کریں اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔ اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو الگ الگ ہو گئے اور ایک دوسرے کے خلاف ہو گئے، اس کے بعد کہ ان کے پاس واضح احکام آ چکے اور یہی لوگ ہیں جن کے لیے بہت بڑا عذاب ہے۔ جس دن کچھ چہرے سفید ہوں گے اور کچھ چہرے سیاہ ہوں گے، کیا تم نے اپنے ایمان کے بعد کفر کیا؟ تو عذاب چکھو، اس وجہ سے کہ تم کفر کیا کرتے تھے۔''

یہ فرقے بندی اور اختلاف کا شکار ہوئے اور اس کے نتیجے میں ان سے جس کفر کا صدور ہوا وہ ظاہر ہے، رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«لَا تَرْجِعُوْا بَعْدِيْ كُفَّاراً يَضْرِبُ بَعْضُكُمْ رِقَابَ بَعْضٍ »[1]

''میرے بعد کافر نہ بن جاؤ کہ ایک دوسرے کی گردنیں مارنے لگو۔''

اس سے معلوم ہوا کہ یہ کفریہ کام ہے، اگرچہ مسلمان گناہ کی وجہ سے کافر نہیں ہوتا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا ۚ فَاِنْۢ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا ۗ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ﴿٩﴾ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿١٠﴾﴾

[الحجرات: ٩، ١٠]

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٢١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٥)

''اور اگر ایمان والوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو دونوں کے درمیان صلح کرا دو، پھر اگر ان دونوں میں سے ایک دوسرے پر زیادتی کرے تو اس (گروہ) سے لڑو جو زیادتی کرتا ہے، یہاں تک کہ اللہ کے حکم کی طرف پلٹ آئے، پھر اگر وہ پلٹ آئے تو دونوں کے درمیان انصاف کے ساتھ صلح کرا دو اور انصاف کرو، بے شک اللہ انصاف کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔ مومن تو بھائی ہی ہیں، پس اپنے دو بھائیوں کے درمیان صلح کراؤ اور اللہ سے ڈرو، تا کہ تم پر رحم کیا جائے۔''

یہ آپس میں لڑنے والے مومنوں سے متعلق اللہ کا حکم اور فیصلہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ وہ بھائی بھائی ہیں، اگر لڑ پڑیں تو پہلے ان میں صلح کرانے کا حکم دیا۔ ﴿ فَإِنۢ بَغَتۡ إِحۡدَىٰهُمَا عَلَى ٱلۡأُخۡرَىٰ ﴾ [الحجرات: ۹] اگر صلح قبول نہ کریں تو فرمایا: ﴿ فَقَٰتِلُواْ ٱلَّتِي تَبۡغِي حَتَّىٰ تَفِيٓءَ إِلَىٰٓ أَمۡرِ ٱللَّهِۚ فَإِن فَآءَتۡ فَأَصۡلِحُواْ بَيۡنَهُمَا بِٱلۡعَدۡلِ وَأَقۡسِطُوٓاْۖ ﴾ [الحجرات: ۹] جب وہ گروہ اللہ کی طرف لوٹ آئے تو ان کے درمیان عدل کے ساتھ صلح کروانے کا حکم دیا، کیوں کہ جو اللہ کی طرف لوٹ آتا ہے اس کے اور اس کے مدِمقابل کے درمیان عدل و انصاف قائم کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے باغی گروہ سے لڑنے سے پہلے بھی اور لڑنے کے بعد بھی دونوں گروہوں کے درمیان صلح کرانے کا حکم دیا ہے، کیوں کہ ایک گروہ کو لڑائی کے ساتھ مقہور کرنا اور توڑنا مقصود نہیں۔

اس قاعدے کی روشنی میں ان دونوں گروہوں کے درمیان اللہ اور رسول کے حکم کے مطابق صلح کروانے کی کوشش کرنا ضروری ہے۔ دونوں سے پوچھا جائے گا: تم ایک دوسرے سے کس چیز کا انتقام لے رہے ہو؟ اگر ثابت ہو جائے کہ ایک گروہ نے دوسرے گروہ کو جانی یا مالی نقصان پہنچا کر زیادتی کی ہے تو وہ اس نقصان کو بھرنے کا ذمہ دار ہو گا، اگر دونوں نے ایک دوسرے کو نقصان پہنچایا تو دونوں ایک دوسرے سے قصاص لیں گے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ كُتِبَ عَلَيۡكُمُ ٱلۡقِصَاصُ فِي ٱلۡقَتۡلَىۖ ٱلۡحُرُّ بِٱلۡحُرِّ وَٱلۡعَبۡدُ بِٱلۡعَبۡدِ وَٱلۡأُنثَىٰ بِٱلۡأُنثَىٰۚ ﴾ [البقرۃ: ۱۷۸]

''تم پر مقتولوں میں بدلہ لینا لکھ دیا گیا ہے، آزاد (قاتل) کے بدلے وہی آزاد (قاتل) اور غلام (قاتل) کے بدلے وہی غلام (قاتل) اور (قاتلہ) عورت کے بدلے وہی (قاتلہ) عورت (قتل) ہو گی۔''

سلف کے ایک گروہ نے ذکر کیا ہے کہ یہ آیت اس طرح کے آپس میں لڑنے والے دو گروہوں کے بارے میں نازل ہوئی اور اللہ نے ان کو ایک دوسرے سے قصاص لینے کا حکم دیا، فرمایا:

﴿ فَمَنۡ عُفِيَ لَهُۥ مِنۡ أَخِيهِ شَيۡءٞ ﴾ [البقرۃ: ۱۷۸]

''پھر جسے اس کے بھائی کی طرف سے کچھ بھی معاف کر دیا جائے۔''

عفو فضل، یعنی زائد کو کہتے ہیں۔ اگر دو گروہوں میں سے ایک کی کوئی چیز دوسرے پر زیادہ ہو جائے تو

﴿ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ ﴾ [البقرة: ١٧٨] معروف کی پیروی کرنی ہے، جس پر حق ہو وہ اس کو احسان کے ساتھ ادا کرے، اگر ایک کے لیے دوسرے کا نقصان بھرنا ناممکن ہو تو کوئی بھی شخص صلح کی خاطر ضامن بن کر تاوان بھرنے کی ذمے داری لے سکتا ہے اور وہ بعد میں زکات سے وصول بھی کر سکتا ہے، بلکہ اس معاملے میں مال دار ہونے کے باوجود لوگوں سے مدد بھی طلب کر سکتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے قبیصہ بن مخارق ہلالی سے کہا تھا:

''اے قبیصہ! مانگنا صرف تین لوگوں کے لیے جائز ہے: ① کسی شخص کا مال آفت زدہ ہو جائے جو اس کا سارا مال تباہ کر دے تو وہ اتنا مانگ سکتا ہے جو زندہ رہنے کے لیے کافی ہو، پھر رک جائے۔ ② کوئی فاقہ کشی کا شکار ہو جائے اور اس کی قوم کے تین عقل مند گواہی دیں کہ فلاں شخص فاقے میں مبتلا ہو گیا ہے، وہ مانگ سکتا ہے، جب اتنا ہو جائے جو زندہ رہنے کے لیے کافی ہو تو رک جائے۔ ③ کوئی شخص تاوان بھرنے کی ذمے داری لے، وہ مانگے جب اس کو اتنا مل جائے جس سے تاوان کی رقم پوری ہو جائے تو رک جائے۔''[1]

ان لوگوں کے درمیان صلح کی کوشش کرنا ہر صاحبِ استطاعت مسلمان پر فرض ہے، وہ ان کو ممکن حد تک اللہ کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق چلائے، دونوں گروہوں میں سے جو اپنے آپ کو مظلوم اور زیادتی کا شکار سمجھتا ہو وہ صبر کرے اور معاف کرے، اللہ اس کو عزت و نصرت دے گا۔ صحیح بخاری میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« مَا زَادَ اللّٰهُ عَبْداً بِعَفْوٍ إِلَّا عِزًّا، وَمَا تَوَاضَعَ أَحَدٌ لِلّٰهِ إِلَّا رَفَعَهُ اللّٰهُ، وَلَا نَقَصَت صَدَقَةٌ مِنْ مَالٍ »[2]

''اللہ معاف کرنے کی وجہ سے بندے کی عزت میں اضافہ ہی کرتا ہے، جو اللہ کے لیے تواضع اختیار کرتا ہے اللہ اس کو بلند ہی کرتا ہے اور صدقہ مال میں کوئی کمی نہیں کرتا۔''

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۚ فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ۚ ﴾ [الشوریٰ: ٤٠]

''اور کسی برائی کا بدلہ اس کی مثل ایک برائی ہے، پھر جو معاف کر دے اور اصلاح کر لے تو اس کا اجر اللہ کے ذمے ہے۔''

فرمایا:

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٤٤)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٨٨) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٠٢٩)

﴿ اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَيَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ﴾ [الشوریٰ: ٤٢،٤٣]

''راستہ تو انھی پر ہے جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں اور زمین میں حق کے بغیر سرکشی کرتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن کے لیے دردناک عذاب ہے۔ اور بلاشبہہ جو شخص صبر کرے اور معاف کر دے تو بے شک یہ یقیناً بڑی ہمت کے کاموں سے ہے۔''

اللہ تعالیٰ باغی، ظالم سے دنیا و آخرت میں انتقام لے لیتا ہے، کیوں کہ باغی کا انجام گرنا ہی ہے۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول ہے: ''اگر کوئی پہاڑ بھی کسی پہاڑ پر زیادتی کرے تو اللہ باغی یعنی زیادتی کرنے والے کو توڑ کر رکھ دے۔'' کسی شاعر نے کیا حکمت آمیز بات کہی ہے:

قضى الله أن البغي يصرع أهله ۔۔۔ وأن على الباغي تدور الدائر

''اللہ کا فیصلہ ہے، زیادتی کرنے والے کا مقدر گرنا ہی ہے اور باغی حوادث کا شکار ہو کر ہی رہتا ہے۔''

اس کا شاہد یہ فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ اِنَّمَا بَغْيُكُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ ۙ مَّتَاعَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۫ ﴾ [یونس: ۲۳]

''تمھاری سرکشی تمھاری جانوں ہی پر ہے، دنیا کی زندگی کے فائدے کے لیے۔''

حدیث شریف میں آتا ہے: ''بغاوت و زیادتی کے سوا کوئی ایسا جرم نہیں جو دنیا میں جلد از جلد سزا ملنے کے قابل ہو اور صلہ رحمی کے سوا کوئی ایسی نیکی نہیں جو دنیا ہی میں جلد از جلد ثواب ملنے کے لائق ہو۔''[1]

بنابریں باغی اور ظالم گروہ اللہ سے ڈرے اور توبہ کرے، جو مظلوم اور زیادتی کا شکار ہو وہ صبر کرے تو اس کے لیے اللہ کی طرف سے خوش خبری ہے، فرمایا: ﴿ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ﴾ [البقرة: ١٥٥]

عمرو بن اُوس کا قول ہے: ''یہ وہ لوگ ہیں جو ظلم کا شکار ہوتے ہیں تو ظلم نہیں کرتے۔ اللہ تعالیٰ نے مومنوں سے ان کے دشمنوں کے حق میں کہا ہے:

﴿ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْــًٔا ۭ ﴾ [آل عمران: ١٢٠]

''اور اگر تم صبر کرو اور ڈرتے رہو تو ان کی خفیہ تدبیر تمھیں کچھ نقصان نہیں پہنچائے گی۔''

یوسف علیہ السلام نے بھی اپنے بھائیوں کی زیادتی کے مقابلے میں صبر اور تقوے ہی سے کام لیا تھا اور اللہ نے ان کو نصرت عطا کی، جب وہ ان کے پاس آئے تو وہ عزت کے آسمان پر براجمان تھے، کہنے لگے:

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٩٠٢) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٩١٨)

﴿ءَاِنَّكَ لَاَنْتَ يُوْسُفُ ؕ قَالَ اَنَا يُوْسُفُ وَهٰذَاۤ اَخِيْ ؗ قَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَاؕ اِنَّهٗ مَنْ يَّتَّقِ وَيَصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ [یوسف: ۹۰]

''انھوں نے کہا کیا یقیناً تو ہی یوسف ہے؟ کہا میں یوسف ہوں اور یہ میرا بھائی ہے، یقیناً اللہ نے ہم پر احسان فرما دیا ہے۔ بے شک حقیقت یہ ہے کہ جو ڈرے اور صبر کرے تو بے شک اللہ نیکی کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔''

لہٰذا جو بھی صدق و عدل کے ساتھ اللہ سے ڈرے، حدود اللہ سے تجاوز نہ کرے اور دوسروں کے ظلم و عدوان پر صبر سے کام لے تو دوسرے کا مکر اور سازش اس کو نقصان نہیں دے سکتی، بلکہ اللہ تعالیٰ اس کو اس کے خلاف فتح سے نوازتا ہے۔

ان فتنوں کا سبب گناہ اور غلطیاں ہیں، دونوں گروہ استغفار کریں، توبہ کریں، اس سے عذاب اٹھ جائے گا اور رحمت اتر آئے گی، فرمانِ الٰہی ہے:

﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْؕ وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ﴾ [الأنفال: ۳۳]

﴿وَ''اور اللہ کبھی ایسا نہیں کہ انھیں عذاب دے، جب کہ تو ان میں ہو اور اللہ انھیں کبھی عذاب دینے والا نہیں جب کہ وہ بخشش مانگتے ہوں۔''

رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''جو کثرت سے استغفار کرتا ہے، اللہ اس کے لیے ہر فکر میں آسانی اور ہر تنگی سے نکلنے کا راستہ بنا دیتا ہے اور اس کو وہاں سے رزق دیتا ہے جہاں سے اس کے گمان میں بھی نہیں ہوتا۔''[1]

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿الٓرٰ ۫ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ ① اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّا اللّٰهَ ؕ اِنَّنِيْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ ② وَّاَنِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْۤا اِلَيْهِ يُمَتِّعْكُمْ مَّتَاعًا حَسَنًا اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى وَّيُؤْتِ كُلَّ ذِيْ فَضْلٍ فَضْلَهٗ ؕ﴾ [ھود: ۱۔۳]

''الٓر۔ ایک کتاب ہے جس کی آیات محکم کی گئیں، پھر انھیں کھول کر بیان کیا گیا ایک کمال حکمت والے کی طرف سے جو پوری خبر رکھنے والا ہے۔ یہ کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو، بے شک میں تمھارے لیے اس کی طرف سے ایک ڈرانے والا اور خوش خبری دینے والا ہوں۔ اور یہ کہ اپنے رب سے بخشش مانگو، پھر اس کی طرف پلٹ آؤ تو وہ تمھیں ایک معین مدت تک اچھا ساز و سامان دے گا اور ہر زیادہ عمل والے کو اس کا زیادہ ثواب دے گا۔''[2]

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (۱۵۱۸) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (۳۸۱۹) السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (۷۰۵)

[2] مجموع الفتاویٰ (۳۵/ ۷۹۔ ۸۳)

آپس میں لڑنے والے مسلمان گروہوں کے قاتل ومقتول کا حکم

سوال کسانوں کے دو گروپوں میں لڑائی ہوگئی، ایک گروپ نے دوسرے کو شکست دے دی اور شکست کے بعد کچھ لوگوں کو قتل کر دیا۔ سوال یہ ہے کیا شکست خوردہ گروہ کے مقتول جہنمی ہیں اور اس فرمانِ رسول ﷺ کے مصداق ہیں:
«اَلْقَاتِلُ وَالْمَقْتُوْلُ فِيْ النَّارِ» ''قاتل اور مقتول آگ میں جائیں گے۔''
یا نہیں؟ نیز شکست خوردہ گروہ پر معرکے میں مرنے والوں کا حکم لگایا جائے گا یا نہیں؟

جواب الحمد لله. اگر شکست خوردہ گروہ حرام لڑائی سے توبہ کی نیت سے پیچھے ہٹا اور شکست تسلیم کی تو اس پر جہنمی ہونے کا حکم نہیں لگایا جائے گا، اللہ اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتے ہیں اور غلطیوں کو معاف کرتے ہیں۔

اگر ان کی شکست صرف ان کی کمزوری اور عجز کا نتیجہ تھا اور اگر وہ اپنے مدِمقابل پر قابو پا لیتے تو ان کو قتل کر دیتے، ایسی صورت میں وہ جہنمی ہیں، رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

''جب دو مسلمان اپنی تلوار کے ساتھ ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہوں تو قاتل اور مقتول دونوں جہنم میں جائیں گے۔ پوچھا گیا: اے اللہ کے رسول! یہ تو قاتل ہے، مقتول کا قصور کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: وہ اپنے صاحب (مدِمقابل) کو قتل کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔''[1]

اگر مقتول محض اس وجہ سے جہنم میں جائے گا کہ وہ مدِمقابل کو قتل کرنے کا ارادہ رکھتا تھا تو شکست خوردہ بطریق اولیٰ اس میں داخل ہے، کیوں کہ وہ دونوں ارادے اور فعل میں شریک ہوتے ہیں۔ مقتول کو جو نقصان پہنچتا ہے، شکست خوردہ کو نہیں پہنچتا۔ اگر مقتول کی یہ مصیبت لڑائی کے گناہ کی وجہ سے اس کے لیے کفارہ نہیں بن سکتی تو شکست کی مصیبت کا اس کے گناہ کا کفارہ نہ بننا اس سے زیادہ مناسب اور اولیٰ ہے، بلکہ لڑائی پر اصرار کرنے والے شکست خوردہ کا گناہ معرکہ میں مقتول کے گناہ سے بڑھ کر ہے اور اس کا آگ کا مستحق بننا اس سے زیادہ شدید ہے، کیوں کہ مقتول کا برا عمل اس کی موت کے ساتھ ہی ختم ہو جاتا ہے، مگر یہ شکست خوردہ اس سے بہت بڑی خباثت پر اصرار کرتا ہے، اس لیے فقہا کے ایک گروہ کا کہنا ہے، باغی شکست خوردہ کو قتل کر دیا جائے اگر اس کا کوئی پناہ دینے والا گروہ ہو اور اس کی واپسی کا خدشہ ہو۔ زخمی کے عکس اس کو قتل نہ کیا جائے، کیوں کہ اس کا شر رُک جاتا ہے، مگر شکست خوردہ کا شر نہیں رکتا۔ نیز مقتول کے متعلق یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ مصیبتِ قتل کی وجہ سے شاید اس کے عذاب میں تخفیف ہو جائے، گو وہ اہلِ نار سے ہو، مگر شکست کی مصیبت قتل کی مصیبت سے مختلف ہے۔ معلوم ہوا کہ شکست خوردہ اگر اپنے بھائی کو قتل کرنے پر مُصر ہو تو وہ مقتول سے برا ہے اور جو توبہ کرے تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ غفور ورحیم ہے۔[2]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٨٨)
[2] مجموع الفتاویٰ (٥١/٣٥-٥٢)

باغی اور خارجی میں فرق

سوال کیا باغی اور خارجی مترادف الفاظ ہیں یا ان میں فرق ہے؟ نیز کیا شریعت نے بھی ان پر جاری ہونے والے احکام میں کوئی فرق کیا ہے یا نہیں؟ اگر کوئی دعویٰ کرے کہ نام کے سوا ان میں کوئی فرق نہیں اور اس پر امت کا اجماع ہے اور دوسرا کہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اہلِ شام اور اہلِ نہروان میں فرق کیا تھا تو حق کس کے ساتھ ہے؟

جواب الحمد لله. یہ دعویٰ ہی باطل ہے کہ امت نے اس پر اجماع کیا ہے کہ ان میں نام کے سوا کوئی فرق نہیں، ایسا دعویٰ کرنے والا اٹکل پچو لگا رہا ہے۔ فرق نہ کرنا بہت سے حنفی، شافعی اور حنبلی فقہا کا موقف ہے، مثلاً: بہت سے مصنفین زکات نہ دینے والوں کے خلاف حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی لڑائی خوارج اور اہلِ جمل و صفین سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی لڑائی، نیز اس طرح اسلام کی طرف نسبت رکھنے والوں سے لڑائی کو "قتال أهل البغي" کے باب میں ذکر کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ اس پر بھی ان کا اتفاق ہے کہ حضرت طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما وغیرہ جیسے اصحابِ رسول عادل ہیں اور ان پر کفر یا فسق کا حکم لگانا ناجائز ہے۔ وہ مجتہد ہیں۔ وہ صحیح ہیں یا غلط دونوں صورتوں میں ان کے گناہ بخشے ہوئے ہیں۔ یہ فقہا علی الاطلاق کہتے ہیں کہ باغی فاسق نہیں تھے۔

اگر ان کو اور ان کو برابر قرار دیا جائے تو خوارج اور ان کے خلاف لڑنے والے تمام اہلِ عدالت مجتہدین کا برابر ہونا لازم آئے گا۔ اس لیے ایک گروہ نے باغیوں کو فاسق کہا ہے، لیکن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی عدالت پر تمام اہلِ سنت کا اتفاق ہے۔

جمہور اہلِ علم "دین سے نکلنے والے خوارج" اور "اہلِ جمل و صفین" وغیرہ اہلِ جمل اور صفین میں فرق کرتے ہیں، جنھیں تاویل کرنے والے باغی شمار کیا جاتا ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے یہی معروف ہے اور عام اہلِ حدیث، فقہا اور متکلمین کا موقف بھی یہی ہے۔ ائمہ اربعہ اور ان کے پیروکاروں سے منقول الفاظ و نصوص بھی اسی پر دلالت کرتی ہیں۔

صحیح مسلم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"مسلمانوں کے اختلاف کے وقت دین سے نکلنے والا ایک گروہ دین سے نکل جائے گا، دو گروہوں میں سے جو حق کے زیادہ قریب ہو گا، وہی ان سے لڑے گا۔"[1]

اس حدیث میں تینوں گروہوں کا تذکرہ ہے اور یہ بیان کیا گیا ہے کہ دین سے نکلنے والے تیسری قسم ہے جو دوسرے دو گروہوں کی جنس سے تعلق نہیں رکھتے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا گروہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے گروہ کی نسبت حق کے

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٠٦٤)

زیادہ قریب تھا اور دین سے نکلنے والے خوارج کے بارے میں فرمایا:

''تم ان کی نمازوں کے سامنے اپنی نمازوں، ان کے روزوں کے سامنے اپنے روزوں اور ان کی تلاوت کے سامنے اپنی تلاوت کو حقیر سمجھو گے۔ وہ قرآن کریم کی تلاوت کریں گے، مگر وہ ان کے حلقوں سے تجاوز نہیں کرے گا۔ وہ اسلام سے اس طرح نکل جائیں گے جس طرح تیر شکار کے آر پار ہو جاتا ہے، تم جہاں انھیں پاؤ، قتل کر دو، ان کو قتل کرنے کا اجر قیامت کے دن اللہ کے ہاں بہت زیادہ ہوگا۔''[1]

ایک روایت میں ہے:

''وہ جو ان سے لڑتے ہیں، اگر اس اجر کو جان لیں جو ان کے نبی کی زبان سے بیان ہوا ہے تو عمل کرنا ہی چھوڑ دیں۔''[2]

صحیح مسلم میں ان خوارج سے متعلق دس سے زیادہ وجوہ سے احادیث بیان ہوئی ہیں۔ امام بخاری نے بھی ایک سے زیادہ طرق سے اس کو روایت کیا ہے۔ اہلِ سنن و مسانید نے بھی ان کو نقل کیا ہے، یہ احادیث مستفیض (مشہور) اور تلقی بالقبول (قبولِ عامہ) کا درجہ رکھتی ہیں، ان پر صحابہ و تابعین کا اجماع ہے اور ان خوارج کے خلاف لڑنے پر تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اتفاق کیا تھا۔

جہاں تک ''اہلِ جمل وصفین'' کا معاملہ ہے تو ایک گروہ نے ایک جانب سے لڑائی میں حصہ لیا اور دوسرے نے دوسری طرف سے، مگر اکابر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم دونوں اطراف سے لڑائی میں شریک نہ ہوئے۔ جنھوں نے لڑائی میں شرکت کرنے سے گریز کیا، انھوں نے ان بہت سی احادیث سے استدلال کیا جو فتنے کے وقت لڑائی سے علاحدہ رہنے کی ترغیب دیتی ہیں اور انھوں نے اس لڑائی کو فتنہ قرار دیا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ خوارج کے خلاف لڑنے پر بہت زیادہ مسرور تھے اور اس حدیث کے راوی تھے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے لڑنے کا حکم دیا ہے۔ مگر ''صفین'' کی لڑائی سے متعلق انھوں نے بیان کیا تھا کہ اس میں ان کے پاس کوئی نص نہیں، یہ ان کی رائے تھی اور وہ اکثر ان لوگوں کی تعریف کرتے جو اس لڑائی کو جائز نہیں سمجھتے تھے۔

صحیح میں یہ حدیث بھی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا تھا:

''میرا یہ بیٹا سید (سردار) ہے، عن قریب اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے مسلمانوں کے دو بہت بڑے گروہوں کے درمیان صلح کروائے گا۔''[3]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٤١٤، ٣٤١٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٦٤، ١٠٦٦)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٦٦)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٥٥٧)

اس فرمان میں رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کے دو گروہوں، شیعانِ علی اور شیعانِ معاویہ کے درمیان صلح کروانے پر حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی تعریف اور مدح کی ہے۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ لڑائی نہ کرنا ہی بہتر عمل تھا، وہ لڑائی واجب تھی نہ مستحب۔

خوارج سے لڑنے کا حکم خود رسالتِ مآب ﷺ نے دیا تھا اور اس کی ترغیب دی تھی۔ اس لیے ایک وہ کام جس کا حکم اور ترغیب منقول ہو اور دوسرا وہ جس کو چھوڑنے والے کی تعریف کی گئی ہو، کبھی ایک طرح نہیں ہو سکتے۔ بنا بریں جو جنگِ جمل و صفین میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی لڑائی اور ذوالخویصرہ تمیمی جیسے دین سے نکلنے والے خوارج اور حدودِ الٰہی سے تجاوز کرنے والے حروریہ سے جنگ کو ایک ہی طرح قرار دیتا ہے، اس کی یہ رائے جاہلوں اور کھلے ظالموں کی رائے کی نوع سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ رائے رکھنے والا رافضہ اور معتزلہ کی صف میں کھڑا ہو جاتا ہے جو جمل و صفین میں لڑنے والوں کو کافر یا فاسق قرار دیتے ہیں۔ دین سے نکلنے والے خوارج کے متعلق بھی یہی کہا جاتا ہے، مگر ان کو کافر قرار دینے میں اسلامی امت اور ائمہ کا اختلاف رہا ہے اور اس کے متعلق دو مشہور اقوال ہیں، حالانکہ وہ سب جنگِ جمل اور صفین میں لڑنے والے تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تعریف و ثنا پر متفق ہیں اور ان کے درمیان ہونے والے جھگڑوں سے اپنی زبانوں کو بند رکھنا ہی سلامتی کی راہ سمجھتے ہیں۔ لہٰذا ان کی طرف اس تکفیر و تفسیق کی نسبت کرنا قطعاً روا نہیں۔

مزید برآں رسول اکرم ﷺ نے ان کے آپس میں لڑنے سے بہت پہلے خوارج سے لڑنے کا حکم دیا تھا، مگر اہلِ بغی کے متعلق تو اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے:

﴿وَاِنْ طَآىِٕفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا ۚ فَاِنْۢ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ فَاۗءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۝﴾ [الحجرات: ٩]

''اور اگر ایمان والوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو دونوں کے درمیان صلح کرا دو، پھر اگر ان دونوں میں سے ایک دوسرے پر زیادتی کرے تو اس (گروہ) سے لڑو جو زیادتی کرتا ہے، یہاں تک کہ اللہ کے حکم کی طرف پلٹ آئے، پھر اگر وہ پلٹ آئے تو دونوں کے درمیان انصاف کے ساتھ صلح کرا دو اور انصاف کرو، بے شک اللہ انصاف کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے ابتداءً زیادتی کرنے والے گروہ سے لڑنے کا حکم نہیں دیا، اس سے معلوم ہوا کہ باہمی لڑائی ابتداءً مامور نہیں، لیکن اگر وہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان کے درمیان صلح کروانے کا حکم ہے۔ پھر اگر ایک گروہ زیادتی پر اتر آئے تو اس صورت میں اس سے لڑا جائے گا، اس لیے کچھ فقہا نے کہا ہے: باغیوں سے شروع میں لڑائی نہیں کی

جائے گی، تا آنکہ وہ لڑنے پر اتر آئیں، دوسری طرف خوارج کے متعلق تو صریح حکمِ رسول ہے:

''انھیں جہاں پاؤ، قتل کرو، ان کو قتل کرنے والے کے لیے اللہ کے ہاں قیامت کے دن اجر ہوگا۔''[1]

نیز فرمایا:

''اگر میں نے ان کو پا لیا تو اس طرح قتل کروں گا جس طرح قومِ عاد کو قتل کیا گیا تھا۔''[2]

اسی طرح صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے زکات نہ دینے والوں سے آغاز ہی میں لڑائی کی اور صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''خدا کی قسم! اگر انھوں نے ایک بکری دینے سے بھی انکار کر دیا جو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں دیتے تھے تو میں اس پر بھی ان سے لڑوں گا۔'' لہٰذا اگر وہ وجوب کا عقیدہ رکھنے کے باوجود واجبات ادا کرنے سے انکار کر دیں تو ان سے لڑا جائے گا، تاہم ان لوگوں کو کافر قرار دینے میں بھی فقہا کا اختلاف ہے جس طرح خوارج کی تکفیر میں اختلاف ہے، مگر جو صرف اہلِ بغی اور زیادتی کرنے والے ہوں، ائمہ دین کے اتفاق کے ساتھ ان کو کافر قرار نہیں دیا جائے گا، قرآن نے ان کی باہمی لڑائی اور زیادتی کے باوجود ان کو اہلِ ایمان اور بھائی قرار دیا ہے۔ واللہ أعلم[3]

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر تبرا بازی کا حکم

سوال حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر لعنت بھیجنے والے کا کیا حکم ہے؟ کیا مندرجہ ذیل دو فرامین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمودہ ہیں:

① ''جب دو خلیفہ لڑ پڑیں تو ایک ملعون ہوتا ہے۔''

② ''عمار کو باغی گروہ قتل کرے گا۔''

کیا ان کو حضرت معاویہ کی فوج نے قتل کیا تھا؟ نیز کیا انھوں نے اہلِ بیت کو گالیاں دیں اور حجاج نے کسی شریف کو قتل کیا تھا؟

جواب الحمد للہ. جو انسان کسی صحابیِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو گالی دیتا ہے، خواہ وہ معاویہ بن ابو سفیان ہو یا عمرو بن عاص، یا ان سے افضل ابو موسیٰ اشعری اور ابو ہریرہ یا ان سے بھی افضل طلحہ و زبیر، عثمان، علی، ابوبکر، عمر، ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہم یا دیگر اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم تو وہ شدید ترین سزا کا مستحق ہے، اس پر ائمہ دین کا اتفاق ہے، مگر اس میں اختلاف ہے کہ اس کی سزا قتل ہے یا قتل سے کم، تفصیل کسی اور جگہ گزر چکی ہے۔

صحیحین میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٤١٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٦٤)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣١٦٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٦٤)

[3] مجموع الفتاویٰ (٣٥/٥٣_٥٧)

''میرے صحابہ کو گالی نہ دو، اس کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! اگر تم میں سے کوئی ایک اُحد پہاڑ کے برابر سونا خرچ کرے تو وہ ان کے ایک مُد اور نصف مُد کے برابر کو بھی نہ پہنچ پائے گا۔''[1]

لعنت گالی سے بھی زیادہ سنگین جرم ہے، صحیح میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''مومن کو لعنت کرنا، اس کو قتل کرنے کی طرح ہے۔''[2]

یعنی آپ ﷺ کے نزدیک مومن پر لعنت بھیجنا اس کو قتل کرنے کے مترادف ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تو تمام مومنوں سے بہتر افراد ہیں، حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

''بہترین صدی وہ صدی ہے جس میں میں مبعوث ہوا، اس کے بعد وہ جو اس کے بعد آئیں گے اور اس کے بعد وہ جو ان کے بعد آئیں گے۔''[3]

ہر وہ انسان جو حالتِ ایمان میں رسول اللہ ﷺ کے دیدار سے مشرف ہوا، اس کو اسی قدر صحبتِ رسول ﷺ کا شرف حاصل ہے۔ صحیح میں رسول اللہ ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

''ایک فوج لڑے گی تو پوچھا جائے گا: کیا تم میں کوئی رسول اللہ ﷺ کا صحابی موجود ہے؟ وہ کہیں گے: ہاں، تو ان کو فتح حاصل ہوگی۔ پھر ایک فوج لڑے گی اور پوچھے گی: کیا تم میں کوئی ایسا شخص ہے جس نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا ہو؟ وہ کہیں گے: ہاں، تو ان کو فتح حاصل ہوگی، پھر تیسرے طبقے کا ذکر کیا۔''[4]

جو حکم رسول اللہ ﷺ کی صحبت پر لگایا، وہی آپ ﷺ کی رویت اور دیدار پر بھی لگایا۔ لفظ ''صحبت'' میں عموم خصوص کی نسبت ہے، جس صحابی کو جو امتیازی خصوصیت حاصل ہو وہ اس صحبت سے متصف ہوگا، وہ نہیں جو اس خوبی میں اس کے ساتھ شریک نہ ہو۔ ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سے کہا، جب ان کا حضرت عبدالرحمان بن عوف رضی اللہ عنہ سے کوئی جھگڑا ہوا:

''اے خالد! میرے اصحاب کو گالی نہ دو، اس ذات کی قسم! جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! اگر تم میں سے کوئی ایک اُحد پہاڑ کے برابر سونا خرچ کرے تو وہ ان میں سے کسی ایک کے ایک مُد یا نصف مُد خرچ کرنے کو بھی نہیں پہنچ پائے گا۔''[5]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٤٧٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٤٠)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٧٥٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (١١٠)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٥٠٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٣٤)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٧٤٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٣٢)

[5] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٤٧٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٤٠)

حضرت عبدالرحمان بن عوف رضی اللہ عنہ جیسے اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سابقین اولین میں شمار ہوتے ہیں، جنھوں نے صلح حدیبیہ سے پہلے اپنا مال اللہ کی راہ میں خرچ کیا تھا اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ صلح حدیبیہ کے بعد مسلمان ہوئے اور انھوں نے جو جہاد کیا اور خرچ کیا وہ ان سے کم ہی تھا، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ لَا يَسْتَوِي مِنْكُمْ مَنْ أَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ ۚ أُولَٰئِكَ أَعْظَمُ دَرَجَةً مِنَ الَّذِينَ أَنْفَقُوا مِنْ بَعْدُ وَقَاتَلُوا ۚ وَكُلًّا وَعَدَ اللَّهُ الْحُسْنَىٰ ﴾ [الحديد: ١٠]

''تم میں سے جس نے فتح (مکہ) سے پہلے خرچ کیا اور جنگ کی وہ (یہ عمل بعد میں کرنے والوں کے) برابر نہیں۔ یہ لوگ درجے میں ان لوگوں سے بڑے ہیں جنھوں نے بعد میں خرچ کیا اور جنگ کی اور ان سے اللہ نے اچھی جزا کا وعدہ کیا ہے۔''

یہاں فتح سے فتح حدیبیہ مراد ہے، جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے درخت کے نیچے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعتِ رضوان کی، یہ چودہ سو سے کچھ اوپر تھے، انھوں ہی نے خیبر فتح کیا، صحیح میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

''جس نے درخت کے نیچے بیعت کی، ان میں سے کوئی بھی جہنم میں نہیں جائے گا۔''[1]

''کہ تم مسجد حرام میں ضرور بالضرور داخل ہو گے، اگر اللہ نے چاہا، امن کی حالت میں، اپنے سر منڈاتے ہوئے اور کتراتے ہوئے، ڈرتے نہیں ہو گے، تو اس نے جانا جو تم نے نہیں جانا تو اس نے اس سے پہلے ایک قریب فتح رکھ دی۔''

سورت فتح جس میں اس کا ذکر ہے، مکہ فتح ہونے سے پہلے نازل ہوئی، بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمرہ کرنے سے بھی پہلے نازل ہوئی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ نے حدیبیہ والے سال سنہ چھے ہجری میں درخت کے نیچے بیعت کی تھی اور مشرکوں سے صلح کی تھی جو صلح حدیبیہ کے نام سے مشہور ہے۔

اس صلح کے نتیجے میں ایسی فتح حاصل ہوئی جسے اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا تھا، بلکہ بہت سے مسلمانوں نے اسے ناپسند کیا تھا، لیکن اس میں جو بہتری اور زبردست نتائج تھے وہ اس سے بے خبر تھے، حتی کہ سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ نے کہا تھا:

''لوگو! اپنی رائے کو الزام دو، میں نے ابو جندل کے دن اپنے آپ کو دیکھا، اگر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملے کو آپ پر لوٹا سکتا ہوتا تو لوٹا دیتا۔'' (رواه البخاري)[2]

اگلے سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرہ کیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جو صحابہ گئے تھے وہ بھی مکہ میں عمرے کی نیت سے داخل ہوئے، اہلِ مکہ اس دن مشرک تھے، ہجرت کے آٹھویں سال رمضان کے مہینے میں مکہ فتح ہوا اور اللہ تعالیٰ

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤٩٦)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٩٥٣)

نے سورت فتح میں یہ آیات اتاری تھیں:

﴿ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ وَمُقَصِّرِيْنَ لَا تَخَافُوْنَ فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوْا فَجَعَلَ مِنْ دُوْنِ ذٰلِكَ فَتْحًا قَرِيْبًا ﴾ [الفتح: ٢٧]

یہ سورت فتح میں اللہ تعالیٰ نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ وہ مکہ میں امن کی حالت میں داخل ہوں گے۔ دوسرے سال اللہ نے اپنا وعدہ پورا کیا اور اس کے متعلق یہ آیت اتاری:

﴿ اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ ﴾ [البقرۃ: ١٩٤]

''حرمت والا مہینا حرمت والے مہینے کے بدلے ہے اور سب حرمتیں ایک دوسری کا بدلہ ہیں۔''

یہ سب فتح مکہ سے پہلے کی باتیں ہیں، جو یہ سمجھتا ہے کہ سورت فتح، فتح مکہ کے بعد نازل ہوئی، اس کو شدید مغالطہ لگا ہے۔ یہاں یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ وہ لوگ جو فتح سے پہلے رسول اللہ ﷺ کی صحبت سے مشرف ہوئے، ان کو یہ جو امتیازی صحبت حاصل ہوئی، اس کے نتیجے میں وہ بعد میں آنے والوں پر فضیلت کے مستحق ٹھہرے، حتی کہ آپ ﷺ نے حضرت خالد بن ولید سے کہا: ''میرے صحابہ کو گالی نہ دو۔'' کیوں کہ وہ حضرت خالد بن ولید اور ان جیسے صحابہ سے پہلے صحابہ بنے تھے۔

اسی طرح حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو صحبتِ خاص کا امتیاز حاصل تھا جو کسی دوسرے صحابی کو حاصل نہ ہوا، صحیح بخاری میں حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما کے درمیان کوئی بات ہوگئی، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عمر رضی اللہ عنہ سے کہا: میرے لیے استغفار کرو، انھوں نے انکار کر دیا۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور سارا ماجرا آپ ﷺ کے گوش گزار کر دیا، بعد میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ندامت ہوئی تو ابوبکر رضی اللہ عنہ کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے، انھیں بتایا گیا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس ہیں، جب عمر رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر ہوئے تو نبی اکرم ﷺ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے لیے غصے میں آ گئے اور کہا: ''لوگو! میں تمھارے پاس آیا، اور کہا: میں اللہ کا رسول ہوں، تم نے کہا: تم جھوٹ کہتے ہو، ابوبکر نے کہا: آپ سچ فرماتے ہیں۔ کیا تم میرے صاحب کو میرے لیے چھوڑ نہیں دیتے؟ کیا تم میرے صاحب کو میرے لیے چھوڑ نہیں دیتے؟'' اس کے بعد انھیں کبھی اذیت نہ دی گئی۔ یہاں رسول اللہ ﷺ نے آپ کو صحبت کے ساتھ خاص کیا، جس طرح قرآن نے بھی اس آیت میں انھیں صحبت کے ساتھ خاص کیا اور فرمایا:

﴿ ثَانِيَ اثْنَيْنِ اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ﴾ [التوبۃ: ٤٠]

''جب کہ وہ دو میں دوسرا تھا، جب وہ دونوں غار میں تھے، جب وہ اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا غم نہ کر، بے شک اللہ ہمارے ساتھ ہے۔''

صحیحین میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ نے ایک بندے کو دنیا اور آخرت میں سے کسی ایک کو منتخب کرنے کا اختیار دیا تو اس بندے نے اس کو منتخب کر لیا جو اللہ کے پاس ہے۔'' یہ سن کر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے رونا شروع کر دیا اور کہا: ہم اپنی جانیں اور اموال آپ پر نچھاور کرتے ہیں۔ راوی کہتا ہے: لوگ تعجب کرنے لگے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو کسی بندے کا ذکر کیا ہے جس کو اللہ نے دنیا اور آخرت میں سے ایک کا انتخاب کرنے کا اختیار دیا، مگر جس کو اختیار دیا گیا وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی تھے اور ابوبکر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ہم سے زیادہ جانتے تھے۔[1]

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے:

''صحبت اور احسان کے لحاظ سے ہم پر سب سے زیادہ احسان ابوبکر کا ہے، اگر میں اہلِ زمین سے کسی کو خلیل بناتا تو ابوبکر کو بناتا، لیکن وہ میرا بھائی اور صاحب ہے۔ ابوبکر کی کھڑکی کے سوا مسجد کی تمام کھڑکیاں بند کر دو۔''

یہ بالاتفاق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال، افعال اور احوال کا علم رکھنے والے علما کے نزدیک سب سے زیادہ صحیح حدیث ہے۔

مقصودِ بیان یہ ہے کہ صحبت میں عموم وخصوص کی نسبت اور تعلق ہے۔ اس کے عموم میں ہر وہ شخص داخل ہے جس نے حالتِ ایمان میں رخِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کا دیدار کیا، اسی بنیاد پر کہا جاتا ہے کہ فلاں کو ایک سال کی یا ایک مہینے کی یا ایک ساعت وغیرہ کی صحبت نصیب ہوئی۔

اسلافِ امت میں سے کسی نے بھی حضرت امیر معاویہ اور حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ جیسے اہلِ ایمان میں سے کسی پر بھی نفاق کا الزام نہیں لگایا، بلکہ صحیح میں ثابت ہے کہ جب حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت کی تو پوچھا: کیا میرے سابقہ سارے گناہ بخش دیے جائیں گے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں فرمایا: ''اے عمرو! تجھے معلوم نہیں کہ اسلام پہلے کی ہر چیز کو منہدم کر دیتا ہے؟!''[2]

یہ سب کو معلوم ہے کہ جو اسلام اسلام قبول کرنے سے پہلے کی ہر برائی کو منہدم اور ختم کر دیتا ہے، وہ مومنوں کا اسلام ہے، منافقوں کا اسلام نہیں۔

نیز حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ اور ان جیسے دیگر صحابہ حدیبیہ کے بعد اپنی مرضی سے ہجرت کر کے مدینہ پہنچے، انھیں کوئی مجبوری نہیں تھی اور مہاجرین میں سے کوئی بھی منافق نہیں تھا، نفاق ان بعض لوگوں میں تھا جو انصار سے

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٦٩١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٨٢)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٢١)

اسلام میں داخل ہوئے، کیوں کہ انصار اہلِ مدینہ تھے، جب ان کے اشراف اور جمہور مسلمان ہو گئے تو جو باقی بچ گئے انھوں نے اسلام کی شوکت اور غلبے کی وجہ سے اوپر اوپر سے اسلام کے اظہار میں عافیت سمجھی، مگر دل میں نفاق تھا۔ مکہ کے اشراف، معززین اور جمہور کافر تھے، اس لیے ان میں سے جو اسلام کا اظہار کرتا وہ اندر اور باہر سے مومن ہوتا، کیوں کہ وہاں جو مسلمان ہوتا تھا اس کو تکلیفیں پہنچائی جاتیں اور وہ ہجرت پر مجبور ہو جاتا، چونکہ منافق کسی دنیاوی فائدے کے لیے ہی اسلام کا اظہار کرتا ہے اور مکہ میں جو اسلام کا اعلان کرتا اس کو دنیا ہی میں عذاب سہنا پڑتا، اس لیے وہاں منافقت کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ پھر جب حضور اکرم ﷺ نے مدینہ طیبہ ہجرت کی تو اکثر مومن بھی ہجرت کر گئے، وہاں وہی رہ گئے جن کو ہجرت کرنے سے روک دیا گیا، مثلاً بنی مخزوم میں سے ولید بن ولید کو روک دیا گیا، رسول اللہ ﷺ ان کے لیے دعائے قنوت فرماتے اور کہتے:

''اے اللہ! ولید بن ولید، سلمہ بن ہشام اور کمزور مومنوں کو نجات دے۔ اے اللہ! مضر پر اپنی پکڑ سخت کر، ان پر ایسا قحط ڈال جو یوسف علیہ السلام کے زمانے میں ہوا۔''[1]

اول سے آخر تک کسی مہاجر پر کسی نے نفاق کا الزام نہیں لگایا، بلکہ سب مومن تھے اور ان کے ایمان کی گواہی دی گئی، اور ''مومن پر لعنت کرنا اس کو قتل کرنے جیسا ہے''[2] حضرت معاویہ بن ابوسفیان اور ان جیسے کبار صحابہ ان لوگوں میں شامل ہیں جن کو فتح مکہ کے دن آزاد کر دیا گیا اور وہ فتح مکہ کے بعد مسلمان ہوئے، جیسے: عکرمہ بن ابوجہل، حرث بن ہشام، سہیل بن عمرو، صفوان بن امیہ اور ابوسفیان بن حرث بن عبدالمطلب وغیرہ، یہ اور ان کی طرح کے دیگر صحابہ کا اسلام اچھا ثابت ہوا اور اس بات پر سب مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ اسلام قبول کرنے کے بعد ان کو بھی نفاق کا الزام نہیں دیا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ تو رسول اللہ ﷺ کے کاتب تھے، آپ ﷺ نے ان کے لیے یہ دعا فرمائی تھی:

«اَللّٰھُمَّ عَلِّمْهُ الْكِتَابَ وَالْحِسَابَ، وَقِهِ الْعَذَابَ»[3]

''اے اللہ! اس کو لکھنے اور حساب کا علم دے اور عذاب سے بچا۔''

ان کا بھائی یزید بن ابوسفیان رضی اللہ عنہ ان سے بہتر اور افضل تھا، وہ ان امرا میں شامل تھا جن کو ابوبکر رضی اللہ عنہ نے شام فتح کرنے کے لیے روانہ کیا اور پیدل چلتے چلتے مشہور وصیت کی، انھوں نے کہا: ''اے رسول اللہ ﷺ کے خلیفہ! یا آپ بھی سوار ہو جایئے، یا میں بھی اتر جاؤں۔'' حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: ''نہ تم اترو گے، نہ میں سوار ہی ہوں گا، میں

---

(1) صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٧١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٧٥)

(2) صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٧٥٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (١١٠)

(3) مسند أحمد (١٢٧/٤) صحيح ابن خزيمة (٢١٤/٣) صحيح ابن حبان (١٩١/١٦) المعجم الكبير (٢٥١/١٨) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٣٢٢٧)

اپنے یہ قدم جو اٹھا رہا ہوں، اللہ کی راہ میں سمجھتا ہوں۔"[1] عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ دوسرے امیر تھے، شرحبیل بن حسنہ رضی اللہ عنہ تیسرے اور چوتھے خالد بن ولید رضی اللہ عنہ جو ان کے مطلق امیر تھے، پھر ان کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے معزول کر کے حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کو امیر بنا دیا تھا، جن کو رسول اللہ ﷺ نے اس امت کا امین قرار دیا تھا، جس طرح صحیح میں ہے۔[2] اسی طرح شام حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر فتح ہوا اور عراق سعد بن ابو وقاص رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر، جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے دور میں یزید بن معاویہ فوت ہو گئے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کے بھائی معاویہ بن ابوسفیان رضی اللہ عنہما کو گورنر بنا دیا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ انتہائی زیادہ فراست اور ژرف نگاہی کے حامل تھے، انھیں لوگوں کو پرکھنے میں کمال حاصل تھا، حق کو سب سے زیادہ قائم کرنے والے، سب لوگوں سے زیادہ علم رکھتے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے: ''ہم باتیں کیا کرتے تھے کہ مسکینت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی زبان سے بولتی ہے۔'' رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''اللہ نے حق عمر کے دل پر نقش اور زبان پر جاری کر دیا ہے۔''[3] فرمانِ حضور ﷺ ہے: ''اگر تم میں میں مبعوث نہ ہوتا تو عمر تم میں مبعوث ہوتے۔''[4] حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا قول ہے: ''میں نے کبھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے نہیں سنا کہ انھوں نے کہا ہو: اس میں میری رائے یہ ہے اور اس طرح نہ ہوا ہو۔'' رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا تھا: ''شیطان تجھے جس راستے سے گزرتا دیکھ لے، وہ راستہ چھوڑ دیتا ہے۔''[5]

یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ تھے، انھوں نے اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کبھی کسی منافق اور اپنے کسی عزیز کو کسی حکومتی ذمے داری میں شریک کیا نہ کسی علاقے کا گورنر ہی بنایا۔ ان دونوں کو اللہ کی راہ میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پروا نہیں ہوتی تھی، بلکہ جب انھوں نے مرتدوں سے لڑائی لڑی اور ان کو اسلام کی طرف لوٹایا تو اس وقت تک ان کو گھوڑوں پر سوار ہونے اور اسلحہ اٹھانے سے منع کر دیا جب تک ان کی توبہ درست اور صحیح ثابت نہیں ہو جاتی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے امیرِ عراق حضرت سعد بن ابو وقاص رضی اللہ عنہ کو حکم دیا تھا کہ ان میں سے کسی کو بھی عامل مقرر نہ کرنا اور نہ جنگ میں ان سے مشورہ ہی لینا، وہ طلیحہ اسدی، اقرع بن حابس، عیینہ بن حصن اور اشعث بن قیس کندی جیسے اکابر

---

[1] الموطأ (٤٤٧/٢) سنن سعيد بن منصور (١٤٨/٢) المعجم الكبير (٢٣١/٢٢) سنن البيهقي الكبرىٰ (٨٩/٩) علامہ ہیثمی رحمہ اللہ نے مجمع الزوائد (٦٨٧/٩) میں اسے منقطع کہا ہے۔

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٨٢٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤١٩)

[3] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٦٨٢) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٠٨) صحيح الجامع، رقم الحديث (١٧٣٢)

[4] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٦٨٦) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٣٢٧)

[5] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٤٨٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٩٦)

امرا تھے، جب حضرت ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما نے ان میں ایک طرح کی منافقت کا اندیشہ محسوس کیا تو انھیں مسلمانوں کا والی اور حکومتی ذمے دار مقرر نہ کیا۔

اگر عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ اور معاویہ بن ابوسفیان رضی اللہ عنہما جیسے لوگوں میں بھی منافقت کی بو محسوس ہوتی تو وہ کبھی انھیں مسلمانوں کے امیر مقرر نہ کرتے، بلکہ عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کو تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ ذات السلاسل میں امیر مقرر کیا تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کسی منافق کو مسلمانوں کا امیر مقرر نہیں کیا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے والد ابوسفیان بن حرب رضی اللہ عنہ کو نجران کا والی مقرر کیا تھا۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو اس وقت ابوسفیان نجران میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نائب کے طور پر کام کر رہے تھے۔ اس پر تو سب مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا اسلام اپنے باپ ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے اسلام سے بہتر تھا۔ لہٰذا یہ کس طرح ممکن ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علم و عمل میں انھیں مسلمانوں کے احوال کا امین مقرر کریں اور یہ منافق ہوں؟! اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اور عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ وغیرہ کو فتنوں سے واسطہ پڑا، لیکن نہ ان کے کسی دشمن اور مخالف نے اور نہ کسی حمایتی اور ہم نوا ہی نے کبھی ان پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ بولنے کا الزام لگایا، بلکہ تمام علمائے صحابہ اور تابعین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو نقل کیا اس میں یہ سچے ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرنے میں امین ہیں، منافق تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرنے میں امین نہیں ہوتا، بلکہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ بولنے والا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کرنے والا ہوتا ہے۔ اگر یہ سب مومن اور اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرنے والے تھے تو جو ان پر لعنت بھیجتا ہے وہ اللہ اور رسول کا نافرمان ہے، صحیح بخاری میں ہے: ''ایک آدمی حمار کے نام سے مشہور تھا اور وہ شراب کا رسیا تھا، جب شراب پیتا تو اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لایا جاتا اور کوڑے مارے جاتے، ایک مرتبہ اس کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لایا گیا تو ایک آدمی نے کہا: اللہ اس پر لعنت کرے! اس کو کتنی مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لایا گیا ہے؟! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس پر لعنت نہ بھیجو، یہ اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہے۔''[1]

ہر مومن اللہ اور رسول سے محبت کرتا ہے، جو اللہ اور رسول سے محبت نہیں کرتا، وہ مومن نہیں ہوسکتا، گو لوگ ایمان اور محبت وغیرہ میں برابر نہیں ہوں۔ باوجودیکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب، شراب کشید کرنے والے، پینے والے، پلانے والے، اٹھانے والے، جس کے لیے اٹھائی جائے اور جو اس کی قیمت کھائے، ان سب پر لعنت کی ہے،[2] مگر

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٣٩٨)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٦٧٤) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٢٩٥) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٣٨١) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٨٣٩)

اس متعین اور مخصوص شخص پر لعنت کرنے سے منع کیا، کیوں کہ لعنت وعید سے تعلق رکھتی ہے، اس لیے اس کا حکم عموماً ہی لگایا جاتا ہے، جو متعین اور مخصوص فرد ہو، اگر وہ صحیح توبہ کر لے تو اس سے وعید اٹھ جاتی ہے، یا اس کے پاس نیکیاں ہوتی ہیں جو اس کو مٹا دیتی ہیں، یا اس پر ایسے مصائب آتے ہیں جو اس کے لیے کفارہ بن جاتے ہیں، یا کسی مستجاب اور قبولِ سفارش کے نتیجے میں اس کی خلاصی ہو جاتی ہے یا اس طرح کا کوئی اور سبب وجود میں آ جاتا ہے جس کا ضرر گناہ گار سے سزا اٹھا دیتا ہے۔ یہ اس کے متعلق ہے جس کا گناہ محقق اور ثابت ہو چکا ہو۔ اس طرح حاطب بن ابی بلتعہ اپنے غلاموں کے ساتھ بھی برا سلوک کرتا تھا، حتی کہ اس کے ایک غلام نے کہا: اے اللہ کے رسول! حاطب بن ابی بلتعہ ضرور بضرور جہنم میں جائے گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''تو نے جھوٹ کہا ہے، وہ بدر اور حدیبیہ میں شریک تھا۔''[1]

انھوں نے مشرکوں کو رسول اللہ ﷺ کے ارادۂ جنگ کی خبر دینے کی سنگین غلطی کی، جب ان کا معاملہ کھلا تو رسول اللہ ﷺ نے پوچھا: حاطب! یہ تو نے کیا کیا؟ انھوں نے جواب دیا: اللہ کے رسول! میں نے یہ کام اپنے دین سے مرتد ہو کر نہیں کیا، بلکہ مکے میں اپنے عزیزوں کو بچانے کے لیے ایک کوشش کی تھی، تا کہ ان کو قریش کی حمایت حاصل ہو سکے،[2] مجھے یہ یقین تھا کہ اس سے آپ کو کوئی نقصان نہیں ہو گا، یعنی اللہ اپنے رسول اور مومنوں کی مدد ہی کرے گا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ سن کر ان کی گردن اڑانے کی اجازت طلب کی، مگر آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ بدر میں شریک تھا اور تجھے کیا معلوم اللہ نے اہلِ بدر کو اندر تک جھانک لیا اور کہا: جو چاہو کرو، میں نے تمھیں بخش دیا ہے۔''[3]

یہ اتنی بڑی غلطی تھی جو بدر میں شریک ہونے کی وجہ سے معاف ہو گئی۔ اس سے معلوم ہوا کہ بہت بڑی نیکی بہت بڑی غلطی کو مٹا دیتی ہے اور مومن وعد و وعید پر ایمان رکھتے ہیں۔ ایک طرف رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''جس کا آخری کلام ''لا إله إلا الله'' ہوا وہ جنت میں داخل ہو گا۔''[4] وغیرہ اور دوسری طرف یہ فرمانِ الٰہی بھی ہے:

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا ۭ وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا ﴾ [النساء: ١٠]

''بے شک جو لوگ یتیموں کے اموال ظلم سے کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹوں میں آگ کے سوا کچھ نہیں کھاتے اور عنقریب وہ بھڑکتی ہوئی آگ میں داخل ہوں گے۔''

اس لیے کسی خاص دلیل کے بغیر نہ تو کسی متعین فرد کو جنتی کہا جا سکتا ہے اور نہ کسی خاص دلیل کے بغیر کسی

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤٩٥)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٨٤٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤٩٤)

[3] أيضاً.

[4] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣١١٦) صحيح الجامع، رقم الحديث (٥١٥٠)

متعین و مخصوص شخص کو جہنمی ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔ محض عموم میں مندرج ہونے کے گمان کے ساتھ کسی متعین فرد پر جنت یا جہنم کا حکم نہیں لگایا جا سکتا، کیوں کہ ایسا بھی ممکن ہے کہ وہ دونوں عموموں میں مندرج ہو اور ثواب و عذاب کا مستحق ہو، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ ۝ وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ ﴾ [الزلزال: ٨،٧]

''تو جو شخص ایک ذرہ برابر نیکی کرے گا اسے دیکھ لے گا۔ اور جو شخص ایک ذرہ برابر برائی کرے گا اسے دیکھ لے گا۔''

بندے میں جب نیکیاں اور برائیاں اکٹھی ہو جائیں تو اگرچہ وہ برائیوں کی وجہ سے سزا کا مستحق ہوتا ہے، مگر نیکیوں کے ثواب سے بھی محروم نہیں ہوتا۔ مومن کی نیکیاں محض اس سے صادر ہونے والے امور کی وجہ سے ضائع نہیں ہوتیں۔ کبیرہ گناہوں کی وجہ سے ساری نیکیوں کے ضائع ہونے کا دعویٰ تو خوارج اور معتزلہ کرتے ہیں جو کبیرہ گناہ کرنے والوں کو دائمی جہنمی خیال کرتے ہیں اور ان کے نزدیک یہ کسی سفارش یا سبب سے جہنم سے نہیں نکلیں گے، کیوں کہ کبیرہ گناہ کرنے والے میں ایمان نامی کوئی چیز باقی نہیں رہتی۔ یہ سب فاسد اقوال ہیں جو قرآن کریم، سنتِ متواترہ اور اجماعِ صحابہ کے خلاف ہیں۔

تمام اہلِ سنت والجماعت اور ائمہ دین کسی بھی صحابی کی، خواہ وہ سابقین سے تعلق رکھتا ہو یا آلِ رسول سے، عصمت کا عقیدہ نہیں رکھتے، بلکہ ان کے نزدیک ان شخصیات سے گناہوں کا سرزد ہو جانا ممکن ہے، اللہ تعالیٰ توبہ، گناہوں کو مٹانے والی نیکیوں اور دیگر اسباب سے ان کو بخش دیتے ہیں اور ان کے درجات بلند کرتے ہیں، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَ بَلَغَ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ۙ قَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِيْٓ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلٰى وَالِدَيَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ وَاَصْلِحْ لِيْ فِيْ ذُرِّيَّتِيْ ۚ اِنِّيْ تُبْتُ اِلَيْكَ وَاِنِّيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ نَتَقَبَّلُ عَنْهُمْ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَنَتَجَاوَزُ عَنْ سَيِّاٰتِهِمْ فِيْٓ اَصْحٰبِ الْجَنَّةِ ﴾ [الأحقاف: ١٥، ١٦]

''یہاں تک کہ جب وہ اپنی پوری قوت کو پہنچا اور چالیس برس کو پہنچ گیا تو اس نے کہا اے میرے رب! مجھے توفیق دے کہ میں تیری اس نعمت کا شکر کروں جو تو نے مجھ پر اور میرے ماں باپ پر انعام کی ہے اور یہ کہ میں وہ نیک عمل کروں جسے تو پسند کرتا ہے اور میرے لیے میری اولاد میں اصلاح فرما دے، بے شک میں نے تیری طرف توبہ کی اور بے شک میں حکم ماننے والوں سے ہوں۔ یہی وہ لوگ ہیں کہ ہم ان سے وہ سب سے اچھے عمل قبول کرتے ہیں جو انھوں نے کیے اور ان کی برائیوں سے درگزر کرتے ہیں، جنت والوں میں۔''

انبیائے کرام کے متعلق ان کا عقیدہ ہے کہ وہ گناہوں پر اصرار سے معصوم ہیں۔ صدیقین، شہدا اور صالحین معصوم نہیں۔ یہ ثابت شدہ گناہوں کے متعلق ہے۔ جو اجتہادی امور تھے، ان میں کبھی وہ صحیح ہوتے ہیں اور کبھی غلط، اگر اجتہاد صحیح ہو تو دوہرے اجر کے مستحق بنتے ہیں، اگر غلط ہو تو ایک اجر کے مستحق بنتے ہیں اور ان کی یہ غلطی بخشی ہوئی ہوتی ہے۔

گمراہ افکار کے حامل لوگ غلطی اور گناہ کو لازم و ملزوم قرار دیتے ہیں، کبھی اتنا غلو کرتے ہیں کہ ان کو معصوم قرار دیتے ہیں اور کبھی اتنی بے انصافی کرتے ہیں کہ غلطی کی وجہ سے ان کو باغی قرار دیتے ہیں، مگر اہلِ علم و ایمان ان کو معصوم بھی نہیں کہتے اور گناہ گار بھی نہیں کہتے۔ اسی اندازِ فکر سے بہت سے گمراہ اور بدعتی فرقوں نے جنم لیا، ایک گروہ نے اسلافِ امت، یعنی صحابہ و تابعین کو اپنے اس عقیدے اور گمان کی وجہ سے دشنام طرازی کا نشانہ بنایا کہ انھوں نے گناہ کیے اور جو گناہ کرے وہ لعنت کا حق دار بن جاتا ہے، بلکہ یہ کبھی ان کو فاسق یا کافر تک بھی کہہ دیتے ہیں، خوارج کی مثال سامنے ہے، انھوں نے حضرت علی بن ابو طالب اور حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہما اور ان کے عقیدت مندوں کو کافر قرار دیا، ان پر لعنت اور سب و شتم کے تیر برسائے اور ان سے لڑائی کرنا حلال قرار دیا۔ انھی کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

''ان کی نمازوں کے سامنے تمھاری نمازیں حقیر ہوں گی۔''[1]

نیز فرمایا:

''ایک دین سے نکلنے والا فرقہ مسلمانوں کی ایک جماعت کے خلاف خروج کرے گا اور ان سے وہ گروہ لڑے گا جو حق کے زیادہ قریب ہوگا۔''[2]

ان مارقہ، یعنی دین سے نکلنے والوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف خروج کیا اور ان کو اور ان کے عقیدت مندوں کو کافر قرار دیا، مسلمان دو گروہوں میں بٹ چکے تھے، ایک حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھا اور دوسرا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ۔ خوارج نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے گروہ سے لڑائی لڑی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی حرف بحرف پوری ہوئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے متعلق فرمایا تھا: ''میرا یہ بیٹا مسلمانوں کے دو بڑے گروہوں کے درمیان صلح کا باعث بنے گا۔''[3] اللہ تعالیٰ نے ان کے ذریعے شیعانِ علی اور شیعانِ معاویہ کے درمیان صلح کروا دی۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٤١٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٦٤)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٦٤)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٥٥٧)

رسول اللہ ﷺ نے اس کی وجہ سے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی تعریف کی اور ان کو سید کا نام دیا، کیوں کہ انھوں نے جو کارنامہ سرانجام دیا وہ عین اللہ اور اس کے رسول کی مرضی کے مطابق تھا۔ اگر مسلمانوں کے درمیان لڑائی کو برقرار رکھنا ہی اللہ اور اس کے رسول کا حکم اور مرضی ہوتی تو اس صورت میں حضرت حسن کا فعل قابلِ تعریف نہ ہوتا، لیکن اس صحیح اور صریح نص سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کا فعل محمود اور قابلِ تعریف تھا اور اللہ اور اس کے رسول کی مرضی کے مطابق تھا۔

صحیح حدیث میں آتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ حضرت حسن اور اسامہ بن زید کو اپنی ران مبارک پر بٹھاتے اور کہتے:

''اے اللہ! میں ان دونوں سے محبت کرتا ہوں اور جو ان دونوں سے محبت کرے، اس سے بھی محبت کرتا ہوں۔''[1]

اس حدیث میں آپ ﷺ نے ان کے لیے محبت کا اظہار اور دعا کی ہے۔ وہ دونوں ہی اس معاملے میں سب سے زیادہ دلچسپی رکھتے تھے جس میں رسول اللہ ﷺ نے حضرت حسن کی تعریف کی تھی، اسی طرح اس کام کو سخت ناپسند کرتے تھے جو اس کے مخالف ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ صفین میں قتل ہونے والے نبی اکرم ﷺ کے نزدیک دین سے نکلنے والے خوارج کی حیثیت نہیں رکھتے تھے جن سے آپ ﷺ نے لڑائی کرنے کا حکم دیا تھا، بلکہ ان آخر الذکر کے درمیان صلح کرنے کی تعریف کی اور ان سے لڑنے کا حکم نہیں دیا۔ یہی وجہ ہے کہ تمام صحابہ نے خوارج کے خلاف جنگ لڑنے پر اتفاق ظاہر کیا اور حضرت علی کو بھی ان سے لڑائی کرنے میں خوشی محسوس ہوئی، مگر صحابہ کی لڑائی کے متعلق رسول اللہ ﷺ سے کوئی حدیث منقول نہیں۔ اسی طرح انھوں نے اس لڑائی پر خوشی کا اظہار نہیں کیا، بلکہ کبیدہ خاطری ان پر عیاں تھی اور ان کی یہی تمنا تھی کہ کاش ایسا نہ ہوتا۔ بعض صحابہ نے شکر کیا، دونوں گروہوں کو کفر و نفاق سے مبرا قرار دیا اور دونوں جانب سے قتل ہونے والوں کے لیے دعائے رحمت کی اجازت دی۔ اسی طرح دونوں گروہوں کے اہل و ایمان ہونے پر حضرت علی اور دیگر صحابہ کا اتفاق تھا۔ قرآن کریم سے بھی ثابت ہوتا ہے، مومنوں کی آپس کی لڑائی ان کو دائرۂ ایمان سے خارج نہیں کرتی، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَإِنْ طَآئِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَأَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا ۚ فَإِنْ بَغَتْ إِحْدٰىهُمَا عَلَى الْأُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ إِلٰٓى أَمْرِ اللّٰهِ ۚ فَإِنْ فَآءَتْ فَأَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَأَقْسِطُوْا ۖ إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۝ إِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ إِخْوَةٌ فَأَصْلِحُوْا بَيْنَ أَخَوَيْكُمْ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝﴾

[الحجرات: ۹، ۱۰]

''اور اگر ایمان والوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو دونوں کے درمیان صلح کرا دو، پھر اگر ان دونوں میں سے ایک دوسرے پر زیادتی کرے تو اس (گروہ) سے لڑو جو زیادتی کرتا ہے، یہاں تک کہ اللہ کے

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٥٢٨)

حکم کی طرف پلٹ آئے، پھر اگر وہ پلٹ آئے تو دونوں کے درمیان انصاف کے ساتھ صلح کرا دو اور انصاف کرو، بے شک اللہ انصاف کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔ مومن تو بھائی ہی ہیں، پس اپنے دو بھائیوں کے درمیان صلح کراؤ اور اللہ سے ڈرو، تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔''

اللہ نے ان کی باہمی لڑائی اور زیادتی کے باوجود ان کو مومن اور بھائی کہا ہے۔

حضرت علی اور معاویہ رضی اللہ عنہما کے نزاع کے اسباب:

یہ جو حدیث ذکر کی جاتی ہے: ''جب دو خلیفہ لڑ پڑیں تو ایک ملعون ہوتا ہے۔'' موضوع روایت ہے، اس کو کسی محدث نے روایت کیا ہے نہ یہ حدیث کی کسی معتبر کتاب میں منقول ہے۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے جب حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جنگ کی، اس وقت انھوں نے نہ تو دعوائے خلافت کیا تھا اور نہ ان کی بیعت ہی کی گئی تھی، انھوں نے اپنے آپ کو خلیفہ سمجھتے ہوئے اور خلافت کا مستحق قرار دیتے ہوئے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے لڑائی نہیں لڑی تھی۔

اسی طرح حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کا اقرار کرتے تھے۔ اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کے خلاف جنگ کا آغاز کرنا بھی ان کی سوچ نہیں تھی، بلکہ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں نے اس رائے پر زور دیا کہ ان پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فرماں برداری اور بیعت کرنا فرض ہے، کیوں کہ مسلمانوں کا خلیفہ ایک ہی ہوتا ہے، مگر وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فرماں برداری میں نہیں آ رہے اور اس فریضے سے اجتناب کر رہے ہیں اور وہ صاحبِ اقتدار بھی ہیں تو انھوں نے ان سے لڑنا بہتر سمجھا، تاکہ وہ اس فریضے کو ادا کریں اور خلیفہ کی عملداری اور جماعت بندی قائم ہو۔

دوسری طرف ان کا موقف یہ تھا کہ یہ بیعت ان پر فرض نہیں، اگر اس پر ان سے جنگ کی گئی تو وہ مظلوم ہوں گے، کیوں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو مظلوم شہید کیا گیا اور اس پر سب کو اتفاق ہے۔ ان کے قاتل حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فوج میں ہیں اور وہ غالب اور صاحبِ اقتدار بھی ہیں، اگر ہم نے بیعت کر لی تو وہ ہم پر بھی ظلم کریں گے اور ہمیں بھی زیادتی کا نشانہ بنائیں گے۔ علی رضی اللہ عنہ ان کو روک نہیں سکیں گے، جس طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بھی ان کو نہ روک سکے۔ ہم اسی خلیفہ کی بیعت کریں گے جو ہمارے ساتھ انصاف کرے اور ہمیں انصاف دلائے گا۔

دونوں گروہوں میں ایسے جاہل موجود تھے جو حضرت علی اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما دونوں کے متعلق ایسی بدگمانیوں کے شکار تھے، جن سے علی و عثمان رضی اللہ عنہما دونوں ہی مبرا تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ قسم کھا کر کہتے تھے، حالانکہ وہ قسم کھانے کے بغیر بھی سچے تھے کہ میں نے عثمان کو قتل کیا ہے نہ ان کے قتل پر خوش ہوں اور نہ اس سلسلے میں کسی کو کوئی معاونت فراہم

کی ہے اور اس میں کوئی شک بھی نہیں۔ کچھ لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عقیدت مند تھے اور کچھ مخالف، اُنھی نے یہ ساری باتیں پھیلائی تھیں، عقیدت مندوں کا مقصد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی ذات پر طعن کرنا تھا کہ وہ تھے ہی اس لائق کہ ان کو قتل کر دیا جائے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کو قتل کرنے کا حکم دیا تھا۔ جو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے نفرت کرتے تھے، اس جھوٹ کو پھیلانے سے ان کا مقصد حضرت علی رضی اللہ عنہ پر طعن وتنقید کرنا تھا کہ انھوں نے مظلوم خلیفہ کے قتل کرنے میں معاونت فراہم کی ہے، جس نے اتنا صبر کیا کہ اپنی ذات کا دفاع کرنا بھی ضروری نہ سمجھا اور اپنی ذات کے دفاع کے لیے کسی مسلمان کا خون نہ بہایا۔ اس جیسی باتیں گمراہ اور جاہل شیعانِ علی وعثمان نے پھیلائیں اور جنگ کے لیے ایندھن فراہم کیا۔

اس کے باوجود شیعانِ علی وعثمان کا ہر گروہ اس بات کا اقرار کرتا تھا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ خلافت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مقابلے کے نہیں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلیفہ بننے کے امکان کے ہوتے ہوئے ان کا خلیفہ بننا درست نہیں، کیوں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فضیلت، سابقیت، علم، دین، شجاعت اور تمام فضائل کسی سے ڈھکے چھپے نہیں تھے، جس طرح ان کے بھائیوں ابوبکر وعمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کے فضائل سے ہر کوئی آگاہ تھا۔ ان کے اور حضرت سعد کے سوا اہلِ شوریٰ سے کوئی نہیں بچا تھا۔ حضرت سعد نے دست برداری اختیار کر لی تھی اور باقی عثمان اور علی رضی اللہ عنہما ہی بچے تھے۔ جب عثمان رضی اللہ عنہ شہید ہو گئے تو خلافت کے لیے متعین اشخاص میں سے صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ بچے تھے۔ سارا فتنہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل کے سبب رونما ہوا، جس کے لیے نتیجے میں ظلم اور زیادتی کرنے والوں کو قوت حاصل ہو گئی اور اہلِ علم و ایمان کمزور ہو گئے۔ اس قدر اختلاف اور فرقے بندی نے جنم لیا کہ نااہل لوگوں کی بات مانی جانے لگی اور اہل پیچھے رہ گئے، اسی لیے تو اللہ نے جماعت بندی اور ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر رہنے پر زور دیا اور اختلاف و افتراق سے روکا ہے۔ جماعت کے اندر رہتے ہوئے ناپسندیدہ امور بھی افتراق میں اتفاقی امور سے بہتر ہوتے ہیں۔

عمار کو باغی گروہ قتل کرنے کی وضاحت:

وہ حدیث جس میں ذکر ہوا ہے کہ ''عمار کو باغی گروہ قتل کرے گا۔''[1] اہلِ علم کی ایک جماعت کے نزدیک اس میں کلام ہے، لیکن امام مسلم رحمہ اللہ نے اسے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے اور بخاری کے کچھ نسخوں میں بھی موجود ہے۔ کچھ نے اس کی یہ تاویل کی ہے کہ باغی سے مراد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خون کا مطالبہ کرنے والے ہیں، جس طرح انھوں نے کہا تھا کہ ہم نیزوں کی انیوں کے ساتھ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خون کا مطالبہ کریں گے۔ تاہم یہ تاویل قابلِ اعتنا

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٣٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٩١٥)

نہیں اور بات وہی ہے جو رسول اللہ ﷺ نے فرمائی ہے اور حضرت عمار کو باغی گروہ کے قتل کرنے میں کوئی ایک ایسی بات نہیں جو ہماری پیش کردہ معروضات کے منافی ہو، کیوں کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ وَاِنْ طَآىِٕفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَیْنَهُمَا ۚ فَاِنْۢ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِیْ تَبْغِیْ حَتّٰى تَفِیْٓءَ اِلٰۤى اَمْرِ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَیْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ ۝ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَیْنَ اَخَوَیْكُمْ ﴾ [الحجرات: ۹، ۱۰]

''اور اگر ایمان والوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو دونوں کے درمیان صلح کرا دو، پھر اگر ان دونوں میں سے ایک دوسرے پر زیادتی کرے تو اس (گروہ) سے لڑو جو زیادتی کرتا ہے، یہاں تک کہ اللہ کے حکم کی طرف پلٹ آئے، پھر اگر وہ پلٹ آئے تو دونوں کے درمیان انصاف کے ساتھ صلح کرا دو اور انصاف کرو، بے شک اللہ انصاف کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔ مومن تو بھائی ہی ہیں، پس اپنے دو بھائیوں کے درمیان صلح کراؤ۔''

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے باہمی لڑائی اور بغی، یعنی زیادتی کے باوجود انھیں مومن اور بھائی قرار دیا ہے، بلکہ باغی گروہ کی سرکوبی کرنے کا حکم دینے کے باوجود ان کو مومن ہی قرار دیا ہے، کیوں کہ ہر بغی، زیادتی، ظلم اور عدوان عام لوگوں کو ایمان سے خارج کرنے والے نہیں ہوتے اور نہ ان پر لعنت بھیجنا ہی لازمی قرار دیتے ہیں تو جو خیر القرون سے تعلق رکھتے ہوں وہ بھلا کس طرح اس کی وجہ سے ایمان سے خارج ہو جائیں گے؟

ہر باغی، ظالم، زیادتی کرنے والے یا کسی گناہ کا ارتکاب کرنے والے کی دو اقسام ہوتی ہیں، ایک تاویل کرنے والا اور دوسرا غیر متاول، متاول (تاویل کرنے والا) مجتہد ہوتا ہے، مثلاً وہ علمائے دین جنھوں نے اجتہاد کیا اور بعض معاملات کو حلال اور بعض کو حرام سمجھا، کچھ نے کچھ مشروبات کی اقسام جائز قرار دیں، کچھ نے بعض سودی معاملات کو حلال کہا اور کچھ نے بعض تحلیل اور متعے کے عقود کو حلال خیال کیا، اس طرح کے اجتہاد امت کے بہترین علما اور اسلاف سے صادر ہوئے تو یہ تاویل کرنے والے مجتہد زیادہ سے زیادہ غلط ہی ہو سکتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے بھی فرمایا ہے:

﴿ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِیْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ ﴾ [البقرۃ: ۲۸۶]

''اے ہمارے رب! ہم سے مؤاخذہ نہ کر اگر ہم بھول جائیں یا خطا کر جائیں۔''

اور صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ دعا قبول فرمائی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے داود اور سلیمان علیہما السلام کا فیصلہ قرآن میں درج کیا ہے، ایک کو علم وحکمت کے ساتھ خاص کیا، مگر علم وحکمت میں دونوں کی تعریف کی۔ علما انبیا کے وارث ہیں، ایک کسی مسئلے کو اس طرح سمجھے، جس طرح دوسرا نہ سمجھ سکے

تو اس وجہ سے وہ اپنے علم و دین میں شہرت کی بنا پر ملعون اور قابلِ ملامت نہیں ہوگا، اگر وہ حکم کا علم رکھتے ہوئے بھی خلاف چلے تو یہ گناہ اور ظلم ہے، اس پر اصرار فسق ہے، بلکہ جس کا حرام ہونا دین کی ضروریات سے معلوم ہو، اس کو حلال کرنا کفر ہے، لہٰذا بغی اسی باب سے تعلق رکھتا ہے۔

اگر باغی مجتہد اور تاویل کرنے والا ہو، اس کے سامنے اپنا باغی ہونا واضح نہ ہو، بلکہ وہ اپنے آپ کو حق ہی پر سمجھتا ہو، گو وہ اپنے اس خیال میں غلط ہو تو اس کو باغی کہنا اس کے فسق کو ثابت کرنا تو درکنار اس کے گناہ کو بھی لازم نہیں کرتا۔

وہ جو تاویل کرنے والے باغیوں سے لڑنے کے قائل ہیں، وہ کہتے ہیں: گو ان سے لڑنے کا حکم ہے، مگر ہمارا ان سے لڑنا ان کی بغاوت کے ضرر کو دور کرنے کے لیے ہے، ان کو سزا دینے کے طور پر نہیں، بلکہ زیادتی سے روکنے کے لیے ہے۔ وہ عادل ہیں، فاسق نہیں اور دوسرے مکلفین کی طرح ہی ہیں، جس طرح بچے، پاگل، بے ہوش، سوئے ہوئے اور بھولے ہوئے کو کسی طرح کی زیادتی کے ارتکاب سے روکا جاتا ہے، بلکہ چوپائیوں کو بھی زیادتی کرنے سے روکا جاتا ہے، اسی طرح ان کو بھی روکا جاتا ہے۔ جو کسی مومن کو غلطی سے قتل کرتا ہے، قرآن کی نص سے اس پر دیت واجب ہوتی ہے، حالانکہ اس کی وجہ سے اس پر کوئی گناہ نہیں ہوتا، اسی طرح جس پر حد کی سزا ثابت ہو، اس کا کیس عدالت میں پیش کر دیا جائے اور وہ اس کے بعد توبہ کرے، پھر اس پر حد جاری کر دی جائے تو جو گناہ سے توبہ کر لیتا ہے وہ ایسے ہی ہو جاتا ہے جیسے اس پر کوئی گناہ نہ ہو۔ امام مالک، شافعی اور احمد کے نزدیک تاویل کرنے والے باغی کو کوڑوں کی سزا دی جائے گی، تاہم اس کے نظائر بے شمار ہیں۔

اگر یہ فرض کر لیں کہ زیادتی بغیر تاویل کے تھی تو وہ گناہ ہی ہوگا اور گناہوں کی سزا متعدد اسباب سے ختم ہو جاتی ہے، مثلاً گناہوں کو مٹانے والی نیکیوں کا ہونا، کفارہ بننے والی آزمائشیں اور مصیبتیں وغیرہ وغیرہ۔

مزید یہ الفاظ: ''عمار کو باغی گروہ قتل کرے گا''[1] حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے اصحاب کو متعین کرنے میں نص نہیں، بلکہ ممکن ہے اس سے وہ گروہ مراد ہو جس نے ان پر حملہ کیا اور ان کو قتل کر دیا، یہ فوج کا ایک گروہ ہوگا، جو عمار کے قتل پر راضی ہو، اس کا حکم اس گروہ کا حکم ہوگا، جس نے ان کو قتل کیا۔ یہ سب کو معلوم ہے کہ معاویہ رضی اللہ عنہ کی فوج میں ایسے لوگ تھے جو حضرت عمار رضی اللہ عنہ کے قتل پر راضی نہیں تھے، جیسے عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما وغیرہ، بلکہ خود حضرت امیر معاویہ اور عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما نے حضرت عمار کے قتل کی مذمت کی تھی۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ انھوں نے کہا: عمار کو اسی گروہ نے قتل کیا جو ان کو اپنے ساتھ لے کر آیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس تاویل کی تردید میں کہا کہ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ حمزہ رضی اللہ عنہ کو بھی پھر ہم ہی نے قتل کیا تھا؟ تاہم حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جو کہا، وہی

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٣٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٩١٥)

درست تھا، جس نے یہ تاویل کی اس کی رائے میں حضرت معاویہ قاتلِ عمار نہیں اور باغی بھی نہیں۔ جو شخص اپنے آپ کو باغی نہ سمجھتا ہو، مگر وہ حقیقت میں باغی ہو تو وہ تاویل کرنے والا اور غلط ہے۔ فقہا میں سے کسی کی یہ رائے نہیں کہ جس گروہ نے حضرت عمار کو قتل کیا تھا ان سے لڑنا ضروری ہے، مگر ان کے دو مشہور اقوال ہیں، اکابر صحابہ بھی انہی دو آرا پر کاربند تھے، کچھ حضرت عمار رضی اللہ عنہ اور ان کے گروہ کے ساتھ مل کر لڑنا جائز سمجھتے تھے اور کچھ نے لڑائی سے مطلق کنارہ کشی کر لی، دونوں گروہوں میں سے سابقین اور اولین صحابہ کی تعداد موجود تھی، پہلی رائے حضرت عمار، سہل بن حنیف اور ابو ایوب رضی اللہ عنہم کی تھی اور دوسری رائے پر سعد بن ابی وقاص، محمد بن مسلمہ، اسامہ بن زید اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم وغیرہ نے عمل کیا، بلکہ اکثر صحابہ کا یہی موقف تھا۔ دونوں لشکروں میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہما سے افضل کوئی نہیں تھا، انھوں نے جنگ سے کنارہ کشی کی۔

لڑائی کو جائز سمجھنے والے حضرت عمار کی حدیث سے دلیل لے سکتے ہیں، کیوں کہ اگر ان کو قتل کرنے والے باغی ہیں تو ان کے متعلق اللہ کا حکم ہے:

﴿ فَقٰتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ ﴾ [الحجرات: ٩] ''تو اس (گروہ) سے لڑو جو زیادتی کرتا ہے۔''

جنھوں نے لڑائی سے کنارہ کشی کی انھوں نے ان صحیح احادیث سے استدلال کیا جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتنے کے وقت لڑائی میں شریک ہونے کی حوصلہ شکنی کی اور لڑائی سے علاحدہ رہنے والوں کو بہتر قرار دیا۔[1] یہ گروہ اس لڑائی کو فتنے کی لڑائی سمجھتا تھا اور ان کے پیشِ نظر یہ بات تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کی باہمی لڑائی میں لڑنے کا حکم نہیں دیا اور اس کو پسند بھی نہیں کیا، بلکہ صلح کو پسند کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے باغی سے لڑنے کا حکم دیا ہے، مگر اس کے ساتھ جنگ کا آغاز کرنے کا حکم نہیں دیا، بلکہ کہا ہے:

﴿وَاِنْ طَآئِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا ۚ فَاِنْ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقٰتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ﴾ [الحجرات: ٩]

''اور اگر ایمان والوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو دونوں کے درمیان صلح کرا دو، پھر اگر ان دونوں میں سے ایک دوسرے پر زیادتی کرے تو اس (گروہ) سے لڑو جو زیادتی کرتا ہے، یہاں تک کہ اللہ کے حکم کی طرف پلٹ آئے، پھر اگر وہ پلٹ آئے تو دونوں کے درمیان انصاف کے ساتھ صلح کرا دو اور انصاف کرو، بے شک اللہ انصاف کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔''

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٦٧٠، ٦٦٧١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٨٦)

ان کا استدلال تھا کہ اللہ نے ان کے ساتھ لڑائی کرنے میں پہل کرنے کا حکم نہیں دیا، کیوں کہ ہر زیادتی کرنے والے کے خلاف لڑنے کا حکم نہیں، کیوں کہ اکثر اہلِ ایمان بلکہ اکثر لوگ ظلم و زیادتی سے خالی نہیں ہوتے، مگر جب اہلِ ایمان کے دو گروہ لڑ پڑیں تو پہلے ان کے درمیان صلح کروانا فرض ہے۔

دونوں میں سے کسی ایک گروہ کو بھی لڑائی کا حکم نہیں، اگر ایک زیادتی پر اتر آئے تو پھر اس کے ساتھ لڑا جائے گا، کیوں کہ اس نے لڑائی نہیں چھوڑی اور صلح قبول نہیں کی تو اس کا شر اور فتنہ لڑنے کے بغیر ختم نہیں ہوسکتا، اس لیے اس گروہ سے لڑنا اپنی ذات کے دفاع میں لڑنے کے مترادف ہے کہ اگر حملہ آور کو نہ روکا جائے تو اس کا ظلم بڑھتا چلا جائے گا، اس لیے لڑائی کے بغیر چارہ نہیں۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

''جو اپنا مال بچاتے ہوئے یا اپنا دین بچاتے ہوئے یا اپنی جان بچاتے ہوئے یا اپنی عزت بچاتے ہوئے مارا جائے، وہ شہید ہے۔''[1]

ان علما کا یہ استدلال بھی ہے کہ فرض کرو دونوں لشکر ہی باغی ہوں، تب بھی ان کے ساتھ جنگ میں پہل کرنے کا حکم نہیں، بلکہ ان کے درمیان صلح قائم کرنے کا حکم ہے۔ مزید برآں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ لڑنے والے اکثر لڑائی سے دور بھاگ رہے تھے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فرماں برداری میں بھی سستی اور اختلاف دکھا رہے تھے، اس لیے بھی نہ لڑنا ہی بہتر تھا۔

مقصود یہ ہے کہ یہ حدیث کسی بھی صحابی پر لعنت بھیجنے اور کسی کو بھی فاسق قرار دینے کے لیے مسالہ مہیا نہیں کرتی۔

جہاں تک اہلِ بیت کی بات ہے تو الحمد للہ کسی نے کسی صحابی کو کبھی گالی نہیں دی۔ حجاج نے بنی ہاشم میں سے کسی کو قتل نہیں کیا تھا، بلکہ اشرافِ عرب کے کچھ لوگوں کو قتل کیا تھا۔ اس نے عبداللہ بن جعفر کی بیٹی سے شادی کی۔ اس پر بنو عبدمناف، بنو ہاشم اور بنو امیہ راضی نہ ہوئے اور انھوں نے ان دونوں کے درمیان علاحدگی کروا دی، کیوں کہ وہ اس کو اس کے جوڑ کا نہیں سمجھتے تھے۔ واللہ أعلم[2]

بے عمل مگر کمزوروں کی مدد کرنے والے نام کے مسلمانوں کا حکم

سوال کچھ لوگ ایسے ہیں جو نماز پڑھتے ہیں نہ روزہ رکھتے ہیں، ان میں سے جو روزہ رکھتا ہے نماز نہیں پڑھتا، ان کا مال حرام ہے، لوگوں کا مال چھین لیتے ہیں، پڑوسی اور کمزور کی عزت کرتے ہیں، ان کا مذہب نامعلوم ہے، حالانکہ وہ مسلمان ہیں؟

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٣٤٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤١) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٧٧٢) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٤٢١) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٥٨٠) صحيح الجامع (٦٤٤٥)

[2] مجموع الفتاویٰ (٣٥/٥٨-٧٩)

جواب یہ لوگ اگر مسلمان حکمرانوں کی عملداری میں آتے ہیں تو وہ ان کو نماز قائم کرنے کا حکم دیں اور نماز اور روزہ ترک کرنے پر سزا دیں، اگر نماز پنجگانہ، رمضان کے روزوں اور فرض زکات کے فرض ہونے کا اقرار کرتے ہوں تو صحیح ہے، جو ان کا اقرار نہ کرے وہ کافر ہوتا ہے، اگر نماز کے فرض ہونے کا اقرار کریں مگر اس کو قائم کرنے سے انکار کریں تو ان کو سزا دی جائے، تاآنکہ وہ اسے قائم کرنا شروع کر دیں۔ جو بالغ عاقل نماز نہیں پڑھتا، جمہور علما یعنی مالک، شافعی اور احمد کے نزدیک واجب القتل ہے، اسی طرح ان پر حدود نافذ کی جائیں۔

اگر انکار کرنے والا گروہ بااثر اور طاقتور ہو تو ان سے لڑنا ضروری ہے، تاآنکہ نماز، روزہ اور زکات جیسے ظاہری فرائض کو ادا کرنے کا التزام اور زنا، سودی خوری اور رہزنی جیسے حرام کاموں کو چھوڑنے کا عہد نہ کر لیں۔ جو نماز، روزہ، زکات کے فرض ہونے کا قائل نہیں، وہ کافر ہے، اس سے توبہ کروائی جائے اگر توبہ کر لے تو صحیح، ورنہ قتل کر دیا جائے۔ جو اللہ، رسول، روزِ قیامت اور جنت و دوزخ پر ایمان نہیں رکھتا، وہ یہود و نصاریٰ سے بھی بڑا کافر ہے۔ والدین کی نافرمانی کبیرہ گناہ ہے۔[1]

مالی و جانی مفادات میں شراکت کی بنیاد پر مخصوص بھائی چارہ قائم کرنے کا حکم

سوال موجودہ زمانے میں کچھ لوگ بھائی چارے کا بندھن باندھتے ہیں، ہر ایک یہ اقرار و التزام کرتا ہے کہ میرا مال تیرا مال، میرا خون تیرا خون، اور میری اولاد تیری اولاد ہے، اور ہر ایک دوسرے کا خون پیتا ہے، کیا یہ کام جائز ہے یا نہیں؟ نیز کیا اس کے نتیجے میں وہ شرعی احکام ثابت ہوتے ہیں جو حقیقی بھائی چارے کے نتیجے میں ثابت ہوتے ہیں؟ پھر یہ کہ رسول اللہ ﷺ نے جو مہاجرین و انصار کے درمیان بھائی چارہ قائم کیا تھا، اس کی کیا نوعیت تھی؟

جواب الحمد لله. یہ فعل اس مذکور انداز میں بالاتفاق غیر مشروع اور ناجائز ہے، اخوت کی اصل اور اساس اس طرح ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے گھر مہاجرین و انصار کو آپس میں بھائی بھائی اور ایک دوسرے کا حلیف بنایا، آپ ﷺ نے سعد بن ربیع کو عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کا بھائی بنایا۔ سعد نے عبدالرحمٰن سے یہاں تک کہا: ''میرا آدھا مال لے لے، میری ایک بیوی پسند کر لے، میں اس کو طلاق دے دوں گا تو اس سے نکاح کر لینا۔'' عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: اللہ تیرے مال اور اہل میں برکت ڈالے، مجھے بازار کی راہ دکھا۔[2] پھر آنحضرت ﷺ نے سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کو ابو درداء رضی اللہ عنہ کا بھائی بنایا، یہ واقعات صحیح بخاری میں درج ہیں۔

---

[1] مجموع الفتاوىٰ (۳۵/۸۹۔۹۰)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٧٨٥)

کچھ سیرت نگاروں نے ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی اور ابوبکر رضی اللہ عنہما کے درمیان مواخات قائم کیا۔ یہ محدثین کے نزدیک باطل اور لغو بات ہے، کیوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجر کو مہاجر اور انصاری کو انصاری کا بھائی نہیں بنایا تھا، بلکہ مہاجرین و انصار کے درمیان رشتۂ اخوت استوار کیا تھا۔ مواخات اور محالفت (ایک دوسرے کا حلیف بنانا) کے رشتے میں بندھنے والے، اقارب کو چھوڑ کر، ایک دوسرے کے وارث بنے، تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرما دی:

﴿ وَأُولُوا الْأَرْحَامِ بَعْضُهُمْ أَوْلَىٰ بِبَعْضٍ فِي كِتَابِ اللَّهِ ﴾ [الأنفال: ٧٥]

''اور رشتے دار اللہ کی کتاب میں ایک دوسرے کے زیادہ حق دار ہیں۔''

اس کے بعد وراثت اس مواخات اور محالفت کو چھوڑ کر رشتے داری کی بنیاد پر تقسیم ہونے لگی۔ اس جیسی محالفت اور مواخات سے متعلق علما کا اختلاف ہے کہ کیا جب اقارب اور موالی میں سے کوئی وارث نہ ہو، تو اس کی بنا پر وراثت تقسیم ہو سکتی ہے یا نہیں، دو اقوال ہیں۔ ابو حنیفہ اور ایک روایت میں احمد کے نزدیک اس مواخات کی بنا پر وراثت تقسیم ہو سکتی ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَالَّذِينَ عَقَدَتْ أَيْمَانُكُمْ فَآتُوهُمْ نَصِيبَهُمْ ﴾ [النساء: ٣٣]

''اور جن لوگوں کو تمھارے عہد و پیمان نے باندھ رکھا ہے انھیں ان کا حصہ دو۔''

دوسرا قول ہے: اس کی بنیاد پر کوئی کسی صورت میں کسی کا وارث نہیں بن سکتا، یہ مالک، شافعی اور دوسری روایت میں احمد کا مذہب ہے۔ ان کے نزدیک یہ آیت منسوخ ہو چکی ہے۔

اسی طرح اس بات میں بھی علما کا اختلاف ہے کہ کیا اس طرح دو آدمی ایک دوسرے کے ساتھ بھائی چارہ اور تحالف استوار کر سکتے ہیں جس طرح مہاجرین و انصار کے درمیان یہ تعلق قائم کیا گیا تھا؟ ایک قول کے مطابق یہ منسوخ ہو چکا ہے، کیوں کہ صحیح مسلم میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«لَا حَلْفَ فِي الْإِسْلَامِ وَمَا كَانَ مِنْ حَلْفٍ فِي الْجَاهِلِيَّةِ فَلَمْ يَزِدْهُ الْإِسْلَامُ إِلَّا شِدَّةً» [1]

''اسلام میں حلیف بننا نہیں، جاہلیت میں جو حلف بندی تھی، اسلام نے اس میں سختی ہی کی ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے نصِ قرآن کی روشنی میں مومنوں کو آپس میں بھائی بنائی بنا دیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: ''مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، وہ اس کو کسی کے سپرد کرتا ہے نہ اس پر ظلم ہی کرتا ہے۔'' [2] اس کی قسم جس کے

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٣٠)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٣١٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٨٠)

ہاتھ میں میری جان ہے! تم میں سے کوئی بھی اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا جب تک وہ خیر میں سے اپنے بھائی کے لیے وہی پسند نہیں کرتا جو اپنے لیے کرتا ہے۔''[1]

بنا بریں جو انسان ایمان کے تقاضوں پر قائم ہو وہ ہر مومن کا بھائی ہوتا ہے اور ہر مومن پر اس کے حقوق ادا کرنا ضروری ہوتا ہے، چاہے ان دونوں کے درمیان اس طرح کا کوئی خاص معاہدہ نہ ہوا ہو، اللہ تعالیٰ نے یہ کہہ کر: ﴿ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ ﴾ [الحجرات: ١٠] اور رسول ﷺ نے یہ کہہ کر: « وَدِدْتُ أَنِّي قَدْ رَأَيْتُ إِخْوَانِي »[2] ''کاش! میں اپنے بھائیوں کو دیکھ چکا ہوتا۔'' ان کے درمیان رشتہ اخوت قائم کر دیا ہے۔

جو انسان ایمان کے حقوق سے خارج نہ ہو، اس کے ساتھ اس کے مطابق ہی معاملہ کرنا چاہیے، اس کی اچھائیوں کی تعریف کی جائے، ان کی بنیاد پر اس کے ساتھ دوستی اور وِلاء کا تعلق قائم رکھا جائے۔ اور حسبِ امکان اس کو برائیوں سے دور رکھا اور روکا جائے اور ان کے مطابق ہی اس سے دور رہا جائے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''اپنے بھائی کی مدد کر، ظالم ہو کہ مظلوم! میں نے کہا: اے اللہ کے رسول! مظلوم کی مدد کروں، یہ تو بنتا ہے، ظالم ہونے کی صورت میں کیسے اس کی مدد کروں؟ فرمایا: اس کو ظلم سے روک، یہ بھی اس کی مدد ہی ہے۔''[3]

ہر مسلمان کو چاہیے کہ اس کی محبت، نفرت اور دوستی دشمنی اللہ اور رسول کے حکم کے تابع ہو، جس سے اللہ رسول محبت کریں اس سے محبت کرے، جس سے اللہ رسول نفرت کریں اس سے نفرت کرے، جس سے اللہ رسول دوستی رکھیں اس سے دوستی رکھے جس سے اللہ رسول دشمنی رکھیں اس سے دشمنی رکھے جس انسان میں اچھائیاں بھی ہوں جو محبت رکھنے کا تقاضا کریں اور برائیاں بھی ہوں جو نفرت کا کہیں تو اس کے ساتھ اسی کے حساب سے محبت یا نفرت کا تعلق رکھا جائے، مثلاً: امتِ محمدیہ کے ایسے فاسق افراد جو اپنے اندر موجود نیکی اور برائی کے مطابق سزا اور ثواب، دوستی اور دشمنی اور محبت ونفرت کے حق دار ہوتے ہیں، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ﴾ [الزلزال: ٧، ٨]

''تو جو شخص ایک ذرہ برابر نیکی کرے گا اسے دیکھ لے گا۔ اور جو شخص ایک ذرہ برابر برائی کرے گا اسے دیکھ لے گا۔''

یہ اہلِ سنت والجماعت کا مذہب ہے، خوارج، معتزلہ، مرجئہ اور جہمیہ سب کا مذہب اس کے مخالف ہے، ان

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (١٣) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٤٥)

[2] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٤٩)

[3] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٢٣١٢) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٥٨٤)

میں کچھ ایک انتہا پر ہیں اور دوسرے دوسری انتہا پر، اہلِ سنت ہی اعتدال کی راہ پر قائم ہیں۔

کچھ علما کا کہنا ہے کہ یہ مواخات اور محالفت جائز ہے۔ یہ موقف ان کا ہے جو محالفت کی وجہ سے وارث بننے کے قائل ہیں۔ تاہم اس بات میں مسلمانوں کے ہاں قطعاً کوئی اختلاف نہیں کہ ایک کا بیٹا دوسرے کی اولاد کے ساتھ وارث بننے کی وجہ سے دوسرے کا بیٹا نہیں بن جاتا۔ اللہ تعالیٰ نے لے پالک بنانے کا رواج، جو جاہلیت میں عام تھا، منسوخ کر دیا اور فرمایا:

﴿مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِيْ جَوْفِهٖ ۚ وَمَا جَعَلَ اَزْوَاجَكُمُ الّٰٓـِٔيْ تُظٰهِرُوْنَ مِنْهُنَّ اُمَّهٰتِكُمْ ۚ وَمَا جَعَلَ اَدْعِيَآءَكُمْ اَبْنَآءَكُمْ ۭ﴾ [الأحزاب: ٤]

''اللہ نے کسی آدمی کے لیے اس کے سینے میں دو دل نہیں بنائے اور نہ اس نے تمھاری بیویوں کو جن سے تم ظہار کرتے ہو، تمھاری مائیں بنایا ہے اور نہ تمھارے منہ بولے بیٹوں کو تمھارے بیٹے بنایا ہے۔''

نیز فرمایا:

﴿اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآىِٕهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ لَّمْ تَعْلَمُوْٓا اٰبَآءَهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ﴾ [الأحزاب: ٥]

''انھیں ان کے باپوں کی نسبت سے پکارو، یہ اللہ کے ہاں زیادہ انصاف کی بات ہے، پھر اگر تم ان کے باپ نہ جانو تو وہ دین میں تمھارے بھائی اور تمھارے دوست ہیں۔''

اسی طرح دونوں میں سے ہر ایک کا مال بھی دوسرے کا نہیں بن جاتا کہ وہ اس کے مال کا وارث بنے، یہ بھی دونوں اطراف سے ممتنع اور ناممکن ہے، لیکن اگر دونوں برضا و رغبت ایک دوسرے کو اپنا اپنا مال استعمال کرنے کی اجازت دیں تو یہ جائز ہے۔ سلف صالحین ایسا کیا کرتے تھے، وہ ایک دوسرے کے گھر جاتے اور مالک کی موجودگی میں اس کے گھر سے کھانا وغیرہ کھا لیتے، کیوں کہ انھیں اس پر اس کی رضا اور خوش دلی کا علم ہوتا، اللہ تعالیٰ نے بھی فرمایا ہے: ﴿اَوْ صَدِيْقِكُمْ ۭ﴾ [النور: ٦١]

رہی ایک دوسرے کا خون پینے کی رسم تو یہ کسی صورت میں جائز نہیں، اس میں نجاست کے ساتھ ساتھ کم سے کم برائی فحش کاموں اور لونڈوں سے محبت بازی جیسی شیطانی محبت وغیرہ جیسے گناہ اور برائی کے کاموں پر ایک دوسرے کا حلیف اور بھائی بننے والوں کے ساتھ مشابہت ہے، اگرچہ یہ لوگ بظاہر کاروباری اشتراک کے پردے میں یہ کام کریں، دوسرے پر ظلم میں تعاون یا باطل طریقے سے لوگوں کا مال کھانے کے لیے بھی یہ اشتراک ہو سکتا ہے، یہ بھائی چارہ اسی طرح کا ہے جس طرح کا بھائی چارہ کئی جعلی پیر مردوں اور عورتوں کے درمیان قائم کرتے ہیں، پھر وہ

ایک دوسرے کے ساتھ خلوت میں مل سکتے ہیں، بہت سے گروہوں نے اس کے پردے میں ان کی بدکاریوں کا پردہ چاک کیا ہے۔ اس طرح کا بھائی چارہ جو حرام کام میں تعاون کے لیے قائم کیا جائے، قائم کرنے والا خواہ کوئی بھی ہو، بالاتفاق حرام ہے۔

صرف اس مواخات میں اختلاف ہے جس کا مقصد نیکی اور تقوے میں تعاون کرنا ہو، یعنی اللہ کی فرماں برداری انھیں اکٹھا کرے اور نافرمانی دور کر دے۔ جس طرح علما کہتے ہیں: ہمیں سنت اکٹھا کرتی ہے اور بدعت علاحدہ۔ اس مخالفت میں اختلاف ہے اور اکثر علما اس کے قائل بھی نہیں، کیوں کہ اللہ تعالیٰ اور رسول نے جو ''ایمانی مواخات'' قائم کر دی ہے، اس کے ہوتے ہوئے ایسے کسی معاہدے کی ضرورت نہیں رہتی۔ وہی کافی اور ہر خیر اس سے حاصل ہو سکتی ہے۔ اسی کے حقوق و فرائض ادا کرنے میں پوری کوشش کرنی چاہیے، کیوں کہ اللہ نے ایک مومن کے دوسرے مومن پر جو حقوق رکھے ہیں وہ ذاتیات سے بلند ہیں۔

کچھ علما اس صورت میں اس کے جواز کے قائل ہیں جب یہ شرعی طریقے کے مطابق ہو اور اس میں شریعت کی کوئی مخالفت نہ ہو۔

اگر کوئی یہ کہے کہ ایسا رشتہ قائم کرنے والا نیکیوں اور برائیوں میں دوسرے کا شریک بن جاتا ہے کہ اگر ایک جنت میں داخل ہوا تو دوسرا بھی جنت میں داخل ہو گا، لوگ ایک دوسرے پر اس طرح کی شرطیں بھی لگاتے ہیں تو یاد رہے کہ یہ اور اس طرح کی شرطیں درست نہیں ہوتیں اور ان کو پورا کرنا بھی ضروری نہیں ہوتا۔ شفاعت صرف اللہ تعالیٰ کی اجازت سے حاصل ہو گی، ان دونوں کا انجام اور خاتمہ کیا ہو گا اور وہ کس چیز کے مستحق ہوں گے، اس سے اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی باخبر نہیں، لہٰذا جو کام کسی مسلمان کے اختیار ہی میں نہیں اس کو اس کا پابند کیسے بنایا جا سکتا ہے، وہ اپنا حال جانتا ہے نہ دوسرے کا! اس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ جو لوگ اس طرح کی شرطیں رکھتے ہیں انھیں اپنی شرطوں کی حقیقت کا علم ہی نہیں ہوتا، اگر ان میں سے کوئی ایک یہ بھانپ لے کہ دنیا میں اس کا کچھ مال اس سے لے لیا جائے گا تو کیا وہ اس طرح کی مواخات میں شریک ہو گا؟ اللہ ہی بہتر جانے!

مختصراً، لوگوں کے درمیان باندھی جانے والی شرطوں، معاہدوں اور بھائی چارے جیسے حلفوں وغیرہ کو کتاب و سنت پر پیش کیا جائے گا، جو شرط کتاب و سنت کے مطابق ہو اس کو پورا کیا جائے، اور جس نے ایسی شرط باندھی جو کتاب اللہ میں نہیں تو وہ لغو ہے، چاہے سو شرطیں ہی ہوں، اللہ کی کتاب زیادہ حق رکھتی ہے اور اس کی شرط زیادہ ثقہ اور مضبوط ہے۔[1] لہٰذا جب شرط اللہ اور اس کے رسول کی شرط کے مخالف ہو وہ باطل ولغو ہو گی، مثلاً: کوئی یہ شرط رکھے

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٤٢٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٥٠٤)

کہ فلاں کا بیٹا اس کا ہے، یا دوسرے کا آزاد کردہ اسی کا مولیٰ رہے، یا اس کا بیٹا یا قریبی وارث نہیں بنے گا، یا وہ ہر کام میں اس کی معاونت کرے گا، اس کے ہر دشمن کے خلاف اس کی مدد کرے گا، چاہے وہ حق پر ہو یا باطل پر، یا اس کے ہر حکم پر عمل کرے گا، یا وہ اس کو مطلقاً جنت میں داخل کر دے گا یا جہنم سے آزاد کر دے گا، وغیرہ وغیرہ۔ ان شروط میں اسی حصے کو پورا کیا جائے گا جو اللہ اور رسول کے حکم کے مطابق ہو اور اس کو پورا نہیں کیا جائے گا جس سے اللہ اور رسول نے منع کیا ہے۔ اس پر اہلِ اسلام کا اتفاق ہے۔ مباحات میں اختلاف ہے اور یہ تفصیل کا موقع نہیں۔

اسی طرح خرید وفروخت، ہبہ، وقف اور نذر، نیز ائمہ، مشائخِ طریقت کی بیعت کے معاہدات، بھائی چارہ قائم کرنے والوں، اہلِ انساب اور قبائل کے معاہدات اور اس طرح کے دیگر معاملات کی شرطوں میں ہر ایک کے لیے ہر چیز میں اللہ اور رسول کی فرماں برداری کرنا اور ہر چیز میں خدا رسول کی نافرمانی سے بچنا ضروری ہے، خدا کی نافرمانی میں مخلوق کی فرماں برداری جائز نہیں۔ انسان کے لیے اللہ اور رسول ہر چیز سے زیادہ محبوب ہونا چاہیے اور وہ صرف خدا اور رسول پر ایمان رکھنے والے کی فرماں برداری کرے۔ واللہ أعلم [1]

[1] مجموع الفتاویٰ (۹۲/۳۵۔۹۸)

متفرق مسائل

حکمران سے فتویٰ لینے کا حکم

سوال کیا ولیِ امر یعنی حکمران سے فتویٰ لینا درست ہے؟

جواب فتویٰ اسی سے لینا درست ہے جو فتویٰ دینے کی اہلیت رکھتا ہو، وہ علم اور عدل کی روشنی میں فتویٰ دے۔

جو شخص علم کے بغیر یا حق اور صحیح بات کو جانتے ہوئے بھی اس کے خلاف فتویٰ دیتا ہے، اس سے فتویٰ لینا جائز ہے نہ اس کو قاضی بنانا ہی درست ہے۔

بلکہ کسی ایسے شخص کو انصاف کی کرسی پر بٹھانا جو علم نہ رکھتا ہو اور علما سے فتویٰ لے کر اس کے مطابق فیصلہ کرتا ہو، اختلافی امر ہے۔ قاضی کے لیے شرطوں کے حوالے سے علما کے تین اقوال ہیں:

1. امام ابو حنیفہ کے نزدیک صرف اس کا اہلِ شہادت میں ہونا کافی ہے۔
2. امام شافعی اور اکثر حنابلہ کے نزدیک اس کا مجتہد ہونا شرط ہے، اس قول کی طرف میلان رکھنے والے اکثر متاخرین کے نزدیک ضرورت کے لیے غیر مجتہد کو بھی قاضی مقرر کیا جا سکتا ہے۔
3. امام احمد وغیرہ کے اقوال سے ثابت ہوتا ہے کہ حسبِ امکان بالترتیب بہتر سے بہتر کو مقرر کیا جائے، اس کی کوئی حد نہیں، بلکہ اگر فرض کیا جائے کہ صرف دو فاسق بچتے ہیں تو ان میں سے اس کو مقرر کیا جائے جس کا شر کم اور فائدہ زیادہ متوقع ہو۔ اسی طرح اگر صرف دو مقلد موجود ہوں تو ان میں سے زیادہ عادل اور تقلید کو بہتر جاننے والے کو مقرر کیا جائے۔

اگر دو مجتہد پائے جائیں تو ان میں سے بہتر کو مقرر کیا جائے، اگر وہ کسی ایسے کام میں مشغول نہ ہو جو عدلیہ سے بہتر ہو۔

یہی وجہ ہے جب خلیفہ وقت نے مختلف شہروں کے قاضی مقرر کرنے کے بارے میں پوچھنے کے لیے اپنے وزیر کو امام احمد کے پاس بھیجا اور جن کو مقرر اور معزول کرنا تھا، ان کے نام بھی لکھ کر بھیجے تو امام صاحب نے کچھ کو مقرر کرنے اور کچھ کو معزول کرنے کی تجویز دی اور کچھ کے بارے میں کہا کہ میں انھیں نہیں جانتا، اور جن کو مقرر کرنے کی تجویز

دی تھی، ان میں کچھ کم علم بھی تھے تو امام صاحب نے کہا کہ اگر اس کی جگہ فلاں کو مقرر کر لیں تو وہ اس سے بہتر رہے گا۔

جہاں تک مفتی کا تعلق ہے تو اس کے لیے فقہا عموماً علم کی شرط لگاتے ہیں، صرف شہادت کی اہلیت پر اکتفا نہیں کرتے، اس لیے جس کو علم ہی نہیں کہ فتویٰ کیا دینا ہے، اس سے فتویٰ لینا کس طرح درست ہو سکتا ہے؟[1]

باعمل عالم اور مخلص مجاہد میں سے بہتر

سوال باعمل عالم بہتر ہے یا مخلص مجاہد؟

جواب اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ يَاأَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَى وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ ﴾ [الحجرات: ١٣]

''اے لوگو! بے شک ہم نے تمھیں ایک نر اور ایک مادہ سے پیدا کیا اور ہم نے تمھیں قومیں اور قبیلے بنا دیا، تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو، بے شک تم میں سب سے زیادہ عزت والا اللہ کے نزدیک وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ تقویٰ والا ہے۔''

صحیح بخاری و مسلم میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا: سب سے زیادہ معزز کون ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سب سے زیادہ متقی۔[2] لہٰذا دو آدمیوں میں سے جو زیادہ پرہیز گار اور اللہ سے ڈرنے والا ہو وہ اللہ کے نزدیک اتنا ہی معزز ہے۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے انعام یافتہ لوگوں کی چار انواع ذکر کی ہیں، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَمَنْ يُطِعِ اللَّهَ وَالرَّسُولَ فَأُولَئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ ﴾ [النساء: ٦٩]

''اور جو اللہ اور اس کے رسول کی فرماں برداری کرے تو یہ ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام کیا، نبیوں اور صدیقوں اور شہدا اور صالحین میں سے اور یہ لوگ اچھے ساتھی ہیں۔''

بنابریں صدیق غیر صدیق شہید سے افضل ہے اور شہید غیر شہید صالح (نیک) سے افضل ہے۔

کبھی کوئی شخص صدیق، شہید اور صالح بھی ہو سکتا ہے، جس طرح کوئی نبی، صدیق اور شہید بھی ہو سکتا ہے۔

ابراہیم علیہ السلام سے متعلق ارشاد ہے:

---

[1] جامع المسائل (٤٨١/٩-٤٨٣)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣١٧٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٧٨)

﴿ وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِبْرٰهِيْمَ ۬ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ﴾ [مریم: ٤١]

''اور اس کتاب میں ابراہیم کا ذکر کر، بے شک وہ بہت سچا تھا، نبی تھا۔''

ابراہیم علیہ السلام نے دعا کی تھی:

﴿ رَبِّ هَبْ لِيْ حُكْمًا وَّاَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ ﴾ [الشعراء: ٨٣]

''اے میرے رب! مجھے حکم عطا کر اور مجھے نیک لوگوں کے ساتھ ملا۔''

سیدنا یوسف صدیق علیہ السلام نے دعا کی تھی:

﴿ تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ ﴾ [یوسف: ١٠١]

''مجھے مسلم ہونے کی حالت میں فوت کر اور مجھے نیک لوگوں کے ساتھ ملا دے۔''

عالم اگر صدیق ہو اور مجاہد صدیق نہ ہو تو صدیق افضل ہے۔ اسی طرح اس کے عکس اگر مجاہد صدیق ہو اور عالم صدیق نہ ہو تو وہ صدیق مجاہد افضل ہے۔

کوئی آدمی اس وقت تک باعمل عالم نہیں کہلا سکتا جب تک مخلص مجاہد نہ ہو، اور کوئی آدمی مخلص مجاہد نہیں ہو سکتا جب تک اس کے پاس اللہ کے احکام کا علم اور ان پر عمل نہ ہو۔

جہاد اللہ کے دین کی دعوت دے کر زبان سے بھی ہوتا ہے اور ہاتھ سے بھی، اس لیے جہاد علم و عمل کا مجموعہ ہے۔

لہٰذا جب تک دو آدمیوں کے درمیان تفصیلی فرق نہ کیا جائے اس وقت تک اس مذکور اساس کی بنا پر امتیاز نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم یہ ممکن ہے کہ مجاہد کا جہاد قتال کی صورت میں ہو اور اس میں اس کا عمل نمایاں ہو اور اس عالم کا علم زیادہ نمایاں ہو اور لوگ اس سے زیادہ استفادہ کرتے ہوں۔

اس لیے کبھی یہ افضل ہو سکتا ہے اور کبھی وہ جو ان دونوں میں زیادہ متقی ہو گا وہ افضل ہو گا۔ اور وہ جو علم اور عمل کے ساتھ زبان سے جہاد بھی کرے، دعوت بھی دے اور سیاست اور خلافت کے امور بھی نپٹائے، جس طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کی زندگی رہی، وہ ان دونوں سے افضل ہے۔ مختصراً جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے عمل اور ذمے داریوں کے جتنا قریب اور مشابہ ہو گا اتنا ہی دوسرے سے افضل ہو گا۔[1]

علم افضل ہے یا قرآن

سوال کیا علم قرآن سے افضل ہے؟

جواب اللہ کے کلام سے بہتر کوئی کلام نہیں اور جس علم کا تعلق قرآن سے ہو وہ افضل علم ہے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد

---

[1] جامع المسائل (٩/٤٨٥-٤٨٧)

ہے: ''کچھ لوگ اللہ والے ہیں، پوچھا گیا: اے اللہ کے رسول! وہ کون ہیں؟ فرمایا: قرآن والے، یہ اللہ والے اور اللہ کے خاص ہیں۔''[1] لیکن جو علم سیکھنا ہر مسلمان پر فرض ہے، یہ وہ ہے جس کی اس کو اپنے دین کو جاننے کے لیے ضرورت ہوتی ہے۔ ہر شخص پر یہ سیکھنا فرض ہے کہ اللہ نے اس کو کیا حکم دیا ہے، کس سے روکا ہے، یہ علم سیکھنا قرآن پڑھنا، سیکھنے سے بھی زیادہ ضروری اور اتنا قرآن یاد کرنا بھی ضروری ہے جو نماز پڑھنے کے لیے کافی ہو۔ واللہ أعلم[2]

جاہل کون؟

سوال دو آدمی آپس میں جھگڑ پڑے، ایک نے کہا: تو شرعی احکام سے جاہل ہے، دوسرے نے تعجب سے کہا: کیا میں جاہل ہوں؟

جواب اگر یہ شخص امر و نہی کا عمومی علم رکھتا ہے تو یہ شریعت کا عالم ہے، اگر ان امور کا علم نہیں رکھتا تو ان سے جاہل ہے، لیکن اگر اس کو یہ بھی معلوم نہیں کہ اللہ نے خاص طور پر اس کو کیا حکم دیا ہے اور کس سے منع کیا ہے تو پھر یہ اجہل الناس ہے۔ واللہ أعلم[3]

شراب سے علاج کا حکم

سوال شراب سے علاج کرنا کیسا ہے، نیز جو کہتے ہیں یہ جائز ہے ان کی کیا دلیل ہے اور رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان کا کیا مطلب ہے: «إِنَّها دَاءٌ وَلَيْسَتْ بِدَواءٍ» ''یہ بیماری ہے دوا نہیں۔'' جو اس کو ضرورت کی وجہ سے جائز کہتے ہیں ان کی کیا دلیل ہے، نیز وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ حدیث: «إِنَّ اللّٰهَ لَمْ يَجْعَلْ شِفَاءَ أُمَّتِي فِيما حَرَّمَ عَلَيْها» ''اللہ نے جس چیز کو امت پر حرام کیا ہے، اس میں ان کے لیے دوا نہیں رکھی۔'' ضعیف ہے؟

جواب شراب سے علاج کرنا رسول اللہ ﷺ کے الفاظ کی روشنی میں حرام ہے اور جمہور اہلِ علم مالک، احمد اور ابو حنیفہ کا اس پر اتفاق ہے، شافعی مذہب میں بھی ایک قول یہی ہے۔

صحیح حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے شراب کی دوا بنانے سے متعلق پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

---

[1] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢١٥) صحيح الجامع (٢١٦٥)

[2] جامع المسائل (٤٨٧/٩۔٤٨٨)

[3] جامع المسائل (٤٨٨/٩)

« إِنَّها دَاءٌ وَلَيْسَتْ بِدَوَاءٍ »[1] ''یہ بیماری ہے، دوا نہیں۔'' سنن ابی داود میں ہے: « إِنَّهُ نَهَى عَنِ الدَّوَاءِ الْخَبِيْثِ »[2] ''آپ ﷺ نے خبیث دوا سے منع کیا ہے۔'' اور شراب تو ام الخبائث ہے۔ بخاری وغیرہ نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے: « إِنَّ اللّٰهَ لَمْ يَجْعَلْ شَفَاءَ أُمَّتِي فِيْما حَرَّمَ عَلَيْها »[3] اللہ تعالیٰ نے میری امت کی شفا اس چیز میں نہیں رکھی جس کو اس پر حرام کیا ہے، اس روایت کو ابن حبان نے مرفوع سند کے ساتھ نقل کیا ہے۔ سنن میں حدیث ہے: آپ ﷺ سے مینڈک کی دوا بنانے کے لیے مارنے کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے اس کو مارنے سے منع کیا اور فرمایا: « إِنَّ نَقِيْقَهَا تَسْبِيْحٌ »[4] ''اس کی ٹرٹر تسبیح ہے۔''

جو علما حرام چیز سے دوا بنانے کو جائز کہتے ہیں وہ مجبور شخص کے لیے مردار اور خون کھانے کے جواز پر قیاس کرتے ہیں، یہ استدلال و قیاس مندرجہ ذیل چند وجوہ کی بنا پر کمزور ہے:

1. جو انسان اپنی جان بچانے کی خاطر مردار کھانے پر مجبور ہو جاتا ہے اس کا مقصود اس حرام چیز کو کھانے کی صورت میں یقینی طور پر حاصل ہو جاتا ہے وہ جب اسے کھاتا ہے تو اس کی جان بچ جاتی ہے اور اس کی ضرورت ختم ہو جاتی ہے، لیکن خبائث اور حرام چیزوں کی دوا کھانے کی صورت میں شفا یقینی نہیں ہوتی، ایسے کتنے واقعات ہیں کہ لوگ علاج کرتے ہیں، لیکن شفا نہیں ملتی، یہی وجہ ہے کہ فقہا نے اچھو لگ جانے کی صورت میں شراب کا گھونٹ لگانے کی اجازت دی ہے، لیکن پیاس کی صورت میں شراب کا گھونٹ لگانے کی اجازت نہیں دی، اس کی تعلیل میں وہ کہتے ہیں کہ یہ شراب نہیں کرتی۔

2. مجبور انسان کے پاس اپنی ضرورت کے ازالے کے لیے حرام چیز کھانے کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں ہوتا، اگر وہی اس کو میسر ہو، لیکن شفا کے حصول کے لیے علاج صرف اس خبیث کو کھانے میں محصور و منحصر نہیں، کیوں کہ ادویہ کی بے شمار اقسام ہیں، کبھی دوا کے بغیر بھی شفا مل جاتی ہے، دعا اور دم سے بھی بندہ صحت یاب ہو جاتا ہے، بلکہ یہ دونوں علاج کی عظیم ترین قسمیں ہیں۔ بقراط کا قول ہے: ہماری طبابت اربابِ کنیسا کی طبابت کے

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٩٨٤)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٨٧٠) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٠٤٥) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٤٥٩) السلسلة الصحيحة (١٦٣٣)

[3] صحيح البخاري (٢١٢٩/٥) صحيح ابن حبان (٢٣٣/٤) المستدرك للحاكم (٢٤٢/٤) المعجم الكبير (٣٤٥/٩) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٦٣٣)

[4] الكامل لابن عدي (٣٨٨/٦) مصنف عبد الرزاق (٨٤١٨) ابن أبي حاتم (٢٥١٠) المعجم الأوسط (٣٧١٦) المعجم الصغير (١٨٩/١)

مقابلے میں وہی حیثیت رکھتی ہے جو ہمارے مقابلے میں بوڑھی عورتوں کی طبابت ہے۔

بسا اوقات کسی اختیاری سبب کے بغیر بھی شفا مل جاتی ہے، اللہ تعالیٰ انسان کے جسم میں کوئی ایسی طبعی مدافعاتی قوت پیدا کر دیتے ہیں جو اس بیماری کو ختم کر دیتی ہے۔[1]

3 ائمہ وغیرہ کے ظاہر مذہب کے مطابق مجبور انسان کے لیے اپنی جان بچانے کے لیے مردار کھانا واجب ہو جاتا ہے (اگر وہی میسر ہو) مسروق کا قول ہے: جو مردار کھانے پر مجبور ہو جائے، لیکن پھر بھی نہ کھائے اور مر جائے وہ جہنم میں داخل ہوگا، لیکن علاج جمہور علما کے نزدیک واجب ہی نہیں، جن علما نے علاج کروانے کو واجب قرار دیا ہے وہ چند ایک حنبلی اور شافعی علما ہیں، بلکہ علما کے ہاں یہاں تک اختلاف ہے کہ علاج کروانا افضل ہے یا صبر کرنا، اس اختلاف کا سبب یہ صحیح حدیث ہے جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایک لڑکی مرگی میں مبتلا تھی، اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دعا کی درخواست کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «إِنْ أَحْبَبْتَ أَنْ تَصْبِرِي وَلَكَ الجَنَّةُ، وإِنْ أَحْبَبْتَ دَعَوْتُ اللّٰهَ أَنْ يَّشْفِيَكَ»[2] ”اگر تو صبر کرنا پسند کرے تو تجھے بدلے میں جنت ملے گی اور اگر تو پسند کرے تو میں اللہ سے دعا کروں وہ تجھے شفا دے دے؟“ اس نے کہا: ”بل أصبر“ ”بلکہ میں صبر کروں گی، لیکن جب مجھے دورہ پڑتا ہے تو میرے کپڑے اتر جاتے ہیں، آپ اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کر دیجیے کہ میں دورے کی حالت میں برہنہ نہ ہوں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لیے یہ دعا کر دی۔ نیز بہت سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین علاج نہیں کرواتے تھے، بلکہ ان میں کئی

[1] اگر ڈاکٹر کہیں کہ اس کا علاج صرف یہی دوا ہے تو یہ بات کوئی پڑھا لکھا ڈاکٹر نہیں کہہ سکتا، کیوں کہ شفا معمول کے مطابق کسی ایک سبب میں محصور و متعین نہیں ہوتی جس طرح بھوک کو مٹانے کا سبب معمول کے مطابق مقرر ہوتا ہے، کچھ لوگوں کو دوا کے بغیر ہی آرام آ جاتا ہے، کچھ لوگوں کو دوا کھانے سے آرام آتا ہے، قطع نظر وہ حرام ہو کہ حلال۔ کبھی انسان دوا کھاتا ہے، لیکن کسی شرط کے نہ ہونے یا کسی رکاوٹ کی وجہ سے آرام نہیں ملتا، لیکن یہ کھانے کے بالکل الٹ ہے، کیوں کہ وہ بھوک مٹنے اور سیر ہو جانے کا سبب ہے، اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے مجبور کے لیے حرام چیزیں کھانا جائز کیا ہے کہ جب وہ بھوک کی وجہ سے ان کو کھانے پر مجبور ہو تو کھا لے، کیوں کہ بھوک صرف کھانے کی وجہ سے مٹتی ہے اس کے بغیر نہیں یا وہ مر جائے گا یا بھوک سے شدید بیمار ہو جائے گا، تو جب اس مقصود یعنی بھوک مٹانے کا ایک ہی راستہ اور طریقہ متعین ٹھہرا تو اللہ نے اس غرض سے مجبوری کے عالم میں خبائث کھانا جائز کر دیا، لیکن خبیث دواؤں کے عکس کہ علاج صرف ان میں محصور نہیں ہوتا، بلکہ اور بھی طریقے ہوتے ہیں، بلکہ کسی کا قول ہے: جو خبیث دواؤں کو استعمال کرتا ہے، یہ اس کے دل میں بیماری اور ایمان میں کمزوری کی علامت ہے، وہ ایسی چیزوں میں شفا ڈھونڈتا ہے جو بجائے خود بیماری ہے۔

[2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٥٣٣٨) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٥٧٦)

ایسے تھے جنھوں نے بیماری پسند کی، ان میں حضرت ابوذر اور حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہما کا ذکر ملتا ہے، اس کے باوجود ان کے علاج ترک کرنے کو غلط نہیں کہا گیا۔

مذکورہ بالا تصریحات سے واضح ہوا کہ اگر مجبوری کی حالت میں مردار کھانا واجب ہو جاتا ہے، لیکن علاج کروانا واجب نہیں تو ان کو ایک دوسرے پر قیاس کرنا بھی جائز نہیں، کیوں کہ جو واجب ہے بسا اوقات اس میں ایسی چیزیں جائز ہو جاتی ہیں جو غیر واجب میں جائز نہیں ہوتیں، اس طرح واجب کو ادا کرنے کی مصلحت حرام کی مفسدت کو ڈھانپ لیتی ہے، صاحبِ شریعت مصلحت اور مفسدت دونوں کا لحاظ رکھتا ہے، اگر کسی جگہ دونوں اکٹھی ہو جائیں تو مصلحتِ راجحہ کو مفسدتِ مرجوحہ پر مقدم کر لیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فرض جہاد میں وہ کام بھی جائز ہو جاتے ہیں جو جہاد کے علاوہ جائز نہیں ہوتے، حتی کہ توپ سے گولے برسانا جائز ہو جاتا ہے، خواہ اس کی زد میں بچے اور عورتیں بھی آ جائیں، لیکن عمداً یہ کام کرنا حرام ہے، شریعت میں اس کی مثالیں بے شمار ہیں۔ واللہ أعلم [1]

خنزیر کی چربی سے علاج کرنا

سوال ایک شخص کی بیماری کے لیے خنزیر کی چربی تجویز کی گئی، کیا اس کو استعمال کرنا جائز ہے یا ناجائز؟

جواب خنزیر کی چربی بطور دوا کھانا جائز نہیں، لیکن علاج کے طور پر اس کو ملنا پھر بعد میں دھو دینا جائز ہے، یہ نماز کے علاوہ گندگی چھونے کے جواز پر مبنی ہے۔ تاہم اس میں علما کا اختلاف بھی ہے، لیکن صحیح یہ ہے کہ یہ ضرورت کے لیے جائز ہے، جس طرح آدمی کا اپنے ہاتھ سے استنجا کرنا اور نجاست دور کرنا جائز ہے۔

جو ضرورت کے لیے جائز ہو اس کے ساتھ علاج کرنا بھی جائز ہے۔ جس طرح بطور علاج ریشم پہننا جائز ہے، لیکن جن خبیث چیزوں کو ضرورت کے وقت کھانا جائز ہو ان کو بطور علاج کھانا جائز نہیں۔ جس طرح شراب کو بطور دوا پینا جائز نہیں، بالخصوص اس قول کی روشنی میں جس میں یہ دلیل دی گئی ہے کہ لوگ بحری جہازوں کو چکنا کرنے کے لیے چمڑوں کو رنگنے کے لیے اور چراغ جلانے کے لیے مردار کی چربی استعمال کرتے، جب رسول اللہ ﷺ سے اس کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے ان کاموں کو برقرار رکھا، لیکن ان کو اس کی قیمت لینے سے منع کیا گیا۔ واللہ أعلم [2]

جنوں کا وجود اور دم کے ذریعے آسیب زدہ کا علاج

سوال کیا جن وجود رکھتے ہیں اور بنی آدم کو تنگ کرتے ہیں، نیز کیا شریعت میں دم، تعویذ اور جھاڑ پھونک کے ذریعے آسیب زدہ کا علاج کرنا جائز ہے؟

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۲۴/۲۶۷_۲۷۰)

[2] مجموع الفتاویٰ (۲۴/۲۷۰)

جواب الحمد لله. جنوں کا وجود کتاب وسنت اور اجماعِ امت کی روشنی میں ثابت ہے، اسی طرح ان کا انسان کے جسم میں داخل ہونا بھی ائمہ اہلِ سنت کے اتفاق کے ساتھ ثابت ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ اَلَّذِیْنَ یَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا یَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا یَقُوْمُ الَّذِیْ یَتَخَبَّطُهُ الشَّیْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ﴾ [البقرة: ٢٧٥]

''وہ لوگ جو سود کھاتے ہیں، کھڑے نہیں ہوں گے مگر جیسے وہ شخص کھڑا ہوتا ہے جسے شیطان نے چھو کر خبطی بنا دیا ہو۔''

صحیح بخاری میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «إِنَّ الشَّيْطَانَ يَجْرِي مِنِ ابْنِ آدَمَ مَجْرَى الدَّمِ»[1]

''شیطان ابن آدم میں اسی طرح دوڑتا ہے جس طرح بدن میں خون دوڑتا ہے۔''

امام احمد بن حنبل کے بیٹے عبداللہ کہتے ہیں کہ میں نے اپنے باپ سے کہا: کچھ لوگ کہتے ہیں جن اس شخص کے بدن میں داخل نہیں ہوتا جس کو دورے پڑ رہے ہوں، انھوں نے کہا: ''بیٹے یہ لوگ جھوٹ کہتے ہیں، جن اس کی زبان سے بول رہا ہوتا ہے۔'' یہ ایک مشہور بات ہے کہ آسیب زدہ شخص کی زبان سے جن اوٹ پٹانگ باتیں کرتا ہے جن کا معنی سمجھ میں نہیں آتا، ایسے شخص کو اتنا شدید مارا جاتا ہے کہ اگر کسی اونٹ کو بھی اتنا شدید مارا جائے تو اس پر بھی اس کا گہرا اثر ہو، لیکن آسیب زدہ نہ تو اس مار کو محسوس کرتا ہے اور نہ ان باتوں ہی کو محسوس کر رہا ہوتا ہے، جو وہ اس کی زبان سے بولتا ہے۔ جن کبھی ایسے شخص کو اٹھا کر کسی دوسری جگہ پھینک دیتا ہے، اس کی چیزیں ادھر ادھر کر دیتا ہے اور اس طرح کے کئی کام کرتا ہے جن کا ہم نے مشاہدہ کیا ہے اور جن سے اس شخص کو یقینی طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کی زبان پر بولنے والا اور ان چیزوں کو ادھر ادھر کرنے والا انسان کے علاوہ کوئی دوسری جنس ہی ہے۔

ائمہ اسلام میں سے کوئی بھی جن کے آسیب زدہ کے جسم میں یا کسی دوسرے انسان کے بدن میں داخل ہونے کا انکار نہیں کرتا جو اس کا انکار کرتا ہے اور ساتھ ہی یہ دعویٰ بھی کرتا ہے کہ شریعت اس کی نفی اور تکذیب کرتی ہے وہ شریعت کی طرف جھوٹ اور غلط بات منسوب کرتا ہے، کوئی ایسی شرعی دلیل نہیں جو اس کی نفی کرتی ہو۔

جھاڑ پھونک اور تعویذ دھاگے کے ذریعے آسیب زدہ کے علاج کی دو صورتیں ہیں:

1. اگر ان کلمات اور تعویذات کا معنی سمجھ میں آتا ہو اور وہ ایسے مفہوم پر مشتمل ہوں جن کے ساتھ بولنا، اللہ سے دعا کرنا، اللہ کا ذکر کرنا اور اس کی مخلوق کو مخاطب کرنا اسلام میں جائز ہو تو ان کے ذریعے آسیب زدہ کو دم کرنا بھی جائز ہے، کیوں کہ صحیح بخاری میں یہ حدیث موجود ہے کہ جس میں آپ ﷺ کے الفاظ یہ ہیں: «إِنَّهُ أَذِنَ فِي

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣١٠٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢١٧٤، ٢١٧٥)

الرُّقٰي ما لَمْ تَكُنْ شِرْكاً»[1] ''آپ ﷺ نے دم میں اس وقت تک اجازت دی ہے جب تک اس میں کوئی شرکیہ لفظ نہ آئے۔'' نیز فرمایا: ''جو اپنے بھائی کو فائدہ پہنچا سکتا ہو تو ضرور پہنچائے۔''[2]

2 اگر دم شرکیہ الفاظ یا نامعلوم معانی پر مشتمل ہو جن میں کفر کا احتمال ہو تو ان کے ساتھ دم کرنا جائز ہے نہ جھاڑ پھونک کرنا اور نہ اس طرح کا کوئی دوسرا عمل کرنا، گو جن اس عمل سے بھاگ جائے، لیکن جو کام اللہ اور اس کے رسول نے حرام قرار دیا ہے اس کا نقصان اس کے فائدے سے کہیں زیادہ ہوتا ہے، مثلاً لوگ طرح طرح کے جادو کے ذریعے جن نکالتے ہیں، جادوگر اگرچہ جادو کے ذریعے مالی مفادات حاصل کر لیتا ہے، جس طرح چور چوری کے ذریعے، جھوٹا اپنے جھوٹ کے ذریعے، خائن اپنی خیانت کے ذریعے اور مشرک اپنے کفر و شرک کے ذریعے کچھ اغراض و مفادات حاصل کر لیتا ہے، یہ لوگ ان حرام کاموں کے ذریعے مالی فوائد تو حاصل کر لیتے ہیں، لیکن ان کے نتیجے میں ان کو دنیا اور آخرت میں جو نقصان پہنچتا ہے وہ ان دنیاوی اغراض سے کہیں بڑھ کر خطرناک ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے رسولوں کو مصالح و مفادات کے حصول و تکمیل اور مفاسد کو موقوف اور کم کرنے کے لیے مبعوث کیا۔ ہر وہ کام جس کا اللہ و رسول نے حکم دیا ہے اس کی مصلحت اس کی مفسدت پر راجح ہوتی ہے اور اس کی منفعت اس کی مفسدت پر مقدم ہی ہوتی ہے، چاہے دل ناپسند ہی کریں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ﴾ [البقرة: ٢١٦]

''تم پر لڑنا لکھ دیا گیا ہے، حالانکہ وہ تمھیں ناپسند ہے۔''

اس آیت میں جہاد کا حکم دیا گیا ہے جو دلوں کے لیے ناپسند ہی ہوتا ہے، لیکن اس کی مصلحت و منفعت اس تکلیف سے بہت بڑھ کر ہوتی ہے جو اس کے نتیجے میں برداشت کرنا پڑتی ہے، جس طرح کوئی شخص شفا کے حصول کے لیے کڑوی سے کڑوی دوا بھی پی لینا پسند کرتا ہے، کیوں کہ اس کی حصولِ شفا کی مصلحت دوا کی کڑواہٹ اور تکلیف پر مقدم ہوتی ہے۔ تاجر کو لے لیں وہ سفر کی صعوبتیں برداشت کرتا ہے، دن رات جاگتا ہے اور سارے شدائد برداشت کرتا ہے، کس لیے؟ نفع کی مصلحت کے لیے جو اس کے نزدیک ان تمام سختیوں کے مقابلے میں مقدم ہوتی ہے۔ صحیح بخاری و مسلم میں ارشادِ نبوی ہے: « حُفَّت الجَنَّةُ بالْمَكَارِهِ وحُفَّتِ النَّارُ بِالشَّهَوَاتِ »[3] جنت سختیوں اور جہنم خواہشات کی باڑ کے ساتھ گھری ہوئی ہے۔''

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٢٠٠)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢١٩٩)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦١٢٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٢٢)

اللہ تعالیٰ جادوگر کے متعلق فرماتے ہیں:

﴿ وَلَا يُفْلِحُ السَّاحِرُ حَيْثُ أَتَىٰ ﴾ [طہٰ: ٦٩] ''اور جادوگر کامیاب نہیں ہوتا جہاں بھی آئے۔''

نیز فرمایا:

﴿ وَمَا يُعَلِّمَانِ مِنْ أَحَدٍ حَتَّىٰ يَقُولَا إِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ۖ فَيَتَعَلَّمُونَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُونَ بِهِ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهِ ۚ وَمَا هُم بِضَارِّينَ بِهِ مِنْ أَحَدٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ ۚ وَيَتَعَلَّمُونَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنفَعُهُمْ ۚ وَلَقَدْ عَلِمُوا لَمَنِ اشْتَرَاهُ مَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۚ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهِ أَنفُسَهُمْ ۚ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ﴾ [البقرة: ١٠٢]

''حالانکہ وہ دونوں کسی ایک کو نہیں سکھاتے تھے، یہاں تک کہ کہتے ہم تو محض ایک آزمائش ہیں، سو تو کفر نہ کر۔ پھر وہ ان دونوں سے وہ چیز سیکھتے جس کے ساتھ وہ مرد اور اس کی بیوی کے درمیان جدائی ڈال دیتے اور وہ اس کے ساتھ ہرگز کسی کو نقصان پہنچانے والے نہ تھے مگر اللہ کے اذن کے ساتھ۔ اور وہ ایسی چیز سیکھتے تھے جو انھیں نقصان پہنچاتی اور انھیں فائدہ نہ دیتی تھی۔ حالانکہ بلاشبہ یقیناً وہ جان چکے تھے کہ جس نے اسے خریدا آخرت میں اس کا کوئی حصہ نہیں اور بے شک بری ہے وہ چیز جس کے بدلے انھوں نے اپنے آپ کو بیچ ڈالا۔ کاش وہ جانتے ہوتے۔''

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے بیان کیا ہے کہ آخرت میں جادوگر کا کوئی حصہ نہیں، وہ اس کے ذریعے اپنے کچھ دنیاوی مفادات ہی حاصل کر سکتے ہیں، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَلَوْ أَنَّهُمْ آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَمَثُوبَةٌ مِّنْ عِندِ اللَّهِ خَيْرٌ ۖ لَّوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ﴾ [البقرة: ١٠٣]

''اور اگر واقعی وہ ایمان لاتے اور بچتے تو یقیناً اللہ کے پاس سے تھوڑا ثواب بھی بہت بہتر تھا، کاش وہ جانتے ہوتے۔''

یعنی ایمان لائیں اور اللہ تعالیٰ کے دیے گئے احکام مان کر اور اس کے منع کردہ امور سے رک کر تقویٰ اختیار کریں تو اس کے نتیجے میں ان کو جو دنیا اور آخرت کی بھلائیاں نصیب ہو سکتی ہیں وہ جادو کے ذریعے حاصل کیے گئے مفادات سے کہیں عظیم ہیں، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ إِنَّا لَنَنصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِينَ آمَنُوا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُومُ الْأَشْهَادُ ﴾ [المؤمن: ٥١]

''بے شک ہم اپنے رسولوں کی اور ان لوگوں کی جو ایمان لائے ضرور مدد کرتے ہیں دنیا کی زندگی میں اور اس دن بھی جب گواہ کھڑے ہوں گے۔''

نیز فرمایا:

﴿ مَنْ عَمِلَ صٰلِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ﴾ [النحل: ۹۷]

''جو بھی نیک عمل کرے، مرد ہو یا عورت اور وہ مومن ہو تو یقیناً ہم اسے ضرور زندگی بخشیں گے، پاکیزہ زندگی۔''

مزید فرمایا:

﴿ وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِي اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ﴾ [النحل: ۴۱]

''اور جن لوگوں نے اللہ کی خاطر وطن چھوڑا، اس کے بعد کہ ان پر ظلم کیا گیا، بلاشبہہ ہم انھیں دنیا میں ضرور اچھا ٹھکانا دیں گے۔''

نیز فرمایا:

﴿ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا ﴾ [البقرة: ۲۰۱-۲۰۲]

''اور ان میں سے کوئی وہ ہے جو کہتا ہے اے ہمارے رب! ہمیں دنیا میں بھلائی اور آخرت میں بھی بھلائی دے اور ہمیں آگ کے عذاب سے بچا۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے لیے اس میں سے ایک حصہ ہے جو انھوں نے کمایا۔''

دنیا و آخرت میں نیک اعمال کے ثواب کے متعلق احادیث بھی بے شمار ہیں، بندے کو اپنی مرضی کے مطابق ہر تکلیف دور کرنے اور اپنی مرضی ہی کے مطابق ہر فائدہ حاصل کرنے کا اختیار حاصل نہیں، بلکہ وہ اسی ذریعے سے فائدہ حاصل کر سکتا ہے اور اسی طریقے سے نقصان دور کر سکتا ہے جو تقویٰ پر مشتمل ہو، لہٰذا ہر وہ دم، جھاڑ پھونک، تعویذ گنڈا، دعا اور خلوت و شب بیداری جو خدا اور اس کے رسول کے جائز کردہ امور کے دائرے میں داخل ہو اسے اختیار کرنے میں کوئی حرج نہیں، لیکن جو حرام اور منع کردہ امور میں داخل ہو، اس سے اجتناب برتا جائے۔

جو شخص جنوں اور شیاطین کے وجود، شیطانوں کے انسانی بدن میں داخل ہونے، جادو اور اس کی اثر انگیزی، جادوگروں کے مختلف کام جیسے ستاروں کو پکارنا، زمینی اثر پذیر قوتوں کے ذریعے آسمانی فعال قوتوں کو نکالنا، تاکہ خلافِ معمول واقعات رونما کر سکیں یا کسی معمول کے کام میں رکاوٹ پیدا کر سکیں (جادوگر آسمانی فعال قوتوں سے ستاروں کی ارواح مراد لیتے ہیں جو حقیقت میں ستاروں کی ارواح نہیں جن ہوتے ہیں اور زمینی اثر پذیر قوتوں سے زمین میں رونما ہونے والے واقعات مراد لیتے ہیں) ان جھوٹوں پر شیطانوں کا نازل ہونا، اس طرح ان کا مختلف منتروں کے ذریعے جنوں اور شیطانوں کو حاضر کرنا اور ان جیسے دیگر موجودہ کاموں کا انکار کرتا ہے، وہ درحقیقت اپنی لاعلمی اور بے بضاعتی

کی وجہ سے ان امور کو جھٹلاتا ہے۔

جو کہتا ہے کہ انسان ان امور میں سے جسے موثر سمجھے اسے شریعت کے ترازو میں تولے بغیر ہی استعمال کرے، اس کی یہ بات شریعت کے خلاف ہے، کیوں کہ بسا اوقات یہ تعویذ گنڈے جھاڑ پھونک اور طلسماتی علاج حرام امور پر مشتمل ہوتے ہیں جیسے کفر یا فسق یا نافرمانی۔ اس لیے وہی طریقے اپنائے جائیں جو جائز ہیں، حرام چھوڑ دیا جائے، اللہ اور اس کے رسول کے احکام پر عمل کیا جائے اور اللہ اور اس کے منع کردہ کاموں سے بچا جائے۔

رسول اللہ ﷺ نے جادو ٹونے کا علاج اللہ کی پناہ میں آنا بتایا ہے۔

صحیح بخاری میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''جو سوتے وقت آیت الکرسی پڑھتا ہے اس پر اللہ کی طرف سے ایک حفاظت کرنے والا مقرر ہو جاتا ہے اور صبح تک شیطان اس کے قریب نہیں آتا۔''[1] سنن میں ہے کہ آپ ﷺ اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو درج ذیل کلمات سکھائے تھے: «أعوذُ بِكَلِماتِ اللّٰهِ التَّامَّاتِ مِنْ غَضَبِهِ وعِقابِهِ وشَرِّ عِبادِهِ ومِنْ هَمَزاتِ الشَّيَاطِيْنِ وَأَنْ يَّحْضُرُوْنِ»[2]

جب آپ ﷺ کے پاس شیاطین آگ کا شعلہ لے کر آئے تو آپ ﷺ کو مندرجہ ذیل کلمات کے ذریعے اللہ کی پناہ طلب کرنے کا حکم دیا گیا:

«أَعُوْذُ بِكَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّامَّاتِ الَّتِيْ لَا يُجَاوِزُهُنَّ بَرٌّ وَلَا فَاجِرٌ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ وَذَرَأَ، وَمِنْ شَرِّ مَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَاءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيْهَا وَمِنْ شَرِّ مَا ذَرَأَ فِيْ الْأَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمِنْ فِتَنِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمِنْ شَرِّ كُلِّ طَارِقٍ إِلَّا طَارِقاً يَطْرُقُ بِخَيْرٍ يَا رَحْمَانُ»[3]

علمائے کرام نے صبح، شام اور سونے کے اذکار، خوف کے وقت کی دعائیں اور اس جیسے دیگر موثر اسباب کتابوں میں جمع کر دیے ہیں۔ جو اس راہ پر چلتا ہے وہ اللہ کے ان اولیا کے راستے کا مسافر ہوتا ہے جو خوف اور حزن سے آزاد ہوتے ہیں، لیکن جو شرک، جادوگری اور شیطانی راستے اختیار کرتا ہے وہ دنیا اور آخرت میں نقصان اٹھاتا ہے، اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے تحریف کرنے والے اہل کتاب کی مذمت میں کہا ہے:

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣١٠١)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٨٩٣) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٥٢٧) صحيح الجامع (٧٠١)

[3] موطأ (١٠) یہ روایت مرسل ہے۔ علامہ ہیثمی رحمہ اللہ نے مجمع الزوائد (١٠/١٢٩، ١٣٠) میں کہا ہے کہ اسے امام طبرانی رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے، اس کی سند میں سید بن واضح راوی ہے جسے کئی ایک نے ثقہ اور ایک جماعت نے ضعیف کہا ہے اور یہی حال حسن بن عمری راوی ہے، جب کہ باقی رجال صحیح والے رجال ہیں۔

﴿ وَلَمَّا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ كَاَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴾ [البقرة: ١٠١]

”اور جب ان کے پاس اللہ کی طرف سے ایک رسول اس کی تصدیق کرنے والا آیا جو ان کے پاس ہے تو ان لوگوں میں سے ایک گروہ نے، جنھیں کتاب دی گئی تھی، اللہ کی کتاب کو اپنی پیٹھوں کے پیچھے پھینک دیا، جیسے وہ نہیں جانتے۔“

اگر کسی انسان کے سامنے عدمِ علم کی بنا پر جنوں کی کیفیت اور ان کی بات چیت کی حقیقت واضح نہ ہو تو یہ علاحدہ بات ہے، لیکن محض اس بنا پر ان کے وجود کا انکار نہیں کیا جا سکتا، کیوں کہ کتاب وسنت کے دلائل کے علاوہ بھی بہت سے ایسے شواہد ہیں جو ان کا وجود ثابت کرتے ہیں۔ کئی لوگوں نے جنوں کو دیکھا ہے، کئی لوگوں نے ان سے بات چیت بھی کی ہے، بلکہ بہت سے لوگ جنوں کو قابو میں کر لیتے ہیں اور ان سے کام بھی لیتے ہیں، ان کو قابو کرنے والوں میں نیک لوگ بھی ہوتے ہیں اور بد بھی۔

اگر میں اپنے ساتھ اور اپنے ساتھیوں اور دوسرے لوگوں کے ساتھ پیش آنے والے ایسے واقعات کا ذکر کروں تو بات لمبی ہو جائے گی، نیز علمی جوابوں میں ان باتوں پر اعتماد کیا جاتا ہے جو جواب دینے والے اور تمام لوگوں میں مشترک ہوں، جواب دینے والے کے علم کے ساتھ خاص نہ ہوں، إلا یہ کہ جواب دینے والا ایسا شخص ہو جس کی صداقت پر اعتماد ہو۔ واللہ أعلم [1]

شدتِ تکلیف سے رونا اور صبر

سوال ایک بیمار آدمی شدتِ تکلیف کی وجہ سے روتا ہے اور اللہ سے فریاد کرتا ہے، کیا اس کا رونا دھونا اور فریاد کرنا صبر کے منافی ہے؟

جواب اللہ سے دعا اور فریاد کرنا اور اس کے سامنے اپنا شکوہ رکھنا، صبر کے منافی نہیں۔ جو شکوہ صبر کے منافی ہے وہ مخلوق کے سامنے ہے، یعقوب علیہ السلام نے کہا تھا: ﴿ فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ ﴾ اور یہ بھی کہا: ﴿ قَالَ اِنَّمَآ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَحُزْنِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ﴾ [یوسف: ٨٦] .

طاؤس سے منقول ہے کہ وہ مریض کا رونا مکروہ سمجھتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ شکوہ ہے۔ یہ بات امام احمد بن حنبل کو ان کے مرض الموت میں بتائی گئی تو انھوں نے اپنے منہ سے کوئی آواز نہ نکالی، یہاں تک کہ وہ اپنے خالق سے جا

[1] مجموع الفتاویٰ (٢٤/٢٧٦-٢٨٢)

ملے۔ سری سقطی سے منقول ہے کہ مریض کا آہ کرنا اللہ کا ذکر ہے، یہ اس وقت ہے جب اللہ اور اس کے درمیان ہو۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انھوں نے فجر کی نماز میں یہ آیت تلاوت کی: ﴿قَالَ إِنَّمَآ أَشْكُوا۟ بَثِّى وَحُزْنِىٓ إِلَى ٱللَّهِ﴾ پھر زار و قطار رونا شروع کر دیا اور آپ کے رونے کی آواز آخری صفوں تک سنی گئی۔ تو مریض کا رونا اور خشیتِ الٰہی کی وجہ سے گریہ زاری کرنا، اللہ کے سامنے گڑگڑانا اور اس کے سامنے اپنا شکوہ رکھنا اچھا عمل ہے، لیکن جو مکروہ کام ہو اس کو مکروہ ہی سمجھنا چاہیے۔ واللہ أعلم[1]

بیمار کا صحت مند کے ساتھ رہنا

سوال ایک بیمار آدمی کسی گھر یا جگہ میں صحت مند افراد کے درمیان رہ رہا ہے، لیکن ان میں سے کچھ کہتے ہیں کہ ہم تمھارے ساتھ نہیں رہ سکتے اور تجھے بھی صحت مندوں کے درمیان نہیں رہنا چاہیے کیا اس کو نکالنا جائز ہے؟

جواب ہاں، اس کو صحت مند لوگوں کے درمیان رہنے سے روکا جا سکتا ہے۔ نبی اکرم ﷺ کا فرمان ہے: ''بیمار اونٹوں کا مالک اپنے اونٹوں کو صحت مند اونٹوں کے مالک کے پاس نہ لائے۔''[2] اس حدیث میں آپ ﷺ نے بیمار اونٹوں کے مالک کو اپنے اونٹوں کو صحت مند اونٹوں کے پاس لانے اور دونوں کو ایک ہی گھاٹ سے پانی پلانے سے منع کیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ ﷺ کا یہ فرمان بھی ہے: «لا عَدْوَى وَلا طِيَرَةَ»[3] ''کوئی بیماری متعدی نہیں ہوتی اور نحوست بھی اپنا وجود نہیں رکھتی۔'' اسی طرح یہ بھی مروی ہے کہ ایک مجذوم (کوڑھ زدہ) بیعت کے لیے آیا تو آپ ﷺ نے اس کو پیغام بھیجا کہ میں نے تجھ سے بیعت لے لی ہے، لیکن اس کو مدینے میں داخل ہونے کی اجازت نہ دی۔[4]

عیالدار انسان کے سفر کا حکم

سوال عیالدار انسان کے سفر کا کیا حکم ہے؟

جواب اگر عیالدار اور گھر بار والے انسان کا سفر اس کے اہلِ خانہ کے لیے نقصان کا باعث ہو تو اس کو سفر نہیں کرنا چاہیے، رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۲۸۳/۲٤)

[2] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۲۲۲۱)

[3] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٥٤۳۷) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۲۲۲۰، ۲۲۲۲)

[4] مجموع الفتاویٰ (۲۸٤/۲٤)

«كَفَى بِالْمَرْءِ إِثْماً أَنْ يُّضَيِّعَ مَنْ يَّقُوتُ »[1]

''انسان کے گناہ گار ہونے کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ ان کو ضائع کر دے جن کی روٹی روزی کا ذمے دار ہو۔''

چاہے وہ ان کو خرچہ کم دے کر نقصان پہنچائے یا کسی دوسری کمزوری کی وجہ سے۔ اس طرح کے انسان کا سفر جائز نہیں۔ اگر ان کو اس کے سفر سے کوئی نقصان نہ ہو، لیکن تکلیف ہو اور وہ اس کی کمی محسوس کریں تو اگر اس کے سفر کا کوئی بڑا فائدہ اور ثواب نہ ہو تو پھر اس کو گھر ہی رہنا چاہیے۔ یہ اس وقت ہے جب سفر مشروع اور جائز ہو اور اس کی نیت بھی درست ہو۔

اگر کوئی شخص محض وقت گزاری اور پریشانیوں سے جان چھڑانے کے لیے سفر پر نکلتا ہے تو اس کو گھر میں رہ کر اللہ کی عبادت کرنی چاہیے۔ تاہم ایسے انسان کو اپنے خاص نفسیاتی اور معاشرتی حالات کے تحت اہلِ علم سے مشورہ کرنا چاہیے اور جو اس کے لیے زیادہ مفید اور محفوظ راہ ہو وہ اختیار کرنی چاہیے، کیوں کہ ان جیسے امور میں ہر ایک کے حالات دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ واللہ أعلم[2]

مختلف ایام کو منحوس سمجھنے کے عقیدے کی تردید

سوال مختلف دنوں اور راتوں کی نحوست کے متعلق دین کی رائے کیا ہے؟ مثلاً: کچھ لوگ بدھ کے روز سفر کرنا ناپسند کرتے ہیں، کچھ ہفتے کو، کچھ ان دنوں میں کپڑے سینا مکروہ سمجھتے ہیں، اسی طرح کیا کسی رات بیوی سے مجامعت کرنا بھی مکروہ ہے کہ نہیں؟

جواب الحمد للہ. یہ سب باطل اور بے کار باتیں ہیں، ان کی کوئی دلیل نہیں۔ آدمی جب اللہ سے استخارہ کر کے جائز کام کرنا چاہتا ہے تو وہ کسی بھی وقت میں، جب اس کے لیے آسانی ہو، وہ کام کر سکتا ہے۔ کسی بھی دن میں کپڑے سینے یا کپڑا بننے جیسے کام مکروہ نہیں۔ اسی طرح کسی دن یا رات میں مجامعت بھی مکروہ نہیں۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نحوست پکڑنے سے منع کیا ہے، حضرت معاویہ بن حکم سلمی کہتے ہیں کہ میں نے رسول اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: ہمارے ہاں کچھ لوگ کاہنوں کے پاس جاتے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تو ان کے پاس مت جاؤ'' میں نے کہا: ہمارے کچھ لوگ نحوست پکڑتے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یہ چیز انسان اپنے دل میں پاتا ہے،

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٦٩٢) صحيح الجامع، رقم الحديث (٤٤٨١)

[2] مجموع الفتاوىٰ (٢٨/٢٨)

لیکن یہ تم کو نہ روکے۔''[1] اگر اس بات سے ممانعت ہے کہ نحوست انسان کے عزم کی راہ میں رکاوٹ نہ بنے تو دن اور رات کی کیا اہمیت رہ جاتی ہے؟

البتہ جمعرات، ہفتے اور سوموار کو سفر کرنا مستحب ہے، لیکن دیگر ایام میں بھی ممانعت نہیں۔ جمعے کے دن کے سفر میں علما کا اختلاف ہے، خاص طور پر جب یہ خدشہ ہو کہ سفر کی وجہ سے جمعہ نہیں پڑھا جا سکے گا۔ واللہ أعلم[2]

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر

سوال امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی اہمیت اور حقیقت تفصیل سے بیان کیجیے۔

جواب امر بالمعروف اور نہی عن المنکر، یعنی اچھائی کا حکم دینا اور برائی سے منع کرنا دین کا اہم جزو ہے، جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے کتابیں نازل کیں اور انبیا مبعوث کیے۔

رسالت دو امور پر مبنی ہے، ایک اِخبار یعنی خبر دینا اور دوسری اِنشا، یعنی امر نہی اور اباحت۔

اِخبار یعنی خبر رسانی میں اللہ تعالیٰ اپنی ذات کے متعلق خبر دیتے ہیں اور اپنی مخلوق، یعنی گزرے ہوئے لوگوں کے متعلق۔ اور اِنشا حکم دینے، منع کرنے اور چیزوں کی اباحت بیان کرنے پر مشتمل ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں احکام کو انشا کہا جاتا ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے: ''﴿ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ﴾ ایک تہائی قرآن کے برابر ہے۔'' کیوں کہ قرآن کے بنیادی مضامین تین ہیں: ایک واقعات، دوسرے توحید اور تیسرے احکام۔ سورت اخلاص چونکہ توحید کے مضمون پر مشتمل ہے، اس طرح وہ قرآن کے ایک تہائی حصے کی نمایندگی کرتی ہے۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ہمارے نبی حضرت محمد ﷺ کی صفات بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے:

﴿ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ ﴾ [الأعراف: ۱۵۷]

''جو انھیں نیکی کا حکم دیتا ہے اور انھیں برائی سے روکتا ہے اور ان کے لیے پاکیزہ چیزیں حلال کرتا ہے اور ان پر ناپاک چیزیں حرام کرتا ہے۔''

اس آیتِ کریمہ میں رسول اللہ ﷺ کی کمالِ رسالت کو بیان کیا گیا ہے، کیوں کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے آپ ﷺ ہی کی زبانِ اقدس سے ہر اچھائی کا حکم، ہر برائی سے منع، ہر پاکیزہ چیز حلال اور ہر خبیث اور گندی چیز حرام قرار دی ہے۔

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٣٧)

[2] مجموع الفتاویٰ (٢٨/٢٩)

اسی مفہوم کو رسول اللہ ﷺ کی اس حدیث میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

«إِنَّمَا بُعِثْتُ لِأُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْأَخْلَاقِ »[1]

''میں مکارم الاخلاق، یعنی اعلیٰ اخلاقیات کی تکمیل کے لیے مبعوث ہوا ہوں۔''

ایک متفق علیہ حدیث میں ہے: ''میری اور انبیائے کرام علیہم السلام کی مثال اس شخص کی مثال ہے، جس نے ایک گھر بنایا اور اس کو ہر لحاظ سے مکمل کیا، مگر ایک اینٹ کی جگہ چھوڑ دی، لوگ اس عمارت کی رعنائی پر تعجب کا اظہار کرتے اور کہتے: اگر یہ اینٹ کی جگہ خالی نہ رہتی! تو میں وہ اینٹ ہوں۔''[2]

اس طرح اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپ ﷺ کو مبعوث کر کے اپنے دین کی تکمیل کی جو امر بالمعروف ونہی عن المنکر ہر پاکیزہ کو حلال اور ہر خبیث کو حرام قرار دینے پر مشتمل ہے۔ آپ ﷺ سے پہلے انبیا اپنی امتوں پر کچھ پاکیزہ چیزیں بھی حرام کرتے تھے، جس طرح اللہ رب العزت نے بیان فرمایا ہے:

﴿ فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبَٰتٍ أُحِلَّتْ لَهُمْ ﴾ [النساء: ١٦٠]

''تو جو لوگ یہودی بن گئے ان کے بڑے ظلم ہی کی وجہ سے ہم نے ان پر کئی پاکیزہ چیزیں حرام کر دیں، جو ان کے لیے حلال کی گئیں تھیں۔''

اور شاید ان پر ساری خبیث چیزیں بھی حرام نہیں ہوتی تھیں، اللہ تعالیٰ نے بیان کیا ہے:

﴿ كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِيٓ إِسْرَٰٓءِيلَ إِلَّا مَا حَرَّمَ إِسْرَٰٓءِيلُ عَلَىٰ نَفْسِهِۦ مِن قَبْلِ أَن تُنَزَّلَ التَّوْرَىٰةُ ﴾ [آل عمران: ٩٣]

''کھانے کی ہر چیز بنی اسرائیل کے لیے حلال تھی مگر جو اسرائیل نے اپنے آپ پر حرام کر لی، اس سے پہلے کہ تورات اتاری جائے۔''

خبائث اور گندی چیزوں کی تحریم ''نہی عن المنکر'' کے مفہوم میں مندرج ہے۔ اسی طرح طیبات کو حلال قرار دینا ''امر بالمعروف'' کے معنی میں داخل ہے، کیوں کہ اللہ نے ''طیبات'' یعنی پاکیزہ چیزوں کو حرام قرار دینے سے منع کیا ہے۔ اسی طرح تمام معروفات کا حکم اور تمام منکرات سے روکنا بھی اس رسول کے ہاتھوں تکمیل پذیر ہوا، جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے ان تمام مکارم الاخلاق کی تکمیل کی ہے جو معروف کے دائرے میں داخل ہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

---

[1] مسند أحمد (٣٨١/٢) السلسلة الصحيحة (٤٥)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٣٤١، ٣٣٤٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٢٨٦، ٢٢٨٧)

﴿ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلٰمَ دِيْنًا ﴾ [المائدۃ: ۳]

''آج میں نے تمھارے لیے تمھارا دین کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمھارے لیے اسلام کو دین کی حیثیت سے پسند کر لیا۔''

اس طرح اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ہمارے لیے دین مکمل کر دیا، اپنی نعمت پوری کر دی اور اسلام کو ہمارے لیے بطور دین پسند کیا۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے جو صفت اپنے نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان کی ہے، وہی صفت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کی بھی بیان کی ہے، ارشاد ہے:

﴿ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ﴾

[آل عمران: ۱۱۰]

''تم سب سے بہتر امت چلے آئے ہو جو لوگوں کے لیے نکالی گئی، تم نیکی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے منع کرتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔''

دوسری جگہ فرمایا:

﴿وَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ﴾ [التوبۃ: ۷۱]

''اور مومن مرد اور مومن عورتیں، ان کے بعض بعض کے دوست ہیں، وہ نیکی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے منع کرتے ہیں۔''

اسی بنا پر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا تھا: ''تم لوگوں میں سب سے زیادہ خیر اندیش ہو، تم ان کو بیڑیوں میں باندھ کر لاؤ گے اور جنت میں داخل کر کے چھوڑو گے۔''

اس آیتِ کریمہ میں اللہ رب العزت نے بیان فرمایا ہے کہ یہ امت لوگوں کے لیے سب سے بہتر امت ہے، کیوں کہ یہ لوگوں کے لیے سب سے زیادہ فائدہ منداور ان پر سب سے زیادہ احسان کرنے والی ہے۔ یہ امت صفت اور قدر کے پہلو سے لوگوں کو نیکی کا حکم دے کر اور برائی سے منع کر کے تکمیل کے مدارج طے کرتی ہے۔ انھوں نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضے کو قائم کرنے کے لیے اپنی جانوں اور مال کے نذرانے پیش کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا اور یہی لوگوں کا سب سے بڑا فائدہ اور کمالِ منفعت ہے۔

باقی امتوں نے ہر ایک کو نیکی کا حکم نہیں دیا، ہر ایک کو برائی سے منع نہیں کیا اور اس مقصد کے لیے جہاد بھی

نہیں کیا، بلکہ کچھ امتیں ایسی گزری ہیں جنھوں نے مطلقاً جہاد نہیں کیا۔ بنی اسرائیل کی طرح جنھوں نے جہاد کیا بھی تو عموماً اپنی زمینوں کے دفاع کے لیے جس طرح کوئی حملہ آور ظالم کا ہاتھ روکنے کے لیے لڑتا ہے، دعوت اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لیے نہیں کیا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا:

﴿ يٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِيْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَرْتَدُّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ ﴿21﴾ قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِنَّ فِيْهَا قَوْمًا جَبَّارِيْنَ وَاِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَا حَتّٰى يَخْرُجُوْا مِنْهَا فَاِنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا فَاِنَّا دٰخِلُوْنَ ﴿22﴾ قَالَ رَجُلٰنِ مِنَ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمَا ادْخُلُوْا عَلَيْهِمُ الْبَابَ فَاِذَا دَخَلْتُمُوْهُ فَاِنَّكُمْ غٰلِبُوْنَ ۚ وَعَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿23﴾ قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَآ اَبَدًا مَّا دَامُوْا فِيْهَا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ﴿24﴾ ﴾

[المائدة: ٢١۔٢٤]

اے میری قوم! اس مقدس زمین میں داخل ہو جاؤ جو اس نے تمھارے لیے لکھ دی ہے اور اپنی پیٹھوں پر نہ پھر جاؤ، ورنہ خسارہ اٹھانے والے ہو کر لوٹو گے۔ انھوں نے کہا اے موسیٰ! بے شک اس میں ایک بہت زبردست قوم ہے اور بے شک ہم ہرگز اس میں داخل نہ ہوں گے، یہاں تک کہ وہ اس سے نکل جائیں، پس اگر وہ اس سے نکل جائیں تو ہم ضرور داخل ہونے والے ہیں۔ دو آدمیوں نے کہا، جو ان لوگوں میں سے تھے جو ڈرتے تھے، ان دونوں پر اللہ نے انعام کیا تھا، تم ان پر دروازے میں داخل ہو جاؤ، پھر جب تم اس میں داخل ہو گئے تو یقیناً تم غالب ہو اور اللہ ہی پر پس بھروسا کرو، اگر تم مومن ہو۔ انھوں نے کہا اے موسیٰ! بے شک ہم ہرگز اس میں کبھی داخل نہ ہوں گے جب تک وہ اس میں موجود ہیں، سو تو اور تیرا رب جاؤ، پس دونوں لڑو، بے شک ہم یہیں بیٹھنے والے ہیں۔"

دوسری جگہ فرمایا:

﴿ اَلَمْ تَرَ اِلَى الْمَلَاِ مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى ۘ اِذْ قَالُوْا لِنَبِيٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوْا ؕ قَالُوْا وَمَا لَنَآ اَلَّا نُقَاتِلَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَاَبْنَآئِنَا ؕ ﴾ [البقرة: ٢٤٦]

"کیا تو نے موسیٰ کے بعد بنی اسرائیل کے سرداروں کو نہیں دیکھا، جب انھوں نے اپنے ایک نبی سے کہا ہمارے لیے ایک بادشاہ مقرر کر کہ ہم اللہ کے راستے میں لڑیں۔ اس نے کہا یقیناً تم قریب ہو کہ اگر تم پر لڑنا فرض کر دیا جائے تو تم نہ لڑو۔ انھوں نے کہا اور ہمیں کیا ہے کہ ہم اللہ کے راستے میں نہ لڑیں، حالانکہ ہمیں ہمارے گھروں اور ہمارے بیٹوں سے نکال دیا گیا ہے۔"

انھوں نے لڑائی کی یہ علت بیان کی کہ ان کو ان کے گھروں اور بچوں سے دور کر دیا گیا، اس کے باوجود وہ اس حکم پر عمل کرنے سے کتراتے تھے۔ اسی لیے اللہ نے ان کے لیے مالِ غنیمت حلال نہیں کیا تھا اور لونڈیوں سے مستفید ہونا بھی ان کی شریعت میں نہیں تھا، حالانکہ ہماری امت سے پہلے سب سے زیادہ ایمان لانے والے بھی بنی اسرائیل ہی سے تھے، جس طرح صحیحین میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔[1]

امتِ اسلام کا اجماع بھی اسی وجہ سے حجت کا درجہ رکھتا ہے۔ اللہ رب العزت نے بتایا ہے کہ یہ ہر نیکی کا حکم دیتے ہیں اور ہر برائی سے منع کرتے ہیں، اگر یہ امت کسی حرام کی اباحت، کسی واجب کو ساقط کرنے، کسی حلال کو حرام کرنے، یا اللہ کی طرف سے کوئی غلط اور باطل بات نقل کرنے پر اتفاق کر لے، تو یہ برائی کا حکم دینے اور اچھائی، اچھی بات اور نیک عمل سے روکنے والی ہوگی، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے متصف نہیں ہوگی، بلکہ اس آیت سے یہ مفہوم بھی نکلتا ہے کہ امت جس کام کا حکم نہ دے وہ معروف نہیں ہو سکتا اور جس سے منع نہ کرے وہ منکر نہیں ہو سکتا، کیوں کہ ہر معروف کام کا حکم دینا اور ہر برائی سے روکنا اس کے فرائض میں شامل ہے۔ اس لیے ایسا ممکن ہی نہیں کہ ساری کی ساری امت برائی کا حکم دے اور ساری کی ساری امت معروف سے روکے۔ اللہ تعالیٰ نے امت کی یہ صفت بیان کرتے ہوئے یہ بھی بیان کیا ہے کہ یہ فریضہ فرضِ کفایہ کی حیثیت رکھتا ہے، ارشاد ہے:

﴿ وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ أُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَأُولَٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴾ [آل عمران: ١٠٤]

”اور لازم ہے کہ تم میں ایک ایسی جماعت ہو جو نیکی کی طرف دعوت دیں اور اچھے کام کا حکم دیں اور برائی سے منع کریں اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔“

یہ بھی یاد رہے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ یہ امت امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دے گی تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ حکم دینے والے کا حکم اور منع کرنے والے کا منع کرنا دنیا کے ہر مکلّف تک پہنچے، یہ تو تبلیغِ رسالت کی شرط بھی نہیں تو اس کے توابع اور فروع کی شرط کیسے ہو سکتی ہے؟ بلکہ شرط یہ ہے کہ مکلّف اس کو اپنے تک پہنچنا ممکن بنائیں، اگر وہ سستی کریں اور اس تک پہنچنے کی کوشش نہ کریں، جب کہ جس کی ذمے داری ہے وہ اس کو ادا کر رہا ہو تو ایسی صورت میں یہ مکلفوں کی طرف سے تفریط اور سستی ہے، دعوت پہنچانے والے کی نہیں۔

اسی طرح امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہر ایک پر واجب اور فرضِ عین نہیں، بلکہ فرضِ کفایہ ہے۔

قرآن سے یہی ثابت ہوتا ہے، اگر جہاد اس کا تتمہ اور اس کو نافذ کرنے کی راہ میں رکاوٹ دور کرنے کے

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٣٧٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٢٠)

لیے کیا جاتا ہے تو جہاد کا حکم بھی یہی ہے۔ اگر کوئی بھی اس کو قائم نہ کرے تو ہر کوئی حسبِ استطاعت گناہ گار ہو گا، کیوں کہ یہ ہر انسان پر اس کی استطاعت کے مطابق ہی واجب ہے، رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

《 مَنْ رَأَى مِنْكُمْ مُنْكَراً فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهِ، فَإِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهِ، فَإِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهِ وَذَلِكَ أَضْعَفُ الْإِيمَانِ 》[1]

''تم میں سے جو بھی کوئی برائی دیکھے تو اس کو اپنے ہاتھ سے بدلے، اگر طاقت نہ رکھتا ہو تو زبان سے، اگر اس کی طاقت بھی نہ رکھتا ہو تو دل سے، یہ کمزور ترین ایمان ہے۔''

اگر یہ اس کی اہمیت ہے تو معلوم ہوا کہ امر بالمعروف، نہی عن المنکر اور جہاد کے ذریعے اس کو پورا کرنا سب سے بڑا معروف اور نیکی ہے جس کا ہمیں حکم دیا گیا ہے۔

اگر یہ عظیم ترین واجبات اور مستحبات میں شمار ہوتا ہے تو اس میں مصلحت کا مفسدت پر راجح ہونا ضروری ہے، کیوں کہ رسولوں کی بعثت اور کتابوں کے نزول کا یہی مقصد ہے۔ اللہ تعالیٰ فساد پسند نہیں کرتا، بلکہ اللہ کا ہر حکم صلاح اور بہتری پر مشتمل ہے۔ اس نے جابجا صلاح، صلاح پسندوں، ایمان والوں اور صالح عمل کرنے والوں کی تعریف کی ہے اور فساد کرنے والوں کی مذمت کی ہے۔

اس لیے کسی کا کیا خوب کہنا ہے: تمھارا ''امر بالمعروف اور نہی عن المنکر'' منکر نہیں بننا چاہیے۔ اگر امر و نہی کی مفسدت اس کی مصلحت سے بڑی اور سنگین تر ہو تو یہ اللہ کا حکم نہیں۔ مومن کو چاہیے کہ اللہ کے بندوں کے بارے میں اللہ سے ڈرتا رہے، ان کو سیدھی راہ پر چلانا اس کی ذمے داری نہیں، قرآن میں بھی یہی فرمایا گیا ہے:

﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ ﴾ [المائدۃ: ١٠٥]

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تم پر اپنی جانوں کا بچاؤ لازم ہے، تمھیں وہ شخص نقصان نہیں پہنچائے گا جو گمراہ ہے، جب تم ہدایت پا چکے۔''

اِہتدا یعنی ہدایت سے سرفراز ہونا واجب ادا کرنے سے حاصل ہو جاتا ہے، اگر ایک مسلمان دیگر واجبات اور فرائض کی طرح امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ بھی ادا کرتا ہے تو اس کے بعد گمراہوں کی گمراہی اس کے لیے چنداں ضرر رساں نہیں ہوتی۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کبھی دل سے ہوتا ہے، کبھی زبان سے اور کبھی ہاتھ سے۔ دل سے ہر حال میں فرض اور واجب ہے، کیوں کہ اس پر کوئی ضرر اور نقصان مرتب نہیں ہوتا۔ جو دل سے بھی نہ کر سکے تو وہ مومن نہیں،

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٤٩)

جس طرح رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ یہ ادنیٰ یا کمزور ترین ایمان ہے۔ دوسری جگہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اس کے بعد رائی کے ایک دانے کے برابر بھی ایمان نہیں۔''[1]

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا: زندوں میں مردہ کون ہے؟ آپ نے فرمایا: ''جو معروف کو معروف اور منکر کو منکر نہیں جانتا۔'' حضرت حذیفہ کی حدیث میں جس فتنے میں مبتلا ہونے کا ذکر ہوا ہے اس سے مراد بھی یہی ہے۔ یہاں دو فریق غلطی کرتے ہیں:

ایک اس آیت کی تاویل کرتے ہوئے اور اس کو بنیاد بنا کر امر و نہی کا فریضہ ہی چھوڑ بیٹھتا ہے، جس طرح حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے ایک خطبے میں کہا تھا: تم یہ آیت: ﴿عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ﴾ پڑھتے ہو اور اس کو اس کی جگہ پر نہیں رکھتے، میں نے نبی اکرم ﷺ سے سنا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''لوگ جب منکر دیکھیں مگر اسے تبدیل نہ کریں تو قریب ہے کہ اللہ ان کو عمومی سزا میں مبتلا کر دے۔''[2]

دوسرا فریق سمجھ داری، فقاہت، حلم، صبر، مصلحت اندیشی اور استطاعت و عدمِ استطاعت کو مدِ نظر رکھے بغیر مطلقاً زبان یا ہاتھ سے اس فریضے پر عمل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ حضرت ابوثعلبہ خشنی رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے:

''میں نے اس آیت: ﴿عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ ...﴾ کے بارے میں رسول اللہ ﷺ سے پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''ایک دوسرے کو معروف کا حکم دو اور منکر سے روکو، جب تو بخیلی کو دیکھے کہ اس کی بات مانی جائے، خواہش کو دیکھے کہ اس کی پیروی کی جائے، دنیا کو دیکھے کہ اسے ترجیح دی جائے، ہر رائے والا اپنی رائے کو پسند کرے اور تو معاملے کو دیکھے کہ تیرا اس پر کوئی اختیار نہ ہو تو تم پر تمھاری جان کا بچاؤ لازم ہے۔ عوام کے معاملے کی فکر چھوڑ دے، اس کے پیچھے ایسے صبر کے ایام ہوں گے کہ ان میں صبر کرنا انگارے پر بیٹھنے کی طرح ہو گا، ان صبر کے ایام میں عمل کرنے والے کو وہی عمل کرنے والے پچاس آدمیوں کے ثواب کے برابر ثواب ہو گا۔''[3]

یہ فریق امر و نہی پر عمل کرتے ہوئے سمجھتا ہے کہ وہ اس میں اللہ اور اس کے رسول کی فرماں برداری کر رہا ہے، مگر حقیقت میں وہ اس کی حدود سے تجاوز کر رہا ہوتا ہے، جس طرح خارجیوں، معتزلیوں اور رافضیوں جیسے بہت

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٠)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٣٣٨) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢١٦٨) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٠٠٥) صحيح الجامع (١٩٧٣، ١٩٧٤)

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٣٤١) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٠٥٨) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٠١٤) السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٤٩٤)

سے بدعت پرست لوگ اس کے لیے کھڑے ہوتے ہیں، حالانکہ وہ امر و نہی اور جہاد کے معاملات میں غلطی اور غلط فہمی کا شکار ہوتے ہیں۔ اس طرح ان کی حکمت سے خالی تبلیغ اور امر و نہی کو قائم کرنے کا فائدہ کم اور فساد و نقصان زیادہ ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ائمہ یعنی حکام کے جور و ظلم پر صبر کرنے اور اس وقت تک ان کے خلاف ہتھیار اٹھانے سے منع کیا ہے، جب تک وہ اقامتِ صلاۃ کا فریضہ ادا کرتے رہیں۔ آپ ﷺ کا فرمان ہے:

«أَدُّوا إِلَيْهِمْ حُقُوقَهُمْ، وَسَلُوا اللّٰهَ حُقُوقَكُمْ» [1]

''ان کے حقوق ادا کرو اور اپنے حقوق اللہ سے مانگو۔''

بنا بریں جماعت کا دامن تھامے رکھنا، حکام کے خلاف ہتھیار نہ اٹھانا اور پرفتن حالات میں لڑائی سے دور رہنا اہلِ سنت و الجماعت کے اصول میں داخل ہے۔ ائمہ یعنی حکام کے خلاف لڑنا اور ہتھیار اٹھانا معتزلہ جیسے خواہش پرست فرقوں کے مذہب کا بنیادی قاعدہ ہے۔ ان کے اصولِ مذہب پانچ ہیں:

① توحید ② عدل ③ دو درجوں کے درمیان درجہ۔
④ وعید کا نفاذ۔ ⑤ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر۔

ان کے نزدیک توحید سے مراد صفات کی نفی، عدل سے مراد تقدیر کی تکذیب، دو درجوں کے درمیانی درجے سے مراد کبیرہ گناہوں کا ارتکاب کرنے والوں کا ٹھکانا اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ایک حصہ ائمہ و حکام سے لڑنا بھی ہے۔

ائمہ کے خلاف ہتھیار اٹھانے کے مسئلے پر بحث تو بہت سی جگہوں پر ہو گزری ہے، لیکن اس سب کی اصل اور مغز اس عام قاعدے کے دائرے میں داخل ہے کہ اگر مصالح اور مفاسد یا اچھائیوں اور برائیوں کا تعارض یا تصادم ہو جائے تو اس تصادم کی صورت میں مصلحتِ راجحہ کو ترجیح دی جائے گی۔ امر و نہی اگر مصلحت کے حصول اور مفسدت دور کرنے پر مشتمل ہو تو اس کے معارض کو دیکھا جائے گا، اگر اس کی وجہ سے مصلحت زیادہ چھوٹ رہی ہو یا مفسدت زیادہ واقع ہو رہی ہو تو پھر سمجھ لیجیے وہ مامور نہیں، یعنی اسے کرنے کا حکم نہیں دیا گیا، بلکہ اگر اس کا حکم دینے کی وجہ سے مصلحت سے زیادہ مفسدت رونما ہو رہی ہو تو پھر وہ حرام ہو جاتا ہے، یعنی اس کا حکم دینا حرام ہو جاتا ہے، لیکن یاد رہے کہ مصالح اور مفاسد کی مقدار کا اندازہ اور اعتبار کرنے کے لیے شریعت کی میزان پر پرکھنا ضروری ہے۔ جب انسان کے لیے نصوص اور قرآن و حدیث کے صریح دلائل کی پیروی کرنا ممکن ہو تو پھر ان سے گریز نہ کرے۔ اگر ایسا ممکن نہ ہو تو پھر اشباہ و نظائر کی معرفت حاصل کرنے کے لیے اجتہاد کرے، لیکن جو انسان نصوص سے باخبر ہو اور احکام پر ان کی دلالت پر گہری نظر رکھتا ہو، وہ کم ہی ان کی کمی کی شکایت کرتا ہے۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٦٤٤)

فلہٰذا اگر کوئی شخص یا گروہ معروف اور منکر کو اس طرح یکجا کر دے کہ ان دونوں کے درمیان فرق ملحوظ نہ رکھ سکے، بلکہ دونوں کو اکٹھا کرے، یا اکٹھا چھوڑے تو اس کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام نہیں دینا چاہیے، بلکہ دیکھے اگر معروف اور اچھائی زیادہ ہے تو حکم دے، خواہ نتیجے میں کوئی ایسا منکر وجود پذیر ہو جو اس سے ہلکا اور چھوٹا ہو اور ایسے منکر سے نہ روکے جس کے نتیجے میں اس سے کوئی بڑا معروف چھوٹ جائے، بلکہ ایسی صورت میں نہی اللہ کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے، اطاعتِ خدا اور اطاعتِ رسول کو زائل کرنے اور اچھائیوں کو ختم کرنے کی ایک کوشش ہو گی۔ اگر منکر غالب اور زیادہ ہو تو پھر اس سے روکے چاہے اس کے نتیجے میں کوئی ایسا معروف ختم ہو جائے جو اس منکر سے چھوٹا ہو، کیوں کہ ایسے معروف کا حکم دینا جو اپنے سے بڑے منکر پر مشتمل ہو، بذاتِ خود ایک منکر کام اور اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی ایک کوشش ہو گی۔ اگر مصلحت اور مفسدت میں معروف اور منکر دونوں برابر ہوں تو ایسی صورت میں حکم دیا جائے نہ منع ہی کیا جائے۔

کبھی امر مفید ہوتا ہے، کبھی نہی اور کبھی دونوں ہی مفید نہیں ہوتے۔ یہ ایسی صورت میں ہے جب معروف اور منکر ایک دوسرے کو لازم ملزوم ہوں، تاہم یہ مخصوص واقع ہونے والے امور میں ہے۔

جہاں تک نوعیت کا اعتبار ہے تو مطلقاً نیکی کا حکم دیا جائے اور مطلقاً برائی سے منع کیا جائے، ایک ہی فاعل اور ایک ہی گروہ کو معروف کا حکم دیا جائے، ان کے منکر سے روکا جائے اور اس طرح ان کے قابلِ تعریف کاموں کی تعریف اور قابلِ مذمت کاموں کی مذمت کی جائے کہ امر بالمعروف اس معروف سے زیادہ کے فقدان یا اس سے بڑی برائی کے حصول کا موجب نہ بنے اور نہی عن المنکر اس منکر سے بڑے منکر کے حصول یا اس سے زیادہ اور راجح معروف کے فقدان کا باعث نہ بنے۔

جب معاملہ مشتبہ ہو جائے تو مومن کو چاہیے کہ اس کا ابہام دور کرنے کی کوشش کرے، تا آنکہ حق اس کے سامنے روشن ہو جائے۔ علم اور نیت کے بغیر نیکی کی طرف قدم نہ بڑھائے۔ واجب کو چھوڑنا بھی نافرمانی ہے اور حرام کا ارتکاب بھی نافرمانی ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا عبداللہ بن اُبی جیسے ائمہ نفاق و فجور سے تعرض نہ کرنا بھی اسی باب سے تعلق رکھتا ہے، کیوں کہ اس کے حمایتی تھے، اس کو اس کے منکر کی نوعیت کی سزا دے کر اس کے منکر کا ازالہ کرنا اس کی قوم کو بھڑکا کر اور ان کے تعصب کو ہوا دے کر اس سے بڑے معروف کا ازالہ کرنے کے مترادف تھا کہ لوگ جب سنتے کہ محمد ﷺ نے اپنے ہی ساتھیوں کو قتل کرنا شروع کر دیا ہے تو وہ دین سے نفرت کرنے لگتے۔ یہی وجہ ہے کہ جب آپ ﷺ نے واقعہ افک کے حوالے سے لوگوں سے بات کی اور اس سے عذر خواہی کی تو اس موقع پر حضرت سعد بن معاذ نے بڑی اچھی

بات کہی، مگر اسی موقع پر حضرت سعد بن عبادہ اپنے حسنِ ایمان کے باوجود عبداللہ بن اُبی کی حمایت میں بولنے لگے۔

اصل بات یہ ہے کہ انسان معروف سے محبت کرے اور منکر سے نفرت، اس کا معروف کا ارادہ اور منکر سے کراہت اللہ کی محبت و نفرت اور اس کے شرعی ارادے اور شرعی کراہت سے ہم آہنگ ہے، لہٰذا وہ اپنی قوت اور ارادے کے مطابق اپنے محبوب کام کو کرے اور اپنے مکروہ اور قابلِ نفرت کام کو دور کرے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ کسی انسان کو اس کی وسعت اور طاقت سے زیادہ مکلّف نہیں کرتا۔ فرمانِ خداوندی ہے:

﴿ فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ ﴾ [التغابن: ١٦] ''سو اللہ سے ڈرو جتنی طاقت رکھو۔''

لیکن نیکی کے لیے دل کی محبت، برائی کے لیے نفرت اور اسی طرح نیکی کا ارادہ اور برائی کی کراہت مکمل اور پختہ ہونی چاہیے، ان میں کمی ایمان میں کمی کی موجب ہوتی ہے۔

رہا بدنی اور جسمانی فعل تو وہ انسان کی قدرت کے مطابق ہی ہوتا ہے، لیکن جب انسان کے دل کا ارادہ اور برائی کے لیے کراہت کامل ہو اور بندہ اس کے ساتھ اپنی طاقت کے مطابق بدنی قوت بھی استعمال کرے تو اس کو کامل فاعل کا ثواب ملتا ہے۔

کچھ لوگوں کی نیکی کے لیے محبت و ارادہ اور بدی سے نفرت اور کراہت اپنے نفس کی محبت اور نفرت کے حسبِ حال ہوتی ہے اور اللہ اور اس کے رسول کی محبت و نفرت کے مطابق نہیں ہوتی، یہ ہوا اور خواہشِ نفس کی ایک نوع ہے۔ اگر انسان اس کی پیروی کرے تو وہ ہوا اور خواہش کی پیروی کرنے والا ہوگا، اللہ فرماتے ہیں:

﴿ وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ ﴾ [القصص: ٥٠]

''اور اس سے بڑھ کر گمراہ کون ہے جو اللہ کی طرف سے کسی ہدایت کے بغیر اپنی خواہش کی پیروی کرے۔''

ہوا (خواہش پرستی) کی اصل نفس کی محبت اور نفرت ہے۔ اصل ہوا وہ نفس کی محبت ہو یا نفرت قابلِ ملامت نہیں، کیوں کہ یہ بسا اوقات انسان کے اختیار میں نہیں ہوتی۔ اصل قابلِ ملامت ہوائے نفس کی اتباع اور اس کے پیچھے چلنا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ﴾ [صٓ: ٢٦]

''اے داوٗد! بے شک ہم نے تجھے زمین میں خلیفہ بنایا ہے، سو تو لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کر اور خواہش کی پیروی نہ کر، ورنہ وہ تجھے اللہ کی راہ سے بھٹکا دے گی۔''

نیز فرمایا:

﴿ وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ ﴾ [القصص: ٥٠]

''اور اس سے بڑھ کر گمراہ کون ہے جو اللہ کی طرف سے کسی ہدایت کے بغیر اپنی خواہش کی پیروی کرے۔''

رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''تین چیزیں نجات دیتی ہیں: ظاہر اور باطن میں اللہ سے ڈرنا، فقیری اور امیری میں میانہ روی اختیار کرنا اور غضب و رضا میں کلمہ حق کہنا۔ تین ہلاک کرنے والی چیزیں ہیں: بخل جس کی اطاعت کی جائے، ہوا (خواہشِ نفس) جس کی پیروی کی جائے اور آدمی کا خود پسند ہونا۔''[1]

محبوب اور مبغوض کے وجود کے وقت ذوق محبت و بغض کی پیروی کرتا ہے تو جو اللہ اور اس کے رسول کی تعلیمات کے خلاف نفس کی اس محبت اور بغض کی پیروی کرتا ہے وہ اللہ کی ہدایت کے بغیر اپنی خواہش کی پیروی کرنے والا ہوتا ہے، بلکہ بعض اوقات نوبت یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ وہ اپنی ہوائے نفس کو اپنا معبود بنا لیتا ہے۔ ادیان میں اہواء اور خواہشاتِ نفس کی پیروی نفسانی اور جنسی خواہشات میں اہواء اور خواہشاتِ نفس کی پیروی سے زیادہ سنگین ہے۔ پہلی صورت اہلِ کتاب اور مشرکوں میں سے کافروں کی ہے، جس طرح اللہ تعالیٰ نے بیان کیا ہے:

﴿ فَاِنْ لَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكَ فَاعْلَمْ اَنَّمَا يَتَّبِعُوْنَ اَهْوَآءَهُمْ ۭ وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ ﴾ [القصص: ٥٠]

''پھر اگر وہ تیری بات قبول نہ کریں تو جان لے کہ وہ صرف اپنی خواہشوں کی پیروی کر رہے ہیں اور اس سے بڑھ کر گمراہ کون ہے جو اللہ کی طرف سے کسی ہدایت کے بغیر اپنی خواہش کی پیروی کرے۔''

فرمایا:

﴿ ضَرَبَ لَكُمْ مَّثَلًا مِّنْ اَنْفُسِكُمْ ۭ هَلْ لَّكُمْ مِّنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ شُرَكَآءَ فِيْ مَا رَزَقْنٰكُمْ فَاَنْتُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ تَخَافُوْنَهُمْ كَخِيْفَتِكُمْ اَنْفُسَكُمْ ۭ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝ بَلِ اتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ﴾ [الروم: ٢٨، ٢٩]

''اس نے تمھارے لیے خود تمھی میں سے ایک مثال بیان کی ہے، کیا تمھارے لیے ان (غلاموں) میں سے جن کے مالک تمھارے دائیں ہاتھ ہیں، کوئی بھی اس رزق میں شریک ہیں جو ہم نے تمھیں دیا ہے کہ تم اس میں برابر ہو، ان سے اس طرح ڈرتے ہو جس طرح تم اپنے آپ سے ڈرتے ہو۔ اسی طرح ہم ان لوگوں کے لیے کھول کر آیات بیان کرتے ہیں جو سمجھتے ہیں۔ بلکہ وہ لوگ جنھوں نے ظلم کیا وہ جانے بغیر اپنی خواہشوں کے پیچھے چل پڑے۔''

---

[1] المعجم الأوسط (٤٧/٦) صحيح الجامع، رقم الحديث (٣٠٤٥)

فرمایا:

﴿ وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ اِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ اِلَيْهِ ۗ وَاِنَّ كَثِيْرًا لَّيُضِلُّوْنَ بِاَهْوَآئِهِمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۗ ﴾ [الأنعام: ۱۱۹]

''حالانکہ بلاشبہہ اس نے تمھارے لیے وہ چیزیں کھول کر بیان کر دی ہیں جو اس نے تم پر حرام کی ہیں، مگر جس کی طرف تم مجبور کر دیے جاؤ اور بے شک بہت سے لوگ اپنی خواہشوں کے ساتھ کچھ جانے بغیر یقیناً گمراہ کرتے ہیں۔''

فرمایا:

﴿ قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ غَيْرَ الْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعُوْۤا اَهْوَآءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَاَضَلُّوْا كَثِيْرًا وَّضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ ﴾ [المائدة: ۷۷]

''کہہ دے اے اہل کتاب! اپنے دین میں ناحق حد سے نہ بڑھو اور اس قوم کی خواہشوں کے پیچھے مت چلو جو اس سے پہلے گمراہ ہو چکے اور انھوں نے بہت سوں کو گمراہ کیا اور وہ سیدھے راستے سے بھٹک گئے۔''

فرمایا:

﴿ وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ۗ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ۗ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ الَّذِيْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴾ [البقرة: ۱۲۰]

''اور تجھ سے یہودی ہرگز راضی نہ ہوں گے اور نہ نصاریٰ، یہاں تک کہ تو ان کی ملت کی پیروی کرے۔ کہہ دے بے شک اللہ کی ہدایت ہی اصل ہدایت ہے۔ اور اگر تو نے ان کی خواہشات کی پیروی کی، اس علم کے بعد جو تیرے پاس آیا ہے، تو تیرے لیے اللہ سے (چھڑانے میں) نہ کوئی دوست ہوگا اور نہ کوئی مددگار۔''

فرمایا:

﴿ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ مِّنْ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴾ [البقرة: ۱۴۵]

''اور یقیناً اگر تو نے ان کی خواہشوں کی پیروی کی، اس علم کے بعد جو تیرے پاس آیا ہے، تو بے شک تو اس وقت ضرور ظالموں سے ہوگا۔''

فرمایا:

﴿ وَاَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ ﴾ [المائدة: ۴۹]

''اور یہ کہ ان کے درمیان اس کے ساتھ فیصلہ کر جو اللہ نے نازل کیا ہے اور ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کر۔''

اسی بنا پر جو علما اور عباد کتاب وسنت کے موجب اور دائرے سے نکلتے ہیں ان کو اہلِ اہواء (خواہشاتِ نفس کی پیروی کرنے والوں) میں شمار کیا جاتا ہے۔ سلف صالحین بھی ایسے لوگوں کو اہلِ اہواء کہا کرتے تھے، کیوں کہ جو شخص علم کی پیروی نہیں کرتا، وہ اپنی ہوا اور خواہشِ نفس کی پیروی کرتا ہے اور دین کا علم اس ہدایت پر مشتمل ہے جو اللہ نے اپنے رسول کو دے کر مبعوث کیا۔ ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ ﴾ [القصص: ۵۰]

''اور اس سے بڑھ کر گمراہ کون ہے جو اللہ کی طرف سے کسی ہدایت کے بغیر اپنی خواہش کی پیروی کرے۔''

لہٰذا انسان کو اپنے حب وبغض کے اندر جھانکنا اور اپنے حب وبغض کی مقدار ماپنی چاہیے کہ کیا وہ اللہ اور اس کے رسول کے حکم کے مطابق ہے؟ یہی اللہ کی وہ ہدایت ہے جو اس نے اپنے رسول پر اتاری کہ بندہ اسی حب وبغض کا مامور ہے اور اس میں اس کو اللہ اور اس کے رسول سے آگے نہیں بڑھنا چاہیے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ﴾ [الحجرات: ۱]

''اللہ اور اس کے رسول سے آگے نہ بڑھو۔''

جو اللہ اور اس کے رسول کے حکم سے پہلے کسی چیز کے لیے اپنی محبت یا اپنے بغض کا اظہار کرتا ہے، اس میں اللہ اور اس کے رسول سے آگے بڑھنے کی ایک گونہ جرأت پائی جاتی ہے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے کہ صرف محبت یا بغض کو ہوا کہا جاتا ہے، یہ مذموم نہیں، اللہ کی ہدایت کے بغیر اس محبت یا بغض کی پیروی حرام ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ يَضِلُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌۢ ﴾ [صٓ: ۲۶]

''اور خواہش کی پیروی نہ کر، ورنہ وہ تجھے اللہ کی راہ سے بھٹکا دے گی۔ یقیناً وہ لوگ جو اللہ کی راہ سے بھٹک جاتے ہیں، ان کے لیے سخت عذاب ہے۔''

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ جو اپنی ہوا کی پیروی کرتا ہے وہ اس کو اللہ کی راہ سے گمراہ کر دیتی ہے اور اللہ کی راہ ہی اس کی وہ ہدایت ہے جو اس نے اپنے رسول کو دے کر مبعوث کیا۔

تحقیقِ امر یہ ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر تاکیدی افضل اور احسن اعمال میں سے ایک عمل ہے، اللہ فرماتے ہیں:

﴿ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ﴾ [الملك: ۲]

''تاکہ تمھیں آزمائے کہ تم میں سے کون عمل میں زیادہ اچھا ہے۔''

اس کی تفسیر میں فضیل بن عیاض کا قول ہے: احسن سے مراد اَخلص: خالص ترین اور اصوب: درست ترین ہے۔ عمل اگر خالص ہو، لیکن درست نہ ہو تو وہ اس وقت تک قبول نہیں ہوتا جب تک خالص اور درست نہ ہو۔ خالص سے مراد ہے کہ وہ صرف اللہ کے لیے ہو اور درست سے مراد ہے کہ وہ سنتِ رسول ﷺ کے مطابق ہو۔ چنانچہ عملِ صالح کے لیے ضروری ہے کہ وہ اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے کیا جائے، کیوں کہ جو عمل اللہ کی رضا کے لیے نہ کیا جائے وہ قبول نہیں ہوتا، رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

''اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: میں شریکوں کے شرک سے بے نیاز ہوں، جس نے کوئی عمل کیا اور اس میں میرے علاوہ کسی کو شریک کیا تو میں اس سے بری ہوں، وہ سارا اسی کے لیے ہے جس کو اس نے شریک بنایا۔''[1]

یہی توحید ہے جو اصل اسلام ہے اور یہی اللہ کا وہ دین ہے جو اس نے تمام رسولوں کو دے کر مبعوث کیا۔ وہ مخلوق کا خالق ہے تو اس کا اپنے بندوں پر یہ حق ہے کہ وہ اس کی عبادت کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں۔ اس کے ساتھ نیک عمل کا ہونا بھی ضروری ہے اور نیک عمل وہ چیز ہے جس کا اللہ اور اس کے رسول نے حکم دیا ہے، یہی طاعت اور فرماں برداری ہے۔ ہر طاعت صالح عمل ہے اور ہر صالح عمل طاعت ہے۔ یہی مشروع و مسنون عمل ہے، کیوں کہ مشروع و مسنون واجب ہوتا ہے یا مستحب اور یہی عملِ صالح ہے، اس کو حسن، بر، نیکی اور خیر کہتے ہیں اور اس کا متضاد معصیت، نافرمانی، عملِ فاسد، سیہ (برائی)، فجور اور ظلم ہے۔

عمل کے لیے نیت اور حرکت کا ہونا ضروری ہے، جس طرح رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''سب سے سچے نام حارث (کھیتی کرنے والا) اور ہمام (پرہمت) ہیں۔''[2] ہر کوئی حارث اور ہمام ہے اور اس کا عمل اور نیت ہوتی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ اچھی نیت ہی قبول کرتا ہے اور اسی کا ثواب دیتا ہے۔ عمل کرتے وقت اللہ کی رضا مدِنظر رہنی چاہیے، یہی عملِ صالح ہے اور اسی کا حکم دیا گیا ہے۔ اسی بنا پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ دعا کیا کرتے تھے:

"اللهم اجعل عملي كله صالحا، واجعله لوجهك خالصا، ولا تجعل لأحد فيه شيئا"

''اے اللہ! میرے سارے عمل کو صالح بنا، اس کو خالص اپنی رضا کے لیے کر دے اور اس میں کسی کا کوئی حصہ نہ رکھنا۔''

اگر ہر عملِ صالح کی یہ تعریف ہے تو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کام کرنے والے کو چاہیے کہ وہ اس کو اپنے لیے بھی اسی طرح بنائے۔ اگر اس کا یہ عمل علم اور فقہ، یعنی سمجھ داری سے خالی ہو تو وہ صالح نہیں ہوگا، جس طرح

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٩٨٥)

[2] المعجم الأوسط (٢١٤/١) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٠٤٠)

حضرت عمر بن عبدالعزیز کا کہنا ہے:

"من عبد الله بغير علم كان ما يفسد أكثر مما يصلح"

''جو علم کے بغیر اللہ کی عبادت کرتا ہے، وہ اصلاح کم اور خرابی زیادہ کرتا ہے۔''

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے:

«اَلْعِلْمُ إِمَامُ الْعَمَلِ وَالْعَمَلُ تَابِعُهُ» [1] ''علم عمل کا امام اور عمل اس کا مقتدی ہے۔''

یہ بالکل ظاہر بات ہے کہ اگر قصد و عمل علم کے بغیر ہو تو وہ جہالت و گمراہی اور ہوائے نفس کی پیروی ہوگی۔ یہی اہلِ جاہلیت اور اہلِ اسلام میں فرق ہے، لہٰذا معروف اور منکر کا علم اور ان میں تمیز و فرق کی سمجھ ہونا ضروری ہے۔ اسی طرح جس کو حکم دیا جائے اور جس کو منع کیا جائے اس کے احوال کا علم ہونا بھی ضروری ہے۔

امر و نہی کا کام صراطِ مستقیم کے مطابق کرنا چاہیے، یہ حصولِ مقصود کا مختصر ترین راستہ ہے۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ایک لازمی عنصر نرم رویہ ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

«مَا كَانَ الرِّفْقُ فِي شَيْئٍ إِلَّا زَانَهُ، وَلَا كَانَ الْعُنْفُ فِي شَيْئٍ إِلَّا شَانَهُ» [1]

''نرمی جس چیز میں بھی ہو اسے خوب صورت بنا دیتی ہے اور درشتی جس چیز میں بھی ہو اسے عیب دار بنا دیتی ہے۔''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک فرمان یہ بھی ہے:

''اللہ نرم ہے اور ہر چیز میں نرمی پسند کرتا ہے اور اس پر وہ کچھ عطا کرتا ہے جو درشتی پر نہیں عطا کرتا۔'' [3]

اس فریضے کا تیسرا لازمی عنصر حلم اور اذیتوں پر صبر اختیار کرنا ہے، کیوں کہ جو یہ فریضہ ادا کرتا ہے، اس کو لازمی طور پر اذیتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اگر داعی حلم اور صبر سے کام نہ لے تو وہ اصلاح کے بجائے بہت زیادہ بگاڑ کا باعث بن سکتا ہے۔ حضرت لقمان علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے کہا:

﴿ وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا أَصَابَكَ ۖ إِنَّ ذَٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ ﴾

[لقمان: ١٧]

---

[1] السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٥٢٩٣)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٩٤)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٩٣) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٨٠٧) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٦٨٨) صحيح الجامع، رقم الحديث (١٧٧١)

''نماز قائم کر اور نیکی کا حکم دے اور برائی سے منع کر اور اس (مصیبت) پر صبر کر جو تجھے پہنچے، یقیناً یہ ہمت کے کاموں سے ہے۔''

اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں کو، جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے امام ہیں، صبر سے آراستہ ہونے کا حکم دیا، بلکہ یہ تبلیغِ رسالت کا قرین ہے۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے خاتم الرسل حضرت محمد ﷺ پر پہلے وحی نازل کرنے کے بعد جس میں آپ ﷺ کو نبی بنایا گیا، دوسرا پیغام یہ اتارا:

﴿ يَاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ① قُمْ فَاَنْذِرْ ② وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ③ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ④ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ ⑤ وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ ⑥ وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ ﴾ [المدثر: ١-٧]

''اے کمبل میں لپٹنے والے! اٹھ کھڑا ہو، پس ڈرا۔ اور اپنے رب ہی کی پس بڑائی بیان کر۔ اور اپنے کپڑے پس پاک رکھ۔ اور پلیدگی کو پس چھوڑ دے۔ اور (اس نیت سے) احسان نہ کر کہ زیادہ حاصل کرے۔ اور اپنے رب ہی کے لیے پس صبر کر۔''

لوگوں کی طرف رسول بنا کر بھیجنے کی آیات کا آغاز لوگوں کو ڈرانے کے حکم سے کیا اور اختتام صبر کا حکم دے کر کیا۔ اِنذار یعنی ڈرانا بذاتِ خود امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے، لہٰذا اس سے معلوم ہوا کہ اس کے بعد صبر کرنا ضروری ہے۔ دوسری جگہ فرمایا:

﴿ وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَاِنَّكَ بِاَعْيُنِنَا ﴾ [الطور: ٤٨]

''اور اپنے رب کا حکم آنے تک صبر کر، پس بے شک تو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔''

فرمایا:

﴿ وَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيْلًا ﴾ [المزمل: ١٠]

''اور اس پر صبر کر جو وہ کہتے ہیں اور انھیں چھوڑ دے، خوبصورت طریقے سے چھوڑنا۔''

فرمایا:

﴿ فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ ﴾ [الأحقاف: ٣٥]

''پس صبر کر جس طرح پختہ ارادے والے رسولوں نے صبر کیا۔''

فرمایا:

﴿ فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ ﴾ [القلم: ٤٨]

''پس اپنے رب کے فیصلے تک صبر کر اور مچھلی والے کی طرح نہ ہو۔''

فرمایا:

﴿ وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ إِلَّا بِاللّٰهِ ﴾ [النحل: ١٢٧] ''اور صبر کر اور نہیں تیرا صبر مگر اللہ کے ساتھ۔''

فرمایا:

﴿ وَاصْبِرْ فَإِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ ﴾ [هود: ١١٥]

''اور صبر کر بے شک اللہ نیکی کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔''

چنانچہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لیے علم، نرمی اور صبر ان تینوں کا ہونا ضروری ہے، علم امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے پہلے، نرمی اس کے ساتھ اور صبر اس کے بعد، اگرچہ یہ تینوں عناصر ان احوال میں ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ اسی مفہوم میں سلف صالحین سے منقول یہ اثر بھی ہے جسے کچھ نے مرفوع بھی روایت کیا ہے:

"لا يأمر بالمعروف وينهى عن المنكر إلا من كان فقيهاً فيما يأمر به، فقيهاً فيما ينهى عنه، رفيقاً فيما يأمر به، رفيقاً فيما ينهى عنه، حليماً فيما يأمر به، حليماً فيما ينهى عنه"

''امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کام صرف وہ کرے جو فقیہ، نرم خو اور حلیم ہو۔''

جاننا چاہیے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں ان خصلتوں کو اختیار کرنے کا حکم بہت سے لوگوں کے لیے صعوبت کا باعث بن سکتا ہے اور وہ سمجھ سکتے ہیں کہ ان کے نہ ہونے کی وجہ سے یہ فریضہ ان سے ساقط ہے، اس لیے وہ اسے چھوڑ سکتے ہیں۔ یہ چیز ان کے لیے ان خصلتوں کے نہ ہونے یا کم ہونے کی حالت میں امر بالمعروف کا فریضہ سرانجام دینے کی صورت میں حاصل ہونے والے نقصان سے زیادہ نقصان دہ ہے، کیوں کہ امر واجب کو چھوڑنا نافرمانی ہے۔ جو انسان ایک چھوٹی نافرمانی سے بچنے کے لیے بڑی نافرمانی کا ارتکاب کرتا ہے، وہ ایسے ہی ہے جیسے بارش سے بچنے کے لیے پرنالے کے نیچے کھڑا ہو جائے، گرمی سے بچنے کے لیے آگ سینکنا شروع کر دے، لہٰذا ایک معصیت سے نکل کر دوسری میں داخل ہونے والا ایک باطل دین کو چھوڑ کر دوسرا باطل دین اختیار کرنے والے کی طرح ہوتا ہے، کبھی دوسری نافرمانی پہلی سے بڑی ہوتی ہے، کبھی چھوٹی ہوتی ہے اور کبھی دونوں برابر ہوتی ہیں۔ امر بالمعروف میں تقصیر اور حد سے تجاوز کرنے والا بھی ایسے ہی ہوتا ہے، کبھی اس کا گناہ بڑا ہوتا ہے اور کبھی اس کا اور کبھی دونوں برابر ہوتے ہیں۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے آفاق اور انفس میں ہمیں جو نشانیاں دکھائی ہیں اور قرآن کریم میں بھی جن کی شہادت موجود ہے ان سے معلوم ہوتا ہے کہ معاصی، یعنی نافرمانیاں مصیبتوں کے اسباب ہیں۔ پس برائیاں مصیبتیں ہیں جو برے اعمال کا بدلہ ہیں۔ فرماں برداری نعمت کا سبب ہے، عمل میں احسان اور نیکی اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے احسان اور حسنِ سلوک کا سبب ہے، ارشادِ باری عزوجل ہے:

﴿ وَمَآ اَصٰبَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ ﴾ [الشوریٰ: ۳۰]

''اور جو بھی تمھیں کوئی مصیبت پہنچی تو وہ اس کی وجہ سے ہے جو تمھارے ہاتھوں نے کمایا اور وہ بہت سی چیزوں سے درگزر کر جاتا ہے۔''

فرمایا:

﴿ مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ۫ وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ ۭ ﴾ [النساء: ۷۹]

''جو کوئی بھلائی تجھے پہنچے سو اللہ کی طرف سے ہے اور جو کوئی برائی تجھے پہنچے سو تیرے نفس کی طرف سے ہے۔''

فرمایا:

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ۙ اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطٰنُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا ۚ وَلَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ ۭ ﴾ [آل عمران: ۱۵۵]

''بے شک وہ لوگ جو تم میں سے اس دن پیٹھ پھیر گئے جب دو جماعتیں بھڑیں، شیطان نے انھیں ان بعض اعمال ہی کی وجہ سے پھسلایا جو انھوں نے کیے تھے اور بلاشبہہ یقیناً اللہ نے انھیں معاف کر دیا۔''

فرمایا:

﴿ اَوَلَمَّآ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَدْ اَصَبْتُمْ مِّثْلَيْهَا ۙ قُلْتُمْ اَنّٰى هٰذَا ۭ قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ ۭ ﴾ [آل عمران: ۱۶۵]

''اور کیا جب تمھیں ایک مصیبت پہنچی کہ یقیناً اس سے دگنی تم پہنچا چکے تھے تو تم نے کہا یہ کیسے ہوا؟ کہہ دے یہ تمھاری طرف سے ہے۔''

فرمایا:

﴿ اَوْ يُوْبِقْهُنَّ بِمَا كَسَبُوْا وَيَعْفُ عَنْ كَثِيْرٍ ﴾ [الشوریٰ: ۳٤]

''یا وہ انھیں اس کی وجہ سے ہلاک کر دے جو انھوں نے کمایا اور (چاہے تو) بہت سے لوگوں سے درگزر کر دے۔''

فرمایا:

﴿ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ ۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ فَاِنَّ الْاِنْسَانَ كَفُوْرٌ ﴾ [الشوری: ٤۸]

''اور اگر انھیں اس کی وجہ سے کوئی مصیبت پہنچتی ہے جو ان کے ہاتھوں نے آگے بھیجا تو بے شک انسان بہت ناشکرا ہے۔''

فرمایا:

﴿ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ ۚ وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ﴾
[الأنفال: ٣٣]

''اور اللہ کبھی ایسا نہیں کہ انھیں عذاب دے، جب کہ تو ان میں ہو اور اللہ انھیں کبھی عذاب دینے والا نہیں جب کہ وہ بخشش مانگتے ہوں۔''

اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے قومِ نوح، قومِ عاد، قومِ ثمود، قومِ لوط، اصحابِ مدین اور قومِ فرعون جیسی گناہ گار قوموں کو دنیا میں جو سزا دی اس کے بارے میں بتایا اور جو آخرت میں ان کو سزا دے گا اس کے بارے میں بھی بتایا ہے، اسی بنا پر آلِ فرعون کے مومن نے کہا:

﴿ يٰقَوْمِ اِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ مِّثْلَ يَوْمِ الْاَحْزَابِ ﴿30﴾ مِثْلَ دَاْبِ قَوْمِ نُوْحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوْدَ وَالَّذِيْنَ مِنْ بَعْدِهِمْ ۚ وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعِبَادِ ﴿31﴾ وَيٰقَوْمِ اِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ يَوْمَ التَّنَادِ ﴿32﴾ يَوْمَ تُوَلُّوْنَ مُدْبِرِيْنَ ۚ مَا لَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ﴾ [المومن: ٣٠۔٣٣]

''اے میری قوم! بے شک میں تم پر (گزشتہ) جماعتوں کے دن کی مانند سے ڈرتا ہوں۔ نوح کی قوم اور عاد اور ثمود اور ان لوگوں کے حال کی مانند سے جو ان کے بعد تھے اور اللہ اپنے بندوں پر کسی طرح کے ظلم کا ارادہ نہیں کرتا۔ اور اے میری قوم! یقیناً میں تم پر ایک دوسرے کو پکارنے کے دن سے ڈرتا ہوں۔ جس دن تم پیٹھ پھیرتے ہوئے بھاگو گے، تمھارے لیے اللہ سے بچانے والا کوئی نہ ہو گا اور جسے اللہ گمراہ کر دے پھر اسے کوئی ہدایت دینے والا نہیں۔''

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ كَذٰلِكَ الْعَذَابُ ۗ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ ﴾ [القلم: ٣٣]

''اسی طرح (ہوتا) ہے عذاب۔ اور یقیناً آخرت کا عذاب کہیں بڑا ہے۔''

فرمایا:

﴿ سَنُعَذِّبُهُمْ مَّرَّتَيْنِ ثُمَّ يُرَدُّوْنَ اِلٰى عَذَابٍ عَظِيْمٍ ﴾ [التوبة: ١٠١]

''عنقریب ہم انھیں دوبارہ عذاب دیں گے، پھر وہ بہت بڑے عذاب کی طرف لوٹائے جائیں گے۔''

﴿ وَلَنُذِيْقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْاَدْنٰى دُوْنَ الْعَذَابِ الْاَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴾ [السجدة: ٢١]

''اور یقیناً ہم انھیں قریب ترین عذاب کا کچھ حصہ سب سے بڑے عذاب سے پہلے ضرور چکھائیں گے، تاکہ وہ پلٹ آئیں۔''

﴿ فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَأْتِي السَّمَآءُ بِدُخَانٍ مُّبِينٍ ﴿١٠﴾ يَغْشَى النَّاسَ ۖ هَٰذَا عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿١١﴾ رَّبَّنَا اكْشِفْ عَنَّا الْعَذَابَ إِنَّا مُؤْمِنُونَ ﴿١٢﴾ أَنَّىٰ لَهُمُ الذِّكْرَىٰ وَقَدْ جَآءَهُمْ رَسُولٌ مُّبِينٌ ﴿١٣﴾ ثُمَّ تَوَلَّوْا عَنْهُ وَقَالُوا مُعَلَّمٌ مَّجْنُونٌ ﴿١٤﴾ إِنَّا كَاشِفُوا الْعَذَابِ قَلِيلًا ۚ إِنَّكُمْ عَآئِدُونَ ﴿١٥﴾ يَوْمَ نَبْطِشُ الْبَطْشَةَ الْكُبْرَىٰ إِنَّا مُنتَقِمُونَ ﴾

[الدخان: ١٠۔١٦]

''سو انتظار کر جس دن آسمان ظاہر دھواں لائے گا۔ جو لوگوں کو ڈھانپ لے گا۔ یہ دردناک عذاب ہے۔ اے ہمارے رب! ہم سے یہ عذاب دور کر دے، بے شک ہم ایمان لانے والے ہیں۔ ان کے لیے نصیحت کہاں؟ حالانکہ یقیناً ان کے پاس بیان کرنے والا رسول آ چکا۔ پھر انھوں نے اس سے منہ پھیر لیا اور انھوں نے کہا سکھلایا ہوا ہے، دیوانہ ہے۔ بے شک ہم یہ عذاب تھوڑی دیر کے لیے دور کرنے والے ہیں، بے شک تم دوبارہ وہی کچھ کرنے والے ہو۔ جس دن ہم بڑی پکڑ پکڑیں گے، بے شک ہم انتقام لینے والے ہیں۔''

یہی وجہ ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ عام سورتوں میں اِنذار کا ذکر کرتے وقت ان سزاؤں کا تذکرہ کرتے ہیں جو اس نے برے لوگوں کو دنیا میں دیں اور جو آخرت میں ان کے لیے تیار کی ہیں۔ وہ کسی سورت میں صرف آخرت کے دعوے کا تذکرہ کرتا ہے، کیوں کہ آخرت کا عذاب بھی عظیم تر ہے اور ثواب بھی جلیل تر، وہی دارِ قرار ہے۔ دنیا میں وہ جس سزا اور ثواب کا ذکر کرتا ہے وہ آخرت کے ذکر کے تابع ہوتا ہے، مثلاً یوسف علیہ السلام کے واقعے میں ہے:

﴿ وَكَذَٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوسُفَ فِي الْأَرْضِ يَتَبَوَّأُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَآءُ ۚ نُصِيبُ بِرَحْمَتِنَا مَن نَّشَآءُ ۖ وَلَا نُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ ﴿٥٦﴾ وَلَأَجْرُ الْآخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِينَ آمَنُوا وَكَانُوا يَتَّقُونَ ﴾ [یوسف: ٥٦، ٥٧]

''اور اسی طرح ہم نے اس سرزمین میں یوسف کو اقتدار عطا فرمایا، اس میں سے جہاں چاہتا جگہ پکڑتا تھا۔ ہم اپنی رحمت جس کو چاہتے ہیں پہنچا دیتے ہیں اور ہم نیکی کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتے۔ اور یقیناً آخرت کا اجر ان لوگوں کے لیے کہیں بہتر ہے جو ایمان لائے اور ڈرتے رہے۔''

فرمایا:

﴿ فَآتَاهُمُ اللَّهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْآخِرَةِ ۗ ﴾ [آل عمران: ١٤٨]

''تو اللہ نے انھیں دنیا کا بدلہ عطا فرمایا اور آخرت کا اچھا بدلہ بھی۔''

فرمایا:

﴿ وَالَّذِينَ هَاجَرُوا فِي اللَّهِ مِن بَعْدِ مَا ظُلِمُوا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ۖ وَلَأَجْرُ الْآخِرَةِ أَكْبَرُ ۚ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ﴿٤١﴾ الَّذِينَ صَبَرُوا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ ﴾ [النحل: ٤١، ٤٢]

''اور جن لوگوں نے اللہ کی خاطر وطن چھوڑا، اس کے بعد کہ ان پر ظلم کیا گیا، بلاشبہہ ہم انھیں دنیا میں

ضرور اچھا ٹھکانا دیں گے اور یقیناً آخرت کا اجر سب سے بڑا ہے۔ کاش! وہ جانتے ہوتے۔ وہ لوگ جنھوں نے صبر کیا اور اپنے رب ہی پر بھروسا کرتے ہیں۔''

ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں فرمایا:

﴿ وَاٰتَيْنٰهُ اَجْرَهٗ فِي الدُّنْيَا ۚ وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴾ [العنکبوت: ۲۷]

''اور ہم نے اسے اس کا اجر دنیا میں دیا اور بے شک وہ آخرت میں یقیناً صالح لوگوں سے ہے۔''

دنیا اور آخرت کی عقوبت اور سزا کا ذکر سورت نازعات میں دیکھیے:

﴿ وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا ۝ وَّالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا ۝ وَّالسّٰبِحٰتِ سَبْحًا ۝ فَالسّٰبِقٰتِ سَبْقًا ۝ فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا ۝ يَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ ۝ تَتْبَعُهَا الرَّادِفَةُ ﴾ [النازعات: ۱۔۷]

''ان (فرشتوں) کی قسم جو ڈوب کر سختی سے (جان) کھینچ لینے والے ہیں! اور جو بند کھولنے والے ہیں! آسانی سے کھولنا۔ اور جو تیرنے والے ہیں! تیزی سے تیرنا۔ پھر جو آگے نکلنے والے ہیں! آگے بڑھ کر۔ پھر جو کسی کام کی تدبیر کرنے والے ہیں! جس دن ہلا ڈالے گا سخت ہلانے والا (زلزلہ)۔ اس کے بعد ساتھ ہی پیچھے آنے والا (زلزلہ) آئے گا۔''

یہاں قیامت کا ذکر مطلقاً کیا، اس کے بعد فرمایا:

﴿ هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى ۝ اِذْ نَادٰىهُ رَبُّهٗ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ۝ اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ۝ فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰٓى اَنْ تَزَكّٰى ۝ وَاَهْدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى ۝ فَاَرٰىهُ الْاٰيَةَ الْكُبْرٰى ۝ فَكَذَّبَ وَعَصٰى ۝ ثُمَّ اَدْبَرَ يَسْعٰى ۝ فَحَشَرَ فَنَادٰى ۝ فَقَالَ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى ۝ فَاَخَذَهُ اللّٰهُ نَكَالَ الْاٰخِرَةِ وَالْاُوْلٰى ۝ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى ﴾ [النازعات: ۱۵۔۲۶]

''کیا تیرے پاس موسیٰ کی بات پہنچی ہے؟ جب اس کے رب نے اسے مقدس وادی طویٰ میں پکارا۔ فرعون کے پاس جا، یقیناً وہ حد سے بڑھ گیا ہے۔ پس کہہ کیا تجھے اس بات کی کوئی رغبت ہے کہ تو پاک ہو جائے؟ اور میں تیرے رب کی طرف تیری راہ نمائی کروں، پس تو ڈر جائے۔ چنانچہ اس نے اسے بہت بڑی نشانی دکھائی۔ تو اس نے جھٹلا دیا اور نافرمانی کی۔ پھر واپس پلٹا، دوڑ بھاگ کرتا تھا۔ پھر اس نے اکٹھا کیا، پس پکارا۔ پس اس نے کہا میں تمھارا سب سے اونچا رب ہوں۔ تو اللہ نے اسے آخرت اور دنیا کے عذاب میں پکڑ لیا۔ بے شک اس میں اس شخص کے لیے یقیناً بڑی عبرت ہے جو ڈرتا ہے۔''

اس کے بعد تفصیل کے ساتھ مبدا و معاد (آخرت کے امور) کا ذکر کیا اور فرمایا:

﴿ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ ۚ بَنٰهَا ﴿27﴾ رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰىهَا ﴿28﴾ وَاَغْطَشَ لَيْلَهَا وَاَخْرَجَ
ضُحٰىهَا ﴿29﴾ وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا ﴿30﴾ اَخْرَجَ مِنْهَا مَآءَهَا وَمَرْعٰىهَا ﴿31﴾ وَالْجِبَالَ اَرْسٰىهَا ﴿32﴾ مَتَاعًا لَّكُمْ
وَلِاَنْعَامِكُمْ ﴿33﴾ فَاِذَا جَآءَتِ الطَّآمَّةُ الْكُبْرٰى ﴿34﴾ يَوْمَ يَتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ مَا سَعٰى ﴿35﴾ وَبُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِمَنْ
يَّرٰى ﴿36﴾ فَاَمَّا مَنْ طَغٰى ﴿37﴾ وَاٰثَرَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ﴿38﴾ فَاِنَّ الْجَحِيْمَ هِيَ الْمَاْوٰى ﴿39﴾ وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ
رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ﴿40﴾ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى ﴿41﴾ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰىهَا ﴿42﴾
فِيْمَ اَنْتَ مِنْ ذِكْرٰىهَا ﴿43﴾ اِلٰى رَبِّكَ مُنْتَهٰىهَا ﴿44﴾ اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرُ مَنْ يَّخْشٰىهَا ﴿45﴾ كَاَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَهَا لَمْ
يَلْبَثُوْٓا اِلَّا عَشِيَّةً اَوْ ضُحٰىهَا﴾ [النازعات: ٢٧۔٤٦]

''کیا پیدا کرنے میں تم زیادہ مشکل ہو یا آسمان؟ اس نے اسے بنایا۔ اس کی چھت کو بلند کیا، پھر اسے برابر کیا۔ اور اس کی رات کو تاریک کر دیا اور اس کے دن کی روشنی کو ظاہر کر دیا۔ اور زمین، اس کے بعد اسے بچھا دیا۔ اس سے اس کا پانی اور اس کا چارا نکالا۔ اور پہاڑ، اس نے انھیں گاڑ دیا۔ تمھاری اور تمھارے چوپاؤں کی زندگی کے سامان کے لیے۔ پھر جب وہ ہر چیز پر چھا جانے والی سب سے بڑی مصیبت آ جائے گی۔ جس دن انسان یاد کرے گا جو اس نے کوشش کی۔ اور جہنم (ہر) اس شخص کے لیے ظاہر کر دی جائے گی جو دیکھتا ہے۔ پس لیکن جو حد سے بڑھ گیا۔ اور اس نے دنیا کی زندگی کو ترجیح دی۔ تو بے شک جہنم ہی (اس کا) ٹھکانا ہے۔ اور رہا وہ جو اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈر گیا اور اس نے نفس کو خواہش سے روک لیا۔ تو بے شک جنت ہی (اس کا) ٹھکانا ہے۔ وہ تجھ سے قیامت کے متعلق پوچھتے ہیں کہ اس کا قیام کب ہے؟ اس کے ذکر سے تو کس خیال میں ہے؟ تیرے رب ہی کی طرف اس (کے علم) کی انتہا ہے۔ تو تو صرف اسے ڈرانے والا ہے جو اس سے ڈرتا ہے۔ گویا وہ جس دن اسے دیکھیں گے وہ (دنیا میں) نہیں ٹھہرے، مگر دن کا ایک پچھلا حصہ، یا اس کا پہلا حصہ۔''

اسی طرح سورت مزمل میں فرمایا:

﴿وَذَرْنِيْ وَالْمُكَذِّبِيْنَ اُولِي النَّعْمَةِ وَمَهِّلْهُمْ قَلِيْلًا ﴿11﴾ اِنَّ لَدَيْنَآ اَنْكَالًا وَّجَحِيْمًا ﴿12﴾ وَّطَعَامًا ذَا غُصَّةٍ
وَّعَذَابًا اَلِيْمًا ﴿13﴾ يَوْمَ تَرْجُفُ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ وَكَانَتِ الْجِبَالُ كَثِيْبًا مَّهِيْلًا ﴿14﴾ اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْكُمْ
رَسُوْلًا ۙ شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا ﴿15﴾ فَعَصٰى فِرْعَوْنُ الرَّسُوْلَ فَاَخَذْنٰهُ
اَخْذًا وَّبِيْلًا﴾ [المزمل: ١١۔١٦]

''اور چھوڑ دے مجھے اور ان جھٹلانے والوں کو جو خوش حال ہیں اور انھیں تھوڑی سی مہلت دے۔ بلاشبہ ہمارے پاس بیڑیاں ہیں اور سخت بھڑکتی ہوئی آگ۔ اور گلے میں پھنس جانے والا کھانا اور دردناک عذاب۔

جس دن زمین اور پہاڑ کانپیں گے اور پہاڑ گرائی ہوئی ریت کے ٹیلے ہو جائیں گے۔ بلاشبہہ ہم نے تمھاری طرف ایک پیغام پہنچانے والا بھیجا جو تم پر گواہی دینے والا ہے، جس طرح ہم نے فرعون کی طرف ایک پیغام پہنچانے والا بھیجا۔ سو فرعون نے اس پیغام پہنچانے والے کی نافرمانی کی تو ہم نے اسے پکڑ لیا، نہایت سخت پکڑنا۔''

﴿ فَإِذَا نُفِخَ فِي الصُّورِ نَفْخَةٌ وَاحِدَةٌ ۝ وَحُمِلَتِ الْأَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَاحِدَةً ....

إلى آخره .... فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيمِ ﴾ [الحاقة: ١٣-٥٢]

''پس جب صور میں پھونکا جائے گا، ایک بار پھونکنا۔ اور زمین اور پہاڑوں کو اٹھایا جائے گا، پس دونوں ٹکرا دیے جائیں گے، ایک بار ٹکرا دینا ...... پس اپنے بہت عظمت والے رب کے نام کی تسبیح کر۔''

سورت قلم میں باغ والوں کا قصہ ذکر کیا، جنھوں نے اپنے اموال کا حق ادا کرنے سے انکار کیا تو اس نے ان کو جو سزا دی اس کا تذکرہ کیا اور فرمایا:

﴿ كَذَٰلِكَ الْعَذَابُ ۖ وَلَعَذَابُ الْآخِرَةِ أَكْبَرُ ۚ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ﴾ [القلم: ٣٣]

''اسی طرح (ہوتا) ہے عذاب۔ اور یقیناً آخرت کا عذاب کہیں بڑا ہے، کاش! وہ جانتے ہوتے۔''

سورت تغابن میں ہے:

﴿ أَلَمْ يَأْتِكُمْ نَبَأُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِن قَبْلُ فَذَاقُوا وَبَالَ أَمْرِهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُ كَانَت تَّأْتِيهِمْ رُسُلُهُم بِالْبَيِّنَاتِ فَقَالُوا أَبَشَرٌ يَهْدُونَنَا فَكَفَرُوا وَتَوَلَّوا ۚ وَّاسْتَغْنَى اللَّهُ ۚ وَاللَّهُ غَنِيٌّ حَمِيدٌ ۝ زَعَمَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَن لَّن يُبْعَثُوا ۚ قُلْ بَلَىٰ وَرَبِّي لَتُبْعَثُنَّ ﴾ [التغابن: ٦-٧]

''کیا تمھارے پاس ان لوگوں کی خبر نہیں آئی جنھوں نے اس سے پہلے کفر کیا؟ پھر اپنے کام کا وبال چکھا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔ یہ اس لیے کہ بے شک حقیقت یہ ہے کہ ان کے پاس ان کے رسول واضح دلیلیں لے کر آتے تھے تو انھوں نے کہا کیا کوئی بشر ہماری رہنمائی کریں گے؟ پس انھوں نے انکار کر دیا اور منہ پھیر لیا اور اللہ نے پروا نہ کی اور اللہ بے پروا ہے، تمام خوبیوں والا ہے۔ وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا انھوں نے گمان کیا کہ وہ ہرگز اٹھائے نہیں جائیں گے۔ کہہ دے کیوں نہیں؟ میرے رب کی قسم تم ضرور بالضرور اٹھائے جاؤ گے۔''

سورت قٓ میں بھی رسولوں کے مخالفین کا حال اور آخرت میں وعد و وعید کا تذکرہ کیا گیا ہے، اسی طرح سورت قمر، غافر، حمٓ السجدۃ، زخرف اور دخان اور دیگر سورتوں میں بھی ان کا تذکرہ ملتا ہے۔

پہلے پہل توحید اور وعد و وعید کی آیات نازل ہوئیں، صحیح بخاری میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

''قرآن میں اول اول جو مفصل سورت نازل ہوئی اس میں جنت دوزخ کا ذکر تھا، جب لوگ اسلام کی طرف لوٹ آئے تو حلال وحرام کی آیات اتریں، اگر پہلے یہ حکم نازل ہوتا کہ شراب نہ پیو تو لوگ کہتے: ہم شراب نوشی کبھی نہیں چھوڑیں گے، اگر پہلے نازل ہوتا کہ زنا نہ کرو تو لوگ کہتے: ہم زنا نہیں چھوڑیں گے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر مکے میں یہ آیتِ کریمہ نازل ہوئی تو میں اس وقت کھیل کود کی عمر میں تھی:

﴿بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ وَالسَّاعَةُ أَدْهٰى وَأَمَرُّ﴾ [القمر: ٤٦]

''بلکہ قیامت ان کے وعدے کا وقت ہے اور قیامت زیادہ بڑی مصیبت اور زیادہ کڑوی ہے۔''

جب سورت بقرہ اور نسا نازل ہوئی، اس وقت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھی۔''[1]

اگر کفر، فسوق اور نافرمانی شر اور زیادتی کا سبب ہیں اور اگر کوئی شخص یا کوئی گروہ گناہ کرے اور دوسرے خاموش رہیں اور امر و نہی کا فریضہ سرانجام نہ دیں تو یہ شر ان کے گناہوں کی وجہ سے ہوگا اور اگر کچھ دوسرے لوگ ان کو ایسے طریقے سے منع کریں جو شریعت کی نگاہ میں ممنوع ہو تو پھر یہ شر ان کے گناہوں کی وجہ سے ہوگا، اس طرح افتراق، اختلاف اور شر جنم لے لے گا جو قدیم و جدید کے تمام فتنوں سے زیادہ سنگین چیز ہے، کیوں کہ انسان ظلوم اور جہول ہے اور ظلم و جہالت کی انواع ہیں، پہلے کا ظلم و جہل اور نوع کا ہے اور دوسرے اور تیسرے کا ظلم و جہل کسی اور نوع کا۔ جو شخص رونما ہونے والوں فتنوں پر تدبر کرتا ہے اور امرا، علما، بادشاہ، مشائخ اور عام لوگوں کے درمیان ہونے والے اختلافات اور فتنوں کا جائزہ لیتا ہے اس کو یہی ان کی اصل نظر آئے گی، اس میں گمراہی اور گم گشتگی کے اسباب بھی داخل ہیں، جن کو ہم دینی اور شہوانی اہواء اور خواہشات کہہ سکتے ہیں، دینی اہواء وہ بدعات ہیں جو دین کے نام پر بنائی جاتی ہیں اور شہوانی اہواء دنیا میں فسق و فجور کو جنم دیتی ہیں، گمراہی اور گم گشتگی کے یہ اسباب، یعنی بدعات اور فسق و فجور بنی آدم میں عام اور مشترک ہیں، کیوں کہ ان میں ظلم و جہل پایا جاتا ہے۔ اس طرح انسان کچھ لوگوں کے گناہ کی وجہ سے اپنے اوپر ظلم بھی کرتا ہے اور دوسرے پر بھی۔ مثلاً زنا کاری، لواطت، شراب نوشی، خیانت، چوری یا لوٹ مار کے ذریعے مال میں ظلم کا ارتکاب وغیرہ، یہ سب گناہ اگرچہ عقل اور دین میں مذموم اور قابلِ نفرت ہیں، لیکن نفس ان کی چاہت اور تمنا بھی کرتا ہے، اسی طرح انسانی نفسیات ان خواہشات کو اپنے علاوہ کسی دوسرے کے لیے خاص دیکھنا نہیں چاہتی، بلکہ اپنے لیے خاص رکھنا چاہتی ہے اور کم از کم یہ چاہتی ہے کہ جو دوسرے کو حاصل ہوا ہے وہ اسے بھی حاصل ہو! اس کو رشک کہتے ہیں جو حسد کی سب سے ہلکی قسم ہے، بلکہ اس سے بڑھ کر نفس دوسرے پر غلبہ پانا، کم تر

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٧٠٧)

سے انتقام لینا، یا اس سے حسد کرنا اور اگر وہ چیز حاصل نہ کر سکے تو دوسرے سے زوالِ نعمت کی تمنا کرتا ہے، اس میں عُلُو (بلند تر ہونا) فساد، تکبر، انکارِ حق اور حسد پایا جاتا ہے۔ یہاں معتدل وہ ہے جو ان امور میں اشتراک پسند کرتا ہے اور جو دوسرے کو نیچا دکھانا اور سب کچھ اپنے لیے خاص کرنا چاہتا ہے، وہ ظالم اور حاسد ہے۔ یہ دونوں رویے مباح اور جائز امور میں بھی پائے جاتے ہیں اور حرام کاموں میں بھی جو کھانے، پینے، پہننے، نکاح شادی، سواری اور اموال کمانے جیسے مباح امور کی جنس اور قبیل سے ہو، اگر اس میں اختصاص واقع ہو جائے تو ظلم، بخیلی اور حسد جنم لیتے ہیں۔

بخیلی اور حسد دونوں کی اصل شُحّ (شدتِ حرص اور بخل کا مجموعہ) ہے، صحیح میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''شُح یعنی شدتِ حرص سے بچو، اس نے تم سے پہلے لوگوں کو ہلاک کیا، اس نے ان کو بخیلی کا حکم دیا تو انھوں نے بخیلی اختیار کی، اس نے ان کو ظلم کا حکم دیا تو انھوں نے ظلم کیا اور اس نے ان کو قطع تعلقی کا حکم دیا تو انھوں نے قطع تعلقی کی۔''[1]

اسی بنا پر اللہ رب العزت نے انصار کی تعریف میں فرمایا: جنھوں نے ان سے پہلے دارِ ہجرت اور ایمان میں جگہ بنا لی:

﴿ وَلَا يَجِدُونَ فِي صُدُورِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ أُوتُوا ﴾ [الحشر: ۹]

''اور وہ اپنے سینوں میں اس چیز کی کوئی خواہش نہیں پاتے جو ان (مہاجرین) کو دی جائے۔''

یعنی ان کے مہاجر بھائیوں کو جو کچھ عطا ہوا، وہ اس پر حسد محسوس نہیں کرتے:

﴿ وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰٓ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ﴾ [الحشر: ۹]

''اور اپنے آپ پر ترجیح دیتے ہیں، خواہ انھیں سخت حاجت ہو۔''

پھر فرمایا:

﴿ وَمَن يُوقَ شُحَّ نَفْسِهِۦ فَأُولَٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴾ [الحشر: ۹]

''اور جو کوئی اپنے نفس کی حرص سے بچا لیا گیا تو وہی لوگ ہیں جو کامیاب ہیں۔''

دیکھا گیا کہ عبدالرحمان بن عوف رضی اللہ عنہ بیت اللہ کا طواف کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے:

''رَبِّ قِنِي شُحَّ نَفْسِي'' ''اے اللہ! مجھے میرے نفس کی شدتِ حرص سے بچانا۔''

ان سے اس کے بارے میں پوچھا گیا تو انھوں نے کہا: ''اگر مجھے میرے نفس کی شدتِ حرص سے بچا لیا گیا تو میں بخیلی، ظلم اور قطع تعلقی سے بچا لیا جاؤں گا۔''

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٧٨) سنن أبي داود، رقم الحديث (١٦٩٨) السلسلة الصحيحة (٨٥٨).

نفس کی یہ شدتِ حرص انسان کو خرچ کرنے سے روک کر بخیلی، غیر کا مال چھین کر ظلم، قطع تعلقی اور حسد پر آمادہ کرتی ہے اور حسد کیا ہے؟ جو دوسرے کے ساتھ خاص ہے، اس سے نفرت کرنا، حسد میں بخل بھی پایا جاتا ہے اور ظلم بھی، بخل اس طرح کہ دوسرے کو دیا گیا ہے، اس کو کیوں نہیں؟ اور ظلم اس کے زوال کی تمنا کرے۔

اگر یہ ظلم و حسد مباح خواہشات کی قبیل سے تعلق رکھنے والی چیزوں میں پایا جاتا ہے تو زنا کاری اور شراب نوشی وغیرہ جیسی حرام چیزوں میں کیوں نہیں؟ اگر اس میں اختصاص واقع ہو تو اس کی دو اقسام بنیں گی:

1 اختصاص کی وجہ سے بغض اور ظلم، جس طرح مباح کی جنس سے تعلق رکھنے والے امور۔

2 نفس کا حق اللہ کی وجہ سے بغض اور نفرت کرنا، اس بنا پر گناہوں کی تین اقسام ہوں گی:

① جن میں لوگوں پر ظلم کیا جائے، مثلاً: کسی کا ناحق مال لینا، حقوق ادا نہ کرنا اور حسد وغیرہ۔

② جن میں حضرتِ انسان اپنے نفس پر ظلم کرے، مثلاً شراب نوشی اور زنا وغیرہ، جب ان کا ضرر آگے نہ بڑھے۔

③ جس میں دونوں امور جمع ہو جائیں، مثلاً: کوئی متولی اور عہدے دار لوگوں کا مال ناحق لے کر اس کو زنا اور شراب میں استعمال کرے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ قُلْ إِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْإِثْمَ وَالْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَأَنْ تُشْرِكُوا بِاللَّهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهِ سُلْطَانًا وَأَنْ تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴾ [الأعراف: ٣٣]

''کہہ دے میرے رب نے تو صرف بے حیائیوں کو حرام کیا ہے، جو ان میں سے ظاہر ہیں اور جو چھپی ہوئی ہیں اور گناہ کو اور ناحق زیادتی کو اور یہ کہ تم اللہ کے ساتھ اسے شریک ٹھہراؤ جس کی اس نے کوئی دلیل نہیں اتاری اور یہ کہ تم اللہ پر وہ کہو جو تم نہیں جانتے۔''

لوگ اگرچہ انواع واقسام کے گناہوں میں مبتلا ہوں مگر ان کا نظام عدل پر قائم ہو تو ایسا معاشرہ اس معاشرے کی نسبت زیادہ مضبوط اور راست ہوتا ہے جہاں لوگ گو پارسا ہوں مگر ان کا نظام ظالمانہ اور لوگوں کے حقوق غصب کرنے پر مبنی ہو۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ اللہ عادل حکومت کو قائم رکھتا ہے، گو وہ کافر ہو مگر ظالم ملک کو قائم نہیں رہنے دیتا، چاہے وہ مسلمان ہو۔ کہا جاتا ہے: دنیا عدل و کفر کے ساتھ تو باقی رہ سکتی ہے، مگر ظلم اور اسلام کے ساتھ نہیں، کیونکہ عدل ہر چیز کا نظام ہے، اگر دنیا کا نظام عدل پر قائم ہو تو وہ باقی رہتی ہے، اگرچہ ایسا کرنے والے کا آخرت میں کوئی حصہ نہ ہو۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور جہاد فی سبیل اللہ کی راہ میں ایسی ابتلائیں اور آزمایشیں بھی آجاتی ہیں جن کی وجہ سے انسان کسی فتنے میں بھی مبتلا ہو سکتا ہے، بلکہ کچھ لوگ تو اسے بہانہ بنا کر فرض سے جان چھڑانے کی بھی سوچتے ہیں، جس طرح اللہ تعالیٰ نے منافقوں کے بارے میں بتایا ہے:

﴿ وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ يَّقُوۡلُ ائۡذَنۡ لِّىۡ وَلَا تَفۡتِنِّىۡ ؕ اَلَا فِى الۡفِتۡنَةِ سَقَطُوۡا ؕ ﴾ [التوبۃ: ۴۹]

''اور ان میں سے بعض وہ ہے جو کہتا ہے مجھے اجازت دے دے اور مجھے فتنے میں نہ ڈال۔ سن لو! وہ فتنے ہی میں تو پڑے ہوئے ہیں۔''

اس آیت کی تفسیر میں ذکر کیا گیا ہے کہ یہ جد بن قیس کے بارے میں نازل ہوئی، اس نے عورتوں کے فتنے سے بچنے کے لیے جہاد میں پیچھے رہنے کی اجازت مانگی، مگر فرض جہاد سے پیچھے رہ کر اس سے بڑے فتنے میں مبتلا ہوا۔

یہاں لوگوں کی تین اقسام بنتی ہیں:

ایک قسم اپنے مزعومہ فتنے کو ختم کرنے کے لیے نیکی کا حکم دیتے، برائی سے منع کرتے اور جہاد کرتے ہیں۔ حقیقت میں ان کا یہ فعل بذاتِ خود ایک بہت بڑا فتنہ ہے، مثلاً: امت کے درمیان واقع ہونے والے فتنے میں لڑنے والے۔ دوسرے لوگ فتنے سے بچنے کے لیے امر و نہی اور اس قتال سے پیچھے ہٹ جاتے ہیں جو اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے کیا جائے، لیکن وہ ترکِ جہاد کر کے بالفعل فتنے میں مبتلا ہو جاتے ہیں، کیوں کہ جو چھوٹا فتنہ ابھی ان کو پہنچا نہیں، محض اس کے پہنچنے کا گمان ہے، اس سے بچنے کے لیے فریضے کو چھوڑ کر اس سے بڑے فتنے میں بالفعل مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اکثر دین داروں کا یہی حال ہے کہ وہ چھوٹے فتنوں سے بچنے کے لیے بڑے فتنوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

ایسی صورت میں انسان کا یہ فرض بنتا ہے کہ فرض ادا کرے اور اس میں جو محظور اور ممنوعہ امور لازم آتے ہیں۔ ان سے اجتناب کرے، کیوں کہ یہ دونوں چیزیں لازم و ملزوم ہیں، ایسے لوگ اس فریضے کو اس لیے چھوڑ دیتے ہیں کہ وہ ایک وقت دونوں کام کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے یا دونوں کو چھوڑ دیں گے یا دونوں کا ارتکاب کریں گے۔ جیسا کہ بہت سے لوگ اقتدار یا مال اور گمراہی والی شہوات کو پسند کرتے ہیں، یہ جب امر بالمعروف، نہی عن المنکر اور جہاد جیسا کوئی واجبی کام کرے گا تو ضرور کسی حرام کام کا بھی ارتکاب کرے گا۔ ایسی حالت میں اس پر فرض یہ ہے کہ دونوں میں سے وہ کام کرے جو زیادہ ضروری ہے۔ اگر محظور سے مأمور زیادہ اجر والا ہے تو وہ اسے اس خوف سے نہیں چھوڑے گا کہ اس کے ساتھ وہ بھی شامل ہو جائے گا جو مفسدت سے اس سے کم ہے، اور اگر محظور کا چھوڑنا زیادہ باعث اجر ہے تو وہ اسے واجب فعل پر ثواب کی امید سے کر گزرے گا جو اس سے کم درجے کا ہے۔

ہر انسان ضروری ہے کہ کسی شئے کا حکم دے اور کسی شئے سے منع کرے، خواہ وہ اکیلا ہو تب بھی وہ خود کو نیکی کا یا برائی کا حکم ضرور دیتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ اِنَّ النَّفۡسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوۡٓءِ ﴾ [یوسف: ۵۳] ''یقیناً جان برائی کا حکم دینے والی ہے۔''

انسان اکیلا نہیں رہ سکتا، ایک دوسرے کے ساتھ کسی نہ کسی صورت میں مل کر رہنا پڑتا ہے، جب دو یا دو سے

زیادہ افراد اکٹھے ہوں تو ان میں ایک دوسرے کو حکم دینا اور ایک دوسرے کو منع کرنا ضروری ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ کم از کم جماعت کے لیے دو افراد کافی ہیں، لیکن یہ چونکہ نماز میں اشتراک ہے، اس لیے ایک امام بن جاتا ہے اور دوسرا مقتدی، لیکن عام معاملات کے متعلق آپ ﷺ کا فرمان ہے: ''اگر تین آدمی سفر پر جا رہے ہوں تو ایک کو امیر بنائیں۔''[1]

اگر امر و نہی بنی آدم کے وجود کے لوازم میں شامل ہے تو جو انسان اس معروف کا حکم نہیں دیتا، جس کا اللہ اور اس کے رسول نے حکم دیا ہے اور اس منکر سے منع نہیں کرتا جس سے اللہ اور اس کے رسول نے منع کیا ہے تو وہ کسی اور معروف کا حکم دے گا یا کسی اور منکر سے منع کرے گا، لیکن یہ کام ضرور کرے گا، کیوں کہ یہ معاشرت کا تقاضا ہے اور ہر انسان چونکہ اپنے ارادے کا مالک ہے اور اسی کے مطابق حرکت کرتا ہے تو جس کی نیت نیک نہ ہو اور جس کا عمل صالح اور اللہ کی رضا کے حصول کے لیے نہ ہو اس کا عمل فاسد ہوگا جو باطل اور بے کار ہے، جیسے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ اِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتّٰى ﴾ [الليل: ٤] ''بے شک تمھاری کوشش یقیناً مختلف ہے۔''

یہ سارے باطل اعمال کافروں کے اعمال کی قبیل سے ہیں، جن کے متعلق ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ ﴾ [محمد: ١]

''وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا اور اللہ کے راستے سے روکا، اس نے ان کے اعمال برباد کر دیے۔''

﴿ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍۭ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً ۗ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَهٗ لَمْ يَجِدْهُ شَيْـًٔا وَّوَجَدَ اللّٰهَ عِنْدَهٗ فَوَفّٰىهُ حِسَابَهٗ ۗ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴾ [النور: ٣٩]

''اور وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا، ان کے اعمال کسی چٹیل میدان میں ایک سراب کی طرح ہیں، جسے پیاسا پانی خیال کرتا ہے، یہاں تک کہ جب اس کے پاس آتا ہے تو اسے کچھ بھی نہیں پاتا اور اللہ کو اپنے پاس پاتا ہے تو وہ اسے اس کا حساب پورا چکا دیتا ہے اور اللہ بہت جلد حساب کرنے والا ہے۔''

فرمایا:

﴿ وَقَدِمْنَآ اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا ﴾ [الفرقان: ٢٣]

''اور ہم اس کی طرف آئیں گے جو انھوں نے کوئی بھی عمل کیا ہوگا تو اسے بکھرا ہوا غبار بنا دیں گے۔''

اللہ رب العزت نے اپنی کتاب مقدس میں اپنی اطاعت، اپنے رسول کی اطاعت اور مومن اولو الامر کی اطاعت کا حکم دیا ہے:

---

[1] مسند أحمد (٢/١٧٧) السلسلة الصحيحة (١٣٢٢)

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ﴾ [النساء: ٥٩]

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ کا حکم مانو اور رسول کا حکم مانو اور ان کا بھی جو تم میں سے حکم دینے والے ہیں، پھر اگر تم کسی چیز میں جھگڑ پڑو تو اسے اللہ اور رسول کی طرف لوٹاؤ، اگر تم اللہ اور یوم آخر پر ایمان رکھتے ہو، یہ بہتر ہے اور انجام کے لحاظ سے زیادہ اچھا ہے۔''

﴿ اُولِي الْاَمْرِ ﴾ سے مراد وہ ہیں جو لوگوں کو حکم دیتے ہیں، اس میں اہلِ اطاعت اور اہلِ علم مشترک ہیں، لہٰذا اولو الامر کی دو اقسام ہیں: ایک علما، دوسرے امرا۔ اگر یہ درست ہو جائیں تو لوگ درست ہو جاتے ہیں۔ اگر یہ خراب ہو جائیں تو لوگ خراب ہو جاتے ہیں۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے سوال ہوا: "ما بقاؤنا علی هذا الأمر" ''ہم اس دین پر کب تک باقی رہ سکتے ہیں؟'' انھوں نے فرمایا: "ما استقامت لکم أئمتکم"[1] ''جب تک تمھارے ائمہ سیدھے رہیں۔'' ائمہ میں بادشاہ بھی داخل ہیں، مشائخ بھی اور اہلِ دیوان، یعنی محکمہ انصاف بھی۔

ہر متبوع اور پیشوا اولی الامر میں داخل ہے، اس لیے ہر پیشوا کو چاہیے کہ وہ اس کا حکم دے جس کا اللہ اور اس کے رسول نے دیا ہے اور ہر اس سے منع کرے جس سے اللہ اور اس کے رسول نے منع کیا ہے، جو پیروکار ہوں ان کو چاہیے کہ اللہ کی اطاعت کے حکم میں اپنے پیشوا اور امام کی پیروی کریں، لیکن اس کام میں اس کی فرماں برداری نہ کریں جو اللہ کی نافرمانی پر مبنی ہو، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جب خلیفہ بنے تو انھوں نے لوگوں کو یہ خطبہ دیا: ''لوگو! جو تم میں طاقتور ہے وہ میرے نزدیک اس وقت تک کمزور ہے جب تک میں اس سے حق نہ لے لوں، اور جو تم میں کمزور ہے وہ میرے نزدیک اس وقت تک قوی ہے جب تک میں اس کا حق نہ دلوا دوں، اس حکم میں میری اطاعت کرو جس میں میں اللہ کی اطاعت کروں، اگر میں اللہ کی نافرمانی کروں تو تم پر میری اطاعت فرض نہیں۔ واللہ أعلم

دنیا میں گناہوں کے مراتب:

یہاں مذمت اور سزا کے اعتبار سے دنیا میں گناہوں کے مراتب بیان کرنا مقصود ہے، یہ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ وہ گناہ جن میں دین اور دنیا کے معاملے میں کسی دوسرے پر ظلم ہو یا ان کے ذریعے اس کو نقصان پہنچے، ان کی دنیاوی سزا ایسے گناہوں سے زیادہ سخت ہوتی ہے جو دوسرے کو نقصان پہنچانے پر مشتمل نہیں ہوتے، بھلے آخرت میں

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٣٦٢٢)

اس کی سزا اُس سے کہیں زیادہ اور بڑی ہو، مثلاً: جرم کرنے والے مسلمانوں کو ایسی سزائیں دی جاتی ہیں جو ذمی کافروں کو نہیں دی جاتیں، کافر کو آخرت میں مسلمان سے زیادہ سخت عذاب اور سزا ہوگی۔

اسی طرح جو کھلے عام گناہ کرتا ہے، اس کو وہ سزا دی جاتی ہے جو چھپ کر گناہ کرنے والے کو نہیں دی جاتی۔ بدعت کا اظہار اور اس کی دعوت پھیلانے والے کو وہ سزا دی جاتی ہے جو اپنے نفاق کو چھپا کر رکھنے والے اور اس کو نہ پھیلانے والے منافق کو نہیں دی جاتی۔ ان لوگوں کو سزا دینے کا سبب دین اور دنیا سے ظالموں کے ظلم کو دور کرنا ہے، مگر جو صرف اپنی ذات پر ظلم کرتا ہے تو اس کی سزا اس کے خدا کا معاملہ ہے۔

سو باتوں کی ایک ہی بات ہے کہ سارے گناہ ظلم ہوتے ہیں، یا بندہ صرف گناہ کر کے اپنی ذات پر ظلم کرتا ہے، یا کسی دوسرے کو ظلم کا شکار بناتا ہے، جس میں دوسرے پر ظلم کیا جائے تو اس کی روک تھام کے لیے اور دین و دنیا میں ظالم کے ظلم کا خاتمہ کرنے کے لیے سزا متعین کرنا ضروری ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ۚ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰی نَصْرِهِمْ لَقَدِیْرُ ۙ ﴾ [الحج: ٣٩]

''ان لوگوں کو جن سے لڑائی کی جاتی ہے، اجازت دے دی گئی ہے، اس لیے کہ یقیناً ان پر ظلم کیا گیا اور بے شک اللہ ان کی مدد کرنے پر یقیناً پوری طرح قادر ہے۔''

یہاں دوسرے کو سزا دینے کے جواز کا سبب جو قتال ہے، یہ ہے کہ ان پر ظلم کیا گیا، دوسری جگہ فرمایا:

﴿ وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰی لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّیَكُوْنَ الدِّیْنُ لِلّٰهِ ؕ فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَی الظّٰلِمِیْنَ ﴾ [البقرة: ١٩٣]

''اور ان سے لڑو، یہاں تک کہ کوئی فتنہ نہ رہے اور دین اللہ کے لیے ہو جائے، پھر اگر وہ باز آ جائیں تو ظالموں کے سوا کسی پر کوئی زیادتی نہیں۔''

یہاں بیان کیا کہ ظالم پر زیادتی کی جا سکتی ہے، یعنی اس کے حق میں مطلق حد کے تجاوز کے ساتھ اور یہی سزا ہے، یہ زیادتی جائز ہے، جس طرح اس آیت میں ہے:

﴿ فَمَنِ اعْتَدٰی عَلَیْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَیْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰی عَلَیْكُمْ ۪ ﴾ [البقرة: ١٩٤]

''پس جو تم پر زیادتی کرے سو تم اس پر زیادتی کرو، اس کی مثل جو اس نے تم پر زیادتی کی ہے۔''

کچھ مفسرین نے کہا ہے کہ یہاں عدوان، یعنی زیادتی سے مراد حقیقت میں زیادتی کرنا نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ نے یہ لفظ محض مقابلے اور جواب آں غزل کے طور پر ذکر کیا ہے، جس طرح اس آیت میں ہے:

﴿ وَجَزٰٓؤُا سَیِّئَةٍ سَیِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۚ ﴾ [الشوریٰ: ٤٠]

''اور کسی برائی کا بدلہ اس کی مثل ایک برائی ہے۔''

لیکن یہاں اس تاویل کی ضرورت نہیں، کیوں کہ مطلق عدوان کا مطلب ہے مطلق حد سے تجاوز کرنا اور یہ اس کے حق میں جائز نہیں، اِلا یہ کہ وہ زیادتی کرے، تو جس قدر اس نے حد سے تجاوز کیا، اسی قدر اس کے حق میں حد سے تجاوز کیا جائے گا۔ جہاں تک سیئہ کا تعلق ہے تو سیئہ اسے کہا جاتا ہے جو انسان کو برا لگے، قرآن کریم میں کئی ایک جگہ مصیبتوں اور سزاؤں کو سیئہ کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ظلم کی دو اقسام ہیں: ایک حق میں تفریط کرنا اور دوسرے حد سے تجاوز کرنا، پہلے کی مثال انسان کے ذمے جو دوسرے کے حقوق واجب الادا ہیں ان کو ادا نہ کرنا، مثلاً کسی کا قرض ادا نہ کرنا اور امانت ادا نہ کرنا وغیرہ، اور حد سے تجاوز کی مثال ہے: کسی کو قتل کرنا، کسی کا مال چھیننا، یہ دونوں ہی ظلم ہیں۔ اسی بنا پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: ''مال دار کا ٹال مٹول کرنا ظلم ہے۔'' یہاں آپ ﷺ نے خالی ٹال مٹول کو ظلم کہا ہے جو ادا کرنے کی طاقت کے باوجود تاخیر کو کہا جاتا ہے، لیکن جو انسان بالکل نہیں دیتا، اس کو کیا کہا جائے گا؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ وَيَسْتَفْتُونَكَ فِي النِّسَآءِ ۖ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيكُمْ فِيهِنَّ وَمَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ فِي يَتٰمَى النِّسَآءِ الّٰتِي لَا تُؤْتُونَهُنَّ مَا كُتِبَ لَهُنَّ وَتَرْغَبُونَ اَنْ تَنْكِحُوهُنَّ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الْوِلْدَانِ وَاَنْ تَقُومُوا لِلْيَتٰمٰى بِالْقِسْطِ ۚ ﴾ [النساء: ١٢٧]

''اور وہ تجھ سے عورتوں کے بارے میں فتویٰ پوچھتے ہیں، کہہ دے اللہ تمھیں ان کے بارے میں فتویٰ دیتا ہے اور جو کچھ تم پر کتاب میں پڑھا جاتا ہے وہ ان یتیم عورتوں کے بارے میں ہے جنھیں تم وہ نہیں دیتے جو ان کے لیے فرض کیا گیا ہے اور رغبت رکھتے ہو کہ ان سے نکاح کر لو اور نہایت کمزور بچوں کے بارے میں ہے اور اس بارے میں ہے کہ یتیموں کے لیے انصاف پر قائم رہو۔''

اس آیت کی تفسیر میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: اس سے مراد وہ یتیم لڑکی ہے جو اپنے ولی اور سرپرست کی زیرِ کفالت ہو اور وہ اس کے مہر میں انصاف نہ کرتے ہوئے اس کے ساتھ نکاح کرنے کا ارادہ رکھتا ہو۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے تکمیلِ مہر کو قسط کہا ہے جو ظلم کا متضاد ہے۔

یہ بات اجمالاً بالکل ظاہر اور مسلمانوں کے ہاں متفقہ ہے کہ عدل کبھی ادائے واجب میں ہوتا ہے اور کبھی ترکِ حرام میں اور کبھی دونوں کا مجموعہ ہوتا ہے۔ ظلم بھی کبھی واجب کو ترک کرنے میں اور کبھی حرام کام کرنے میں ہوتا ہے اور کبھی دونوں کا مجموعہ۔ اگر یہ قاعدہ معلوم ہو گیا ہے تو یہ بات بالکل واضح ہو جانی چاہیے کہ عدل اور ظلم کبھی انسان کا اپنے حق میں ہوتا ہے اور کبھی لوگوں کے حقوق میں۔ اس کی تفصیل کسی جگہ گزر چکی ہے۔ قصہ مختصر! تمام نیکیاں اور

حسنات عدل میں داخل ہیں اور تمام سیئات، یعنی برائیاں ظلم میں داخل ہیں۔ اس قاعدے کو سمجھ لینے سے کئی مسائل واضح ہو جاتے ہیں، ایک مسئلہ بطورِ مثال درج کیا جاتا ہے:

مسلمانوں میں جو اولی الامر کا درجہ رکھتے ہیں وہ ایک علما ہیں اور دوسرے امرا اور ان کے پیروکار۔ ان دونوں طبقوں کے ذمے لوگوں کے کچھ حقوق ہوتے ہیں جن کا ادا کرنا ان کا فرض ہوتا ہے، وہ ان پر فرض ہوتے ہیں، دوسرے پر نہیں اور وہ ان کے مرتبے کا تقاضا ہوتے ہیں، دوسرے کا نہیں۔ اسی طرح ان کا مرتبہ ان پر ایسے امور کو حرام کر دیتا ہے جو دوسرے پر حرام نہیں ہوتے یا ان کی حرمت اس کے حق میں خفیف ہوتی ہے۔

اس کی مثال جہاد ہے، یہ مسلمانوں پر عمومی طور پر فرضِ کفایہ ہے، کبھی کچھ پر فرضِ عین بھی ہو جاتا ہے، لیکن وہ جو تنخواہ دار فوجی ہوں، جن کو مالِ غنیمت سے حصہ ملتا ہو، وہ ان پر شریعت کی رو سے بھی فرضِ عین ہوتا ہے، امیر کی بیعتِ اطاعت کی رو سے اور اس عوض کی وجہ سے جو ان کو ملتا ہے، بلکہ اگر یہ ان پر شریعت یا بیعت کی رو سے نہ فرض ہو تو بھی اس معاوضے کی وجہ سے فرض ہوتا ہے جو وہ حاصل کرتے ہیں۔ جس طرح مزدور مزدوری لیتا ہے تو مزدوری کرنا اس کا فرض ہوتا ہے جو قیمت لیتا ہے تو سامان دینا اس پر فرض ہوتا ہے۔ نیز وہ اس پہلو سے بھی واجب ہوتا ہے کہ اگر وہ اس کو نہ کرے تو مسلمانوں کو نقصان پہنچ سکتا ہے، گویا وہ یہ ذمے داری قبول کر کے مسلمانوں کو دفاع کی ضمانت مہیا کرتے ہیں جس سے لوگوں کو اطمینان ہو جاتا ہے اور وہ ان پر اعتماد کرتے ہوئے اپنے دفاع سے بے فکر ہو جاتے ہیں۔ اب اگر یہ تنخواہ اور مفادات حاصل کرنے والے فوجی اپنی ذمے داری میں غفلت کا شکار ہوں تو وہ مسلمانوں کو دین، جان، مال اور اولاد میں ناقابلِ تلافی نقصان پہنچانے کا باعث بنیں گے۔ یہ ان کا وہ ظلم ہوگا جس کا نقصان دوسرے مسلمانوں کو بھی پہنچے گا تو اس کی سزا بھی اتنی ہی سخت ہوگی، لیکن اس ظلم کے عکس جس کا اثر کسی دوسرے پر نہیں پڑتا، صرف کرنے والے کی ذات تک محدود رہتا ہے، مثلاً: ایک شخص شراب پیتا ہے، بدکاری کرتا ہے تو یہ اس کا ظلم اپنی جان کے ساتھ خاص ہے، اب ترکِ جہاد کی سزا اس سے کہیں زیادہ ہوگی۔

اسی طرح اہلِ علم کی مثال لیں جو کتاب وسنت کی لفظی اور معنوی حفاظت پر مامور ہیں، اگرچہ یہ حفاظت امت پر عمومی طور پر بطور فرضِ کفایہ واجب ہے، کبھی کسی پر فرضِ عین ہوتی ہے، لیکن وہ اہلِ علم جو اس کام کے لیے مامور ہوں اور ان کو اس کام کی تنخواہ ملتی ہو، ان پر یہ ذمے داری تاکید کے ساتھ عائد ہوتی ہے۔ کبھی کسی پر یہ ذمے داری اس کی قدرت اور استعداد کی وجہ سے بھی عائد ہو جاتی ہے جو کسی دوسرے کو حاصل نہیں ہوتی۔ قدرت میں عقلی استعداد، طلبِ علم کی ہمت علم تک پہنچانے والے راستوں کا علم، تمام متعدد دلائل سے واقفیت اور مکمل فراغت شامل ہے۔

جو لوگ علم کے لیے وقف ہو جاتے ہیں، دین کے علم کی حفاظت اور اس کی تبلیغ ان کی ذمے داری بن جاتی

ہے، اگر وہ دین کے علم کو آگے نہ پہنچائیں، یا جو علم حاصل کیا تھا اس کو ضائع کر دیں تو یہ مسلمانوں پر سب سے بڑا ظلم ہوگا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالْهُدٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا بَيَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتٰبِ اُولٰٓئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ ﴾ [البقرۃ: ۱۵۹]

''بے شک جو لوگ اس کو چھپاتے ہیں جو ہم نے واضح دلیلوں اور ہدایت میں سے اتارا ہے، اس کے بعد کہ ہم نے اسے لوگوں کے لیے کتاب میں کھول کر بیان کر دیا ہے، ایسے لوگ ہیں کہ ان پر اللہ لعنت کرتا ہے اور سب لعنت کرنے والے ان پر لعنت کرتے ہیں۔''

کیوں کہ ان کے چھپانے کا ضرر جانوروں تک جا پہنچتا ہے، اس لیے جانور تک ان پر لعنت کرتے ہیں جس طرح معلمِ خیر اور دین کا سبق پڑھنے پڑھانے والے کے لیے فرشتے دعائیں کرتے ہیں، ہر چیز حتی کہ سمندر کے پیٹ میں مچھلیاں اور فضائے بسیط میں اڑتے ہوئے پرندے بھی اس کے حق میں دعائے مغفرت کرتے ہیں۔

اسی طرح ان علما کا علم میں جھوٹ بولنا، معاصی اور بدعتوں کا اعلان و اظہار جو ان سے اعتماد ختم کر دیتا ہے اور دلوں میں ان کی پیروی سے نفرت پیدا کر دیتا ہے، سب سے بڑا ظلم ہے، اس بنا پر وہ ایسی شدید مذمت اور سزا کے مستحق ہوتے ہیں، جو ایک عام اور جاہل شخص جو گناہوں اور بدعات کا پرچار کرے، وہ اتنی شدید سزا کا مستحق نہیں ہوتا، کیوں کہ اگرچہ اس میں ایک نوع کا ضرر ہوتا ہے، لیکن اس کا ضرر اس عالم کے ضرر اور نقصان جیسا نہیں ہوتا جو حق کے ظہور میں رکاوٹ اور باطل کے ظہور میں معاون بنتا ہے۔

لہٰذا اہلِ علم کا تبلیغ ترک کرنا، اہلِ جہاد کے جہاد ترک کرنے کے مانند ہے اور یہ دونوں ہی بہت بڑے گناہ ہیں۔ اسی طرح تمام ذمے داران اپنی اپنی ذمے داری کے مطابق جواب دہ ہیں۔ جو امت کی مفادات میں بے پروائی سے کام لیتا ہے یا حد سے تجاوز کرتا ہے تو اس کا وہ گناہ اس کے انفرادی گناہ سے زیادہ شدید اور قابلِ مذمت ہے۔ (ملخصاً)[1]

شرعی ترکِ تعلق کی صورتیں اور حکم

سوال کس سے بغض رکھنا یا ترکِ تعلقات کرنا ضروری ہے، جب یہ دونوں کام صرف اللہ کے لیے ہوں؟ نیز اس ترکِ تعلق اور بغض کی کیا شرائط ہیں؟ کیا سلام نہ لینا ترکِ تعلق میں داخل ہے؟ نیز اگر دوسرا شخص سلام لے تو اس کا جواب دینا ضروری ہے؟ نیز یہ کس وقت تک جاری رہنا چاہیے؟

اس سلسلے میں ہماری رہنمائی فرما کر عنداللہ ماجور ہوں۔

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۱۲۱/۲۸۔۱۷۹)

جواب شرعی ترکِ تعلق (ہجرِ شرعی) کی دو انواع ہیں: ایک ہے منکرات اور برائیوں کی وجہ سے تعلق ترک کرنا اور دوسرا ہے ان کی سزا کے طور پر تعلق ختم کرنا۔

پہلا معنی قرآن کریم کی ان آیات میں درج ہے:

﴿ وَاِذَا رَاَيْتَ الَّذِيْنَ يَخُوْضُوْنَ فِيْۤ اٰيٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖ ؕ وَاِمَّا يُنْسِيَنَّكَ الشَّيْطٰنُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰى مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴾ [الأنعام: ٦٨]

''اور جب تو ان لوگوں کو دیکھے جو ہماری آیات کے بارے میں (فضول) بحث کرتے ہیں تو ان سے کنارہ کر، یہاں تک کہ وہ اس کے علاوہ بات میں مشغول ہو جائیں اور اگر کبھی شیطان تجھے ضرور ہی بھلا دے تو یاد آنے کے بعد ایسے ظالم لوگوں کے ساتھ مت بیٹھ۔''

﴿ وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَاُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖۤ ؕ اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ ﴾ [النساء: ١٤٠]

''اور بلاشبہ اس نے تم پر کتاب میں نازل فرمایا ہے کہ جب تم اللہ کی آیات سنو کہ ان کے ساتھ کفر کیا جاتا ہے اور ان کا مذاق اڑایا جاتا ہے تو ان کے ساتھ مت بیٹھو، یہاں تک کہ وہ اس کے علاوہ کسی اور بات میں مشغول ہو جائیں۔ بے شک تم بھی اس وقت ان جیسے ہو۔''

ان آیات کا مفہوم یہ ہے کہ کسی ضرورت کے بغیر منکرات اور برے کاموں سے دور رہا جائے، مثلاً کچھ لوگ شراب پی رہے ہوں، یا کوئی ایسی دعوتِ طعام میں شرکت کے لیے کہے جس میں شراب نوشی اور گانے بجانے کا اہتمام ہو تو اس میں شرکت کرنے سے احتراز کیا جائے، البتہ اگر کوئی ان کو روکنے کے لیے وہاں جائے، یا بغیر اختیار جائے تو علاحدہ بات ہے۔ اسی وجہ سے یہ بات کہی جاتی ہے کہ جو شخص کسی منکر میں شرکت کرے وہ کرنے والے ہی کی طرح ہوتا ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے: ''جو اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہے وہ ایسے دسترخوان پر نہ بیٹھے جس پر شراب پی جائے۔''[1]

یہ ترک منکرات اور برائیوں کو ترک کرنے کی قبیل سے ہے، جس طرح رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

((اَلْمُهَاجِرُ مَنْ هَجَرَ مَا نَهَى اللّٰهُ عَنْهُ))[2]

''مہاجر (چھوڑنے والا) وہ ہے جو ہر وہ چیز چھوڑ دے جس سے اللہ نے منع کیا ہے۔''

دار الکفر اور مقامِ فسق و فجور سے دار الاسلام اور دیارِ ایمان کی طرف ہجرت کرنا بھی اسی باب سے تعلق رکھتا

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٨٠١) صحيح الجامع، رقم الحديث (٦٥٠٦)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٠)

ہے، یہ کافروں اور منافقوں کے ہاں رہنے کو چھوڑ دینا ہے جو انسان کو اپنے دین پر عمل کرنے سے روکیں، اللہ کا یہ فرمان بھی اسی معنی پر دلالت کرتا ہے:

﴿ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ ﴾ [المدثر: ٥] ''اور پلیدگی کو پس چھوڑ دے۔''

دوسری قسم بطورِ تادیب اور سزا تعلق ختم کرنا۔ جو شخص برائیوں کو ظاہر کرے، اس سے اس وقت تک تعلقات منقطع رکھنا، جب تک وہ توبہ نہ کرے، ہجرِ شرعی کی دوسری قسم ہے۔ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ان تین مسلمانوں کے ساتھ تعلقات منقطع کر لیے جو غزوۂ تبوک میں کسی عذر کے بغیر پیچھے رہے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول کی اور قرآن میں اس کی صراحت کر دی، یہاں ان سے تعلقات ختم کرنا بطور تعزیر تھا اور تعزیر اس کے لیے ہوتی ہے جو واجبات و فرائض کا تارک اور حرام کاموں کا مرتکب ہو رہا ہو، مثلاً تارکِ نماز و زکات، مظالم و فواحش کا اظہار کتاب و سنت اور اجماع کے خلاف بدعت کا داعی اور پرچارک۔

ائمہ کرام اور سلف صالحین سے یہ جو منقول ہے کہ بدعت کا پرچار کرنے والوں کی گواہی قبول نہ کی جائے، ان کے پیچھے نماز نہ پڑھی جائے، ان سے علم حاصل نہ کیا جائے اور ان کے ساتھ رشتے استوار نہ کیے جائیں تو یہ ان کی سزا کے طور ہے، تاآنکہ وہ باز آ جائیں۔ اسی وجہ سے علما و سلف بدعت کو پھیلانے والے اور نہ پھیلانے والے کے درمیان فرق کرتے ہیں، کیوں کہ پھیلانے والا منکرات کو ظاہر کرتا ہے، اس لیے سزا کا حق دار بنتا ہے، چھپانے والے کے عکس، وہ ان منافقوں سے برا نہیں کہ رسول اللہ ﷺ جن کا علانیہ ایمان قبول کرتے تھے اور ان کے باطن کو اللہ کے سپرد کرتے تھے، حالانکہ آپ ﷺ کو اکثر کے بارے میں علم ہوتا تھا۔ اسی وجہ سے حدیث شریف میں آیا ہے: ''معصیت جب پوشیدہ ہو تو وہ صرف معصیت کرنے والے کو نقصان دیتی ہے، لیکن جب اس کا برملا اظہار کیا جائے اور اس کو روکا نہ جائے تو وہ عوام کو نقصان پہنچاتی ہے۔''[1]

کیوں کہ آپ ﷺ کا یہ فرمان بھی ہے: ''لوگ جب برائی دیکھیں اور اس کو نہ روکیں تو قریب ہے کہ اللہ ان کو اپنی طرف سے عمومی سزا دے۔''[2]

چنانچہ برملا کی جانے والی برائیوں کو روکنا ضروری ہوتا ہے، پوشیدہ برائیوں کے عکس کہ ان کا نقصان خاص طور پر ان کے کرنے والوں تک محدود رہتا ہے۔

---

[1] المعجم الأوسط (٩٤/٥) شعب الإيمان ٩٩/٦) السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (١٦١٢)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٣٣٨) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢١٦٨) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٠٠٥) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٥٦٤)

یہ ترکِ تعلق ترکِ تعلقات کرنے والوں کی قوت وضعف اور قلت و کثرت کے لحاظ سے مختلف درجات کا حامل ہوتا ہے۔ مقصود مہجور (چھوڑا گیا شخص) کو ڈانٹ پلانا اور عوام کو اس طرح کے کاموں سے روکنا ہے۔ یہاں مصلحت کو دیکھا جائے گا، اگر یہ ترکِ تعلق اس شخص کی برائی کو کمزور اور کم کرنے میں معاون ہو، تب جائز ہے۔ اگر مہجور باز آئے نہ کوئی دوسرا، بلکہ اس کی وجہ سے برائی مزید بڑھ جائے اور ہاجر (چھوڑنے والا ترکِ تعلق کرنے والا) کمزور ہو، یعنی اس کی مفسدت اس کی مصلحت سے بھاری پڑ رہی ہو تو پھر یہ ہجر اور ترک مشروع و جائز نہیں ہوگا، بلکہ کچھ لوگوں کے لیے تالیفِ قلب اور خاطر داری ہجر سے زیادہ فائدہ مند ثابت ہوتی ہے اور کچھ دوسرے لوگوں کے لیے ہجر تالیفِ قلب سے زیادہ مفید ثابت ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ کچھ لوگوں کی تالیفِ قلب کرتے اور کچھ لوگوں سے تعلقات ختم کر لیتے۔

جس طرح وہ تین صحابہ جو کسی عذر کے بغیر غزوۂ تبوک سے پیچھے رہے۔ وہ ایسے بہت سے لوگوں سے بہتر تھے، جن کی تالیفِ قلب کی گئی۔ یہ لوگ اپنے اپنے قبیلے کے سردار اور نمایاں مقام رکھتے تھے، ان کی تالیفِ قلب کرنا دینی مصلحت کا تقاضا تھا، جب وہ مومن تھے اور مومن ان کے علاوہ بھی بہت تھے۔ ان کے ساتھ تعلقات ختم کرنا دین کی عزت اور ان کو گناہوں سے پاک کرنے کے لیے تھا۔ یہ ایسے ہی ہے، جیسے کبھی جنگ بہتر ہوتی ہے، کبھی صلح اور کبھی جزیہ لینا، یہ سب احوال اور مصالح کی مناسبت سے مختلف ہوتا ہے۔

اس باب میں امام احمد وغیرہ کا جواب اسی اصل اور قاعدے پر مبنی ہے، اس لیے وہ ان جگہوں میں فرق کرتے تھے، جہاں بدعات کا ظہور زیادہ تھا اور جہاں اس طرح نہیں تھا، مثلاً: بصرہ میں قدریوں کی کثرت تھی، خراسان میں نجوم کا دور دورہ تھا، کوفہ میں شیعیت پھیلی ہوئی تھی، اسی طرح وہ ان ائمہ میں بھی فرق کرتے تھے، جن کی پیروی کی جاتی اور جن کی نہ کی جاتی۔

جب انسان مقصدِ شریعت جان لے تو وہ اس کے حصول کی سب سے صحیح راہ پر گامزن ہو جاتا ہے۔

اگر شرعی ہجر کے اس مفہوم اور اصلیت کو مدِنظر رکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ ان اعمال میں داخل ہے جن کا حکم اللہ اور اس کے رسول نے دیا ہے، فرماں برداری اور نیکی کے لیے ضروری ہے کہ وہ اللہ کے لیے خالص ہو اور اس کے حکم کے مطابق ہو، تاکہ وہ اللہ کے لیے خالص اور سنت کے مطابق ہو کر درست ہو۔ جو شخص محض اپنی خواہشِ نفس کی پیروی میں کسی سے تعلقات ختم کرتا ہے، یا غیر مامور انداز میں تعلقات ختم کرتا ہے، وہ شرعی ہجر سے خارج ہے۔ بے شمار ایسے لوگ ہیں جو اپنی مرضی اور خواہشِ نفس کے مطابق عمل کرتے ہیں اور سمجھ رہے ہوتے ہیں کہ وہ یہ کام اللہ کی فرماں برداری میں کر رہے ہیں!

ذاتی خواہش کی بنا پر کسی سے تعلقات ختم کرنا تین راتوں سے زیادہ جائز نہیں، صحیحین میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''کسی مسلمان کے لیے اپنے بھائی سے تین دنوں سے زیادہ بول چال بند رکھنا جائز نہیں، دونوں ملیں تو ایک دوسرے سے کترا کر گزر جائیں، ان میں سے بہتر وہ ہے جو سلام میں ابتدا کرے۔''[1]

اس ہجر اور ترکِ تعلق کے لیے آپ ﷺ نے تین دنوں سے زیادہ کی رخصت نہیں دی۔ اسی طرح آپ ﷺ نے بیوی کے علاوہ دیگر وابستگان کے سوگ کے لیے تین دن سے زیادہ کی اجازت نہیں دی۔ صحیحین میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

''ہر سوموار اور جمعرات کے روز جنت کے دروازے کھولے جاتے ہیں اور ہر اس بندے کو معاف کر دیا جاتا ہے جو اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہیں بناتا، سوائے اس شخص کے جس کی اس کے بھائی کے ساتھ عداوت (لڑائی) ہو، پھر کہا جاتا ہے کہ ان دونوں کو اس وقت تک مہلت دو جب تک صلح نہ کرلیں۔''[2]

یہ ہجر اور قطع تعلقی انسان کے حق میں حرام ہے، البتہ بعض صورتوں کی رخصت ہے، مثلاً: خاوند کے لیے اجازت ہے کہ جب اس کی بیوی نافرمانی پر اتر آئے تو بستر میں اس سے علاحدگی اختیار کرلے، اسی طرح تین راتوں تک کے لیے ہجر کی اجازت ہے۔

چنانچہ انسان کو اللہ کے حق اور اپنے حق کے لیے ہجر اور ترکِ تعلق میں فرق کرنا چاہیے، پہلے کا حکم ہے اور دوسرا منع ہے، کیوں کہ مومن آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ صحیح حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''ایک دوسرے سے قطع تعلقی نہ کرو، ایک دوسرے سے پشتیں نہ پھیرو، ایک دوسرے سے بغض نہ رکھو، ایک دوسرے سے حسد نہ رکھو اور اللہ کے بندے اور بھائی بھائی بن کر رہو، مسلمان مسلمان کا بھائی ہے۔''[3]

سنن میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

''میں تمھیں ایسا عمل نہ بتاؤں جو نماز، روزے، صدقے اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے درجے سے بھی افضل ہے؟ انھوں نے کہا: کیوں نہیں اے اللہ کے رسول! آپ ﷺ نے فرمایا: لوگوں کے درمیان

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٧٢٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٦٠)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٦٥)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٣١٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٨٠)

صلح کروانا، لوگوں کے درمیان فساد پیدا کرنا حالقہ ہے، میں یہ نہیں کہتا کہ حالقہ بال مونڈنے کا نام ہے، یہ دین مونڈ دیتی ہے۔''[1]

صحیح حدیث میں ہے: ''مومنوں کی آپس میں مودّت، رحم دلی اور شفقت کی مثال ایک جسم کی مثال ہے، جب اس کا ایک عضو بیمار پڑتا ہے تو وہ سارے جسم کو بخار اور بیداری میں مصروف رکھتا ہے۔''[2]

مزید برآں یہ شرعی ہجر ''شرعی سزاؤں'' کے باب سے تعلق رکھتا ہے اور یہ جہاد فی سبیل اللہ کی جنس سے ہے جو اعلائے کلمۃ اللہ اور اللہ کے دین کو غالب و سربلند کرنے کے لیے کیا جاتا ہے۔ ایک مومن کو چاہیے کہ جس کے ساتھ دشمنی رکھے تو اللہ کے لیے رکھے اور جس سے دوستی رکھے تو بھی اللہ کے لیے رکھے، اگر کوئی مومن ہو تو وہ اس کے ساتھ دوستی رکھے، خواہ وہ اس پر ظلم ہی کرے، کیوں کہ ظلم ایمانی موالات اور دوستی کو قطع نہیں کرتا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَاِنْ طَآىِٕفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا ۚ فَاِنْۢ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ فَاۗءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۝ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ ﴾ [الحجرات: ۹، ۱۰]

''اور اگر ایمان والوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو دونوں کے درمیان صلح کرا دو، پھر اگر ان دونوں میں سے ایک دوسرے پر زیادتی کرے تو اس (گروہ) سے لڑو جو زیادتی کرتا ہے، یہاں تک کہ اللہ کے حکم کی طرف پلٹ آئے، پھر اگر وہ پلٹ آئے تو دونوں کے درمیان انصاف کے ساتھ صلح کرا دو اور انصاف کرو، بے شک اللہ انصاف کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔ مومن تو بھائی ہی ہیں۔''

اللہ تعالیٰ نے قتال (لڑائی) یعنی بغاوت و ظلم کے باوجود انھیں بھائی بنایا ہے اور ان کے درمیان صلح کروانے کا حکم دیا ہے۔

چنانچہ ایک مومن کو ان دونوں اقسام کے ہجر میں تامل کرنا چاہیے، کیوں کہ اکثر ان میں التباس ہو جاتا ہے۔ نیز مومن کے ساتھ دوستی رکھنا فرض ہے، خواہ وہ ظلم اور زیادتی کرے۔ اسی طرح کافر سے دشمنی اور عداوت رکھنا بھی ضروری ہے، خواہ وہ نوازشیں اور احسان کرے۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے نبی مبعوث کیے اور کتابیں اتاریں، تاکہ سارے کا سارا دین اللہ کے لیے ہو جائے، لہٰذا اس کے اولیا، یعنی دوستوں سے محبت ہو، اس کے دشمنوں سے عداوت ہو، اس کے دوستوں کا احترام کیا جائے، اس کے دشمنوں کی توہین کی جائے ثواب اس کے دوستوں کے لیے ہے اور سزا اس کے دشمنوں کے لیے۔

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٩١٩) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٥٠٩) شیخ البانی رحمہ اللہ نے اسے صحیح کہا ہے۔

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٦٦٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٨٦)

اگر کسی ایک انسان میں خیر و شر، نیکی و بدی، نافرمانی و فرماں برداری اور سنت و بدعت پائی جائے اور باہم آور ہو جائے تو جس قدر اس میں اچھائی ہو اس کے مطابق وہ موالات اور دوست داری کا حق دار ہوگا اور جس قدر اس میں برائی ہو اس کے مطابق ترکِ تعلق اور عداوت داری کا حق رکھے گا، اس طرح شر کے مطابق ہی اس کو سزا دی جائے گی۔ کسی ایک ہی شخص میں تکریم اور توہین کے اسباب اکٹھے ہو جائیں تو اس کے مطابق ہی اس کے ساتھ اچھا یا برا سلوک ہوگا، مثلاً: ایک فقیر چور کا ہاتھ کاٹا جائے گا مگر بیت المال سے اس کو اتنا مال بھی دیا جائے گا جو اس کی ضرورت کے لیے کافی ہو۔

یہ قاعدہ اہلِ سنت والجماعت کے نزدیک متفقہ ہے۔ خوارج اور معتزلہ اور ان کے ہم نوا اس کی مخالفت کرتے ہیں۔ وہ لوگوں کو نہ صرف ثواب کے مستحق کہتے ہیں اور نہ صرف عذاب کے مستحق، لیکن اہلِ سنت کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کبیرہ گناہ کرنے والوں میں سے جس کو چاہے گا جہنم کا عذاب دے گا، پھر ان کو ان کی سفارش سے جہنم سے نکال لے گا جن کو سفارش کی اجازت دے گا۔ نبی اکرم ﷺ کی احادیث و سنت سے بھی یہی ثابت ہے۔

والله أعلم وصل اللهم على محمد وعلى آله وصحبه أجمعين.[1]

بچپن کے گناہ پر ترکِ تعلق

سوال کسی مسلمان سے بچپن میں ایسی غلطی صادر ہوئی ہو جو اس سے تعلقات ختم کر دینے کے لیے کافی ہو تو کیا اس سے تجاوز کیا جائے یا اس کے ساتھ میل جول قائم کیا جائے؟

جواب بلاشبہ جو صدقِ دل سے اللہ سے رجوع کرتا ہے اللہ تعالیٰ بھی اس پر مہربانی فرماتے ہیں، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَهُوَ الَّذِىْ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَيَعْفُوْا عَنِ السَّيِّاٰتِ وَيَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ ﴾ [الشوری: ٢٥]

''اور وہی ہے جو اپنے بندوں سے توبہ قبول کرتا ہے اور برائیوں سے درگزر کرتا ہے اور جانتا ہے جو تم کرتے ہو۔''

﴿ قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۚ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ۚ ﴾ [الزمر: ٥٣]

''کہہ دے اے میرے بندو جنھوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی! اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو جاؤ بے شک اللہ سب کے سب گناہ بخش دیتا ہے۔''

---

[1] مجموع الفتاویٰ (٢٨/٢٠٣۔٢٠٩)

یعنی اس کے سارے گناہ معاف کرتا ہے جو توبہ کرتا ہے۔

اگر اس طرح ہے کہ اس شخص نے توبہ کی، پھر ایک سال تک نیک اعمال کرتا رہا اور توبہ نہ توڑی تو اس کی گواہی قبول کی جائے اور اس کے ساتھ میل ملاپ اور گفتگو رکھی جائے۔ اگر ایک سال نہ گزرا ہو تو اس بارے میں علما کے دو مشہور اقوال ہیں: کچھ کے مطابق توبہ کے بعد میل ملاپ رکھنا اور گواہی قبول کرنا جائز ہے، جب کہ کچھ کے نزدیک ایک سال کا گزرنا ضروری ہے، جس طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صبیغ بن عسل کے معاملے میں فیصلہ کیا تھا، تاہم یہ اجتہادی مسائل ہیں، دونوں اقوال میں سے جو قول بھی اختیار کیا جائے، جائز ہے اور یہ دونوں اقوال اپنی اپنی جگہ درست ہیں۔

البتہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فحاشی اور بے حیائی کو پھیلانے سے منع کیا ہے، ارشاد ہے:

﴿ اِنَّ الَّذِیْنَ یُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِیْعَ الْفَاحِشَةُ فِی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ ﴾ [النور: ١٩]

''بے شک جو لوگ پسند کرتے ہیں کہ ان لوگوں میں بے حیائی پھیلے جو ایمان لائے ہیں، ان کے لیے دنیا اور آخرت میں دردناک عذاب ہے۔''

اسی طرح فواحش کی پردہ پوشی کا حکم دیا گیا ہے، رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

''جو شخص ان گندگیوں میں سے کسی گندگی میں مبتلا ہو، اس کو اللہ تعالیٰ کی پردہ پوشی کے ساتھ پردہ ڈالنا چاہیے، جس نے ہمارے سامنے اپنا چہرہ ظاہر کیا تو ہم اس پر کتاب اللہ کے مطابق حد لگائیں گے۔''[1]

آپ ﷺ نے فرمایا: ''میری ساری امت کو معافی مل جائے گی، سوائے گناہوں کا اظہار کرنے والے کے، گناہوں کا اظہار یہ ہے کہ آدمی رات کو گناہ کرتا ہے اور اللہ اس پر پردہ ڈالتا ہے تو وہ صبح لوگوں کو بتاتا پھرتا ہے۔''[2]

گناہ جب تک پوشیدہ رہتا ہے، اس وقت تک اس کی مصیبت اور اثر اس آدمی تک محدود رہتا ہے، جب وہ اس کا اظہار کرے اور کوئی اس کو نہ روکے تو اس کا نقصان عام ہو جاتا ہے۔ جب اس کے ظہور میں دوسرے کو تحریک ملے تو ظاہر ہے اس کا نقصان دوچند ہو جاتا ہے۔ اسی بنا پر امام احمد وغیرہ نے عشقیہ شاعری سے منع کیا ہے، تاکہ دلوں میں فواحش کے لیے تحریک پیدا نہ ہو۔ لہٰذا جو شخص بیمارِ عشق ہو، اس کو چاہیے اپنے عشق کو اپنے اندر دبا کر رکھے اور صبر کرے، تاکہ ان لوگوں میں شامل ہو جائے جن کے متعلق اللہ فرماتے ہیں:

﴿ اِنَّهٗ مَنْ یَّتَّقِ وَیَصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا یُضِیْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ ﴾ [یوسف: ٩٠]

---

[1] الموطأ (٢/٨٢٥) السلسلة الصحيحة (٦٦٣)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٧٢١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٩٩٠)

''بے شک حقیقت یہ ہے کہ جو ڈرے اور صبر کرے تو بے شک اللہ نیکی کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔'' واللہ أعلم [1]

شراب نوش کے ساتھ تعلقات رکھنے کا حکم

سوال کیا شراب نوش کو سلام کہنا، اس کے سلام کا جواب دینا اور اگر مر جائے تو اس کے جنازے میں شریک ہونا جائز ہے؟ اسی طرح اگر وہ شراب کی حرمت میں شک کا اظہار کرے تو کیا کافر ہو جائے گا؟

جواب جو شخص فحاشی، شراب نوشی اور زیادتی جیسی کسی بھی برائی کا مرتکب ہو تو طاقت کے مطابق اس کو روکنا ضروری ہے، جس طرح فرمانِ حبیب ہے:

''تم میں سے جو برائی دیکھے اسے اپنے ہاتھ سے روکے، اگر اس کی طاقت نہ رکھتا ہو تو زبان سے بدلے اور اگر اس کی طاقت بھی نہ رکھتا ہو تو دل میں برا جانے، یہ کمزور ترین ایمان ہے۔'' [2]

اگر کوئی شخص چھپ کر یہ کام کرتا ہے اور برملا نہیں کرتا تو اس کو علاحدگی میں سمجھایا جائے اور اس کی پردہ پوشی کی جائے، جس طرح رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: ''جس نے کسی مسلمان کی پردہ پوشی کی، اللہ دنیا اور آخرت میں اس کی پردہ پوشی کرے گا۔'' [3] البتہ اگر اس کا ضرر اور نقصان اس تک محدود نہ رہے، بلکہ متعدی ہو جائے تو تب اس کی زیادتی کو روکنا ضروری ہوتا ہے۔ اگر انسان اس کو علاحدگی میں سمجھائے اور وہ پھر بھی باز نہ آئے تو اس کے ساتھ ایسا رویہ اختیار کرنا چاہیے جس سے وہ اس کام سے رک جائے، مثلاً: اس سے تعلقات منقطع کر لے اگر یہ دین کے لیے زیادہ مفید ہو۔

جب کوئی شخص برملا برائیاں کرے تو اس کو برملا روکنا ضروری ہوتا ہے، اب اس کے پاس پوشیدگی کا حق باقی نہیں رہتا، اس کو علانیہ ایسی سزا دینی چاہیے جس سے وہ باز آ جائے، لیکن اس شرط کے ساتھ کہ فاعل یہ کام کسی راجح مفسدت کے بغیر کرنے پر قادر ہو۔

اچھے اور دین دار لوگ جس طرح زندگی میں ایسے شخص سے تعلقات منقطع کرتے ہیں، اسی طرح اس کے مرنے کے بعد بھی اس سے تعلق توڑے ہی رکھیں، تاکہ اس طرح کے دیگر مجرم اس سے نصیحت حاصل کرتے ہوئے اپنے جرائم سے باز آ جائیں، لہٰذا اچھے لوگ اس کا جنازہ نہ پڑھیں، جس طرح رسول اللہ ﷺ نے اپنی زندگی میں کئی مجرموں کا جنازہ نہیں پڑھا۔

---

[1] مجموع الفتاویٰ (٢١٤/٢٨)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٤٩)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٣١٠) صحيح مسلم رقم الحديث (٢٥٨٠)

حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ کو بتایا گیا کہ آپ کا بیٹا کل رات فوت ہو گیا ہے، انھوں نے کہا: اگر وہ مرا تو میں اس کا جنازہ نہیں پڑھوں گا، کیوں کہ اس نے اپنے آپ کو مارنے میں اپنی اعانت کر کے خودکشی کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی خودکشی کرنے والے کا جنازہ نہیں پڑھا۔ جو شخص شراب، مردار اور فواحش جیسی متواتر حرام اشیا کو حرام ماننے سے انکار کرتا ہے، یا ان کی تحریم میں شک کرتا ہے تو اس کو ان کی حرمت کے بارے میں بتایا جائے اور اس سے توبہ کروائی جائے، اگر توبہ کرے تو صحیح، ورنہ اس کو قتل کر دیا جائے، کیوں کہ وہ مرتد ہے، اس کا جنازہ پڑھا جائے نہ اس کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن ہی کیا جائے۔ واللہ أعلم[1]

فاسق کی غیبت اور اس کے ساتھ تعلقات رکھنے کا حکم

سوال اس حدیث کا مفہوم کیا ہے: « لا غیبة للفاسق »؟ ''فاسق کی غیبت نہیں۔'' نیز اگر کوئی شخص شراب پی رہا ہو، یا شریکِ مے نوشی ہو، یا رقص و طرب کی محفل میں شریک ہو تو کیا اس کو سلام کہنا باعثِ گناہ ہو گا؟

جواب یہ حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان نہیں، بلکہ حضرت حسن بصری سے منقول ہے کہ انھوں نے کہا: ''کیا تم فاجر کا ذکر کرنے سے اعراض کرتے ہو؟ اس کی برائی بیان کرو، تا کہ لوگ اس سے بچیں۔''

ایک حدیث میں ہے: ''جس نے حیا کی چادر اتار دی اس کی غیبت نہیں، ان دونوں انواع کی غیبت بلا اختلافِ علما جائز ہے۔

ایک یہ کہ آدمی ظلم، بے حیائی اور بدعات جیسے گناہوں کا بے دھڑک اور برملا اظہار کرتا ہو تو اس کو حسبِ قدرت روکنا اور منع کرنا ضروری ہے، جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: ''تم میں سے جو کوئی بھی برائی دیکھے اسے اپنے ہاتھ سے روکے، اگر اس کی طاقت نہ رکھتا ہو تو اپنی زبان سے منع کرے اور اگر اس کی طاقت بھی نہ رکھتا ہو تو اپنے دل میں برا جانے اور یہ کمزور ترین ایمان ہے۔''[2]

مسند اور سنن میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انھوں نے کہا: ''لوگو! تم قرآن پڑھتے ہو اور یہ آیت بھی پڑھتے ہو مگر اس کو اس کی جگہ نہیں رکھتے: ﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ١ۚ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ١ؕ ﴾ [المائدة: ۱۰۵] ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تم پر اپنی جانوں کا بچاؤ لازم ہے، تمھیں وہ شخص نقصان نہیں پہنچائے گا جو گمراہ ہے، جب تم ہدایت پا چکے۔'' میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۲۸/۲۱۷۔۲۱۸)

[2] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۴۹)

''لوگ جب برائی دیکھیں اور اسے تبدیل نہ کریں تو قریب ہے اللہ ان کو اپنی طرف سے کوئی عمومی سزا دے۔''[1]

لہٰذا جو برملا برائی کرتا ہے اس کو روکنا ضروری ہے، اس کی کئی صورتیں ہیں، مثلاً: اس سے بول چال بند کر دی جائے، اس کی مذمت کی جائے وغیرہ۔

سلف سے جو یہ بات منقول ہے کہ ''جس نے حیا کی چادر اتاری، اس کی غیبت نہیں۔'' اس کا یہی مطلب ہے، لیکن جو چھپ چھپا کر گناہ کرتا ہے اس کی پردہ پوشی کرنی چاہیے اور اس کو علاحدگی میں سمجھانا چاہیے۔ جو شخص اس حالت اور راز سے آگاہ ہو وہ اس سے اس وقت تک میل جول چھوڑ سکتا ہے جب تک وہ باز نہ آ جائے، اسی طرح اس کے معاملے کو بطور عبرت اور نصیحت بھی پیش کیا جا سکتا ہے، لیکن اس کی پردہ دری اور رسوائی کے لیے نہیں۔

دوسری قسم یہ ہے کہ کسی شخص سے نکاح کرنا ہو، اس کے ساتھ کوئی معاملہ کرنا ہو یا اس کو گواہ بنانا ہو تو کسی ایسے شخص سے اس کے متعلق استفسار یا مشورہ کیا جائے جو اس کے حالات سے اچھی طرح باخبر ہو اور وہ جانتا ہو کہ وہ شخص ان کاموں کے لائق نہیں تو اس کو چاہیے کہ مشورہ مانگنے والے کو اس کے بارے میں صحیح بتا دے، جس طرح صحیح میں یہ واقعہ درج ہے کہ فاطمہ بنت قیس نے رسول اللہ ﷺ سے کہا: اے اللہ کے رسول! مجھے ابو جہم اور معاویہ نے نکاح کا پیغام بھجوایا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: ''ابو جہم عورتوں کے معاملے میں بڑا ہتھ چھٹ ہے اور معاویہ فقیر اور نادار ہے۔''[2] آپ ﷺ نے اس عورت کے سامنے نکاح کے خواہستگار دونوں افراد کی حالت اور اصلیت بیان کر دی۔

اوپر جو حضرت حسن بصری کا قول گزرا ہے اس کی دلیل یہی ہے۔

دین کے معاملے میں نصیحت اور خیر خواہی دنیا کے معاملے میں خیر خواہی سے بہت بہتر ہے۔ اگر رسول اللہ ﷺ نے دنیا کے معاملے میں اس عورت کی خیر خواہی کی تو دین میں خیر خواہی اس سے بہت اہم اور زیادہ ضروری ہے۔

اگر کوئی شخص بے نماز ہو، گناہوں کا شائق و مرتکب ہو اور کوئی ایسا شخص اس کے ساتھ رہتا ہو جس کے بارے میں خدشہ ہو کہ اس شخص کی بے دینی اس انسان کو خراب کر دے گی تو اس دوسرے شخص کے سامنے اس کی حالت بیان کر دینی چاہیے، تاکہ وہ اس کے ساتھ رہنے سہنے سے گریز کرے۔ اسی طرح اگر کوئی بدعتی ہو اور کتاب و سنت کے مخالف عقائد کی دعوت دیتا ہو، یا ایسی راہ کا مسافر ہو جو کتاب و سنت سے دور ہو اور خوف ہو کہ یہ شخص اپنے ان نظریات کے ساتھ لوگوں کو گمراہ کر دے گا تو لوگوں کے سامنے اس کی اصلیت بیان کرنی چاہیے، تاکہ وہ اس کی اصلیت

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٣٣٨) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢١٦٨) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٠٠٥) صحيح الجامع (١٩٧٣، ١٩٧٤)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٨٠)

جان کر اس کی گمراہی سے بچ جائیں، لیکن یہ عیب نمائی نصیحت اور خیر خواہی اور رضائے الٰہی کے جذبے کے تحت ہونی چاہیے، خواہش پرستی کسی انسان کے ساتھ ذاتی رنجش، دنیاوی عداوت، حسد، بغض یا کسی عہدے کے حصول میں کشمکش کی وجہ سے نہیں ہونی چاہیے کہ بظاہر نصیحت اور خیر خواہی کے روپ میں اس کی برائیاں بیان کرے اور نیت اس کو ذلیل کرنا، اس کی اہمیت گھٹانا اور اپنے انتقام کی پیاس بجھانا ہو، یہ شیطانی عمل ہے، ''اعمال کا دار و مدار نیتوں پر ہے، ہر شخص کے لیے وہی ہے جو اس نے نیت کی۔'' بلکہ ناصح کا قصد اس شخص کی اصلاح اور مسلمانوں کو اس کے دینی و دنیاوی ضرر سے بچانا ہونا چاہیے اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے آسان ترین راہ منتخب کرنی چاہیے۔

کسی ضرورت کے بغیر اپنی مرضی سے برائیوں کی مجلس میں شریک ہونا جائز نہیں، رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''جو اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہے وہ ایسے دستر خوان میں شریک نہ ہو جس پر شراب پی جائے۔''[1]

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے سامنے کچھ شراب نوش پیش کیے گئے، انھوں نے ان کو کوڑے لگانے کا حکم دیا تو ان کو بتایا گیا کہ ان میں ایک روزے دار بھی ہے، انھوں نے کہا: اسی سے آغاز کرو، کیا تم نے یہ آیت نہیں سنی:

﴿ وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَاُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖٓ ۖ اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ ﴾ [النساء: ١٤٠]

''اور بلاشبہہ اس نے تم پر کتاب میں نازل فرمایا ہے کہ جب تم اللہ کی آیات کو سنو کہ ان کے ساتھ کفر کیا جاتا ہے اور ان کا مذاق اڑایا جاتا ہے تو ان کے ساتھ مت بیٹھو، یہاں تک کہ وہ اس کے علاوہ کسی اور بات میں مشغول ہو جائیں۔ بے شک تم بھی اس وقت ان جیسے ہو۔''

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے بیان کیا کہ اللہ نے برائی میں موجود ہونے والے کو برائی کرنے والے ہی کی طرح قرار دیا ہے، اسی لیے علما کا کہنا ہے: ''اگر ایسی دعوتِ طعام میں بلایا جائے جہاں شراب نوشی اور رقص و طرب جیسی برائیاں ہوں تو وہاں جانا جائز نہیں۔'' کیوں کہ اللہ نے ہمیں حسبِ امکان برائیوں سے روکنے کا حکم دیا ہے، تو جو شخص اپنی مرضی سے کسی ایسی محفل میں شریک ہوتا ہے اور برائی سے روکتا نہیں وہ امر و نہی کے فریضے سے غفلت کی بنا پر اللہ اور اس کے رسول کا نافرمان ٹھہرتا ہے۔ لہٰذا اپنی مرضی سے اور کسی ضرورت کے بغیر فاسقوں کی محفل میں شرکت کرنے والا اگر امر و نہی کا کام نہ کرے تو ان کے فسق میں شریک ہوگا اور انھی میں شمار ہوگا۔ واللّٰہ أعلم[2]

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٨٠١) صحيح الجامع (٦٥٠٦)

[2] مجموع الفتاویٰ (٢٨/٢١٩_٢٢٢)

غیبت کا مفہوم اور جائز و ناجائز صورتیں

سوال غیبت کے متعلق تفصیل سے فتویٰ دیجیے، کیا مخصوص شخص یا متعین اشخاص کی غیبت کرنا جائز ہے؟

جواب الحمد لله رب العالمين.

سب سے پہلے غیبت کا مفہوم جاننا ضروری ہے، رسول اللہ ﷺ سے اس سے متعلق سوال ہوا تو آپ ﷺ نے ان الفاظ میں اس کی تفسیر اور وضاحت بیان کی:

«هِيَ ذِكْرُكَ أَخَاكَ بِمَا يَكْرَهُ»

''غیبت یہ ہے کہ تو اپنے بھائی کو کسی ایسی چیز کے ساتھ یاد کرے جس کو وہ ناپسند کرے۔''

پوچھا گیا: اگر میرے بھائی میں وہ عیب موجود ہو جو میں کہہ رہا ہوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اگر اس میں وہ عیب ہے جو تو کہہ رہا ہے تو یہی غیبت ہے، اگر اس میں وہ عیب نہ ہو جو تو کہہ رہا ہے پھر تو تُو نے اس پر بہتان باندھا۔''[1]

اس حدیثِ مبارکہ میں رسول اللہ ﷺ نے عیب اور بہتان کا فرق بیان کرتے ہوئے کہا کہ اس کے بارے میں جھوٹ بیان کرنا اس پر الزام اور بہتان باندھنا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ لَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بِاَنْفُسِهِمْ خَيْرًا وَّقَالُوْا هٰذَآ اِفْكٌ مُّبِيْنٌ ﴿١٢﴾ لَوْ لَا جَآءُوْ عَلَيْهِ بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ ۚ فَاِذْ لَمْ يَاْتُوْا بِالشُّهَدَآءِ فَاُولٰٓئِكَ عِنْدَ اللّٰهِ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ ﴿١٣﴾ وَلَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ لَمَسَّكُمْ فِيْ مَآ اَفَضْتُمْ فِيْهِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿١٤﴾ ﴾ [النور: ١٢ـ١٤]

''کیوں نہ جب تم نے اسے سنا تو مومن مردوں اور مومن عورتوں نے اپنے نفسوں میں اچھا گمان کیا اور کہا یہ صریح بہتان ہے۔ وہ اس پر چار گواہ کیوں نہ لائے؟ تو جب وہ گواہ نہیں لائے تو اللہ کے نزدیک وہی جھوٹے ہیں۔ اور اگر دنیا اور آخرت میں تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو یقیناً اس بات کی وجہ سے جس میں تم مشغول ہوئے، تم پر بہت بڑا عذاب پہنچتا۔''

نیز فرمایا:

﴿ وَلَا يَاْتِيْنَ بِبُهْتَانٍ يَّفْتَرِيْنَهٗ بَيْنَ اَيْدِيْهِنَّ وَاَرْجُلِهِنَّ ﴾ [الممتحنة: ١٢]

''اور نہ کوئی بہتان لائیں گی جو اپنے ہاتھوں اور اپنے پاؤں کے درمیان گھڑ رہی ہوں۔''

صحیح حدیث میں ہے:

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٥٨٩)

«إِنَّ الْيَهُودَ قَوْمٌ بُهتٌ »[1] ''یہودی بہتان باز قوم ہے۔''

لہٰذا کسی شخص کے بارے میں جھوٹ بیان کرنا مکمل حرام ہے، وہ مسلمان ہو کہ کافر، نیک ہو یا بد، لیکن مومن پر افترا باندھنا زیادہ شدید نوعیت کا ہے، بلکہ ہر طرح کا جھوٹ حرام ہے، البتہ کسی شرعی ضرورت کے تحت توریہ (ذو معنی الفاظ) جائز ہے، جسے جھوٹ بھی کہا سکتا ہے، کیوں کہ جب کوئی شخص کوئی بات کرتا ہے تو وہ اس سے ایک معنی اور مفہوم مراد لیتا ہے، مخاطب بھی وہی معنی سمجھنا چاہتا ہے، اگر وہ اس کی مراد کے مطابق نہ ہو تو وہ واضح جھوٹ ہوتا ہے، اگر وہ اس کی مراد کے مطابق ہو، لیکن وہ وہ معنی نہیں ہوتا جو مخاطب سمجھ رہا ہو، اسے توریہ کہا جاتا ہے، یہ فہم اور سمجھ کے اعتبار سے جھوٹ ہوتا ہے، گو جائز مقصد کے اعتبار سے جھوٹ نہ ہو، رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان بھی اسی قسم سے ہے کہ ''حضرت ابراہیم علیہ السلام نے صرف تین جھوٹ بولے اور وہ تینوں اللہ کی ذات کے لیے تھے: ایک حضرت سارہ کو اپنی بہن کہنا، دوسرے یہ کہنا: ''یہ ان کے اس بڑے نے کیا ہے۔'' اور تیسرے یہ کہنا: ''میں بیمار ہوں۔'' یہ تینوں معاریض (توریہ) ہیں۔''[2]

اس حدیث کی بنیاد پر علمائے کرام نے مظلوم کے لیے توریہ کے جواز پر استدلال کیا ہے، یعنی وہ اپنی بات سے ایسا مفہوم مراد لے کہ لفظ میں جس کی گنجایش موجود ہو، گو مخاطب اسے نہ سمجھ سکے۔ اس لیے ایک عالم نے کہا ہے: رسول اللہ ﷺ نے جس جھوٹ کی اجازت دی ہے وہ اسی قبیل سے تعلق رکھتا ہے۔

ام کلثوم بنت عقبہ بیان کرتی ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

«لَيْسَ الْكَاذِبُ الَّذِي يُصْلِحُ بَيْنَ النَّاسِ فَيَقُولُ خَيْراً أَوْ يَنْمِي خَيْراً »[3]

''وہ جھوٹا نہیں جو لوگوں کے درمیان صلح کرواتا ہے، وہ اچھی بات کہتا ہے، یا اچھی بات (دوسرے تک) پہنچاتا ہے۔''

جسے لوگ جھوٹ کہتے ہیں، اس کی رخصت صرف ان تین مواقع پر ہے: لوگوں کے درمیان صلح کروانے کے لیے، جنگ میں اور بیوی کے ساتھ بات کرنے میں۔ تو یہ سب خاص طور پر توریہ ہیں۔

اسی بنیاد پر نبی اکرم ﷺ نے اس سے، قصد اور غایت کے اعتبار سے، لفظ جھوٹ کی نفی کی ہے، آپ ﷺ کا فرمان ہے: «اَلْحَرْبُ خُدْعَةٌ »[4] ''جنگ دھوکا ہے۔'' آپ ﷺ جب کسی غزوے کا ارادہ کرتے تو توریہ کرتے۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣١٥١)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث ٣١٧١٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٧١)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٥٤٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٠٥)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٨٦٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧٣٩)

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے سفرِ ہجرت میں آپ ﷺ کے متعلق جو یہ کہا تھا: "إن هذا الرجل يهديني السبيل"[1] "یہ آدمی میرا راہبرِ سفر ہے۔" آنحضرت ﷺ نے غزوۂ بدر میں ایک سائل کافر کو جواب دیتے ہوئے کہا: «نَحْنُ مِنْ مَاءٍ»[2] "ہم پانی سے ہیں۔" اسی طرح ایک شخص نے ایک مسلمان پر قسم کھا لی جس کو کافروں نے اسیر بنانا چاہا تو آپ ﷺ نے کہا: "وہ میرا بھائی ہے۔" یعنی دینی بھائی، انھوں نے اس سے نسبی بھائی چارہ سمجھا تو نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: "میں سب سے زیادہ سچا اور اپنی بات کو پورا کرنے والا ہوں، مسلمان مسلمان کا بھائی ہے۔"[3]

یہ سب احادیث اسی معنی پر دلالت کرتی ہیں۔

یہاں یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے غیبت کرنے اور بہتان باندھنے میں فرق کیا اور بتایا ہے کہ اگر خبر دینے والا ایسی بات بتا رہا ہو جو اس کے مومن بھائی میں موجود ہو تو یہ غیبت ہے، آپ ﷺ کا یہ فرمان: «ذِكْرُكَ أَخَاكَ بِمَا يَكْرَهُ»[4] اس آیت کے مطابق اور ہم معنی ہے:

﴿ وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا ۚ اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ ۚ ﴾

[الحجرات: ١٢]

"اور نہ جاسوسی کرو اور نہ تم میں سے کوئی دوسرے کی غیبت کرے، کیا تم میں سے کوئی پسند کرتا ہے کہ اپنے بھائی کا گوشت کھائے، جبکہ وہ مردہ ہو، سو تم اسے ناپسند کرتے ہو۔"

یہاں وجہ تحریم یہ بیان کی کہ وہ اس کا ایمانی بھائی ہے، اس لیے مومن کے حسبِ حال غیبت زیادہ سخت ہو جاتی ہے، جس کا ایمان زیادہ ہو اس کی غیبت بھی زیادہ سنگین ہوتی ہے۔

ہمز ولمز، یعنی طعنے بازی، اشارے بازی اور عیب جوئی بھی غیبت ہی کی قبیل سے ہے۔ ہمز شدید طعنے بازی کو کہا جاتا ہے، لمز خفیف اشارے بازی وعیب جوئی کو۔ قرآن کریم میں ہے:

﴿ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّلْمِزُكَ فِي الصَّدَقٰتِ ﴾ [التوبة: ٥٨]

"اور ان میں سے کچھ وہ ہیں جو تجھ پر صدقات کے بارے میں طعن کرتے ہیں۔"

یعنی وہ تجھ پر طعن کرتے ہیں اور عیب لگاتے ہیں۔ فرمایا:

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٦٩٩)

[2] المغازي للواقدي (٥/١) البداية والنهاية (٢/٢٦٣)

[3] مسند أحمد (٧٩/٤) سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٢٥٦) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢١١٩) شیخ البانی رحمہ اللہ نے اسے صحیح کہا ہے۔

[4] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٨٩)

﴿ وَلَا تَلْمِزُوٓا أَنفُسَكُمْ ﴾ [الحجرات: ۱۱] ''اور نہ اپنے لوگوں پر عیب لگاؤ۔''

یعنی ایک دوسرے کو اشارے نہ کرو۔ فرمایا:

﴿ هَمَّازٍ مَّشَّآءٍ بِنَمِيمٍ ﴾ [القلم: ۱۱]

''جو بہت طعنہ دینے والا، چغلی میں بہت دوڑ دھوپ کرنے والا ہے۔''

نیز فرمایا:

﴿ وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ ﴾ [الھمزۃ: ۱]

''بڑی ہلاکت ہے ہر بہت طعنہ دینے والے، بہت عیب لگانے والے کے لیے۔''

یہ بات واضح ہوگئی ہے تو معلوم ہونا چاہیے کہ لوگوں کو ایسی باتوں کے ساتھ یاد کرنا جن کو وہ ناپسند کرتے ہوں، دو صورتوں میں ہوتا ہے: ایک نوع کا ذکر اور دوسرے مخصوص شخص کا ذکر وہ زندہ ہو کہ مردہ۔

پہلی صورت کے متعلق جاننا چاہیے کہ خدا اور رسول نے جس جس صنف کی مذمت کی ہے اس کی مذمت کرنا ضروری ہے، یہ غیبت نہیں، جس طرح جس جس صنف کی خدا اور رسول نے تعریف کی ہے، اس کی تعریف کرنا ضروری ہے۔ اسی طرح جس پر خدا اور رسول نے لعنت بھیجی ہے اس پر لعنت بھیجنا اور جس کے لیے اللہ رحمت کرے اور اس کے فرشتے رحمت کی دعا کریں، اس کے لیے دعائے رحمت کرنا بھی ضروری ہے۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے کافر، فاجر (بدکار) فاسق (نافرمان)، ظالم، بے راہ، بھٹکے ہوئے، حاسد، بخیل، جادوگر، سود خور، سود کھلانے والے، چور، زنا کار، خود پسند، فخر کرنے والے، متکبر اور جبار (سخت) اور اس طرح کے لوگوں کی مذمت کی ہے۔ اسی طرح مومن، متقی، صادق، بار (نیک)، عادل، ہدایت یافتہ، راشد، کریم، صدقہ کرنے والے، رحیم اور اس طرح کے نیک صفات انسانوں کی تعریف کی ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے سود خور، سود کھلانے والے، اس کی گواہی دینے والے، اسے لکھنے والے، حلالہ کرنے والے، حلالہ کروانے والے، لونڈے بازی کرنے والے، بدعت نکالنے والے یا بدعتی کو پناہ دینے والے، شراب پینے، نچوڑنے، اٹھانے، خریدنے، بیچنے، پلانے اور اس کی قیمت کھانے والے اور یہود و نصاریٰ کو چربی بیچنے، اس کی قیمت کھانے اور خدائی آیات کو چھپانے پر لعنت بھیجی، ظالموں پر لعنت کا ذکر بھی کیا۔

اللہ اور اس کے فرشتے رسول پر اور اہلِ ایمان پر درود بھیجتے ہیں صبر کرنے والے اور مصیبت کے وقت إنا لله ...الخ پڑھنے والے پر خدا کی مہربانی اور رحمت ہوتی ہے، اللہ اور اس کے فرشتے لوگوں کو خیر سکھانے والے پر درود بھیجتے ہیں، اس کے لیے فضا میں اڑنے والے پرندے اور سمندر میں تیرنے والی مچھلیاں بخشش کی دعا کرتی ہیں۔ اسی

طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو اپنے گناہ گار اور مومن مردوں اور عورتوں کے گناہوں کی بخشش کی دعا کرنے کا حکم دیا۔

اگر اچھائی کا حکم اور ترغیب دینا اور برائی سے روکنا اور خبردار کرنا مقصود ہو تو تب اس کا ذکر کرنا ضروری ہے، یہی وجہ ہے کہ جب رسولِ امین ﷺ کو پتا چلتا کہ کسی نے ایسا کام کیا ہے جو ناجائز اور منع ہے تو آپ ﷺ کہتے: ''لوگوں کو کیا ہے ایسی شرطیں لگاتے ہیں جو کتاب اللہ میں نہیں؟ ہر وہ شرط جو کتاب اللہ میں نہ ہو وہ لغو ہے، خواہ سو شرطیں ہوں۔''[1]

فرمایا: ''لوگوں کو کیا ہے ان اشیا سے بچتے ہیں جن میں میں رخصت دیتا ہوں، اللہ کی قسم! میں تم سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا اور اس کی حدود کو جاننے والا ہوں۔''[2] فرماتے: ''لوگوں کو کیا ہے؟ ایک کہتا ہے: میں مسلسل روزے رکھوں گا، دوسرا کہتا ہے: میں سوئے بغیر قیام اللیل کروں گا، تیسرا کہتا ہے: میں عورتوں سے شادی نہیں کروں گا، ایک کہتا ہے: میں گوشت نہیں کھاؤں گا؟! میں روزہ رکھتا ہوں، چھوڑتا بھی ہوں، سوتا بھی ہوں، قیام بھی کرتا ہوں، شادی بھی کرتا ہوں اور گوشت بھی کھاتا ہوں، جس نے میری سنت سے بے رغبتی دکھائی وہ مجھ سے نہیں۔''[3]

بنا بریں اللہ تعالیٰ نے تعریف یا مذمت، محبت یا بغض، موالات یا عداوت، درود یا لعنت کو اللہ تعالیٰ جن اسماء کے ساتھ معلق اور منسلک کیا ہے، کسی کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ ان اسما کو ان کے علاوہ قبیلوں، شہروں، مذہبوں یا مشائخ طریقت کے مختلف سلسلوں کے ساتھ منسلک کر دے جن کا مقصود محض پہچان ہوتی ہے، جس طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ يَآيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا ۚ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ۚ ﴾ [الحجرات: ١٣]

''اے لوگو! بے شک ہم نے تمھیں ایک نر اور ایک مادہ سے پیدا کیا اور ہم نے تمھیں قومیں اور قبیلے بنا دیا، تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچانو، بے شک تم میں سب سے زیادہ عزت والا اللہ کے نزدیک وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ تقویٰ والا ہے۔''

﴿ اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ﴾

[یونس: ٦٢، ٦٣]

''سن لو! بے شک اللہ کے دوست، ان پر نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ وہ جو ایمان لائے اور بچا کرتے تھے۔''

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٤٤) صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٥٠٤)

[2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٥٧٥٠) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٣٥٦)

[3] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٤٧٧٦) صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٤٠١)

﴿ تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِىْ نُوْرِثُ مِنْ عِبَادِنَا مَنْ كَانَ تَقِيًّا ﴾ [مریم: ٦٣]

''یہی ہے وہ جنت جس کا وارث ہم اپنے بندوں میں سے اسے بناتے ہیں جو متقی ہو۔''

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''آل ابی فلاں میرے دوست نہیں، میرا دوست اللہ اور صالح مومن ہیں۔''[1]

فرمایا: ''یاد رہے میرے دوست متقی ہیں، وہ جہاں بھی ہوں اور جو بھی ہوں۔''[2]

فرمایا: ''اللہ نے تم سے جاہلیت کی عصبیت اور آبائی فخر کرنا دور کر دیا ہے، اب لوگ دو ہی ہیں؛ مومن متقی اور فاجر و بدکار بدبخت۔''

فرمایا: ''لوگ آدم سے ہیں اور آدم مٹی سے۔''[3]

فرمایا: ''عربی کو عجمی پر، عجمی کو عربی پر، گورے کو کالے پر اور کالے کو گورے پر کوئی فضیلت نہیں، مگر تقویٰ کے ساتھ۔''[4]

لہٰذا زمانوں کے ساتھ، شہروں اور کسی عالم کی طرف نسبت کا ذکر محض پہچان کے لیے ہوتا ہے، تعریف و مذمت، محبت و بغض اور موالات و معادات (عداوات) صرف انھی اشیا کے ساتھ منسلک کی جا سکتی ہے جن کی کوئی سلطان اور برہان خدا نے اتاری ہے اور اس کی سلطان، یعنی دلیل اس کی کتاب ہے جو مومن ہو، خواہ کسی صنف سے تعلق رکھتا ہو، اس سے دوستی اور موالات رکھنا فرض ہے۔ جو کافر ہو، خواہ کسی بھی صنف سے تعلق رکھتا ہو، اس سے دشمنی رکھنا ضروری ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ ۝ وَمَنْ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴾ [المائدة: ٥٥، ٥٦]

''تمھارے دوست تو صرف اللہ اور اس کا رسول اور وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے، وہ جو نماز قائم کرتے اور زکات دیتے ہیں اور وہ جھکنے والے ہیں۔ اور جو کوئی اللہ کو اور اس کے رسول کو دوست بنائے اور ان لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں تو یقیناً اللہ کا گروہ ہی وہ لوگ ہیں جو غالب ہیں۔''

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰٓى اَوْلِيَآءَ ۘ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ﴾

[المائدة: ٥١]

---

1. صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٦٤٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢١٥)
2. مسند أحمد (٢٣٥/٥) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٢٤٢) صحيح الجامع (٤١٩٤)
3. سنن أبي داود، رقم الحديث (٥١١٦) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٢٧٠) صحيح الجامع (١٧٨٧)
4. مسند أحمد (٤١١/٥) السلسلة الصحيحة (٢٧٠٠)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! یہودیوں اور عیسائیوں کو دوست نہ بناؤ، وہ آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں۔''

﴿ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ﴾ [التوبة: ۷۱]

''اور مومن مرد اور مومن عورتیں، ان کے بعض بعض کے دوست ہیں۔''

﴿ لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَ عَدُوَّكُمْ اَوْلِيَآءَ ﴾ [الممتحنة: ۱]

''میرے دشمنوں اور اپنے دشمنوں کو دوست مت بناؤ۔''

﴿ اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَ ذُرِّيَّتَهٗۤ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِيْ وَ هُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ بِئْسَ لِلظّٰلِمِيْنَ بَدَلًا ﴾ [الكهف: ۵۰]

''تو کیا تم اسے اور اس کی اولاد کو مجھے چھوڑ کر دوست بناتے ہو، حالانکہ وہ تمھارے دشمن ہیں، وہ (شیطان) ظالموں کے لیے بطور بدل برا ہے۔''

﴿ لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ لَوْ كَانُوْۤا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ اُولٰٓىِٕكَ كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ وَ اَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ ﴾ [المجادلة: ۲۲]

''نہیں پائے گا کہ وہ ان لوگوں سے دوستی رکھتے ہوں جنھوں نے اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کی، خواہ وہ ان کے باپ ہوں، یا ان کے بیٹے، یا ان کے بھائی یا ان کا خاندان۔ یہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں اس نے ایمان لکھ دیا ہے اور انھیں اپنی روح کے ساتھ قوت بخشی ہے۔''

جس میں ایمان بھی ہو اور فجور، یعنی بدکاری بھی تو اس کو اس کے ایمان کے مطابق موالات، یعنی تعلق داری سے حصہ دیا جائے گا اور اس کے فجور کے مطابق بغض سے، لیکن محض گناہوں اور نافرمانیوں کی وجہ سے وہ دائرۂ ایمان سے خارج نہیں ہوگا، جس طرح خوارج اور معتزلہ کا عقیدہ ہے۔ ایمان دین، محبت، نفرت اور موالات و معادات کے معاملات میں انبیا، صدیقین، شہدا اور صالحین فساق اور نافرمانوں کے مرتبے میں قطعاً نہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ اِنْ طَآىِٕفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا فَاِنْۢ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰۤى اَمْرِ اللّٰهِ فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَ اَقْسِطُوْا اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۝ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ ﴾ [الحجرات: ۹، ۱۰]

''اور اگر ایمان والوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو دونوں کے درمیان صلح کرا دو، پھر اگر ان دونوں میں سے ایک دوسرے پر زیادتی کرے تو اس (گروہ) سے لڑو جو زیادتی کرتا ہے، یہاں تک کہ اللہ کے حکم کی طرف پلٹ آئے، پھر اگر وہ پلٹ آئے تو دونوں کے درمیان انصاف کے ساتھ صلح کرا دو اور

انصاف کرو، بے شک اللہ انصاف کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔ مومن تو بھائی ہی ہیں۔''

آپس کی لڑائی اور بغاوت کے باوجود اللہ تعالیٰ نے ان کو بھائی بھائی ٹھہرایا ہے، ارشاد ہے:

﴿ اَمْ نَجْعَلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَالْمُفْسِدِيْنَ فِي الْاَرْضِ اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِيْنَ كَالْفُجَّارِ ﴾ [صٓ: ٢٨]

''کیا ہم ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے، زمین میں فساد کرنے والوں کی طرح کر دیں گے؟ یا کیا ہم پرہیز گاروں کو بدکاروں جیسا کر دیں گے؟''

ایک جگہ فرمایا:

﴿ وَلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ﴾ [النور: ٢]

''اور تمھیں ان کے متعلق اللہ کے دین میں کوئی نرمی نہ پکڑے، اگر تم اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہو۔''

یہ انواع کے متعلق گفتگو تھی۔ جہاں تک متعین اور مخصوص فرد کا معاملہ ہے تو کچھ جگہوں پر اس کی برائی کا تذکرہ کیا جا سکتا ہے، جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

1 مظلوم کو حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنے اوپر ظلم کرنے والے کے ظلم کو روکنے یا اپنا حق وصول کرنے کے لیے اس کی برائی بیان کرے، جس طرح حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ کی بیوی ہند نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! ابوسفیان بخیل آدمی ہے، وہ مجھے اتنا خرچہ نہیں دیتا جو میرے اور میری اولاد کے لیے کافی ہو۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: ''معروف کے مطابق اتنا لے لے جو تیرے اور تیری اولاد کے لیے کافی ہو۔'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«لَيُّ الْوَاجِدِ يُحِلُّ عِرْضَهُ وَعَقُوْبَتَهُ» [1]

''خوش حال کا ٹال مٹول کرنا اس کی شکایت اور سزا کو جائز کر دیتا ہے۔''

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ ﴾ [النساء: ١٤٨]

''اللہ بری بات کے ساتھ آواز بلند کرنا پسند نہیں کرتا مگر جس پر ظلم کیا گیا ہو۔''

بیان کیا جاتا ہے کہ یہ ایک ایسے شخص کے متعلق اتری جو کسی قوم کے پاس مہمان بن کر آیا اور انھوں نے اس کی مہمان نوازی نہ کی، اگر یہ ایسے شخص کے بارے میں فرمایا گیا ہے، جس کی مہمان نوازی نہ کر کے اس پر ظلم کیا گیا،

---

[1] صحيح البخاري (٨٤٥/٢) سنن ابن داود، رقم الحديث (٣٦٢٨) سنن النسائي، رقم الحديث (٤٦٨٩) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٤٢٧) صحيح الجامع (٥٤٨٧)

جس کے وجوب ہی میں اختلاف ہے، گو صحیح مذہب کے مطابق یہ واجب ہی ہے تو اس کے بارے میں کتنی گنجایش نکل سکتی ہے جس کا حق نہ دے کر اس پر ظلم کیا گیا ہو؟ کہ جس کے استحقاق میں علما کا اتفاق ہے۔

یا پھر وہ شخص اپنے اوپر ظلم کرنے والے سے قصاص لینے کے لیے بھی اس کا ذکر کر سکتا ہے مگر زیادتی نہیں کرنی، نہ جھوٹ کا سہارا لینا ہے اور نہ اس پر ظلم ہی کرنا ہے، اگرچہ اسے ترک کر دینا افضل ہے۔

2 مسلمان کو دین یا دنیا کے کسی معاملے میں نصیحت کرتے اور مشورہ دیتے ہوئے کسی دوسرے کے عیب بیان کرنا، فاطمہ بنت قیس کی حدیث میں گزرا ہے کہ اس نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے نکاح کے معاملے میں مشورہ کیا اور بتایا کہ معاویہ اور ابوجہم نے اس کو نکاح کا پیغام بھیجا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''معاویہ نادار ہے اور ابوجہم اپنے کندھے سے لاٹھی نہیں اتارتا۔''[1] آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بتایا کہ ایک فقیر ہے اور تیرا حق ادا کرنے سے قاصر ہے اور دوسرا تجھے مار کر اذیت پہنچائے گا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات اس کو مشورے کے طور پر کہی تھی، گو اس میں نکاح کا پیغام بھیجنے والے کے عیب کا ذکر تھا۔

اسی معنی اور مفہوم میں آدمی جس سے معاملات کرتا ہے، جس کو اپنا نائب مقرر کرتا ہے، جس کو نگران بناتا ہے، جس سے گواہی طلب کرتا ہے، بلکہ جس کے پاس فیصلہ کروانے کے لیے جاتا ہے، اس کے متعلق مشورہ کرتا ہے۔ اگر انسان کو ذاتی مصلحت کے لیے اس کی اجازت ہے تو وہ امور جو مسلمانوں کے عمومی حقوق سے تعلق رکھتے ہوں، جیسے امرا، حکام، گواہ، مزدور اور اہلِ دیوان وغیرہ۔ ان امور میں مشورہ کرتے وقت خیر خواہی کرنا اور حقیقتِ حال بیان کرنا بلاشبہہ زیادہ اہم معاملہ ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: ''دین خیر خواہی کا نام ہے۔'' انھوں نے پوچھا: اے اللہ کے رسول! کس کے لیے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ کے لیے، اس کے رسول کے لیے، اس کی کتاب کے لیے، مسلمانوں کے سربراہوں اور عام مسلمانوں کے لیے۔''[2]

نصیحت اور خیر خواہی خاص دینی مصالح اور معاملات میں بھی ضروری ہے اور عام معاملات میں بھی۔ وہ راویانِ حدیث جو روایت میں غلطی کرتے یا جھوٹ بولتے ہیں، ان کے بارے میں بتانا عیب جوئی میں شمار نہیں ہوتا۔

یحییٰ بن سعید کہتے ہیں: میں نے امام مالک، سفیان ثوری، لیث بن سعد اور اوزاعی سے اس شخص سے متعلق پوچھا جو حدیث میں تہمت زدہ ہو یا اس کا حافظہ کمزور ہو تو انھوں نے کہا: اس کی حقیقت بیان کر۔

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٨٠)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٥)

کسی شخص نے امام احمد بن حنبل سے کہا: مجھ پر یہ بات گراں گزرتی ہے کہ کہوں: فلاں ایسا ہے، فلاں ایسا ہے۔ انھوں نے کہا: اگر تو بھی خاموش رہا اور میں بھی تو جاہل کو کب صحیح اور ضعیف حدیث معلوم ہو سکے گی؟

کتاب و سنت کے خلاف نظریات رکھنے والے بدعتی فرقے اور ان کے امام، یا کتاب و سنت کے مخالف عبادات کی حقیقت بیان کرنا اور امت کو ان سے خبردار کرنا بالاتفاق دینی فریضہ ہے۔ امام احمد سے کہا گیا: ایک آدمی نماز پڑھتا ہے، روزہ رکھتا ہے، اعتکاف کرتا ہے یا بدعتیوں کا پردہ چاک کرتا ہے، آپ کو اس کا کون سا عمل زیادہ محبوب ہے؟ انھوں نے جواب دیا: اگر وہ اہلِ بدعت کا پردہ چاک کرتا ہے تو یہ کام مسلمانوں کے لیے کرتا ہے اور جب نماز پڑھتا ہے، روزہ رکھتا ہے اور اعتکاف کرتا ہے تو اپنے لیے کرتا ہے، لہٰذا وہ افضل ہے۔ اس قول میں انھوں نے بیان کیا کہ جس کا مسلمانوں کو دینی فائدہ عام ہو، وہ جہاد فی سبیل اللہ کی نوعیت کا کام ہے، کیوں کہ اللہ کے راستے، اس کے دین اور شریعت کو پاک کرنا اور ظالموں کے ظلم کو روکنا فرضِ کفایہ ہے، اگر کوئی یہ کام نہ کرے اور ان لوگوں کے ضرر کا ہاتھ نہ روکے تو دین خراب ہو جائے گا اور دین کا فساد کسی علاقے پر دشمن کے قبضے کے فساد سے کہیں زیادہ ہوتا ہے، کیوں کہ قابض فوجیں دلوں اور دین کو اصالتاً خراب نہیں کرتیں، بلکہ یہ اس کا ثانوی نتیجہ ہوتا ہے، لیکن بدعتی اور دین میں بگاڑ پیدا کرنے والے آغاز ہی دلوں کے بگاڑ سے کرتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«إِنَّ اللّٰهَ لَا يَنْظُرُ إِلَى صُوَرِكُمْ وَأَمْوَالِكُمْ وَإِنَّمَا يَنْظُرُ إِلَى قُلُوبِكُمْ وَأَعْمَالِكُمْ »[1]

”یقیناً اللہ تمھاری شکلوں اور مال کو نہیں دیکھتے، بلکہ تمھارے دلوں اور اعمال کو دیکھتے ہیں۔“

اللہ سبحانہ وتعالیٰ قرآن کریم میں فرماتے ہیں:

﴿ لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ۚ ﴾

[الحدید: ٢٥]

”بلاشبہ یقیناً ہم نے اپنے رسولوں کو واضح دلیلوں کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور ترازو کو نازل کیا، تاکہ لوگ انصاف پر قائم رہیں، اور ہم نے لوہا اتارا جس میں سخت لڑائی (کا سامان) ہے اور لوگوں کے لیے بہت سے فائدے ہیں اور تاکہ اللہ جان لے کہ کون دیکھے بغیر اس کی اور اس کے رسولوں کی مدد کرتا ہے۔“

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ اس نے لوگوں کو انصاف پر قائم کرنے کے لیے کتاب اور میزان

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٦٤)

اتاری اور لوہا بھی اتارا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دین کی مضبوطی کتابِ ہدایت اور سیفِ ناصر سے ہوتی ہے۔

﴿ وَكَفٰى بِرَبِّكَ هَادِيًا وَّنَصِيْرًا ﴾ [الفرقان: ۳۱]

''اور تیرا رب ہدایت دینے والا اور مدد کرنے والا کافی ہے۔''

کتاب اصل ہے، اس لیے اللہ نے اول جب اپنا رسول مبعوث کیا تو اس پر کتاب بھی اتاری۔ آپ ﷺ جتنی دیر مکے میں رہے، اتنی دیر تک آپ کو تلوار استعمال کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ جب آپ نے ہجرت کی اور جہاد کے لیے آپ کے معاونین تیار ہو گئے تو اس وقت آپ ﷺ کو تلوار استعمال کرنے کی اجازت دی۔

دین کے دشمن دو طرح کے ہیں: ایک کفار اور دوسرے منافق۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے قرآن کریم کی دو آیات میں ان دونوں گروہوں سے جہاد کرنے کا حکم دیا، ارشاد ہے:

﴿ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ جٰهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ﴾ [التوبة: ۷۳]

''کافروں اور منافقوں سے جہاد کر اور ان پر سختی کر اور ان کا ٹھکانا جہنم ہے۔''

اگر کچھ لوگ منافق ہوں اور دین میں ایسی بدعات نکالیں جو کتاب اللہ کے مخالف ہوں، پھر ان کو لوگوں پر اس طرح خلط ملط کریں کہ حقیقتِ حال ان کے سامنے مبہم ہو جائے تو کتاب میں فساد پیدا ہو جائے گا اور دین میں تبدیلی پیدا ہو جائے گی، جس طرح ہم سے پہلے اہلِ کتاب کے دین کے ساتھ ہوا کہ ایسے لوگوں نے اس میں تبدیلیاں کر دیں اور کسی نے ان کو نہ روکا۔ اگر وہ لوگ منافق نہ ہوں، لیکن منافقوں کی باتوں پر کان دھرنے والے ہوں، جن پر حقیقت مستور ہو جاتی ہے اور وہ اسی کو حق سمجھ لیتے ہیں، لیکن دراصل وہ کتاب اللہ کے مخالف ہوتی ہے تو وہ منافقوں کی بدعتوں کے داعی اور مبلغ بن جاتے ہیں، اللہ فرماتے ہیں:

﴿ لَوْ خَرَجُوْا فِيْكُمْ مَّا زَادُوْكُمْ اِلَّا خَبَالًا وَّلَاَوْضَعُوْا خِلٰلَكُمْ يَبْغُوْنَكُمُ الْفِتْنَةَ وَفِيْكُمْ سَمّٰعُوْنَ لَهُمْ ﴾ [التوبة: ۴۷]

''اگر وہ تم میں نکلتے تو خرابی کے سوا تم میں کسی چیز کا اضافہ نہ کرتے اور ضرور تمھارے درمیان (گھوڑے) دوڑاتے، اس حال میں کہ تم فتنہ تلاش کرتے، اور تم میں کچھ ان کی باتیں کان لگا کر سننے والے ہیں۔''

لہٰذا ان کی حقیقت سے پردہ اٹھانا بھی ضروری ہوتا ہے، بلکہ اگر ان کی حقیقت بیان نہ کی جائے تو اس سے زیادہ فتنے کا خدشہ ہوتا ہے، کیوں کہ ان لوگوں میں کچھ ایمان بھی ہوتا ہے جو ان کے ساتھ تعلقات رکھنے کا تقاضا کرتا ہے، لیکن یہ لوگ دین کو خراب کرنے والی منافقوں کی بدعتوں میں سے کسی بدعت کا شکار ہو جاتے ہیں، اس لیے ان

کی بدعتوں سے خبردار کرنا ضروری ہوتا ہے، چاہے اس کے لیے ان کا نام لینا اور ان کو متعین کرنا ضروری ہو، بلکہ اگر وہ یہ بدعت کسی منافق سے نہ بھی لیں، لیکن اس کو حق سمجھتے ہوئے بیان کرتے رہیں، لیکن وہ حقیقت میں غلط ہو، تب بھی اس سے پردہ اٹھانا ضروری ہوتا ہے۔

اسی بنیاد پر جو حدیث اور روایت میں غلطی کرتا ہے، رائے اور فتویٰ دہی میں غلطی کرتا ہے اور زہد وعبادت میں غلطی کرتا ہے، اس کی حالت بیان کرنا ضروری ہے، اگرچہ غلطی کرنے والے مجتہد کی غلطی معاف ہے اور اس کو اجتہاد کا اجر ملتا ہے، لیکن اس قول وعمل کو بیان کرنا جس پر کتاب وسنت دلالت کرتے ہوں، ضروری ہوتا ہے، خواہ وہ اس مجتہد کے قول وعمل کے مخالف ہو۔

جس شخصیت کو قابلِ اجتہاد سمجھا جائے، اس کا ذکر مذمت کے اسلوب میں نہیں کرنا چاہیے نہ اس کو گناہ گار ہی قرار دینا چاہیے، کیوں کہ اللہ اس کی غلطی معاف کرتا ہے، اس کے ایمان، پرہیز گاری، محبت، موالات اور دعا وستایش جیسے اس کے حقوق کی پاسداری کرنا ضروری ہے۔

جس کی منافقت معلوم ہو، جس طرح رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں عبداللہ بن اُبی اور اس کے حاشیہ نشینوں کی ایک جماعتِ منافقین مشہور تھی، نیز جس طرح مسلمانوں کو عبداللہ بن سبا، عبدالقدوس بن حجاج اور محمد بن سعید مصلوب جیسے رافضیوں کے نفاق کے بارے میں علم تھا تو ایسے لوگوں کو منافق کہنا اور ان کے نفاق کا ذکر کرنا جائز ہے۔

اگر کوئی شخص کسی بدعت کا برملا پرچار کرتا ہے اور یہ معلوم نہ ہو کہ وہ منافق ہے کہ خطا کار مومن تو ایسی صورت میں اس کے بارے میں جو معلوم ہو وہ بیان کیا جائے، لیکن جس بات کا علم نہ ہو، اسے بیان کرنا جائز نہیں۔ اسی طرح کسی کے بارے میں بات کرتے وقت اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول اور کلمہ اسلام کی سربلندی اور دینِ اسلام کے پھیلاؤ کے علاوہ کوئی اور نیت نہیں ہونی چاہیے۔ جو انسان اس معاملے میں بلاعلم یا اس کے بارے میں اپنے علم کے خلاف غلط بات کہے وہ اللہ کی نگاہ میں گناہ گار ہے۔

قاضی، گواہ اور مفتی کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے، رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

''قاضی تین ہوتے ہیں: دو دوزخ میں اور ایک جنت میں جائے گا، جس شخص کو حق اور سچ کی بات معلوم ہوگئی اور اس نے اس کے مطابق فیصلہ دیا تو وہ جنت میں جائے گا، جس نے جہالت (لاعلمی) کی بنیاد پر لوگوں کا کوئی فیصلہ کر دیا وہ جہنم میں جائے گا اور جس کو حق معلوم ہو گیا، لیکن اس نے اس کے خلاف فیصلہ دیا تو وہ بھی جہنم میں جائے گا۔''[1]

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٥٧٣) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٣٢٢) سنن ابن ماجه (٢٣١٥) صحيح الجامع (٤٤٤٦)

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ ۚ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا ۖ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا ۚ وَاِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ۝135 ﴾ [النساء: ۱۳۵]

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! انصاف پر پوری طرح قائم رہنے والے، اللہ کے لیے شہادت دینے والے بن جاؤ، خواہ تمھاری ذاتوں یا والدین اور زیادہ قربت والوں کے خلاف ہو، اگر کوئی غنی ہے یا فقیر تو اللہ ان دونوں پر زیادہ حق رکھنے والا ہے۔ پس اس میں خواہش کی پیروی نہ کرو کہ عدل کرو اور اگر تم زبان کو پیچ دو، یا پہلو بچاؤ تو بے شک اللہ اس سے جو تم کرتے ہو، ہمیشہ سے پوری طرح باخبر ہے۔''

﴿ تَلْوٗٓا ﴾ سے مراد جھوٹ اور ﴿ تُعْرِضُوْا ﴾ سے مراد حق چھپانا ہے۔ اسی مفہوم سے ملتی جلتی یہ حدیث بھی صحیحین میں مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

''دو خرید و فروخت کرنے والوں کو اس وقت تک اختیار ہوتا ہے جب تک جدا جدا نہ ہو جائیں، اگر وہ دونوں سچ بولیں اور بیان کریں تو ان دونوں کی بیع میں برکت ڈال دی جاتی ہے، اگر جھوٹ بولیں اور چھپائیں تو ان کی بیع سے برکت مٹا دی جاتی ہے۔''[1]

مزید برآں اس معاملے میں بات کرنے والے کے لیے ضروری ہے کہ اس کی نیت اچھی ہو، اگر وہ حق بات کہے، لیکن ارادہ اپنے آپ کو بلند کرنے اور فساد پھیلانے کا ہو تو وہ اس مجاہد کی طرح ہے جو غیرت دکھانے اور ریاکاری کے لیے لڑتا ہے، اللہ کے لیے نہیں۔

اگر وہ اخلاص کی بنیاد پر اور صرف اللہ کے لیے کسی کی عیب نمائی کرے تو وہ اس مجاہد کی طرح ہے جو اللہ کی راہ میں لڑتا ہے اور وہی دراصل انبیا کا وارث اور رسولوں کا نائب ہے۔ یہ باب جس کا ذکر ہو رہا ہے، اس حدیث: «ذِكْرُكَ أَخَاكَ بِمَا يَكْرَهُ»[2] کے مخالف نہیں، کیوں کہ بھائی مومن ہے اور مومن بھائی اگر اپنے ایمان میں سچا ہو تو وہ اس حق بات کو قطعاً ناپسند نہیں کرے گا جو اللہ اور اس کے رسول کو پسند ہے، خواہ اس میں اس کے اور اس کے تعلق داروں کے خلاف گواہی پڑتی ہو، بلکہ اس کو انصاف کو قائم کرنا چاہیے اور صرف اللہ کے لیے گواہ بننا چاہیے، خواہ وہ اس کی اپنی ذات اپنے والدین یا رشتے داروں ہی کے خلاف ہو۔ اگر اس نے اس حق کو ناپسند کیا تو اس کے ایمان میں کمی

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٩٧٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٨٩)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٨٩)

واقع ہوگی، اس لیے اس جہت سے اس کی کراہت اور ناپسندیدگی کی کوئی اہمیت نہیں جو اس کے ایمان میں کمی کر دے، کیوں کہ اس چیز کی ناپسندیدگی جو اللہ اور اس کو رسول کو بھی ناپسند ہو، اللہ اور اس کے رسول کی محبت کو مقدم کرنے کا تقاضا کرتی ہے، اللہ نے بھی فرمایا ہے:

﴿ وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ ﴾ [التوبة: ٦٢]

''اللہ اور اس کا رسول زیادہ حق دار ہے کہ وہ اسے خوش کریں۔''

چنانچہ حدیثِ غیبت میں مذکورہ امور پر تنبیہ لفظی طور پر داخل ہے نہ معنوی طور پر۔

غیبت کرنے والوں کی اقسام:

(۱) کچھ لوگ محض شرکائے مجلس دوستوں اور ہم جولیوں کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کسی کی غیبت کرتے ہیں، حالانکہ انھیں علم ہوتا ہے کہ جس کی غیبت کر رہے ہیں وہ ان عیبوں سے بری ہے، یا اس میں کسی حد تک وہ عیب پائے جاتے ہیں، لیکن وہ سمجھتے ہیں کہ اگر انھوں نے دوسرے لوگوں کو اس کی غیبت کرنے سے روکا تو مجلس ختم ہو جائے گی اور اہلِ مجلس ان کو ثقیل اور بوجھل سمجھتے ہوئے ان سے نفرت کریں گے، چنانچہ وہ ان کی ہاں میں ہاں ملانے ہی کو حسنِ معاشرت اور اچھی سنگت کا تقاضا سمجھتے ہیں۔ اسی طرح اگر وہ لوگ غصے میں آ جائیں تو یہ لوگ بھی ان کے غصے کی وجہ سے غصے میں آ جاتے ہیں اور چغل خوری میں ان کے ساتھ شامل ہو جاتے ہیں۔

(۲) کئی لوگ غیبت کو کئی رنگوں میں پیش کرتے ہیں، کبھی دین اور اصلاح کے رنگ میں، مثلاً بات کرتے وقت کہیں گے: میری یہ عادت نہیں کہ کسی کی برائی کروں، میں غیبت اور جھوٹ پسند نہیں کرتا، میں تمھیں اس کے حالات بتاتا ہوں، اللہ کی قسم! وہ تو بے چارہ ہے، یا اچھا آدمی ہے، لیکن اس میں فلاں فلاں عیب ہے۔ یا اس طرح کہیں گے: اس کا ذکر چھوڑیے، اللہ اس کو اور ہمیں معاف فرمائے۔ اور مقصد اس کی شان میں کمی کرنا اور اس سے پہلو تہی کرنا ہوتا ہے۔ اس طرح لوگ دین اور اصلاح کے رنگوں میں غیبت کرتے ہیں اور اللہ کو دھوکا دینے کی سعیِ ناتمام کرتے ہیں اور لوگوں کو بھی دھوکا دیتے ہیں۔

ہم نے غیبت اور عیب جائی کے اس طرح کے ہزار رنگ دیکھے ہیں۔

(۳) کچھ لوگ ریاکاری کرتے ہوئے دوسرے کو بلند کرتے ہیں، لیکن بباطن اپنی تعریف کرنا چاہتے ہیں، مثلاً کہیں گے: اگر میں رات کو فلاں شخص کے لیے دعا کر دیتا تو اس کے بارے میں مجھے یہ جو فلاں فلاں باتیں سننے کو مل رہی ہیں، نہ ملتیں۔ مقصد اپنی ذات کو بلند کرنا اور اپنے معتقد کے ہاں اپنی پرہیزگاری ظاہر کرنا ہوتا ہے۔ یا اس

طرح کہیں گے: فلاں کند ذہن اور کم سمجھ ہے اور مقصد اپنی تعریف، اپنے علم کا اظہار اور اپنی افضلیت کا اعلان ہوتا ہے، یعنی دوسرے کی مذمت کی آڑ میں اپنی ستایش۔

④ کچھ لوگوں کو حسد غیبت پر اکساتا ہے تو وہ غیبت اور حسد جیسے دو قبیح کاموں کا ارتکاب کرتے ہیں۔ اگر کسی کی تعریف بھی کریں تو بعد میں دین اور اصلاح کے رنگ یا حسد، فجور اور مذمت کے قالب میں اس کو لوگوں کی نظروں سے نیچا گرانے اور اس کا مرتبہ گھٹانے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں۔

⑤ کچھ لوگوں کو خوش کرنے کے لیے کسی کی نقل اتار کر یا اس کی تذلیل کر کے تمسخر اور مذاق اڑانے کے رنگ میں غیبت کرتے ہیں۔

⑥ کچھ تعجب کے انداز میں غیبت کرتے ہیں اور کہتے ہیں: مجھے فلاں شخص پر تعجب ہوتا ہے وہ فلاں فلاں عمل کیوں نہیں کرتا؟! فلاں شخص سے کس طرح اس کام کا صدور ہوا؟! اس طرح وہ تعجب کے پیرائے میں اس کا نام ظاہر کر دیتا ہے۔

⑦ کچھ اظہارِ تاسف کے پیرائے میں غیبت کرتے ہیں، مثلاً کہیں گے: فلاں بے چارہ! میں اس کے حالات سے دکھی ہوں! جو یہ بات سنتا ہے تو سمجھتا ہے یہ اس کے غم میں پگھل رہا ہے اور اس کو تسلی دینے کے لیے اس کو الفاظ نہیں مل رہے، لیکن ممکن ہے وہ یہ بات اس کے دشمنوں کے پاس کہہ رہا ہو اور وہ یہ بات سن کر انتقام کی آگ ٹھنڈی کرتے ہوں۔ یہ سب بڑے بڑے امراضِ قلب اور اللہ اور اس کی مخلوق کو دھوکا دینے کے مختلف پیرائے ہیں۔

⑧ کچھ غصے اور برائی کی مذمت کے اسلوب میں غیبت کا اظہار کرتے ہیں اور اس باب میں بظاہر بڑی خوب صورت اور مزین باتیں کرتے ہیں، مگر اندرونی مقصد کچھ اور ہوتا ہے۔ واللہ المستعان۔[1]

اہلِ خانہ سمیت غلط جگہوں پر جانے کا حکم

سوال ایک شخص حکام کی نگاہ میں نیک اور معتبر ہے اور تفریح کے ایام میں ایسی جگہوں پر جاتا ہے جہاں لوگ سیر و تفریح کے لیے اکٹھے ہوتے ہیں، وہ وہاں کوئی برائی دیکھتا ہے، لیکن اسے روکنے کی صلاحیت نہیں رکھتا، وہ وہاں اپنے گھر والوں کو بھی لے کر جاتا ہے تو کیا یہ جائز ہے؟ اور اس کی عدالت و دیانت اور نیک نامی کے لیے قادح ہے؟

جواب وہ جگہیں جہاں برائیں دیکھی جائیں اور آدمی ان کو روکنے کی قدرت نہ رکھتا ہو تو وہاں کسی شرعی کام کے بغیر جانا درست نہیں، یعنی وہاں کوئی ایسا کام ہو جو آدمی کی اپنی یا دنیاوی مصلحت و مفاد کے لیے ضروری ہو اور اس کا وہاں جانا لازمی ہو، یا وہ وہاں جانے پر مجبور ہو، لیکن صرف تفریح کے لیے ایسے مقامات پر جانا اور ساتھ اپنی

[1] مجموع الفتاویٰ (۲۸/۲۲۲ـ۲۳۶)

بیوی کو بھی لے کر جانا کہ وہ بھی ان گناہوں کو دیکھے تو یہ درست نہیں، اگر وہ اس کام پر اصرار کرے تو یہ اس کی عدالت و مروت میں عیب شمار ہوگا۔ واللہ أعلم [1]

پانی وغیرہ پینے کا شرعی طریقہ

سوال کیا تین سانس میں پینا سنت ہے، نیز کھڑے ہو کر پینے کا کیا حکم ہے؟

جواب الحمد للہ. بہتر یہی ہے کہ آدمی تین سانس میں پیے اور سانس برتن میں نہ لے، بلکہ اس سے باہر لے، کیوں کہ برتن میں سانس لینا منع ہے، اگر سانس نہ لے اور ایک ہی سانس میں پی لے تو بھی جائز ہے۔

صحیح میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم برتن میں تین سانس لیتے۔ [2] مسلم کی روایت میں ہے: پینے میں تین سانس لیتے۔ اس سے پیاس بھی بجھ جاتی ہے اور پینا بھی خوش گوار ہو جاتا ہے، [3] یعنی اچھو لگنے کا خدشہ نہیں رہتا۔ یہ حدیث تین سانس میں پینے کے مستحب ہونے کی دلیل ہے۔ دوسری حدیث کی وضاحت سے معلوم ہوا کہ برتن میں سانس لینے سے مراد تین سانس میں پینا ہے، کیوں کہ صحیحین میں حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم میں سے کوئی جب پیے تو برتن میں سانس نہ لے۔'' [4] اس حدیث میں سانس لینے سے منع کیا گیا ہے۔ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پینے میں سانس لینے سے منع کیا۔ ایک آدمی نے کہا: اگر میں برتن میں کوئی تنکا دیکھوں تو؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اسے بہا دے۔'' اس نے کہا: میں ایک سانس میں سیراب نہیں ہوتا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اپنے منہ سے پیالہ جدا کر لے۔'' (رواہ الترمذي وصححہ) [5]

معلوم ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سانس میں پینے سے منع نہیں کیا، لیکن جب اس آدمی نے کہا: میں ایک سانس میں سیراب نہیں ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: تو پیالہ اپنے منہ سے جدا کر لے، یعنی جب تجھے سانس لینے کی ضرورت پیش آئے تو پیالے سے باہر سانس لے لے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی ایک ہی سانس میں سیراب ہو جائے اور اس کو سانس لینے کی ضرورت پیش نہ آئے تو ایک سانس میں پینا بھی جائز ہے۔

مجھے اس سلسلے میں کسی امام کا قول معلوم نہیں جس میں اس نے سانس لینا واجب اور ایک سانس میں پینا حرام کہا ہو۔

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۲۳۶/۲۸)

[2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۵۳۰۸) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۲۰۲۸)

[3] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۲۰۲۸)

[4] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۱۵۲) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۲۶۷)

[5] سنن الترمذي، رقم الحدیث (۱۸۸۷) السلسلة الصحیحة، رقم الحدیث (۳۸۵)

آپ ﷺ کا فعل استحباب کی دلیل ہے، جس طرح آپ ﷺ کو جوتا پہننے میں، کنگھی کرنے میں، صفائی کرنے میں اور تمام کاموں میں دائیں جانب سے آغاز کرنا اچھا لگتا تھا۔[1] اگر کوئی شخص وضو کرتے وقت پہلے بائیں اعضا دھوئے، پھر دائیں تو وہ اس بہتر کو چھوڑنے والا ہو گا، مگر اس کا وضو صحیح ہو گا، اس میں مجھے علما کا کوئی اختلاف معلوم نہیں۔ جہاں تک کھڑا ہو کر پینے کا مسئلہ ہے تو صحیح احادیث میں اس کی ممانعت آئی ہے اور صحیح احادیث ہی میں اس کی رخصت بھی مذکور ہے، اس لیے اس مسئلے میں علما کا اختلاف ہے۔ امام احمد سے دو روایات منقول ہیں۔ ان احادیث میں تطبیق دینے کی یہی ایک صورت ہے کہ رخصت کی احادیث کو عذر پر محمول کیا جائے۔

منع کی احادیث یہ ہیں:

صحیح بخاری میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے کھڑے ہو کر پینے سے منع کیا۔[2] دوسری حدیث قتادہ عن انس کی سند سے ہے: نبی اکرم ﷺ نے کھڑے ہو کر پینے سے ڈانٹتے ہوئے روکا۔[3] قتادہ کہتے ہیں: ہم نے پوچھا: کھانا؟ تو انھوں نے کہا: ''وہ پینے سے بھی زیادہ برا ہے۔''

رخصت کی احادیث یہ ہیں:

صحیحین میں حضرت علی اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم سے مروی ہے: ''نبی اکرم ﷺ نے زمزم کھڑے ہو کر پیا۔''[4] صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کوفہ کے میدان میں کھڑے ہو کر پیا، پھر کہا: لوگ کھڑا ہو کر پینا مکروہ سمجھتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے بھی اسی طرح کیا تھا، جس طرح میں نے کیا ہے۔[5] حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اس حدیث میں ایک اثر بھی مروی ہے جس میں ہے: یہ زمزم کا پانی تھا، جس طرح عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث میں ہے: یہ حج کا موقع تھا، لوگ وہاں طواف کر رہے تھے زمزم پیتے بھی تھے اور پلاتے بھی تھے اور آپ ﷺ سے مسائل بھی پوچھتے تھے، وہاں بیٹھنے کی کوئی جگہ نہیں تھی، یہ آپ ﷺ کی وفات سے کچھ ہی عرصہ پہلے کا واقعہ ہے۔

یہ اور اس جیسے احوال اس ممانعت سے مستثنیٰ ہیں، یہ شریعت کے احوال کے مطابق ہے کہ ممنوعہ کام حاجت اور ضرورت کے وقت جائز ہو جاتا ہے، بلکہ حاجت کے وقت تو وہ چیزیں بھی مباح ہو جاتی ہیں جو حرمت میں اس سے کہیں زیادہ شدید ہیں۔ کھانے سے تعلق رکھنے والی مردار اور خون جیسی حرام چیزیں ضرورت کے وقت حلال ہو جاتی

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٦٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٨)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٠٢٥)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٠٢٤)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٥٥٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٠٢٧)

[5] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٢٩٢)

ہیں، اسی طرح سونے اور ریشم جیسی پاک چیزیں جنھیں پہننا اور جسم سے لگانا حرام ہے، یہ بھی ضرورت کے وقت حلال ہو جاتی ہیں، جب کہ یہاں ممانعت کھانے اور پینے کی کیفیت سے تعلق رکھتی ہے جو سونے چاندی کے برتنوں میں کھانے اور سونا و ریشم پہننے کی ممانعت اور نہی سے خفیف اور کم درجے کی ہے، حالانکہ ان کے متعلق وعید بھی آئی ہے، پھر بھی ضرورت کے وقت یہ چیزیں جائز ہو جاتی ہیں، اس لیے ضرورت کے وقت اس کا جائز ہونا ان سے زیادہ مناسب اور اولیٰ ہے۔ واللہ أعلم[1]

مشتبہ مال کے حامل کی دعوت کھانے کا حکم

سوال ایک شخص کا اکثر مال حلال ہو، مگر اس میں کچھ مشتبہ مال بھی ہو، جب وہ کسی کو کھانے کی دعوت دے تو کیا اس کی دعوت قبول کرنا جائز ہے؟ اسی طرح جس کے پاس حلال مال بھی ہو اور حرام بھی، کیا اس کے مال سے کھانا جائز ہے؟

جواب اگر دعوت میں نہ جانا قطع تعلقی، یا لڑائی جھگڑے جیسی کسی مفسدت اور خرابی کا باعث بنے تو دعوت قبول کر لینی چاہیے، کیوں کہ صلہ رحمی کرنا اور صلح صفائی قائم رکھنا فرض ہے، اگر یہ فرض اس کے بغیر پورا نہ ہو سکتا ہو تو یہ بھی فرض ہوگا اور دعوت قبول کرنا حرام نہیں ہوگا، یا یہ کہا جائے کہ دعوت قبول کرنے کی مصلحت اس خدشے پر راجح ہو جو شبہہ سے پیدا ہوتا ہے۔

اگر دعوت قبول نہ کرنے میں کوئی مفسدت اور خرابی نہ ہو، بلکہ ترکِ دعوت محض شبہے سے بچنے کی مصلحت کے پیشِ نظر ہو اور دعوت دینے والے کو تھوڑے سے گناہ سے منع کرنا مقصود ہو اور دعوت قبول کرنے میں محض دعوت قبول کرنے کی مصلحت ہو اور اس میں صرف شبہے کی مفسدت ہو تو ان دونوں صورتوں میں کیا زیادہ مناسب اور راجح ہے؟ اس میں علما کا اختلاف ہے، کچھ ترکِ دعوت اور پرہیز گاری کے پہلو کو ترجیح دیتے ہیں اور کچھ نیکی اور مصلحت کو مقدم رکھتے ہیں۔ دوسرا وہ شخص جس کے پاس حلال مال بھی ہو اور حرام بھی ہو، اگر اس میں کسی متعین ومخصوص مال کے حرام ہونے کا یقینی علم ہو تو اسے حتماً نہیں کھانا چاہیے، اگر کسی مخصوص مال کے حرام ہونے کا علم نہ ہو تو پھر اس سے کھانا حرام نہیں، لیکن جب حرام زیادہ ہو، حلال کم ہو تو پھر پرہیزگاری کا تقاضا ہے کہ اس کے مال سے نہ کھایا جائے۔ واللہ أعلم[2]

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۳۲/۲۰۸-۲۱۰)

[2] مجموع الفتاویٰ (۳۲/۲۱٤)

شطرنج کھیلنے کی شرعی حیثیت

سوال کیا شطرنج حرام ہے یا حلال؟

جواب الحمد للہ رب العالمین.

اگر شطرنج کسی طرح کے معاوضے اور شرط پر مشتمل ہو یا نماز ضائع کرنے، اس میں تاخیر کرنے، یا اہل وعیال کی ذمے داریوں سے غفلت اور دیگر فرائض میں کوتاہی کا سبب بنے تو بالا جماع حرام ہے۔ اسی طرح اگر جھوٹ اور ظلم جیسے حرام امور پر مبنی ہو تب بھی بالا جماع حرام ہے۔ اگر ان تمام برائیوں سے خالی ہو تو امام مالک، ابو حنیفہ، احمد اور امام شافعی کے بہت سے اصحاب اور جمہور علما کے نزدیک حرام ہے۔ امام شافعی کے کچھ اصحاب کہتے ہیں: امام صاحب نے اسے قطعی حلال نہیں کہا، بلکہ مکروہ سمجھا ہے۔ ان سے ایک قول یہ بھی مروی ہے کہ اس کی حرمت میرے سامنے واضح نہیں ہوئی۔ امام شافعی کے اصحاب میں سے امام بیہقی سب سے زیادہ حدیث کا علم رکھتے تھے اور امام شافعی کے سب سے بڑے حمایتی تھے۔ انھوں نے اس کی حرمت پر حضرت علی، حضرت ابو سعید، عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن عباس، ابو موسیٰ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہم جیسے اصحابِ رسول ﷺ کا اجماع نقل کیا ہے اور اس مسئلے پر کسی صحابی کا اختلاف نقل نہیں کیا۔ جس نے کسی صحابی سے رخصت نقل کی ہے وہ غلط ہے۔

بیہقی جیسے محدثین صحابہ کے اقوال کے متعلق ایسے لوگوں سے زیادہ علم رکھتے تھے جو بلا سند ہی نقل کرتے رہتے ہیں، چنانچہ بیہقی کہتے ہیں: امام شافعی کے نزدیک شطرنج کھیلنا اختلافی مسئلہ ہے اور یہ گواہی رد کرنے کا سبب نہیں، البتہ یہ ان کے نزدیک مکروہ ہے اور یہی ان کے مذہب کے زیادہ مطابق رائے ہے، مکروہ کہنے والوں کی تعداد بھی زیادہ ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ شطرنج عجم کا میسر (جوا) ہے۔ انہی سے مروی ہے، وہ کچھ لوگوں کے پاس سے گزرے جو شطرنج کھیل رہے تھے تو کہا:

﴿مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ﴾ [الأنبياء: ٥٢] ''کیا ہیں یہ مورتیاں جن کے تم مجاور بنے بیٹھے ہو؟'' اگر کوئی اپنے ہاتھ میں گرم کوئلہ پکڑے اور وہ اس کے ہاتھ ہی میں ٹھنڈا ہو جائے، یہ ان کو ہاتھ لگانے سے بھی بہتر ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس، ابن عمر، ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہم اور حضرت عائشہ سے ایسے اقوال منقول ہیں جو اس کی کراہت پر دلالت کرتے ہیں۔ یزید بن ابی حبیب، محمد بن سیرین، ابراہیم اور مالک بن انس سے بھی اس کی کراہت منقول ہے۔

میں کہتا ہوں: سلف کے کلام میں اس کام کی کراہت بکثرت منقول ہے اور غالباً اس سے حرام ہونا مراد ہے، انھوں نے اس کے مکروہ تحریمی ہونے کی صراحت کی ہے اور واضح الفاظ میں اسے نرد سے بھی برا کہا ہے جو حرام ہے، اگرچہ اس میں عوض نہ بھی ہو۔

قاسم بن محمد سے پوچھا گیا: مَیسر (جوا) کیا ہے؟ انھوں نے کہا: ''ہر وہ کام اور چیز جو اللہ کے ذکر اور نماز سے غافل کر دے، مَیسر ہے۔ ان سے کہا گیا: نرد تو مَیسر ہے، کیا شطرنج بھی مَیسر ہے؟ تو انھوں نے اوپر والا جواب دیا۔

عقبہ بن عامر کا قول ہے: ''جاہلیت میں پوجا کیے جانے والے کسی بت کی پوجا کرنا، یہ جوا کھیلنے سے بہتر ہے۔'' فضالہ بن عبید کا قول ہے: ''میں یہ کھیل کھیلوں یا خنزیر کے خون سے وضو کر کے نماز پڑھوں، دونوں میں کوئی فرق نہیں۔'' حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جو پہلے قول منقول ہوا ہے اس میں انھوں نے شطرنج کھیلنے والوں کو بتوں کے پجاریوں سے تشبیہ دی ہے۔ یہ اس آیت کے مفہوم کے مطابق ہے جس میں اللہ نے فرمایا ہے:

﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۝ إِنَّمَا يُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَنْ يُوقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ وَعَنِ الصَّلَاةِ فَهَلْ أَنْتُمْ مُنْتَهُونَ ۝ ﴾ [المائدة: ٩٠، ٩١]

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! بات یہی ہے کہ شراب اور جوا اور شرک کے لیے نصب کردہ چیزیں اور فال کے تیر سراسر گندے ہیں، شیطان کے کام سے ہیں، سو اس سے بچو، تاکہ تم فلاح پاؤ۔ شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعے تمھارے درمیان دشمنی اور بغض ڈال دے اور تمھیں اللہ کے ذکر سے اور نماز سے روک دے، تو کیا تم باز آنے والا ہو۔''

مَیسر (جوا) میں نردشیر وغیرہ بھی داخل ہے۔ صحیح میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: ''جس نے نردشیر کھیلا، اس نے خنزیر کے گوشت اور خون سے اپنا ہاتھ رنگا۔''[1] سنن میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے نردشیر کھیلا، اس نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی۔''[2] نرد کھیلنا ائمہ اربعہ کے مذہب میں حرام ہے، چاہے عوض کے بغیر ہی ہو، عبداللہ بن عمر اور مالک بن انس وغیرہ کا قول ہے: ''شطرنج، نرد سے بھی برا کھیل ہے۔''

ابو حنیفہ، احمد اور شافعی وغیرہم کا قول ہے: ''نرد شطرنج ہی سے تعلق رکھتا ہے۔'' یہ دونوں اقوال علاحدہ علاحدہ لحاظ سے صحیح ہیں۔ نرد اگر عوض کے ساتھ ہو اور شطرنج عوض کے بغیر تو اس صورت میں وہ شطرنج سے زیادہ برا ہے اور

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٢٦٠)

[2] مسند أحمد (٣٩٤/٤) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٩٣٨) صحيح الجامع، رقم الحديث (٦٥٢٩)

بالا جماع حرام ہے۔ اگر دونوں ہی عوض کے ساتھ ہوں یا عوض کے بغیر ہوں تو پھر شطرنج نرد سے برا ہے، کیوں کہ شطرنج نرد سے زیادہ دل کو غافل اور اللہ کے ذکر اور نماز سے دور کرتا ہے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے: شطرنج مذہبِ قدر پر مبنی ہے اور نرد مذہبِ جبر پر۔

نرد کھیلنے والا بعد میں اشارہ کرتا اور حساب لگاتا ہے، جب کہ شطرنج کا کھلاڑی ساری چالیں پہلے ہی ترتیب دے کر رکھتا ہے، اس لیے شطرنج دل کو نرد سے زیادہ خراب کرتا ہے۔ عربوں میں نرد کا کھیل معروف تھا۔ شطرنج فتوحات کے بعد عربوں میں داخل ہوئی، اس کا اصل ملک ہندوستان تھا، وہاں سے یہ ایرانیوں میں منتقل ہوئی۔ عربوں میں نرد کے معروف ہونے کی وجہ سے حدیث میں اس کا ذکر آیا ہے، ورنہ شطرنج اس سے بری ہے، جب یہ دونوں عوض مقرر کرنے اور نہ کرنے کے لحاظ سے برابر ہوں۔ واللہ أعلم[1]

کبوتر بازی کا حکم

سوال کبوتر بازی جائز ہے یا ناجائز؟

جواب کبوتر بازی سے منع کیا گیا ہے، سنن میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ایک شخص کو کبوتری کا پیچھا کرتے ہوئے دیکھا تو فرمایا: ''شیطان شیطانی کا پیچھا کر رہا ہے۔''[2] جو کبوتر بازی کرتا ہے وہ عموماً لوگوں کی چھتیں پھلانگتا ہے اور ان کے گھروں میں نظر ڈالتا ہے، اپنے کبوتروں کو کنکریاں مارتا ہے جو کسی وقت ہمسائیوں کو جا لگتی ہیں، اس لیے اس کو سخت سزا دی جانی چاہیے، تاکہ وہ اس کام سے باز آ جائے، ایک تو یہ کھیلنا حرام ہے اور دوسرا ہمسائیوں کو تنگ کرنے کا باعث ہے۔ واللہ أعلم[3]

ہنسانے کے لیے جھوٹی کہانیاں گھڑنے کا حکم

سوال لوگوں کو ہنسانے کے لیے جھوٹی کہانیاں اور باتیں گھڑ کر سنانا جائز ہے یا ناجائز؟

جواب جو شخص لوگوں کو ہنسانے یا کسی اور مقصد سے جھوٹی باتیں بنا کر سناتا ہے وہ اللہ اور رسول کا نافرمان ہے۔

حضرت بہز بن حکیم سے عن ابیہ عن جدہ کی سند سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«إِنَّ الَّذِي يُحَدِّثُ فَيَكْذِبُ لِيُضْحِكَ الْقَوْمَ: وَيْلٌ لَهُ وَيْلٌ لَهُ ثُمَّ وَيْلٌ لَهُ »[4]

---

1. مجموع الفتاویٰ (۳۲/۲٤۰_۲٤۳)
2. سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٩٤٠) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (۳۷٦٥) صحيح الجامع (۳۷۲٤)
3. مجموع الفتاویٰ (۳۲/۲٤٦)
4. سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٩٦٩) سنن الترمذي، رقم الحديث (۲۳۱٥) صحيح الجامع (۷۰۱۳)

''وہ جو لوگوں کو ہنسانے کے لیے بات کرتا ہے تو جھوٹ بولتا ہے، اس کے لیے ہلاکت ہے، ہلاکت ہے، ہلاکت ہے۔''

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول ہے: ''جھوٹ مذاق میں جچتا ہے نہ سنجیدگی میں، تم میں سے کوئی اپنے بچے سے بھی ایسا وعدہ نہ کرے جسے پورا نہ کرے۔''

اگر اس کام میں کسی دوسرے مسلمان پر زیادتی کی جائے اور دین میں نقصان پہنچایا جائے تو پھر اس کی حرمت دوچند ہو جاتی ہے۔ بہرحال ایسا کام کرنے والا ایسی شرعی سزا کا مستحق ہے جو اس کو اس سے روک دے۔ واللہ أعلم [1]

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۳۲/۲۵۵)

یادداشت



Street no: 5, Hameed Colony, Gill Road, Gujranwala
+92-55-3823990 darabitayyab1@gmail.com
fb/darabitayyab www.darabitayyab.com

دار ابي الطيب
للبحث والتحقيق